

جو کہانیاں لکھیں

اسد محمد خاں



جو کہانیاں لکھیں

اسد محمد خاں

اکارے بیاز یافت

پہلی اشاعت : ستمبر ۲۰۰۶ء
کمپوزنگ : لیزر پلس، فون: 2751324
قیمت : ۶۰۰ روپے
جملہ حقوق محفوظ

Jo Kahaniyan Likhen

(Short Stories)

By: Asad Muhammad Khan



Kitab Market, Office# 17, St.# 3,
Urdu Bazar, Karachi, Pakistan
Ph: (92-21) 2751428
e-mail: a.bazyaft@yahoo.com

یہ کتاب

میرے والد میاں عزت محمد خاں صاحب، والدہ منور جہاں بیگم صاحبہ
اہلیہ فرزانہ اسد

اور میرے بچوں:

محمد اولیس خاں، ڈاکٹر انیس الرحمن، سمن انیس
غلام محی الدین، ایمن محی الدین، محمد خالد قریشی اور غزل خالد
اور میرے نواسہ نواسی: حسان، ہنزہ گل اور شمیمنا

کے نام ہے

خدا ان سب کو بلند رتبہ کرے اور آباد رکھے!

ترتیب

نئی زمین نئے آسماں تراشتا ہوں

مبین مرزا

۹

کھڑکی بھر آسماں

۳۳

برج خموشاں

۱۱۱

غصے کی نئی فصل

۱۹۳

نربدا

۳۸۱

ٹکڑوں میں کہی گئی کہانی

۶۳۵

نئی زمین نئے آسماں تراشتا ہوں

(چند باتیں اسد محمد خاں کے افسانوں کی بابت)

باتوں، لہجوں اور ماجروں کو جوڑ توڑ کر کہانی بنانے والا، جذبے اور احساس کو ملال کی آنچ دے کر شعر کاڑھنے اور گیت کا ریشم بننے والا، رنگوں میں زندگی کی حرارت گوندھنے والا اور چاک پہ مٹی دھر کے اُسے بولنا سکھانے والا ایک آدمی... کوئی بھی آدمی، بلکہ یہ سب کے سب لوگ اپنے ہنر میں اور فن میں جُوا کھیلتے ہیں۔ زندگی کا جُوا۔ جی اُٹھنے یا پھر مر رہنے کی بازی۔ سو یوں اگر دیکھا جائے تو ہمارے زمانے کی کہانی کی دُنیا میں اس شخص نے جس کا نام اسد محمد خاں ہے، بڑا تگڑا جُوا کھیلا ہے۔ اور اُنھیں جو جاننے والے ہیں، جاننا چاہیے اور ماننا چاہیے کہ جیت لی ہے بازی اس شخص نے۔

تو اب ایسا ہے کہ وہ جنھیں جاننے اور سمجھنے کا ذوق ہے، تو انھیں اطمینان کے ساتھ دیکھنا اور سمجھنا چاہیے کہ آخر اسد محمد خاں کے فن کی جیت کیا ہے؟ اور کیسے ہے! کہ یہ شخص جو آج کے ادب کے صدر میں بیٹھا کہانیاں کہتا اور قصے سناتا ہے، اوّل اوّل قصہ گو تو نہیں تھا۔ افسانہ و افسوں سے اس آدمی کو بہت بعد میں ذوق ہوا، ورنہ پہلے تو یہ شعر کاڑھنے اور گیت بننے والا آدمی تھا۔

میں وندھیا چل کی آتما...

جیسا مدھر گیت جس میں واقعی آتما گاتی گنگناتی سنائی دیتی ہے، بھلا کسے یاد نہ ہوگا! تو اپنے

بھائی اسد محمد خاں یہ اور ایسے ہی دوسرے گیتوں کی مدھرتا بکھراتے اور تانیں اڑاتے، ادب کی وادی میں اترے تھے اور سوچتے تھے کہ اپنے زمانے کے ادب میں بس کہیں حاشیے پہ ٹک رہیں گے۔ لیکن پھر یوں ہوا (اور ہونا بھی یوں ہی چاہیے تھا) کہ مئی دادا اور باسودے کی مریم کے قصوں نے انھیں تاک لیا۔ اور بس پھر کچھ لوگ تھے نئے اور کچھ نئے زمانے تھے، نئی زمینیں تھیں کہ ایک الگ لحن، ایک انوکھا لہجہ اور ایک منفرد آواز جنھیں گڑھتی، بناتی، تراشتی اور ہمارے سامنے رکھتی جاتی تھی۔

تو ایسا ہے اب کہ یہ قصہ جب چھڑ ہی گیا ہے تو کیوں نہ میں اس کا سراوہیں سے تھام لوں جہاں میں نے اسد محمد خاں اور ان کی کہانی کو پہلے پہل دریافت کیا تھا اور خواہش کی تھی اسے جاننے اور سمجھنے کی۔

کچھ یوں لگا کہ پوری ایک دنیا ہے... بھانت بھانت کے لوگوں سے بھری ہوئی۔ جیون جو جھتے، کشت اٹھاتے، وضع نبھاتے اور جیتے مرتے لوگوں سے بھری ہوئی دنیا۔ اچھے بھی ہیں ان میں، بہت اچھے، سچے اور اندر باہر سے سولہ آنے کھرے۔ اور یہی نہیں بلکہ ایک سے ایک بڑا حرام الدہر بھی پڑا ہے ان میں... بلکہ سچ پوچھو تو یہ رذیل کمینے ہی زیادہ دکھائی پڑتے ہیں یہاں بھی۔ ہماری اپنی دنیا کی طرح۔ دوسروں کا استحصال کرتے، انھیں دباتے، زندگی کو ان کے لیے ایک مسلسل عذاب بناتے اور برائی کا کاروبار کرتے لوگ، اچکے، اٹھائی گیرے، کرائے کے بدمعاش اور دلال... ہر طرح کا موذی ہے ان میں۔ ہاں، وہ کوٹھوں کا اُجالا، نصیبوں والیاں بھی ہیں یہاں پر۔ لیکن بکھیڑا یہ ہے کہ ان بُرے اور برائی کرتے لوگوں میں بھی نیک دل مرد اور بھلی طبیعت کی عورتیں نکل آتی ہیں، بالکل اسی طرح جیسے خود اپنی زندگی میں ہم دیکھتے ہیں کہ کسی بہت بُری جگہ یا کسی بہت بُرے کام میں کوئی ایسی روح سامنے آ جاتی ہے جو اپنے کام کی ساری معصیت کے باوجود ہمیں معصوم نظر آتی ہے۔ سو ان افسانوں میں بھی بہت سے ہیں جو بے قصور ہیں مگر زندگی کو سزا کی طرح بھوگتے ہیں۔ ان لوگوں کی پتا سنتے اور انھیں جیون بھوگتے دیکھ کر بالکل یوں لگتا ہے کہ جیسے کوئی آئینہ ہے جو ہماری زندگی کا عکس دکھاتا ہے، کوئی فلم ہے، ایک مسلسل اور طویل فلم یا پھر ایک فلم کے ٹکڑے ہیں جن میں خود ہم ہیں اور عین مین ہمارے ارد گرد کا ماحول۔ کیسے جیتے جاگتے اور کتنے حقیقی ہیں یہ کردار۔ جی ہاں، اسد محمد خاں کے جہانِ افسانہ و افسوں کے کرداروں سے میرا پہلا تعارف کچھ اسی قسم کا تھا۔

اب، جب کہ میں ان کرداروں کے ساتھ طویل، بہت طویل عرصہ گزار چکا ہوں اور اس منزل میں ہوں کہ جہاں مجھے ان کرداروں کے کردار کی بابت اپنا بیانِ حلفی ریکارڈ کرانا ہے، تو ضروری ہے کہ میں اعتراف کروں کہ آگے چل کر مجھے اپنی اُس رائے میں تبدیلی کرنا پڑی جو میں نے اوّلین تعارف کی بنا پر ان کرداروں کے بارے میں قائم کی تھی۔

انسانی تہذیب اور سماجی رشتوں کی بنتی بگڑتی اور بدلتی صورتِ حال کی جیسی جامع، تہ دار اور بلیغ دستاویز افسانوں اور ناولوں میں مرتب ہوتی ہے ویسی تہذیب و ثقافت کے کسی دوسرے فن میں ہمیں نہیں ملتی۔ اس کا ایک اہم سبب تو ظاہر ہے اس فنِ لطیف سے وابستہ لوازم ہیں جو فن کار کو اپنے موضوع کی خارجی اور داخلی صورت گری کی یکساں قدرت کا حامل بناتے ہیں۔ دوسری طرف ایک بات اور بھی قابلِ توجہ ہے۔ وہ یہ کہ کہانی کہنے اور سننے کے دونوں ہی اعمال سے فطرتِ انسانی کو شروع سے ایک خاص مناسبت ہے۔ کہانی کہنے اور اس سے محفوظ ہونے کے اسالیب، فنی لوازم اور اظہار و ابلاغ کے پیرائے، زمانوں اور معاشروں کی مزاجی کیفیات اور تقاضوں کے تحت تبدیل تو ضرور ہوتے رہے ہیں، لیکن کہانی کا وہ بنیادی جوہر جو ایک انسان کو دوسرے بہت سے انسانوں بلکہ پورے پورے معاشروں اور زمانوں کی زندگی کو جاننے ہی کا نہیں، بسر کرنے کا لطف بھی دے جاتا ہے۔ آج بھی کہانی کے haunting elements میں سے ہے۔ وقت کی کم یابی اور مسائل و مشاغلِ حیات کی افزونی کے اس دور میں بھی یہی وہ جوہر ہے جو کہانی کا اثبات کرتا اور کہانی کے فن کا جواز بنتا ہے۔

یہیں اگر ایک اور امر کا اعتراف بھی کر لیا جائے تو چنداں مضائقہ نہیں۔ یہ کہ ہمارا زمانہ، جس کی بابت عام تاثر یہ ہے کہ اس نے انسان کی معنوی دلچسپیوں اور باطنی اظہار کی سرگرمیوں کے آگے بڑے بڑے سوالیہ نشان لگا دیے ہیں اور ہمیں خارجی زندگی کے ہنگاموں میں محو کر دیا ہے... ان سب باتوں کے باوجود حقیقت یہ ہے کہ ہمارا زمانہ اچھی کہانیوں کے لیے توجہ اور قبولیت سے آج بھی عاری نہیں بلکہ بڑی کہانیوں کے امکانات سے اب بھی اسی طرح بھرا پڑا ہے جیسے اس سے قبل کے زرخیز زمانے رہے ہیں۔ ہاں، بس اب یہ ہے کہ وہی کہانی کار فوکس ہو سکیں گے جو کہانی کہنے بننے سے پہلے خود اپنے اندر اور اپنے فن کے اندر کہانی کو بسر کرتے ہیں... ایسے ہی کہانی کاروں کی ایک مثال ہمارے زمانے میں اسد محمد خاں ہیں۔

ایک بار میں نے اسد محمد خاں سے دریافت کیا، کیا پہلی بار میں ہی کہانی ایسی گتھی

ہوئی صورت میں اُتر آتی ہے؟ انھوں نے نہایت سادگی اور متانت سے اپنے مخصوص انداز میں جواب دیا، ”نہیں، ہرگز نہیں۔ بھائی جان! بڑی جان لگانی پڑتی ہے۔ کبھی تو سولہ سترہ بار ڈرافٹ کرتا ہوں، تب کہیں جا کر کہانی کی صورت دیکھنے کو ملتی ہے۔“ ٹھیک کہتے ہیں اسد محمد خاں، بالکل ٹھیک۔ جو کہانی وہ لکھتے ہیں، وہ اس سے کم ریاضت کے بغیر ممکن بھی نہیں۔

اب یہاں میں نے لفظ ریاضت استعمال کیا ہے تو ضروری ہے کہ بتاتا چلوں، ریاضت کی نوعیت بھی مختلف فن کاروں میں مختلف ہوا کرتی ہے۔ کچھ کے یہاں ریاضت محض مشقِ سخن کے درجے میں رہتی ہے اور کچھ لوگ اس کے ذریعے ذرا اور آگے بڑھتے ہیں، اپنی آواز پانے کی سعی کرتے ہیں۔ لیکن وہ جو بڑا فن کار ہوتا ہے، وہ ریاضت کے ذریعے اپنی زندگی کو انفرادی اور اجتماعی دونوں سطحوں پر پہلے تو rediscover کرتا ہے اور پھر relive بھی کرتا ہے... زندگی کے پورے کیف و کم اور احساس کی تہ در تہ شدتوں کے ساتھ۔ یہ ادب و فن کو جیتی جاگتی زندگی کا لمس دینے اور اس کی معنویت کو سماجی سیاق و سباق میں متعین کرنے کا عمل ہے۔ اب یہاں مثال کے طور پر آپ اسد محمد خاں کے پہلے افسانوی مجموعے ”کھڑکی بھر آسمان“ ہی کو سامنے رکھ لیجیے۔ افسانے پڑھتے جائیے ایک ایک کر کے، آپ دیکھیں گے کہ افسانہ نگار نے پے در پے ایسے کرداروں کو لکھا ہے جو ہندوستانی کلچر کے پیدا کردہ ہیں۔ اسد محمد خاں نے بڑی احتیاط سے کام لیا ہے کہ اپنے کرداروں پر علاقائی عصبیت کی چھاپ نہیں پڑنے دی اور نہ ہی انھیں کسی مذہبی رول ماڈل کے سانچے میں ڈھالا ہے۔ انھوں نے تو ان کرداروں اور ان کے ماجروں کو اُس تناظر میں دیکھا اور دکھایا ہے جس پر برصغیر کی ثقافتی روح کی چھوٹ پڑتی ہے۔ خیر و شر کے باہم آمیز عناصر کے ساتھ اور مخلوط معاشرے کی complex situations میں پورے قد کے ساتھ ابھرتے ہیں اسد محمد خاں کے تراشے ہوئے یہ کردار۔ ان کرداروں کے ماجروں کی حقیقی قدر و قیمت کو سمجھنے کے لیے ہمیں اپنا تہذیبی اسٹرکچر، اس کی تمام تر رنگارنگی اور تنوع کے ساتھ سامنے رکھنا پڑے گا... ورنہ یہ سب کردار گھٹ کر محض زندگی کی کھلواڑ کا ایسا نمونہ ہو کر رہ جائیں گے جس کا مقصد وقت گزاری کے لیے تفریح طبع کا سامان فراہم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتا۔ تو بس اب ضروری ہے کہ ہم یہاں رُک کر پہلے اُس اصول کو سمجھ لیں جس کے تحت برصغیر کی تہذیبی و ثقافتی روح نے ظہور کیا ہے۔

برصغیر پاک و ہند کی تہذیبی و ثقافتی روح نے اپنے اظہار کے لیے زمین اور وقت

کے جتنے بھی دائرے قائم کیے، ان سب میں اصول کثرت ہمیں مشترک ملتا ہے۔ تہذیبوں کا مطالعہ کوئی ایسا کام تو خیر نہیں ہے کہ جس کے لیے جمع تفریق یا ضرب تقسیم کی قسم کا کوئی ضابطہ مقرر کر لیا جائے اور پھر اسی کے تحت تہذیبوں کے مظاہر اور ان کی نمو کا جائزہ لیا جائے۔ اس لیے کہ تہذیبوں کے باطن میں جو تخلیقی جوہر کارفرما ہوتا ہے، وہ اپنے اصول خود اپنی ہی نہاد سے اخذ کرتا ہے۔ تاہم انسانی صورت حال اور اس کے سماج کو سمجھنے کے لیے ہمیں کوئی نہ کوئی قاعدہ تو اختیار کرنا ہی پڑتا ہے۔

خیر، بات ہو رہی تھی کہ اسد محمد خاں تاریخی اعتبار سے بیسویں صدی کے آخری ربع میں ہمارے افسانوی منظر نامے کا ایک ایسا نام ہے جس کے فن کارانہ طرز احساس اور تخلیقی شعور کو ثقافتی تناظر سے منہا کر کے سمجھنا ممکن نہیں۔ اس لیے کہ اسد محمد خاں کے افسانے اپنی اوپری سطح پر اظہار و ابلاغ کا کتنا ہی ڈرامائی، سہل اور رواں دواں اسلوب کیوں نہ اختیار کریں، واقعہ یہ ہے کہ یہ افسانے تہ در تہ معنویت کا ایک گمبھیر اور پیچیدہ سلسلہ رکھتے ہیں۔ ایک فن کار صرف اپنے موضوعات اور مسائل کی وجہ سے بڑا نہیں بنتا ہے بلکہ اس کی بڑائی میں اس کے اسلوب اور طرز احساس کا بھی اتنا ہی حصہ ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس کا اسلوب اور طرز احساس نہ صرف معنویت کی متنوع سطحوں کا حامل ہوتا ہے بلکہ ابلاغ و تفہیم کے بھی مختلف دائروں میں بیک وقت کام کرتا ہے۔ پارچہ بانی کے فن کی طرح اس کا فن بھی اپنی دیدہ زیبی اور فن کاری کے لیے عامتہ الناس اور اہل ذوق و نظر سے الگ الگ قسم کی داد وصول کرتا ہے۔ اسد محمد خاں کے افسانے دل چسپ، سادہ اور grasping ہونے کی وجہ سے اپنا وسیع تر عوامی حلقہ ضرور رکھتے ہیں لیکن بایں ہمہ حقیقت یہ ہے کہ یہ دل چسپی اور سادگی محض برائے فن نہیں ہے بلکہ زندگی کے نہایت گنجلک تجربے اور عمیق احساس کو خود زندگی کے لب و لہجے میں بیان کی شدید فن کارانہ کاوش نے انھیں سہل بنا دیا ہے۔ گویا یہ سادگی سادگی نہیں بلکہ پختہ کاری کی انتہا ہے۔ اظہار کے اس سہل متمتع کے پیچھے فنی الجھنوں اور فکری دقیقوں کا ایک طویل عمل ہے جس سے فن کار پوری ثابت قدمی کے ساتھ گزرا ہے۔ صبح منہ اندھیرے، نور کے تڑکے سانس پکا کرنے کا ریاض۔ جی ہاں، فن کار کسی شعبے کا ہو، فن کی اگلی منزلوں کی طرف بڑھنے کے لیے سانس تو اُسے پکا کرنا ہی پڑتا ہے۔ تو بات یہ ہے کہ اسد محمد خاں نے یہ ریاض بہت کیا ہے۔ اسی ریاض کی دین ہے کہ ان کے افسانوں میں فکر و فن کی ساری گمبھیرتا ایک زیریں سطح پر سفر کرتی ہے اور

between the lines معنویت کی ایک تہ جماتی چلی جاتی ہے۔ خیر، اس پر مزید گفتگو ہم آگے چل کر کریں گے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اہم فن کاروں کی تفہیم اور تعین قدر میں جو ایک مسئلہ بالعموم ہمارے یہاں پیش آتا ہے، وہی اسد محمد خاں کے افسانوں کے حوالے سے بھی دیکھنے میں آتا ہے۔ یہ مسئلہ ہے فن کار کے کسی ایک پہلو کی ایسی تعیم کہ اس کا سارا فنی کارنامہ محض اس ایک پہلو سے موسوم نظر آئے۔ اسد محمد خاں کی بابت ایک عام رائے یہ پائی جاتی ہے کہ انھوں نے خطِ افلاس سے نیچے زندگی بسر کرنے والوں کا احوال قلم بند کیا ہے۔ یہ رائے اسد محمد خاں کے جہانِ افسانہ کی بابت غلط تو بے شک نہیں ہے لیکن یہ بھی واقعہ یہ ہے کہ یہ ان کے پورے فن کو اس کی کلیت میں بیان نہیں کرتی بلکہ اس کے محض ایک جزو کی طرف اشارہ کرتی ہے۔ اس قسم کی آرا کسی بھی تخلیق کار کی من حیث المجموع قدر و قیمت کے تعین میں نہایت مہلک قسم کی گم راہی کا سبب بنتی ہیں۔ لیکن اب اس کا کیا کیا جائے کہ ہماری تنقید نے اپنے تناظرات میں بالعموم اور فلشن کے باب میں بالخصوص پہلے بھی ایسے کئی ایک لطیفے سنائے ہوئے ہیں، مثلاً منٹو کو طوائفوں (یا جنس) کا، قرۃ العین حیدر کو طبقہ اشرف کا اور انتظار حسین کو ناسٹلجیا (یا اساطیر) کا کہانی کار قرار دینے والے بیانات ہماری تنقید کی کام چوری سے پیدا ہونے والے لطیفے نہیں ہیں تو اور کیا ہیں۔ پروفیسر قسم کے دانش وروں اور فلشن کے سکہ بند نقادوں کو شاید میری یہ بات زیادہ ناگوار گزرے گی لیکن واقعہ یہ ہے کہ اردو فلشن کے فروغ اور تفہیم میں ہماری تنقید نے خاطر خواہ کردار ادا نہیں کیا ہے۔ خیر، اس وقت نہ تو نقادوں کی گوشمالی مقصود ہے اور نہ ہی اپنی تنقید کی نارسائی کے مصائب کا بیان۔ تو آئیے واپس اسد محمد خاں کی طرف۔ ان کے بارے میں جو عام تاثر ہے کہ وہ پسے ہوئے اور زندگی گزیدہ کرداروں کے کہانی کار ہیں، یہ رائے ان کے فن کا پورا احاطہ نہیں کرتی اس لیے ہمیں اس سے الگ ہو کر اپنا کام کرنا پڑے گا۔ یہ ہیں وہ دو بنیادی باتیں جنہیں ہمیں آغاز ہی میں جان لینا چاہیے۔

انسانی احساس کی وسعت اور اس کے تجربے کی گہرائی کما حقہ تو خیر کس سے بیان ہوئی ہے اور کیوں کر بیان ہو سکتی ہے، لیکن اس اعتراف کے باوصف اگر ہم آج اکیسویں صدی کے اوّلین عشرے میں اپنے افسانوی ادب کا جائزہ لیں اور یہ دیکھنا چاہیں کہ ہمارے کن کن فن کاروں نے انسانی احساس اور اس کے تجربے کا زیادہ سے زیادہ ریکارڈ مرتب کیا

ہے تو درجہ اول کے ناموں میں ایک نام اسد محمد خاں ہمارے سامنے آتا ہے۔ اسد محمد خاں نے اپنے افسانوں میں انسانی احساس کے عجیب منطقوں کو دریافت کیا ہے اور ان منطقوں کی سیاحت کے دوران گہرے تجربوں کے زندہ رنگوں کو سمیٹا ہے۔

اسد محمد خاں نے افسانوں کا ایک خاص پہلو یہ ہے کہ ان کو جوڑ کر دیکھنے سے ہندو اسلامی کلچر یا گنگا جمنی تہذیب کی سماجی صورت حال اور انسانی رویوں کا خاصا معقول کوائف نامہ مرتب ہو جاتا ہے۔ یہ کہنا تو درست نہیں ہوگا کہ اسد محمد خاں کے افسانوں میں پہلی بار ہندو اسلامی کلچر کے نمائندہ کردار ہمارے سامنے آتے ہیں۔ ایسا تو یقیناً نہیں ہے۔ یوں بھی اسد محمد خاں نے جس زمانی دائرے میں اپنے افسانوی سفر کا آغاز کیا، اس سے پہلے اولیت کے سارے ہی سہرے بندھ چکے تھے اور پھر یہ بھی بڑا ماننے کی کوئی بات نہیں کہ اولیت کا اعزاز تو اپنی جگہ، لیکن ہمارے یہاں ایک زمانے میں جس طرح اس قسم کا سہرا باندھنے کا فیشن رہا ہے، کیا کسی تخلیقی فن کار کی حتمی سبقت میں وہ کوئی فیصلہ کن کردار ادا کر سکتا ہے؟ میرا ذاتی جواب نفی میں ہے۔ اس لیے کہ تخلیقی فنون میں درجہ بندی کے لیے قطار کا نہیں صف کا اصول درست ہوتا ہے۔ قطار بندی اسکول کے لڑکوں کے ڈسپلن کے لیے تو ٹھیک ہے لیکن فن کاروں پر اس کے اطلاق میں جس hard and fast قسم کے رویے کی ضرورت پیش آتی ہے، مجھے اس پر اندھے کی لاٹھی کی پھبتی سوجھتی ہے۔ پھر یہ کہ خود اسد محمد خاں ایسے تخلیقی فن کار کی ذاتی دل چسپی بھی اپنے کام کے تخمین وطن میں تو بے شک ہوگی لیکن اولیت کے قضیے میں نہیں۔ یہ تو محققوں کا مسئلہ ہے، سوائے انھی کے سپرد کر دینا چاہیے۔

تو بات یہ ہے کہ گنگا جمنی کردار ہم نے اوروں کے یہاں بھی دیکھے اور ان کی کتھا پڑھی ہے لیکن اسد محمد خاں کے یہاں ایسے کردار اپنے پورے وجودی تجربے اور باطنی احساس کے ساتھ اس طرح آتے ہیں کہ ان کے اطوار سے ہمارے سامنے مناسبات کا پورا ایک سلسلہ روشن ہوتا چلا جاتا ہے اور یوں پوری سماجی زندگی کا منظر نامہ ظہور کرتا ہے۔ کائنات عالم اکبر ہے اور انسان عالم اصغر۔ وہ سب کچھ جو کائنات کے دائرے میں افشا ہوتا ہے، عالم اصغر میں بہ صورت تصغیر پایا جاتا ہے۔ چناں چہ خارجی کائنات اور انسان کے داخل کے مابین تناسب کا ایک رشتہ ہے۔ بڑا کہانی کار اپنے تئیں اس تناسب کو جاننے اور بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ بیچ میں پورا ثمر بار شجر خوابیدہ ہوتا ہے تو اس تمثیل کا اطلاق کرتے

ہوئے کہا جاسکتا ہے کہ بعینہ ایک فرد (یا ایک کردار) میں پورا ایک سماج اور اس کی زندگی کا پورا ایک دائرہ مضمر ہوتا ہے۔ فرد اپنی ذات میں اپنے سماج کے امکانِ نمو کو ظاہر کرتا ہے اور کہانی کار اسی امکان کو رُو بہ عمل لاتا ہے۔ اسد محمد خاں کی کہانیاں ”باسودے کی مریم“ اور ”مسیٰ دادا“ فرد کے اسی امکان کو رُو بہ عمل لانے اور explore کرنے سے معرضِ اظہار میں آئی ہیں۔ اپنے اجمال میں ان کہانیوں نے کتنے ہی بڑے کرداروں اور ان کرداروں کے سماجی منظر نامے کی تفصیل کو سمیٹ لیا ہے۔ کہانی تلوار کی دھار پر سفر کرتی ہے۔ ایک طرف مذہبی اختلاف کا جہنم ہے تو دوسری طرف انسانیت کی ناپاس داری کا الاؤ۔ ایسے میں فن کی معراج یہ ہے کہ فن کار کو سلامت روی پار جاتا رہے۔

فلکشن کے عام مطالعات اور جائزوں میں زندگی کی عکاسی اور سماج سدھار بھاشن کا بہت کریڈٹ افسانہ نگار کو دیا جاتا ہے۔ تنقید نے بھی کیا کیا ڈھکوسلے بنائے ہیں۔ مغربی ادب میں یہ شوشہ رینے ساں کی دین ہے۔ ہمارے یہاں اس کی ابتدائی شکلیں تو سر سید احمد خاں کی اصلاحی تحریک کے زیر اثر سامنے آئی تھیں لیکن بعد ازاں سماجی حقیقت نگاری اور افادی ادب کے تصورات نے اس بدعت کو رائج کرنے میں بڑی مدد دی۔ ترقی پسندوں کی بدعتیں بھی ترقی یافتہ تھیں۔ تخلیقی فن کار کی فکری و فنی خود مختاری کا جو استحصال اس تحریک کے اثرات کے تحت ہوا، ویسا اس سے پہلے کبھی نہ ہو سکا تھا۔ بہر حال، اس حساب کو پھر کسی موقعے کے لیے اٹھا رکھتے ہیں۔ بات ہو رہی تھی ”باسودے کی مریم“ اور ”مسیٰ دادا“ کی۔ تو ٹھیک ہے کہ ان افسانوں میں ہمیں انفرادی کردار بھی ملتے ہیں اور ان کا وہ تفاعل بھی افسانے میں نظر آتا ہے جسے زندگی کی عکاسی سے عبارت کیا جاسکتا ہے لیکن ”یومِ کپور“، ”گھر“، ”ترلوچن“ اور ”براوو براوو“ ایسے افسانوں کی بابت کیا کہا جائے گا۔ یہ افسانے تو اسد محمد خاں نے محض بیانیے کی تکنیک میں لکھے ہیں۔ ان میں عمل اور ردِ عمل کی وہ صورتِ حال ہے ہی نہیں، جسے بیان کرنے پر افسانہ نگار کو عرفِ عام میں زندگی کی عکاسی اور سماج کی درستی کا کریڈٹ دیا جاتا ہے۔ صیغہ واحد متکلم یا کہانی کار کے سیدھے سادے بیانیے میں کہیں بھی زندگی کی کشاکش افسانے میں ظاہر نہیں ہوتی۔ تو کیا ان افسانوں کو پڑھ کر ہم افسانہ نگار سے وہ کریڈٹ واپس لے لیں جو ہم پہلے اسے دے آئے ہیں؟ یہ ہے وہ نظریاتی جبریت جس سے ادب و نقد کی شرمساری کا مرحلہ آغاز ہوتا ہے۔

دیکھیے، بات یہ ہے کہ لکھنے والے سے قاری کے جو بھی مطالبات ہوں وہ سر آنکھوں پر، لیکن افسانہ نگار کے فنی کمال کا تعین اس سے نہیں ہوتا کہ اس نے سماج کی کتنی زندہ تصویریں پیش کی ہیں یا یہ کہ معاشرے کے کتنے عیب گنوائے ہیں اور کس کس ثواب کو بیان کیا ہے؟ اس کا اصل کام یہ نہیں ہے، بلکہ دیکھنے کی بات یہ ہے کہ اس نے اپنے سماج، اپنی تہذیب، اپنی زندگی کے جو رخ پیش کیے ہیں اور جو تصویریں دکھائی ہیں، ان سے معافی کیا پیدا ہوتے ہیں؟ اور پھر یہ کہ جو معافی پیدا ہوتے ہیں، وہ کسی خاص مذہبی، فکری یا نظری دائرے میں انسانی احساس سے relate کرتے ہیں یا ان سے بلند ہو کر ہمیں بلا تفریقِ مذہب و نسل محض انسانی رویے اور طرزِ احساس کو سمجھنے کی راہ بچھاتے ہیں۔

کسی بھی جینیوئن افسانہ نگار کا یہ مسئلہ ہی نہیں ہوتا کہ وہ سماج کی تصویروں کا کوئی البم مرتب کرے۔ اسے براہِ راست نتائج یا منضبط خیالات سے کچھ بہت زیادہ دلچسپی بھی نہیں ہوتی اور نہ ہی اس کے فن کا کمال یہ ہے کہ وہ سماجی احوال کی کوئی سالانہ ریکارڈ بک ترتیب دے۔ اس کی توجہ تو ان روزمرہ تبدیلیوں پر مرکوز ہوتی ہے جو سماج کے اجتماعی شعور میں غیر محسوس انداز اور نہایت خاموشی سے رونما ہوتی چلی جاتی ہیں۔ یہ تبدیلیاں پہلے پہل پیدا تو افراد کی زندگی میں ہوتی ہیں لیکن دھیرے دھیرے یہ پورے سماج کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہیں۔ یہ تہذیبوں اور معاشروں کی کایا کلپ کا عمل ہے۔ بڑا تخلیقی فن کار اسی عمل کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش کرتا ہے اور یہی کوشش اس کے فن کا جواز قرار پاتی اور اس کی تخلیقی شخصیت کی شناخت بنتی ہے۔ وہ صحافی نہیں کہ ہم تک معاشرے کی روزمرہ خبریں پہنچاتا رہے، وہ مؤرخ یا واقعہ نگار بھی نہیں ہے کہ اپنے عہد کی تاریخ یا واقعات کو قلم بند کرتا رہے، وہ مصلح بھی نہیں ہوتا کہ اصلاحِ معاشرہ کے لیے قصے گھڑتا اور سماج سدھار اداروں کے لیے کام کرتا رہے۔ ہاں، یہ درست ہے کہ اس کے اندر یہ سب افراد اپنے احساسات اور مدرکات کے ساتھ کسی نہ کسی شکل میں موجود ہوتے ہیں لیکن کہانی کار ان تینوں میں سے کسی کے لیے کام نہیں کرتا، کام وہ اپنا ہی کرتا ہے۔ وہ ان تینوں کے مجموعے سے سوا ہوتا ہے۔ چنانچہ وہ صرف زندگی کو نہیں دیکھتا بلکہ اس کی نظریں اس کے ماسوا تک دیکھنے کی جستجو میں رہتی ہیں۔ یہ ورائے حیات کا نظارہ ہے، افراد کو اور سماج کو ان کے تہذیبی و ثقافتی منظر نامے میں دیکھنا۔

چھا تو اب آپ ”یوم کپور“ کے narrator کو دیکھیے، کیا اس کا گریہ ایک فرد کا

گریہ ہے؟ یا یہ صدیوں کا سفر کرتی تہذیب کے برگشتہ عنصر کا گریہ ہے جو اس تہذیب کی متوازی پگڈنڈی پر سفر کر رہا ہے۔ پھر ”باسودے کی مریم“ کی طرف آئیے۔ کیا مریم ہند اسلامی کلچر کی اس قوت کا استعارہ نہیں جو اپنے مرکز سے دور ہے، اس کے تاریخی و جغرافیائی فکر و فہم سے عاری ہے لیکن اس کے باوجود یہ قوت کھینچتی ہے اپنے مرکز ہی کی طرف۔ یہ رامیسٹرل ہے جسے زمانے کے سہاگے نے unpurify نہیں کیا ہے۔ اور وہ اس کا بیٹا ممدو... مریم کی معصوم روح کے لپٹن سے پھوٹا ہوا انحراف کا بیج جو عذاب کی طرح مریم کی جان سے ایسے لگا ہوا ہے کہ مرتا ہے اور نہ مانجھا دیتا ہے۔ ان دونوں کرداروں کے ساتھ اسد محمد خاں نے ہندو اسلامی کلچر کے جن زاویوں کو دیکھا ہے، ان کا بے حد بلیغ بیان اس افسانے کی اختتامیہ سطریں ہیں:

اماں حج کر کے لوٹیں تو بہت خوش تھیں۔ کہنے لگیں، ”منگلے میاں! اللہ نے اپنے حبیب کے صدقے میں حج کرا دیا۔ مدینہ طیبہ کی زیارت کرا دی اور تمھاری انا بوا کی دوسری وصیت بھی پوری کرائی۔ عذابِ ثواب جائے بڑی بی کے سر، میاں! ہم نے تو ہرے بھرے گنبد کی طرف منھ کر کے کئی دیا کہ یا رسول اللہ! باسودے والی مریم فوت ہو گئیں، مرتے وخت کہہ رئی تھیں کہ نبی جی سرکار! میں آتی ضرور مگر میرا ممدو بڑا حرامی نکلا۔ میرے سب پیسے خرچ کرا دیے۔

یہاں بھی یہ فقرے اپنے پورے معانی دیں گے لیکن افسانے کے تسلسل میں جب ہم ان اختتامی سطروں تک آتے ہیں تو افسانے کا ابلاغ ہمیں اس بلند سطح پر لے جاتا ہے جہاں ہم پر ادب کی ماہیت کھلتی ہے۔ انسان کے خارج کو رنگنا تو کوئی ایسا کام نہیں ہے، یہ کام تو سیاسی جماعتوں کے نعرے اور ٹیلی وژن کے نغمے بھی کر لیتے ہیں لیکن افسوس کہ کرنے والوں نے ادب سے کیا بھی تو ایسا سرسری اور چھوٹا مطالبہ کیا۔ ادب تو انسان کے باطن کو رنگتا ہے اور اس طرح رنگتا ہے کہ جیون کا رنگ ہی بدل جاتا ہے۔ ایسے افسانے تو انسان کے درون کو تغیر آشنا کرتے ہیں۔ اس کے اندر ایک نئے آدمی کو جنم دیتے ہیں۔ اس کی قلبِ ماہیت میں معاون ہوتے ہیں۔ ہاں، اندر کا تغیر ان امکانات کے بہ روئے کار آنے کا حوالہ ہے جو انسان کے نمو اور نئی صورت گری سے حیات و کائنات کی معنویت کا کوئی نیا پہلو سامنے لاتے ہیں۔ یہ کائنات ابھی نا تمام ہے شاید کی تفسیر ایسے ہی کرداروں سے تو ہوتی ہے اور وہ جو سمرسٹ مام

نے کہا تھا کہ یہ کائنات ایک بار وجود میں آ کر مکمل نہیں ہوئی بلکہ ہر نیا فن کار اسے نئے سرے سے تخلیق کرتا ہے، اس کے یہی معنی تو ہیں کہ ہر بڑا فن کار کچھ ایسے کردار تخلیق کرتا ہے جو اس کائنات کی نئی تفہیم اور از سر نو صورت پذیری میں کام آتے ہیں۔

اب ذرا ایک نظر ”مئی دادا“ کے مرکزی کردار پر بھی ڈالتے چلیے۔ مئی دادا کیا تھے؟ ہندو، سکھ، عیسائی، یہودی یا مسلمان، کیا تھے؟ افسانے کی فضا پہلے انھیں مسلمان دکھاتی ہے، پھر غیر مسلم کر ڈالتی ہے... اور آخر میں اس کے باوجود کہ وہ غیر مسلم ثابت ہو چکے ہیں اور خود انھوں نے اس کا اعتراف بھی کر لیا ہے:

”بھان کی گھوڑی مرتے مرتے کالک لگوا دی تو نے... لڑکے کیا سوچیں

گے؟“ پھر ان کے رونے کی آواز آئی۔ کچھ دیر خاموشی رہی۔ ”ٹھی ٹھی

ک ہے، تیلی کالمڈا پٹھانوں کے پالے سے پٹھان تو نہیں بن جاتا۔“

لیکن افسانے کا اختتامیہ، خاندان کے سب سے معتبر فرد سے بیان دلواتا ہے اور انھیں ایک بار پھر مسلمان بنادیتا ہے:

”... وہ کوئی بھی تھے، تمھیں بس ایک بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ تم سے

محبت کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ تم اپنے دادوں پر دادوں کی طرح

عزت کے ساتھ جینا سیکھ جاؤ... سمجھے! جاؤ اب کھیلو۔“ پھر وہ جاتے

جاتے غصے سے پلٹے، ”اور سنو، کون خبیث کہتا ہے وہ مسلمان نہیں تھے،

کون کہتا ہے پٹھان نہیں تھے؟“

کہیے کیا بات دھیان میں آئی؟ مئی دادا چاہے اور جو کچھ بھی تھے لیکن اصلاً وہ ہندو اسلامی کلچر کا ایک ایسا جیتا جاگتا کردار تھے جو خاص اسی تمدن کے سانچے میں ڈھلا ہوا تھا، جو اس تہذیب کے اُس جوہر کی نمائندگی کرتا ہے جس میں جذب ہونے اور جذب کرنے کی بے پایاں صلاحیت ہے، جو انسان کی سب سے بڑی جذباتی عصبيت یعنی مذہب تک کو پیچھے چھوڑ کر انسان کو اس کے خالص انسانی حوالے کی بنیاد پر اوپر اٹھالیتا ہے، اپنا بنا لیتا ہے۔ تو اسی جوہر کی بنیاد پر میں نے اسد محمد خاں کے افسانوں کو اور ان افسانوں کے کرداروں کو ہندو اسلامی کلچر کا نمائندہ کہا ہے۔ یہ کردار صدیوں میں مرتب ہونے والے تمدن نے پیدا کیے ہیں۔ ایک ایسے تمدن نے جس کی معاشرتی hierarchy میں انسانیت پہلے مرتبے میں آتی ہے، زندگی کے

باقی سب حوالے بعد کے مراتب میں آتے ہیں۔ یہ کردار اسی تمدن کی تمثیل ہیں۔ جی ہاں، عالمِ اصغر کا اثباتی مظہر۔

اب یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان گزگا جمنی کرداروں کی ماہیت کیا ہے؟ کیا وہ ہماری کسی ذہنی، جذباتی یا فکری ضرورت کو پورا کرتے ہیں؟

بات یہ ہے کہ ہمارا عہد تہذیبوں کے انہدام کا عہد ہے۔ سائنس کی ترقی اور ہماری زندگی میں اس کا بڑھتا ہوا دخل، گلوبل ویلج کی راہ ہموار ضرور کر رہا ہے، لیکن اس کے ساتھ ساتھ وہ ہمیں ایک ایسی معاشرت کی طرف لیے جا رہا ہے جس میں معاشروں کی تہذیبی شناخت ختم ہو جائے گی۔ اپنے اپنے معاشی مسئلوں کے حل اور وجودی مسرتوں کے حصول میں سرگرداں افراد کا ایک انبوہ کثیر اس گلوبل ویلج کی منزل مقصود ہے۔ ہم دیکھ سکتے ہیں کہ یہ انبوہ کثیر اپنی روح کے مطالبات سے ناواقف ہے یا ان سے آنکھیں چراتا ہے کہ ان کی آواز پر لبیک کہنا اس کی وجودی مسرتوں کو ملایا مٹ کر سکتا ہے۔ منہدم تہذیب اور منقسم شخصیات... یہ ہے ہمارا آئندہ۔ یہاں ہمیں ٹامس ہارڈی کے حوالے سے لکھا ہوا فرینک اوکانر کا وہ فقرہ یاد آتا ہے:

... دو تہذیبیں ٹکراتی ہیں تو یہ نہیں ہوتا کہ برتر تہذیب غلبہ پالے بلکہ ہوتا

یوں ہے کہ کم زور تہذیب اس کے بعد دلوں میں پناہ ڈھونڈ لیتی ہے۔

تو بس ہر عہد کا بڑا فلکشن اپنے ثقافتی کرداروں کے لیے جو پہلا کام کرتا ہے، وہ یہی ہے کہ انھیں دلوں میں پناہ ڈھونڈ دیتا ہے۔ لہذا باسودے کی مریم اور مئی دادا ایسے ہی کردار ہیں اور اسد محمد خاں نے انھیں جس طرح تراشا اور پیش کیا ہے تو اب چاہے وہ ہماری خارجی زندگی کے مصرف کے نہیں رہے لیکن داخلی ضرورت کو ضرور پورا کرتے ہیں۔ اسی ضرورت سے ان کرداروں کی ماہیت طے ہوتی ہے۔ ان افسانوں اور ان کرداروں کے ذریعے فن کار ایک کام تو یہ کرتا ہے کہ ایک طرزِ معاشرت اور ایک تہذیب کو sterilize کر کے محفوظ کر لیتا ہے اور دوسرا کام یہ کرتا ہے کہ ہمیں دوسروں کی زندگی کے وجودی تجربے کو احساس کی سطح پر live کرنے کا موقع فراہم کرتا ہے۔ اس لیے کہ جو تہذیب اور جو کردار اس نے اپنی کہانیوں میں محفوظ کیے ہیں، وہ آرکائیوز اور نیشنل میوزیم میں رکھی ہوئی اشیا کی طرح حنوط کیے ہوئے نہیں ہیں۔ اس کے یہاں تو جو کچھ ہے، زندہ ہے اور اس طرح زندہ ہے کہ اس کا لمس تک

محسوس کیا جا سکتا ہے۔ ”باسودے کی مریم“ اور ”مسیٰ دادا“ تو اسد محمد خاں کے فنی سفر کے ابتدائی سنگِ میل ہیں، آپ وہاں سے آگے کے افسانوں ”نربدا“، ”موتبر کی باڑی“، ”ایک دشت سے گزرتے ہوئے“ اور ”ندی اور آدمی“ تک چلے آئیے۔ آپ کو ہر جگہ احساس کی ایک ایسی لہر موجزن ملے گی جو بیک وقت وجود اور روح کی سطح پر زندگی کے تجربے کو بیان کرتی نظر آتی ہے۔ ایک ایسے intense تجربے کو جو خود آپ کا نہیں ہے لیکن معنویت کے کسی نہ کسی دائرے میں آپ اس سے خود کو شدت کے ساتھ identify ضرور کرتے ہیں۔

میں نے اوراقِ گزشتہ میں ایک مقام پر حقیقت اور زندگی کی عکاسی کا نعرہ بلند کرنے والوں کو گدگدایا ہے۔ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ میں ادب میں حقیقی زندگی کے عکس و آہنگ کی پیش کش کے خلاف ہوں۔ نہیں، بلکہ میرا اختلاف تو اس تصور سے ہے جو حقیقت یا زندگی کی عکاسی کے حوالے سے اس قسم کی فرمائش کے پس منظر میں کام کرتا ہے۔ قصہ یہ ہے کہ کہانی کار کا شعور مکمل طور پر اس کے دماغ اور مشاہدے کا مرہونِ منت نہیں ہوتا بلکہ انسانی وجود کے ہر رگ و ریشہ سے جو احساسات و مدرکات ترتیب پاتے ہیں اور پھر روح ان احساسات و مدرکات کو اپنے جو معنی دیتی ہے، ان سب کے مجموعے سے کہانی کار کا شعور مرتب ہوتا ہے۔ لہذا وہ جس حقیقت کا سراغ لگاتا اور اظہار کرتا ہے، اس کی تفہیم محض تعلقات کی مدد سے نہیں ہو سکتی۔

حقیقت نگاروں کا مسئلہ یہی ہے کہ وہ سامنے کی چیزوں اور عقلی تناسبات میں اس درجہ الجھ جاتے ہیں کہ ورائے عقل حقائق تک ان کی رسائی ہو ہی نہیں پاتی۔ سماجی رابطے کا اُتھلا پن اور جذباتی رشتوں کی کچی باتیں وقت گزاری کے مشغلے کے لیے کہانیاں پڑھنے والے قارئین کو پسند آ سکتی ہیں کہ ان کا بنیادی مسئلہ (time killing) اس قسم کی باتوں سے حل ہو جاتا ہے لیکن وہ سنجیدہ قاری جو کہانی پڑھنے سے پہلے بھی اور اس کے بعد بھی اپنے مطالبات رکھتا ہے، ان کہانیوں سے اس کی تشفی نہیں ہو سکتی۔ ادب کا سنجیدہ کہانی کار time killing اور recreation of life کے بنیادی فرق کو بہت اچھی طرح سمجھتا ہے۔ آپ اسد محمد خاں کے افسانے ”فورک لفٹ ۳۵۲ حمود الرحمن کمیشن کے روبرو“، ”طوفان کے مرکز میں“ اور ”وقائع نگار“ پڑھیے اور دیکھیے کہ ہماری ہم عصر سماجی سیاسی زندگی کے کیا کیا احوال و آثار ان افسانوں میں بیان ہوئے ہیں۔ لیکن ان افسانوں میں وہ سماجی حقیقت نگاری کہیں نہیں ملتی جو مثال کے طور پر رضیہ بٹ، سلمیٰ کنول اور بشریٰ رحمن کی ’معاشرتی کہانیوں‘ میں نظر آتی ہے۔

اصل میں سماجی حقیقت نگاری کا وہ مطالبہ جو کبھی ترقی پسندوں نے کیا تھا، اس کے تو شاید پھر بھی کوئی معانی تھے اور اس تحریک کے زیر اثر بعض سنجیدہ لکھنے والوں نے اس مطالبے کو فنی تناظر میں ہی قبول بھی کیا تھا لیکن آج تو اس مطالبے کا مطلب سوائے اس چٹخارے کے اور کچھ رہا ہی نہیں جو ٹیلی وژن کے مقبول رومانی ڈراموں یا ڈائجسٹ کے سلسلوں میں پایا جاتا ہے۔ اہل نظر نے اس نوع کی چیزوں کو ہمیشہ لچرپن کا عنوان دے کر الگ رکھا ہے لیکن افسوس کہ آج کی سماجی حقیقت نگاری اور معاشرتی کہانیاں اسی مفہوم و مطلب کی حامل ہو کر رہ گئی ہیں۔ تاہم سنجیدہ لکھنے والے آج بھی پاپولر کہانیوں کے طومار سے الگ ہیں۔ آپ اسد محمد خاں کے ان تینوں افسانوں کا مطالعہ کیجیے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ ادب کے شعور سے بہرہ مند فن کار اپنے موضوع کے انتخاب ہی میں نہیں اس کے برتاؤ میں بھی کن لوازم کو پیش نظر رکھتا ہے۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ ادب تاریخ نہیں ہوتا لیکن کبھی وہ تاریخ کے لیے raw material فراہم کرتا ہے اور کبھی تاریخ کی چھان پھٹک کے لیے وہ parallel history کی دستاویز مرتب کرنے میں معاون ثابت ہوتا ہے، سو اسد محمد خاں کے مذکورہ بالا تینوں افسانے کچھ اسی نوع کا کام کرتے نظر آئیں گے۔ یہ تینوں افسانے مختلف المزاج ہیں۔ اس کا ایک سبب تو یہ ہے کہ تینوں مختلف واقعات کے تناظر میں لکھے گئے ہیں لیکن اس کے علاوہ اہم ترین بات یہ ہے کہ افسانہ نگار نے ان کی الگ الگ زمانی واقعت اور مکانی حوالوں کو معرض اظہار میں لانے کے لیے ایسے اسالیب وضع کیے ہیں کہ حقائق نہ تو افسانے کو خراب کرتے ہیں اور نہ ہی افسانہ حقائق کو مسخ کرتا ہے۔ ان میں بعض مقامات پر افسانوں کی بالکل داخلی ضرورت کے تحت حقیقت اور علامت کا ایک آمیزہ افسانے کے قالب میں ڈھلتا محسوس ہوتا ہے اور کہیں کہیں سادہ بیانیے میں ہلکے رنگوں کا satire اسلوب میں شامل ہو جاتا ہے۔ ایسے مقامات فن اور فن کار کی کڑی آزمائش کے مراحل ہوا کرتے ہیں۔ ذرا سی فنی کم زوری افسانے کو سیاسی نعرہ بنا کر رکھ دیتی ہے یا پھر افسانہ نگار کی ذرا سی بے احتیاطی سے افسانہ تیسرے درجے کے جذباتی ملغوبے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ اسد محمد خاں کے افسانے اس قسم کی کسی پینک میں نظر نہیں آتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انھوں نے واقعات اور حقائق کو کبھی over play نہیں کیا اور نہ ہی افسانے کو بھاشن دینے کے لیے استعمال کیا ہے، مزید برآں یہ کہ انھوں نے اپنے فن کو نظریاتی آلودگی سے بھی محفوظ و مامون رکھا ہے۔

دیکھیے، یہاں مجھے خیال آتا ہے کہ میں ”چاکر“، ”مردہ گھر میں مکاشفہ“، ”ہٹلر، شیر کا بچہ“، اور ”ایک دشت سے گزرتے ہوئے“ کا حوالہ دوں بلکہ صرف انھی کا نہیں، طوائفوں کے حوالے سے لکھے گئے افسانوں (مثلاً ”برجیاں اور مور“، ”اک بیٹھے دن کا انت“، ”نصیبوں والیاں“ وغیرہ) کا بھی ذکر کروں اور ان کے حوالوں اور مثالوں سے واضح کروں کہ اسد محمد خاں نے زندگی کے حقیقی کرداروں، واقعات، معاملات اور مسائل کو کس طرح اپنے افسانوں میں برتا ہے لیکن فی الحال بہت تفصیل و طوالت سے حذر کرتے ہوئے بس دو ایک حوالوں پر اکتفا کرتا ہوں:

رمجونے پیسے لے لیے۔ دیدے گھما کے بولا، ”سلام کائے کو کہلوارئی ہو، دُعا دو۔ دونوں عمر میں چھوٹے ہوں گے تم سے۔“
دڈی پلو سے آنکھیں پونچھ رہی تھی۔ سراٹھا کے بولی، ”ہوں گے کیا، پاگلا! دونوں ہی عمر میں چھوٹے ہیں۔ پرگن وان اور کلاؤنت اپنے کاموں سے بڑے ہوتے ہیں۔ حبیب خاں جس ویلے وینا پہ ہاتھ رکھ دیں یا اللہ رکھا خاں صاحب طبلے کو انگلیاں ٹھوادیں تو سمجھو اس ویلے سب کے بزرگ بن جاتے ہیں۔ سمجھا کچھ؟“

(اک بیٹھے دن کا انت)

ایک اور اقتباس دیکھیے:

شاہ زیب نے ملزم کی ہتھ کڑیوں کا تالا اور بیڑیوں کے ریپٹ کھول دیے۔ ”ضابطے کے تحت اسے وقوعے کی جگہ پر ادھر ہی دشت میں دفن کیا جاسکتا ہے۔ ویسے بھی حکم ہے کہ جلدی کرنی چاہیے... پر آگے جو بھی آرڈر ہو۔“ ملاں نے کہا۔

دور درختوں میں تین پرچھائیاں رُکی ہوئی تھیں۔ ان میں سے دو مردوں کی پرچھائیاں تھیں، تیسری ایک عورت کی۔ وہ اتنی دُھندلی تھیں اور ایسے لرزتی تھیں کہ ان کے پار دشت کا سب کچھ نظر آتا تھا، بالکل اسی طرح جیسے روہیں سچسٹ کرتے ہوئے فلم کے ڈبل ایکسپوژر میں پرچھائیاں دکھلائی جاتی ہیں تو ان کے پار بھی سب کچھ نظر آتا ہے۔

نہیں کہا جاسکتا کہ وہ تین، جواب مل کے بھی ایک زندہ جاوے نہیں بن سکتے تھے، کیا کریں گے؟ آگے کہاں جائیں گے؟ بس، دشت کے آف سیٹ میں وہ وہیں رُکے ہوئے تھے۔

اور تبھی کھلا کہ جب کوئی امنگوں بھرا جوان مرتا ہے تو ایک دوست اس کا اور ایک داشتہ اُسی کے ساتھ مر جاتے ہیں۔

(ایک دشت سے گزرتے ہوئے)

پہلے ذرا ”اک بیٹھے دن کا انت“ کے اقتباس کو دیکھیے۔ اتنا تو اس ٹکڑے میں انداز ہو جاتا ہے کہ ایک کوٹھے والی استادوں کو نیاز گزار رہی ہے۔ یوں تو یہ بس ایک عام سی بات ہے۔ ہر شعبے میں بڑوں کو بعد میں آنے والے خراج عقیدت پیش کرتے ہی ہیں لیکن کوٹھے والوں کا رکھ رکھاؤ اور ان کی ریت رسم تو ہوتی ہی کچھ اور ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ ان فقروں میں ادا کیے گئے احساسات کے معافی انھی لوگوں پر کھل سکتے ہیں جو کوٹھے کے کلچر سے واقف ہوں لیکن اتنی بات تو ہم سبھی سمجھ سکتے ہیں کہ اس گئے گزرے زمانے میں کہ جب کوٹھوں کی تہذیب رخصت ہو چکی، اب تک وہاں یہ چلن باقی ہے کہ بڑوں کی نذر نیاز اور ادب احترام کانوں کی لوئیں چھو کر کیا جاتا ہے۔ یہ کسی شخص کا نہیں بلکہ اُس کے گنوں کا اعتراف ہے۔ آدمی کی قدر و منزلت کسی اور شے میں نہیں اس کے کمال فن میں مضمر ہوتی ہے۔ بڑا تو آدمی کو اس کا کام بناتا ہے۔ یہ اعتبار کی دنیا ہے۔ بظاہر ایک چٹخارے کے ساتھ شروع ہوتی اور آگے بڑھتی اس کہانی کے عقب میں جھانک کر دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ افراد کی توقیر ہی میں نہیں، خود اُن کے رویوں کی تشکیل میں بھی معاشرے کی تہذیب و ثقافت کس طرح اثر انداز ہوتی ہیں۔ بلند ترین تصورات کی سطح سے لے کر ارذل و اسفل شعبوں تک حفظِ مراتب کا یہ پورا نظام کام کرتا ہے۔ اسد محمد خاں کے فن میں ہمیں اپنی ثقافتی اقدار کی ایسی ایسی متحرک تصویریں مل جاتی ہیں جو اب معاشرے میں مفقود ہو چکی ہیں۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ اسد محمد خاں نے ان تصویروں کو اچھائی اور برائی کے لیبل لگائے بغیر دکھانے یا محفوظ کرنے کی کوشش کی ہے اور یہی فن کا اصل مقصود ہوتا ہے۔

دوسرا اقتباس جس کہانی سے لیا گیا ہے وہ تو اپنی تکنیک میں بھی ایک نہایت عمدہ تجربہ ہے۔ ماضی و حال کے منظروں، کرداروں کی داخلی و خارجی صورتِ حال اور اُن کے احساس و حقیقت کو جس خوبی کے ساتھ اسد محمد خاں نے بلینڈ کیا ہے، اُس سے افسانے میں

معانی کی مختلف جہتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔ اس افسانے کی خاص بات یہ ہے کہ یہ اگر ایک طرف علامت اور تجرید کے الگ الگ تناظرات میں اپنے معانی متعین کرنے میں کامیاب رہتا ہے تو دوسری طرف حقیقت نگاری کے حوالے سے بھی اسے ایک عمدہ مثال قرار دیا جاسکتا ہے۔ اسد محمد خاں نے افسانے کو جس طرح conclude کیا ہے، اُس سے اس میں ایک سیاسی جہت بھی نمایاں ہو جاتی ہے۔ اب افسانے کے معانی بالکل بدل جاتے ہیں۔ افراد کی بے بسی اور سفاکی کا وہ رویہ جو گاہ گاہ افسانے میں ہمارے سامنے آتا رہا ہے، اب اُس کا مفہوم ہم واضح طور پر سمجھ سکتے ہیں... اور اس کے تضاد میں دوست اور داشتہ کی شخصیات کو جس طور پیش کیا گیا ہے، وہ ان کرداروں کی انسانیت کو نہایت شدت کے ساتھ اُجاگر کرتا ہے اور تہذیبِ نو کے آئین اور اصولوں کے آگے سوالیہ نشان لگا دیتا ہے۔

بات یہ ہے کہ اسد محمد خاں کا افسانہ خواہ وہ ”وقائع نگار“ ہو، ”طوفان کے مرکز میں“ ہو، ”مردہ گھر“ ہو، ”اک میٹھے دن کا انت“ یا ”ایک دشت سے گزرتے ہوئے“... ان کے یہاں ہمیں کسی بھی مقام پر نہ تو سیاست و تاریخ پڑھنے کو ملتی ہے اور نہ ہی صرف زندگی... بلکہ ہم ان کے افسانوں میں افسانے ہی پڑھتے ہیں۔ جی ہاں، افسانے... جو ادب ہیں اور وہ ادب جو ہمیں مسکن ادویات کی طرح entertain نہیں کرتا بلکہ ہمارے احساس کے تاروں کو جھنجھنا دیتا ہے اور ہمیں زندگی کے سوالوں پر سوچنے کی راہ دکھاتا ہے۔ ان افسانوں کا لکھنے والا نہ تو خود at ease ہے اور نہ ہی ہمیں at ease رہنے دینا چاہتا ہے۔ اس سہمہ راست زندگی کو نہیں لکھا، نہ ہی رومانس کی نیلگوں فضائیں اس کے افسانوں کے موسموں میں رنگ بھرتی ہیں اور نہ ہی حیاتِ انسانی کے دکھوں، محرومیوں اور نارسائیوں کو glamourize کرنے میں اس نے اپنے فن کا آب و رنگ خرچ کیا ہے۔ وہ زندگی کو نہ تو equations میں سوچتا ہے اور نہ ہی لکھتا ہے۔ وہ نہ تو کسی نظریے کا طرف دار ہے اور نہ ہی کسی اخلاقی منصوبے کا نمائندہ۔ کسی قسم کی اخلاقی کارگزاری، نظریاتی آسودگی یا جذباتی تسکین کی خاطر کہانیاں پڑھنے والے لوگوں کو اسد محمد خاں کے افسانے پڑھ کر سخت مایوسی ہوگی۔ اسد محمد خاں ہمارے عہد کے اُن لکھنے والوں میں ہیں جو زندگی اور اس کے مظاہر کو دیکھتے ہیں تو سوالوں سے دوچار ہوتے ہیں اور ان کا فن ان سوالوں کا سامنا کرنے کی جرأت سے پیدا ہوتا ہے۔ ایسے لوگ لکھتے ہوئے عوام الناس کی خواہشات اور مطالبات کو نہیں بلکہ اپنے فن کے تقاضوں اور فکر کے زاویوں کو سامنے رکھتے ہیں۔

ان کا افسانہ اپنے اظہار و ابلاغ میں زندگی کے عام سے تناظر اور معمولی مسائل سے شروع ہو کر ورائے ادراک حقائق کی طرف اپنے پڑھنے والوں کو لے کر چلتا ہے۔

دیکھیے، بات یہ ہے کہ کہانیاں ہمیں ایک زندگی میں ایک سے زیادہ زندگیاں جینے کا موقع فراہم کرتی ہیں۔ کس طرح؟ یوں کہ ان کے احوال و کوائف سے ہم identify کرتے ہیں، اپنے احساس کو، اپنی سوچ کو، اپنے وجود کو... اور اپنی روح کو۔ اسد محمد خاں کا افسانہ ایک ایسے آمیزے کی صورت رکھتا ہے جس کے تمام عناصر ایک خاص تناسب کے ساتھ گوندھے گئے ہیں... لیکن انھیں الگ الگ کر کے شناخت کرنا ممکن نہیں... ہماری زندگی کے اپنے آمیزے کی طرح کہ اس کی ساری رونق، چاشنی اور رنگ و آہنگ جو کچھ بھی اس میں ہے، وہ اصل میں اس کی کلیت میں ہے۔ کسی بھی لکھنے والے کے یہاں یہ صورت اس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ زندگی کو کسی آدرش، کسی نظریے، کسی ایجنڈے کے تحت نہیں دیکھتا اور نہ ہی ایسی کسی خارج سے عائد ہونے والی cause کو serve کرنے کی خاطر لکھتا ہے بلکہ یہ صورت تو اُس وقت پیدا ہوتی ہے جب وہ تجربہ حیات کو اور انسانوں کو خود ان کی اصل حالت پر قبول کرنے لگتا ہے، نہ اس سے زیادہ اور نہ اس سے کم۔ میں یہ نہیں کہہ رہا کہ لکھنے والے کے اپنے تعصبات نہیں ہوتے یا یہ کہ وہ کوئی ترجیحات نہیں رکھتا یا یہ کہ وہ جب لکھنے بیٹھتا ہے تو اپنے تعصبات اور ترجیحات کو یکسر ترک کر دیتا ہے۔ نہیں، ایسا نہیں ہے۔ یہ تو پیغمبرانہ شان ہے۔ ہاں، اس شان میں سچے اور بڑے لکھنے والے کا اتنا حصہ ضرور ہوتا ہے کہ وہ اپنے تعصبات اور ترجیحات کے پورے نظام کو اپنی تحریر میں suspended حالت میں ظاہر کرتا ہے... وہ بھی اگر ظاہر کرنا از بس ضروری ہو تو۔ اسی خصوصی استعداد کی بنا پر وہ دوسروں کو جو، جہاں اور جیسا ہے کی بنیاد پر قبول کرتا ہے اور باور کرتا ہے کہ ہر انسان میں احساس اور عمل کا نظام بیک وقت اچھائی اور برائی کے متضاد رویوں کے تحت کام کرتا ہے۔ اسد محمد خاں کے افسانوں میں ہمیں خراب جگہوں اور خراب لوگوں میں جو ایک خوبی یا اچھائی کی اچانک جھلک دکھائی دے جاتی ہے یا کہیں اچانک اچھائیوں کے جھر مٹ میں چھپی ہوئی برائی نظر آ جاتی ہے تو اس کا سبب یہی ہے کہ انھوں نے اپنے کرداروں کو انسانی سطح پر دیکھا اور انسانی حوالوں سے برتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانی کیمسٹری کسی ملٹی نیشنل میڈیسن کمپنی کی کیمسٹری لیب کے نتائج کی پابند نہیں ہوتی۔ وہ اپنے نتائج اپنے اصولوں کے تحت ترتیب دیتی ہے، proto types کے تحت

نہیں۔ آپ چیخوف کے افسانوں میں دیکھیے، کیسے کیسے کردار نظر آتے ہیں۔ نہایت زندہ کردار مگر زندگی کی عین مطابقت میں نہیں... کہیں اس سے زیادہ اور کہیں اس سے کم۔ آپ چیخوف کی ایک کہانی کے اُس کو چوان کو یاد کیجیے جو سارا دن لوگوں کے ساتھ گزارتا ہے، صبح سے شام تک مسلسل لوگوں کے بیچ... لیکن سخت تنہائی کے احساس سے دوچار۔ لوگ اس سے باتیں کرتے ہیں، وہ بھی ان سے بات کرتا ہے لیکن وہ بات جو وہ بتانا چاہتا ہے، نہیں بتا پاتا... اور پھر جب رات میں وہ اپنے گھوڑے کو تھان پر لا کر کھولتا ہے تو اس سے اپنی بات کہتا ہے۔ دیکھیے، کہانی کے اختتام پر لا کر چیخوف نے پورے معاشرے کے بیچ فرد کی تنہائی کو کتنا بڑا اور کتنا حقیقی بنا دیا ہے۔ کیا یہ تنہائی واقعی اتنی ہے جتنی کہ ہم زندگی میں دیکھتے ہیں؟ نہیں، یہ اس سے کہیں زیادہ بڑی ہے۔ میں نے ابتدا میں بتایا کہ پہلے پہل مجھے اسد محمد خاں کے کردار بالکل حقیقی زندگی کے مماثل نظر آئے، لیکن بعد میں مجھے اپنی رائے تبدیل کرنی پڑی۔ اب میں سمجھتا ہوں کہ یہ کردار حقیقی زندگی کے کرداروں سے کہیں کہیں بڑے ہو جاتے ہیں، خاصے بڑے۔ میں اسد محمد خاں کو اردو کا چیخوف نہیں بنا رہا ہوں محض مناسبات کی نشان دہی مقصود ہے، آپ اسد محمد خاں کا افسانہ ”طوفان کے مرکز“ میں پڑھیے اور دیکھیے کہ افسانہ نگار نے زندگی کے integrated vision کے ٹوٹنے کے عمل کو کس طرح مجسم کر دیا ہے۔ اسی طرح ”موتیر کی باڑی“ میں دیکھیے، اختتامیہ ساری دُبدھا کو کیسی reality میں منقلب کرتا ہے... انسانیت اور محبت کا اصل روپ کس طرح بے نقاب اور بے حجاب ہو کر ہمارے سامنے آٹھرتا ہے۔ تو یہاں آکھو ہمیں تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ فن زندگی کے اسکیل پر خود زندگی سے بڑھ جاتا ہے۔ افسانے کی سچائی زندگی کی سچائی سے زیادہ بڑی اور زیادہ نمایاں ہو جاتی ہے۔

یہاں اہم سوال یہ ہے کہ فن larger than life کیسے ہو جاتا ہے؟ ایسے ہو جاتا ہے کہ وہ ورائے زمان و مکاں سفر کرتا ہے اور اپنے ساتھ ساتھ خود تجربہ حیات کی نئی معنویتیں دریافت کرتا چلا جاتا ہے۔ اس میں فرد کی سچائی absolute انسانی سچائی میں ڈھل جاتی ہے اور یہ سچائی کسی تہذیبی، سماجی، تاریخی اور سیاسی حوالے کے بغیر بھی ہم سے اپنا اثبات کراتی اور رشتہ استوار کر لیتی ہے۔ آپ ”زبداء“، ”رگھوبا اور تاریخ فرشتہ“، ”جانی میاں“ اور ”ایک دشت سے گزرتے ہوئے“ کے کرداروں کو ملاحظہ کیجیے۔ کیسے دلچسپ تضادات کی دنیا اور گہرے انسانی رویوں کا منظر نامہ اجاگر ہوتا ہے۔ کئی مقامات پر ہم ان کرداروں اور ان کی

صورتِ حال سے یوں مربوط ہو جاتے ہیں کہ ان کے تجربے اور احساس کی گواہی دینے لگتے ہیں۔ نارنگ سنگھ، سارنگ سنگھ اور لڑکی (نربدا)، رگھوبا، گسم چند، امّے (رگھوبا اور تاریخ فرشتہ)، جانی میاں، ریٹا بائی، وحید، سلطان بھائی (جانی میاں)، جاوا، سگاں، اللہ بخش کالا ناگ (ایک دشت سے گزرتے ہوئے) ذرا ان کرداروں کو دیکھیے... ویسے یہاں پہلے میں ایک بات واضح کردوں کہ بہت ہاتھ کھینچ کر گنائے ہیں میں نے یہ کردار، ورنہ اسد محمد خاں کی کہانی چاہے وہ مکمل narration ہی میں کیوں نہ ہو، اس کے کرداروں سے صرف نظر کرنا ممکن نہیں۔ خیر، تو جب ہم ان کرداروں کا مطالعہ کرتے ہیں تو انسانی فطرت کی شیرینی، حلاوت، تلخی، تیزی، ترشی اور نمک، غرض ہر ذائقہ، الگ الگ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اب لطف کی بات یہ ہے کہ ان میں بعض کردار تو ایسے ہیں کہ بیک وقت تلخ، ترش، شیریں محسوس ہوتے ہیں۔ میں نے آغاز میں کہا تھا کہ اسد محمد خاں کے جہانِ افسانہ و افسوں میں ہمارا واسطہ ایسے لوگوں سے پڑتا ہے کہ اچھوں میں گئے جائیں مگر بُروں میں بھی الگ نہیں لگتے... ساتھ ہی ساتھ بُروں میں ایسی اچھائیاں کرنے والے بھی نظر آتے ہیں کہ انسانیت کی مثال ٹھہرائے جائیں۔ تو اسد محمد خاں کے فن کا امتیاز اصل میں یہی ہے کہ مسلسل suspension of belief پر اصرار کرتا ہے۔ یہ کردار زندگی کی عکاسی تو کرتے ہیں لیکن محض زندگی کی عکاسی معراجِ فن نہیں ہے۔ فن کا کمال تو یہ ہے کہ وہ جو سامنے نظر آ رہا ہے، اس کے پس منظر کی خبر لے آئے... وہ جو اصل دکھائی دے رہا ہے، اس کی بنیاد کا سراغ پالے اور اس سے بھی آگے یہ کہ اُس کے گزشتہ کو حال ہی سے نہیں، آئندہ سے بھی مربوط کر کے دکھائے۔ یہی ہے فن کو larger than life بنانے والی reality۔ سارنگ سنگھ، رگھوبا، امّے، جانی میاں، جاوا، اللہ بخش کالا ناگ... دیکھیے تو سہی کہ صرف انسان کی نہیں بلکہ انسانیت کی کیسی کیسی حقیقتوں کے مظہر ہیں یہ کردار۔ اُن حقیقتوں کے جن کو سہارتے ہوئے خود زندگی پچک جاتی ہے، چیس بول جاتی ہے۔ اس لیے کہ یہ لوگ اپنی جگہ سے سرکتے ہیں تو سماج کی چولیس ہل جاتی ہیں۔ حالاں کہ یہ کردار نہ تو کسی سماجی و سیاسی نظام کے نمائندے ہیں اور نہ ہی کسی اخلاقی و تہذیبی فکر کے رول ماڈل۔ بس انسان ہیں... انسان کا وہ سانچہ کہ جس کی realities سے دوسرا انسان باوجود اختلافات اور ناپسندیدگی کے، خود کو associate کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اس لیے نہیں رہ سکتا کہ یہ کردار اپنی اچھائی اور برائی کے دائرے میں فطرتِ انسانی کو کھولتے ہیں...

generic انسان کو decode کرتے ہیں۔

اسد محمد خاں کے فن کی بنیادی جستجو اصل میں انسان کو اس کی سرشت میں مثبت و منفی علاقے کے ساتھ سمجھنے سے عبارت ہے۔ ہم ان کے پورے فنی سفر کو سامنے رکھ کر اس نکتے کو بہتر انداز میں سمجھ سکتے ہیں۔ ان کے پہلے مجموعے ”کھڑکی بھر آسمان“ کے افسانے ہوں جو افراد اور ان کے شخصی کردار کو موضوع بناتے ہیں یا دوسرے مجموعے ”برج خموشاں“ کے افسانے کہ جن میں حالات اور واقعات پر کرداروں کی بہ نسبت افسانہ نگار کی توجہ زیادہ محسوس ہوتی ہے... اور آخری دونوں مجموعوں ”غصے کی نئی فصل“ اور ”نربدا اور دوسری کہانیاں“ میں تو خیر اب ان کی کہانی بنتی ہی افراد اور اس کے ماحول کے ایسے تال میل سے ہے کہ دونوں کو ایک دوسرے سے الگ کر کے دیکھنا محال ہے۔ لیکن از اوّل تا آخر ہم ایک بات بخوبی محسوس کر سکتے ہیں کہ اسد محمد خاں نے خواہ افراد کی کہانیاں لکھی ہوں یا ماحول کی یا پھر دونوں کے گھال میل سے قصہ بنایا ہو لیکن ان کی خاص توجہ اصل میں فرد کی اس سرشت پر رہتی ہے جو نیکی میں بدی اور بدی میں نیکی کے اصول خود بناتی اور ان کے تحت کام کرتی ہے۔ ان اصولوں کی ہماری سماجی صورتِ حال، اخلاقی اور اقداری نظام سے کوئی relevance ہوتی ہے یا ہو سکتی ہے تو وہ محض انسانی اور اتفاقی ہے۔ ہم اسد محمد خاں کے کرداروں کی اکثریت کو اچھا کہیں یا بُرا لیکن اتنی بات ہمیں بہر طور تسلیم کرنی پڑتی ہے کہ یہ کردار پوری سچائی کے ساتھ نظر آتے اور زندگی کو پورے وجود سے بسر کرتے ہیں۔

اسد محمد خاں کے جہانِ افسانہ میں ہمیں رذیل اور کمینے لوگوں سے زیادہ واسطہ پڑتا ہے۔ اس کا کیا سبب ہے؟ بات یہ ہے کہ انسان کا خمیر اٹھا تو خیر سے ہے لیکن اس کے ساتھ نفس کا جو لازمہ لگا ہوا ہے وہ بدی کو کسی لمحے اس سے الگ ہونے کا موقع فراہم نہیں کرتا۔ ادب و فن کا کلاسیکی تصور انسان میں خیر کے عنصر کو غالب سمجھتا اور غالب پیش کرتا ہے جب کہ نئے ادب کا مسئلہ یہ ہے کہ یہ خیر کا انکار تو نہیں کرتا لیکن یہ انسان کے اندر خیر کو غالب بھی نہیں سمجھتا۔ اس نے زندگی کو خیر و شر کی آویزش میں دریافت کیا ہے اور شر کو خیر پر غلبہ پاتے دیکھا ہے۔ چنانچہ اسد محمد خاں، کہ جدید عہد کے افسانہ نگار ہیں، انھوں نے اپنے فن میں جو انسانی صورتِ حال پیش کی ہے وہ خیر و شر کے اسی نئے تصور کے تحت وقوع پذیر ہوتی ہے۔ اور یہاں ہمیں اس حقیقت کو بھی پوری سچائی کے ساتھ تسلیم کرنا چاہیے کہ انسانی فطرت میں داخل شر کے

عنصر کا جو اظہار ہمارے عہد کی زندگی میں ہو رہا ہے وہ غالباً اس سے قبل کی انسانی تاریخ میں نظر نہیں آتا۔ اس عہد میں بدی زیادہ طاقت ور ہی نہیں ہوئی ہے بلکہ اس سے کہیں زیادہ ہول ناک بات یہ ہے کہ اس نے نیکی پر غلبہ پانے کے لیے خود نیکی کے اوزاروں کو بھی استعمال کرنا سیکھ لیا ہے۔

اب آخر میں آکر میں ضمناً اسد محمد خاں کے بارے میں سامنے آنے والے دو ایک تاثرات پر بھی اظہار خیال کرنا چاہوں گا۔ اسد محمد خاں کے افسانوں کی بابت ایک رائے یہ پائی جاتی ہے، اور اس کا اظہار نہایت خوشی کے ساتھ کیا جاتا ہے، گویا ایسا ان کی کسی خوبی کے اعتراف میں کیا جا رہا ہے اور اس کا جواز ان کی ”پٹھانیت“ کو قرار دیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ ان کے افسانوں میں غصے کی ایک لہر کو ہمہ وقت دوڑتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے۔ اسی طرح ان کے ایک مداح نے ان کے طوائفوں والے افسانوں کے لیے وفور جذبات میں یہ بھی کہا کہ افسانے میں بجلیاں سی دوڑتی محسوس ہوتی ہیں۔ سبحان اللہ، جیسی جس کے گمان میں آئی۔ یاروں کے کھیل نرالے، کہیں فن میں بھی نسلی تعصب کی گنجائش نکال لیتے ہیں اور کہیں اپنے ناگفتہ جذبوں کی تھکن دور کرنے کے لیے افسانے سے وہ نسخہ کیمیا برآمد کر لیتے ہیں جو رگ و پے میں بجلیاں دوڑا سکتا ہے۔ اصل میں اس قماش کے لوگ بھول جاتے ہیں کہ ذمہ دار کہانی کار اپنے کرداروں اور ان کی تقدیر سے صرف اور صرف فکری، ذہنی یا نظری رشتہ نہیں رکھتا بلکہ ان سے اس کی وابستگی احساس اور جذبے کی سطح پر بھی نہایت مستحکم ہوتی ہے۔ چنانچہ اسد محمد خاں کے یہاں جس شے کو غصے اور برقی لہر سے تعبیر کیا جاتا ہے، وہ اصل میں کہانی کار کی اسی وابستگی و پیوستگی کی قوت ہے۔ یہ کردار کو محض اس کے وجود میں نہیں بلکہ روح میں جاننے اور بیان کرنے کا ہنر ہے اور کہانی کار اس ہنر کو استعمال کرنا اسی وقت سیکھتا ہے جب وہ اپنے کردار اور اس کی تقدیر سے اپنے تئیں مستحکم رشتے استوار کرتا ہے۔ یہ فن اور زندگی کو احساس کی بلند سطح پر آمیز کرنے کا تجربہ ہے، اس بلند سطح پر جہاں فن چقماق بن جاتا ہے اور زندگی سے رگڑ کھاتا ہے تو چنگاری پیدا کیے بغیر نہیں رہتا۔ ایک ایسی قوت کے قالب میں ڈھل جاتا ہے جو اپنے اظہار کے لیے راہ خود نکال لیتی ہے۔

ایک بات اور، اسد محمد خاں نے اپنے افسانوں میں اسلوب، تکنیک اور بیانیہ کے بہت تجربے کیے ہیں۔ ان کے پیش روؤں میں پریم چند، منٹو، بیدی اور عزیز احمد کے یہاں بھی

ہمیں اس نوع کے خاصے تجربات ملتے ہیں لیکن مختلف المنہاج تجربوں کا جو سلسلہ ہمیں اسد محمد خاں کے یہاں ملتا ہے، وہ اپنی نوعیت میں الگ بھی ہے اور دل چسپ بھی۔ سوال یہ ہے کہ کیا یہ سبقت افسانہ نگار کے کام کے مجموعی تخمین وطن میں کام آ سکتی ہے؟ جی ہاں آ سکتی ہے لیکن اس کا فیصلہ کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ ہم ان تجربوں کی نوعیت کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ دیکھنا یہ ضروری ہے کہ کیا یہ تجربے کسی قسم کے فنی التزام کا حاصل ہیں یا افسانے کی ماہیت اور افسانہ نگار کے فنی سفر کی کسی داخلی ضرورت کے نتیجے میں رونما ہوئے ہیں؟ اگر ان تجربوں کا اہتمام محض فنی التزام کی بنا پر ہو تو بھی اس کی داد افسانہ نگار کو ضرور دی جانی چاہیے۔ اس لیے کہ یہ فن کی توسیع کا عمل ہے، لیکن اس صورت میں اس کے کام کی مجموعی قدر و قیمت میں اس التزام سے کوئی بڑا فرق نہیں پڑتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ فنی التزام اگر معنویت کی افزونی کے لیے ہے تو بڑا کام ہے بصورت دیگر محض آرائش۔ کلیاں پھند نے ٹانگنا بھی ایک کام تو ضرور ہے لیکن زندگی کے بڑے تجربوں کی معنویت کھولنے میں یہ کام کچھ ایسا مفید مطلب ثابت نہیں ہوتا۔ خیر، stylists کی اہمیت ہر زمانے اور ہر ادب میں رہی ہے لیکن اصل میں بڑا فن کار وہ ہے جس کا ہر کام اس کے فن کے بنیادی نکتے کی تشکیل و تعبیر میں کوئی نہ کوئی کردار ادا کرتا ہے۔ مثال کے طور پر آپ موپاساں کو لیجیے۔ اس کے یہاں آپ کو ہر فنی تجربہ اس کے معنوی تجربے سے منسلک ملے گا۔ ہیمنگوے کو دیکھیے، یہی صورت نظر آئے گی۔ بورخیس کے یہاں ملاحظہ کیجیے، ایسا ہی نقشہ ملے گا۔ غرض کہ بڑا افسانہ نگار اپنے فن کے ہر ایک جزو اور ہر ایک عنصر کو برتتے ہوئے ایک نامیاتی وحدت میں ڈھالتا ہے اور ایک گل میں جوڑتا ہے اور اس گل سے اپنے معانی وضع کرتا ہے۔

آخری بات... اگر ہم سے کوئی یہ دریافت کرے کہ بھئی اسد محمد خاں کا خاص رنگ کیا ہے؟ تو ہم مخمضے میں پڑ جائیں گے۔ ہاں واقعی اسد محمد خاں کا تو کوئی خاص رنگ ہے ہی نہیں۔ ان کے یہاں تو ہمیں کوئی patent اسٹائل ملتا ہی نہیں۔ تو وہ لوگ جو ادب میں کسی خاص رنگ اور کسی خاص اسٹائل کے بغیر لقمہ توڑنے پر آمادہ نہیں ہوتے، اسد محمد خاں کا افسانہ ان کا کپ اوف ٹی نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہاں ایک لمحے کے لیے رک کر ہمیں یہ جاننے کی کوشش ضرور کر لینی چاہیے کہ آخر اس زندگی کا اور اس کائنات کا بھی کیا کوئی خاص رنگ یا خاص اسلوب ہے؟ جی ہاں، اس سوال کا جواب ہی اس قضیے کو حل کر سکتا ہے کہ ایسا کوئی مطالبہ کسی

فن کار سے کیا بھی جانا چاہیے یا نہیں۔ تو جواب یہ ہے کہ نہیں کیا جانا چاہیے۔ اس لیے کہ خود حیاتِ انسانی کا اور انسانوں کی اس کائنات کا کوئی مخصوص رنگ نہیں ہے۔ یہاں تو رنگارنگی بہار دکھاتی ہے۔ جس طرف نگاہ کیجیے، نگار ہزار شیوہ رُوبہ رُوبہ ہے، دُکھ کے ہزار رنگ ہیں اور سکھ کے بھی ہزار رنگ۔ اور لطف یہ ہے کہ ان میں بھی کبھی کوئی رنگ dominate کرتا ہوا نظر آتا ہے اور کبھی کوئی رنگ۔ تو وہ لوگ جنہوں نے ایک خاص رنگ اور ایک خاص اسلوب وضع کر لیا، ان کے فن کا داخلی مطالبہ وہی ہوگا۔ انھیں ہم مسترد نہیں کرتے، بلکہ ان کا احترام اپنی جگہ ہے۔ تاہم یہ بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ جس فن کار نے ایسا نہیں کیا وہ بھی اپنے کسی داخلی فنی مطالبے کی وجہ سے نہیں کیا ہوگا۔ اسد محمد خاں کے افسانوں کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ ہر نیا قصہ ایک نئے تجربے کے ساتھ اس لیے آتا ہے کہ یہ حقیقت کو ہر رُخ سے جاننے اور ہر رنگ میں دیکھنے کی جستجو کا حاصل ہے۔ جب انسان خود کوئی فارمولا نہیں ہے تو آخر اس کے بیان کو کسی فارمولے میں کیوں کر ڈھالا جاسکتا ہے؟ اسد محمد خاں نے اصل میں اپنے کرداروں کو ان کے الگ الگ زمانوں اور الگ زمینوں میں دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ یہ ہر تجربے کے ساتھ نئی زمین نئے آسمان تراشنے کا عمل ہے۔ انسانی احساس کو پرت در پرت کھولنے کی آرزو کا سفر۔ نئے جہانِ معانی کی ہمہ وقت جستجو کا سفر۔ تو بس یہ ہے کہ ہمیں ایسے فن کاروں کو اپنے لگے بندھے فرمائشی پروگراموں کے ساتھ نہیں پڑھنا چاہیے بلکہ ان کے مطالعے میں اس آزادی کو روا رکھنا چاہیے جو انسانی زندگی کے داخلی مطالبات سے مرتب ہوتی ہے۔ اور ادب و فن اسی کے لیے اور اسی کے ساتھ کام کرتے ہیں۔

مبین مرزا

کھڑکی بھر آسمان

پہلی اشاعت: ۱۹۸۲ء

فہرست

۳۵	چودہ کروڑ کی مناجات
۳۸	منشور
۴۰	یومِ کپور
۴۴	باسودے کی مریم
۵۱	مئی دادا
۶۶	گھر
۷۲	ترلوچن
۷۷	براوو! براوو
۸۵	ناممکنات کے درمیان
۸۹	فورک لفٹ ۳۵۲ حمود الرحمن کمیشن کے رو بہ رو
۹۷	ایک وحشی خیال کا منفی میلا پن
۱۰۲	ہے لال لال
۱۰۶	سوروں کے حق میں ایک کہانی

چودہ کروڑ کی مناجات☆

یا دافع الاشرار!
ہمیں کافروں کے شر سے محفوظ رکھ
کسی بھی مشرک، ملحد، زندیق، غیر مقلد، غیر کفو کے رو بہ روجھل نہ ہونے دے۔
ہمیں سرخروئی عطا فرما۔
مولا! اب تو کچھ ایسا ہو کہ ایک فزی سسٹ ہماری ہی صفوں سے اُٹھے؛ جو کھڑے ہو کر
سلام پڑھتا ہو
کہ جیبوں میں ڈھیلے لے کر چلتا ہو۔
جو اسٹاک ہوم کے چورستوں میں قینچیاں مارے
کہ مشرکین بیرونی اور کفار مقامی کا پتہ پانی ہو دے۔

بارِ الہا!
کچھ ایسا ہو کہ فلاں فلاں ملک کی مثال ہم پٹرول سے اور بے شمار معدنیات سے مونہا
منہ بھر جائیں

☆ اپنی رہائش گاہ سی فورٹین سے شائع کی گئی دوسری کتاب ”برج خموشاں“ کا آغاز میں نے اس نظم سے کیا تھا

تاکہ ہم روز ناموں کی شہ سرخیوں میں
 تاکہ ٹیلی وژن کی اسکرینوں پر
 تاکہ یونیورسٹیوں میں
 تاکہ چورستوں، ہوائی اڈوں پر
 تاکہ ڈاک کے ٹکٹوں پر
 ہم آرام سے تیرے نام کا بھنگڑا ڈال سکیں
 اور ملحدوں کا فروں مشرکوں کی بستیوں کی جانب منہ پر کلائییاں رکھ کر
 آرام سے بکرا بلا سکیں۔

یا نافع الانعام!
 ہمارے بکرے جوع البقر سے
 ہماری گائیں گھوڑوں سے
 ہمارے گھوڑے اصطبلوں سے
 ہمارے اصطبل کتابوں سے معمور ہیں
 اور اس معمورے میں ہماری بڑھکوں کے سوا کان پڑی آواز نہ سنائی دے، آمین۔
 (اور اگر یہ سب مناسب نہ ہو تو)
 اے صاحب الکلام!

وہ ترے نام کا زیرِ مبادلہ بلند کرنے اپنے گھروں سے نکلے ہیں۔
 اپنی نصرت بھیج ہمارے قوالوں کے حلق کشادہ کر
 ہمارے ڈوم ڈھاڑیوں کو زمین پر پھیل جانے کا اذن دے۔

یا صاحب الجود! یا فاتح الہند و الیہود!
 ہمارے کھلاڑیوں ہی کو ہر نوع کی سر بلندی عطا کر
 کہ اب تو وہی ہمارا اثاث البیت ہیں۔
 اور اے مالک الجندل!

ہمارے دشمنوں کو اب اندر سے سنگسار فرما
ان کی میانیوں میں برف باری کر، دھماکے فرما

اور ہاں اے مالک الملک!
ہو نہ ہو یہ شخص ام خ دل آزار آدمی ہے
کہ برابر لکھ لکھ کے دل آزاری کا ارتکاب کیے جاتا ہے
پس اے لایزال، اے لامکان، اے لازمان
الامان! الامان! الامان!



منشور☆

ادب صرف اپنے آمروں کو پہچانتا ہے اور میں بڑی بے شرمی کے ساتھ اعتراف کرتا ہوں کہ میں بھی اپنی ایک چھوٹی سی قلمرو تراش کر اس کی طے شدہ حدوں میں اپنا حکم نافذ کرنے آیا ہوں۔

مجھے بہ حفاظت کسی کارواں سرا تک نہیں پہنچنا کہ میں خدا اتنی پرانی اور اُن چارٹڈ زمینوں سے ہوتا ہوا کسی نامعلوم تک جانا چاہتا ہوں اور ایک دشتِ محال کے تمام بھیڑیوں کا خطرہ مول لینے کو تیار ہوں۔

ان باتوں سے ہرگز یہ نہ سمجھا جائے کہ میں کسی قسم کا کوئی جھنڈا اٹھائے چل پڑا ہوں یا کوئی عندلیبِ گلشنِ نا آفریدہ ہوں یا کوئی محمد تعلق ہوں جو اپنے وقت سے پہلے پیدا ہو گیا ہے یا کوئی بہت مظلوم اور غضب ناک لیکھک ہوں۔ جی نہیں۔ میں تو ٹھنڈی پھوہار میں گاتا ہوا چلا تھا، گاتے رہنا چاہتا ہوں کہ باہر کوئی ساون رہے نہ رہے میں اپنی رتوں میں بھیگتے رہنے اور شرابور کر دینے کا ہوس مند ہوں۔

میں تو گھاس کا چھوٹا سا اکِ فرعون ہوں اور اپنے تنکوں سے ایک ورقِ سادہ پر مانکرو اسکو پک لکیریں بناتا جا رہا ہوں۔ اگر آپ ان لکیروں کو پڑھ لیں گے تو اپنے اور میرے حق میں اپنی رہائش گاہ، سی فورٹین سے شائع کی گئی پہلی کتاب ”کھڑکی بھر آسمان“ کا آغاز میں نے اس تحریر سے کیا تھا۔

دعائے مغفرت کریں گے اگر نہیں تو آپ کو میری موجودگی کا پتا بھی نہیں چلے گا اور میں اپنی راہ چلا جاؤں گا۔ اس طرح ایک شریفانہ باہمی بے تعلقی ہم دونوں کی نجاتِ اخروی کی ضمانت ہوگی۔

نہ میں کسی تحریک کا بانی بن سکتا ہوں، نہ بننا چاہتا ہوں۔ میں کسی تحریک کا پر جوش حامی اور مخلص پیر و کار بننے کے صبر آزما کام سے جی چرانے والا آدمی ہوں۔

ایک غیر حقیقی معاشی زندگی میں تو میں سفید کار والا غلام ہوں مگر اس سرگرمی میں کہ جسے میں ادبی سمجھتا ہوں مجھے سفید کار والا غلام بننا منظور نہیں۔ ایک اور بات: کہ میں نے یہ چند سطریں آنے والوں کے لیے نہیں لکھیں۔ یہ آپ کے لیے ہیں کیوں کہ مجھے شبہ ہے کہ آپ میں اور مجھ میں ابھی زندگی کی ایک رمت باقی ہے۔ کوئی نسل آئندہ میری مخاطب نہیں۔ کیا پتا وہ لوگ کون ہوں، کیسے ہوں۔ کیا خبر ان کا مسئلہ صرف معاش، محض انٹرنیمنٹ کا حصول ہو۔ اور اگر وہ نامعلوم لوگ اتنے دہشت ناک نہ بھی ہوئے تو کیا ضمانت کہ میرے لکھے کچے کچے لفظ اتنے دن چل بھی جائیں۔

میں تو بس اپنے زمانے کے ان تمام تک چڑھے، پیارے اور مشکل لوگوں کو شکار کرنا چاہتا ہوں جو ہر عہد میں شکار کیے جانے کے لائق ہوتے ہیں۔ اب اگر میں ان کے معیار پر پورا نہیں اترتا تو یہ میری ہلاکت ہے۔ ان پیارے، تک چڑھے، مشکل لوگوں پر اس کی ذمہ داری عائد نہیں ہوگی۔ خود میں ہی دو ٹکے کا آدمی نکلوں گا۔ تاہم میرے یہاں یہ خوش فہمی موجود رہے گی کہ وہ آسانی سے شکار نہ ہونے والے لوگ شاید کبھی توجہ کریں گے اور شاید ایک بار کہیں گے کہ یہ بھی دوڑنے والوں میں شامل تھا۔ اور اگر ایسا نہ بھی ہوا تو کیا یہ کوشش اپنی اجرت آپ نہیں ہے؟

یہ بہت سادہ اور کم لاگت سے تیار کی ہوئی کتاب ہے۔ میں اس بات کو سمجھتا ہوں کہ چاہے اپنا مجموعہ ورقِ طلائی پر خطِ گہر بار سے لکھوا کر پیش کروں، چاہے کچے اخباری کاغذ پر توپ دوں، میں رہوں گا وہی جو کہ میں ہوں۔ اس لیے میں یہ نہیں چاہتا کہ میرے اپنے لفظوں کی بجائے کتابت اور طباعت اور جلد سازی کی معزز صنعتیں میری نمائندگی کریں۔

میں اپنی اس کتاب کو، کہ جسے میں اپنی پہلی ایکسرسائز بک سمجھتا ہوں، بڑے انکسار اور کمالِ رعونت کے ساتھ خود چھپوا کر اپنے گھر سے شائع کر رہا ہوں۔ مجھے یہ گمان ہے کہ میں اچھا خاصا لکھنے والا ہوں اور یہ یقین ہے کہ اتنا اچھا تجارتی جو انہیں ہوں، تو پھر اپنے اوپر پندرہ بیس ہزار روپے کیوں لگاؤں۔ اتنے پیسوں سے تو بہت سے اور نیکی کے کام کیے جاسکتے ہیں۔



یوم کپور

میں اور میرے جد یوم کپور[☆] میں ہیں۔

اور میں اور میرے جد، بنی اسرائیل کے وہ قبیلے تھے جو اپنے بھائی بندوں کی حرمزدگیوں سے بیزار ہو، اپنے اپنے ید بیضا اپنی بغلوں میں مار، ارض موعود کی تلاش میں اٹے چلتے ہوئے، پہاڑوں پہاڑ ادھر آنکے تھے۔

پھر ایک قاصد فرخندہ فال نے ہموار زمینوں اور سمندروں اور جنگلوں کو نوید پہنچائی کہ صدق کا سورج طلوع کی منزلوں میں آ گیا ہے۔ سو ہم نے گینڈے کی سی گردن والے اپنے سردار الف خان سے پکار کر کہا کہ الف خانا! او بے پیر، ٹیلے سے نیچے اتر آ اور اپنے تیغے کو زمیں بوس کر دے، یہ رجز خوانی بند کر اور سن لے کہ قبیلہ قریش تو آج سب قبیلوں پر سبقت لے گیا۔ خدائے موسیٰ کی قسم اس قبیلے کے آسمان شکوہ ہاشم خیل میں تو زمینوں اور آسمانوں کے سرور نے ظہور کیا ہے۔ او الف خانا! کعبۃ اللہ کی طرف منہ کر لے کہ سورج کی سی پیشانیوں والے آج ابراہیمؑ کے گھر کی سمت مڑ گئے ہیں۔

سو الف خان ٹیلے سے نیچے اتر آیا، اس نے تیغ پھینک کر چار بڑی سمتوں میں سجدے گزارے کہ اس کم آگاہ کو کعبۃ اللہ کی صحیح سمت معلوم نہ تھی۔ پھر اس نے ”وئی“ کہہ کر

نعرہ مارا اور پھر کی جیسے گھومنا شروع کیا یہاں تک کہ اس کا پیرا ہن خانہ بدوشوں کے خیمے کی طرح پھیل گیا۔ وہ گھومتا جاتا تھا اور نعرہ زن تھا کہ، ”ٹول سرفرازے، ڈیرے قسمتے، خدائے رختے، وئی وئی وئی، درگہ، درگہ، درگہ۔“ پھر اس آواز میں جو بلندی سے لڑھکتے پتھروں جیسی تھی اور فرط انبساط سے پہلی بار لرزتی تھی اور نمی سے بوجھل تھی، اس نے کہا کہ اللہ الحمد آج سے ہمارے تیغے ہاشم خیل کی چاکری میں آگئے۔ ٹول سر بلندے، ڈیرے سرفرازے، رختے مخاخ، درگہ درگہ درگہ۔ پھر الف خان کوتاہ گردن سے کچھ اور نہ بن پڑا تو بے انتہا شادمانی سے نڈھال ہو، اس نے پتھروں سے ٹیک لگائی اور رونا شروع کر دیا۔ یہ روئے زمین پر الف خان کا پہلا گریہ تھا۔

سوائے ارضِ موعود! میں روتا ہوں۔ اور اے ارضِ موعود! میں روتا ہوں۔ اور اے ارضِ موعود! میں تو بھولا بسرا قبیلہ تھا اور اپنے یدِ بیضا اپنی بغلوں میں مار تیری تلاش میں نکلا تھا۔ سو میں (کہ میراجد) ورگزے دوست خان اپنے ۱۹ رفیقوں کے ساتھ جنوب کی ٹیکری پر چڑھا اور طشت نما وادی پر نظر ڈالی جہاں کفار سے کفار نبرد آزما تھے اور بلا کا شور کرتے تھے۔ ورگزے دوست خان نے کچھ دیر ان کے طریقِ جنگ کا مشاہدہ کیا اور طشت نما وادی کے لشکر کو پسپائی کی جنگ لڑتے دیکھا، پھر بیزاری سے منہ پھیر کر جماہی لی اور بولا، ”یہ کون لوگ ہیں؟ واللہ ان قُرمساقوں کو جنگِ مغلوبہ کا بھی شعور نہیں۔“ پھر اس نے اپنے گھوڑے کی ایال سے کھیلے ہوئے السائی ہوئی آواز میں پوچھا، ”وزیر خان! یہاں سے قلعہ رائے سین کے فرسنگ ہوگا؟“

مگر نہیں... دوست خان نے قلعہ رائے سین کی بابت نہیں پوچھا تھا، اور شاید اس کے پاس گھوڑے بھی نہیں تھے۔ اس نے اپنے گھوڑے بیچ کر قافلے کی خوراک کا بندوبست کیا تھا۔ اور میرے ابا بتاتے ہیں کہ جد مکرم دوست خان اور اس کے ۱۹ رفیقوں کے پاس بس بے نیام تیغے اور ستو کی چند پوٹلیاں باقی بچی تھیں اور یہ بیس طالع آزمادہ خیر کے کسی علاقے تیراہ سے آئے تھے اور ورگزے دوست خان، سردار قبیلہ کا بیٹا تھا اور اپنے بھائی سے روٹھ کر قسمتِ آزمانے مغلوں کی قلمرو میں در آیا تھا اور جس دن اس نے جنوبی ٹیکری پر کھڑے ہو کر کفارہ مالوہ کے دو خون آشام لشکروں کو کھانڈے سے کھانڈا بجاتے دیکھا، اس دن رکھشا بندھن کا تیوہار تھا۔ مگر لینگی ناچنے کی بجائے اہل ہنود کھانڈے سے کھانڈا بجا رہے تھے اور اگر جدِ اعلیٰ ورگزے

دوست خان توجہ نہ فرماتا تو ہزیمت وادی طشت کی رانی کا مقدر تھی۔ سو اس نے توجہ فرمائی اور ہارتے ہوئے لشکر کے شانہ بہ شانہ جنگ کی اور فتح مند آیا۔ مگر دوست خان کو ان کا طریق جنگ ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ ہر چند کہ آب و ہوا معتدل تھی اور لوگ وفا سرشت تھے۔ شاید اسی لیے اس نے کچھ دن وہاں قیام کرنے کا فیصلہ کیا اور بالآخر وہیں دفن ہوا اور اس کی ذریت وہاں کئی سو برس ٹھہری۔

اور رانی کملاپتی نے سستی ہونے سے ایک ساعت قبل شکر گزاری میں ورگزے دوست خان کی بالشت بھر چوڑی کلائی پر راکھی کا طلائی دھاگا باندھ دیا اور اپنے نو عمر کنور کو جو اسی جنگ میں یتیم ہوا تھا، خان کی تولیت میں دیا؛ پھر اپنے لشکر کی فتح کا شکھ سنتی ہوئی سات داسیوں کے ہمراہ محل کی ان سیڑھیوں تک پہنچی جو آج بھی زیر آب ہیں، اور جل پوجا کرتی کٹورے تال میں اترتی چلی گئی اور سستی کہلائی۔

اور تال کے گردا گرد جنت پہاڑیاں تھیں اور سیتا پھلوں کے بن اٹھ پڑتے تھے اور کھیتوں کی مٹی نیٹ سیاہ تھی۔ اور رکھشا بندھن کے تیوہار پر چندن موسیٰ، مہامائی کی پوجا سے فارغ ہوتی تو میرے باپ ورگزے عزت خان کی چوڑی کلائی پر راکھی باندھنے سیدھی ہمارے گھر آتی تھی۔ اور دو جو روؤں والا ٹھاکر، جس کے کانوں میں سونے کی مندریاں جھولتی رہتی تھیں، دارو پی کر دونوں جو روؤں کے ساتھ ایک بیل گاڑی میں لد جاتا اور موسیٰ کے پیچھے پیچھے چلا آتا اور میں بچہ ہی تھا سو اسے دیکھ کر بہت ہنستا تھا اور وہ ہمارے صحن میں لینگی ناچتا تھا کہ ارے لگ گئی رے بھنسا رے کی نیند، لگ گئی رے... سو میری آٹھ پشتیں وہاں نیند کرتی ہیں۔

اور میرے دادا ورگزے کمال خان کا پر دادا ورگزے نصرت خان چوتھی پشت میں دوست خان بانی ریاست کی صلب تھا اور وہ جرنیل تھا اور اسی گھر میں جہاں رکھشا بندھن پر میں دو جو روؤں والے ٹھا کر کو دارو پی کرنا چتے دیکھتا تھا، اسی گھر میں سنہ اٹھارہ سو کچھ میں زبردست آتش زدگی ہوئی تھی اور نصرت خان نے، کہ زمین کی طرح سانولا اور تاڑ کی طرح لمبا تھا اور اسی لیے کو لے خان کہلاتا تھا، اللہ اکبر کا نعرہ مارا تھا اور وہ جلتی ہوئی چھت کو الانگ گیا تھا اور جلتی ہوئی دیواروں اور جلتے ہوئے طاقتوں پر چڑھتا اترتا اور جلتے ہوئے دروازوں سے گزرتا جزدان میں لپٹا ہوا قرآن مجید سینے سے لگائے نعرے مارتا صحیح و سالم واپس آ گیا تھا۔ اور میرا دادا ورگزے کمال خان حب قرآن میں گریہ کرتا تھا اور کہتا تھا کہ تاریخ ہند کی جلد نمبر

فلاں میں پنڈاریوں کی سرکوبی کے ذیل میں ورگزنے نصرت خان، المعروف بہ کو لے خان جرنیل، کی معرکہ آرائیاں مرقوم ہیں اور دادا کمال خان مجھ سے کہتا تھا کہ لڑکے! جب کو لے خان بہادر تیرے اس جلتے ہوئے مکان میں قرآن لینے کو دا تو پرکھوں نے باواز بلند انا للہ وانا الیہ راجعون پڑھا اور تمام پرکھے اتفاق رائے سے ملول ہوئے کہ ہیہات! ایک متشرع مسلمان کی میت کو مٹی نصیب نہ ہو سکی اور وہ مثل اہل ہنود کے سوختہ ہوا... مگر جب ورگزنے نصرت خان کلامِ مجید کو سینے سے لگائے شعلوں کی دیوار چیر کر طلوع ہوا تو پرکھوں نے نعرہ کیا کہ ڈیرے قسمتے، ٹول سرفرازے، ٹول سر بلندے، وئی وئی وئی اور شادمانی سے نڈھال ہو، انھوں نے پتھروں سے ٹیک لگائی اور رو کر کہا کہ ہاشم خیل کے چاکروں کا چاکر، نصرت خان سرخ رو آیا اور الف خان کوتاہ گردن کی صلب مشکور ہوئی اور زمینوں اور آسمانوں کے سروے نے اس قبیلے کو اپنی چاکری میں سرفراز فرمایا۔ اور نمی سے بوجھل آوازوں میں انھوں نے درود و سلام پڑھے اور گریہ کیا۔

سوائے ارضِ موعود! میں روتا ہوں اور اے ارضِ موعود! میرا جد سچا تھا کہ وہ اپنے تیراہ کے لیے گروہ کرتا تھا اور اپنے بڑے بیٹے کو روتا تھا جو ٹورنامنٹ کھیلتے ہوئے چھاتی پر گیند لگنے سے شہید ہوا اور میرا باپ سچا ہے، وہ اپنے بیٹے کو روتا ہے جو سب تیراہوں سے دور لیاقت آباد کی ایک کشادہ قبر میں ۲۳ سال سے دفن ہے اور بنو ہاشم کی قسم، میں سچا ہوں کہ روتا ہوں۔ اور اے ارضِ موعود کبھی کبھی شام کو دو جو روؤں والا ٹھا کر بھی دارو پی کر روتا تھا اور ابا سے اپنے الکو ہلک دکھ بیان کرتا تھا اور گنے کے کھیت کی طرف منہ کر کے اپنے مفروضہ دشمن کو للکارتا تھا کہ بھیتر کا ہے گھس گیو سورے! ایدھر آ کچو دیکے! مہارے منجھے بھیا کے تائیں بندوخ ہے، سورے کو گوڑی مرواد گیو۔ اور میرے بڑے بھائی کے پاس ایک ایڑ گن تھی اور گرمیوں کی چھٹیوں میں ہم دونوں سیسا پگھلا پگھلا کر پیتل کے سانچوں میں ڈالتے جاتے تھے اور بڑے نفیس چہرے بناتے تھے اور اس اندھے لڑکپن میں اجلی اجلی فاختاؤں کو ہلاک کرتے تھے۔ سواب روتا ہوں اور اے ارضِ موعود! میں روتا ہوں کہ میں نے فاختائیں کیوں ہلاک کیں۔



باسودے کی مریم

مریم کے خیال میں ساری دنیا میں بس تین ہی شہر تھے۔ مکہ، مدینہ اور گنج باسودہ۔ مگر یہ تین تو ہمارا آپ کا حساب ہے، مریم کے حساب سے مکہ، مدینہ ایک ہی شہر تھا۔ ”اپنے جو رکا سہر۔“ مکے مدینے سریپ میں ان کے جو رہتے اور گنج باسودے میں ان کا ممدو۔

ممدوان کا چھوٹا بیٹا تھا۔ اس کے رخسار پر ”اتا بڑا“ ناسور تھا۔ بعد میں ڈاکٹروں نے ناسور کاٹ پیٹ کر رخسار میں ایک کھڑکی بنا دی تھی جس میں سے ممدو کی زبان پانی سے نکلی ہوئی مچھلی کی طرح تڑپتی رہتی تھی۔ مجھے یاد ہے پہلی بار مریم نے اماں کو سرجری کا یہ لطیفہ سنایا تھا تو میں کھی کھی کر کے ہنسنے لگا تھا۔ اگر مریم اپنے کھر درے ہاتھوں سے کھینچ کھانچ کے مجھے اپنی گود میں نہ بھر لیتیں تو میری وہ پٹائی ہوتی کہ رہے نام اللہ کا۔ ”اے دلہین! بچہ ہے۔ بچہ ہے ری دلہین! بچہ ہے۔“ مگر اماں نے غصے میں دو چار ہاتھ جڑ ہی دیے جو مریم نے اپنے ہاتھوں پر روکے اور مجھے اٹھا کر اپنی کوٹھری میں قلعہ بند ہو گئیں۔ میں مریم کے اندھیرے قلعے میں بڑی دیر تک ٹھس ٹھس کر کے روتا رہا۔ وہ اپنے اور میرے آنسو پونچھتی جاتی تھیں اور چیخ چیخ کر خفا ہو رہی تھیں۔ ”اے ری دلہین، یہ اللہ کی دین ہیں... نبی کے امتی ہیں۔ انھیں مارے گی، کوٹے گی تو اللہ نبی کھش ہوں گے تجھ سے؟ تو بہ کر دلہین! تو بہ کر۔“

پھر وہ طرح طرح سے کھڑکی اور مچھلی والا لطیفہ سنا سنا کر مجھے بہلانے لگیں۔ ”تو بیٹا

ڈانگدروں نے کیا کیا کہ حرامیوں نے ممدو کے گال میں کھڈکی بنادی اور کھڈکی میں سے تھرک تھرک، تھرک تھرک...“ مریم کا دل بہت بڑا تھا اور کیوں نہ ہوتا، اس میں ان کے جو رکامہ مدینہ آباد تھا اور سیکڑوں باسودے آباد تھے۔ جن میں ہزاروں لاکھوں گل گتھے ممدو اپنی گول مٹول مٹھیوں سے مریم کی دودھوں بھری ممتا پر دستک دیتے رہتے تھے۔ ”انا بوا! دروازہ کھولو۔ اللہ کی دین آئے ہیں۔ نبی کے امتی آئے ہیں۔“

مریم نے میرے ابا کو دودھ پلایا، وہ میری کھلائی اور میری پناہ تھیں، وہ میرے بھانجے بھانجیوں کی انا تھیں اور ابھی زندہ ہوتیں تو انھی بھانجے بھانجیوں کے بچے اپنے چارج میں لیے بیٹھی ہوتیں۔ میری تین پشتوں پر مریم کا احسان ہے۔

میں نے ایک بار مریم کے قلعے میں گھس کر ان کی پٹلیا سے گڑ کی بھیلی چرائی۔ مریم بچوں کو بگاڑنے والی مشہور تھیں۔ مگر مجال ہے جو بڑے جرائم میں کسی کی حمایت کر جائیں۔ انھوں نے فوری طور پر اماں سے میری رپورٹ کردی اور اماں، خدا انھیں خوش رکھے، جاگیردار کی بیٹی، کھری پٹھانی اپنی اولاد سے کوئی گھٹیا فعل منسوب ہوتے دیکھ ہی نہیں سکتیں۔ انھوں نے جلال میں آکر الٹا مریم سے ان بولا کر لیا۔

ابا کو پتا ہی نہ تھا کہ گھر میں سرد جنگ جاری ہے۔ وہ اسی طرح عشا کی نماز کے بعد پندرہ بیس منٹ کے لیے مریم کے پاس بیٹھ کر ان کا حال احوال پوچھتے، مریم کے پاؤں دابنے کی کوشش کرتے اور ان کی پیار بھری جھڑکیوں کی دولت سمیٹ کر اپنے کمرے میں سونے چلے جاتے۔

تین چار دن میری یہ دو جنتیں ایک دوسرے سے برگشتہ رہیں اور میں گنہگار عذاب جھیلتا رہا۔ اماں نے مریم کی دیکھ بھال میں کوئی کوتاہی تو نہ کی مگر مریم کا سامنا ہو جاتا تو اماں کے نازک خدو خال آپی آپ سنگ و آہن بن جاتے۔ مریم زیادہ تر اپنی کوٹھری میں محصور رہیں اور شاید روتی رہیں۔ آخر چوتھے پانچویں دن میں پھوٹ بھا اور پٹائی کے خوف سے بے نیاز ہو کر اماں کی گود میں سر رکھ کر میں نے اقبال جرم کر لیا۔ اماں کے پاؤں تلے کی زمین نکل گئی۔ بس ایک غضب کی نگاہ کی، مجھے ایک طرف دھکیل کر اٹھ کھڑی ہوئیں اور بجلی کی سی تیزی سے مریم کے قلعے میں داخل ہو گئیں۔ ”انا بوا! تمھارا منجھلا تو چور نکلا۔ بوا! ہمیں معاف کر دو۔“ میں نے کواڑ کی آڑ سے دیکھا کہ مریم لرزاتے ہاتھوں سے اماں کے دونوں ہاتھ تھامے انھیں چوم

رہی ہیں۔ کبھی ہنستی ہیں، کبھی روتی ہیں اور کبھی اماں کو چپٹ لگانے کا ڈراما کرتی ہیں۔ ”بس ری دلہین! بس کر، چپ ری دلہین! چپ کر۔ دیکھ، میں مار بیٹھوں گی۔“

مریم سیدھی سادی میواتن تھیں۔ میری خالہ سے مرتے دم تک صرف اس لیے خفا رہیں کہ عقیقے پر ان کا نام فاطمہ رکھ دیا گیا تھا۔ ”ری دلہین! بی بی پھاٹمہ تو ایلکی تھیں۔ نبی جی سرکار کی سجادہ تھیں، دنیا آکھرت کی باچھا تھیں۔ ہم دوئج کے کندے بھلا ان کی برو بری کریں گے۔ توبہ توبہ استلکھار۔“

محرم میں نویں اور دسویں کی درمیانی شب وہ خشوع و خضوع سے تعزیے، سواریاں اور اکھاڑے دیکھتیں، خوب خوب پاڑ، پکوڑے کھاتیں کھلاتیں اور دسویں کو صبح ہی سے ”جو بونا کے“ بیٹھ جاتیں؛ ہم لڑکوں کو پکڑ پکڑ کر دن بھر شہادت نامہ سنتیں یا کلمہ طیبہ کا ورد کرتیں، اور خدا مغفرت کرے، کلمہ شریف بھی جس طرح چاہتیں پڑھتیں: ”لا الہ الا اللہ لا نبی جی رسول الا۔“ جو رجبی رسول الا۔“

امام حسینؑ کا نام لے لے کر بین کرتیں، رو رو کر آنکھیں سجالیتیں اور بین کرتے کرتے گالیوں پر اتر آتیں۔ ”رے حرامیوں نے میرے سجادے کو مار دیا۔ رے ناس مٹوں نے میرے باچھا کو مار دیا۔“

محرم میں وہ ہم لڑکوں کو حسنؑ حسینؑ کے فقیر بناتی تھیں۔ ہمارے کرتے ہرے رنگ دیتیں۔ گردنوں میں کلاوے ڈال دیتیں اور چھوٹی چھوٹی بوٹیاں سی کر ان میں دو دو آنے کے پیسے ڈال، سیٹھی پنوں سے ہمارے گریبانوں میں ٹانک دیتی تھیں۔

حق مغفرت کرے، ہمارے دادا میاں مرحوم تھوڑے سے وہابی تھے۔ ابا بھی ان سے کچھ متاثر ہیں پر محرم کے دنوں میں مریم کے آگے کسی کی وہابیت نہ چلتی۔ دس روز کے لیے تو بس مریم ہی ڈکیٹر ہوتیں۔ مگر یہ ڈکیٹری بھی، جیو اور جینے دو، کے اصول پر چلاتی تھیں؛ ہمیں فقیر بنا کر چپکے سے سمجھا دیتی تھیں، ”دیکھ رے بیٹا! بڑے میاں جی کے سامنے متی جانا۔“ اور بڑے میاں جی بھی، خدا ان پر اپنی رحمتوں کا سایہ رکھے، کمال بزرگ تھے۔

ظاہر تو یہ کرتے تھے جیسے مریم کی ان باتوں سے خوش نہیں ہیں۔ پر ایک سال محرم کے دنوں میں مریم باسودے چلی گئیں، ہمارے گھر میں نہ شہادت نامہ پڑھا گیا، نہ ہائے حسینؑ ہوئی، نہ ہم فقیر بنے۔ عاشورے پر ہم لڑکے دن بھر ہاکی کھیلتے رہے۔ عصر کی نماز پڑھ کر دادا میاں گھر

لوٹ رہے تھے۔ ہمیں باڑے میں ادھم مچاتے دیکھا تو لاٹھی ٹیک کر کھڑے ہو گئے۔ ”ابے کرشنا نو! تم حسن حسین کے فقیر ہو؟ بڑھیا نہیں ہے تو جائیے پہن کر ادھم مچانے لگے۔ یہ نہیں ہوتا کہ آدمیوں کی طرح بیٹھ کر یسین شریف پڑھو۔“

یسین شریف پڑھو حسن حسین کے نام پر، یسین شریف پڑھو بڑے میاں جی کے نام پر، یسین شریف مریم کے نام پر اور ان کے ممدو کے نام پر کہ ان سب خوب صورت ناموں سے تمھاری یادوں میں چراغاں ہے۔

مگر میں ممدو کو نہیں جانتا۔ مجھے صرف اس قدر علم ہے کہ ممدو باسودے میں رہتا تھا اور ڈانگدروں نے اس کے گال میں ایک کھڈکی بنادی تھی اور اس کھڈکی کے پٹ مریم کی جنت میں کھلتے تھے؛ اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ جب مریم بڑے سوز کے ساتھ کھواجہ پیا جرا کھولو کوڑیاں گاتی تھیں تو اماں کی کونکوں جیسی آواز ان کی آواز میں شامل ہو کر مجھ پر ہزار جنتوں کے دروازے کھول دیتی تھی۔ میں اماں کے زانو پر سر رکھ کر لیٹ جاتا اور خواجہ پیا کو سروں کے معصوم جھرو کے سے درشن بانٹتے دیکھا کرتا۔ سنا ہے، میری اماں موج میں ہوتی ہیں تو اب بھی گاتی ہیں۔ خدا انھیں ہنستا گاتا رکھے۔ پر مریم کی آواز تھک کر سوچکی ہے یا شاید ایک لمبے سفر پر روانہ ہو چکی ہے اور مکے مدینے سریپ کی گلیوں میں پھول بکھراتی پھر رہی ہے یا باسودے کے قبرستان میں ممدو کو لوریاں سنا رہی ہے۔

سفر مریم کی سب سے بڑی آرزو تھی؛ وہ حج کرنا چاہتی تھیں۔ ویسے تو مریم ہمارے گھر کی مالک ہی تھیں مگر پتا نہیں کب سے تنخواہ لے رہی تھیں۔ ابا بتاتے ہیں کہ وہ جب اسکول میں ملازم ہوئے تو انھوں نے اپنی تنخواہ مریم کے قدموں میں لا کر رکھ دی۔ مریم پھول کی طرح کھل اٹھیں۔ اپنی گاڑھے کی چادر سے انھوں نے ایک چونی کھول کر ملازمہ کو دی کہ جا بھاگ کے بجار سے زلے بیاں لیا۔ مریم نے خود ان جلیبیوں پر کلمہ شریف پڑھا اور تنخواہ اور جلیبیاں اٹھا کر بڑے غرور کے ساتھ دادا میاں کے سامنے رکھ آئیں۔ ”بڑے میاں جی! مبارکی ہو۔ دولھے میاں کی تنکھا ملی ہے۔“ پھر اس تنخواہ میں سے وہ بھی اپنی تنخواہ لینے گئیں، جو پتا نہیں انھوں نے ایک روپیہ مقرر کی تھی کہ دو روپے۔

مریم کا خرچ کچھ بھی نہیں تھا۔ باسودے میں ان کے مرحوم شوہر کی تھوڑی سی زمین تھی، جو ممدو کے گزارے کے لیے بہت تھی، اور بکریاں تھیں جن کی دیکھ بھال ممدو کرتا تھا۔ بڑا

لڑکا شتاب خاں ریلوائی میں چوکیدار تھا اور مزے کرتا تھا۔ برسوں کسی کو پتا نہ چلا کہ مریم اپنی تنخواہوں کا کرتی کیا ہیں۔ پھر ایک دن وہ ڈھیر سارے کل دار روپے، میلے کھیلے نوٹ اور ریز گاری اٹھائے ہوئے ابا کے پاس پہنچیں اور انکشاف کیا کہ وہ حج کرنے جا رہی ہیں۔ کرائے کی یہ رقم ان کی برسوں کی کمائی تھی۔ یہ مکہ مدینہ فنڈ تھا جو مریم خبر نہیں کب سے جمع کر رہی تھیں۔ ابا نے گن کر بتایا کہ نو سیکڑے تین بیسی سات روپے کچھ آنے ہیں۔ مریم کو اس سے غرض نہیں تھی کہ یہ کتنے ہیں، وہ تو سیدھی سی بات پوچھ رہی تھیں کہ ان سے مکے مدینے کا ٹکس مل جائے گا یا نہیں۔ ابا نے بتایا کہ بے شک مل جائے گا۔

مریم نے تیاریاں شروع کر دیں۔ وہ اٹھتے بیٹھتے، چلتے پھرتے گنگناتی رہتیں کہ کھواجہ پیاجرا کھولو کوڑیاں۔ ان پر مکے مدینے کی کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں اور ان کھڑکیوں سے نبی جی کے مقدس پیرا ہن کی خوش بو چلی آرہی تھی۔ کسی نے چھیڑنے کو کہہ دیا کہ تم کو ڈھنگ سے نماز پڑھنی تو آتی نہیں، قرآن شریف تو یاد نہیں ہے، پھر حج کیسے کرو گی؟

مریم بھر گئیں۔ ”رے مسلمان کی بیٹا، مسلمان کی جو رو ہوں۔ نماز پڑھنا کا ہے نہیں آتی۔ رے کلمہ سریپ سن لے، چاروں کل سن لے۔ اور کیا چپے تیرے کو؟ ہاں اور کیا چپے؟“ پھر ان کے دل میں تو نبی جی کے پیار کا چمن بھی کھلا ہوا تھا کہ یہی بہت تھا۔

مگر ایک دن شتاب خاں کا خط آیا کہ ممدو کی حالت کھراب ہے، بکریاں بیچ بانچ کے علاج مالجہ کرایا، جمین گروی رکھ دی۔ اب بالکل پیسے نہیں ہیں۔ صورت دیکھنا چاہتی ہے تو خط کو تار سمجھنا۔ مریم کی آنکھوں میں مکہ مدینہ دھندلا گیا۔ انھوں نے نو سیکڑے تین بیسی سات روپے چادر میں باندھے اور روتی پیٹتی باسودے کی بس میں جا بیٹھیں۔ ابا ساتھ جانا چاہتے تھے انھیں سختی سے منع کر دیا۔

ممدو تو ان کی ذمے داری تھا، وہ کسی اور کو اس میں کیوں شریک کرتیں۔ مریم کا یہ اصول بڑا سفاک تھا۔ انھوں نے باسودے خیریت سے پہنچنے کا خط تو لکھوا دیا پر ممدو کے بارے میں ایک لفظ نہیں لکھوایا۔ مہینے گزر گئے؛ کسی نے بتایا کہ وہ ممدو کو علاج کے لیے اندور لے گئی ہیں، پھر پتا چلا کہ بمبئی میں صابو صدیق کی سرائے میں نظر آئی تھیں، پھر پتا چلا کہ ممدو مر گیا ہے۔ پھر ایک لٹی لٹائی مریم گھر لوٹ آئیں۔

میں اسکول سے گھر پہنچا تو دیکھا کہ مریم صحن میں بیٹھی اپنے مرے ہوئے بیٹے کو

کوس رہی ہیں، ”رے حرامی تیرا ستیاناس جائے رے مدو! تیری ٹھٹھری نکلے۔ اور رے بد جناور تیری کبر میں کیڑے پڑیں۔ میرے سبرے پیسے کھرچ کرادیے۔ اے ری دھین! میں کے مدینے کیسے جاؤں گی۔ بتاری دھین! اب کیسے جاؤں گی؟“

ابا نے کہا، ”میں تمہیں حج کراؤں گا۔“

اماں نے کہا، ”انا بوا، ہم اپنے جہیز والے کڑے بیچ دیں گے، تمہیں حج کرائیں گے۔“

مگر مریم چپ نہ ہوئیں، دو دن تک روتی رہیں اور مدو کو کوستی پیٹتی رہیں۔ لوگوں نے سمجھایا کہ آخر دولھے میاں بھی تو تمہارا ہی بیٹا ہے، وہ اگر تمہیں حج کرواتا ہے تو ٹھیک ہے، مان کیوں نہیں جاتیں؟ مگر مریم تو بس احسان کرنا جانتی تھیں، کسی بیٹے کا بھی احسان اپنے سر کیوں لیتیں۔ انھوں نے تو اپنی کمائی کے پیسوں سے حج کرنے کی ٹھانی تھی۔

مدو کے مرنے کے بعد مریم شاید ایک دفعہ اور باسودے گئیں اپنی زمین کا تیا پانچا کرنے پھر اس کے بعد باسودے کا زوال شروع ہو گیا۔ مریم کے چوڑے چکلے میواتی سینے میں بس ایک ہی شہر بسا رہ گیا۔ ان کے جو رکا سہر۔ وہ اٹھتے بیٹھتے ”نبی جی، جو ر جی“ کرتی رہتیں۔ کبھی تو یوں لگتا کہ انھیں قرار سا آ گیا ہے۔ شاید اس لیے کہ ان کے بھولے بھالے منصوبہ کار ذہن نے ایک نیا مکہ مدینہ فنڈ کھول لیا تھا۔

ابا نے بڑے شوق سے لحاف سلوا کر دیا، مریم چپکے سے جا کر بیچ آئیں۔ عید آئی، مریم کے بھی کپڑے بنے، خدا معلوم کب، کتنے پیسوں میں وہ کپڑے بیچ دیے۔ ابا اماں سمیت، ہم سب کو جو ایک ایک آنہ عیدی دیتی تھیں، فوری طور پر بند کردی۔ پیسا پیسا کر کے پھر مکہ مدینہ فنڈ جمع ہو رہا تھا۔ سب ملا کر ابھی پانچ سو ساٹھ روپے ہی جمع ہوئے تھے کہ مریم کا بلاوا آ گیا۔ مجھے معلوم نہیں کہ کب اور کس طرح چل بسیں۔ میں گرمیوں کی چھٹیوں میں اپنی خالہ کے گاؤں گیا ہوا تھا، واپس آیا تو مجھے دیکھ کر اماں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں، ”بخلے! تیری انا بوا گزر گئیں۔ لڑکے! تجھے بگاڑنے والی گزر گئیں۔“

ابا نے مجھے حکم دیا کہ میں مریم کی قبر پر ہو آؤں، میں نہیں گیا۔ میں کیوں جاتا، ٹھنڈی مٹی کے ڈھیر کا نام تو مریم نہیں تھا۔ میں نہیں گیا۔ ابا ناراض بھی ہوئے مگر میں نہیں گیا۔

لوگوں نے بتایا کہ مریم نے مرتے وقت دو وصیتیں کی تھیں۔ ایک وصیت تو یہ تھی کہ تجہیز و تکفین انھی کے پیسوں سے کی جائے اور باقی کے پیسے شتاب خاں کو بھیج دیے جائیں۔

دوسری وصیت کا صرف اماں کو علم تھا۔ اماں کے کان میں انھوں نے مرتے وقت کچھ کہا تھا جو اماں کسی کو بتانا نہیں چاہتی تھیں۔

میں یہاں آ گیا۔ پندرہ برس گزر گئے۔ ۶۵ء میں ابا اور اماں نے فریضہ حج ادا کیا۔ اماں حج کر کے لوٹیں تو بہت خوش تھیں۔ کہنے لگیں، ”مجھلے میاں! اللہ نے اپنے حبیب کے صدقے میں حج کرا دیا۔ مدینے طیبہ کی زیارت کرا دی اور تمھاری انا بوا کی دوسری وصیت بھی پوری کرائی۔ عذابِ ثواب جائے بڑی بی کے سر، میاں ہم نے تو ہرے بھرے گنبد کی طرف منھ کر کے کئی دیا کہ یا رسول اللہ! باسودے والی مریم فوت ہو گئیں۔ مرتے وخت کہہ رکی تھیں کہ نبی جی سرکار! میں آتی ضرور مگر میرا مدو بڑا حرامی نکلا۔ میرے سب پیسے خرچ کرا دیے۔“



مسی دادا

مایا کے تین ناموں کی طرح مسی دادا کے بھی تین نام تھے: مجید، اور مسی دادا۔ مجید کہنے والے ان کے سامنے اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مجید، یا ارے ماں مجید کہنے والے دو تین بڑے بوڑھے ان کے بعد بھی کچھ دن زندہ رہے۔ باقی تمام لوگوں کے لیے، سارے شہر، سب زمانوں کے لیے وہ مسی دادا تھے۔

خود مسی دادا کا بیان تھا کہ ان کا اصل نام ابدل مزید کھاں ایسپ جی ہے۔ چناں چہ پولیس کے مشیر ناموں، راشن کارڈوں، سرکاری اسپتال کے کاغذوں اور آخر میں قبرستان کے رجسٹر میں ان کا نام عبدالمجید خاں یوسف زئی لکھا گیا۔ اگر ان کا کوئی وارث ہوتا تو لوح مزار پر بھی عبدالمجید خاں یوسف زئی ہی لکھا جاتا۔ اس لیے کہ ان کی وصیت یہی تھی۔ مسی دادا کے بارے میں محلے کے دھویوں نے اڑا رکھا تھا کہ وہ ذات کے ہندو تیلی ہیں اور ان کی مسلمانیاں تک نہیں ہوئی ہیں۔

دھویوں کی اس حرمزدگی کی وجہ خود مسی دادا یہ بیان کرتے تھے کہ جوانی میں دھویوں کے سلسلے میں ان سے کچھ لغزشیں ہوئی تھیں اور یہ بدجناروں کی اولاد اب ان باتوں کا انتقام لے رہی ہے۔

دھوبی محلے میں ان کی تگ و تاز کے بارے میں مجھے بس اتنا معلوم ہے کہ جوانی

میں مئی دادا دیکھنے دکھانے کی چیز تھے اور یہ کہ ان کی آخری محبوبہ جمرت دھوبن سنہ ۶۵ء میں ۷۰ سال کی ہو کر مری ہے۔

میں نے ڈبا کیمرے سے کھینچی ہوئی بادامی رنگ کی ایک بوسیدہ تصویر بھی دیکھی ہے جس میں اٹھارہ بیس برس کے مئی دادا کان کی لو تک پہنچی ہوئی لوہا چڑھی لاٹھی تھامے، تاراسی آنکھوں میں بہت سا سرمہ بھرے ایک زبردست پگڑ باندھے کیمرے کو گھورتے ہوئے دکھائے گئے ہیں۔ مئی دادا کی یہ تصویر مرحوم پھوپھا ابا کی کھینچی ہوئی ہے، جنہوں نے شہر میں سب سے پہلے سنہ اٹھارہ سو کچھ میں بمبئی کی کسی پارسی فرم سے کیمرے کا وی پی پارسل منگوا یا تھا۔ خاندان کے اسکیئنڈل باز بوڑھوں نے مشہور کر رکھا تھا کہ مئی دادا، پھوپھا ابا مرحوم اور ان کے یاروں دوستوں کے لیے اغوا کی وارداتیں کیا کرتے تھے اور اربابِ نشاط سے رابطے قائم کراتے تھے۔ مگر یہ نری خباثت تھی، پھوپھا ابا کھرے پٹھان اور حافظ قرآن تھے اور مئی دادا تو تھے ہی یوسف زئی، ایسی گھٹیا باتیں ان کے دائرہ خیال میں بھی نہیں آ سکتی تھیں۔ لوگ کہتے ہیں، پھوپھا ابا نے انھیں ایک تینچا خرید کر دیا تھا جسے چلانے کی نوبت تو شاید کبھی نہ آئی ہو مگر دھمکانے کے کام ضرور آتا تھا۔

میں نے اکثر مئی دادا سے اس تینچے کا ذکر سنا ہے۔ تقسیم ملک سے بہت پہلے کسی حرامی ازل گر پھٹتا بھان کے گھوڑے نے اسے چرایا اور دھوبیوں نے اڑا دیا کہ چرانے والے نے یہ تینچا ٹین ڈبے بھوسی ٹکڑے والے کو خستہ گجک کے بدلے میں تلوا دیا ہے۔ مئی دادا تینچے کے واقعے پر ہل کر رہ گئے تھے اور پولیس میں رپورٹ لکھانے چلے تھے مگر لوگوں نے سمجھایا کہ کیا غضب کرتے ہو، پولیس کو ہوا بھی نہ لگے، بلا لائنس کا ہتھیار تھا، اٹنے چکر میں پڑ جاؤ گے۔ مجبوری تھی۔ مئی دادا خون کے گھونٹ پی کر رہ گئے۔ بعد میں کئی برس تک اس انتظار میں رہے کہ بس مجھے پتا چل جائے کہ میرا تینچا کس سالے کے کئے ہے۔ آنتیں نکال کے اس ازل گر پھٹتا بھان کے گھوڑے کے گلے میں پنا دوں گا۔

آنتیں نکال کر گلے میں پہنا دینا ان کی پسندیدہ دھمکی تھی اور ”اجل گرفتہ“ انھوں نے میرے چچا سے سنا تھا جو اس زمانے میں زور زور سے طلسم ہوش رُبا پڑھ کر ہم سب کو سنایا کرتے تھے۔

مئی دادا کا خیال تھا کہ ”یہ یو“ طلسم ہوش رُبا اور قصہ طوطا مینا اور انوار سہیلی وغیرہ

ہیں یہ سب ٹھیک ہیں مگر انگریزی تعلیم جو ہے یہ آدمی کو ”نامردا“ بنا دیتی ہے... یہ لفظ وہ بزدل کے معنوں میں استعمال کرتے تھے اور اکثر بڑے تأسف سے کہا کرتے تھے کہ غضب خدا کا، جب سے ان پٹھان بچوں نے انگریزی پڑھنا شروع کی ہے، اس خاندان کے لوگوں نے کوئی ”کتل“ ہی نہیں کیا۔

ایک بار ابا نے یہ بات سن لی اور انھیں ایسی ڈانٹ پلائی کہ سب سے چار دن تک روٹھے رہے، کسی سے بات نہیں کی۔ آخر پانچویں دن مجھے اشارے سے بلا کر راز دارانہ انداز میں کہنے لگے کہ تیرے باوا علی گڑھ جا کے خراب ہوئے ہیں، پہلے ایسے نہیں تھے۔ بھلا یہ بھی کوئی بات ہے کہ ہم نے ایک قاعدے کی بات کہی اور وہ بگڑ گئے۔ ”بلاو جے۔“

مگر یہ طے تھا کہ ابا کو اور ہم سب بہن بھائیوں کو ان سے جتنی محبت ملتی تھی، دوسروں کو اس کی آدھی بھی نصیب نہیں تھی۔ ویسے مجموعی طور پر وہ پورے کٹمب قبیلے کے عاشق تھے۔ مجھ سے کہتے تھے کہ میں تیرے کٹمب قبیلے کے ”ساکھ سجر“ کا ماسٹر ہوں اور یہ کہ ”ایسا چاروں کھونٹ ساکھ سجر“ میں نے کہیں اور نہیں دیکھا۔

”ساکھ سجر“ سے ان کی مراد شجرۂ نسب ہوتی تھی مگر ”چاروں کھونٹ ساکھ سجر“ کیا ہوتا ہے، یہ نہ میں نے کبھی پوچھا، نہ انھوں نے کبھی بتایا۔

اور میں اس بات کی گواہی دیتا ہوں کہ میرے کٹمب کی حد تک مئی دادا علم اسم نویسی کے ماہر تھے۔

اس مرحوم خاندان میں بڑوں کا طریق کار یہ تھا کہ جوں ہی لڑکا اپنا پورا نام لکھنے کے قابل ہوا اس کا دادا، تایا، باپ یا چچا اسے شجرۂ نسب کی ایک وصلی ٹھما دیتے تھے کہ لو بیٹا، سنبھال سنبھال کے اس کی سونقلیں تو بنا دو۔ ظاہر ہے کہ کلک اور گاڑھی سیاہ روشنائی سے لمبے لمبے کاغذوں پر یہ شاخ شجر بنائے جاتے تھے۔ پنسل، فاؤنٹین پین، فولادی نب وغیرہ سے پرکھوں کے نام لکھنا سخت بے ادبی بلکہ مداخلت فی الدین سمجھی جاتی تھی۔ انھیں درست طریقے سے بنانے میں مہینوں لگ جاتے تھے مگر یہ ایک طے شدہ طریق کار بلکہ پیدائشی جبر تھا جس سے بچنا ممکن نہیں تھا۔ شاخ شجر مکمل ہو جاتے تو خاندان کا اس دور کا پیٹری آرک، لمڈوں کو بلا کر ان کی کارکردگی ملاحظہ کرتا اور تمام کلمے، الحمد شریف اور چاروں قل سننے کے بعد پہلے اس لڑکے کی مین لائن پھر براچ لائنیں زبانی سنتا اور ایک روپیا کلدار عطا کرتا تھا۔ درمیان میں

بھول جانے کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا تھا اس لیے کہ مہینوں تک فلاں محمد خاں کے بیٹے فلاں محمد خاں اور ان کے بیٹے فلاں محمد خاں خوابوں تک میں تلواریں لیے ٹہلتے پھرے تھے۔ انھیں بھول کون سکتا تھا۔

دوسرے پیٹری آرکوں کے برخلاف میرے دادا لمڈوں کی بدخطی کو نظر انداز فرماتے تھے۔ مگر لمڈے بندہ بشر ہوتے ہیں۔ اگر غلطی سے ان محمد خاں کے بیٹے اُن محمد خاں کی بجائے ”وہ دوسرے“ محمد خاں لکھ دیا اور دادا کی نظر پڑ گئی تو سمجھو مارے گئے۔ انگلیوں پر کلک تقریباً توڑ دیے جاتے تھے کہ سور، میرے نگڑ سگڑ دادا کو ولد الحرام بتا رہا ہے! اس وقت ہماری سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر اس قدر خفا ہونے کی کیا بات ہے، ہم درست کیے لیتے ہیں... مگر اب کچھ کچھ سمجھ میں آتا ہے اور اندازہ ہوتا ہے کہ ان سب کے یہاں یہ شدت کس لیے تھی۔ شاید اپنی زاد بوم سے ہزار میل دور اور سیکڑوں برس کے بعد میں، یہ پشتون قبیلہ جو اپنی زبان بھی بھول چکا تھا، کا غدوں پر اپنے نسب کے تحفظ کی ہارتی ہوئی جنگ لڑ رہا تھا۔

اس لیے کہ لوگ کبھی کبھی شیخوں، مغلوں میں بھی شادیاں کر لیتے تھے اور بعضے تو اتنے بے ادب تھے کہ سیدوں تک کی بیٹی لے آتے تھے۔ معاذ اللہ۔ آل رسول سے خدمتیں لینا اور کبھی کبھی سخت سست کہہ دینا!... اس بے ہودگی کا تصور ہی بدنوں میں لرزہ طاری کرنے کے لیے کافی تھا۔

تو دوسری اولادِ زرینہ کی طرح اس اذیت سے، کہ جو ہمارے یہاں ختنہ ہی کی طرح لازمی تھی، مجھے بھی گزرنا پڑا۔ عالم گیر بادشاہ کے عہد سے میرے ہوش سنبھالنے تک آٹھ پیڑھیاں بھگتنا نا بہ ظاہر کوئی مشکل کام نہیں تھا۔ مگر وہ سپاہی لوگ تھے اور پھر ان زمانوں میں خاندانی منصوبہ بندی کا کوئی واضح تصور موجود نہیں تھا۔ چنانچہ میں چیس بول گیا، مثلاً فلاں محمد خاں کے پانچ بیٹے، ان پانچ بیٹوں کے مجموعی طور پر اٹھائیس انتیس بیٹے (جن میں بمشکل ایک دو لاولد) باقی ستائیس اٹھائیس کی اتنی اولادیں اور ان کے اتنے اتنے نونہال... اور معلوم ہوتا تھا ابھی ہم چار پیڑھی ہی اترے ہیں کہ ایک وضاحتی شجرہ اور تھما دیا گیا کہ بیٹا ذرا اب ماؤں کی طرف سے ان چاروں پیڑھیوں کا حساب تو کر لو۔

اور یہاں سے ایک تہ دار عذابِ مزید شروع ہوتا تھا۔ اس لیے کہ کہیں خال خال انحراف کے سوا یہ خاندان آپس میں ہی شادیاں کرتا رہا تھا کیوں کہ ہڈی اور خون کے تحفظ کا

سوال تھا اور اس بات نے میرے لیے ایک عجیب صورتِ حال پیدا کر دی تھی۔ یعنی ایک رشتے سے جو صاحب میرے دادا یا نانا ہیں، وہ دوسرے حساب سے چچا اور تیسرے، ذرا دور کے رشتے سے، ماموں ہوتے ہیں اور اس میں شک و شبہ کی کوئی گنجائش نہیں... کئی ہزار کاغذوں پر اسی طرح لکھا ہے۔ اور اب جو یہ صاحب میری پھوپھی کی صاحب زادی سے شادی کرنے پر تلے ہیں تو یہ میرے بہنوئی بن جائیں گے اور ذیلی شاخ شجر، جدول پانچ کے حساب سے دیکھو تو یہی صاحب میرے بھائی بنتے ہیں، ہر چند کہ یہ رشتہ ذرا گھما کر ہے۔

اس عذاب سے گھبرا کر میں باقاعدہ رو پڑتا۔ تب ایسے میں مئی دادا خدا کے بروقت فرشتوں کی طرح میری مدد کو آتے اور اسم نویسی کا مسئلہ پانی کر دیتے۔ گھنٹوں میرے پاس بیٹھ کر گتھیاں سلجھاتے اور ہمت بندھاتے۔

خود ان کے شجرہ نسب کے بارے میں سوال کرنے کا ہمیں خیال ہی نہیں آیا۔ یا آیا ہوگا تو دھویوں کی اڑائی ہوئی افواہوں کے تناظر میں یہ سوچ کر کہ مئی دادا اس بارے میں بہت حساس ہیں، ہم لڑکوں نے کبھی پوچھا نہیں ہوگا۔ ایک بار کسی بزرگ خاتون نے خوش مزاجی سے پوچھ لیا کہ مجید! تو سب کے شجرے یاد کیے بیٹھا ہے، خود اپنا شاخ شجر بھی یاد ہے تجھے؟ تو اتنی ہی خوش مزاجی سے بولے، ”ہاں بیا! کیوں نہیں۔ سنو، سمیرا بنے سمیرا بنے سمیرا بنے ابدل مزید کھاں ایسپ جی“ اور ایک زبردست قہقہہ مار کر ہنسے۔ نادر شاہ درانی کا یہ تاریخی لطیفہ بھی انھیں چچا نے ہی سنایا تھا۔

ہم لڑکوں کے لیے ان کی جو حیثیت تھی، اگر اسے کسی ایک دو لفظی اصطلاح میں بیان کیا جاسکتا تو وہ اصطلاح تھی ”ماہر پشتو نیات“ کی۔ وہ ہمارے لیے ”پٹھان ساگا“ کے عالم تھے مثلاً یہ کہ پشتو زبان جو دنیا کی پُر شکوہ زبانوں میں سے ایک ہے، کچھ اس طرح بولی جاتی ہے کہ دغا دار روڑا داپستہ دابادام روڑا داپنگ اور یہ ہمیں بہت شان دار لگتا تھا کہ ہمارے پرکھے ایسی زبردست زبان بولتے ہوئے کفار کے علاقوں میں در آئے تھے اور انھوں نے سیاہ فام بھیلوں، کورکوؤں اور گونڈوں کے درمیان کھڑے ہو کر اعلائے کلمۃ اللہ کیا تھا اور یہ زبان بولی تھی۔ کیسا رعب پڑتا ہوگا مقامی آبادیوں پر!

اپنے ہم عمر کٹمب قبیلے والوں میں شاید میں سب سے زیادہ پُر تخیل واقع ہوا تھا۔ آنکھیں پھاڑے، منہ کھولے مئی دادا کا بولا ہوا ایک ایک لفظ پیتا رہتا۔ اور جب میری عمر کے

دوسرے لڑکے پتنگیں اڑانے اور ہاکیاں کھیلنے میں لگے ہوتے، میں باڑے کی کوٹھریوں والی چھت پر چڑھ جاتا اور اپنے قبیلے کے وطن تیراہ سے ہزار ڈیڑھ ہزار میل دور، اپنے پشتون اجداد سے ڈھائی تین سو سال پرے، ٹین کی نالی دار چھت پر لیٹا ہوا قبائلی جنگیں لڑا کرتا یا بقول مئی دادادرہ خیبر میں ”ڈنڈم ڈنڈا اور تلوارم تلوارا“ کیا کرتا۔

گرمیوں کی چھٹیوں میں میرا پسندیدہ کھیل یہ ہوتا تھا کہ میں کاٹھ کباڑ والے تاریک کمروں میں گھس جاتا، یا تل گھروں میں اتر جاتا یا دھاووں پر چڑھ جاتا اور کھیتی باڑی کے آلات میں دبے ہوئے زنگ خوردہ آدھے پون ہتھیاروں میں سے اپنے مطلب کی کوئی چیز نکال کر اسے اپنے طور پر صیقل کرتا۔ کبھی کوئی پوری تلوار، کنار بھی مل جاتی جو زنگ سے نڈھال ہو کر ہل یا ہسیئے یا پا سے کی طرح بوجھل اور بے ڈول ہو گئی ہوتی؛ تو اسے دیکھ کر مجھے عجیب سا خیال آتا اور میں سوچتا کہ یہ تلوار جواب ہل یا ہسیئے یا پا سے کی شکل ہو گئی ہے، یہ شاید ہمارا سپاہی پیشہ خاندان ہے اور اسے زمین پر پڑے پڑے ایک ”عدم استعمال“ یا ”غلط استعمال“ نے کسان بنا دیا ہے۔ سو میں اپنے زنگ خوردہ سپاہی کو بحال کرنے کی کوشش میں بہن بھائیوں کے روبہ رونا ٹک کیا کرتا تھا۔ پر دادا کی کام دارمحمل کی پھٹی ہوئی فرغل پہن کر، کمر سے آدھی پون تلوار باندھ کر میں پشتو مکالمات میں (جو ظاہر ہے مئی دادا کی ایجاد ہوتے تھے) کفار کو للکارا کرتا، پشتو رجز پڑھا کرتا۔ مئی دادا کو یہ نالک اور ہتھیاروں کی یہ بحالی بہت اچھی لگتی تھی۔ وہ گھنٹوں ہم لوگوں کے ساتھ اس کھیل میں شریک رہتے کیوں کہ ان کا بیان تھا کہ وہ ہتھیاروں کے درمیان پیدا ہوئے تھے۔ ان کو ہر قسم کے ہتھیاروں سے عشق تھا۔

۳۶-۴۷ء کے پُر آشوب زمانے میں پڑوس کی غیر مسلم ریاست سے مسلمان ہجرت

کر کے ہمارے شہر آ رہے تھے، کیوں کہ ہمارا شہر مسلمان اکثریت کا شہر تھا، شاید اب بھی ہوگا اور یہ پٹھانوں کی بسائی ہوئی ریاست تھی۔ مئی دادا ایک روز ریلوے اسٹیشن سے گھیر گھار کے صیقل گروں، اسلحہ سازوں کا ایک خاندان لے آئے اور انھیں باڑے میں بٹھا کر ابا کی تلاش میں اسکول پہنچ گئے۔ پتا نہیں کس طرح ابا کو قائل کر لیا کہ بے چارے بے آسرا لوگ ہیں۔ جہاں چار کنبوں کو باڑے کی کوٹھریوں میں پناہ دی ہے تو میاں! ان کے لیے بھی جگہ نکال لے۔ پھر مئی دادا نے بڑی کوشش اور سیاست سے اسلحہ سازوں صیقل گروں کے لیے ایک کوٹھری خالی کرائی، لکڑی کے کھوکھے لالا کر تختے نکالے اور جگہ کر، باڑے میں ایک چھوٹا سا کمپاؤنڈ بنا دیا۔

اسلحہ سازوں، صیقل گروں نے دوسرے ہی دن گڑھا کھود کر دھونکنی نصب کر دی اور کھٹا کھٹ چھریاں، تلواریں بنانی شروع کر دیں۔ پہلا زنبیہ مئی دادا کے لیے تخلیق ہوا؛ جس کے نیام پر اماں کی پرانی مٹھلیں صدری سے حاصل کیا ہوا کپڑا مڑھا گیا اور مرحوم تنچے کے بعد مئی دادا ایک اصل نسل زنبیہ کے مالک بن گئے۔ تنچے کی گم شدگی اور زنبیہ کے حصول کے درمیان کی عذاب ناک مدت کے بارے میں پہلی بار مئی دادا تقریباً مسکرا کر کہنے لگے، ”یہ یوتھنچا گایب ہوا ہے تو اس میں بھی مالک کی کوئی نہ کوئی مصلے ت ہوئے گی۔ کیا پتا میں گھسے میں کسی بھان کے گھوڑے کے پیٹ میں جھونک دیتا، بلا وجے لینے کے دینے پڑ جاتے۔ پلس کچیری ہوتی پھرتی۔“ کسی نے خدشہ ظاہر کیا کہ مئی دادا تنچا لے لینے اور زنبیہ دے دینے میں مالک کی کیا مصلحت ہو سکتی ہے۔ اب آپ کسی گھوڑے کے پیٹ میں زنبیہ اتار دیں گے۔ تو زور سے ہنسنے اور زنبیہ کے مٹھلیں نیام کو تھپکنے لگے، ”ابے کیا کھوجی سمج لیا ہے۔“

رتن ناتھ سرشار کے خوجی سے میرے چچا نے اور سروانٹے کے ڈون کیہوٹے سے میں نے متعارف کرایا تھا۔ مگر کیہوٹے ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہتے تھے، ”گورے سب... تیا ہوتے ہیں۔“

یہی زمانہ تھا کہ ریاستی حکومت نے آتشیں اسلحہ اور چند انچ سے زیادہ پھل کے ہر دھاردار آلے کے لائسنس کی سختی سے پڑتال شروع کر دی۔ نئے لائسنس جاری ہو رہے تھے مگر بڑی سفارشوں کے بعد۔ اور لائسنس کی سالانہ فیس بھی ہوتی تھی جو بڑی ”جیادتی“ کی بات تھی، مگر پہلا مسئلہ لائسنس کا حصول تھا۔ مئی دادا نے اماں کی خوشامد کرکرا کے ماموں سے سفارش کروائی۔ وہ پولیس میں کوئی توپ افسر تھے۔ اور مئی دادا کا کام بن گیا۔ زنبیہ کا بارہ آنے سالانہ کا لائسنس جاری ہو گیا۔ مئی دادا کو یہ بارہ آنے ہمیشہ کھلتے رہے مگر انھیں یہ اطمینان ہو گیا کہ ان کا زنبیہ اب کوئی بھان کی گھوڑی گورمنٹ بھی نہیں چھین سکتی، دوسروں کا ذکر ہی کیا۔ اماں نے اور ماموں نے سفارش گزارنے سے پہلے مئی دادا سے تقریباً حلف اٹھوایا تھا کہ وہ کسی کو اس زنبیہ سے دھمکائیں گے نہیں۔ ”ناہیں میاں! جیسی چاہے کم لے لو، میں کسی ازل گر پھتا بھان کے.....“

مئی دادا سال میں ایک بار خود اپنا لائسنس اور میرے ابا، تایاؤں، چچاؤں، پھوپھاؤں، خالوؤں کے اور میری اماں کے نام کے بندوقوں، رانفلوں، تیغوں، تلواروں،

خنجروں، کناروں، کرچوں کے لائنس اکٹھے کرتے اور فیس بھرنے کے لیے لائن لگاتے۔ واپس آتے تو مردانہ ڈیوڑھی سے ہی بڑبڑانا شروع کر دیتے کہ غضب خدا کا، ایک زمانہ وہ دیکھا سنا تھا کہ گدی نشین تو نہیں تھے مگر فلاں محمد خاں کے محل پے پانچ پانچ تو پیس چڑھی رہتی تھیں۔ ”مزال تھی کوئی ازل گر پھتا بھان کا گھوڑا نجر بھی ڈال کے دینا سکتا“... اور فلاں محمد خاں بھی اگرچہ گدی نشین نہیں تھے مگر ”ون کے کنے سو لھے سو تر واریں تھیں۔“ وہ وہ سروہیاں، تیغے، کھانڈے، کرچیں، زنیے، کناریں، کھکھریاں، پیش قبض تھے کہ رہے نام مالک کا۔“

ابا کہتے تھے، مجید کو تو ریاست کے اسلحہ خانے کا داروغہ ہونا چاہیے تھا، ہتھیار دیکھ دیکھ کر اس کا خون بڑھتا رہتا۔ پھر حکومت نے حکم جاری کیا کہ تمام ہتھیار سرکاری مال خانے میں جمع کرادیے جائیں۔ مئی دادا نے ڈوبتے ہوئے دل کے ساتھ یہ خبر سنی۔ دو روز تک مغلظات بکتے رہے۔ غصہ ذرا ٹھنڈا ہوا تو میرے دو تین بزرگوں کو اپنا ہم خیال کیا اور ابا کو مشورہ دیا کہ لائنس والے ہتھیار بے شک جمع کرادیے جائیں مگر کونوں کھدروں، تل گھروں میں، دھاووں پر اور دیواروں میں پرکھوں کی جو امانتیں محفوظ ہیں، ان کا کہیں کوئی اندراج نہیں ہے سو ان کو صیقل کرا کے تیار رکھا جائے۔ زمانہ خراب ہے اور پٹھان بچے تو اچھے زمانے میں بھی تیار رہتے ہیں۔

ابا علی گیرین تھے، اصول پرست آدمی تھے، انھیں حکومت کے واضح احکام کی خلاف ورزی کسی صورت منظور نہیں تھی۔ پھر ان کا کہنا تھا کہ سو پچاس برس کے دفن کیے ہوئے ہتھیار اب کھاد بن چکے ہوں گے پھر اس تردد بے جا سے کیا حاصل؟ اس لیے اس معاملے کو یہیں ختم کر دیا جائے۔ مئی دادا بظاہر مایوس ہو کر بیٹھ رہے مگر ہم لڑکے دیکھ رہے تھے کہ ان کے گرد و پیش اور ہمارے دہرے دالانوں، دھاووں، تل گھروں، زینوں میں ایک پراسرار سرگرمی جاری ہے جس کا ابا کو کوئی پتا نہیں۔

لائسنس دار اسلحے جمع کر دیے گئے۔ دو تانگوں میں کٹب قبیلے کے دو چار بڑے اور مئی دادا ہتھیار لا کر پولیس کے مال خانے پہنچے اور رسیدیں کٹوا کر خالی ہاتھ گھر لوٹ آئے۔ میں اسکول سے آیا تو دیکھا کہ مئی دادا ڈیوڑھی میں دیوار سے ٹیک لگائے سر نہوڑائے اکڑوں بیٹھے ہیں۔ یوں لگتا تھا، اپنے کسی خون کے رشتے کو مٹی کے سپرد کر آئے ہیں۔ دکھ اتنا گہرا تر گیا تھا کہ آج مغلظات بھی نہیں سنا رہے تھے۔ پھر جو تین چار دن بعد

میرے ایک تایا کے ہتھیار جمع کرانے مال خانے گئے تو مئی دادا لوٹ کر نہیں آئے۔

خبر آئی کہ انھیں گرفتار کر لیا گیا ہے؛ کو تو الی خاص کے لاک اپ میں بیٹھے ہوئے ہیں اور مغلظات سے شغل ہے۔ ہاں ہاں کر کے تقریباً پورا قبیلہ دوڑ پڑا۔ مئی دادا ویسے تو شاید ملازم تھے مگر میرزائی خیلوں کی ڈیوڑھیوں کے پروردہ تھے اور سب سے بڑی بات یہ کہ دوسرے قبیلے کے ہی سہی، پٹھان تھے... وردیوں کے نرغے میں انھیں اکیلا کیسے چھوڑا جاسکتا تھا۔

اماں تانگے میں بیٹھ ترنت اپنے پولیس بھیا کے یہاں پہنچیں اور میز پر سروتا مار مار کر بھائی کو حکم دے دیا کہ ابھی اسی وقت مئی دادا کو گھر آ جانا چاہیے۔ میاں... آج ہمارے پشتینی اہلکار کو... ایک بوڑھے کو بند کر دیا ہے تم نے، تو کل ہمارے بچوں کو باندھ لے جاؤ گے۔ پرکھوں نے کیا اسی لیے اپنی تلواروں سے جنگل کاٹ کاٹ کے یہ ریاست بسائی تھی؟ آئیں! اس روز میری اماں کا جلال دیدنی تھا۔ بولتی ہی چلی گئیں۔ غالب کے شاگرد نواب یار محمد خاں شوکت کی پوتی تھیں۔ ایک جید نواب زادے کی فکر مندی، ایک توانا شاعر کی طلاقت لسانی اپنے جوہر دکھا رہی تھی۔

ماموں کی کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا، ”مگر منجھلی آپا! پتا تو چلے کہ اسے کیوں بند کیا گیا ہے... سنیے تو... میں بھیجتا ہوں کسی کو... آپ اندر تو چلیے۔ کھانا تو کھا لیجیے۔“ مگر اماں چٹان کی طرح ان کی مردانہ بیٹھک میں جمی رہیں اور جلال کے عالم میں بیٹھی چھالیا کرتی رہیں۔ ماموں کا پورا گھر ایک ایک بسکٹ اور ایک ایک پیالی چائے پر صبر کیے انھیں گھیرے بیٹھا رہا۔ ماموں کو وردی پہن کر خود جانا پڑا۔

دو گھنٹے بعد مئی دادا ہماری ڈیوڑھی میں بیٹھے تھے اور کوئی دو درجن میرزائی خیلوں کو اپنی روداد سنار ہے تھے۔

”اجل گرفتہ“ اور وہ دوسری بات ہٹا کر میں جو سمجھ سکا، وہ یہ تھا کہ جب وہ تایا کے ہتھیار جمع کرانے مال خانے پہنچے تو حوالدار سکھیا رام؛ جو ذات کا تیلی ہے اور وردی پہننے کے باوجود کسی طرف سے سپاہی نظر نہیں آتا، اس دن مال خانے کا انچارج تھا۔ مئی دادا اور سکھیا رام کی پہلی مشترکہ بد قسمتی یہی تھی کہ ڈیوٹی پر سکھیا رام تھا۔ اگر بیلا سنگھ ٹھا کر یا گلاب خاں حوالدار ڈیوٹی پر ہوتے تو وہ کچھ نہ ہوتا جو ہوا۔

پہلے تو سکھیا نے ہنس کر ان کی طرف دیکھا۔ دوسری واضح حرمز دگیاں یہ کیس کہ

انھیں بڑے میاں کہہ کر مخاطب کیا اور چپراسی کے اسٹول پر بیٹھنے کی دعوت دی۔ مئی دادا ایک طرف کھڑے اسے گھورتے رہے۔ آتش فشاں اندر ہی اندر کھول رہا تھا۔ اس کی آخری اور ناقابلِ معافی بد معاشی جس سے آتش فشاں کا ڈھکنا ایک ”بوم“ کے ساتھ اڑ گیا، یہ تھی کہ اس تیلی کے بچے نے ہمارے ہتھیاروں میں سے ایک ہتھیار اٹھالیا اور بے نیازی سے بیڑی پیتے ہوئے اس سے اپنی پنسل چھیننے لگا۔

یہ نواب غوث محمد خاں فتح جنگ بہادر کا پیش قبض تھا؛ جس کا قبضہ سنگِ یشب کا تھا، جس پر سنگ تراش نے پھول پتیوں کے نقش کچھ اس طرح ابھارے تھے کہ لگتا تھا موم سے ڈھال کر نکالے گئے ہیں۔ پیش قبض کے ایک چوتھائی پھل پر سونے کے پانی سے خلد آشیانی پر کھے کا نام نامی درج تھا اور فارسی زبان میں خبر دی گئی تھی کہ یہ ہتھیار ایک ایرانی کاری کرنے بطور خاص نواب بہادر کے لیے تخلیق کیا ہے کہ جو زمین پر کھڑے ہو کر روبہ رو شیر کا شکار کیا کرتے ہیں۔

سو پہلی بات تو یہ کہ سکھیا رام ذات کا تیلی تھا اور آخری بات یہ کہ بیڑی پیتے ہوئے نواب غوث بہادر جنت مکانی کے پیش قبض سے پنسل چھیل رہا تھا۔

مئی دادا نے ”ازل گر پھتا“ یا ”بھان کے“ کہہ کر جو ایک زناٹے کا تھپڑ مارا تو حوالدار سکھیا کی بیڑی اور پنسل دور جا پڑی پھر انھوں نے اس تیلی کے پودے کو اطلاع دی کہ یہ شیر بچوں کی میراث ہے... تیری ترکاری کاٹنے والی چھری نہیں؛ اور یہ تیرے ہاتھ لگنے سے تو نجس ہو ہی چکی تھی مگر میں نے صبر کیا اور اب جو تو بھان کے گھوڑے اس سے پنسل چھیلتا ہے، اب تو میں تجھے زندہ نہیں چھوڑوں گا وغیرہ۔

ظاہر ہے اس کے بعد مئی دادا کو کوتوالی خاص کے لاک اپ میں منتقل کر دیا گیا۔ کوتوالی انچارج بڑے چکر میں تھا۔ تین فیتوں والے ایک چھوٹے موٹے پولیس افسر کو، جو سرکاری وردی میں ڈیوٹی پر تھا، ایک سویلین نے زد و کوب کیا تھا اور سرکاری فرائض کی بجائے آوری میں مزاحم ہوا تھا۔

مگر ریاست ابھی یونین میں ضم نہیں ہوئی تھی۔

ایک پٹھان نواب ابھی ماہی مراتب کے سائے میں ریاستی گدی پر بیٹھا مقدور بھر فرماں روائی کرتا تھا اور ایک ہزار سے زائد مسجدوں کے ایک ہزار سے زائد منبروں سے ابھی

اس کے نام کا خطبہ پڑھا جا رہا تھا کہ خلد اللہ ملکہ و سلطانہ... ہر چند کہ ریاستی پرچم کا مستول ہاتھوں سے پھسلا جاتا تھا اور نئی دلی میں بات چل پڑی تھی کہ ریاست ضم کر دی جائے گی۔

تو نواب کے خوش حال، نیم خوش حال، تعلیم یافتہ، نیم تعلیم یافتہ اور مہذب، نیم مہذب مگر با اثر کٹمب قبیلے کے معززین، اور ذرا کم معزز، کئی سو پٹھان کو توالی خاص کو گھیرے کھڑے تھے کہ اتنے میں ماموں پہنچ گئے۔ انھوں نے علی گڑھ سے نفسیات میں فاضل کی سند خواہ خواہ تو نہیں لی تھی۔ دس بیس منٹ میں اپنے توپ عہدے کی دھونس دیے بغیر؛ بڑے پیار سے، اپنے اس ماتحت افسر کو قائل کر لیا کہ یہ غنڈا گردی اور فوج داری سے زیادہ تاریخ کی بازی ہارتے ہوئے ایک غیرت مند قبیلے کی جھلاہٹ اور مجروح انا کا مسئلہ ہے۔ کو توالی انچارج ذات کا چوہان راجپوت تھا اور تلوار باندھنے والے ہارتے ہوئے ہاتھوں کی تکلیف کو شاید سمجھتا تھا۔ علاوہ ازیں ایک بے وقوف، غیر سپاہی ہیڈ کانسٹیبل کی وجہ سے اپنے افسرانِ بالا کے لیے مزید مسائل پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

حوالدار سکھیا رام کو جواب طلبی کا پروانہ ملا کہ ہر گاہ ہمارے علم میں آیا ہے کہ تم نے ریاست سے متعلق نہایت بیش قیمت، نادر اور تاریخی اہمیت کے حامل ایک ہتھیار کو کہ جو تمہاری تحویل میں وغیرہ وغیرہ... سکھیا رام کو لائن حاضر کر دیا گیا۔

ابا نے مئی دادا کو آرام کرنے کے لیے، زمینوں پر بھیج دیا۔ یہ اس لیے بھی ضروری تھا کہ وہ ہر کس و ناکس کو حوالدار سکھیا، سابق انچارج اسٹیٹ مال خانہ کے زوال کی داستان سناتے پھرتے تھے۔

مگر کسے معلوم تھا کہ مئی دادا کا تقریباً زوال بھی ہم لڑکوں کو دیکھنا پڑے گا۔ ایک بات پر ابا ان سے سخت ناراض ہوئے، باڑے کی ایک کوٹھری خالی کرائی گئی، اور مئی دادا کو پہلی بار ہماری ڈیوڑھی سے کچھ دور چھاؤنی چھانا پڑی۔

ہوایوں کہ دادا کے انتقال کے بعد شاید پہلی بار ہماری ایک بہن قبیلے سے باہر بیاہی گئی۔ لڑکا اعلیٰ تعلیم یافتہ مگر سخت سویلین تھا کہ اس کا تعلق کسی مارنے دھاڑنے والے قبیلے سے نہیں تھا۔ شادی کے بعد، ہمارے یہاں کے دستور کے مطابق، داماد کو لے جایا گیا کہ وہ مئی دادا کو سلام کرے اور مئی دادا اسے دو روپے سلامی کے دیں۔ ظاہر ہے، وہ اس کے بزرگ تھے۔ کوئی بوڑھا ادھیڑ اس وقت موجود نہیں تھا اس لیے ہم لڑکوں کو مقرر کیا گیا کہ داماد کو لے جا

کر رسم پوری کرائیں۔ مئی دادا علیل تھے، نئے داماد کو دیکھ کر مسکرائے، جیوٹ کر کے اٹھ بیٹھے۔ ہم نے دائیں بائیں تکیے لگا دیے۔ سلام لے کر انھوں نے داماد کے سر پر ہاتھ پھیرا، سلامی کے دو روپے عطا کیے اور پھر ”پشتو نیات“ کی بساط پھیلا دی۔

ڈیڑھ دو گھنٹے تک نیا داماد منہ کھولے مئی دادا کے انکشافات سنتا رہا۔ ”ساکھ سجر“ پر ایک سیر حاصل تبصرے کے بعد مئی دادا نے داماد کو بتایا کہ یہ میرزائی خیل بڑے جیوٹ والے کٹمب ہیں، خونخوار اتنے کہ ”مزال“ ہے کوئی ان کی طرف ٹیڑھی آنکھ سے دیکھ لے؛ اور یہ کہ جو چالیس بیالیس گھر اس محلے میں ایک ساتھ چلے گئے ہیں، یہ ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ ہر گھر نے دوسرے گھر میں ایک کھڑکی اتنی بڑی نکال رکھی ہے کہ ایک سالم آدمی مع تلوار یا ”رفل“ کے گزر سکتا ہے۔ اگر محلے کے اس سرے پر میرزائی خیلوں کے کسی گھر پر حملہ ہو تو ”دس منٹی“ میں اس سرے سے اس سرے تک، سو سو مسلح پٹھان بچے صورت حال پر قابو پانے اور حملہ آور کو تھس نہس کرنے کے لیے جمع ہو سکتے ہیں۔ مثلاً سنہ فلاں میں فلاں محمد خاں ایک ذرا سی بات پر نائب کو توال کو مع اس کے گھوڑے کے قتل کر دینے کے بعد کھڑکیوں کھڑکیوں، گھروں گھروں گزرتے ہوئے صاف نکل گئے تھے۔ تو یہ فائدہ ہے ان مربوط مکانات کا۔ پھر اس طرح عزیز پیاروں میں آپس میں میل محبت بھی رہتی ہے۔ اس کی مثال مئی دادا نے یوں دی؛ کہ یہ جو اپنے بچو میاں بیٹھے ہیں تو ان کے فلاں پر دادے نے انھی کے فلاں پر نانے کو صرف اتنی سی بات پر قتل کر دیا تھا کہ دونوں ایک جگہ ولیمہ کھانے گئے تھے؛ پر دادے پہلے سے موجود تھے کہ پر نانے آئے۔ دونوں میں جاسیداد پر معمولی سا مقدمہ چل رہا تھا (ویسے کوئی خاص بات نہیں تھی۔ ان لوگوں میں نالشیں، فوجداریاں ہوتی ہی رہتی تھیں؛ ڈنڈم ڈنڈا، تلوارم تلوار بھی چلتی رہتی تھی، کس لیے کہ شیر بچے ہیں آخر کچھ نہ کچھ تو کریں گے ہی) اب جو ان کے پر نانے ولیمے کی فرشی نشست پر جانے کے لیے پاپوشیں اتارنے لگے تو ان کی ایک پاپوش ان کے اس پر دادے کی پاپوش پر چڑھ گئی کہ جو پہلے سے موجود تھا اور نووارد پر کھے کی حرکات و سکنات کا بغور مشاہدہ کر رہا تھا۔ پاپوش کا پاپوش پر چڑھنا تھا کہ ان کا پہلے والا پر کھا چمک کر اٹھا اور خبردار کہہ کر تلوار کا جو بھر پور ہاتھ مارا ہے تو دوسرے پر کھے کی گردن بھنسا سی دور جا پڑی۔

داماد کے چہرے سے پسینا بہہ بہہ کر شادی کی نئی شیروانی کے کالر میں جذب ہوتا جا رہا تھا۔ وہ دو تین بار پانی پی چکا تھا اور حد درجہ بے چین تھا۔ دیر بھی بہت ہو گئی تھی، ہم اسے

زنانے میں لے آئے۔

دوسرے دن طوفان پھٹ پڑا۔ مئی دادا بیمار تھے، ان سے تو ابانے کچھ نہیں کہا، اماں کے سامنے گرجتے برستے رہے کہ کیا مجید کا بالکل ہی دماغ خراب ہو گیا ہے۔ داماد کو اس قدر دہلا دیا کہ وہ گھر جا کر گم صم لیٹ گیا۔ لڑکی سے پوچھتا تھا کہ کیا یہ سب باتیں صحیح ہیں؟ اور کیا تم قاتلوں، خوں خواروں کی اولاد ہو؟ کیا تمہارے یہاں بات بات پر تلوار مٹلوارا ہوتی ہے؟ پوچھ رہا تھا: تمہارے گھر میں اب کتنی تلواریں ہیں؟ اور کیا سب لوگ اب بھی ویسے کی دعوتوں میں تلواریں باندھ کر جاتے ہیں، تاکہ ایک دوسرے کو قتل کرنے میں آسانی ہو؟ حد ہو گئی۔ آخر یہ گڑے مردے اکھاڑنے کی کیا ضرورت تھی؟ ہر گھرانے میں کچھ نہ کچھ پاگل پن ہوتا ہی رہتا ہے۔ تو کیا اس کو اس طرح مشتہر کیا جاتا ہے؟ لاحول ولا قوۃ!

ہفتے بھر بعد باڑے میں ایک کوٹھری تیار کر دی گئی اور مئی دادا کو وہاں فروکش ہونا پڑا۔ ڈیوڑھی سے دور ان کی بیماری نے شدت اختیار کر لی۔ ویسے تو انھیں ہم سب گھیرے رہتے تھے؛ مگر وہاں ان کا دل نہیں لگتا تھا۔ انھیں پتا چل گیا تھا کہ داماد والے معاملے میں میاں خفا ہو گئے ہیں اور اسی لیے ان کو ڈیوڑھی سے دور کر دیا گیا ہے۔ بڑی حسرت ناک باڑے پر اور اس کے گرد و پیش چھائی ہوئی تھی۔ ایک روز کہنے لگے، ”اب مزید کہاں ایسپ جی جمین کا بوجھا بنتا جا رہا ہے۔ چل چلاؤ کا ٹیم ہے۔“ وہ ابا کو بلوا کر اپنی صفائی پیش کرنا چاہتے تھے۔ میں نے جا عرض کیا کہ مئی دادا بہت بیمار ہیں، آکر دیکھ لیجیے۔ ابا آئے تو جیسے مئی دادا کھل اٹھے۔ حکیموں ویدوں کے ”نکھسوں“ پر باتیں کرتے رہے... ”ازل گر پھتا“ اور ”بھان کے“ وغیرہ بھی شروع ہو گیا۔ پھر اچانک بڑی چمک دار آواز میں، جیسے ابا کو کوئی لطیفہ سنا رہے ہوں، کہنے لگے کہ میاں، وہ داماد والے معاملے میں آپ خفا ہو گئے، شاید اسی لیے مجھے یہاں پھنکوا دیا۔ ابانے کچھ ہوں ہاں کر دی۔ میں دیکھ رہا تھا کہ مئی دادا کی بیماری سے، ان کی حسرت ناک، ان کے لطیفہ سنانے کے انداز سے؛ جو ظاہر ہے ابا کو راضی کرنے کی بڑی رقت انگیز کوشش تھی، وہ بہت متاثر ہوئے ہیں۔ مئی دادا کہنے لگے، ”میاں! ویسے تو آپ ما سے الّا بال بچے والے ہو، برے میرے آگو کے بچے ہو۔ میری مصلے تیں آپ نہیں سمجھ سکتے۔ یہ یو کہتے ہیں ناکہ داگر باکستن دارو جے اوّل، تو میں نے صائب جادے کو کھبردار کر دیا ہے کہ ہاں کھبردار! پٹھانوں سے مالا ہے... اب صائب جادے جیادہ کج چیں پٹاکھ

نہیں کریں گے انسا الّا۔“

ابا نے اسی دن مئی دادا کی ڈیوڑھی میں بحالی کے احکام صادر کر دیے۔ تو جیسے سوکھے دھانوں پانی پڑ گیا۔ مئی دادا کی حالت بہتر ہونے لگی مگر وہ بہت بوڑھے ہو گئے تھے، زیادہ دن چلتے نظر نہیں آتے تھے۔ اماں نے ان کی محبوبہ جمرت کو ان کی دیکھ بھال کی اجازت دے دی۔ وہ آکر منہ دھلاتی، کپڑے بدلواتی، اپنے ہاتھ سے دلایا کھلاتی، پرچ میں انڈیل انڈیل کر چائے پلاتی۔ مہینوں یہ سلسلہ چلتا رہا۔ ابا نے ڈاکٹروں کو دکھایا، کئی طرح کے علاج بدلوائے مگر مئی دادا پھر سنبھل نہ سکے، گرتے ہی چلے گئے۔ ان کا آدھا بستر سمیٹ دیا گیا۔ چارپائی کی بان دو طرف سے کھینچ کر درمیان میں ایک خلا بنا دیا گیا اور اس کے نیچے تام چینی کا تسلا رکھ دیا گیا۔ حوائج ضروری کے لیے وہ اب بستر سے اٹھنے کے قابل نہیں رہے تھے۔ جمرت نے ان کی صفائی ستھرائی کی سب ذمہ داری سنبھال لی تھی مگر وہ کنبے دار عورت تھی، رات میں نہیں رک سکتی تھی۔ راتوں میں، میں دیکھتا کہ ابا گرم پانی کے لوٹے لیے کئی کئی بار ڈیوڑھی کی طرف جاتے اور کئی بار کم زور سی آواز میں مئی دادا کے احتجاج کرنے اور رونے کی آواز آتی۔ وہ ابا سے خدمتیں نہیں لینا چاہتے تھے۔ اماں نے ان کی دیکھ بھال کے لیے اپنے میکے سے کوئی ملازم بلوانے کو کہا تو مئی دادا نے سختی سے منع کر دیا۔ میرے ابا ان کے سامنے کے بچے تھے، بیٹوں کی طرح تھے۔ تو بیٹوں کی بات ٹھیک ہے ”میں گیروں کے سامنے ڈھکا کھلا نہیں ہو سکتا۔ بیا! وس سے تو اچھا ہے مجھے اسپتال پہنچا دیو“ مگر سب جانتے تھے، وہ اسپتال میں دو گھنٹے بھی نہیں نکال سکیں گے۔ ختم ہو جائیں گے۔ انھوں نے اعلان کر دیا تھا کہ میں اس گھر میں مرنا چاہتا ہوں۔ وہ کئی کئی گھنٹے غشی کی حالت میں پڑے رہتے۔ دن میں جمرت اور ہم لڑکے، رات میں ابا، امکان بھران کو آرام پہنچانے کی کوشش کرتے تھے۔ مگر سب تھک چکے تھے۔

اور اس تھکن اور بوکھلاہٹ میں جمرت کو مئی دادا کی ایک واضح ہدایت کا خیال نہیں رہا۔ وہ غشی کی حالت میں تھے کہ میں نے انھیں ”ڈھکا کھلا“ دیکھ لیا۔ میں نے دیکھا کہ ان کی مسلمانیاں نہیں ہوئی تھیں۔

اپنے چھوٹے سے ذہن میں بہت سے سوالات لیے میں خاموشی کے ساتھ ڈیوڑھی سے چلا آیا۔ اس نئی اور عجیب بات کی سنناہٹ مجھے چین نہیں لینے دیتی تھی۔ چھت پر گیا، باڑے میں ٹہلا، اماں کے پاس بیٹھا۔ بہت دیر آٹھ باندھے گھومتا پھرا۔ مگر مئی دادا بہت

بیمار تھے اور وہ ہم سب سے بہت محبت کرتے تھے۔ میں پھر ڈیوڑھی میں پہنچ گیا۔
میں نے سنا، ان کے ٹھہر ٹھہر کر غصہ کرنے اور رونے کی کم زور سی آواز آرہی تھی۔
جمرت نے شاید انھیں بتا دیا تھا کہ کیا غضب ہو گیا ہے۔

”بھان کی گھوڑی مرتے مرتے کا لک لگوا دی تو نے... لڑکے کیا سوچیں گے۔“ پھر
ان کے رونے کی آواز آئی۔ کچھ دیر خاموشی رہی ”ٹھی ی ی ی ک ہے۔“ تیلی کا لمدا پٹھانوں
کے پالے سے پٹھان تو نہیں بن جاتا۔“

میں اب ڈیوڑھی میں نہیں رہ سکتا تھا۔ پھر باڑے کی طرف نکل گیا۔
تو کیا مئی دادا ساری زندگی ہم سے جھوٹ بولتے رہے؟ تو کیا محلے کے دھوبی ٹھیک
کہتے تھے؟ ایسا لگ رہا تھا جیسے شکر کا نام لے کر کسی نے مجھے مٹھی بھر ریت پکڑا دی ہے۔ مگر یہ
بات میں کسی سے کہہ بھی تو نہیں سکتا تھا۔

وہ چار دن اور زندہ رہے مگر یہ چار دن غشی اور بیداری کی بھول بھلیاں تھے۔
ان کے انتقال کے کئی مہینے بعد وہ ایک سوال جو اس سننا ہٹوں والے دن سے
برابر میرے ساتھ تھا، مجھے بے چین کیے ہوئے تھا، میں نے یک بارگی ابا کے سامنے رکھ دیا۔
ابا مسجد جانے کے لیے ڈیوڑھی سے گزر رہے تھے کہ مئی دادا کی کوٹھری کے سامنے مجھے خاموش
کھڑے دیکھ کر رک گئے۔ آہستہ سے میرے شانے پر ہاتھ رکھ دیا، بولے ”کیا بات ہے؟“
میں نے بات بتادی۔

وہ بہت دیر خاموش کھڑے رہے۔ پھر آہستہ سے بولے، ”وہ کوئی بھی تھے؛ تمہیں بس ایک
بات یاد رکھنی چاہیے کہ وہ تم سے محبت کرتے تھے اور چاہتے تھے کہ تم اپنے دادوں پر دادوں کی
طرح عزت کے ساتھ جینا سیکھ جاؤ... سمجھے! جاؤ اب کھیلو۔“ پھر وہ جاتے جاتے غصے سے پلٹ
پڑے، ”اور سنو، کون خبیث کہتا ہے وہ مسلمان نہیں تھے؟ کون کہتا ہے پٹھان نہیں تھے؟“



گھر

میں اپنی سلامتی کے خوف سے گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ میں گھر ہی میں رہنا چاہتا ہوں۔ اس لیے کہ باہر میلے چیکٹ تہبندوں والے دلاوروں کے رتھ دوڑ رہے ہیں۔ ان کے ہاتھوں میں شوخ رنگوں والے ایبوناٹ کے نیزے ہیں؛ جو دور سے پلاسٹک کے کھلونے دکھائی پڑتے ہیں، اور بظاہر بے ضرر لگتے ہیں، مگر میں ان کی ضرر رسانی کا عینی شاہد ہوں۔ انھوں نے ایک نیزہ میرے بھائی کی بائیں آنکھ میں اتار دیا ہے، جو اس کے کاسے سر کو توڑ کر سر کی پشت پر نکل آیا ہے، اور بہت بد صورت دکھائی دیتا ہے۔ سروں میں اس طرح نیزے کھب جائیں تو لوگ ٹوپیاں کس طرح اوڑھ سکتے ہیں اور لوگ سوکس طرح سکتے ہیں۔ سو اس دن کے بعد سے میرا بھائی ننگے سر گھومنے پر مجبور ہے۔

میں نے اس سے کہا بھی تھا کہ باہر مت نکلنا مگر نو جوانوں کو گھروں میں بند نہیں رکھا جاسکتا۔ وہ اس کتیا زندگی کو چھو کر دیکھنا چاہتے ہیں اور نیزوں کی زد پر آ جاتے ہیں اور ننگے سر ہو جاتے ہیں۔

میں تو ایک دفعہ کے بعد گھر سے باہر نہیں نکلا۔ مجھے ضرورت ہی نہیں پڑی۔ اس لیے کہ میرا یہ گھر ایک مکمل گھر ہے۔ میں چاہوں تو اس گھر کی خود کفالت میں کئی سو برس رہ سکتا ہوں اور مجھے یہاں سے کوئی نہیں نکال سکتا۔

میرا یہ گھر پہلے پہل برگد کے ایک چھتار درخت کے سائے میں بنایا گیا ہوگا۔ مگر رفتہ رفتہ یہ گھر پھیل کر پہلے برگد کے گردا گرد بنتا رہا، پھر برگد سے اونچا نکل گیا۔ اور اب برگد کی سب سے اونچی ٹہنیوں سے؛ جہاں دو پہروں میں ہریل اور مینائیں پناہ لیتی ہیں، میرے گھر کی سیڑھیاں شروع ہوتی ہیں۔ دراصل برگد کا یہ درخت مکان کے فرش میں دفن ہو گیا ہے۔ کبھی کبھی بڑا دکھ ہوتا ہے کہ ہم نے ایک زندہ چیز کو اپنی مسبریوں، چارپائیوں، تپائیوں اور سلفیچوں کے نیچے دفن کر رکھا ہے اور اس پر چل پھر رہے ہیں، تہبند بدل رہے ہیں، کھانسیں رہے ہیں اور دھما چوڑی مچا رہے ہیں۔

میں اپنی نوعمری اور ناتجربہ کاری میں اس زندہ برگد کو پتھر سے تراشا ہوا یا پیتل میں ڈھالا ہوا برگد سمجھتا تھا۔ اور کبھی کبھی السائی ہوئی دو پہروں میں جب دور سے چکی کی گھم گھم اور مرغوں کی جیسے جماہیاں لے لے کر بانگیں دینے کی افواہیں آتی تھیں؛ اور میں انھیں سن سن کر اونگھنے لگتا تھا، تو بڑی کاہلی کے ساتھ سوچتا تھا کہ یہ جو فرش سے کھنکار کر گلا صاف کرنے کی آواز آتی ہے اور یہ جو کوئی ہتھیار ڈالتی ہوئی آواز میں تااااا، نا، نا، نا ہو و و کہہ کر چپ ہو جاتا ہے، یہ برگد کی آواز نہیں ہو سکتی۔ اور اگر یہ برگد کی آواز ہے تو وہ برگد ایک گونجتا ہوا کھوکھلا ٹیوب ہے جو فرش کے نیچے دور تک اتر ا ہوا ہے۔ خوب چمچماتے ہوئے پیتل کے اس کھوکھلے تنے میں سے یہ چار ماترائیں تاااا، نا، نا، نا، ہو و و؛ ایسے گزر رہی ہیں جیسے ایئر کنڈیشننگ کے نمدہ لپٹے ہوئے ڈکٹس سے ٹھنڈی خوش بودار ہوا گزر رہی ہو۔ مجھے یہ خیال بھی نہیں ہوتا تھا کہ یہ ایک ٹھوس، گیلے اور زندہ برگد کی آواز ہو سکتی ہے؛ جس نے اپنی نرم دار جٹائیں زمین میں گاڑ رکھی ہیں، اور جس نے بے شمار ہریلوں اور میناؤں کو پناہ دے رکھی ہے، اور جسے میرے گھر کی تعمیرات نے ہوا اور دھوپ سے محروم کر دیا ہے۔

بہت دنوں تک مجھے یہ بھی وہم رہا کہ ہوا اور دھوپ تہبندوں کو سکھانے کے لیے فراہم کی جاتی ہے اور برگدوں اور ہریلوں اور میناؤں کو ان کی ضرورت نہیں ہوتی۔

مجھے پہلے دن سے یہی بتایا جاتا رہا تھا کہ میں دلاوروں میں سے ہوں؛ اور نیزے اور تہبند میری بنیادی ضرورتیں ہیں، اور ہوا اور دھوپ اور ندی ہمارے تہبند اور نیزے دھونے اور انھیں سکھانے میں کام آتی ہیں، اور ہمارے پاس قبر خداوندی کی طرح سبک رفتار تھہ ہیں۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب میں ایک بار بھی گھر سے باہر نہیں نکلا تھا... اور

میں ایک دفعہ کے بعد گھر سے باہر نہیں نکلا۔ میں باہر کس لیے نکلوں؟ میرے گھر میں، گھر کے گرد اگر د بڑی دل موہ لینے والی چیزیں ہیں۔ گھر کے پچھواڑے کی باڑ سے ملے ہوئے بانسوں اور سرکنڈوں کے چھدرے چھدرے جھنڈ ہیں؛ جن سے بچتی بچاتی پاترا ندی بہتی ہے۔ نقشہ نویسوں نے اسے کوئی نمبر دے رکھا ہے اور وہ اسے نالہ بارانی شمالاً جنوباً نمبری فلاں فلاں کہتے ہیں اور اپنی بے خبری میں اسے بہت مسکین جانتے ہیں۔ مگر چار پانچ دن لگاتار ایک ہی رفتار سے ننھی ننھی سوئیوں جیسی پھوہار بھی پڑتی رہے تو یہ پاترا ندی اپنی بانہیں اور جانگھیں پھیلا دیتی ہے اور آس پاس کے کھیتوں کو اپنی خواہش کا نشانہ بناتی ہے اور انھیں اپنی کاہل، تیل چڑی، آہستہ روشہوت میں لتھیڑ دیتی ہے۔ اور مجھے بڑی شرم آتی ہے جب میں اس کی بغلوں سے اور پیڑو سے جھانکتے ہوئے سرکنڈے اور بانسوں کے گیلے جھنڈ دیکھتا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے اپنے کسی محرم کو؛ جس سے کوئی جنسی ربط ممکن نہ ہو، برہنہ ستر دیکھ لیا ہو۔ تب میں؛ جو اس کا ستر اس کا ستر پوش ہوں، میں اپنی پلکیں گرا کر اس کی ستر پوشی کرنا چاہتا ہوں... اسے محفوظ دیکھنا چاہتا ہوں۔ پر ساون بھاؤں میں جہاں تک نظر ڈالو، یہ بھاری استوں والی ابلا، کالی مٹی پر اپنی کایا کا بوجھ ڈالنے آلس کے ساتھ کروٹیں بدلتی دکھائی دیتی ہے اور بڑی غیر محفوظ لگتی ہے۔ اور میں سوچتا ہوں کہ اسے کون سمیٹ سکتا ہے، کہاں تک سمیٹ سکتا ہے۔

ننھی سوئیوں جیسی پھوہار کہر کی دبیز چادر کی طرح دوسرے کنارے کے جانے پہچانے نشانوں کو ڈھانپ لیتی ہے اور ندی کا پاٹ کئی میل کا دکھائی پڑتا ہے۔ گہری دھند میں، ندی کے پار سے آوازیں کچھ اس طرح آتی ہیں جیسے گیوں کے پار سے آرہی ہوں۔ تب ایسے میں، میں ندی میں اتر جاتا ہوں اور کندھوں تک پانی میں ڈوبا ہوا ان آوازوں میں لپٹی ہوئی ایک خاص آواز کو ڈھونڈتا ہوں؛ جو پکار کر کہتی ہے کہ ہے پاترا، ہے پتیا، ہے دیشیا، ہے کلکنی! پھر یہی آواز ہچکیاں لے لے کر روتی بھی ہے۔

پتا نہیں کون بوڑھا بدمعاش ہے، جو ننھی ننھی سوئیوں کی ٹھنڈی دھند کے پار کھڑا ہوا ندی کو برے برے نام دے رہا ہے۔ میں کسی روز اسے گدی سے پکڑ کر اس کا منہ کچھڑ میں دے دوں گا۔

ایک روز میں نے چیخ کر کہا بھی تھا کہ او بڈھے سور، بکو اس بند کر! اور مارے غصے کے پانی ہی میں کھڑے کھڑے میرا پیشاب خطا ہو گیا تھا۔ یہ ایسی پریشانی کی بات تھی کہ میں

ندی سے نکل کر سیدھا اپنے گھر بھاگ آیا اور بہت دنوں تک پانی کے پاس نہیں گیا۔ بس گھر میں بیٹھا رہا اور برگد کی چار ماترائیں سنتا رہا کہ تاااا، نا، نا، ہووو۔

میں نے شاید ابھی تک نہیں بتایا کہ یہ آخری ماترا ”ہو“ ہوووم م م کی طرح گونجتی ہے اور اس میں کسی اچھی کمپوزیشن میں گتھے وائیولن کے کاؤنٹرز تک سنائی دیتے ہیں۔ کبھی کبھی پیتل کی ایک گھنٹی بھی ٹائم دیتی ہے۔ اس ہوووم م م کے آخری نوٹس، نوٹس نہیں ہوتے۔ وہ جھپٹے کے وقت کی طرح غیر یقینی سرحدوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ یہ شاید ایکو کی وجہ سے ہو، مگر مجموعی تاثر ایکو سے زیادہ گم شدگی کا تاثر ہوتا ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ ایک دفن کیا ہوا برگد اپنی ایک ماترا میں اتنی بہت سی باتیں رکھتا ہے۔ مگر ان باتوں کا پتا مجھے رفتہ رفتہ ہوا ہے۔ میں نے بتایا تھا کہ شروع میں تو میں اس زندہ برگد کو پتھر میں تراشا ہوا، یا پیتل میں ڈھالا ہوا ایک ڈمب برگد سمجھتا تھا۔ اور اپنی ندی کو نقشہ نویسوں کی طرح نالہ بارانی شمالاً جنوباً کہتا تھا۔ اور باڑے کے دروازے سے ملحق پرانی گھاس کے ڈھیر پر اکڑوں بیٹھی ہوئی، بنا بیلوں کی بیل گاڑی کو محض لکڑی اور بانسوں سے بنایا ہوا ڈیگ ڈمبر سمجھتا تھا۔

دراصل چیزیں؛ ادھر سے ادھر پہنچنے کا عمل بڑی آہستگی سے پورا کرتی ہیں۔ اکثر اوقات تو ہمیں پتا ہی نہیں چلتا۔ جب کھال کے نیچے یا پلکوں کے پیچھے، آنکھوں کے ڈھیلوں پر یا بیڑو میں، یا میڈولا او بلانگلیا کے آس پاس گرے میٹر میں، یا متروک ہو جانے والی دم کی ہڈی میں وہ چبھتی ہیں؛ تو ان کی موجودگی کا یقین آ جاتا ہے اور بڑی حیرت ہوتی ہے۔ اب اس اکڑوں بیٹھی ہوئی بیل گاڑی ہی کو لو، پتا نہیں کب سے وہاں تھی۔ پر میں نے اس کی موجودگی کو اپنی بائیں آنکھ کے ڈھیلے پر اس دن محسوس کیا، جس دن لوگوں نے آ کر بتایا کہ گھر سے دور میلے چیکٹ تہبندوں والے دلاوروں نے میرے بھائی کی آنکھ میں ایبوناٹ کا شوخ رنگ نیزہ اتار دیا ہے، اور وہ اب ننگے سر گھوم رہا ہے۔ یوں کہ نیزے کھب جائیں تو لوگ ٹوپیاں کس طرح اوڑھ سکتے ہیں اور لوگ سوکس طرح سکتے ہیں۔

اور کوئی رو بھی تو نہیں سکتا کہ رونے کے لیے ایک نظام کی ضرورت ہوتی ہے؛ کہ تہبند پہن کر اور شطرنجیاں بچھا کر اور اگر دانوں میں عود اور لوبان جلا کر رویا جاتا ہے، جس کے لیے کافی اور وافر منطقی جواز کی ضرورت ہوتی ہے۔ ورنہ لوگ گدی سے پکڑ کر کچڑ میں منہ دے دیتے ہیں۔ اس لیے ندی کے لیے نہیں رویا جاسکتا اور گھاس کے ڈھیر پر اکڑوں بیٹھی بنا بیلوں

کی بیل گاڑی کے لیے نہیں رویا جاسکتا اور برگد کے لیے دکھنے کا کوئی جواز نہیں۔ اور مینائیں اور ہریل وہ ڈمب پرندے ہیں جنہیں سب دائیں اور بائیں ہلاک کرتے ہیں۔ اور خدا کی سب خوب صورت اور کم زور چیزوں کے لیے تمام تہبند کھلے ہوئے ہیں، اور ایبوناٹ کے نیزے تلے ہوئے ہیں، اور قبر خداوندی کے برق رفتار تھوں پر دلاوروں کے دل عقاب ہیں۔

پر میں تو رونا بھی چاہتا ہوں کہ میں اپنے خدا کا ایک سہا ہوا کبوتر ہوں۔ اسی لیے میں نے اپنے گھر کے عین وسط میں صندل کا ایک بھاری صندوق رکھوا دیا ہے؛ جس کے پٹ پر خوب صورت خطِ کوفی میں خدا کا اسم ذات اور اس کے تمام اسمائے حسنیٰ کھدے ہوئے ہیں۔ اور جب میں رتھوں کے پہیوں کی دلوں کو دو نیم کر دینے والی چراہٹیں سنتا ہوں اور ہوا کو کاٹتے ہوئے ایبوناٹ کی تیز سیٹیاں سنتا ہوں اور تہبندوں کی پھڑ پھڑاہٹ میرے گھر اور باڑے کے باہر گدھوں کے پروں کی طرح تالیاں بجاتی ہوئی اترتی ہے۔ تو میں اس صندوق میں جا بیٹھتا ہوں اور اپنے اوپر اسمائے حسنیٰ کا پٹ ڈھک لیتا ہوں۔ اور خدا کی تمام خوب صورت اور کم زور چیزوں کے لیے اور پورسلین کی چھوٹی چھوٹی طشتریوں اور پیالیوں کے لیے اور تمام بیجزوں اور بہت سی کتابوں کے لیے، جن کے نسخے ناپید ہیں، اور فاختاؤں، میناؤں اور ہریلوں کے لیے اور ر کے ہوئے پانی پر واٹر اسکی انگ کرتی ہوئی جل مکڑیوں کے لیے اور سفید، نیلے اور گلابی کنول کے لیے اور گوری شکر شرما کے لیے، جو اسپتال کی عمارت تعمیر کراتے ہوئے کھڑے کھڑے گر کر مر گیا تھا، اور پیتل کے برگد کے لیے اور پاتراندی کے لیے اور بنا بیلوں کی بیل گاڑی کے لیے اور اپنی بیٹیوں کی تمام گڑیوں کے لیے اور ٹوپوں کے لیے اور ایک بوسیدہ کمبل اور شیونگ کا سامان رکھنے والی مراد آبادی ڈبیا کے لیے اور تین ریڈی میڈ فرائوں کے لیے اور محمود ہاشمی کے لیے اور گہرے سرخ رنگ کی ایک کشمیری شال کے لیے اور لوہے کی ایک گھڑوچی کے لیے اور بہت سے ناتواں لوگوں کے لیے اپنے خدا سے مہلت طلب کرتا ہوں۔ اور میرا خدا مجھے یہ مہلت دے دیتا ہے؛ اور میں صندوق سے باہر آجاتا ہوں اور رتھوں کی چراہٹوں اور ایبوناٹ کی سیٹیوں اور تہبندوں کی پھڑ پھڑاہٹوں کو دم توڑتے ہوئے سنتا ہوں۔ پھر فرش سے کھنکار کر گلا صاف کرنے کی آواز آتی ہے اور پہلی بار ایک لکک ایک ترنگ کے ساتھ جیسے فرش کو توڑتی ہوئی چار ماترائیں امگتی ہیں کہ تاااا، نا، نا، ہووو۔ اور آخری ماترا ہوووو م م م کہتی ہوئی، اپنے کاؤنٹرز اور اپنی پیتل والی گھنٹی کے ٹائم کے ساتھ، واسپریشن کی ایک غیر

واضح سرحد پھلانگتی ہوئی پتا نہیں کب اپنا سفر مکمل کرتی ہے کہ شاید کبھی نہیں کرتی... لرزش کا ایک نہ ایک ریشمی دھاگا سماعت سے الجھا ہوا رہ ہی جاتا ہے؛ کہ ”سا“ کے سر میں پھر ایک بار پہلی ماترا پھر دوسری تیسری اور چوتھی ماترائیں فرش سے پھوٹتی ہیں اور پھوٹتی رہتی ہیں اور میں شرابور ہو جاتا ہوں۔

اور اب میں کسی کتیا زندگی کو چھو کر نہیں دیکھنا چاہتا۔ اس اپنے گھر میں رہنا چاہتا ہوں۔ مجھے یہاں سے کوئی نہیں نکال سکتا۔



تر لوچن

جو کچھ ہوا اس سے پہلے یہاں انسانی بستیاں موجود تھیں اور جانور، درخت، دریا اور پہاڑ سبھی تھے۔ ایک تو اتر کے ساتھ موسم آتے رہتے تھے۔ چیزیں اُگتی تھیں، بڑھتی، پھیلتی اور پرانی ہوتی تھیں اور رسان سے مرجایا کرتی تھیں۔ کبھی کبھی کوئی قہقہہ مار کر ہنس بھی دیا کرتا تھا۔ مجموعی طور پر سب ٹھیک ہی تھا۔ عین الحق یہ سب کچھ ختم نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اگر کوئی کتے کا موت اس کی پیٹی کھول کر چیزوں کی فہرست نہ چرالے جاتا جو اس نے اتنی دل سوزی سے تیار کی تھی، تو عین الحق ہرگز ہرگز وہ نہ کرتا جو اس نے کیا۔

اس نے جو کچھ کیا وہ وقتی اشتعال اور مایوسی کے تحت کیا تھا مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس لیے کہ اب تو کچھ تھا ہی نہیں جسے پھر سے ترتیب دیا جاتا۔ سب ختم ہو چکا تھا۔ اور جو کچھ ہوا، وہ پلک جھپکتے ہو گیا۔ پیٹی خالی دیکھ کر اس نے اہلوک، پرلوک اور دیولوک تینوں کی ڈوریاں اپنی انگشت شہادت پر لپیٹ کر مٹھی بند کی، ایک ذرا کندھا جھکا کر جھٹکے سے انھیں اپنی پشت پر لیا، سیدھے ہاتھ کی مٹھی پر مٹھی کس کر اَللّٰہ کہا اور ہوا میں جیسے کدال چلاتے ہوئے تینوں لوک زمین پر دے مارے۔

یہاں تک بھی ٹھیک تھا، بات کچھ زیادہ بگڑی نہیں تھی۔ لیکن اس کے بعد تو عین الحق نے غضب ہی کر دیا۔ وہ پورے قامت سے تن کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے جھٹکے سے اسٹلنگ پلاسٹر

کا وہ ٹکڑا اپنی پیشانی سے نوچ پھینکا جسے وہ پابندی سے نماز کے گئے والی جگہ پر چپکا لیا کرتا تھا۔ پھر اس نے سر جھکایا، زمین کی طرف دیکھا اور تمام وکمال قہاری میں اپنی تیسری آنکھ کھول دی اور تینوں لوک جلا کر خاک کر دیے۔

سوا ب دھویں اور راکھ کے سوا کچھ نہیں تھا جسے پھر سے ترتیب دیا جاتا۔ سب ختم ہو چکا تھا اور عین الحق جانتا تھا کہ دھویں اور راکھ کو ترتیب نہیں دیا جاسکتا۔ یہ خاتمہ ہے۔

یہ سب ایک بلی سے شروع ہوا تھا۔ ایک دن گلی سے گزرتے ہوئے اس نے اچانک اس بلی کو دیکھا اور اسے فہرست بنانے کا خیال آ گیا۔ وہ بلی اس قدر زخمی اتنی میلی اور جگہ جگہ سے اتنی نچی کھچی تھی کہ ساری باتیں کاغذ پر لکھے بغیر یاد نہیں رکھی جاسکتی تھیں۔ اس نے سوچا، فہرست بنانا اچھا رہے گا۔ وہ اب تک چیزوں کو اپنے ذہن میں محفوظ رکھتا آرہا تھا۔ لیکن چیزیں اتنی بہت سی ہو گئی تھیں اور برابر بڑھتی جا رہی تھیں اور ان کی تفصیل اتنی طولانی ہوتی جا رہی تھی کہ اب ذہن میں محفوظ رکھنا ممکن نہیں رہا تھا۔ وہ ڈرتا تھا کہ کہیں بھولنا شروع نہ کر دے۔ اس لیے اس نے ایک بڑے کاغذ پر سات سو چھیاسی لکھا اور نمبر شمار اور نام اشیا اور ان کے کوائف اور کارہائے مجوز اور تاریخ عمل درآمد کے خانے بنائے اور ان خانوں میں اس نے سب چیزیں درج کرنا شروع کر دیں۔ تاریخ عمل درآمد کا خانہ ابھی خالی رکھا اس لیے کہ پہلے وہ چیزوں کو اور ان کی تفصیل کو حافظے سے کاغذ پر منتقل کر لینا چاہتا تھا۔ یہ بہت ضروری تھا۔ باقی عمل درآمد میں دیر ہی کتنی لگتی۔ فہرست مکمل ہونے کے بعد وہ کسی بھی دن اور کسی بھی وقت کارہائے مجوز کے خانے میں لکھی ہوئی باتوں پر عمل درآمد کر کے معاملے نمٹا سکتا تھا۔

تو اس نے سب سے پہلے نمبر شمار ایک پر بلی کو درج کیا اور اس کے کوائف لکھے اور کارہائے مجوز میں درج کیا کہ اسے نئی کھال وغیرہ دینی ہے اور تاریخ عمل درآمد کا خانہ خالی چھوڑ دیا۔ دوسرے نمبر پر عین الحق نے ہیڈ کانسٹیبل لطافت میر خاں کی بیوہ رقیہ بیگم کا مسئلہ درج کیا، وہ اسی بلاک کے ایک لاؤد مکان میں تنہا رہتی تھی، اسے عرق النسا کی شکایت تھی اور دکھ اور تنہائی میں اس کا چہرہ لٹک گیا تھا۔ یہاں کارہائے مجوز کے خانے میں اس نے طے کیا کہ رقیہ بیگم کو عرق النسا سے چھٹکارا دینا ہے اور ایک لے پالک کے بیٹے بیٹیوں سے اس گھر کا صحن آباد کرنا ہے۔ رقیہ بیگم کے بعد اس نے بھورے خاں کولڈ ڈرنک اینڈ سگریٹ کارنر کو درج کیا جو بہتر برس کا تھا کا ماندہ امرد پرست تھا۔ اس کا گھر بار نہیں تھا، دکان کے تھڑے پر ہی سو رہتا

تھا۔ اسے خوب صورت لڑکوں کو دکان پر بٹھانے اور اسلامی تاریخی ناول پڑھوا کر سننے کا شوق تھا۔ پریشانی کی بات یہ تھی کہ لڑکے بھاگ بھاگ جاتے تھے اور وہ انھیں یاد کر کر کے روتا تھا اور فتح یرموک کتنے ہی دن ملتوی رہتی تھی۔ عین الحق نے بھورے خاں کولڈ ڈرنک اینڈ سگریٹ کارنر کو درج کیا اور اس کے کوائف لکھے اور کارہائے مجوز میں لکھا کہ ایک خوب صورت اور با وفا لڑکا ہمہ وقت موجود رہے تاکہ بھورے خاں جدائی اور دکھ میں دُہرا نہ ہو جائے اس لیے کہ بہتر برس بہت ہوتے ہیں۔ پھر اس نے ہزارے سے آئے ہوئے شیر زمان موچی اور اس کے نیک نفس بھائیوں کو درج کیا جو فجر سے پہلے اٹھ کر شیر زمان کی چارپائی پر اکڑوں بیٹھ جاتے تھے اور اس سے اٹک اٹک کر قرآن پڑھا کرتے تھے۔ ان سب کی بیویاں ملک میں تھیں اور وہ دن بھر شیر زمان کی ہدایت کے مطابق جوتے گانٹھتے اور ٹیپ ریکارڈر پر سلطان میاں قوال کی قوالیاں سنتے تھے۔ عین الحق نے ان کے کوائف لکھے اور کارہائے مجوز میں درج کیا کہ ان سب کا ان کی بیویوں سے ملاپ کرانا ہے اور لکھا کہ شیر زمان کی بوا سیر خونی رفع کرنی ہے کیوں کہ وہ بچوں اور قلیل آمدنی والے کم زور لوگوں سے بھی نرمی سے بات کرتا تھا۔ پھر عین الحق نے عقاب کے سے تجسس والی مائی نوراں مسی کو درج کیا جس کے پنجے بھی عقاب کے تھے اور عین الحق نے اس کے کوائف لکھے اور کارہائے مجوز میں لکھا کہ مائی نوراں مسی کو نئی ریڑھ کی ہڈی دینی ہے اور بلاک نمبر دو سے بلاک نمبر آٹھ تک مکانوں کی عقبی گلی میں وافر مقدار میں پلاسٹک کے ٹکڑے، ہڈیاں اور ردی کا غد مہیا کرنا ہے جو عرصہ بارہ سال تک فراہم رہیں؛ کس لیے کہ نوراں کا ناسور اسے اس سے زیادہ کی مہلت نہیں دے گا۔ عین الحق نے دفع ناسور از پنڈلی لکھ کر کاٹ دیا کیوں کہ اس طرح بعض گھروں سے ملنے والا خصوصی بونس بند ہونے کا احتمال تھا اور یہ بات کسی عنوان بھی نوراں کے لیے مناسب نہ تھی۔ پھر بلاک نمبر دو سے بلاک نمبر آٹھ تک آتے ہوئے، پارک سے متصل، مدکامنی کے پیڑ کے نیچے پہنچ کر عین الحق نے دیکھا کہ تنور والے خمدولانے مدکامنی کے نو عمر تنے سے اپنا مینڈھا باندھ باندھ کر اس کی نرم چھال کو ادھیڑ دیا ہے؛ تو عین الحق نے ادھڑی ہوئی چھال کے نرم دائرے سے اپنی انگلیوں کے پورس کیے اور مدکامنی کے پیڑ سے وعدہ کیا اور پیڑ کے کوائف درج کیے، پھر کارہائے مجوز میں لکھا کہ مدکامنی کا زخم بھرنا ہے اور تالیفِ قلب کے لیے نئی کونپلیس بھی دینی ہیں۔ پھر اس نے پولی ٹکنک والے سہیل کو درج کیا، جسے بیرون ملک بھیجنا تھا، اور عبدالقدیر

قادری اور عترت حسین زیدی کو درج کیا، جنہیں ترقیاں دینی تھیں اور عین الحق کی مصروفیات بڑھتی چلی گئیں۔ اس نے برتن قناتوں والے ننگے کو درج کیا جو گھر والی کی فحش بدعنوانیوں کے سبب ڈھبہ گیا تھا اور پور پور سے ہلاک ہو رہا تھا؛ تو عین الحق نے یہ لکھا کہ اس بی بی کے نظام میں مناسب تبدیلیاں کر کے اسے ننگے کی اطاعت میں بحال کرنا ہے۔ اور عین الحق نے موٹر سائیکل والے لڑکے کو درج کیا جو صبح و شام چکر لگاتا تھا اور بلاک نمبر تین میں وہ بچی اسے خاطر میں نہ لاتی تھی۔ عین الحق نے اسے اداسی سے موٹر سائیکل پر چکر لگاتے دیکھا اور نرم سرگوشیوں میں وعدہ کیا کہ سب انتظام کر دیا جائے گا۔ اور اس نے کموگازر کی بیمار مرغی کو درج کیا اور اس طرح چیزوں کی فہرست طولانی ہوتی چلی گئی۔

وہ چراغ جلے بیٹھتا تو کہیں رات ڈھلے دن بھر کے اندراجات مکمل کر پاتا۔ اور اب یہ ہونے لگا کہ دو نمبر یا تین نمبر بلاک سے آٹھ نمبر تک آتے آتے کبھی ایک آدھ چیز بھول جاتا اور اسے دوبارہ موقع پر پہنچ کر اندراج مکمل کرنے پڑتے سو اسی جھنجٹ میں چار نمبر بلاک کی حمیرا کا لوکیمیا درج ہونے سے رہ گیا۔

اور جب اس اندراج کی ضرورت نہ رہی تو بلاک نمبر چار کے اختتام پر عین الحق ظاہر ہوا۔

وہ سڑک کی طرف سے گلی میں مڑا اور اس نے دیکھا کہ مسجد نور کا چھوٹا والا گہوارہ پھولوں میں رکھا ہوا ہے۔ عین الحق پیلا پڑ گیا۔ اس نے لرزتے کانپتے ہوئے دوپہر کے سناٹے سے پوچھا کہ کیا حمیرا؟ وہ گہوارے کے ساتھ ساتھ رینگتا ہوا چھ نمبر بلاک تک گیا اور اس نے دوپہر کے سناٹے سے پوچھا کہ کیا حمیرا؟ اور وہ چھ نمبر سے آٹھ نمبر بلاک کے سرے تک دوڑتا ہوا گیا اور خجالت کے آنسوؤں میں بھگیتے ہوئے اس نے گہوارے کا پایہ تھام لیا اور ساتھ ساتھ چلنے لگا اور ہولے ہولے اپنی صفائی میں کہتا چلا کہ بی بی میں بھول گیا تھا! بٹیا میں بھول گیا تھا! اماں میں بھول گیا تھا! اور آٹھ نمبر بلاک کی حد پر اس نے گہوارے کا پایہ چھوڑ دیا۔ پھر عین الحق نے ایک چیخ کی بازگشت میں بلاک نمبر دو کی طرف سعی کی اور پکارتا چلا کہ میں بھول گیا تھا! پھر باقی دن اور باقی رات وہ اسی چیخ کی بازگشت میں رہا۔ وہ بلاک دو سے بلاک آٹھ تک اور بلاک آٹھ سے بلاک دو تک گونج کی طرح سنسناتا رہا اور جو کچھ درج ہونے سے رہ گیا تھا دیوانہ وار اپنی یادداشت میں محفوظ کرتا گیا۔ ایک ایک مکان پر سے

گزر رہے تھے اس نے اپنے حافظے میں سب چیزوں اور سب لوگوں کی حاجت مندیاں اور تمام چھوٹے بڑے دکھ محفوظ کیے اور طے کیا کہ مرغ کی بانگ سے پہلے انھیں فہرست میں درج کرے گا اور جب مرغ بانگ دے رہے ہوں گے تو عمل درآمد کرے گا۔

ایک پہر رات باقی تھی کہ وہ اپنے کمرے پر آیا اور یہ دیکھا کہ کمرے کا تالا ٹوٹا ہوا ہے اور اس کی پیٹی اوندھی پڑی ہے۔ کوئی کتے کا موت اس کی فہرست چرالے گیا تھا۔

پیٹی خالی دیکھ کر عین الحق نے حیرانی میں چھ طرفوں پر نظر ڈالی اور مایوسی میں سر ہلایا اور گمان سے بالاتر ہوا اور تب ہی عین الحق نے اہلک، پرلک اور دیولک تینوں کی ڈوریاں اپنی انگشت شہادت پر لپیٹ کر مٹھی بند کی ایک ذرا کندھا جھکا کر جھٹکے سے انھیں اپنی پشت پر لیا اور مٹھیاں کس کر ہوا میں کدال چلاتے ہوئے تینوں لوک زمین پر دے مارے... پھر وہ پورے قامت سے تن کر کھڑا ہو گیا اور جھٹکے سے اپنی پیشانی کا پلاسٹرنوچ پھینکا۔ پھر عین الحق نے سر جھکا کر زمین کی طرف دیکھا اور تمام وکمال قہاری میں اپنی تیسری آنکھ کھول دی اور تینوں لوک جلا کر خاک کر دیے۔



براوو! براوو

پگڑی کی طرح اپنے سر سے ہرے ہرے نرم کانٹوں کا دائرہ لپیٹے، سوکھے بدن پر ارغوانی رنگ کا ٹاٹ اوڑھے، پیروں سے مونجھ کی سینڈلیں باندھے، بالساوڈ کی لمبی صلیب گھسیٹتا ہوا اب جو وہ اپنے گھر سے نکلا ہے تو ایک ایک رفیق کے دروازے پر دستک دیتا چلا جائے گا کہ اے رفیق، الاسد اپنے مکان سے باہر آ اور اے جاننے والے، کچھ قدم میرے ساتھ چل اور اے ایلی پاک دامن، اے کشادہ دل حبیب، میری پیشانی کو بوسہ دے اور اے جانِ برادر، الوداع کہہ اور واویلا کر کہ میں اپنی صلیب اٹھائے اپنے مقتل کو جاتا ہوں۔

اس وقت صبح کے نوبے ہوں گے۔

سو اس کی آواز کے اسیر، اس کے یہ چاروں ہمد اس کے ہمراہ ہو لیں گے۔ وہ گریہ وزاری کرتا، نوبے کی شاہراہوں سے گزرتا ہر چورستے میں ان رفیقوں کی پیشانیوں کو بوسے دے گا اور بغل گیر ہوتے وقت صحیح ٹائمنگ سے لڑکھڑائے گا۔ بازار میں پہنچ کر وہ ہر بقال، ہر آہن گر، ہر جفت ساز کو دیکھ کر سینہ زنی کرے گا پھر ان کے لفظوں پر اعراب لگاتا آگے بڑھ جائے گا۔

صبح کے دس بجنے والے ہوں گے...

کہ وہ شہیدوں کے چوک میں پہنچ کر دیو قامت کرو نو گراف کے سائے میں دم لے

گا اور ٹھیک دس بجے جب کہ کرو نو گراف Beeps سناتا ہوگا، وہ اپنی لنگوٹی سے شیشے کے ٹکڑے نکال کر منہ میں بھر لے گا۔ پھر اپنی شیشہ چباتی ہوئی آواز میں پکارے گا کہ ہلاکت ہو، تم پر ہلاکت ہو۔ اے بے مہر ساعتو اور واویلا مچے اور اے ان ساعتوں میں زندگی کرنے والو، تمہارے گھر بے چراغ ٹھہریں اور تمہارے تاکستانوں پر سرخ چونٹیوں کی یلغار ہو کہ وہ غول غول ہو کر آئیں اور تمہارے نخلستانوں کو بادِ سموم جھلس دے اور تمہارے گلے ریگستانی بھیڑیوں کی خوراک بنیں اور تمہاری گا بھن اونٹنیوں کے پستان خزاں رسیدہ پتوں کی مانند خم ہو جائیں۔

لفظ ”پستان“ کو وہ شیشے کے ساتھ چبا چبا کر دیر تک منہ میں گھولتا رہے گا، پھر کہے گا کہ ہلاکت ہو اور تم پر واویلا مچے کہ میں، یوحنا ایلیاہ... آنسوؤں سے ہپتسمہ دینے والا، اپنی صلیب کے بوجھ سے کراہتا ہوا آج اپنے مقتل کو جاتا ہوں۔

یہاں وہ کراہ کر دکھائے گا یا آہ بھرے گا، پھر کہے گا کہ:

ہلاکت ہو، تم سب پر ہلاکت ہو کہ میرے آئندہ میں تم اپنا کوئی وجود نہیں رکھتے کس لیے کہ آج کے بعد سے تم چوتھی ڈائمنیشن میں زندہ رہو گے۔ واویلا ہو کہ آج میں تمہارے سوگ میں ہوں۔ پھر جاننے والے سے کہے گا کہ اے بھائی سن! میرے سر پر تھوڑی خاک ڈال دے کہ میں تو اب ہر موجود کے سوگ میں ہوں۔ تس پہ جاننے والا اپنی جیب سے صندل کے برادے کا شیشہ نکال کر چٹکی بھر سفوف اس کے سر پر چھڑکے گا اور کہے گا کہ یوحنا! خاک تو فنا بھی ہے اور نموکا وعدہ بھی اور وہ دو ہٹڑ مار کر گریہ و زاری کرے گا۔ پھر نقلی صلیب والا کہے گا اے الاسد! تو دو کوہان کے اونٹ کی طرح بخیل کیوں ہے؟ تیرے رفیق تیرا ماتم کریں، تو میری چھاتی سے لگ کر بین کیوں نہیں کرتا؟ اور اے ایللی پاک دامن! اے فتنہ قامت! میری پیشانی پر بوسے دینا بند کر دے کہ تیرے لعابِ دہن کی ٹھنڈک میرے غصے کی آگ کو کہیں بجھا نہ دے اور اے جانِ برادر! تو یہ گریہ و زاری لپیٹ ہی لے اور بہتر درپچوں والے گھر کو لوٹ جا کہ آج ہول ناک داستانیں رقم ہونے کا دن ہے۔

سو جانِ برادر خوشی خوشی گھر لوٹ جائے گا۔

اس وقت دن کے بارہ بج چکے ہوں گے اور وہ سب کے سب سائے میں ٹھہر جائیں گے۔

(وہ لمبی صلیب والا اور اس کے تینوں رفیق سائے میں ٹھہر جائیں گے)

(وہ سائے میں ٹھہر جائیں گے)

دن کے بارہ بج چکے ہوں گے اور چوگرد گھومنے والی شعلہ زن تلوار کے کھدیڑے ہوئے گروہ کرونگراف کے مہیب سائے سے بچتے، کتراتے ہوئے گزرتے ہوں گے۔ وہ اس کی صلیب کو چھوتے ہوئے گزریں گے؛ مگر ان کے لیے اس کی آواز کی کمندیں کوتاہ ٹھہریں گی۔ وہ اسے ہونٹ ہلاتے اور جبرڑوں کی ہڈیاں کٹکٹاتے ہوئے تو دیکھیں گے مگر اس کی آواز نہیں سن پائیں گے، سو بڑی بیزاری سے منہ پھیر کر اپنے اپنے مٹھی بھر جو سنبھالتے ہوئے تیزی سے گزر جائیں گے۔ ان کو تو یہ گمان بھی نہ ہوگا کہ لمبی صلیب والے کی بددعائیں اور بشارتیں اُنھی کے لیے ہیں۔ ان کو جاننے کے اس عذاب سے پناہ ملے گی۔ مگر اس ایک عذاب کے سوا ان کے گروہ، پیٹ کی بھوک اور برہنگی اور شہوت کی چوگرد گھومنے والی شعلہ زن تلوار کے سب عذاب سمیٹیں گے۔

تو پھر یوں ہوگا کہ لمبی صلیب والے کی ساری بددعائیں اور تمام بشارتیں بے ہدف بومرونگ کی طرح ہوا میں سنسناتی اور سیٹیاں بجاتی واپس لوٹ آئیں گی اور خود اس پر اور ان پر آن گریں گی جو اس کے قریب سائے میں کھڑے ہوں گے۔

مگر وہ تینوں تو اس کے رفیق ہوں گے۔ ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہ ہوگا کہ اس نقلی صلیب والے کی مجبریٰ کردے اور اسے پکڑ وادے۔

ہرچند کہ وہ کفر پہنے ہوگا اور کفر بکتا ہوگا اور کفر سوچتا ہوگا۔

(وہ کفر سوچتا ہوگا۔)

اس وقت وہ اپنی صلیب سے ٹیک لگائے، سر نہیوڑائے سائے میں کھڑا ہوا اپنے دل کی امنگ میں سوچتا ہوگا کہ ارے یہ سب کچھ تو ویسا ہی ہو رہا ہے جیسا کہ ناصرہ کے آسمان شکوہ نچار کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ اذیت طلب، اپنے اس خواب کی سرشاری میں لرزتا ہوگا اور سوچتا ہوگا کہ دیکھنا، ابھی میرے انھی رفیقوں میں سے ایک اپنے سائے سے نکل کر ادھر کو جائے گا جہاں صلیب پر چڑھانے والے کھڑے ہیں۔ وہ انھیں بلا کر لائے گا اور تیسرا پہر شروع ہونے سے پہلے مجھے مضبوط کیلوں سے لکڑی پر ٹھونک دیا جائے گا۔ مگر اس سے پہلے شاید میرا رفیق ایللی پاک دامن تین بار میرے ہونے سے انکار کرے گا اور بعد کو میرا رفیق جاننے والا ایک سبز شاخ پر سر کے میں بھیگا ہوا اسفنج رکھ کر مجھے چسائے گا اور شاید وہ میرا رفیق الاسد ہوگا جو فی

الاصل میری مخبری کرے گا اور صلیب پر چڑھانے والوں کو بلا کر لائے گا۔

”تو اے مخبر... الاسد! میرے یہودا، تجھے جو کچھ کرنا ہے جلد کر لے!“

درشت لہجے اور کرخت چہرے والا الاسد اپنے خیال کی معصومیت میں بڑھ کر اس کے ارغوانی ٹاٹ کو بوسہ دے گا اور کہے گا کہ یوحنا ایلیاہ! میں تیری باتیں سمجھنے سے قاصر ہوں۔ میں خیال میں بھی تجھ سے دغا کرنے سے باز رہا تو پھر تو مجھے یہودا کہہ کر کیوں پکارتا ہے؟

تس پہ نقلی صلیب والا جھڑکی کھائے ہوئے بچے کی طرح ایک ایک رفیق کا منہ تکے گا اور سہمی ہوئی کم زور آواز میں پوچھے گا کہ کیا تم میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں کہ میری مخبری کر دے اور مجھے صلیب پر چڑھوا دے؟

وہ تینوں باری باری سر ہلا کر انکار کریں گے اور کہیں گے کہ نہیں یوحنا ایلیاہ ہم تیری مخبری نہیں کرنے کے، یہ سن کر وہ دو ہٹڑ مارے گا اور ذبح ہوتی بھیڑ کی طرح آواز کرے گا پھر بین کرتا ہوا عظیم چورستے کے ٹارمیک پر لوٹیں لگائے گا اور قابو میں نہیں آئے گا۔ ہر چند کہ جاننے والا روتا ہوا اس کے ساتھ ساتھ پھرے گا اور الاسد اس کے چہرے پر سرد پانی کے چھینٹے مارے گا اور ایللی پاک دامن محبت سے دلا سے دے گا، پھر عاجز ہو کر بیٹھ رہے گا اور جماہیاں لے گا۔

اس وقت سہ پہر کے تین بجے ہوں گے۔

تین بجے کی Beeps سن کر حد درجہ نڈھال یوحنا رینگتا ہوا دوبارہ کروٹو گراف کے سائے میں چلا جائے گا۔ تیسرے پہر کی اداسی میں اس کا کانٹوں کا تاج مسلّا کر بھوسا ہو چکا ہوگا۔ ٹاٹ کا لبادہ نالی میں اس طرح پڑا ہوگا کہ اس کا کچا ارغوانی رنگ گدے پانی میں بدرنگ لکیریں بنا کر بہتا ہوگا اور بالساوڈ سے تراشی ہوئی اس کی صلیب، مٹھی مٹھی بھر جو لے جانے والوں کے پیروں تلے آ کر لگدی بن چکی ہوگی۔ بلاشبہ یوحنا ایلیاہ، یسوع ناصری کے کا سٹیوم کے بغیر جس قدر رنگا ہوگا، اتنا تو وہ پیدا ہوتے وقت بھی نہ تھا۔

تب سسکیاں لیتے ہوئے جاننے والا اُسے اپنے مضبوط بازوؤں میں اٹھا لے گا۔ الاسد اس کے تاج کا بھوسا اور اس کی صلیب کی لگدی پولی تھلین کے ایک تھیلے میں بھر لے گا۔ ایللی پاک دامن نالی میں ہاتھ ڈال کر اس کا ٹاٹ اٹھا لے گا، اور ٹاٹ سے بدبودار پانی نچوڑتا ہوا سب کے پیچھے پیچھے چل پڑے گا۔

اور وہ لوگ، اُسے، جو صبح کو مصلوب ہونے کی امنگ میں گھر سے نکلا، تھا شام

ہوتے ہوتے بہتر درپچوں والے مکان کے ایک حجرے میں رکھ آئیں گے۔

(وہ اسے اس کے حجرے میں رکھ آئیں گے۔)

(اسے حجرے میں رکھ آئیں گے)

”ایادراز، ایاد پہنا، ایاد یرفع، ایاد ابالا۔“

حجرے کی اونچی چھت سے ٹکرائی گئی اس کی آواز اسی کے لاغر بدن پر کنکریوں کی طرح گر رہی ہوگی۔ وہ اپنی پسلیوں میں اپنی لابی نوک دار انگلیاں گڑائے بنکارتا ہوگا کہ تیرے سورج نے تو میرے ساتھ آج بھی دعا کی۔ میں تو خجالت کی گرد میں اٹ گیا کہ یہ سورج بھی رخصت ہوا اور میں زندہ ہوں۔

تو مجھے مرنے کیوں نہیں دیتا اور مجھے جینے کیوں نہیں دیتا۔ اے میرے دشمن! اے میرے دوست! مجھے جینے دے، مجھے مرنے دے۔ کہ میں جیتا رہوں تو تیرے پہاڑ کا شعلہ مستجمل میرے بدن سے ایندھن لیتا رہے اور مرجاؤں تو چٹان پر پھینکے ہوئے طشت کی طرح تیری صدیاں میری نزع کی چیخ سے جھنجھناتی رہیں کہ الوہی۔ الوہی۔ الوہی۔

تو مجھے مرنے کیوں نہیں دیتا؟ اور بتاتا کیوں نہیں کہ کیا وہ میرا وہم تھا جو میں جلتی پہاڑی پر اترتا تھا اور اپنے الہ کی لوحیں اٹھائے بستی میں پہنچتا تھا جہاں سب کے سب سونے کے پکھڑے سے جفتی کھاتے تھے اور مجھے اور میرے الہ کو پہچانتے نہ تھے؟

تو کیا میں بار برداری کا جانور تھا کہ ان حرامزادوں کی خاطر اپنی جان کو عذاب دیتا رہا؟ تو کیا میں غصہ بھی نہ کروں اور اپنے الہ کی لوحیں زمین پر مار کر ٹکڑے ٹکڑے بھی نہ کروں؟

تو مجھے جینے کیوں نہیں دیتا؟ میں تو خیال کی لطافت میں زندہ رہنا چاہتا تھا۔ مگر ہلاکت میرے ہوتے پر کہ میں نسل کشی کے مہیب اعضا لے کر پیدا ہوا اور اپنے بدن میں رہنے پر مجبور ہوں۔

یہ تو نے کیسی زندگی میرا مقصوم کی ہے؟ اور اس کی موت اور پچش اور مینین جانیٹس کی موت میرے لیے کیوں بچا رکھی ہے؟

ہلاکت ان آنکھوں پر کہ میں صحرا کی عذاب ناک راتوں میں گھر گیا اور بے ثواب

گریہ وزاری کی مشقتیں جھیلتا ہوں۔

واویلا نورِ باطن پر کہ میں چوبِ خشک کی طرح جلتا ہوں اور مجھ سے حرارت اور
روشتی لینے والا کوئی نہیں!

”کٹ! شاٹ اوکے! کل دالائس۔ کل داساؤنڈ!! (کل ایوری تھنگ)

”کل ایوری تھنگ! ایوری تھنگ!“

بعل زبوب کے بے شمار سائے تالیاں بجاتے ہوئے اسے اپنے گھیرے میں لے
لیں گے اور اس کے ساتھ ٹھٹھول کریں گے۔ وہ اس کے سر پہ چھڑیاں ماریں گے اور اس پر
تھوکیں گے۔ وہ اپنے ساتھ نئی مے اور جو کی روٹیاں لائے ہوں گے، سو وہ اُسے اوندھا
گرا لیں گے اور اس کے بدن میں روٹیاں داخل کریں گے اور مے کے شیشے اس پر الٹ دیں
گے اور اسے حد درجہ ستائیں گے۔

وہ کھوئی پر ٹنگے ہوئے شہید کی طرح سب کچھ سہتا رہے گا، کہ بدن کی اذیت میں
اسے مزہ ملے گا اور ان باتوں کی پہلٹی دیلو ہوگی۔

جب وہ زمین پر پڑا ہوا گا تو بعل زبوب کے سائے اس سے پوچھیں گے کہ تو اٹھ
کر کوئی کام کیوں نہیں کرتا؟ اور جب وہ دیوار کے سہارے اٹھ کھڑا ہوگا تو وہ سوال کریں گے
کہ تو جاتا کہاں ہے، آرام کیوں نہیں کرتا؟ اور وہ اسے ٹھوکر مار کر گرا دیں گے۔ پھر ان میں
سے ایک یوں کہے گا کہ تو تو حد درجہ نکما ہے اٹھ اور خداوند کی ہیکل میں جا اور ایک تپائی بچھا کر
اپنے سکے پھیلا دے اور کاروبار کر۔

پھر وہ منہ چھپا چھپا کر ہمیں گے اور آپس میں مشورت کریں گے کہ اس سے اس
کے مقدس خریطے چھین لو اور اس کی ژند اور اس کی اوستا پانی میں تر کر کے اس کے حلق میں
ٹھونس دو اور کتاب الطو اسین سے اس کے ٹخنوں پر ضرب لگاؤ اور شیخ اکبر کو اور اگستین ولی کو اور
ملک چین کے دیوزاد کو اس کے قریب نہ آنے دو۔

وہ ہنستے ہوں گے مگر ان کی ہنسی خوف و دہشت کی ہنسی ہوگی اور ان کا ٹھٹھول خود انھی
پر رجعت کرے گا اور یوحنا؛ کہ جس کے بدن پر نوحہ و ماتم اور آہ و فغاں مرقوم ہوگا، وہ اگرچہ
ٹوٹے ہوئے برتن کی مانند زمین پر پڑا ہوگا مگر سب دیکھیں گے کہ اس کا چہرہ تو سالم ہے اور
اس کی پیشانی آبِ رواں کی طرح لشکارے مارتی ہے اور وہ کلام کرتا ہے۔ اور اپنے پھیپھڑوں

کی قوت سے رب الافواج کو پکارتا ہے کہ:

”اے گرجدار آواز والے، تیری آواز بادلوں پر ہے اور تیری آواز میں قدرت و جلال ہے، اور تیری آواز دیوداروں کو توڑ ڈالتی ہے اور آگ کے شعلوں کو چیرتی ہے اور بیابانوں کو ہلا دیتی ہے اور تیری آواز سے ہر نیوں کے حمل گر جاتے ہیں اور تیری آواز جنگلوں کو بے برگ کر دیتی ہے۔“

تو اے گرجدار آواز والے! مجھے بھی پکارتے ہوئے سن کہ میں گونگا نہیں، آواز والا ہوں۔ ہر چند کہ میں نے تیرا دلکھا اور تیری نفی کی اور تجھے ’لا‘ کہا اور تجھ سے سوا اپنی روح ناطق کو اپنا الہ گردانا اور صبح دم میں پھر ایسا ہی کروں گا کہ اپنے ایقان میں راسخ ہوں اور بے دلی سے ماننے والوں کے اس قرن میں، میں اکیلا انکار کرنے والا ہوں۔

تب ایک عجیب بات رونما ہوگی کہ اس کے حجرے کی چھت بڑی آواز کے ساتھ شق ہو جائے گی اور چھت کے ٹائل اڑاڑ کر دور دور تک جا گریں گے اور سورج سنسناتا ہوا اس کے حجرے میں در آئے گا اور اس کی پسلیوں پر آن رکے گا اور آوازہ پڑے گا کہ براوو! براوو!

’خُنابی بی، اس کتے کا منہ دھلا اور اس کے بالوں میں کنگھی کر اور اسے نئی پوشاک پہنا۔‘

(پوشاک پہنا)

نئی پوشاک پہن کر زوفے کی ایک سبز شاخ ہاتھ میں اٹھائے وہ اپنے حجرے سے یوں برآمد ہوگا جیسے دن طلوع ہوتا ہے۔ وہ اپنے دل میں یہ گمان کرتا آئے گا کہ اب کے شاید اسے زندگی کرنے کی مہلت ملی ہے۔ سو وہ انجیر کے درخت کے نیچے کھجور کے پتوں سے بنا ہوا اپنا سجادہ بچھا دے گا اور برو کے قلم کو قوط دے کر صندل کے قلمدان پر رکھ دے گا اور مخمل کے بستے کی گرہ ڈھیلی کر دے گا پھر پتھر سے ٹیک لگا کر کھنکارے گا اور کوچہ و راقاں کی سمت منہ کر کے پکارے گا کہ قال، قال یوحنا ایلیاہ۔ تو اُنکے پیچھے پہنے، کھجور کے پتوں کی ٹوپیاں اوڑھے، استفسار کرنے والے، گروہ درگروہ اپنی بستیاں سے روانہ ہوں گے۔ ان میں سے بعض اپنے ناقوں پر سوار ہوں گے۔ بعضے اصیل گھوڑوں کو ایڑ لگاتے آئیں گے۔ بعضے پیادہ پا ہی چل پڑیں گے۔

وہ تعداد میں اتنے ہو گے جتنے نخیلہ بنی قیدار کے نخل۔ وہ ”لبیک یا استاذنا“ کہتے ہوئے اس پر ہجوم کریں گے یہاں تک کہ اس کا دم الٹنے لگے گا۔ تاہم وہ سجادے سے اٹھ کر شکر گزاری میں رقص کرے گا۔ پھر پتھر سے ٹیک لگا کر ان کے سوال سننے کو ہمہ تن گوش ہو بیٹھے گا۔

تو ناقوں پر آنے والے اور اسیل گھوڑوں کو ایڑ لگاتے آنے والے اور پیادہ پا آنے والے اس سے غسلِ جنابت اور حیض اور موئے زیرِ ناف کے مسائل پوچھیں گے اور یوحنا ایلیاہ یرقان زدہ مریض کی مانند زرد پڑ جائے گا اور مثل پر کاہ لرزہ کرے گا۔

وہ کمزور آواز میں کہے گا کہ لوگوں میں طاہر نہیں ہوں۔ میں تو تشکیک کا درس دینے بیٹھا تھا۔ تم مجھ سے یہ استفسار کیوں کرتے ہو؟ سنو کہ میں حیض کی بابت کچھ نہیں جانتا اور غسلِ جنابت کے باب میں منہ نہیں کھول سکتا کہ مباشرت کے بستر سے اٹھ کر سیدھا سجادے پر آن بیٹھا ہوں اور دیکھو... یہ کہتے ہوئے وہ حیا نا آشنا جھک کر اپنے تہ بند کے گوشے تھام لے گا، پھر انہیں اپنے کانوں کی لوؤں تک پہنچا دے گا اور تا دیر اسی بے ستری میں رقص کرے گا۔

وہ رقص کرتا ہوگا اور آنسوؤں سے روتا ہوگا اور پکار پکار کر اٹنگے پیچا مے والوں سے کہے گا کہ لوگو! تم نے تو میرے کلام کو بے حیثیت ٹھیکریوں کی کھنکھناہٹ سے ملا دیا اور میرے سکوت کو بنجر زمین کی خاموشی بنا دیا اور میرے جاننے کو اپنے نہ جاننے کے برابر سمجھا۔

”تو لوگو! کیا مجھے اس نئی پوشاک میں بھی برہنگی ہی ملی؟“

(نئی پوشاک میں بھی برہنگی ہی ملی۔)

سو برہنگی اس کا لباس اور خموشی اس کا ورثہ اور چراغ کی لو اس کا مسکن قرار پائیں گے۔ اور جو سچ کبھی اس نے کمایا، وہ ہوا کے پرندوں اور زمین کے درندوں کی خوراک ٹھہرے گا۔

اور اس کا جھوٹ سیہ منجھیقوں پر پڑا دکھتا رہے گا... کہ جب بھی زمین ایک دائرہ مکمل کرے گی، وہ اسے اس کرۂ باد میں اچھال دیا کریں گی۔ سو یہی اس کا جینا اور یہی اس کا مرنا کہلائے گا۔

اور جسے اس نے تلاش کیا اور نہ پایا وہ دوام اب اس کی پلکوں پر آشیانہ کرے گا کہ اس کی پلکیں استوائی سورج کی سفاک برچھیاں ہوں گی۔

اور استوائی سورج کی سفاک برچھیاں پر خداوند کی تقدیس اور اس کے سنائے کا چھتر ہوگا۔ اور ایک سفید پرواز کے نیچے ہوئے پر...

اور ایک اندھے کبوتر کی بیٹ پڑی ہوگی۔



ناممکنات کے درمیان

(آکٹوپس... ایک نظم)

میں نے ادی پُرش کے ننگے اسٹیچوایٹ پر ایک روح زندہ کو منڈلاتے اور اترتے ہوئے دیکھا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ زندگی پیدا کرنے کا بس یہی ایک طریقہ ہے۔ میں وہیں تھا جب نیلے امن کا پہلا نقطہ ادی پُرش کے سر کی پشت پر نمودار ہوا اور پھیلنے لگا اور پھیل کر نیلے ٹھنڈے شعلوں کا الاؤ بن گیا اور بھیرویں کی نارنجی لپٹ کے ساتھ ایک روح زندہ ٹیراکوٹا کے اس ننگے اسٹیچوایٹ پر اتری اور اس نے کہا، ”جاگیے برج راج کنور جاگیے، کنول کسم پھولے۔“

تب ادی پُرش کے ننگے پن میں نارنجی آگ سے نہایا ہوا، یک خلیاتی زندگی کا پہلا کنول کھل گیا۔ ادی پُرش بیدار ہوا۔ وہ مٹھانی کی طرح گھومتا ہوا نیلے ٹھنڈے حصار سے باہر آیا۔ اس نے برہما نرتیہ کی سات دراؤں میں زندگی کو سلام کیا (اس کی آٹھویں مدرار روح زندہ کے لیے تھی) اور میں سمجھ گیا کہ زندگی پیدا کرنے کا بس یہی ایک طریقہ ہے۔

(آکٹوپس... ایک منظر)

میں جس منظر میں تمھیں شریک کر رہا ہوں، وہ ایک پل کا منظر ہے۔ یہ پل دوناممکنات کے درمیان کھنچا ہوا ہے۔ یہ سارا منظر ہی غیر معمولی ہے۔ بس ایک بات غیر معمولی

نہیں ہے اور وہ یہ کہ پل کا ایک پیل پایہ ریت میں دھنس گیا ہے۔ میں اسے پیل پایہ ہی کہوں گا کیوں کہ ایک نظر میں یہ پیل پایہ ہی دکھائی دیتا ہے۔ اصل میں یہ ٹین کا بنا ہوا ایک آکٹوپس ہے اور اپنے زنگ خوردہ بدن کے ساتھ ریت میں دھنسا ہوا ہے، بس اس کی سونڈیں آزاد ہیں۔ یہ آکٹوپس پل، گھی کے پرانے کنستروں کو چیر کر بنایا گیا ہے۔ آکٹوپس عام تین منزلہ عمارت جتنا اونچا ہے اور عین مین اس آکٹوپس کی طرح ہے جسے ہم اپنے دہشت ناک خوابوں میں دیکھتے ہیں۔ مگر خواب کا آکٹوپس بہت چھوٹا ہوتا ہے۔

ٹین کے اس آکٹوپس کی آٹھوں سونڈیں ایک دوسرے سے جفتی کھاتی ہوئی اس طرح پھیل گئی ہیں کہ کچھ سونڈیں پل کی دائیں محراب بناتی ہیں اور کچھ بائیں۔ ایک دو سونڈیں پیش منظر میں تمھاری میری طرف بڑھ آئی ہیں۔ اگر تم غور سے دیکھو تو ان کا مہیب سایہ ہمارے اوپر پڑتا دکھائی دے گا۔ ویسے وہ ہمارے اوپر اتنی بلندی پر معلق ہیں کہ بے موسم کے بادل کی طرح ان سے کوئی فوری خطرہ محسوس نہیں ہوتا۔ آکٹوپس کی ایک سونڈ عقب میں انفی نی کی طرف بڑھ گئی ہے، مگر اس سونڈ کو ہم اور تم نہیں دیکھ سکتے۔ یہ سونڈ ہمارا تمھارا مسئلہ نہیں ہے۔ ہم صرف محرابیں بنانے والی سونڈیں اور اپنی طرف اٹھ آنے والی سونڈیں ہی دیکھ سکتے ہیں، جن کی مجموعی تعداد سات ہے۔ جس سونڈ کا رخ انفی نی کی طرف ہے، وہ آٹھویں ہے۔

آکٹوپس پر ایک مکمل سیاہ پیٹ لگایا گیا ہے جس میں سیاہی کے سوا کسی دوسرے امکان کو سوچا بھی نہیں جاسکتا۔ یہ مکمل سیاہ پیٹ اس درجہ سیاہ ہے کہ تمام کی تمام روشنی جذب کر لیتا ہے، ایک کرن بھی منعکس نہیں ہونے دیتا۔ اسے کچھ دیر غور سے دیکھنے کی کوشش کرو تو یوں لگے گا جیسے بینائی کے ساتھ تمھاری آنکھوں کے ڈھیلے بھی کھینچے جا رہے ہوں۔ سیاہی کو دھرا گھناؤنا بنانے کے لیے سونڈوں کے پیٹ پر پوری لمبائی میں سکرز کی چار چار قطاریں لگائی گئی ہیں۔ عام، روزمرہ آکٹوپس اپنی سونڈوں کے پیٹ پر دھڑکتے اور کھلتے بند ہوتے ہوئے سکرز کی قطاریں پہنے رہتے ہیں۔ یہ قطاریں آکٹوپس کا سب سے دہشت ناک حصہ ہوتی ہیں۔ ٹین کے اس آکٹوپس پر سستے پلاسٹک کے لچکے سکرز لگے ہوئے ہیں جو کسی اندرونی برقی میکینکلی نظام کے تحت بہت فحش انداز میں دھڑکتے اور کھلتے بند ہوتے ہیں۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ان میں سے بعض سکرز پورے ہول ناک بلاسٹ کے ساتھ زمین چیر دینے والی آواز میں چیختے ہیں۔ ان میں بسوں کے پریش ہارن نصب ہیں۔ جو سکرز پریش ہارنوں سے خالی ہیں،

بظاہر بے ضرر دکھائی پڑتے ہیں مگر ان میں ایسے آلات لگے ہیں جو ننگے کانوں سے نہ سنائی دینے والی الٹراسونک آواز پیدا کرتے ہیں اور جب وہ اپنی بے آواز، آواز میں چبھتے ہیں تو اعصاب کے جھپٹھڑے اڑا دیتے ہیں۔ باقی سکریز سے اندھا کر دینے والی تیز سفید روشنی اترتی ہے۔ یہ دھڑکتے نہیں ہیں بس ان کی روشنی جھپکتی رہتی ہے اور اس جھپک کی تال میں کوئی ترتیب نہیں ہے۔ روشنی کی سفیدی کا فور کی سفیدی کی طرح ٹھنڈی اور مردہ ہے اور ایک حتمی سوگواری سے ترتر ہے۔ یہ روشنی ٹین کی سونڈوں پر لگے مکمل سیاہ پینٹ کی وجہ سے اپنی قطعی اور طے شدہ حدوں میں رہتی ہے؛ آکٹوپس کی سونڈوں کو یا اس کی سیاہ دہشت کو روشن نہیں کر سکتی۔ وجہ میں پہلے ہی بتا چکا ہوں۔

یہ پل، جیسا کہ میں نے بتایا، دو ناممکنات کے درمیان کھنچا ہوا ہے اور ہر اعتبار سے مردہ ہے۔ اس میں بڑھ کر پھیلنے یا کسی بھی طرح اپنی شکل بدلنے یا حرکت کرنے کا امکان موجود نہیں ہے، البتہ ریت کا جو تودہ آکٹوپس کے اصل بدن کو ڈھکے ہوئے ہے، وہ زندہ ہے۔ مگر یہ زندگی جانوروں اور پودوں اور پتھروں کی زندگی سے مختلف ہے کیوں کہ تودہ اپنی طے شدہ حدوں سے بڑھ کر پھیلنے، شکل بدلنے اور حرکت کرنے پر قادر نہیں ہے، بس اس کی ریت سنکھوں مہا سنکھوں ننھے چمک دار گول کیڑوں کی طرح کلبلائی رہتی ہے۔ اس ریت کے کسی ایک ذرے کو کبھی غور سے دیکھنا، وجہ سمجھ میں آجائے گی؛ مٹ میلی گیلی چمک میں لتھڑا ہوا ہر ذرہ کہیں نہ کہیں پہنچنا چاہتا ہے۔ وہ سب کہیں نہ کہیں پہنچنا چاہتے ہیں اور اس کوشش میں برابر ایک دوسرے کو ٹھیلنے دھکیلتے رہتے ہیں۔ سماعت پر بہت زور دے کر سننا چاہو تو کبھی ان کی فحش آوازیں سننے کی کوشش کرنا۔ وہ سب ایک بے ضابطہ ردم میں یکساں تپج پر چلاتے رہتے ہیں: ”چل بھئی! چل بھئی! چل بھئی!“ جیسے کوہِ ندا کے مسافر کسی مقدر کی سفاک ڈور سے بندھے کھنچے چلے جا رہے ہوں: ”چل بھئی! چل بھئی! چل بھئی!“ مگر یہ گیلی چمک والے ننھے گول کیڑے اصل میں جاتے کہیں نہیں، تودے ہی میں گردش کرتے رہتے ہیں اور اپنی مکروہ آوازوں سے مٹ میلی چمک پھیلاتے رہتے ہیں۔ تودہ ابھی تک اتنا ہی ہے اور وہیں ہے جہاں تھا، اور اتنا ہی اور وہیں رہے گا جہاں ہے... بس یہ کلبلاہٹ چلتی رہے گی۔

ناممکنات کے درمیان ریت کے تودے کے علاوہ اس منظر کے فرش پر دور تک متحجر لہروں کا جال بچھا ہوا ہے۔ روشنیوں والے سکریز سے اندھا کر دینے والی جو سفید روشنی نکلتی ہے،

وہ ان لہروں پر اتر کر بڑے من موہنے انداز میں جھلملانے لگتی ہے۔ پورے منظر میں بس ایک یہی بات دلا سادینے والی ہے۔ لگتا ہے یہ بے جان، متحجر لہریں نہ ہوں سانس لیتا ہوا پانی ہو جس کی سطح کے نیچے زندہ چیزیں حرکت کر رہی ہوں، اُگ رہی ہوں۔

میں ان متحجر لہروں کے بھری دھوکے میں آ کر پہلی بار اس منظر کے فرش پر دور تک دوڑتا چلا گیا تھا اور پشیمان ہوا تھا۔ اور یقین کرو، کتنی ہی بار روح زندہ کا بوجھ اٹھائے اس منظر کے بے زندگی فرش پر دوڑا ہوں کہ شاید میرے پیروں کی دھمک سے چیزیں پیدا ہو جائیں اور سانس لینے لگیں۔

میں بار بار اپنا بوجھ اٹھائے اس منظر کے سفاک فرش پر دوڑتا ہوا گیا ہوں اور اپنے تلوے لہولہان کر لیے ہیں مگر زندگی پیدا نہیں کر سکا؛ حالاں کہ میں سروں کی نارنجی لپٹ میں گھرا ہوا دوڑا ہوں اور ان دونوں آکٹوپس محرابوں سے پیاسی ابابیل کی طرح سنسناتا ہوا گزرا ہوں۔ اور پکارتا ہوا گزرا ہوں۔



فورک لفٹ ۳۵۲ حمود الرحمن کمیشن کے روبہ رو

پرو لوگ:

حضرت شاہ، مینیٹنس میکانک (رات ڈیوٹی) فلیٹ سیکشن (ایسٹ)

پورٹ جالنا کا بیان:

...چوبیس تاریخ گزرنے کے بعد جب میں رات میں اپنی ڈیوٹی پر آیا تو میں نے دیکھا کہ فورک لفٹ ۳۵۲ damaged vehicles کی لائن میں کھڑی ہے اور اس کا ایک پہیہ تیل میں بھیگا ہوا پڑا ہے۔ دستخط حضرت شاہ ایم ایم (نائب)۔



ملزم عبدالرحیم پر مانتھ کلیئر/ ڈرائیور۔ فلیٹ سیکشن (ایسٹ) پورٹ جالنا کا بیان:

میں نے چوبیس تاریخ کو صبح فلیٹ سیکشن میں دن کی ڈیوٹی پر رپورٹ کی تو مجھے ڈیوٹی سلپ دی گئی جس میں میری بکنگ فورک لفٹ ۳۵۲ پر کی گئی تھی۔ اس فورک لفٹ کو ۱۵-۱۶ نمبر برتھ پر کام کرنا تھا۔ تیل پانی چیک کرتے ہوئے میں نے دیکھا کہ فورک لفٹ میں بیٹری نہیں ہے۔ میں نے الیکٹریشن عبدالرحیم بھویاں سے کہا کہ اس فورک لفٹ میں بیٹری نہیں ہے۔ اس نے مجھے بتایا کہ اس گاڑی میں کچھ دن پہلے charged بیٹری لگائی گئی تھی۔ اب جو اس میں بیٹری نہیں ہے، تو اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ گاڑی صحیح کنڈیشن میں نہیں ہے۔

اس لیے میکا نک نے اس کی بیٹری نکال کر رکھ دی ہے۔

میں نے اس بات کی اطلاع بنگلہ کلرک مسٹر جاوید کو دی۔ انھوں نے Log Book میں entry کر لی۔ اس دوران وہاں leading driver میر زمان بھی آ گئے۔ میں نے ان کو یہ صورت حال بتائی تاکہ ان کے ذہن میں رہے اور اونچ نیچ کی صورت میں مجھ کو ذمے دار نہ ٹھہرایا جائے۔ پھر انچارج انسپکٹر منور خاں صاحب بھی وہاں آ گئے؛ میں نے ان کو بھی یہی بات بتائی، انھوں نے کہا، ہاں میں جانتا ہوں یہ گاڑی defective ہے۔ تم بیٹری لگا کے اسے ٹھیک کراؤ اور لے جاؤ۔ انسپکٹر منور خاں صاحب نے ایم ایم عبد المجید کو خود کہا کہ اس گاڑی کو ٹھیک کر دو۔ Maintenance Mechanic عبد المجید نے پرانی spare بیٹری لگا کر یہ گاڑی پلیٹ فارم پر کھڑی کی اور سامنے سے right wheel اور ڈرائیور کے بیٹھنے کے حساب سے left wheel میں Spanner ڈال کر کچھ کام کیا، جو میں نہیں دیکھ سکا اور گاڑی میرے حوالے کر دی۔ انھوں نے کہا کہ اب یہ ٹھیک ہے، اسے لے جاؤ۔ جب انھوں نے کہا کہ گاڑی ٹھیک ہو گئی ہے تو میں گاڑی پر بیٹھ کر اس کو چلاتا ہوا برتھ نمبر ۱۵-۱۶ پر لے گیا جہاں Stevedore کا فورمین موجود تھا۔ میں نے اس سے کام کے لیے پوچھا تو اس نے کہا کہ فورک لفٹ کا کوئی کام نہیں ہے، تم واپس چلے جاؤ؛ مگر میں وہاں ساڑھے دس پونے گیارہ بجے تک بیٹھا رہا، پھر میں نے فورمین سے کہا کہ میں گیراج جا رہا ہوں، تمہیں ضرورت ہو تو وہاں سے بلوا لینا۔ اس نے کہا، ٹھیک ہے۔ میں گاڑی کو لے کر گیراج کی طرف چلا۔ راستے میں مجھے بریک لگانے کی ضرورت محسوس ہوئی تو بریک لگانے پر آگے کا وہ wheel جس پر میکا نک عبد المجید نے کوئی کام نہیں کیا تھا اور صرف Spanner ڈال کر گھما دیا تھا، وہ ایک طرف گھوم گیا اور بریک نہیں لگا۔ میں کسی نہ کسی طرح آہستہ آہستہ گاڑی کو گیراج تک لے آیا۔ جب میں گیراج میں داخل ہو رہا تھا تو میں نے دیکھا کہ انچارج انسپکٹر منور خاں صاحب وہاں پہلے سے موجود ہے اور پتا نہیں کیوں مسکرا رہا ہے۔ انھوں نے مجھ سے پوچھا کیا بات ہے، کیا بریک فیل ہو گیا ہے؟ (عالی جناب انکوائری افسر صاحب سے گزارش ہے کہ انسپکٹر منور خاں صاحب کے اس سوال کی نوعیت کونوٹ فرمائیں) میں نے کہا، جی ہاں میں اسی لیے واپس آ رہا ہوں۔ مگر صاحب! آپ کو کیسے پتا چل گیا، میں نے تو ابھی کسی سے ذکر بھی نہیں کیا ہے؟ انھوں نے وہیں کھڑے ہو کر مسکراتے ہوئے میکا نک فاروق چودھری کو حکم دیا کہ اس گاڑی کو

چیک کرو۔ فاروق چودھری نے پلیٹ فارم پر گاڑی کھڑی کر کے میرے بتانے سے پہلے اسی ڈرم کو کھولنا شروع کر دیا جس پر میکا نک مجید نے کام نہیں کیا تھا۔ اس پر میں نے فاروق میکا نک سے پوچھا کہ کیا آپ کو پہلے سے معلوم تھا کہ اس پیسے میں defect ہوگا؟ تو وہ جواب دیے بغیر میری طرف دیکھ کر مسکرانے لگا۔

عبدالحمید مینٹی ننس میکا نک، فلیٹ سیکشن (ایسٹ) پورٹ جالنا کا بیان:

...میں نے ڈھائی بجے جب دونوں وہیل چیک کیے تو right wheel سے بریک آئل بہہ رہا تھا۔ وہیل کھول کر میں نے دیکھا کہ ایک اسٹڈ nut ٹوٹ گیا تھا، اس کے گر جانے سے ڈرم کٹ گیا تھا اور بریک لائینگ اور شو bend ہو گئے تھے۔ میں نے اس کی رپورٹ انچارج انسپکٹر منور خاں صاحب کو دے دی (بیان جاری ہے)۔

حضرت شاہ مینٹی ننس میکا نک (رات ڈیوٹی) فلیٹ سیکشن (ایسٹ) پورٹ جالنا کا بیان:

سوال: کیا فورک لفٹ کے وہیل میں stud nut کے loose ہونے کی وجہ سے یا کسی دوسرے defect کی وجہ سے فورک لفٹ چلاتے وقت ڈرائیور کو ان defects کا پتا چل سکتا ہے۔

جواب: اگر stud نٹ loose ہو گیا ہے تو لامحالہ پیسے میں سے آواز آئے گی اور ایک اناڑی شخص بھی یہ آواز سن کر جان لے گا کہ پیسے میں کوئی گڑبڑ ہے۔

سوال: میں یہی سوال تم سے پھر پوچھتا ہوں... خوب سوچ کر بتاؤ کہ فورک لفٹ کے چلانے میں اگر کسی وہیل کا کوئی stud نٹ ڈھیلا ہو جائے تو کیا اس کا پتا ڈرائیور کو چل سکتا ہے؟

جواب: جی ہاں۔ کیوں کہ اسٹڈ نٹ کے loose ہونے سے فورک لفٹ کے پیسے سے انجن کے شور سے اونچی اور مختلف آوازیں پیدا ہونے لگتی ہیں اور اگر ڈرائیور بہرا یا بدمعاش نہیں ہے تو سن سکتا ہے اور فوری طور پر مرمت کروا سکتا ہے اور vehicle کو بڑے نقصان سے بچا سکتا ہے۔ دستخط حضرت شاہ ایم ایم (نائب)

عبدالحمید مینٹی ننس میکا نک، فلیٹ سیکشن (ایسٹ) پورٹ جالنا کا بیان:
(گزشتہ سے پیوستہ)

...جواب: جی ہاں، اگر اسٹڈ Loose ہو کر ڈرم میں گھومتا رہے گا تو آواز سے

ڈرائیور کو پتا چل جائے گا۔ ویسے اگر اسٹڈ nut ادھر ادھر پھنس جائے تو آواز نہیں ہوگی۔
(بیان جاری ہے)

غلام رسول۔ اے، ڈرائیور، فلیٹ سیکشن (ایسٹ) پورٹ جالنا کا بیان:
جواب: جی ہاں، چلاتے وقت فوراً اس کا پتا چل جاتا ہے کیوں کہ وہیل سے آواز آنے لگتا ہے۔

دستخط غلام رسول

عبدالمجید مینیٹنس میکانک، فلیٹ سیکشن (ایسٹ) پورٹ جالنا کا بیان:
(گزشتہ سے پیوستہ)

سوال: اسٹڈ loose ہونے سے اتنا نقصان جو کہ ڈرم وغیرہ کو ہوا، یہ کتنے عرصے میں ہوتا ہے اور آپ یہ بھی بتائیے کہ ڈرم کٹ کٹ کر اتنا برادہ جو ڈرم میں جمع ہو گیا تھا اس کے جمع ہونے میں کتنا وقت لگا ہوگا؟

جواب: اگر loose stud برابر رگڑ کھاتا رہے تو کاٹنے کا اتنا کام تین چار گھنٹے میں ہوگا اور اگر زیادہ ٹائٹ ہے تو یہ نقصان دس منٹ میں ہو سکتا ہے کیوں کہ ڈرم کا لوہا نرم ہوتا ہے، اے Cast Iron سے بنایا جاتا ہے۔ دوسری بات یہ کہ جناب والا، برابر رگڑ کھانے سے آواز بھی پیدا ہوگی جو کہ ہزاروں میل تک سنی جاسکتی ہے۔ لیکن اگر اسپرنگ وغیرہ میں اسٹڈ پھنس گیا ہے تو یہ آواز نہیں سنی جاسکتی مگر اندازہ ہو جاتا ہے... ویسے پھنسنے کے بعد اسٹڈ رگڑ بھی نہیں کھائے گا۔

سوال: یہ بتائیے کہ اگر اسٹڈ زیادہ سختی سے رگڑ کھا رہا ہے تو کیا اس میں زیادہ آواز ہوگی اور ہلکی رگڑ کھا رہا ہے تو کیا کم آواز ہوگی؟

جواب: جی ہاں۔ اگر ہلکی رگڑ کھا رہا ہے تو معمولی آوازیں ہوگی جو ہو سکتا ہے کہ پکڑ میں نہ آئے مگر تاریخ اتنی ہلکی آوازوں کو بھی سن لیتی ہے۔

سوال: آپ نے ڈرم کھولا تو کیا stud نٹ اسپرنگ میں پھنسا ہوا تھا؟

جواب: ڈرم ہلانے کے بعد مشکل سے کھلا اور جب باہر نکالا گیا تو نٹ بھی گر گیا اس لیے معلوم نہیں کہ وہ اسپرنگ میں پھنسا ہوا تھا یا آزاد تھا مگر جیسا کہ جناب والا مجھ سے بہتر جانتے ہیں اس بات سے فرق کوئی نہیں پڑتا، نقصان بہر حال ہو چکا تھا۔

سوال: وہ تو ٹھیک ہے مگر میں حقائق کی تہ تک پہنچنا چاہتا ہوں۔ ملزم ڈرائیور عبدالرحیم کا بیان ہے کہ جب تقریباً گیارہ بجے وہ واپس گیراج میں پہنچا تو فاروق چودھری میکانک نے پیسے کو چیک کیا اور عبدالرحیم کے اس سوال پر کہ کیا اسے پہلے سے معلوم تھا کہ defect اس پیسے میں ہوگا، میکانک فاروق کوئی جواب دیے بغیر عبدالرحیم کی طرف دیکھ کر مسکرایا بھی۔ پھر جب اس نے ڈرم کھولا تو اس میں ڈرم کا برادہ وغیرہ موجود تھا۔ اور اسٹڈنٹ spring میں پھنسا ہوا تھا مگر اس کے برخلاف آپ کا کہنا ہے کہ گیارہ بجے نہیں بلکہ تقریباً ڈھائی بجے ڈرائیور رحیم نے آپ کو اطلاع دی تھی کہ بریک فیل ہو گیا ہے اور فاروق نے نہیں بلکہ آپ نے ڈرم کھول کر چیک کیا تھا اور یہ کہ اسٹڈنٹ nut اسپرنگ میں نہیں پھنسا تھا... آپ کے پاس ان سب باتوں کا کیا جواب ہے؟

جواب: اس گاڑی کا ڈرم تقریباً ڈھائی بجے خود میں نے کھولا تھا۔ فاروق بھی وہاں موجود تھا، دیگر یہ کہ میں عرض کر چکا ہوں کہ ڈرم کھولنے پر nut گر چکا تھا اس لیے نہیں کہا جاسکتا کہ وہ پھنسا ہوا تھا کہ آزاد تھا۔

سوال از پرمائنٹ کلیئر/ ڈرائیور ملزم رحیم: یہ جو wheels گھما کر بریک چیک کیے جاتے ہیں تو کیا میکانک پیسے کو ہاتھ سے گھما کر چیک کرتے ہیں یا اشارٹ بھی کرتے ہیں؟ جواب از مجید: ہاتھ سے گھما کر بھی اور اشارٹ کر کے بھی دیکھا جاتا ہے۔

سوال از پرمائنٹ کلیئر/ ڈرائیور ملزم رحیم: مجھے صبح گاڑی دینے سے پہلے آپ نے سیٹ پر کسی کو بٹھا کر اشارٹ گاڑی میں وہیل کو mechanical propulsion دلو کر دیکھا تھا؟ اور کیا آپ نے گھومتے ہوئے پہیوں میں بریک وغیرہ لگوا کر دونوں پہیوں میں اپنا اطمینان کر لیا تھا؟

جواب: جی ہاں۔

سوال از پرمائنٹ کلیئر/ ڈرائیور ملزم رحیم: سیٹ پر کون آدمی بیٹھا تھا؟ کیا میں تھا؟

جواب: نہیں، آپ نہیں تھے routine میں تو جیک اپ (jack up) کی ہوئی گاڑی کی سیٹ پر خود گاڑی کا ڈرائیور ہی بیٹھتا ہے اور میکانک چیک کرتا ہے لیکن ڈرائیور کی عدم موجودگی یا متنازعہ موجودگی یا مشتبہ موجودگی کی صورت میں، میں اپنے helper کو بٹھا کر اس کی مدد سے بھی چیک کرتا ہوں۔ مجھے اب یاد نہیں کہ سیٹ پر اس وقت کس کو بٹھایا تھا۔

سوال از پرماتھٹ کلیئر/ ڈرائیور ملزم رحیم: لیکن میں تو برابر موجود رہا، ہمیشہ سے وہیں تھا۔ آپ کو اپنے ہیلپروں کی ضرورت نہیں پڑنا چاہیے تھی۔

جواب: ضرورت پڑی تھی اس لیے کہ آپ وہیں تھے مگر وہاں نہیں تھے۔

سوال از پرماتھٹ کلیئر/ ڈرائیور ملزم عبدالرحیم: آپ مسکرا کیوں رہے ہیں اور اس مسکرانے کے عمل میں آپ کے کتنے ہیلپر ہیں؟

جواب: سوال کے دونوں حصے impertinent ہیں اس لیے سوال کی حدود میں رہتے ہوئے جواب دینے کی بجائے میں ایک بونس کا جواب دے رہا ہوں... وہ یہ کہ میرا ایک ہیلپر ہے۔

سوال از پرماتھٹ کلیئر/ ڈرائیور ملزم رحیم: کیا اس کا نام بتائیں گے؟

جواب: فاروق چودھری۔

سوال از انکواری افسر: فاروق وہی جو ملزم ڈرائیور عبدالرحیم کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا؟

جواب: جی ہاں... مگر میں نے اس کو مسکراتے ہوئے نہیں دیکھا۔

سوال: سوال از پرماتھٹ کلیئر/ ڈرائیور ملزم

عبدالرحیم: میں نے اسے اور انچارج انسپکٹر منور خاں صاحب دونوں کو مسکراتے ہوئے دیکھا تھا۔

جواب از انکواری افسر: افسروں کے مسکرانے یا نہ مسکرانے کے بارے میں اس مرحلے پر کوئی سوال نہ کیا جائے تو بہتر ہے۔

سوال از پرماتھٹ کلیئر/ ڈرائیور ملزم عبدالرحیم: میں اس مرحلے پر اپنا مسکرانے کا حق محفوظ رکھتے ہوئے عبدالمجید ولد نامعلوم، مینیٹننس میکاٹک فلیٹ سیکشن (ایسٹ) پورٹ جالنا سے سوال کرتا ہوں کہ مسٹر عبدالمجید ولد نا...؟

سوال از انکواری افسر: کیا غیر متعلق باتوں سے پرہیز کیا جا رہا ہے؟

سوال از پرماتھٹ کلیئر/ ڈرائیور ملزم عبدالرحیم: ...سوال کرتا ہوں کہ آپ جو یہ کہتے ہیں کہ بریک فیل ہونے کے بعد آپ نے damaged پیسے کے ڈرم کو کھولا تھا تو یہ بتائیے کہ اس میں پڑا ہوا برادہ کیا بریک آئل سے تر تھا یا بریک آئل برادے تک بالکل نہیں پہنچا تھا کیوں کہ تیل پلیٹ سے بہہ بہہ کر wheel کے ٹائر پر گر رہا تھا۔ ویسے اس بارے میں

International Red Cross زیادہ اچھی طرح بتا سکے گا۔

سوال از انکوائری افسر: ڈرم ٹوٹنے سے کیا بریک آئل باہر آنے لگتا ہے؟

جواب: فورک لفٹ کے اس پیسے میں ڈرم اور شوز اس بری طرح damage ہو گئے تھے کہ ان سے تیل نکل کر بہہ جانا لازمی تھا۔ اگر معمولی نقصان ہوتا تو ممکن ہے تیل اندر ہی رہتا یا زیادہ سے زیادہ کچھ رسنے سا لگتا مگر ایسا نہیں تھا، پورا Wheel تیل سے نہا گیا تھا۔
سوال از انکوائری افسر (دہشت کی جھرجھری کے ساتھ): آپ دونوں یہ کہتے اور سنتے ہوئے مسکرا کیوں رہے ہیں؟

(بیان جاری ہے)

انسپیکٹر منور خاں، انچارج فلیٹ سیکشن (ایسٹ) پورٹ جالنا کا بیان

...سوال: کیا ڈرائیور ملزم عبدالرحیم، لائسنس یافتہ ڈرائیور ہے؟

جواب: نہیں جی اس کے پاس لائسنس نہیں ہے، نیز یہ کہ اس کا عہدہ ڈرائیور کا نہیں ہے۔ وہ Permanent Cleaner ہے جناب والا۔

سوال: کیا آپ کے پاس لائسنس یافتہ ڈرائیور نہیں تھے؟

جواب: جناب والا! ہمارے پاس لائسنس یافتہ ڈرائیور ہیں اور اس دن بھی تھے۔

سوال: کیا آپ اصولی طور پر اس بات کے حق میں ہیں کہ کلیزوں کو محکمے کی قیمتی vehicles حوالے کر دی جائیں؟

جواب: جی نہیں۔

سوال: اگر اصول کے خلاف تھا تو یہ فورک لفٹ پر مائنٹ کلیزر ملزم عبدالرحیم کے حوالے کیوں کی گئی؟

جواب: اس بارے میں کیا عرض کر سکتا ہوں جناب والا۔

سوال: آپ مسکرا کیوں رہے ہیں۔ کیا میرا یہ سوال مضحکہ خیز تھا؟

جواب: کیا عرض کر سکتا ہوں۔

سوال: آپ کم از کم مسکرا نے سے تو باز رہ سکتے ہیں؟

جواب: کھس کھی کھی ہپ!

سوال: مسٹر انسپیکٹر! کیا آپ کو معلوم نہیں کہ آپ انکوائری میں بیٹھے ہیں؟

جواب: قہہ قہہ قہہ قہہ قہہ قہہ!

سوال: ہنسنا بند کرو، سنا نہیں؟

جواب: قا آ آہ قا آ آ آہ، اوووہ اوووہ اوو!

سوال: ہنسنا بند کرو ہا سنا کے بچے! کتے! میں تمہیں ڈمکس کرادوں گا۔ سمجھے؟

جواب: جناب والا! میں معافی کا خواست گار ہوں، ویسے اجازت ہو تو جی میں کچھ

کان میں ”گوش گزار“ کرنا چاہتا ہوں جناب والا!

سوال: ٹھیک ہے تم میرے قریب آ سکتے ہو۔

جواب: پھس پھس پھس پھس پھس کھی کھی کھی!

سوال: اوئے کھی کھی کھی ای ای ایہہ کیہہ کیہہ کیہہ کیہہ؟

جواب: قہہ قہہ قہہ قہہ قہہ قہہ!

سوال: قہہ قہہ قہہ قہہ قہہ قہہ؟

سوال و جواب: قہہ قہہ قہہ قہہ قہہ قہہ قہہ قہہ!



ایک وحشی خیال کا منفی میلا پن

میں کسی روز اس مسئلے کو حل کروں گا۔

اس دھاڑتی ہوئی و لگرسڑک کے کنارے کنارے چلتے ہوئے روز بڑی پابندی سے ایک وحشی خیال بیدار ہو جاتا ہے۔ یہ میرے پاس بہت دن سے ہے اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ خاصا میلا ہو گیا ہے۔ اس کا میلا پن کرسی کے ہتھوں، دروازے کے پٹوں اور تکیے کے غلافوں کے میلے پن سے مختلف ہے۔ ان سب چیزوں کا میلا پن تو استعمال سے وابستہ مثبت میلا پن ہے۔ پر میرے اس وحشی خیال کا میلا پن وہ ہے جو جان دار چیزوں کو گمک کے طور پر اٹھائے پھرنے سے پیدا ہوتا ہے؛ جیسے سائنڈے کا تیل بیچنے والا اپنے زندہ سائنڈے کو روز گھر سے بازار لائے اور پھر گھر لے جائے اور روز کے لانے لے جانے سے وہ میلا ہو جائے، تو یہ اسی طرح میلا ہوا ہے۔ اس کی کمر میں بندھی ہوئی ڈوری بھی میلی ہو گئی ہے اور ہر وقت کی ہینڈلنگ سے اس کے ناخن جھڑنے لگے ہیں۔ میں اس وحشی خیال کے میلے پن سے شرمندہ ہوں۔ کسی دن اسے اسپرٹ سے صاف کروں گا اور اسے اس کا کنوارا ٹیکسچر اور ستھرا پن لوٹا دوں گا۔ ممکن ہوا تو نئے ناخن بھی لگا دوں گا۔ بس وقت ملنے کی بات ہے۔

ایس پی سی اے کے منافق انسپکٹر چاہے کتنا ہی شور مچائیں، میں اسے آزاد نہیں کر سکتا۔ میں انھیں دھوکا یا رشوت دے کر یا ڈرا دھمکا کر مطمئن کر دوں گا۔ اس لیے کہ میرے اور

دیوانگی کے درمیان ایک وحشی خیال کا سانڈا ہی تو دیوار ہے۔ میں یہ دیوار کیسے ڈھا سکتا ہوں۔ مسئلہ یہ ہے کہ دیوار کے اُس طرف، یا اس طرف، پتھر کی ایک عمارت ہے، جہاں لوگ جھوٹی گواہیاں دینے اور جھوٹے ایفی ڈے وٹ بنوانے آتے ہیں۔ اس کی سنگین سیڑھیاں چڑھتے ہوئے تم نے دیکھا ہوگا کہ دائیں اور بائیں گملوں کی قطاریں لگی ہیں۔ ان گملوں میں ہیری پام، کینا، کولینس اور کروٹن کے پودے انتظار ہی انتظار میں نمک لگے بھینس کے چمڑے کی طرح سوکھ کر مڑ گئے ہیں اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے سُر کے بچوں نے ہیری پام کے بالوں بھرے پتوں پر پان کی پیکیں مار دی ہیں اور یہ پتے خون میں لتھڑے ہوئے بچوں کی طرح ہو گئے ہیں؛ جب کہ ان سیڑھیوں پر سجائے جانے میں ان کا کوئی قصور نہیں تھا۔ یہ بے چارے تو اپنی سادگی میں مارے گئے۔

میں جب بھی جھوٹی گواہی دینے یا جھوٹا ایفی ڈے وٹ بنوانے وہاں گیا ہوں، مجھے سب سے زیادہ ہیری پام کے بالوں بھرے ضعیف بچوں پر ترس آیا ہے۔ سالوں نے ذرا بھی رحم نہیں کیا۔ آتے جاتے ان پر خوب تھوکا ہے۔ یہ پام کے ضعیف پنچے ہمیشہ سے ضعیف ہیں؛ اور کیوں کہ یہ سفید بالوں والے اور مرجھائے ہوئے اور مسکین اور پر امید ہیں اسی لیے حرامیوں کو ان پر تھوکنے کا خیال آیا، ورنہ وہ ان پر تھوکتے نہیں۔ انھیں، کینا، کروٹن اور کولینس کی طرح پیاس میں اور مایوسی میں اور انتظار میں مڑ جانے دیتے۔

اصل قصہ کیا ہے۔ وہ سالے سمجھتے ہیں کہ یہ پام کوئی نظر یہ ہے... یا شاید مزاحمت ہے، یارکنے کا اشارہ ہے، یا کیا ہے اسی لیے وہ اس پر تھوکتے ہیں۔ ان بد معاشوں کو اصل بات نہیں معلوم... میں بتاتا ہوں... بات بس اتنی ہے کہ یہ پام بہت سے ڈوبتے ہوئے بوڑھے آدمیوں کے پنچے ہیں جنھیں ایک ساتھ باندھ کر ڈوبنے کے لیے پھینک دیا گیا ہے اور وہ ڈوبنے سے پہلے آخری بار ایک گونگا ایس او ایس دے رہے ہیں کہ بچاؤ، بچاؤ، بچاؤ۔ میں سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس پیک بھرے گملے سے سفید بالوں میں لپٹی ہوئی بچاؤ، بچاؤ کی آواز اٹھتی دیکھتا ہوں اور روہانسا ہو جاتا ہوں۔

بد معاش کہیں کے!... ڈوبتے ہوئے بوڑھے آدمیوں کی صاف ستھری تدفین بھی نہیں دیکھ سکتے۔ ان پر تھوکتے ہیں۔ کتے!

تم ان کتوں کو نہیں جانتے۔ میں بھی نہیں جانتا۔ انھیں کوئی نہیں جانتا۔ ان کی

صورتیں اس قدر مکروہ اور اتنی ناقابل یقین ہیں کہ روبہ رو آ کر انھیں کوئی بھی نہیں پہچان سکتا۔ یہ اپنی غیر حاضری میں پہچانے جاتے ہیں؛ جیسے کینا، کولینس اور کروٹن کے مڑے مڑے انتظار میں، یا ہیری پام کے خوں چکا پنچوں میں، یا اُن کر یہہ آوازوں اور کہنیوں کی چھن میں جنھیں وہ پشت سے میری طرف بھیجتے ہیں۔ میں نے کئی بار اچانک گھوم کر انھیں دیکھنے اور صورت سے پہچان لینے کی کوشش کی ہے مگر وہ پکڑ میں نہیں آئے۔ ہمیشہ یہی ہوا ہے کہ میں نے مڑ کر دیکھا تو میرے پیچھے کینا، کولینس اور کروٹن کی طرح انتظار میں مڑے مڑے مایوس لوگ ہی کھڑے ہوئے ملے؛ جن کی پشت میں بھی وہی حرام زادے اپنی کہنیاں اور آوازیں چھوڑے تھے۔ میں نے کئی بار ان پیچھے کھڑے ہوئے لوگوں سے کہا کہ ذرا گھوم کر دیکھنا وہ حرامی کہاں ہیں اور کیا کر رہے ہیں؟ تو وہ مایوسی میں سر ہلا کر کہنے لگے کہ بھائی! ہمیں معلوم ہے، وہ ہمارے پیچھے ہیں اور کہنیاں اور آوازیں چھوڑے ہیں۔ ہم نے گھوم کر دیکھ بھی لیا تو ہماری طرح کے مڑے مڑے لوگ ہی نظر آئیں گے۔ وہ سُر کے تخم نہیں ملیں گے جو ہماری اور تمھاری اور ان کی پشت میں کہنیاں اور آوازیں چھوڑتے رہتے ہیں۔

اگرچہ یہ فضول سی دلیل تھی اور مایوسی کی بات تھی؛ مگر درست تھی اور میرے تجربے میں تھی، اس لیے میں نے ہر بار چپ رہنا ہی مناسب سمجھا اور چپ رہا۔ مگر اب میں سوچتا ہوں کسی روز اس مسئلے کو حل کروں گا۔ بس وقت ملنے کی بات ہے۔

ابھی ابھی میں نے چوتھی بار وقت کا لفظ کہا ہے؛ اس لیے یہ بتانا ضروری ہو گیا ہے کہ وقت کی اضافیت کی ایک وحشی تمثیل بھی میرے پاس تیار رکھی ہے۔ میری تمام چیزوں کی طرح وہ بھی خاصی کروڈ اور انڈرزنشڈ اور میلی میلی سی ہے۔ مگر کیوں کہ وہ کینا، کروٹن اور کولینس کے مڑے مڑے پودوں سے اور مجھ سے اور ان حرامیوں سے متعلق ہے اور ہیری پام کے ڈوبتے پنچوں سے متعلق ہے اس لیے یہاں اس کا ذکر کرنا از بس ضروری ہے۔

وقت کی اضافیت کی وہ وحشی تمثیل اس طرح ہے کہ:

نمبر ایک: کینا، کولینس اور کروٹن گزرتے ہوئے وقت میں ہیں مگر جامد کر دیے گئے ہیں؛ اس لیے وہ گزر رہے ہوئے وقت میں بھی ہیں، اور مایوس ہی سہی پر انتظار میں ہیں، اس لیے ان کا کچھ سوکھا ہوا چہرہ آنے والے وقت میں بھی ہے۔

نمبر دو: ہیری پام کے ضعیف پنچے گزر رہے ہوئے وقت میں ہیں لیکن گزرتے ہوئے

وقت میں وہ بے چارے ڈوب رہے ہیں؛ اس لیے وہ گزرتے ہوئے وقت میں بھی ہیں اور کیوں کہ سالویشن کی امید لگائے بیٹھے ہیں، اس لیے ان کے پنچے آنے والے وقت کو بھی کھرتے جاتے ہیں۔

نمبر تین: میری رسٹ وائچ گم ہو گئی ہے کہ پتا نہیں چوری کر لی گئی ہے، اس لیے میں اپنے وقت کے بارے میں یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتا۔

اور نمبر چار: رہے وہ حرام زادے، تو ان کے بارے میں طے ہے کہ وہ ٹائم لیس ہیں۔

تمہیں شاید اندازہ ہوا ہو کہ میں نے اپنے وقت کے بارے میں بڑے ہشیار گریز سے کام لیا ہے۔ مجموعی طور پر یہ بڑی چالاک تمثیل ہے۔ یہ کریہہ آوازیں بھیجنے والوں اور کہنیاں چھونے والوں کی ڈائی لیکٹکس ہے اور میں نے انہی حرامیوں سے سیکھی ہے۔ اس طرح کے استدلال سے ہر بات ثابت کی جاسکتی ہے اور کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا۔ وقت کی اضافیت کی اس وحشی تمثیل میں، میں نے ایک بات بڑی دیانت داری سے کہی ہے اور وہ یہ ہے کہ وہ حرام زادے ٹائم لیس ہیں۔ مجھے معلوم ہے، میں اگر اس کی وضاحت کرنے بیٹھوں گا تو پکڑا جاؤں گا یا مار دیا جاؤں گا۔ اسی لیے میں ٹائم لیس کہہ کر بات ختم کر رہا ہوں۔

میں اپنے ہوش و حواس، اپنی آزادی اور اپنی جان کھونا نہیں چاہتا، ہر محتاط آدمی یہی چاہتا ہے کہ یہ چیزیں سلامت رہیں۔ اس لیے یانان، سی، حیدر کی طرح لعن طعن کرنے یا مجھ پر حیران ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ مجھے پکڑے جانے یا مارے جانے کا کوئی شوق نہیں، میں تو یہ چاہتا ہوں کہ یہ مسئلہ حل ہو جائے (اور ایک دن ہو بھی جائے گا) بس وقت ملنے کی بات ہے۔

کچھڑی مونچھوں اور مہربان آنکھوں والے یانان، سی، حیدر کو مجھ سے اختلاف ہے۔ اس کا خیال ہے کہ وہ کمینے ٹائم لیس نہیں... اور یہ کہ ان کا وقت ختم ہو چکا ہے۔

یانان، سی، حیدر نے ابھی ابھی مجھ سے یہ بھی کہا ہے کہ تم نمک لگے بھینس کے سوکھے چمڑے اور ہیری پام کے ضعیف پنچوں کے درمیان کی کوئی دیگی ٹیبل ہو اور گزرتے ہوئے وقت میں مایوس کروٹن کی طرح منتظر اور مڑے تڑے کھڑے ہو۔ تمہارے پاس مسکین پام کے پرامید تین کی جگہ دعاؤں اور بد دعاؤں کا ایک زبردست خزانہ ہے اور تم بچاؤ بچاؤ کا

شور مچانے میں سب سے آگے ہو اور تمہیں یہ نہیں معلوم کہ تمہارے لیے بھی وقت بالکل نہیں ہے۔

اس بات پر اس نے اپنی ایک مہربان آنکھ سے آنسو گرایا ہے (اس کی دوسری مہربان آنکھ میں وہ سالے کہنی مار رہے ہیں) وہ بڑے رसान سے کہتا ہے کہ وقت کسی کے پاس نہیں ہے۔ میں موقع مناسب جانتے ہوئے یا نان سی کو وقت کی اضافیت سے متعلق اپنی وحشی تمثیل سنانا چاہتا ہوں۔ وہ مجھے روک دیتا ہے اور کہتا ہے کہ وقت کسی کے پاس نہیں ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وقت ختم ہو چلا اور تمہارے وحشی خیال کا گمک گھر سے بازار اور بازار سے گھر لانے لے جانے میں بہت ہی میلا ہو گیا۔ اب اسے آزاد کر دو یا اس کا تیل نکال کر اپنے بدن پر مل لو اور کینا، کولیئس اور کروٹن کے منتظر پودوں پر مل دو تا کہ وہ بھی صحت مندی میں ایستادہ ہو جائیں اور ان کا مڑا تڑا انتظار ختم ہو۔ پام کے مسکین پنجنوں کی پرواہ مت کرو، ان کا ایس و ایس بے نتیجہ ہی رہے گا۔ وہ بے چارے اب ڈوبے کہ جب ڈوبے۔ ان کی صاف ستھری تدفین تمہارا مسئلہ نہیں ہے۔

یانان، سی، حیدر ٹھیک کہتا ہے۔ میرے بغیر بھی یہ مسئلہ حل ہو ہی جائے گا پھر بھی صفائی ستھرائی اچھی چیز ہے۔ میں سوچتا ہوں کسی دن میں اسے اسپرٹ سے صاف کر دوں گا اور اسے اس کا کنوارا ٹیکسچر اور ستھرا پن لوٹا دوں گا۔ ممکن ہوا تو نئے ناخن بھی لگا دوں گا۔



ہے لال لال

استاد عاشق علی خاں مرگیا اور بکرے کی آواز والا ایم ایف رحیم زندہ ہے۔ اور آنکھ مارنے والی تسوفی اور حقے کی ترتری بجانے والا آرسہول ڈکاسٹا اور متورم چہرے والا ہومو سیکچوئل پروڈیوسر اور چالیس ہزار نیم مردہ بیوروکریٹس زندہ ہیں۔

اور وہ سب جو زندہ ہیں وہ اس لیے زندہ ہیں کہ آواز کو (جو خداوند کا جمال اور اس کا جلال ہے اور موجودات کا حتمی توازن ہے اور نری سچائی ہے) اپنے خسیوں میں تلاش کرتے ہیں۔ اور استاد عاشق علی خاں اس لیے مرگیا کہ وہ آواز کو اپنے وجدان میں تراشتا تھا۔ استاد علی خاں کی sensitivity چلنے والی چیز نہیں تھی، اسی لیے... وہ مرگیا۔ وہ آواز کو خدا سمجھتا تھا اور بیالیس ہزار راگ راگنیوں اور نروں، شرتیوں کے حوالے سے اور سیہون کے شہر خیال اور روشن آرا بیگم اور بڑے غلام علی خاں کے حوالے سے اور بندو خاں کے حوالے سے آواز کی ارستو کریٹ تتلیاں پیدا کرنا چاہتا تھا... سوا سے تو مرنا ہی تھا۔

اب جب کہ استاد عاشق علی خاں مرگیا ہے تو جو ڈریل بنک کی رصدگاہ نے سورج میں ایک اور اسپاٹ کی خبر دی ہے اور ایم ایف رحیم نے ایک کان سے دوسرے کان تک اپنا دہانہ کھول دیا ہے اور چالیس کیمروں نے اپنے زوم لینس اس کے دہانے میں اتار دیے ہیں کہ ان چالیس کیمروں کے پیچھے چالیس کرومیٹم پلیٹیڈ بومز ہیں جن کے سروں پر فولادی

چھینکوں میں حساس مائیکروفونز قلمی آموں کی طرح جھول رہے ہیں۔ یہ چالیس کیمرے ایم ایف رحیم کی سوچی ہوئی سرخ زبان کے اختتام پر موت کے آرگزم میں اچھلتے ہوئے کلی ٹورس کو فوکس کرتے ہیں؛ جو دہشت اور decay کا مرکزہ ہے، اور چالیس بومز اس chaos کو جذب کرتے ہیں جو nonentity کی بڑی آنت کے نچلے سرے سے شروع ہو کر مائیکروفونز کی فولادی جالیوں پر ختم ہوتا ہے۔

قصہ یہ ہے کہ ایم ایف رحیم کی پتلون، شہوت کے سنفورائزڈ دھاگوں سے سلی ہے۔ اسی لیے تمام VTR رول کر رہے ہیں اور اسی لیے استاد عاشق علی خاں کی ارستو کریٹ تتلیاں، اسٹوڈیو ”بی“ کی چھت سے چپکی ہوئی ہانپ رہی ہیں اور اسی لیے اسٹوڈیو ”بی“ کے ربڑ لگے فرش پر ایک کرومیم پلیٹڈ کرین نصب ہے۔

دور کہیں گھنٹی بجتی ہے اور کرومیم پلیٹڈ کرین کسی دہشت ناک آلہ تناسل کی طرح اپنی jib اٹھاتی ہے۔ کرین کی jib پر ٹرانسلوسنٹ ساڑی پہنے آنکھ مارنے والی تسوفنی کھڑی ہے۔ پھر کہیں گھنٹی بجتی ہے... آنکھ مارنے والی تسوفنی پہلے اپنا پیڑو جھٹکتی ہے، پھر اپنی ٹرانسلوسنٹ ساڑی جھٹکتی ہے اور اپنا ان شے وں دہانہ کھول کر ساری ارستو کریٹ تتلیاں ہڑپ کر جاتی ہے۔

مرحبا! متورم چہرے والا ہومو سیکچوئل پروڈیوسر، بیالیس ہزار راگ راگنیوں اور ’سروں، شرتیوں کو اپنی توند سے دھکیلتا ہوا اسٹوڈیو ”اے“ کے دُہرے دروازوں میں لے جاتا ہے اور سناٹے کے اس برزخ میں اپنی فلانی کا زپر کھول کر ان پر پیشاب کرتا ہے۔ اس آواز کی نوٹیشن F-Minor ہے۔ مصنوعی چمڑے کا جھالردار پنڈلی بوٹ پہنے ایک چپڑقتاتی لونڈا F-Minor میں سسکاری دینے لگتا ہے:

ایس یو این سن۔ ایس یو این سن۔ ایس یو این سن۔

اس کی پتلون بھی شہوت کے سنفورائزڈ دھاگوں سے سلی ہے۔ وہ گرمائے ہوئے جھینگر کی طرح اسٹوڈیو ”بی“ کے ربڑ لگے فرش پر اچھلتا ہے اور کہتا ہے:

ایس یو این سن۔

ان سب کو سورج میں جگہ بنانی ہے۔ یہ سورج کا برص آباد کرنے والے لوگ ہیں۔ یہ لافانی ہیں۔ ہر بار جب جوڈریل بنک کی رصدگاہ سورج میں کسی نئے اسپاٹ کی خبر دیتی

ہے، میں سمجھ جاتا ہوں کہ استاد عاشق علی خاں مرگیا اور ایم ایف رحیم اور سسکاری دینے والے جھینگر لونڈے نے اپنے لیے سورج میں جگہ بنالی اور آنکھ مارنے والی تسوفنی اور آرسہول ڈکاسٹا اور ہومو سیکچوئل پروڈیوسر اور چالیس ہزار نیم مردہ بیوروکریٹس کو ایک اور مہلت مل گئی۔ مگر نہیں... مجھے پوری بات کہہ دینی چاہیے۔ مجھے کسی کے ساتھ نا انصافی نہیں کرنی۔ میں تو اس کا قائل ہوں کہ سیزر کا حق سیزر کو ملے۔

بات یہ ہے کہ انھوں نے، جو زندہ ہیں اور سورج میں لافانی ہیں، انھوں نے استاد عاشق علی خاں کو زندہ رہنے کی ایک مہلت دی تھی اور اسے راگ ایمن کلیان میں ایک jingle کمپوز کرنے کو کہا تھا۔ یہ jingle ان کے نئے ایف ایل کی توصیف میں تھا۔ اس میں ۲۷ بار، نشلی، ریلی، کیٹلی، پچیلی اور پھسلیلی کے الفاظ آتے تھے اور یہ بتایا گیا تھا کہ نیا ایف ایل electronically tested ہے طاقت سے بھرپور اور دنیا بھر میں مشہور ہے اور اس کے استعمال کے بڑے اجر ہیں۔ اور یہ سب باتیں راگ ایمن کلیان میں کہی جانی تھیں جو خداوند کی حمد کا راگ ہے اور ڈھائی ہزار برس کے انسانی وجدان میں آواز کا معجزہ ہے۔ اور یہ ساری باتیں حقے جیسی ترتری کے lubricated نوٹس پر کہی جانی تھیں اور ان باتوں کے لیے بالالتزام کانگو، بونگو اور ”آجاؤ افریقا“ والے ڈھول فراہم کیے گئے تھے اور ایک الیکٹرک ستار بھی تھا اور اسپینش اور بیس گٹاریں اور چیلو اور مراکا اور اسکرپر تھے اور مرلی دھڑکی فلیوٹ تھی اور سارنگیاں اور سرود تھے۔ اور والکن اور وینا اور مردنگ تھے اور ایک تجویز یہ تھی کہ انٹریوڈ میں دم توڑتے ہوئے استاد عاشق علی خاں کی آکار بھی ڈال دی جائے۔ تاہم یہ محض ایک تجویز تھی اور اس سے اتفاق کرنا نہ کرنا استاد عاشق علی خاں پر موقوف تھا۔

تو انھوں نے، جو سورج میں لافانی تھے اور استاد عاشق علی خاں کو زندگی کی مہلت دینے آئے تھے... انھوں نے جب یہ ساری باتیں کہہ ڈالیں تو استاد عاشق علی خاں نے ہاتھ باندھ کر ان سے چلے جانے کو کہا اور ناشکرگزاری میں خون کی الٹیاں کیں۔ سو وہ جو زندگی دینے آئے تھے... وہ چلے گئے مگر انھوں نے استاد عاشق علی خاں کو معاف نہیں کیا۔ انھوں نے اس کی ڈیوڑھی میں نہ ختم ہونے والے اندھیرے کا غبار چھوڑ دیا اور پان کی پیک بچھادی اور پیشاب کی بوٹانک دی اور لکڑی کے چکر دار زینے پر ٹراموں کے گھنٹے لٹکا دیے اور عورتوں کی

دلالی کرنے والے لڑکوں کے آوازے سجادے اور آڑھتیوں کی ہا ہا کار لکھ دی اور ایک ایک سیڑھی پر چالیس چالیس ٹریفک کانٹیبیل کھڑے کر دیے، جو عقوبت کے ٹریفک جام میں پیتل کی discordant سیٹیوں سے آوازوں کے برسٹ مارتے تھے۔

اور بکرے کی آواز والے ایم ایف رحیم نے یوں کیا؛ کہ وہ چڑیا گھر سے ہارمونیکا بجانے والا ہاتھی پکڑ لایا، اور ہارمونیکا بجانے والے ہاتھی پر کھڑے ہو کر لوہے کے سریے سے ٹین کے کنسٹر پیٹنے لگا۔ پھر اس نے استاد عاشق علی خاں کی کھڑکی کے مقابل، ہاتھی کے مستک پر کھڑے کھڑے، گوز صادر کیا اور کونسلے سے مکان کی دیوار پر ”ہے لالہ“ لکھ دیا۔
تو یہ تھی وہ کہانی جو میں نے خود ہی گھڑ لی ہے۔

اس لیے کہ میں نے استاد عاشق علی خاں کو مرتے ہوئے نہیں دیکھا اور ایم ایف رحیم کو ٹین بجاتے نہیں سنا اور آنکھ مارنے والی تسوفی کا اسٹریپ ٹیز نہیں دیکھا اور آرسہول ڈکا سٹا کو ترتری پر استمنا بالید کرتے نہیں سنا اور متورم چہرے والے ہومو سیکچوئل کا F-Minor نہیں دیکھا اور جھینگر لونڈے کو جھالر بوٹ پہن کر سورج میں چہل قدمی کرتے نہیں دیکھا۔

میں سماعت اور بصارت کے ایک دہشت ناک تناظر میں بہرا اور اندھا پیدا ہوا ہوں۔



مُسوروں کے حق میں ایک کہانی

بہت بلندی سے ایک پہاڑی اترتی ہے۔
جس طرح مسجد جامع کی دھلی دھلائی سیڑھیاں متانت کے ساتھ قاضی شہر کے
پاپوش چومتی ہوئی نیچے، عامتہ الناس کی دھواں لپٹی دنیا میں اتر رہی ہوں۔
ٹھیک اسی طرح ایک پہاڑی اترتی ہے۔

تو شام کے جھپٹے میں، اور کبھی دھند میں، شاید کئی لاکھ فیٹ کی بلندی سے ایک
پہاڑی، کبھی ہلکے، کبھی گہرے بادلوں والے آسمان سے، ساون کی دو تین سو نیر جھروں کی انگلی
تھامے قدم قدم اترتی ہے اور تال کے کنارے تک جا پہنچتی ہے۔ اور ساون کا یہ جلوس باون
گنگا کہلاتا ہے۔ اور جو گنتی کرنے بیٹھو تو ان گنگاؤں کی تعداد باون نہیں رہتی، دو تین سو سے اوپر
پہنچ جاتی ہے۔ مگر ساون میں گن کون سکتا ہے۔ یہ تو بے حسابی کی رت ہے۔

تو یہ کئی سو گنگا میں نیچے پہنچ کر ایک بارہ ماسی تال بناتی ہیں؛ جس کی سطح سنگھاڑے کی
بیلوں سے اور جل کبھی سے اور تین قسم کے کنول سے ڈھکی رہتی ہے۔ تال میں بہت سے
چھوٹے چھوٹے ٹاپو ہیں؛ جو آدمی کے قد جتنی اونچی، گہرے ہرے رنگ کی چکنے تھوڑے ڈنھل
والی آبی گھاس پہنے رہتے ہیں۔ اس گھاس کے ڈنھل اس قدر چکنے، اتنے آبدار اور لچک
دار ہیں کہ لگتا ہے، اندرونی آرائش کرنے والوں کی سہولت کے خیال سے انھیں ٹھوس نائیلون

سے بنایا گیا ہے اور یہ کوئی بہت پائدار، واشبل قسم کی آرائشی چیز ہے۔ کبھی لگتا ہے کہ یہ ڈنٹھل کسی سخت گیر اسکول ماسٹر کی لہراتی ہوئی چھڑیاں ہیں؛ جن کے سروں پر ماسٹر نے سجاوٹ کے لیے چار چار پانچ پانچ شاخوں والے طرے لگا رکھے ہیں۔ ان شاخوں سے پور پور برابر کی پتلی لوزنجیز کی شکل کی سخت ہری پتیاں چپکی ہوتی ہیں؛ جیسے ننکھوڑے کے بدن سے اس کی ہزاروں بے چین ٹانگیں چپکی ہوں۔ اور جس وقت یہ آبی گھاس بھیگی ہوئی ہوا کے ساتھ لہرا رہی ہوتی ہے تو بے خیالی میں، یادیں، اس کی تمام لہروں کے خطوط حرکت کو خود پر نقش کر لیتی ہیں اور پتا بھی نہیں چلتا اور تمیں چالیس برس گزر جاتے ہیں۔ پھر اچانک ایک ایک لہر اقلیدی شکل میں خود کو دہراتی ہوئی آتی ہے اور آنکھوں کی پتلیوں کے پیچھے بجلیاں سی کوند نے لگتی ہیں۔

تال کے سارے ساپو اس آبی گھاس سے پٹے پٹے ہیں اور یہ آبی گھاس کبھی پیلی نہیں پڑتی، سداہری بھری رہتی ہے۔ اس لیے کہ ساون رہے نہ رہے؛ تال کے اس دور دراز حصے میں کمر کمر پانی سارے سال ہی رہتا ہے تو پھر یہ ہری ہری پتیاں اور ہرے ڈنٹھل کا ہے کو پیلے پڑنے لگے۔ سارے سارے سال ٹاپوؤں کے یہ ماسٹر سڑک پر چلنے والے اکاؤ کا مسافر کو چھڑیاں لہرا لہرا کر دھمکاتے رہتے ہیں کہ گھن گرج کے ساتھ دوبارہ ساون آ جاتا ہے۔ ساون میں یہ ٹاپو ایک دم گھونٹ دینے والی تیز سبز بو اچھالتے ہیں جو مچھلیوں کے جیتے جیتے سرخ گلپھڑوں سے گزرتی ہوئی ساری دنیا میں پھیل جاتی ہے اور قریب کے راہ گیروں کو (ٹب میں بیٹھے ہوئے شریر بچوں کی طرح) شراہور کر دیتی ہے۔

شام گہری ہوتے ادھر سے کم ہی لوگ گزرتے ہیں۔ وہ شاید گہرے ہرے رنگ کے اس اندھیرے سے ہول کھاتے ہوں گے یا شاید وہ اپنی یادوں کو زیادہ تند و تیز چیزوں سے بھرنا نہیں چاہتے... وہ ہلکے پھلکے رہتے ہوئے جینا چاہتے ہیں... مگر کیا ہلکے پھلکے رہتے ہوئے جینا ممکن ہے؟

میں نے تال کنارے ایک اجڑی ہوئی امرائی کو بھرپور ساون میں بھی سب قصوں، قضیوں سب چیزوں سے الگ تھلگ پڑے دیکھا ہے اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ ہلکے پھلکے رہتے ہوئے جینا کیسے ممکن ہے۔ یہ امرائی، تال میں اور تال کے آس پاس اور پہاڑی پر جو کچھ ہو رہا ہے؛ اس سے الگ تھلگ اور اس کے بیچوں بیچ موجود ہے اور دھیرے دھیرے مرتی جا رہی ہے۔ یوں ہے کہ تال کے بائیں کنارے سے جو ایک چھوٹی سی مسکین پہاڑی اٹھتی ہے

اور باون گنگاؤں والی پہاڑی کی دوسرا تھ کے خیال سے کچھ دور چلتی ہوئی پھر ہموار سطح مرتفع میں گم ہو جاتی ہے (جیسے بیاہ میں آئے ہوئے پڑوسی، دعا سلام کے بعد رشتے ناتے والوں سے ذرا ہٹ کر ایک طرف کو جا بیٹھیں) تو اسی پہاڑی کی گود میں یہ چھوٹی سی امرائی پڑی ہے اور یہ دھیرے دھیرے مرتی جا رہی ہے۔ سو دو سو برس پہلے یہاں آم کے بے گنتی پیڑوں پر بے حساب توتے اور کونکلیں اکٹھا ہوتے اور پکار کرتے تھے۔ اب سناٹا رہتا ہے۔ گنتی کے دس بیس بوڑھے گنجے درخت بکریوں کے ریوڑ سنبھالے بظاہر سکون سے کھڑے رہتے ہیں۔ جہاں اب مینگنیوں کی بچھات بچھی ہے؛ کبھی مست مہک والے آموں کا بورفرش کیے رہتا تھا اور درختوں تلے اگی ہوئی کمزور ہری گھاس پر چمکیلے دھاری دار گاؤں پہنے گلہریاں دوڑ لگاتی تھیں، بھورے کوٹ والے لنگور اُدھم کرتے تھے اور چالاک گرگٹ پل پل میں لباس بدلتے تھے۔ اب یہ سب اوپر چلے گئے ہیں؛ کہ اوپر اب بھی سیتا پھولوں کے ٹیڑھے میڑھے درختوں کے بیچ میٹھے کروندوں اور اچاروں کی جھاڑیاں ہیں؛ اور تیز بسنتی رنگ میں رنگے ہوئے شہد بھرے ققموں کے جھابے اٹھائے تیندو کے درخت کھڑے ہیں، اور نیل کے تناور پیڑ ہیں؛ جو میٹھی مٹی کے میٹھے پھلوں کے درمیان سنتریوں کی طرح اپنی موجودگی کا یقین دلاتے ہوئے، چھوٹی پہاڑی پر چڑھتے چلے جاتے ہیں۔ اور پھولوں میں املتاس ہے اور ٹیسو ہے اور گیندے کی جھاڑیاں ہیں۔ اور اس چھوٹی پہاڑی پر بکھرے ہوئے سال ہا سال کی دھوپ کھائے، کروڑوں برساتیں جھیلے ٹیڑے ترچھے پتھروں کو سرکا سرکا کر قیمتی ایلو ویل مٹی نے پیوند لگا دیے ہیں؛ جہاں کسی بھی وقت کچھ بھی اُگنے لگتا ہے۔ جہاں جہاں مٹی کا جس کم زور پڑ جاتا ہے وہاں بھر بھری مٹی میں خرگوشوں کے قبیلے سرنگیں کھود لیتے ہیں اور سیہہ کا اکا دکا خاندان اپنا بھٹ بنا لیتا ہے؛ اور رات گئے اپنی سیلوانڈ کی کانٹوں دار زرہ بکتیریں پہن کر گھومنے نکلتا ہے تو اپنے نشانات چھوڑ جاتا ہے۔ پھر سطح مرتفع پر بنے ہوئے گھروں سے بھیگی ہوئی ہوا میں سوں سوں کرتے ہوئے بہت سے بچے اترتے ہیں جو یہ سیلوانڈ کی قلمیں اکٹھی کرتے، اور انھیں اپنے دفنی کے ڈبوں میں سنبھال کر رکھ دیتے ہیں؛ کہ تیس چالیس برس بعد وہ انھیں اپنی پلکوں سے چنیں گے، اور تیس چالیس برس پرانی بھیگی ہوئی ہوا میں سوں سوں کریں گے۔

اور سیاہ ایلو ویل مٹی کے پیوندوں میں گوپچی کے نیم قد درخت بیٹھے اپنی مالاؤں کے سیاہ و سرخ، ناسفہ منکے بکھیرتے رہتے ہیں؛ اور چاہتے ہیں کہ اس تیز ہرے گرد و پیش میں

ان کا لایا ہوا سرخ اور ان کا لایا ہوا سیاہ بھی چمکتا رہے۔

تو بے شمار چمکیلے رنگوں کا یہ طوفان چھوٹی مسکین پہاڑی پر آیا ہوا ہے جس کی گود میں سب سے بے تعلق یہ مرتی ہوئی امرائی پڑی ہے۔ اور چھوٹی مسکین پہاڑی باون گنگاؤں والی وشال پہاڑی کی بازگشت ہے کہ اس کے پہلو سے آکار کہتی ہوئی اٹھی ہے اور اس آکار کو گلہریاں اور لنگور اور گرگٹ اور خرگوشوں کے قبیلے اور سیہہ کا اکا دکا خاندان اور بھیگی ہوئی ہوا میں سوں سوں کرتے ہوئے بچے ہی سن سکتے ہیں۔ اور باون گنگاؤں والی پہاڑی ماہار ہے۔ اور میگھ راج کے پُرشور تھ میں جتے ہوئے گھوڑوں کی گردنوں کو چومتا ہوا جب دامن کا کوڑا لٹکتا ہے تو یہی وشال پہاڑی اک بھینکر روپی راگنی ہے۔ جسے رونگٹے کھڑے کر دینے والی وحشی مسرت کے ساتھ تال کے کمر کمر پانی میں کھڑا ہوا یہ آدمی سن رہا ہے۔

یہ سنتا جاتا ہے کہ اس کی بند آنکھوں کی پتلیوں کے پیچھے سمرتیوں کی بجلیاں کوند رہی ہیں۔ تو اس آدمی کو ہاتھ پکڑ کر ٹاپوؤں کی سنگت سے اور سنگھاڑے کی بیلوں اور جل کبھی کی سنگت سے اور تین قسم کنول کی سنگت سے کھینچ لو (کہ سننے والوں اور سُوروں کے درمیان تم اپنا فیصلہ سنا چکے۔ سوا سے ہاتھ پکڑ کر کھینچ لو) اور اس دوسرے کو، اس سور کے تخم کو لے آؤ جو ناک پر رومال رکھے امرائی میں دبکا بیٹھا ہے۔ یہ دوسرا اپنے بل ڈوزر اور ارتھ موور اور ککھاڑے اور چھینیاں لے کر آئے گا اور تین سو نیر جھروں کو روک دے گا، ایک نقلی آبشار بنائے گا اور تال کنارے ٹاپوؤں کی ہری ہری گھاس کھینچ کر وہاں سیمنٹس کے بلاک جڑ دے گا... اور کرائے کے موٹر بوٹ چلائے گا۔ پھر سنگھاڑے کی بیلوں پر اور جل کبھی پر اور تین قسم کے کنول پر سگریٹوں کے بٹ، کاغذ کے گندے رومال اور استعمال شدہ ربر پھینکے جائیں گے اور چھوٹی مسکین پہاڑی پر چونے سے نقشے بننا شروع ہوں گے اور گلہریاں اور لنگور اور رنگین لباس والے گرگٹ اور روئی کے دھنکے ہوئے خرگوش اور سیہہ اور سوں سوں کرتے ہوئے سب بچے پہاڑی سے چلے جائیں گے اور چمکیلے رنگوں والی پہاڑی کی آکار ڈوب جائے گی... بس فاش ٹینکوں کی غراہٹیں رہ جائیں گی... کہ ٹرمپٹ کی آخری سانسوں تک سنی جاسکیں گی۔



برج خموشان

پہلی اشاعت: ۱۹۹۰ء

فہرست

۱۱۳	گھس پیٹھیا
۱۲۶	چا کر
۱۳۵	گھڑی بھر کی رفاقت
۱۵۰	ملفوظاتِ بھپوتا
۱۶۰	مردہ گھر میں مکاشفہ
۱۷۰	شہر کو فے کا محض ایک آدمی
۱۷۵	برجِ خموشاں
۱۷۷	مرتبان - آوازوں کا ایک نائٹک
۱۸۹	مرتبان - ایک سمری

گھس بیٹھیا

بر یار خاں نے کاسٹ آئرن اور لکڑی سے بنی ہوئی مضبوط بنچ کے نیچے پڑے
پڑے آسودگی سے ٹانگیں پھیلائیں اور جان دے دی۔

آخری خیال جو گردن کا منکا ڈھلنے سے پہلے ان کے دماغ میں آیا ڈلچن لکھیرے
کے بارے میں تھا۔ ڈلچن لکھیرا اسی بنچ کے اوپر پڑا ایڑیاں رگڑ رہا تھا۔ ٹھیک اسی وقت کئی ہزار
آدمی ایڑیاں رگڑتے ہوئے دم توڑ رہے تھے۔ بر یار خاں نے سوچا: موت اچانک واقع
ہو رہی ہے، شہر کے مسلمان تو سارے ہی شہادت کے مرتبے پر فائز ہوں گے اور ان شاء اللہ
جنت الفردوس میں جگہ پائیں گے۔ پس طمانیت کے ساتھ بر یار خاں نے کلمہ شہادت پڑھنے
کی کوشش کی اور ہمیشہ کی طرح اٹک گئے۔

وثوق سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ انھیں کلمہ شہادت صحیح طور پر یاد بھی تھا یا نہیں۔ وہ
اب تک اٹکل ہی سے کام چلاتے آئے تھے؛ کیوں کہ انھوں نے اپنے وقت میں بہت سی
میتوں کو کاندھے دیے تھے اور وہ جانتے تھے کہ کاندھا دیتے ہوئے اخلاقاً کلمہ شہادت پڑھنا
پڑتا ہے، جو ذرا سے فرق کے ساتھ پہلے ہی کلمے کی طرح ہے۔ پہلا کلمہ انھیں ٹھیک ٹھیک یاد
تھا۔ مگر اب جب کہ خود اپنی موت پر شہادت کا کلمہ پڑھنا تھا تو ضروری تھا کہ بالکل درست
پڑھا جائے۔ ”یہ لیت و لعل کا وقت نہیں ہے۔“ انھوں نے سوچا: ”مغفرت کا معاملہ ہے۔“

اسی وقت بچ کے اوپر سے خرخرانے کی آواز آئی۔ وہی سالا ڈلچن خرخرارہا ہوگا، سسر امرہی نہیں چکتا۔ ان مشرکوں کا معاملہ واقعی سخت ہے۔ توبہ استغفار، استغفر اللہ میرے معبود! آدمی گناہ بے شک کر لے، مگر یہ شرک اور یہ کفر۔ توبہ توبہ!

ایک وہ تھا مشرک، بھٹنا گر ماسٹر۔ سڑے ہوئے دانتوں والا کافر۔ سسر ہر وقت مزے کرنے کا مشورہ دیا کرتا تھا: ”ابے تو پڑھ لکھ کر کیا کرے گا جاگیردار! مزے، کر مزے۔ مزے کر مزے۔ مزے کر مزے، حرامی پلے!“

اب جب کہ زندگی کا معاملہ ہی ختم ہو رہا تھا تو چیزیں اور واقعات وضاحت کے ساتھ اور ایک ترتیب کے ساتھ بریار خاں کے ذہن میں آرہے تھے۔ لیکن زمانی ترتیب اتنی باضابطہ بھی نہیں تھی، کچھ کچھ گڑبڑ ہو رہی تھی۔ کہیں کہیں تو پوری کی پوری دہائیاں غائب تھیں۔ مثلاً انھیں یہ یاد تھا کہ ملگجا پیجامہ اور مشجر کی شیروانی پہنے، سرخ چمردھے جو توں میں ترچھے ترچھے قدم رکھتا ہوا جو ملگجا سا آدمی ولیمہ کھانے کے لیے دالان میں گھس رہا تھا، بریار خاں اسے ”میاں“ کہتے تھے، وہی ان کا باپ تھا۔ اس کے بعد گڑبڑ ہو گئی تھی۔ میاں کے سرخ چمردھے جو تے کتم عدم میں لٹک گئے تھے۔ بس مشجر کی لیر لیر شیروانی رہ گئی تھی جس کو ادھیڑ کر اور کالی بٹی سے دھو کر گسی نے کتابیں رکھنے والا تھیلہ بنا دیا تھا اور تھیلے پر بار بار لپلپاتا ہوا پتلا سا بید مارا جارہا تھا جو پٹاخا چھوٹنے کی سی آواز پیدا کرتا تھا۔ ”ابے تو پڑھ لکھ کے کیا کرے گا جاگیردار! مزے کر مزے۔ مزے کر مزے۔ مزے کر مزے، حرامی پلے!“

چناں چہ بریار خاں نے بہت مزے لوٹے۔ یعنی یہی کہ چوتھی جماعت سے آگے ایک حرف پڑھ کے نہ دیا۔ خوب سیریں کیں، شکار کھیلے، مقدور بھر فاقے اور حرام کاریاں کیں، آتشک لگالی اور وراثت سے محروم کر دیے گئے۔ مگر یہ سب باتیں اس ترتیب میں نہیں ہوئی تھیں۔ پہلے انھیں وراثت سے محروم کر دیا گیا تھا۔ کہا یہ گیا تھا کہ ان کا باپ کیوں کہ ان کے دادا کی زندگی میں فوت ہو گیا تھا؛ چناں چہ اہل اسلام کے قانون وراثت اور شرع شریف کے مطابق، خاندانی ترکے میں ان کا کوئی حق نہیں بنتا۔ دیگر یہ کہ بریار خاں بے شک ظفریار خاں کے نطفے سے ہوگا (اس لیے کہ دونوں میں حد درجے کی مشابہت موجود تھی) مگر اس بات کا ثبوت تو کہیں نہیں ہے کہ جو عورت بریار خاں کی ماں بتلائی جاتی ہے، ظفریار خاں کا اس عورت سے نکاح بھی ہوا تھا؟ دیگر یہ کہ میاں وہ اشراف میں سے کب تھی۔ ظفریار خاں کے

تصرف میں آنے سے پہلے جمرت نام تھا اس کا۔ بھیا! اماؤں اسیلوں کو چاہے فرخ زمانی بیگم کہلواد، چاہے سنبھلی بہو کا لقب دے دو، رہیں گی وہ جمرت کی جمرت ہی۔ اور اگر بھئی نکاح ہوا تھا تیری ماں، کا تو نکاح نامہ اور گواہ شد اور قضیات کا رکٹ کہیں سے نکلو کر دکھا۔ منہ سکیڑے کیا بیٹھا ہے؟ سمجھا بھئی؟ اب تو جا مزے کر مزے۔ سمجھا؟ کہیں اور مزے کر سالے حرامی پلے! گھس بیٹھے! ہمارا نسب نامہ خراب کرنے یہاں کیوں آن مرا ہے۔

بر یار خاں کو گھس بیٹھیا، حرامی پلا بنانے میں کن کن چیزوں کا ہاتھ تھا، یہ بتانا بہت مشکل ہے۔ سرسری طور پر یہی کہا جاسکتا ہے کہ بر یار خاں نو عمر تھا اور اس کے چچوں تایوں کی اولادیں سن بلوغ کو پہنچی ہوئی مضبوط نانھیالوں والی جمی جھائی اولادیں تھیں۔ بعض اولادیں تو ادھیڑ عمر کی تھیں، وہ سرج کی شیروانیاں پہنے رہتی تھیں اور راجے کو جھک جھک کر سلام کرتی تھیں۔ دیگر یہ کہ ظفر یار خاں مرحوم کے دوسرے عزیز واقارب اور آس پاس کے معتبر لوگ خوف زدہ بیچڑے تھے۔ وہ اپنی اپنی ماؤں کے نکاح نامے موم جامے میں باندھے ہوئے اور اپنے اپنے تر کے پر اپنے پیندے رکھے ہوئے جمے بیٹھے تھے اور روٹیاں چکنی کر کر کے کھا رہے تھے۔ انھیں خواہ مخواہ کسی گھس بیٹھے کی حمایت کرنے کا، اور جمے جمائے مضبوط لوگوں کو اللہ واسطے ناراض کرنے کا شوق نہیں تھا۔ ”ارے بھیا! تم ہی بتاؤ۔ دس بارہ برس کے محروم الارٹ لونڈے کے لیے ہاتھیوں سے دشمنی مول لینے کو کیا کسی حکیم نے بتایا ہے؟ یہ انگریز کی عمل داری تو ہے نہیں میاں! رجواڑا ہے رجواڑا۔ لاشیں راتوں رات حلالی ندی میں بہائی بھی جاسکتی ہیں اور قیمہ وغیرہ کروا کے کتوں وغیرہ کو کھلائی بھی جاسکتی ہیں۔ ہمیں ابھی زندہ رہنا ہے۔ سمجھے بھیا؟“

دس بارہ برس کے بر یار خاں کی بساط ہی کیا تھی۔ چناں چہ اس کی پوری ایک دہائی یہ سن کر معدوم ہو گئی کہ اپنی ماں کے نکاح کا ثبوت لا کر دکھاؤ، ولد الحرام! پھر یہاں رہنے کی سوچنا۔ پتا نہیں کس کے ساتھ اس نے شہر چھوڑ دیا اور قریب کے کسی گاؤں میں رہ پڑا۔ گاؤں میں اجاڑ سا ایک فارم تھا، کسی رحمت اللہ ٹھیکے دار کا۔ وہ شہر سے گاؤں آیا تو اس نے بر یار خاں کو جنگلی پھل کھاتے اور لکڑیاں چنتے ہوئے دیکھا۔ عمر کے حساب سے مضبوط قد کاٹھی اور فراخ پیشانی دیکھ کر رحمت اللہ نے اسے دال روٹی اور تھوڑے سے پیسوں پر فارم پر نوکر رکھ لیا۔ یہاں بیس برس کا ہو کے بر یار خاں پہلے برا پھر بٹن بھیا کہلانے لگا۔ مویشیوں کا سانی گو بر کرنے سے لے کر رحمت اللہ ٹھیکے دار کے لیے وقتاً فوقتاً ڈھیر نیوں، چمارنوں کو ہموار کرنے

تک سارے کام اس بچن بھیا کو نمٹانے ہوتے تھے۔ وہ تارا اوگتے بیدار ہوتا تھا اور فارم کو چلانا شروع کرتا تھا۔ وہ دن بھر درد بھری آواز میں کچھ نہ کچھ گاتا رہتا تھا۔ وہ ہالیوں کو ہل پھیرنے پر آمادہ کرتا تھا اور فصلوں کو اگنے پر اکساتا تھا۔ اور ایک بار کھلیانوں سے فارغ ہو کر جب گاؤں میں جتر ا بھری تھی اور ساگری پی سے ماسٹر صدیق اپنی منڈلی لے کر آیا تھا اور رات میں اس نے ہارمونیم کے بین کرتے ہوئے سروں میں گانا شروع کیا تھا کہ:

کم ہوگی جب چراغے محبت کی روشنی

ارے دل کو جلا جلا کے اجالا کریں گے ہم

تو روتے روتے بریار خاں کی ہچکی بندھ گئی تھی۔ اس لیے کہ فارم کے اس موسم بہار میں بریار خاں نے پہلی بار حرام کاری اور عشق کے مابین کسی فرق کو پہچاننے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش میں چندن پورے والے لالہ جی کی بال ودھوا بیٹی امید سے ہو گئی تھی۔ اور معاملہ بہت پیچیدہ ہو گیا تھا کیوں کہ فارم کے مالک رحمت اللہ ٹھیکے دار کا خیال تھا کہ لالہ کی بیٹی کے کسی بھی معاملے میں خود اس کو اپنی جی جمائی عزت اور کھیتی باڑی دونوں سے ہاتھ دھونا پڑیں گے۔ اس نکلیائی حرام زادی بال ودھوانے رحمت اللہ ٹھیکے دار کو مروا ہی دیا ہوتا، اگر اندھیرے میں چھوڑا ہوا ٹھیکے دار کا ایک تیر ٹھیک بریار خاں کی عشق سے پگھلی ہوئی چھاتی پر نہ جا لگتا۔ بریار خاں نے تین ہی چار سوالوں میں سب کچھ اگل دیا:

”ہاں۔ وہ چندن پورے والے لالہ کی بیٹی سے عشق حقیقی کرتا ہے۔“

”ہاں وہ اس کو مسلمان کر کے اپنے نکاح میں لانا چاہتا ہے۔“

”بے شک وہ راتوں میں کبھی کبھی کھلیان پر آتی رہی ہے۔“

رحمت اللہ ٹھیکے دار نے سکون کا سانس لیا اور گاؤں والوں کی مدد سے بریار خاں کو پکڑ کر آم کے خن سے باندھ دیا۔ پھر بیدوں سے وہ مار لگائی کہ ٹھا کر تک کو سفارش کرنی پڑی کہ مر جائے گا حرامی۔ اب کھول دوسرے، مدرج کو۔ اور سرے، مدرج کو کھول کر سرکاری سڑک پہ پھنکوا دیا گیا۔

سرکاری سڑک سے اٹھائے جانے کے بعد بریار خاں پر وہ عمل شروع ہوا جو ان بے وسیلہ لوگوں پر شروع ہوتا ہے، جن کا کوئی سر دھرا نہ رہا ہو، اور جو اچھی طرح متھے جا چکے ہوں۔ اور بریار خاں تو زخمی بھی بہت ہوا تھا۔ شاید اس کے گردوں پر چوٹ پڑی تھی۔ کچھ دن

اسے پیشاب کے رستے خون آتا رہا پھر پیشاب ہی بند ہو گیا۔ بہر حال، سڑک سے اٹھانے والے بنجاروں نے سیاہ موصلی اور سفید موصلی پلا پلا کر اور اللہ واسطے لیپ چڑھا چڑھا کر اسے لیٹے سے بٹھا دیا۔ پھر وہ اٹھ کھڑا ہوا اور اس کے بعد دھیرے دھیرے چلنے لگا۔

وقت بھی ایک بہت بڑے اسٹیم رولر کی طرح کوکتا ہوا ببر یار خاں پر سے آہستہ آہستہ گزرنے لگا۔

ببر یار خاں نے شہر سے دور پہاڑیا پہ ایک جھونپڑی ڈال لی، محنت مزدوری کرنے لگا۔ پھر اس نے ایک عورت ڈال لی۔ عورت بانجھ نکلی، اس لیے جھونپڑی سے ہر سال ببر یار خاں جیسے چھوٹے چھوٹے حرامی پلے جاری ہونے کی نوبت نہ آئی۔ کچھ دنوں بعد پہلے عورت بیمار ہوئی؛ ببر یار خاں نے جی جان سے اس کی خدمت کی، اس کا میلا تک اٹھایا، پھر وہ خود بیمار ہو گیا۔ عورت کسی کے ساتھ بھاگ گئی۔ وہ لاشتم پشتم اچھا ہوا تو ایک اور عورت نے رحم کھا کے ببر یار خاں کو ڈال لیا۔ وہ عورت برابر والی جھونپڑی میں رہتی تھی اور رات پالی والے مل مزدوروں کی دل بستگی کرتی تھی۔ یہی اس کا ذریعہ آمدنی تھا۔ اس عورت کے ساتھ رہتے ہوئے پہلے ببر یار خاں کے کپڑے میلے ہوئے، پھر پھٹ گئے۔ عورت نے مل مزدوروں سے کسب کیے ہوئے پیسوں سے مارکین کا ایک جوڑا بنوا دیا اور سخت بانات والی ایک ترکی ٹوپی خرید دی۔ ببر یار خاں ترکی ٹوپی پہن کر کم زور ٹانگوں سے چلتا ہوا پہاڑیا کی اجڑی پجڑی عید گاہ تک گیا اور اس نے نماز دو گانہ ادا کی اور خدا کا شکر بجالایا کہ وہ زندہ ہے۔

آگے چل کر وہ صرف اتنا ہی زندہ رہ گیا جتنی کہ سبزیاں زمین سے چکی رہنے تک زندہ رہتی ہیں؛ کیوں کہ مل مزدوروں سے کسب زر کرنے والی اس عورت کے حوالے سے اسے آتشک ہو گئی۔ اور وہ دوسرے تیسرے نشہ بھی کرنے لگا۔ اور اب اسے کسی طرح کی محنت کرنے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ علاوہ ازیں وہ پیسے کمانے کے کئی گر بھی سیکھ گیا تھا۔ چوری ان میں سے ایک اہم گر تھا۔ کئی بار اسے پولیس بھی لے جا چکی تھی۔ ان بد نصیبوں نے اپنے روزنامے میں ببر یار خاں کا نام بئن ولد چھریا خاں، یا زکریا خاں لکھنے کے بعد پیشے کے خانے میں ”آوارہ گرد“ لکھ رکھا تھا۔ اور لکھا تھا کہ اس شخص کا ذریعہ آمدنی نامعلوم ہے، شبہ ہے کہ یہ عورتوں کی دلالی کر کے اپنا رزق حاصل کرتا ہے۔

خدا بڑا رزاق ہے، وہ بڑا مسبب الاسباب اور بڑا منتقم ہے۔ وہ پتھر کے شکم میں

بیٹھے ہوئے کیڑے کو بھی سنگسار کرتا ہے۔

چنانچہ ایک دہائی، یا پتا نہیں دو دہائیاں گزری ہوں گی، کہ ببر یار خاں نے خود کو ادھیڑ عمر کا پایا... ۳۰... ۳۵ برس کا ایک ایسا ادھیڑ آدمی جس کے بال اور دانت جھڑنا شروع ہو گئے تھے؛ جو نشے کی دست گیری کے بغیر رات کا سامنا نہیں کر سکتا تھا، اور فوراً تشک سے جس کی بینائی جواب دیتی جا رہی تھی۔

اسی زمانے میں کبھی پہلی بار ببر یار خاں ولد ظفر یار خاں کے ذہن میں یہ خیال آیا کہ اسے وراثت سے محروم کرنے والے شاید ٹھیک ہی کہتے ہوں گے؛ اس کی ماں فرخ زمانی بیگم عرف بنجھلی بہو عرف جمرت متوفیہ کا نکاح بالعوض اتنے اتنے سکھ رائج الوقت اس کے باپ سے کبھی نہیں ہوا ہوگا، ورنہ وقت کا اسٹیم رولر اس پر سے کوکتا ہوا اتنی سست رفتاری سے کیوں گزرتا۔ اس لیے ایک رات وہ جیسے تیسے شہر کے وسط میں پہنچا اور ایزد یار خاں کی حویلی تک گیا، اور حویلی کے بلند دروازے کے سامنے، جہاں اس کے تایوں چچوں کی اولادوں کے موٹر آکر رکتے ہوں گے، عین اس جگہ، وہ حوائج ضروری سے فارغ ہوا... پھر طہارت کیے بغیر مزے سے چلا آیا۔ اس سے زیادہ وہ کربھی کیا سکتا تھا؟

مزے کر مزے۔ مزے کر مزے۔ مزے کر مزے، حرامی پلے!۔

کچھ دہائیاں ایسی گزری ہیں جن کے بارے میں ببر یار خاں کو یا اہل شہر کو کچھ نہیں معلوم۔ بس... ڈلچن کو کہیں کہیں سے پتا ہوگا۔ ویسے یہ باتیں ڈلچن لکھیرے کو بھی نہ معلوم ہوتیں، اگر اس رات زبردست آندھی بارش سے اس کا چھپر نہ اڑ گیا ہوتا۔ چھپر اڑ گیا تو وہ اپنا ڈالڈے کا ڈبا اٹھائے لائھی ٹیکتا ہوا قبرستان والی باؤلی کے اُسارے میں آ گیا۔ اُسارے میں وہ کبھی نہیں آتا، اگر سڑک پر گھٹنوں گھٹنوں پانی نہ کھڑا ہوتا۔ سڑک نظر آرہی ہوتی تو وہ سیدھا کیروانی مندر کا راستہ پکڑتا۔ وہ مندر میں نہیں گھستا۔ موٹا مہنت اسے گھسنے ہی کب دیتا تھا۔ اس وقت اگر پناہ لینی ہوتی تو ڈلچن بس یہ کرتا کہ مندر کے کمپاؤنڈ تک پہنچتا، چار اینٹیں اوپر تلے رکھ کر ان پر چڑھتا، اور لائھی کی مدد سے اچھل کر باندروں کے چونترے میں پہنچ جاتا، پھر رینگتا ہوا چونترے کے لمبے طاق میں جا لیٹتا، اور بارش رکنے تک مزے سے سوکھے میں پڑا سوتا رہتا۔ یہ طاق اور یہ ترکیب سب کو معلوم تھی، مگر ڈلچن کو ہمیشہ جگہ خالی ہی ملتی تھی۔ ٹھیک تو ہے،

وہاں لیٹ کے کیا کسی کو مرنا تھا؟

جو بھی تھا، اب تو ڈلچن باؤلی کے اُسارے میں آ گیا تھا اور پتھر کی جالی سے ٹیک لگائے مسلمانوں کے مُردوں کو ٹوٹی پھوٹی قبروں سے نکل نکل کر بارش میں چھپا کے مارتے دیکھ رہا تھا۔ ڈلچن مُردوں سے خوف نہیں کھاتا تھا۔ زندوں سے بھی اسے کچھ ایسا زیادہ ڈر نہیں لگتا ہوگا۔ وجہ اس کی یہ تھی کہ لوگ خود ڈلچن سے ڈرے ہوئے تھے۔ وہ اسے دور دور رکھتے تھے۔ اصل میں ڈلچن کو چتکبرے کی بیماری تھی۔ اس کی انگلیوں کا چمڑا اور ہونٹ اور پوٹوں کے سرے سفید ہو چکے تھے۔ باقی چہرے پر بھی چتکبری بیماری نے بسنت کے چوکے پور دیے تھے۔ گردن اور چھاتی کے چمڑے کی بھی یہی حالت تھی۔ لوگوں نے اڑا رکھا تھا کہ یہ کوڑھ ہے؛ اسی لیے چھوٹے بڑے، ہندو مسلمان، سب اسے دُردُرتے تھے اور دور ہی سے پیسا دو پیسا پھینک کر اپنی جان چھڑا لیتے تھے۔ اس طرح چتکبرے کی بیماری نے ڈلچن کا وقت بچا دیا تھا۔ اسے مانگنے میں زیادہ طاقت بھی نہیں لگانی پڑتی تھی۔ ویسے یہ نا انصافی کی بات تھی کہ لوگوں نے اتنی گندی بیماری کو اس سے منسوب کر دیا تھا۔ اس کا اپنا کوئی تھا نہیں جو اس نا انصافی کا برا ماننا اور یہ بھی تھا کہ ڈلچن کے چھوٹے سے چتکبرے دل میں برا ماننے والا خانہ ہی نہیں تھا۔ اس لیے بس، مزے سے گزارا ہو رہا تھا۔ وہ چاہتا تو غصہ دکھا سکتا تھا، گالی بھی دے سکتا تھا، مگر طبیعت کی بات ہے، ڈلچن کسی کو بھی ناراض کرنا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس گندے موسم کو بھی اس وقت بڑی خوشامد سے مسکرا مسکرا کر دیکھ رہا تھا۔ شکایت کر کے اسے اور خفا کرنا نہیں چاہتا تھا۔

اچانک بجلی چمکی اور ڈلچن نے دیکھا کہ ایک مسلمان مردہ، بارش میں چھپ چھپ کرتا، ڈولتا، لہراتا ہوا اُسارے کی طرف آرہا ہے۔ اس نے پتھر والی جالی کے قریب پہنچ کر ڈلچن لکھیرے کی ماں کو گالی دی، پھر زور زور سے ہاتھ ہلا کر اسے یہاں سے چلے جانے کو کہا۔ ڈلچن نے اس کی بات کا برا نہیں مانا، وہ جانے کی تیاری کرنے لگا۔ مگر اس نے دیکھا کہ مسلمان مردہ ایک دم بری طرح کانپنے لگا ہے پھر وہ پتھر کے تڑنے ہوئے فرش پر ڈھیر ہو گیا اور دوبارہ مر گیا۔

تھوڑی دیر بعد ڈلچن نے اسے ہاتھ لگا کر دیکھا۔ وہ ابھی مرا نہیں تھا، سردی میں کانپ رہا تھا۔ ویسے ہی بنا سوچے سمجھے، یا شاید خوشامد میں، ڈلچن نے اسے اپنا پھٹا ہوا کمبل

اوڑھا دیا، پھر فوراً ہی پچھتاتے لگا؛ اس لیے کہ ہوا میں ابھی جاتی سردیوں کی کاٹ باقی تھی ”اب جو بھی ہو۔“ ڈلچن نے سوچا، ”جو بھی ہو... کم سے کم یہ بک بک تو نہیں کرے گا، آرام سے تو بیٹھنے دے گا۔“

صبح جب بریار خاں کی آنکھ کھلی تو حسبِ معمول وہ اپنے لکڑ سکڑ دادا نواب اسفند بریار خاں کے باغ میں تھے؛ جہاں سے کئی ہزار ٹوٹی ہوئی قبروں کی بچھات فی الحال سیٹ لی گئی تھی، اس لیے کہ رات کا خمار ابھی نہیں ٹوٹا تھا۔ چنانچہ بریار خاں سنگین باؤلی کے سائبان میں پشیمینے کی نئی دولائی اوڑھے، رات کی بارشوں اور بھیگے ہوئے مہکتے کنجوں اور بال ودھواؤں کے بارے میں سوچنے لگے۔

اچانک ہی سفید ہونٹوں والے ایک کالے پیلے بد صورت آدمی نے ان پر جھکتے ہوئے بڑی خوشامد سے پوچھا، ”تم کون جات ہو بھیا؟“

دھت تیرے کی! سب غارت ہو گیا۔ پشیمینہ اور سائبان اور نواب اسفند بریار خاں کی باؤلی اور باغ (جو انھیں باپ سے ترکے میں ملا تھا) اور جاتی سردیوں کی بارشوں میں بال ودھواؤں کے ساتھ سیر گلشن؛ سبھی کچھ غارت ہو گیا۔ اس کی جگہ بجلی کے ایک فحش جھماکے نے آبائی قطعہ باغ پر کئی سو ٹوٹی ہوئی قبروں کی بچھات پھیلا دی۔

یہ سفید ہونٹوں والا حرامی کہاں سے آگیا؟ بریار خاں سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔

اس نے پھر پوچھا، ”کون جات ہو بھیا تم؟“

بریار خاں کچھ دیر سوچتے رہے، پھر بولے، ”گھس بیٹھیا ہوں۔“

”کا بھیا؟ ہندو ہو مسلمان؟“

”نہ ہندو نہ مسلمان... حرام کا پلا ہوں... تو کون ہے؟“

چتکبرے آدمی نے بہت زیادہ خوشامد سے جواب دیا، ”ڈلچن لکھیرا ہوں مالک...“

یہ کمبل میرا ہے۔“

بریار خاں کو ہنسی آگئی ”لکھیرا ہے؟ ایس؟ لاکھ کا آدمی؟... خاک ہو گیا؟ تو بھی... ایس؟“

ڈلچن کچھ سمجھا، کچھ نہیں سمجھا مگر ہیں ہیں کر کے ہنسنے لگا۔

دونوں بد صورت آدمی ہنسنے لگے۔

خدا نے، یا جس نے بھی کائنات بنائی ہے، ہنستے ہوئے بنائی ہوگی اور محبت میں

بنائی ہوگی۔ اس لیے کہ چیزیں؛ کسی غصے، کسی انتشار میں یا بے تعلقی اور بے زاری میں نہیں بنائی جاسکتیں۔ کیوں کہ بے زاری اور بے تعلقی موت کی سہیلیاں ہیں، اور غصہ اور انتشار خرابی کے لے پالک ہیں اور ان کا رنگ سیاہ اور زرد ہے اور ان کا رنگ کا فور کی طرح سفید ہے اور یہ سفیدی سُمن کے پھول کی سفیدی سے الگ ہے کہ سُمن کی سفیدی تو ہنسی کے پھول کا رنگ ہے کہ خدا کا رنگ ہے؛ جب وہ روشنی اور مسرت میں ظہور کرتا ہے اور جب وہ چیزیں بناتا ہے۔ اور جب بناتا ہے اور الوہی مسرت میں ہنستا ہے اور بناتا ہے اور ہنستا ہے اور بناتا ہے۔

بریار خاں کے لیے ایک ہنستے ہوئے چتکبرے آدمی کا منظر بہت دیر تک ساکت رہا۔ ڈلچن کا بکھرا ہوا چھپر پھر کبھی نہ سمیٹا گیا۔ وہ قبرستان کی باؤلی میں اٹھ آیا۔ بریار خاں کو اس کا خوشامد سے بات کرنا، اپنے پوپلے منہ سے انھیں مالک کہنا اور گھگھیا گھگھیا کر ہنسا بھا گیا تھا۔ ٹوٹے نشے کی ترنگ میں انھوں نے سوچا کہ میں باپ دادوں کے قطعہ باغ پر قابض ہوں، اپنی جاگیر پر ہوں (مزے کر مزے، مزے کر مزے، مزے کر سارے جاگیردار!) سو یہ چتکبرا میرا کارندہ، میرا ہالی، میرا حاضر باش ہے۔ ”ہنو مالک۔“ انھوں نے ڈلچن سے کہا تو چھپر کے چکر میں کیوں پڑتا ہے بے؟ باؤلی کے اُسارے میں بہت جگہ ہے۔ ”ہنو مالک۔“ ہم دو ہی تو جانیں ہیں، ایک ایک کونا سنبھال لیں گے۔ ”ہنو مالک۔“

ڈلچن چھپر کے بلے سے اپنا کنستر، گڑوی اور پیالہ، رکابی اٹھا لایا۔ یہ اس کی کل کائنات تھی۔ اس نے آتے ہی اُسارے کو اچھی طرح بہارا اور اپنے کنستر میں باؤلی سے پانی لا لاکر پتھر کا تڑخا ہوا فرش دھو ڈالا۔ بریار خاں نے اپنی جیب خاص سے دو روپے دے کر ڈلچن کو بزر یا بھیجا، پکوڑے منگوائے اور دونوں نے قبروں پر بیٹھ کر سہ پہر کا ناشتا کیا۔

ایک دو روز بعد ڈلچن نے باغ کی قبروں کے درمیان گھوم پھر کر اینٹیں جمع کیں، ان کا گھیرا بنایا اور گھیرے میں سوکھے پتے ٹہنیاں اور درختوں کی مردہ چھال اکٹھا کر کے آگ جلادی۔ پھر اینٹوں پر پانی سے بھرا کنستر رکھ دیا۔ جب پانی خوب گرم ہو گیا، تو وہ بڑی خوشامد سے بریار خاں کو تہمد بندھوا کر اُسارے سے باہر لایا، اور ڈالڈا کے ڈبے میں مٹکے کا پانی سموسو کر بریار خاں پر ڈالنے لگا۔ بریار خاں نے کھیا کر اسے گالیاں دیں، اور کچھ دھندلی آنکھوں سے دیکھ کر، کچھ ٹٹول کر لاٹھی اٹھالی اور ڈلچن کو بے دلی سے باز پنے کی کوشش کی۔ مگر لکھیر لاٹھی کی زد سے دور ہی رہا۔ وہ دور سے، بوڑھے آدمیوں والی سجدہ پاؤں پٹی ہنستا رہا

اور ڈبے بھر بھر کر بریاریاں پر گرم پانی ڈالتا رہا۔

لکھیرے بڑے جادوگر ہوتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ لاکھ تو زندہ درختوں کا آنسو ہوتی ہے پھر وہ اسی آنسو سے ہنستی کھلکھلاتی دھنک نکالتے ہیں۔ بڑے جادوگر ہوتے ہیں لکھیرے، اس لاکھ کو اپنے ہاتھوں کی آگ دیتے ہیں، اسے اپنے خوشی غمی کے رنگوں میں گوندھتے اور اچھالتے اور دائروں میں کھینچتے ہیں اور پھونکیں مار مار کر ٹھنڈا کرتے ہیں اور اس کھنکھناتے، بجتے ہوئے دھنک میلے کو ہنستی ہوئی عورتوں کی کلائیوں میں پہنا دیتے ہیں۔ لکھیرے بڑے جادوگر ہوتے ہیں۔

کالی، پیلی انگلیوں والا ڈلچن بھی جادوگر نکلا۔ اس سرے نے بریاریاں کو، جو کسی زندہ درخت کا آنسو تھا اور بہت سی بے جان ریت اور مردہ مٹیوں سے مل کر بنا تھا، آگ دکھائی۔ اسے اپنے ہاتھوں کی حرارت اور اپنی خوشی غمی کے رنگ دیے، اسے اچھالا، دائروں میں کھینچا اور پھونکیں مار مار کر ٹھنڈا کیا۔ اور ڈلچن اسے بازار نہیں لے گیا۔ یہ بجتا کھنکھناتا ہوا دھنک میلہ اس نے اپنے پاس ہی رکھا۔ اس لیے کہ ہاتھوں سے کام کرنے والے ہر آدمی کے لیے کبھی نہ کبھی ایک دن ایسا آتا ہے جب وہ چیزوں کو بازار میں نہیں لے جاتا، اپنے لیے بچا رکھتا ہے۔

اس مفت خورے ڈلچن نے چار دہائیوں سے کچھ نہیں بنایا تھا۔ پر اب جو اس نے بنایا تو خوب بنایا۔ سفید ہونٹوں سے ہنستے ہوئے اس نے بریاریاں کو قبرستان کی چٹائی سے اٹھایا اور پتھر کی عمودی جالی سے ٹکا دیا۔ بریاریاں کی آنکھوں کا چیڑ صاف کیا تا کہ وہ کم نصیب اپنے خوابوں کو اور زیادہ صاف اور رنگین کر کے دیکھ سکے۔ اور ڈلچن نے اس کی چھاتی کھول کر دیکھی۔ اپنے گھاؤ اسے دکھلائے۔ اس کے لیے دھیمے دھیمے رویا۔ اسے رلایا۔ اس کی مار کھائی۔ اسے گالیاں دیں۔ اس کے لیے روٹی اور نشے کی چیزیں لایا۔ اس کے پیسے چرائے۔ اس کے لیے چوریاں کیں اور اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ پھر لوٹ کر آیا تو دیکھا کہ بے بس اندھا حرام زادہ اپنی گندگی میں لتھڑا ہوا مکھیوں کے بادل سے ڈھکا ہوا پڑا ہے۔ لکھیرے نے اسے لاتوں سے مارا، لکڑی کا غد کپڑے سے صاف کیا، گرم پانی سے دھویا اور پھر پتھر کی عمودی جالی سے ٹکا دیا۔ شہر اپنی رفتار سے چلتا رہا۔ کسی نے... کسی ایک نے بھی ان دو بد صورت آدمیوں کو نظر اٹھا کر نہیں دیکھا۔ وہ مسلمانوں کے متروک قبرستان میں گیدڑوں اور قبر بجوؤں

در چوری چھپے نشہ کرنے والوں اور چوری چھپے حرام کرنے والوں اور لٹیا چوروں کی معیت میں زندہ تھے اور پھل پھول رہے تھے۔ بریار خاں جب حواسوں میں ہوتے تھے تو ڈلچن کو ”ڈلی دا“ جو ڈلی چن دادا کا مخفف تھا، یا ”لکھیراجی“ یا ”لالہ“ کہتے تھے؛ جو اس چتکبرے کو کبھی کسی نے نہیں کہا تھا۔ ان ناموں، رشتوں کی موسیقی اس کے کالے پیلے کانوں میں پہروں گھنٹیاں بجاتی رہتی تھی۔ لکھیراجب بن کھاں صاحب کے لیے پیار محسوس کرتا تو انھیں ”مالک“ یا ”ببر بھیا“ کہتا تھا۔ غصہ ہوتا تھا تو چلا جاتا تھا۔ مگر اُسارے میں بہت سا پانی اور علی گڑھ والے بسکٹ، چنے یا پکوڑے اور ایک آدھ بوتل میں دارو چھوڑ جاتا تھا۔ یہ اس ترکے سے بہتر تھا جو مشجر کی شیروانی والا میاں اپنے بریار خاں کے لیے چھوڑ گیا تھا۔ اس پانی، بسکٹ اور دارو تک ہاتھ بڑھایا جاسکتا تھا، اسی لیے بریار خاں خوش تھے۔ وہ ہمیشہ بوتل خالی کرنے سے پہلے ڈلچن کے لیے دعا کرتے تھے۔ دعا کے الفاظ ہمیشہ یہی ہوتے تھے کہ اس سالے چتکبرے کو اللہ خوش رکھے، آمین۔

یہ دو متروک آدمی، دونوں میں سے کسی ایک کی طبعی موت آنے تک، اسی طرح ایک دوسرے کی سنگت میں زندہ رہ سکتے تھے۔ اس لیے کہ دونوں اس طرح مگن بہت تھے۔ اس سے زیادہ انھیں چاہیے بھی کیا تھا۔ لیکن شہر نے کروٹ لے لی۔

[آدھی رات کے وقت شہر کا پیڑو ایک آواز کے ساتھ شق ہوا اور ہلاک کرنے والے دھویں کا سفید دریا، روتے کھانستے، مرتے ہوئے شہر پر سے بہنے لگا۔ پانچ لاکھ آدمیوں نے اندھے شہر کی چیختی ہوئی سڑکوں پر دوڑنا شروع کر دیا۔ ان میں سے کئی ہزار اس شہر کی لال مٹی میں پسر گئے اور ایڑیاں رگڑتے ہوئے دم توڑنے لگے۔]

کھر کی شکل بنائے ہوئے یہ موت اسفند یار خاں کے قطعہ باغ میں بھی آئی اور اس نے بریار خاں کو اور ڈلچن کو گلے سے پکڑ کر اٹھا دیا۔

موت کے قرب نے بریار خاں کا نشہ ہرن کر دیا تھا۔ پہلی بات جو انھوں نے بیدار حواسوں کے ساتھ سوچی؛ یہ تھی کہ موت اچانک واقع ہو رہی ہے، شہر کے مسلمان تو سارے ہی شہادت کے مرتبے پر فائز ہوں گے اور ان شاء اللہ جنت الفردوس میں جگہ پائیں گے۔ مگر مرنے کا خوف اتفاقہ شہادت کی اس نوید پر فوراً ہی غالب آ گیا۔ انھوں نے کھانستے ہوئے اٹھنے کی کوشش کی، اٹھ نہ سکے، لرزتے لگے۔ لمحے بھر بعد انھیں اس خیال سے پھر تقویت

ملی کہ ان جیسے بد اعمال آدمی کو مرنے کا ایسا اچھا موقع پھر کب نصیب ہوگا۔ مسلمان تو سارے ہی شہادت کے مرتبے پر... اس بات کو ڈلچن لکھیرا نہیں سمجھ سکتا تھا۔ پہلے وہ اٹھ کر بھاگا، باغ کی حد بندی سے باہر نکل گیا، مگر وہ اندھے کو مرنے کے لیے چھوڑے جا رہا تھا۔ سو اس نے خود کو ملامت کی اور پیروں سے ٹٹولتا ہوا اور کھانتا ہوا واپس اُسارے میں آگیا۔ اس نے جیوٹ کر کے ہڈیوں کے اس ڈھانچ، بریار خاں کو کمر پر لادا اور قبرستان کی حد بندی سے باہر نکل گیا۔ آگے ٹھنڈی سڑک پر دھویں کا دودھیا دریا غراتا ہوا بہہ رہا تھا۔ ڈلچن کی آنکھیں جواب دے چکی تھیں۔ اس کے پھیپھڑے پھٹنے کو ہوئے تو اس نے بریار خاں کو سڑک کے کنارے نصب کی ہوئی سرکاری بنچ پر لٹا دیا۔ کم زوری سے کھانتا ہوا ہڈیوں کا یہ ڈھانچ تشنچ میں کھٹکے کے چاقو کی طرح کھلا، بلند ہوا، پھر بنچ سے نیچے جا گرا۔ ڈلچن نے سوچا وہ تو بھاگ کر اپنی جان بچائے مگر ہر طرف ہلاک کرنے والے دھویں کا دریا تھا جس کا کوئی اور چھوڑ نہیں تھا۔ ڈلچن خالی بنچ پر گر گیا اور یم دوت کا انتظار کرنے لگا۔ اس نے سوچا جان نکلنے میں اب کوئی دیر نہیں ہے۔ سو ڈلچن نے یاد کیا کہ اس نے کم زوروں پر سختی نہیں کی تھی۔ گھگھیا گھگھیا کے زندگی گزاری تھی۔ ”میں خود کم زور تھا پر بھو! میں نے کسی جیو جانور کو بھی نہیں ستایا۔ دونوں ہاتھ باندھ کے بسر کردی مالک! تو اب یم دوت کا ہاتھ میری جان کو نرمی سے کھینچ لے۔“ پھر بڑی مسرت سے ڈلچن نے سوچا، ”میں تو کرونا مئے گریجا پتی کا بھکت ہوں، سیدھا سؤرگ میں جاؤں گا۔“ بنچ کے نیچے برہیتا بری طرح کھانسنے لگا۔ ”مگر اس اندھے کا کیا بنے گا، یہ تو مسلمان ہے؟“ ڈلچن اسے باغ سے لے آیا تھا، سڑک پہ کیسے چھوڑ جاتا۔ پھر اس نے دودھ کے دریا میں یم راج کی سواری آتے دیکھی اور... گج بدن بھینسے کی دھمک سنی۔ ”ہے پر میثور! اگر یہ یم راج کی پد دھونی ہے تو اب اس مسلمان کی بھی رکھچا کر دے۔ مالک! یہ اندھا نرک اندھکار میں اکیلا کہاں مارا مارا پھرے گا۔ روشنی دکھا دے اسے بھی پر بھو!“

کاسٹ آرن اور لکڑی سے بنی ہوئی مضبوط بنچ کے نیچے پڑے پڑے بریار خاں کی بے نور پتلیوں کے پیچھے ڈلچن کے خیال میں تراشا ہوا مہیب پیکر بیدار ہو گیا۔ ان کی مردہ آنکھوں نے ایک سیاہ ڈیل ڈول دیکھا اور مرتے ہوئے کانوں نے بھاری قدموں کی دھمک سنی۔

وہ یم راج تھا جو اس بھٹکے ہوئے اندھے، برہیتا کی رکھچا کرنے اسے سؤرگ میں لے جانے کے لیے آگیا تھا۔ وہ ڈلچن کی سفارش پر آیا تھا ”وہاں بھی مالک کی مہربانی سے

جوڑی بنی رہے گی۔“ یہ سوچتے ہوئے ڈلچن کا چھوٹا سا چتکبرا دل خوشی سے بھر گیا۔
 ”اس سالے چتکبرے کو اللہ خوش رکھے، آمین۔“

ٹھیک اسی وقت بچ کے نیچے پڑے بریار خاں نے ڈلچن کے لیے دعا مانگی کہ غفور
 الرحیم! اس نے میرے ساتھ بہت نیکیاں کی ہیں۔ ابھی اس کا دم آخر نہیں ہوا ہے۔ نواز دے،
 اسے مسلمان کر دے مولا! یہ جہنم میں کہاں مارا مارا پھرے گا، اکیلا ہے سسر۔

تو غفور الرحیم نے سفارش منظور فرمائی اور بریار خاں کی ڈوبتی ہوئی سماعت
 میں حیرت ناک صحت تلفظ کے ساتھ کلمہ شہادت کے الفاظ آنا شروع ہوئے۔ انھوں نے سنا:
 کاسٹ آرن اور لکڑی سے بنی ہوئی مضبوط بچ کے اوپر پڑے پڑے کوئی ایڑیاں رگڑتا ہوا پو پلی
 آواز میں ایمان لارہا تھا کہ میں شہادت دیتا ہوں کہ شہادت دیتا ہوں کہ شہادت دیتا ہوں...
 شکرگزاری میں بریار خاں کی مردہ آنکھوں سے پانی بہہ نکلا۔ ”مولا! تو نے بالکل
 آخری وقت میں ایک مشرک کو مشرف بہ اسلام کیا ہے۔ تیری رحمت کے صدقے جاؤں
 پروردگار۔“

پھر کاسٹ آرن اور لکڑی سے بنی ہوئی مضبوط بچ کے نیچے پڑے پڑے بریار
 خاں ولد ظفریار خاں نے آسودگی سے ٹانگیں پھیلائیں اور جان دے دی۔
 دو گھس بیٹھے، حرام خور، ایک دوسرے کی سنگت میں کھانتے ہوئے خدا کے ابدی
 مرغزار میں داخل ہونے کی کوشش کر رہے تھے۔



چاکر

خاکستری رنگ کے گاڑھے کا پیوند لگا لمبا ٹکرتا پسینے سے بھیگ کر بدن سے چپک گیا تھا۔ گھنٹوں کی مشقت کے بعد کھر درری ہتھیلیوں کی مضبوط گرفت میں پھاوڑے کا دستہ پسینے سے پھسلنے لگا تو ٹکرتے کی آستینوں سے ہتھیلیاں پونچھیں، رکوع کے انداز میں جھکے جھکے پھاوڑا چلاتے رہنے سے کمر کی ہڈیاں اور پٹھے اکڑ گئے تھے تو جوان بازوؤں کو میناروں کی طرح بلند کیا اور پورے قامت سے تن کراگڑائی لی۔ دھول میں اٹے اپنے پیروں کے درمیان زمین پر نظریں گاڑے، سر جھکائے، لمحے بھر کو ساکت کھڑے رہے۔ پھر دونوں گھٹنے خم کیے اور دوزانو کھیت کی مینڈ پر بیٹھ گئے۔ مشقت سے سنولائے ہوئے ہاتھوں کی دسوں انگلیاں ٹھہر بھری مٹی میں گڑا دیں پھر آہستہ آہستہ کہنے لگے:

”مٹی! او مٹی! اگر یہ امر الہی ہے کہ میں اور میرے ہمسائے اپنے اس ختم نہ ہونے والے روزے ہی میں اپنے خالق سے جا ملیں تو بے شک ہم رضائے الہی میں راضی ہیں۔ شکوہ تو الگ رہا، ہم تو لفظ کیوں بھی اپنی زبانوں پر نہیں لائیں گے۔ اور اگر میری کسی کوتاہی سے، میرے تساہل، میری نا سمجھی سے تو نے وہ رزق ابھی ہمیں سو پنا شروع نہیں کیا جو ہمارے نام کا تیری تحویل میں ہے؛ تو اے مٹی لے! فضل علی اپنے رب کے نام کے ساتھ پھر سے اپنے کام کا آغاز کرتا ہے۔ پھر سے تجھے سنوارتا ہے۔ پھر سے تیری خدمت کرتا ہے۔“

یہ کہا اور اٹھ کھڑے ہوئے، پھاوڑا سنبھالا اور اسی طرح جھکے جھکے پھاوڑا چلاتے قدم قدم بڑھنے لگے۔ وہ ہر ضرب پر منہ ہی منہ میں اللہ اللہ کہتے جاتے تھے۔ جمی ہوئی مٹی کی بے مروت چھاتی کو نئے اکھوؤں کے لیے نرم کرنے کا یہ کام کئی گھنٹے جاری رہا۔ یہ کام گھنٹوں سے... دنوں سے جاری تھا۔

اور جب تہجد کا وقت ہو گیا تو اسی مٹی سے تیمم کیا اور اسی مٹی پر سجدہ ریزہ ہو گئے۔ دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو بے رنگ دھواں دھواں آسمان کچھ اور نیچے اتر آیا۔ دن بھر کی تپش کے بعد گھنٹوں پہلے تانبے سا تپنے والا آسمان اس وقت ایک خفیف سی ٹھنڈک اتار رہا تھا مگر خشک سالی کی ماری ہوئی سوکھی لکڑی زمین اس ٹھنڈک کو اترتے ہی اچک لیتی، ان دیکھے بخارات میں تبدیل کرتی اور پھر لوٹا دیتی تھی۔

یہ سال ۱۸۹۶ء تھا، بارش سے ترسی ہوئی زمین جیسے کچھ بھی پیدا کرنے سے انکاری تھی۔ میانوالی قحط کی لپیٹ میں تھا۔ جانوروں کے لیے چارا نہیں رہا تھا۔ انسانوں کے چہروں پر گرداڑ رہی تھی۔ ایک وقت کا کھانے والے اب دو دو تین تین دن بھوک سے نڈھال پڑے رہتے۔ پہلے جانور دبے ہوئے پھر ایک ایک کر کے مرنے لگے۔ فضل علی کے بیلوں کی جوڑی ٹوٹ گئی۔ ایک بیل کافی چارائے ملنے کے سبب مر گیا تو فضل علی نے دوسرے بیل کو ذبح کیا اور اپنے ہمسایوں کے دروازوں پر دستک دے دے کر سب گوشت بانٹ آئے۔ تین بکریاں اور ایک ڈاچی، جو دودھ سے خالی تھیں، اسی طرح قریب و دور کے ہمسایوں کو کھلائی جا چکی تھیں۔ دودھ دینے والی چند بکریاں رہ گئی تھیں، جن کے لیے فضل علی سارا سارا دن چارے کی تلاش میں سرگرداں رہتے اور شام کو جتنا کچھ دودھ حاصل کر پاتے ان گھروں میں بانٹ آتے جہاں شیرخوار بچے تھے اور مریض اور جاں بہ لب بوڑھے کچے فرش پر چٹائیاں ڈالے پڑے دن گن رہے تھے۔ رات فضل علی کے لیے سخت تر مشقت کی خبر لے کر آتی تھی۔ ان کے چھوٹے سے کھیت میں دو بار بیج ڈالا جا چکا تھا اور دھول کے ساتھ مل کر دھول ہو چکا تھا۔ کیوں کہ زمین اپنا قیمتی نم کھوپچی تھی، بارشیں ہوئی نہیں تھیں، کنوئیں خشک تھے اور دریا دور تھا۔ اتنی دور سے گاڑیوں میں اور جانوروں پر اور آدمی اپنے سروں پر ڈھو ڈھو کر جو پانی لاتے وہ انسانوں اور جانوروں کے لیے ہی ناکافی ہوتا تھا تو زمین کے حصے میں کیا آتا۔ ایسا لگتا تھا کہ جان کی طرح جو قیمتی بیج اور پانی زمین کو دے دیا، بس دے دیا۔ وہ ضائع ہوا۔ زمین لوٹاتی کچھ نہیں تھی۔ کھیتوں

میں اناج کے اکھوے نہیں پھوٹے۔ دھول کے جھکڑ اور ریت کے بھنور بنتے رہے اور آگ کی لپٹوں کی طرح زمین سے بخارات اٹھتے رہے۔ یہ سب تھا، مگر فضل علی کے معمولات میں فرق نہ آیا۔ وہ عشا کی نماز کے بعد اللہ کا نام لے کر اپنے کھیت پر پہنچ جاتے اور فجر تک پھاوڑا چلاتے رہتے۔ بیلوں کی جوڑی گھڑی دو گھڑی میں جتنا ہل پھیر لیتی ہے اتنا کام فضل علی سے ساری رات میں ہو پاتا۔ مگر ایسا تھا کہ زمین کی تحویل میں خلق اللہ کے نام کا جو رزق تھا وہ تو اللہ کی مخلوق کے لیے اس سے حاصل کرنا ہی تھا۔

میانوالی کا یہ شہر کالا باغ؛ ضلع بھر کے شہروں، دیہاتوں میں سب سے کم قحط سے متاثر ہوا تھا۔ دوسری بستیاں تو اس سے کہیں زیادہ سختی جھیل رہی تھیں۔

پہاڑی پر بے کالا باغ کے چھوٹے چھوٹے مکان گڑیوں کے گھروندوں کی طرح بے ترتیبی سے بکھرے ہوئے اوپر تک چڑھتے چلے گئے تھے۔ نیچے سندھ دریا بہہ رہا تھا۔ یہاں پانی ہی پانی تھا۔ پانی میں انسانوں کے لیے خوراک تھی اور دریا سے ملے ہوئے کھیت کچھ پیداوار بھی دے رہے تھے۔

مگر یہ کھیت طرے والوں کے تھے اور دریا پر مچھلی پکڑنے کا ٹھیکا ڈاڈے ملک کا تھا؛ جو کبھی کبھار خیر خیرات کی طور پر گھنٹے دو گھنٹے کے لیے، یا گھر باڑے اور زمین کے چھوٹے ٹکڑوں کے عوض دو دو چار چار دن کے لیے، مچھلی پکڑنے کی اجازت دے دیتا تھا۔ جب اس کے آدمی کاغذ پر انگوٹھے لگوا کر گھروں اور باڑوں سے گزر جاتے! تب ہارے ہوئے جوار یوں کی طرح، مرے مرے قدموں سے، گھریا زمین کے سابق مالک؛ اپنے جال اور مچھلی کے شکار کی چھڑیاں اٹھائے دریا کے کنارے پہنچتے اور دو چار دن تقدیر آزماتے۔ ان کے نصیب کا جو کچھ ملتا، دریا سے حاصل کر لیتے۔ بغیر اجازت مچھلی پکڑنے والوں کا حشر چوروں سے بدتر کر دیا جاتا تھا۔ ڈاڈا ملک اور اس کے آدمی اپنے حق کی حفاظت کرنا جانتے تھے۔ اچھے دنوں میں خدا کے نام پر خیرات نکالنے والے سلکوں نے قحط کی بھیانک شکل دیکھ کر اپنی اناج کی کوٹھیوں کے منہ بند کر دیے تھے۔ پھر ان سے اپنے ہمسایوں کی بھوک نہ دیکھی گئی تو اکثر نے اناج کی حفاظت کے لیے کوٹھیوں اور کھیتوں پر اپنے لٹھ بند بٹھا دیے اور علاقے سے چلے گئے۔ کھیت، کھلیان اور گلیارے ویران ہو چکے تھے۔ بھوکے جانور جہاں گر جاتے پھر اٹھ نہ پاتے۔ موت خاموشی کے ساتھ انھیں زندہ رہنے کے مشکل کام سے نجات دلا دیتی تھی۔ اب تو انسان

بھی موت کا بھیانک ہاتھ اپنی طرف بڑھتے دیکھ رہے تھے۔ دوستیاں، محبتیں، جان پہچان، ہمسائیگی اور مروت جیسے پورے ضلع سے اٹھتی جا رہی تھیں۔ جس کے پاس ایک دو وقت کے کھانے کو ہوتا وہ گھر میں بند ہو جاتا کہ کہیں پڑوسی کی بھوک سوال بن کر سامنے نہ آکھڑی ہو۔ کیسی شرمندگی تھی کہ ہمسائے سے ہمسایہ آنکھ ملانے کی ہمت نہیں کرتا تھا، منہ چھپائے چھپائے پھرتا تھا۔ جنہیں وسائل میسر تھے، جن کے پیروں میں اتنا دم تھا کہ انھیں عذاب جھیلنے ہوئے ان علاقوں سے کھینچ کر لے جاسکتے، وہ جا چکے تھے۔ دریا سے دور پانی سے ترسی ہوئی زمینیں یوں لگتی تھیں جیسے ان کے مالک مدتیں ہوئیں مر چکے ہوں اور اب ان زمینوں کا وارث کوئی نہ ہو۔ جس زمین کے ایک ایک بالشت کے لیے کچھریوں میں برسوں مقدمے چلتے، لائٹھیاں کھینچ جاتیں اور سر پھوٹتے تھے وہ اب بے دعویٰ خشک سالی کے حوالے کر دی گئی تھی۔

دریا سے دور ایک فضل علی کا قطعہ زمین تھا کہ انسان کی محنت کے آثار لیے سارا سارا دن سفاک سورج کی بے رحم لپٹوں میں مٹیالے کپڑے کے بہت بڑے تھان کی طرح کھلا ہلتا رہتا۔ شام ہو جاتی، رات آتی تو پھر وہی ہوتا کہ ایک کشیدہ قامت سایہ جوانی کی چلت پھرت کے ساتھ اللہ اللہ کے آہنگ پر پھاوڑا چلاتا، کھیت میں بے تابانہ گشت کرتا اور ناممکن کو ممکن بنانے کی سعی میں رات سے صبح کر دیتا۔ فضل علی گھڑی بھر کو دم لینے بیٹھتے تو مشقت سے دکتے ہوئے بدن کو آرام تو کیا ملتا، تھکن کچھ اور گہری ہو جاتی اور طرح طرح کے وہم دل کو گھیر لیتے۔ یہ آخری دانے بھی اکھوے نہ لائے تو سب کا کیا ہوگا! مگر ٹکٹل کا مہربان ہاتھ دل پر اپنا ٹھنڈا سایہ ڈالتا، یاد آتا کہ رزاق فضل علی تو نہیں ہے، پھر فکر کس بات کی، فضل علی کا کام تو محنت کرنا ہے سو وہ کیے جاتا ہے۔ اور فضل علی کا کام تو اپنے رب سے گڑگڑا کر اپنے ہمسایوں کے لیے اور اپنے لیے مانگنا ہے سو مانگے جاتا ہے۔ وہ وسوسوں پر توبہ و استغفار کرتے اور پھاوڑے کا دستہ پکڑاٹھ کھڑے ہوتے۔

مگر یہ بے رحم حقیقت کشتِ جاں پر گرد و غبار کے بھورے بادلوں کی طرح مسلط تھی کہ یہ دانے جو بکھیرے جاتے ہیں آخری ہیں اور آدمی کے بس میں جتنا کچھ تھا وہ کیا جا چکا اور اب صرف دریا سے ڈھوڈھو کر پانی لانا اور دعا کرنا ہی رہ گیا ہے۔

بھوک اور مایوسی کے ہاتھوں، کیا بوڑھے کیا جوان، سب ہی نڈھال تھے۔ مگر گنتی کے وہ جوان جو علاقہ چھوڑ کر نہ جاسکے تھے اور فضل علی کے کٹب قبیلے سے تعلق رکھتے تھے یا

ساتھ کے کھیلے ہوئے تھے یا ان کی ثابت قدمی اور جذبہ خدمت سے متاثر تھے، کبھی کبھی ان کا ہاتھ بٹانے آ موجود ہوتے۔ مگر ایسا کبھی کبھی ہوتا تھا۔ دوسرے چوتھے کبھی کچھ پیٹ کومل گیا تو نو جوانی کی غیرت نے جوش مارا اور اپنے اپنے پھاوڑے، مشکیزے، چھاگلے اور برتن لے کر آگئے اور پتھری زمین سے کچھ دیر جو جھ لیے۔ کبھی تو یہ تعداد بارہ پندرہ تک پہنچ جاتی اور کبھی کبھی تابیوں، چچوں، پھوپھوں کے دو تین بیٹوں کے سوا کوئی اور نہ ہوتا۔ بڑی جماعت دریا سے پانی لانے چلی جاتی جو بجائے خود پہاڑ سر کرنے کے برابر تھا۔ ایک دو نو جوان فضل علی کے ساتھ زمین توڑنے بنانے میں لگ جاتے۔ مگر یہ کام نسبتاً زیادہ تھکا دینے والا، زیادہ ہمت شکن اور صبر آزما تھا۔ فضل تنہا ہوتے تو خاموشی سے سر جھکائے ذکر کرتے رہتے۔ سانسوں کی آون جاون کے ساتھ اللہ اللہ کا ورد جاری رہتا۔ کوئی ایک بھی جوان ساتھ ہوتا تو فضل علی لہک لہک کر قرآن سناتے، ساتھ ساتھ اپنے علاقے کی زبان، اپنے محاورے میں ترجمہ بھی کرتے جاتے۔ ان کی سادہ پُراثر آواز سنائے میں دور تک تیرتی چلی جاتی۔ ہاتھ پھاوڑے کے دستے پر جسے اپنا صبر آزما کام جاری رکھتے اور ادھ کھلی آنکھیں جیسے مٹی پر پھیلتی تاروں کی ہلکی چمک میں اپنے رب کی نشانیاں ڈھونڈتی رہتیں۔

ایک رات اسی طرح تلاوت اور ترجمہ جاری تھا۔ فضل سورہ رحمن پڑھ رہے تھے کہ دریا سے آتے ہوئے پانی لانے والی جماعت میں ایک جوان پانی کے چھلکتے برتنوں سے بھری گاڑی دھکیلتے دھکیلتے ذرا کمر سیدھی کرنے کو رکا، دور سے فضل علی کا پُرسوز لحن سن کر نیم دلی سے ہنسا اور بجھی ہوئی آواز میں ایک تھوڑی سی چمک شامل کر کے بولا، ”بھائی فضل علی، رب کو اس کا وعدہ یاد دلار ہے ہیں۔“ دو ایک نے خوش مزاجی سے اتفاق کیا اور یہ سب گاڑی کھینچتے پھر چل پڑے۔ کھیت پر پہنچے تو فضل اور ان کے ساتھیوں کو خاموشی سے کام کرتے ہوئے پایا۔ فضل علی ایک رکوع پڑھنے کے بعد خاموش ہو گئے تھے۔ بس پھاوڑوں کی کھسک کھسک سنائی دے رہی تھی یا مشقت کرنے والوں کی گہری گہری سانسیں۔

ٹیڑھی میڑھی ٹاہلی کے پاس پہنچ کر پانی لانے والوں نے گاڑی سے برتن اتار اتار کر رکھنا شروع کر دیے؛ ایک ایک کر کے وہ برتنوں کے پاس آگئے اور آب خورے بھر بھر خالی پیٹ کو ٹھنڈے پانی سے بہلانے لگے۔ کچھ نے چلو میں پانی لے کر منہ پر چھینٹے مارے اور امکان بھرتازہ دم ہونے کی کوشش کی۔ آخر میں فضل علی اپنا پھاوڑا کاندھے پر رکھے سر جھکائے

سب کے پاس آکھڑے ہوئے۔ کسی نے چھلکتا ہوا آب خورہ ان کی طرف بھی بڑھا دیا۔ گھٹنوں سے پھاؤڑے کا دستہ ٹکا کر دونوں ہاتھوں سے آب خورہ سنبھالا، بیٹھ گئے، ایک چھوٹا سا گھونٹ بھرا اور پانی لانے والے اس نوجوان کی طرف دیکھ کر، کہ جس نے رب کو وعدہ یاد دلانے والا فقرہ کہا تھا، آہستہ سے بولے: ”بی بی بے!... ابھی ابھی اپنے رحمن والی سورۃ پڑھتے ہوئے میں نے ایک بات سوچی تھی اور رب معاف کرے، تھوڑے سے شکوے کے ساتھ سوچی تھی کہ میں جو یہ نعمتوں والی آیتیں پڑھ رہا ہوں اور جو میرا نعمتوں والا رب ہے تو اس میووں، پھلوں، اناجوں والے نے میانوالی کو کہیں بھلا تو نہیں دیا۔ اور میں کیڑا، فضل علی، کہیں اس خزانوں، بھنڈاروں والے کو رحمن والی سورۃ پڑھ کر یاد تو نہیں دلانے لگا۔“

پھر زخمی پرندے کی طرح چیخ ماری اور کانپتی ہوئی آواز میں پکارے:

”او میری یہ مجال کہ میں اس رزقوں والے کو اس کی رزاقی یاد دلاؤں!... او میری یہ مجال، میری یہ مجال!“

پھر وہ آہستہ آہستہ کچھ پڑھنے لگے۔ دونوں ہاتھوں میں آب خورہ اسی طرح سنبھالا ہوا تھا۔ پسینے میں تر اپنی پیشانی کو آب خورے کی ٹھنڈی سطح سے مس کیا اور دھیرے سے بولے:

”پر بی بی بے، مجھے سمجھ آگئی۔ پڑھتے پڑھتے بھول تو میں گیا تھا؛ بھولنے والا تو فضل علی ہے، بھولنے والے تو ہم سب ہیں۔ اس کی رحمتوں والی ہوا تو بہہ رہی ہے۔ اس کا نعمتوں والا دریا تو اچھل رہا ہے...“

پھر انھوں نے اپنی کھردری ہتھیلی کا پیالہ سا بنا کر اس الٹے پیالے سے مٹی کو تھپکی دی۔

”اویارو! اس کے نعمتوں والے اناج تو یہ سوئے پڑے ہیں۔“

دوسروں کی طرح وہ نوجوان بھی جسے فضل علی نے پیسے کہہ کر پکارا تھا، سناٹے میں کھڑا ان کی بات سن رہا تھا۔ خاموش رہنے والے بھائی فضل آج اتنے جذبے اتنے جوش سے اتنی بہت سی باتیں کہہ گئے۔ اور یہ کیسے ہوا کہ جو بات میل آدھا میل دور پیسے نے چلتے چلتے سوچی اور خوش مزاجی سے اپنے ساتھیوں سے کہہ دی، وہی بات بھائی فضل بھی سوچتے تھے اور اس کا اور اپنا حساب کرتے تھے۔ پیسے نے فضل علی کو اس حال میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ یہ سیدھا سادہ خاموش طبیعت جوان؛ پورا بچپن جس کے ساتھ کھیل کود میں بسر کیا، لڑکپن، دریا کنارے دوڑیں لگاتے، پہاڑی ٹیلوں پر چڑھتے اترتے گزارا، آج اتنی گہری باتیں کر رہا ہے۔ خدا

مست لوگوں کی کچھ دن کی صحبت نے اس پر یہ کیسا جادو کر دیا ہے کہ سیانوں کی طرح اپنے اور دوسروں کے اندر اتر کر گتھیاں سلجھانے لگا ہے۔ کیا مسلسل فاقوں نے اور دن رات کی جان توڑ محنت نے اس میں چھپی ہوئی کوئی قوت بیدار کر دی ہے جو یہ دلوں میں جھانکنے لگا، خیالوں کو پڑھنے لگا، پڑھانے لگا؟

بی بے کو اپنے لڑکپن کا وہ فضل یاد آیا جو اس کے ساتھ صرف اس لیے صبح تڑکے گھر سے نکل جاتا اور شام تک...

...صبح تڑکے گھر سے نکل جاتا اور شام تک کالا باغ کی پہاڑیوں کے ایک ایک درخت پر چڑھتا اترتا کہ کہیں اس کو طوطے کا گھونسل مل جائے۔ وہ طوطے کا بچہ پالنا چاہتا تھا، کہتا تھا میں اسے بولنا سکھاؤں گا۔

بیبا گھونسلے کی تلاش میں تھک چکا تھا، ایک ہی کھیل آخر کتنے دن تک کھیلا جاتا، اس نے جھلا کر کہہ دیا، ”او فضل! پہلے خود تو بولنا سیکھ لے؛ طوطے کو کیا پڑھائے گا، پہلے خود تو پڑھ لے۔“ فضل خاموش ہو گیا۔ دونوں نے اس دن سے درختوں پر چڑھنا اترنا، کالا باغ کی پہاڑیوں کا گشت لگانا چھوڑ دیا۔ بچے کو بعد میں افسوس بھی ہوا کہ فضل کا اتنے مزے کا کھیل اس نے ختم کر دیا۔ اس نے ایک دن فضل علی کو پھر سے آمادہ کرنے کی کوشش بھی کی۔ اس سے کہا بھی کہ یارا ہنسی کی بات کا تو نے اتنا اثر لیا ہے۔ چل درختوں میں طوطے بولنے لگے ہیں۔ ہری ہری ٹکڑیاں دریا کے پار سے آ کر کالا باغ کے جھنڈوں میں اترنے لگی ہیں۔ ایک ہی چکر میں تیرے مطلب کا بچہ مل جائے گا، مگر فضل ہنس کر ٹال گیا۔ بچے نے بہت پیچھا لیا تو کہنے لگا، ”بچے تو نے ٹھیک کہا تھا، طوطا پڑھانے میں کوئی مزہ نہیں۔“

پھر اس نے کئی روز فضل کو بستی میں نہیں دیکھا۔ دریا کنارے کبڈی کے مقابلوں میں، بازاروں باڑوں میں، فضل کہیں نظر نہ آیا تو گھر والوں سے اس کی خیر خیریت پوچھنے نکلا۔ دیکھا کہ گھر والے تو کہیں گئے ہوئے ہیں، فضل کی کوٹھری سے اس کے زور زور سے قرآن پڑھنے کی آواز آرہی ہے۔ بیبا باہر کھاٹ پر جا بیٹھا اور انتظار کرنے لگا۔ کچھ دیر میں فضل کی رشتے دار ایک ضعیفہ ادھر سے گزری تو اسے خاموشی سے کھاٹ پر بیٹھے دیکھا، پوچھنے لگی، یہاں کیسے بیٹھا ہے اندر کیوں نہیں جاتا؟ بچے نے کہا کہ بھائی فضل تلاوت کر رہا ہے۔ وہ پڑھ لے تو پھر اندر جاؤں۔ ”اس کا پڑھنا نہیں ختم ہوتا۔ تو اندر چلا جا، بات کر لے۔“ بیبا اندر گیا تو دیکھا

کوٹھری کی واحد چھوٹی سی 'کھڑکیا' کے پٹ بند ہیں۔ کھلے دروازے سے آتی ہلکی روشنی میں فضل اپنے بستر پر بیٹھا، تکیوں پر قرآن مجید رکھے ایک سرشاری کے عالم میں تلاوت کر رہا ہے۔ بیبا دروازے پر رکا اور پھر وہیں کھڑا رہ گیا۔

چند روز میں اس کا دوست فضل علی کوئی دوسرا ہی فضل ہو گیا تھا۔ چہرہ ستا ہوا تھا جیسے کسی گہری فکر نے اس کے لڑکپن کے بھرے بھرے چہرے کو نچوڑ لیا ہو۔ مگر یہ کسی بیمار چہرے کے نقوش نہیں تھے۔ یوں لگتا تھا جیسے مشقت سے خوب تپے ہوئے چہرے پر کسی اُن دیکھی آنچ کا عکس پڑ رہا ہو۔ دروازے سے آتی روشنی اور تکیوں پر رکھے مصحف کے درمیان ایک سایہ آکھڑا ہوا تو فضل علی نے نظر اٹھائی۔ پپے نے اس کی آنکھوں سے آنکھیں ملائیں تو دیکھا کہ ایک عجب طرح کا سویا سویا پن اور دوری ان آنکھوں میں تھی۔ لمحے بھر کو پپے نے محسوس کیا کہ وہ کسی اجنبی کے سامنے کھڑا ہے اور خود اس کے لیے اجنبی ہے۔ پھر پہچان کی ایک تیز لہر ان آنکھوں میں دوڑ گئی۔ فضل علی نے زیر لب "صدق اللہ العظیم" کہہ کر مصحف کو بند کیا، بوسہ دیا اور آہستگی کے ساتھ بستر سے اتر آیا۔

”آؤ بی بے! کدھر رہ گیا تھا یا را!“

یہ آواز اس کے بچپن کے دوست فضل علی کی تھی۔ وہی کھلنڈرے پن کی چمک، وہی بے تکلفی، وہی لڑکپن۔ پپے نے اس کے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو اپنے ہاتھ میں لیا اور وہ دونوں کوٹھری سے باہر آ گئے۔

”میں کدھر ہی رہ گیا تھا کہ تو آپ گھر میں گھسا بیٹھا ہے؟“

وہ دونوں فضل کے باڑے میں آ گئے، باتیں کرنے لگے۔ پپے نے فضل کی غیر حاضری میں ہونے والے واقعات، کھیل، لڑائی بھڑائی کے قصے تفصیل کے ساتھ بیان کیے۔ کئی بار اس کا جی چاہا کہ فضل سے اس کے اچانک گھر بیٹھ جانے کے بارے میں پوچھے مگر ہر بار اسے نیم روشن کوٹھری میں بستر پر بیٹھے ہوئے اس دوسرے فضل علی کا اجنبی چہرہ یاد آ جاتا اور وہ کچھ اور باتیں شروع کر دیتا۔ ان کھلنڈری باتوں کے درمیان وہ اس نئے فضل علی کو بھول جانا چاہتا تھا۔ پتا نہیں وہ کس بات سے خوف زدہ تھا۔ آخر رخصت ہوتے ہوئے پپے نے ہمت کر کے پوچھ ہی لیا کہ کل طوطے کا گھونسلہ تلاش کرنے فضل اس کے ساتھ چلے گا کہ نہیں؟ فضل نے ہنستے ہنستے ایک لفظ میں جواب دیا۔ ”نہیں۔“

اب جو بات کہہ دی تھی تو بیبا اسے ادھوری نہیں چھوڑنا چاہتا تھا۔ ”اویار! ابھی تک تجھے غصہ ہے؟“

”کیسا غصہ؟“ فضل علی نے واقعی حیران ہو کر پوچھا۔

”یہی جو میں نے تجھے طعنہ دیا تھا کہ پہلے خود بولنا سیکھ لے، پہلے خود پڑھے لے۔“
 ”اچھا... وہ۔“ فضل علی بہت دیر تک خاموش کھڑا رہا، پھر آہستہ سے کہنے لگا، ”تو نے طعنہ نہیں دیا تھا یارا! ٹھیک کہا تھا۔ وہ طوطا پڑھانے میں کچھ مزہ نہیں۔“ پھر دھیرے سے اپنے سینے کو تھپتھپا کر بولا، ”اب تو یہ طوطا پڑھاؤں گا۔“ بی بی کی سمجھ میں کچھ آیا، کچھ نہ آیا۔
 وہ جو کبڈی کے مقابلوں کی بات کرتا تھا اور کیلے کے تنے سے چمٹ کر دریا کے ساتھ ساتھ بہنے کے کھیل کی سوچتا تھا اور پہاڑیوں پر دوڑ کر چڑھنے اترنے کا قصہ سناتا تھا تو سب باتیں پیسے کی سمجھ میں آتی تھیں؛ لیکن بڑی عمر کے لوگوں کی طرح گہری گہری باتیں کرنا اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ پھر بھی کوشش کر کے اس نے ایک سوال سوچا اور فضل علی سے پوچھ لیا:
 ”فضل! تو نے مولوی بخشے جی سے کلام مجید تو پڑھ لیا تھا۔ تو تو پہلے ہی فر فر پڑھنے لگا تھا اب اور کیا پڑھے گا؟“

فضل جواب دینے سے پہلے کچھ دیر کا پھر بولا:

”فضل علی کی زبان نے بے شک کلام پڑھ لیا۔ اب فضل علی کلام پڑھے گا۔ مولوی بخشے جی نے حکم دیا ہے، میں بابا دامانی کی حاضری میں جا رہا ہوں، کل۔“

حضرت خواجہ عثمان دامانی، اللہ لوک تھے۔ پیسے نے ان کا نام سنا تو ادب سے اپنے سر پر ٹوپی ٹھیک کی۔ وہ ایک بار اپنے تایا کے ساتھ حضرت بابا دامانی کے ڈیرے پر حاضری دے چکا تھا۔ ایک سفید براق بزرگ صاف اور سادہ موٹے کھر درے کپڑوں میں مصلے پر بیٹھے ہوئے؛ مسکراتے ہوئے، نرمی اور پیار سے لوگوں کی باتیں سن کر ان سے اچھی اچھی باتیں کہتے ہوئے، یا خاموش آنکھیں بند کیے تسبیح پھیرتے ہوئے، اللہ اللہ کرتے ہوئے۔ یہ بابا دامانی تھے۔ بیبا ڈاڈے ملک کو بھی دیکھ چکا تھا۔ رعب دار گھنی کالی مونچھوں والا سرخ و سفید چہرہ تھا ملک کا۔ دیکھے سے دہشت ہوتی تھی۔ مگر بابا دامانی کے رعب سے دہشت نہیں ہوتی تھی، بڑا اچھا، ٹھنڈا ٹھنڈا لگتا تھا۔ وہ آنکھیں کھولے ہوتے تو ان کی آنکھیں ڈاڈے ملک سے دسیوں گنا خوب صورت اور چمک دار لگتی تھیں۔ پھر بھی زیادہ دیر تک بیبا ان آنکھوں کی طرف

نہیں دیکھ سکا تھا۔ پپے کو ایسا لگا تھا جیسے بابا کی طرف ایک دم اس طرح دیکھ کر وہ کوئی گستاخی کر رہا ہے۔

فضل علی سے یہ سن کر کہ وہ بابا عثمان دامانی کی حاضری میں جا رہا ہے، بیبا سوچتا رہ گیا۔ یہ فضل میرا دوست اتنے بڑے بابا کی حاضری میں جا رہا ہے۔ یہ ان سے کلامِ مجید پڑھے گا۔ یہ تو بہت بڑی بات ہے۔ مولوی بخشے کہتے ہیں کہ حضرت خواجہ عثمان دامانی تو اس علاقے میں اللہ کی رحمت کی طرح ہیں، جس نے دل لگا کر ان کی دو باتیں سن لیں، وہ سمجھو پار اتر گیا؛ تو یہ فضل علی میرا یار کون سے دریا پار اترے گا؟ یہ جو اتنے ڈاڈے اللہ لوک کی حاضری میں جا رہا ہے تو یہ بے شک بڑی بات ہے، لیکن بی بے کا ایک یار تو اس سے دور چلا جائے گا۔ جوڑی تو ٹوٹ جائے گی۔ اس بات سے وہ کچھ اداس ہو گیا اور دوسرے دن آنے کا وعدہ کر کے بوجھل دل کے ساتھ اپنے گھر آ گیا۔

اگلا دن بی بے کے لیے بہت اداس کرنے والا دن تھا۔ فضل علی اس کا یار آج کالا باغ سے جا رہا تھا۔ اللہ لوک درویشوں کے وہاں آدمی کیوں جاتا ہے، پپے کو معلوم نہیں تھا۔ اسے یہ بھی معلوم نہیں تھا کہ آدمی جا کر لوٹتا ہے تو کیا بن کر آتا ہے۔ مگر ایک بات وہ اچھی طرح جانتا تھا کہ پھر آدمی وہ نہیں رہتا جو جانے سے پہلے ہوتا ہے، تو بس فضل علی اور پپے کی جوڑی ٹوٹ گئی۔ اب دریا میں تیرنے، درختوں پر چڑھنے اور دوڑیں لگانے کا زمانہ ختم ہو گیا۔ فضل علی کے لیے بھی اور پپے کے لیے بھی۔ یہ بات اس نے تیز تیز قدموں سے مولوی بخشے جی کے ڈیرے کی طرف بڑھتے ہوئے فضل علی کے انداز میں دیکھ لی تھی۔

اسے یاد تھا، فضل علی گلے میں کلامِ مجید ڈالے، ہاتھ میں کپڑوں اور بھنی مکئی کے دانوں کی پوٹلی سنبھالے؛ چھوٹے چھوٹے ٹیلوں پر آگے آگے یوں چڑھتا اترتا چلا جا رہا تھا کہ جیسے سفر کے آخر میں اسے کوئی انعام ملنے والا ہو۔ مولوی بخشے جی کے مکتب میں یہ دونوں ساتھ ساتھ جاتے رہے تھے، مگر آج کا جانا عجیب طرح کا تھا۔ دونوں خاموش تھے۔ ایک دو بار پپے نے فضل سے بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتا ہوا اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا تھا اور بس۔ بی بے کو یقین تھا فضل علی نے اس کی بات ہی نہیں سنی تھی، جواب کیا دیتا۔ آخر چھوٹے بٹے کے پاس پہنچ کر فضل علی رکا، اپنی پوٹلی ایک پتھر پر رکھ دی اور دونوں ہاتھ پھیلا کر بی بے سے معاف کیا۔ کہنیوں سے اوپر اس کے بازو تھام کر ہلکا سا جھٹکا دیا اور بس ایک

فقرہ کہا، ”بی بے! یار، میرے لیے دعا کرنا۔“ بی بے نے سر ہلا کر وعدہ کر لیا۔ یہ لوگ نماز کے بعد تو دعا کرتے ہی تھے۔ رب سے اچھی صحت، روزی رزق کے لیے اور اپنے ماں باپ کے لیے دعا مانگتے تھے، مگر یاروں دوستوں کے لیے دعا کرنے والی بات پیسے نے کبھی نہیں سوچی تھی۔ ٹھیک ہے، یار دوست بھی تو ماں باپ کی طرح پیارے ہوتے ہیں، ان کے لیے بھی دعا کرنی چاہیے۔ پیسے نے بے سے اترتے ہوئے سوچا، گھوم کر دیکھا تو فضل علی جا چکا تھا۔

وہ فضل علی، جسے بی بے نے بے سے رخصت کیا تھا، لوٹ کر پھر نہ آیا۔ دنوں بعد، بہت دنوں بعد بھائی فضل علی ضرور آیا، جس کے گالوں پر چھوٹی سی نرم ریشمی ڈاڑھی تھی، جس کے بال لہراتے ہوئے کاندھوں تک آتے تھے۔ جو سر جھکا کر آہستگی سے کبھی ایک آدھ فقرہ کہہ دیتا تھا ورنہ ہر وقت منہ ہی منہ میں کچھ پڑھتا رہتا تھا۔ جو کالا باغ کے غریبوں، مفلسوں کے لیے ہر وقت مستعد رہتا تھا۔ جسے خالی فضل یا فضل علی کہتے ہوئے اب جھجک محسوس ہوتی تھی۔ یہ تو بھائی فضل یا بھائی فضل علی تھا جسے بڑے بوڑھے بھی کھڑے ہو کر تعظیم دیتے تھے۔ جو بے آسرا بوڑھوں، اپاہجوں کے کپڑے اٹھا کر دریا پر چلا جاتا اور انھیں دھو سکھا کر لے آتا۔ بیماروں، بے گھروں، مسافروں کے لیے اپنے گھر باڑے سے مکئی کی روٹی اور دودھ لے کر سب سے پہلے آ موجود ہوتا۔ اور جب سے رب میانوالی پر غصہ ہوا تھا اور بارشیں جیسے ادھر آنا بھول گئی تھیں اور بھوک اور قحط کے بد صورت گدھ کالا باغ کے ٹیلوں ٹبوں پر آن بیٹھے تھے؛ بھائی فضل کسی جلالی درویش کی طرح زمین کی چھاتی سے چمٹ گیا تھا، ہلکان ہو ہو کے اس سے اللہ کے بندوں کا حق طلب کر رہا تھا۔

اول اول تو اس نے ملکوں، معتبروں کو اللہ اور رسول کا حکم سنایا تھا؛ ہمسایوں کے حق کا واسطہ دیا تھا، اور خیر خیرات کے طور پر انسانوں کے لیے تھوڑا کچھ اناج اور جانوروں کے لیے گاڑی دو گاڑی چارا حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو گیا تھا۔ مگر جیسے جیسے عذاب کے دن لمبے ہوتے گئے، ملکوں، معتبروں کی آنکھوں میں خود غرضی کے گدھ آ آ کر بیٹھنے لگے۔ لالچ نے سرداروں کو عامیوں کا محافظ نہ رہنے دیا۔ معتبروں کو نامعتبر بنا دیا اور کالا باغ کے غریبوں مسکینوں کے لیے ان کی ڈیوڑھیوں سے ملنے والے دانے کم سے کم ہوتے گئے۔ پھر وہ دن آئے کہ ملکوں نے میانوالی کو خیر باد کہا اور اپنی دوسری ہری بھری زمینوں پر آرام کرنے چلے گئے۔ لوگوں نے سنا کہ ڈاڈا ملک کسی باہر والے کو دریا پر ماہی گیری کا ٹھیکا دے کر خود کہیں

جانے والا ہے تو انھوں نے بھائی فضل سے درخواست کی کہ وہ بات کریں؛ آخر کالا باغ سے گزرنے والے دریا پر کالا باغ کے لوگوں کا حق نہیں ہوگا تو اور کس کا ہوگا؟ بڑے بوڑھوں نے ڈاڈے ملک کے کارندوں سے گھگھیا کر کہا کہ ملک کی رو بکاری میں بھائی فضل کی پیشی کرا دو، اسے کچھ عرض کرنا ہے، تو انھوں نے مونچھیں مڑوڑتے ہوئے جواب دیا، ”قریشیوں کے بڑے بوڑھے کدھر گئے جو ان کے بچے ڈاڈے ملک کے سامنے درخواست گزارنا چاہتے ہیں؟ اپنے بھائی فضل سے کہو، اسے اپنے کٹنب کے لیے بوری دو بوری دانے چاہیں یا مال مویشی کے لیے گاڑی بھر چارادر کار ہے تو ہم سے بات کرے۔ یہ سب چھوڑے جو کر رہا ہے۔ جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش، یہ جو خدائی فوج دار اور درویش بنا پھرتا ہے تو بات ابھی ڈاڈے ملک تک نہیں پہنچی ہے۔ اس سے کہو، دوسروں کی طرح بندہ بن کر رہے۔ ہم اس کے لیے مہینے دو مہینے کا بندوبست کرائے دیتے ہیں۔ باقی پورے میانوالی کا ٹھیکا نہیں لیا ہے کسی نے، مصیبتیں سب پر آئی ہوئی ہیں... ہاں۔“ اور وہ مونچھیں مڑوڑتے ہوئے چلے گئے۔

دنیوی وسیلوں میں اب صرف یہ قطعہ زمین ہی تھا جس سے بھائی فضل تنہا جو جھنے پر کمر باندھ چکے تھے۔ ان کے ساتھ گنتی کے یہ چند نو جوان تھے۔ یہ لوگ دوبار بیج ڈال چکے تھے، اب تیسری بار بیج بکھیرا جا رہا تھا۔ پرانے کسانوں نے مایوسی سے سر ہلائے۔ ”بھائی فضل کو سمجھاؤ کہیں ایسے فصلیں اچکتی ہیں۔ دانے مٹی میں ملانے سے فائدہ؟“

مگر قطرہ قطرہ پانی اکٹھا کیا جا رہا تھا، اس امید پر کہ اللہ کے کرم کے اکھوے اس زمین میں پھوٹیں گے تو آنے والے دنوں میں شاید پیٹ بھر کر کھانے کو ملے۔

تو یہ مشقت کے اس مرحلے کی آخری رات تھی اور بھائی فضل نے کھیت کے بیج بیٹھ کر اس کی بے مروت مٹی کو یوں تھپکی دی تھی جیسے وہ ان کی سدھائی ہوئی گھوڑی ہو؛ اور بی بے سے، اپنے ہم عمر جوانوں سے بڑے جذبے، بڑے جوش کے ساتھ کہہ تھا کہ رزقوں والے رزاق کے نعمتوں والے اناج تو یہ سوئے پڑے ہیں۔

بی بے نے ایک عجیب سے بھروسے کے ساتھ تاروں کی دھندلی چمک میں پڑے ہوئے کھیت کی طرف دیکھا۔ کیا پتا بھائی فضل کی تھپکی ان سوئے ہوئے اناجوں کو جگا ہی دے۔ اللہ کے لاڈلوں، اس کے مستی والے درویشوں کے پارس سے چھو کر اب جو بھائی فضل کندن ہو آیا ہے تو شاید مولا کریم اس کی لاج رکھ لیں گے۔

صبح ہوتے ہوتے درویشوں کے پارس سے چھو کر کندن بن جانے والے فضل علی نے کام ختم کیا اور باجماعت نماز فجر ادا کی۔ اپنی محنت میں برکت کے لیے دعا مانگی اور ٹاہلی کے ٹیڑھے درخت کی ایک موٹی جڑ پر سرنگا کر لیٹ گئے اور بے بادل آسمان کو گھورتے رہے۔ پتا نہیں اندر کندن بنا کہ رائگے کا رائگا ہی رہا۔ پتا نہیں طوطے نے پڑھ کے دیا کہ گوئگے کا گونگا ہی رہا۔ کالا باغ سے پہلی بار نکلنا انھیں یاد تھا:

حضرت خواجہ عثمان دامانی کی حاضری میں جب انھیں پیش کیا گیا تو ان سے زیادہ مولوی بخشے جی کی حالت غیر تھی۔ ہکلا ہکلا کر مولوی جی نے کہا کہ حضور خواجہ سائیں! یہ بچہ اللہ کے کلام سے محبت کرتا ہے۔ تجوید اس حقیر کو جتنی آتی تھی سکھلا دی، ترجمہ اور تفسیر اس دربار میں سیکھ لے گا اور خواجہ سائیں سرکار کی نظر ہو گئی تو راہ سلوک پر چل پڑے گا۔ آگے اس کے نصیب۔ بندگانِ خدا کے کام آنا اس نے اپنے کُٹمب قبیلے سے سیکھا ہے... کالا باغ کے سبج قریشیوں کا پتر ہے؛ ویسے ان گھڑکسان بچہ ہے... اجازت ہو جائے تو حاضری میں موجود رہے۔

سفید براق خواجہ سائیں کے مسکراتے ہوئے چہرے پر جیسے خاص فضل علی کے لیے پیار کی ایک لہر آئی۔ وہ کچھ دیر فضل علی کے چہرے پر آتے جاتے رنگ دیکھتے رہے پھر اشارے سے اُسے قریب بلایا، شانے پر ہاتھ رکھا اور میٹھی آواز میں بولے:

”ان گھڑ ہے مگر اسیل ہے۔ مولوی جی! بوڑھے عثمان کو اب اتنی مہلت نہیں ملے گی کہ اس بچے کی خدمت کر سکے۔ چھوڑ جاؤ۔ دندے والے سید سے بات ہوگی۔ آگے جو صاحب کی مرضی۔“

اور یہ صاحب ہی کی مرضی تھی کہ فضل علی، حضرت خواجہ عثمان دامانی کے دامنِ عاطفت کی پناہ میں زیادہ دن نہ رہ سکے۔ خواجہ سائیں نے ان کا ہاتھ اپنے خلیفہِ اول، سید لعل شاہ دندانی سیکسری کے ہاتھ میں دے دیا اور مسکرا کر فرمایا، ”دندے والے سید کے ساتھ چلے جاؤ یہاں سے آگے راستے نکلیں گے۔“

اور دندہ وہ بستی تھی جہاں فضل علی پر اللہ کا کرم خاص شروع ہوا۔ سید لعل شاہ دندانی نے تربیت کا آغاز کیا اور مدارج سلوک طے کروانے شروع کیے۔ ناتراشیدہ ہیرے کو تراشا جارہا تھا، آبِ دی جا رہی تھی۔ مگر فضل علی ابھی لاتعین کے دائرے تک بھی نہیں پہنچائے جاسکے تھے کہ صاحب کی طرف سے سید لعل شاہ کا بلاوا آ گیا۔

”سیدی! مرشدی! سیدی! مولائی!“ جھٹکے سے فضل علی اٹھ کر بیٹھ گئے۔ نئے سورج کی ہلکی روشنی میں، صبح کی ہلکی خنکی میں ایک تاریک رات کی یاد اپنا گہرا سایہ ڈالتی ہوئی گزر گئی تھی۔ پسینے میں جیسے نہائے ہوئے وہ ٹاہلی کے نیچے سے اٹھے اور تازہ بوائی کیے ہوئے کھیت کی مینڈ پر ٹہلنے لگے۔

پیر و مرشد کی مفارقت کا زخم پھر کیوں رسنے لگا؟ سید لعل شاہ کے بعد بھی اللہ نے انہیں بے آسرا تو نہیں چھوڑا تھا۔ ہاں اگر حضرت خواجہ عثمان دامانی کے فرزند، خواجہ سراج الدین نہ سنبھال لیتے تو فضل علی تو دندے ہی میں مر گئے ہوتے۔ یہ صاحب کی مرضی تھی کہ سید لعل شاہ دندانی کے وصال کی خبر سن کر خواجہ سراج تعزیت کے لیے دندے تشریف لائے اور فضل علی کو اس حال میں دیکھا کہ مرشد کے بعد جینے کی امنگ جیسے ختم ہی ہو گئی ہے اور گریہ و زاری ہے کہ رکنے کا نام نہیں لیتی۔

خواجہ سراج الدین، کہ ان کے دادا پیر کے صاحب زادے تھے، مرشدی سید لعل شاہ کو حقیقی بھائی کے مثل اور باپ کے بعد رہنما جانتے تھے اور خود صاحب حال تھے..... سو وہ سایہ دار بادل کی طرح آئے اور فضل علی کو نہال کر گئے۔

انہوں نے کالا باغ والے فضل علی کو غم و اندوہ سے پچھاڑیں کھاتے دیکھا تو اپنے درویش باپ کے سے بیٹھے لہجے میں پوچھا:

”فضل علی! کیا مرنے والے کا سوگ منار ہے ہو؟“

لہجے کی مٹھاس اور آواز کی کھنک حضرت خواجہ سائیں کی تھی۔ فضل علی نے آنکھیں کھولیں اور دوزانو ہو بیٹھے، سر جھکا لیا مگر آنکھوں سے آنسو رواں تھے۔

خواجہ سراج نے پھر سوال کیا، ”فضل علی! بیٹے! کیا مرنے والے کا سوگ منار ہے ہو؟“

”اپنی قسمت کو روتا ہوں خواجہ سائیں! میں بدنصیب ان گھڑ کا ان گھڑ ہی رہا... مرشد وصال کر گئے۔“

خواجہ سراج نے اسی طرح مہربان لہجے میں پوچھا، ”کیا پدر محترم نے ہاتھ پکڑ کر یہ نہیں کہا تھا کہ سید لعل شاہ کے ساتھ چلے جاؤ، یہاں سے آگے راستے نکلیں گے؟“

”بے شک، حضرت خواجہ سائیں درویش نے یہی فرمایا تھا۔“

”تو اللہ کی ذات پر بھروسہ کرو، رستے نکلیں گے۔ جو نعمتیں واپس لیتا ہے، وہی

نعمتیں دینا بھی جانتا ہے۔ کیا پتا ہمارے نصیب میں ہی تمھاری کچھ خدمت کرنی لکھی ہو۔“
یہ بہت واضح حکم تھا۔ فضل علی نے اپنے کانپتے ہاتھوں سے خواجہ سراج الدین کا دایاں ہاتھ تھام لیا، اسے بوسہ دیا پھر، اللہ اللہ کے نعرے مارتے ہوئے والہانہ رقص شروع کر دیا۔
حضرت خواجہ عثمان دامانی کی نسبتِ راست جو دندہ شریف پہنچ کر بالواسطہ ہو گئی تھی، اب بلا واسطہ جاری ہو گئی؛ کیوں کہ خواجہ سائیں واصل باللہ کے فرزندِ خوش خصال، خواجہ سراج الدین نے فضل علی کو تکمیلِ سلوک کے آخری مراحل طے کرانے کی خود سے پیش کش کی تھی اور اس ہیرے کو تراشنے، آب دینے کا ذمہ لے لیا تھا۔

سو اس کے بعد موسیٰ خیل کا دربار فضل علی کی تربیت گاہ قرار پایا۔
اور وقت جو خالقِ زماں کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے؛ وہ گزرتا ہے تو لگتا ہے ایک سبک سیر دریا ہے کہ بہتا چلا جاتا ہے، تو کتنی ہی کنکریوں کو توڑ پھوڑ کر ریزہ ریزہ کرتا ہے، تو کتنے ہی سنگ ریزوں کو جلا دے کر آب دار موتی بناتا ہے۔

خواجہ سراج الدین موسیٰ خیل سے بغرضِ علاجِ دہلی تشریف لے گئے اور چتلی قبر محلے میں حضرت میرزا مظہر جانِ جاناں اور حضرت شاہ غلام علی کے مزارات کے سجادہ نشین حضرت شاہ ابوالخیر کے وہاں قیام کیا۔

تو ایک گوہرِ آب دار کو تربیتِ صدف سے باہر آنے کا اذن ہوا۔
فضل علی کو بانئیس خواجہ کی چوکھٹ سے طلب کیا گیا تھا۔ ارشادِ شیخ تھا کہ فوراً دہلی پہنچو۔ دھڑکتے دل کے ساتھ فضل علی، موسیٰ خیل سے روانہ ہوئے۔ دہلی پہنچ کر شیخ کی قدم بوسی کی۔ خواجہ سراج نے حکم دیا کہ دستارِ خلافت لائی جائے۔

فضل علی لرزتے وجود کے ساتھ سر جھکائے، گویا ایک خواب کے عالم میں دوزانو بیٹھے تھے، برستی آنکھیں جیسے راہِ سلوک کی تمام مسافتوں کی کہانی سن رہی تھیں۔ حکم ہوا آگے آؤ۔ جوانِ صالح ارشاد کی تعمیل میں شیخ کے قدموں میں جھکتا چلا گیا۔ خواجہ سراج الدین نے اپنے ہاتھوں سے دستار باندھی۔ سندِ خلافت عطا کی تو ایک مستی کے عالم میں شیخ کے سجادے کو بوسہ دیا، سندِ خلافت کو اپنی عرق آلود پیشانی پر چسپاں کر لیا، اور اللہ کا نعرہ مار ایسی سرخوشی کے عالم میں رقص شروع کر دیا کہ مجلس میں موجود صاحبانِ حال وجد میں آ گئے۔

دور دراز کی مسافتیں جھیلتا، کالا باغ کے قریشیوں کا جوہرِ قابل؛ جسے مولوی بخشہ جی

نے ان گھڑ کسان بچہ کہہ کر حضرت دامانی کے دربار میں پیش کیا تھا، بائیس خواجہ کی چوکھٹ پر رقص کناں اور نعرہ زناں طلوع ہو رہا تھا کہ اللہ اللہ اللہ۔

اور اللہ اللہ اللہ کہ تازہ بوائی کیے ہوئے کھیت کی مینڈ پر کالا باغ کے روشن آسمان کے نیچے، خاکستری رنگ کے گاڑھے کا پیوند لگا گرتا پہنے، یہ خواجہ فضل علی قریشی تھے کہ رقص کرتے تھے۔ یہ اپنے بچپن کے دوستوں کے لیے بھافضل تھے اور کالا باغ کے جوانوں، بوڑھوں، بچوں کے بھائی فضل علی تھے جو ہفتوں کی مشقت کے بعد تیسری بار، دریا سے دور پڑی اپنی ضدی زمین میں بیج بکھیرنے کے بعد، کسی باطنی اشارے سے خبر پا کر شکر گزاری میں رقص کرتے تھے، کہ لگتا تھا، انھوں نے ابھی ابھی مٹی کی خاکستری چادر اوڑھ کر سوئے ہوئے بیج کو اکھوے نکالتے دیکھا ہے۔

فضل علی کی مرادوں کی فصل بھی تو تیسرے اشارے پر بارور ہوئی تھی۔ پہلے خواجہ عثمان دامانی نے پھر سید لعل شاہ دندانی نے ان کی دست گیری کی تھی، پھر خواجہ سراج الدین نے رستے پر ڈال؛ خلافت کی سند و دستار دے، انھیں بامراد کیا تھا۔ تو اللہ کے کرم سے یہ تیسری بوائی مشکور ہوئی تھی اور طریقت و سلوک کے اکھوے پھوٹنا شروع ہوئے تھے۔

تو شاید یہی کچھ اس کھیت کے ساتھ بھی ہونا ہے، اور امرِ الہی بھی یہی ہے کہ مشقت کی جائے، اور مشقت اور مجاہدے اور ریاضت کے بغیر کیوں کسی کو کچھ ملے۔ تو کیا محبوبِ خدا سے بڑھ کر کہیں کوئی ہوا ہے؟ تو کیا ایک پہاڑی کی کھوہ میں بیٹھے سرکارِ دو عالم امرِ الہی کی تکمیل میں ریاضت نہیں فرماتے تھے؟ تو اللہ اللہ اللہ! محبوبِ پاک کے صدقے میں میرے دوستوں کی اور میری اس حقیر ریاضت کو قبول فرما کہ اللہ اللہ اللہ کہ زمین تیری اور موسم تیرے اور آسمان سے اترنے والا پانی تیرا اور اگتی فصلوں کے چٹختے اکھوے تیرے کہ اس خاکستری چادر کو چیر کر تیرے سورج سے آنکھ ملاتے ہیں، کہ تیری مٹی سے رس لیتے ہیں کہ تیری ہوا کے ساتھ لہلہاتے ہیں کہ اللہ اللہ اللہ اور اللہ اللہ اللہ اور اللہ اللہ اللہ۔

خواجہ فضل علی تین شب و روز کھیت کی مینڈ پر اگی ٹیڑھی میڑھی ٹاہلی کے نیچے بخار میں پڑے بھنتے رہے۔ کالا باغ کے جوان ضد کر کے انھیں بستی میں لے آئے تو بستی کی طرف آتے ہوئے بار بار ان سے وعدہ لیتے جاتے تھے کہ یارو! دریا سے پانی لانے میں کوتاہی تو نہیں کرو گے؟ دیکھو اکھوے چل پڑے ہیں۔ دیکھو رب کی رحمت جوش میں ہے، اس کی

پذیرائی میں کمی نہ ہونے پائے۔ بچے نے خواجہ فضل علی کی جلتی ہوئی پیشانی پر ہاتھ رکھ کر وعدہ کیا کہ یارا درویشا! فکر نہ کر۔ ہم کالا باغ کے کنکر ہیں، پرکسان بچے ہیں۔ درویش کی بھیتی کو سوکھنے نہیں دیں گے۔

پھر ایسا ہی ہوا کہ خواجہ فضل علی کے کھیت نے اکھوے نکالے اور جب پودے بالشت بالشت بھر کے ہوئے تو پورا کالا باغ دیکھنے کو اُٹھ آیا۔ اور لوگوں نے ایک آواز ہو کر کہا کہ کالا باغ نے دنیا کو ایک درویش دیا؛ اور خواجہ فضل علی اللہ لوک ہے اور قریشیوں کا سبیل پتر تو بابا دامانی کا سچا جانشین ہے؛ اس کے فیض سے تو میانوالی سے قحط اور بھوک مری دفع ہوگی اور یہ تو ابرِ رحمت ہے، بارش لے کر آئے گا۔ اور لوگ اب خواجہ فضل علی قریشی کے حوالے سے بارشوں کی راہ دیکھنے لگے۔

اللہ اللہ کے آہنگ پر رقص کرنے والوں کا دائرہ بڑھنے لگا۔ بات ملکوں تک پہنچی تو تپک برداروں کی معیت میں مشکلی گھوڑے پر چڑھ کر ڈاڈا ملک تک فضل علی قریشی کا کھیت دیکھنے آیا اور وہ بہت مرعوب ہوا۔ اس نے اپنے آدمیوں کو اشارہ کیا کہ خواجہ فضل علی کے لیے زندگی آسان کر دی جائے اور علاقے میں خیر خیرات کے کام بڑھا دیے جائیں۔ شاید کہ یہ جوان اللہ لوک ہے۔

اور ایک رات میں کسی وقت خواجہ کی آنکھ کھل گئی تو کسی آواز نے کہا کہ اب تو خلق اللہ کی خدمت میں بڑا مزہ ہے کہ فضل علی قریشی کے رستے آسان ہوئے ہیں۔ بڑی بڑی ناموریاں ملتی ہیں اور اب تو وہ رب جی کے چٹیوں چٹے نام کی، اس کے نوروں نور نام کی مشعل اٹھائے ہوئے دوڑا دوڑا جائے گا۔ اور یہ تو دیکھو، اس کے نصیب واہ واہ ہوئے کہ رب جی نے طوطے کو نام رٹایا اور اپنے مٹھو طوطے کو خوبوں خوب اڑایا کہ دوروں دور پہنچایا کہ فضل علی قریشی اب تو دوڑا دوڑا جائے گا؛ کہ جگہ جگہ جا کے حق حق اللہ اللہ حق اللہ اللہ کہ اللہ اللہ کہ اللہ کا نام پہنچائے گا۔ اور یہ تو دیکھو کہ فضل علی خواجہ کے پرکھوں کے باڑے وسیع ہوئے اور گھرانے کے اونچے ہوئے کہ قریشیوں کے ناموں کے تھمبے بلند ہوئے۔

اور آواز نے کہا کہ مجھے تو میرے کاموں سے بڑی بڑی عزتیں، بڑی بڑی ناموریاں ملیں۔ اور یہ قحط سالی تو میرے لیے ناموری لے کر آئی۔ سواب میں دل جمعی کے ساتھ اللہ کا نام میاں والی میں اور پھر پنجاب بھر میں پھیلاؤں گا اور لوگ تو اب میری سنیں گے کہ واہ درویش۔ واہ

درویش۔ واہ درویش۔

اچانک ایک چمک کے ساتھ زانو پر دو ہتھ مار خواجہ فضل علی قریشی کھڑے ہو گئے۔ گریبان میں ہاتھ ڈال، خاکستری جامہ چاک کر ڈالا اور رات کے سناٹے میں بے آواز چیخ کہ او فضل! او ان گھڑے! او ان گھڑے! تو کالا باغ کے ٹبوں ٹیلوں پر بیٹھے ہوئے گدھوں سے کچھ بہتر تو نہیں! ہے۔ وہ بھی قحط سالی سے مسرور ہیں کہ شکم سیری کے لیے کھیتوں، گڑھوں، گلکاریوں میں مردار جانوروں کا منوں گوشت موجود ہے اور خلق اللہ کی مصیبتوں پر ان کے بدنما شکم پھولتے جاتے ہیں۔ ارے تو تو کندن بننے نکلا تھا پر رانگے کا رانگا ہی رہا۔ اوطوطے، او گونگے، اور انگے، او کچے رانگے! تو نے تو مجھے ہلاکت میں ڈال دیا؟

پھر سکون کی گہری نیند سوتے ہوئے عقیدت مندوں کے درمیان سے فضل علی سائے کی طرح نکلے اور باڑے کے باہر آکھڑے ہوئے۔

کسی نے بیرونی کچی دیوار پر گیر و گھول کر ٹیڑھے میڑھے حروف میں ”ڈیرہ درویش حضرت خواجہ فضل علی قریشی روشن ضمیر، خلیفہ ارشد حضرت بابا خواجہ سائیں سراج الدین دامانی“ لکھ دیا تھا۔ شیخ کا نام نامی پڑھا، تڑپ کر دیوار سے جالپٹے اور بابا سراج کے نام پر پیشانی ٹکا کر ہچکیاں لے لے کر اس طرح روئے کہ لگتا تھا سینہ شق ہو جائے گا۔

طبیعت کو کچھ قرار آیا تو دیوار کا لکھا ایک بار پھر پڑھا، ایک ٹھنڈے بے رحم طیش کے عالم میں ”حضرت خواجہ فضل علی قریشی روشن ضمیر، خلیفہ ارشد“ کے الفاظ پر دونوں ہتھیلیاں تیمم کے انداز میں ماریں اور چہرے پر مل لیں۔ دو ہتھ مارتے تو دیوار کا گچا گیر و ہتھیلیوں پر چھوٹ آتا پھر اسے اپنے چہرے پر مل لیتے اور زیر لب کہتے جاتے، ”لے خواجے لے... لے درویشے لے... لے روشن ضمیر لے... لے خلیفے لے۔“

تو اس طرح اللہ نے ایک قیامت کی گھڑی میں انھیں سرخ رو کیا۔

خواجہ فضل علی دیوار سے ہٹے تو اب وہاں چمکیلے گيرو سے بس اتنا لکھا رہ گیا تھا کہ ”ڈیرہ درویش حضرت بابا خواجہ سائیں سراج الدین دامانی“۔

اور خواجہ فضل علی باڑے کی دیوار سے ہٹے تو سیلاب سے ڈھ جانے والی دیوار کی طرح گھٹنوں پر ہتھیلیاں ٹکا کر بیچ گلیارے میں بیٹھ گئے۔

اندر باڑے میں قریب و دور سے آنے والے ارادت مند اور کٹمب قبیلے والے اور

بچپن لڑکپن کے دوست، خشک سالی اور قحط کی سختیاں بھولے ہوئے چین کی نیند سوتے تھے؛ اس لیے کہ ان کے حسابوں، ایک رحمت باری خواجہ فضل علی درویش کی صورت میں جاگ رہی تھی، ان کی فصلوں، ان کے رزقوں پر ابر باراں کی طرح سایہ فلگن تھی۔

تب خواجہ فضل نے باڑے کی طرف اور اپنی طرف دیکھا، اونچی آواز میں بولے، ”لے طوطے پڑھ۔ اور پڑھا کہ تمام موجودات پر سایہ رحمت تو وہی ہے اور رحمت بھی وہی اور رحیم بھی وہی ہے کہ ارحم الراحمین بھی وہی ہے کہ سائے تو اس کے نور میں، اس کے نوروں اجلے نور میں، ایسے معدوم ہوئے جاتے ہیں کہ اللہ اللہ۔“

پھر خواجہ فضل علی آہستہ آہستہ باڑے کے دروازے کی طرف بڑھے۔ سادہ دل ضرورت مندوں کی بے چارگی ایک بچکانہ حیرت کے ساتھ خواجہ فضل کا منہ تکتی تھی کہ دیہاتی چمردھے جوتوں کا ایک بے ترتیب ڈھیر دروازے پر پڑا تھا۔ ان میں کہیں کہیں شہروں سے خریدے ہوئے نئے طرز کے جوتے بھی تھے۔ کیوں کہ روزگار اور کام دھندے کے لیے انگریز کی عمل داری میں دور دور تک جانے والے، نئے طرز کی زندگی کو دھیرے دھیرے چھو کر دیکھ بھی رہے تھے۔

کھیتوں، کھلیانوں، بیڑوں کی مٹی جوتوں سے لپٹی ہوئی۔ میلوں سے چل کر آنے والوں کے ساتھ اڑتی ہوئی دھول کہ تڑنے ہوئے چمڑے کی دراڑوں میں جمی ہوئی۔ گھسے ہوئے پرانے چمڑے کے ریشوں اور پسینے سے تہ بہ تہ بنی ہوئی پٹریوں سے بھاری کھسے۔ اور طے کے کام کی شوقین مزاجوں والے نوجوان زمین داروں کی نوک دار، نویلی جوتیاں اور لکڑی کی کھڑاویں اور مونجھ سے بٹی ہوئی کھیڑیاں اور چلیاں... سو خواجہ فضل علی ان کے درمیان دو زانو بیٹھ گئے اور گریباں دریدہ کرتے سے ایک ٹکڑا پھاڑ کر محبت، نرمی اور توجہ کے ساتھ ایک ایک جوتے کو جھٹک جھاڑ پونچھ کر، مٹی چھڑا چھڑا کر اپنے دامن کی اس دھجی سے مقدور بھر چمکا کر اور جوڑیاں بنا بنا کر قطاروں میں رکھتے گئے۔

ایک میٹھی آسودگی کا دریا سینے سے بہتا ہوا بازوؤں میں، اور ہتھیلیوں میں، اور پور میں، اور انگلیوں کے سروں سے گزر رہا تھا۔

تو کالا باغ کے ٹبوں، ٹیلوں، کنجوں، پتوں سے یہ رات اسی طرح گزری۔



گھڑی بھر کی رفاقت

مسافرت میں ایک وقت ایسا بھی آتا ہے جب
گھوڑا اپنے سوار کی راسیں سنبھال لیتا ہے
(ایک طبع زاد کہاوت)

مسلل دو دن اور دو راتیں گھوڑے کی پیٹھ پر گزاری تھیں۔ انتہا درجے کی
تھکن اور تشویش میں سنبھل کا حاکم عیسیٰ خان لکھنؤ سرورانی بنگالے پہنچا تھا کہ سلطان ہند حضرت
شیر شاہ سوری بنگالے میں صاحب فراش تھے۔

لکھنؤ کی شہر پناہ کے باہر قلعہ دار چنٹا منی گوڑا ایک تازہ دم گھوڑا اور بعض
اچھی خبریں لیے موجود تھا۔ سب سے اچھی خبر یہ تھی کہ سلطان شیر شاہ صحت یاب ہو رہے ہیں،
انہوں نے بستر سے اٹھ کر دالان میں ٹہلنا شروع کر دیا ہے۔ عیسیٰ خان اس شخص چنٹا منی کو دیکھ
کر ہمیشہ خوش ہوتا تھا۔ وجہ شاید یہ تھی کہ قلعہ دار چنٹا منی بے ضرورت کلام نہیں کرتا تھا اور اچھی
اور مفید بات پہنچانے کے لیے ہر وقت تیار رہتا تھا۔

عیسیٰ خان نے اپنے رفیقوں کو قلعہ دار کی پُر تکلف میزبانی کے حوالے کیا اور
خود قلعہ دار کے بڑھائے ہوئے خوان سے ایک بڑا سرخ سیب اٹھا کر اسے اپنے مضبوط
دانتوں سے کاٹا، گھوڑے کو ایڑ دیتا شہر میں داخل ہو گیا۔ لکھنؤ آتے ہوئے اس کے ہمراہیوں

میں سے کسی نے تجویز پیش کی تھی کہ اقامت گاہِ سلطانی کے راستے میں کسی ترک زادے کا حمام ہے، اگر مسندِ عالی عیسیٰ خان مناسب خیال فرمائیں تو ہم میں سے کوئی آگے بڑھ کر حمام تیار کرادے؛ غسل کر کے تازہ دم ہو جائیے گا پھر اقامت گاہِ سلطانی تشریف لے جائیے۔ مگر عیسیٰ خان نے انکار کر دیا۔ وہ پہلے اقامت گاہِ سلطانی پہنچ کر خود صدر الصدور حسن علی خان یا خادمِ خاص شناور غلزی کی زبان سے، یا اگر شہزادہ عادل خان سوری موجود ہوئے تو ان کی زبان سے، سلطان والا جاہ کی خیریت سنے گا۔ غسل اور لباس کی تبدیلی اور کھانا پینا سب کچھ بعد میں ہوگا۔

سنبھل کا حاکم مسندِ عالی عیسیٰ خان لکبوسروانی، شیر شاہی دربار کا حجاب دار، میر توڑک اور سلطان کا تنبول دار تھا۔ وہ سلطان کو دربار میں پان پیش کرتا تھا... یہ خود اپنی جگہ ایک جلیل القدر اعزاز تھا۔ اسے پانچ ہزار سواروں کی سالاری اور اہل و عیال کی پرورش کے لیے دو پرگنے عطا ہوئے تھے۔ عیسیٰ خان بلا کا شمشیر زن اور قیامت شاہ سوار تھا۔

عیسیٰ خان کو سلطنت کے پہلے وکیل یا وزیر کا رتبہ ملا تھا جس کا وہ بجا طور پر اہل تھا۔ عزت مآب مہمانوں، سرداروں، والیوں، حاکموں، شاہوں کو رو بکاری سلطان میں پیش کرنا، ان کو ان کے مراتب سے دربار میں کرسی، نشست اور اعزاز فراہم کرنا، بہ وقتِ ضرورت خلعت و انعام و سند مہیا کرنا، عیسیٰ خان کے فرائض میں شامل تھا۔ سلطان اور مملکت کا وفادار رہنا عیسیٰ خان کے فرائض میں شامل تھا اور سلطان سے محبت کرنا بھی۔ مگر کسی سے محبت کرنا کسی کے فرائض میں کیسے شامل ہو سکتا ہے؟ عیسیٰ خان نے سن رکھا تھا کہ محبت کا درجہ فرض سے کہیں زیادہ رفیع اور محترم ہے۔

مگر عیسیٰ خان حجاب دار خود رفیع اور محترم تھا اور وہ اپنے بادشاہ سے محبت کرتا تھا۔ شاید بہت دن تک درباروں سے وابستہ رہنے کی وجہ سے ایک کم زوری ضرور عیسیٰ خاں کے مزاج میں در آئی تھی؛ وہ محبت کرتا تھا اور چاہتا تھا کہ جب سلطان کے لیے اس کی محبت ظاہر ہو تو وہ ان کے ملاحظے میں بھی آئے۔ اس کی تازگی و رعنائی ویرانے میں کھلتے پھول کی طرح ہوا کا رزق نہ بن جائے۔

اسی لیے لکھنوتی میں داخل ہوتے ہوئے وہ گرد و غبار اور تھکن اور تشویش میں اٹا ہوا سیدھا اقامت گاہِ سلطانی جانا چاہتا تھا تا کہ شیر شاہ سوری کے قریب کے یہ تین آدمی: حسن علی

خان، شناور غلزنئی اور شہزادہ عادل اسے سلطان کی محبت میں پریشاں مودیکھ لیں۔ یا اگر، خدا اس کا خیال مبارک کرے، اگر سلطان والا جاہ کسی درتپچے سے ایوان کے صحن میں نظر دوڑاتے ہوئے خود ملاحظہ کر لیں تو سبحان اللہ! اس کا یہ تکلیف دہ طولانی سفر باثر ہو جائے۔

قلعہ دار چنتا منی گوڑ نے یہ خبر بھی دی تھی کہ سلطان شیر شاہ نے فیصلہ کیا ہے کہ پرگنہ شاہ آباد کا گاؤں ناہ والی؛ جو تخت دہلی پر بیٹھنے کے بعد سلطان نے خود عیسیٰ خان کو بے طلب بخش دیا تھا، اب عیسیٰ خان سے لے کر شہزادہ عادل خان کو عطا کیا جائے گا۔

یہ خبر سن کر عیسیٰ خان نے خود کو سمجھایا تھا کہ پنج ہزاری سالاری، سنبھل سرکار کی حاکی، نجاب داری، تنبول داری، معتمدی اور سرداری کے ہوتے؛ اور بال بچوں اور وابستگان کی پرورش کے لیے دو پرگنوں کی آمدنی کے موجود رہتے؛ اس ایک گاؤں کے سند جاگیر سے نکل جانے سے کون سی قیامت آجائے گی۔ نہیں، عیسیٰ خان کے مرتبے اور آمدنی میں ایک گاؤں کے چلے جانے سے کوئی کمی واقع نہ ہوگی۔ ہاں، احسان مندی کی ایک روایت جو شیر شاہ سوری نے ہندوستان کا تخت سنبھالتے ہی قائم کرنا چاہی تھی، درمیان سے کٹ جائے گی۔ سو عیسیٰ خان جو شیر شاہی دربار کے دستور اور روایات کا پاس دار تھا، ایک روایت کے اس طرح منقطع ہو جانے سے اداس تھا۔

عیسیٰ خان بڑے باپ کا بیٹا تھا۔ مگر یہ بات وہ کھل کر نہیں کہہ سکتا تھا اس لیے کہ شیر شاہ سوری کے دربار میں اگر قبیلوں کے سرداروں کو شوکت اور عروج حاصل ہوا تھا تو خادموں، خانہ زادوں کی اولاد بھی عالی مرتبت ہو گئی تھی۔ وہ جو آبائی علاقے روہ میں جھروں سے اٹھتے وقت سرداروں، خان زادوں کی دستاریں دونوں ہاتھوں پر رکھ کر انھیں پیش کرتے تھے اور بدھنے بھر بھر کے انھیں وضو کراتے تھے اور ان کے مرکبوں کی راسیں تھامے کھڑے رہتے تھے؛ وہ آج قلمرو ہند میں ان کے برابر بیٹھتے ہیں اور واللہ! ان کے قریب سے گھوڑا نکال لے جاتے ہیں۔ مسند عالی خواص خان کو دیکھو؛ سلطان کے خادم ملک سکھا کا بیٹا ہے۔ اللہ نے... اور سلطان نے... اسے کیا بدبہ و شکوہ عطا کیا ہے!

یہ نہیں کہ میں کسی سے اس کے عروج کی وجہ سے حسد کرتا ہوں۔ مجھے میرے خدا نے اور میرے بادشاہ نے بہت دے رکھا ہے۔ اور حسد وہ کرے جس نے شوکت و مرتبہ اس نسل کے سوا کبھی دیکھا نہ ہو۔ میں خان اعظم عمر خان کلبو رسروانی کا بیٹا ہوں جسے شیر شاہ سے

پہلے سلطان بہلول لودھی نے عزت و شہرت اور خطاب و جاگیر سے نوازا تھا۔ وہ میرا باپ مسندِ عالی عمر خان ہی تو تھا جس نے فرید خان سوری... اس وقت سلطان شیر شاہ، محض فرید خان تھے... تو فرید خان سوری کے باپ میاں حسن خان کو شاہ آباد پر گئے کا یہ گاؤں ناہ والی جاگیر میں دیا تھا۔ اور خود وہ میرا باپ خانِ اعظم عمر خان تھا جس نے بارہ سال کے لڑکے فرید خان کو اسی گاؤں میں بلہو نام کی مزرع عطا کی تھی اور کہا تھا کہ ابھی تو نو عمر ہے، جب اپنی عمر کو پہنچے گا تو تجھے ملازمت بھی دوں گا؛ اور تو، کیوں کہ اس وقت اپنے باپ کے ساتھ آیا ہے، اور ملازمت طلب کرتا ہے اس لیے تالیفِ قلب کے لیے بلہو کی یہ مزرع تجھے عطا کرتا ہوں۔

اور چننا منی گوڑ کہتا ہے کہ اب وہی گاؤں واپس لیا جا رہا ہے جو سلطان عادل شیر شاہ سوری نے تختِ دلی پر متمکن ہوتے وقت بے طلب، مجھے... اپنے محسن اور بخشندہ کے بیٹے کو بخش دیا تھا؛ تاکہ احسان مندی کی ایک روایت سوری خانوادے سے جاری ہو اور کلبور سروانیوں کو تا قیامِ قیامت یہ احساسِ گرم و سرشار رکھے کہ ہم نے کبھی سوری حسن خان کو یہی ناہ والی گاؤں ازراہِ پرورش عطا کیا تھا۔ کس لیے کہ جب سوری ضرورت مند تھے۔ پھر ایک احسان شناس سوری شیر شاہ نے وہ گاؤں 'مجھے' عیسیٰ خاں کلبور سروانی کو جاگیر میں دے کر گویا احسان مندی کی ایک روایت کا آغاز کیا تھا اور افسوس! وہ روایت اب منقطع ہونے کو ہے۔ قلعہ دار چننا منی کہتا ہے...

اور یہاں قلعہ دار کے پیش کیے ہوئے گھوڑے نے ٹھوکر کھائی۔ عیسیٰ خان نے راسیں کھینچ لیں۔ گھوڑے سے اتر آیا اور رستہ چھوڑ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا۔ لوگوں نے دیکھا کہ گھوڑے کی راسیں دھول میں گرائے ہوئے، پختہ عمر کا ایک روہیلہ سردار، سڑک کے کنارے سر جھکائے کھڑا ہے۔

پناہ بہ خدا! کیا یہ عیسیٰ خان تھا جو اتنی پست سوچ سوچتا ہوا چلا آ رہا تھا؟ یہ سنبھل کا حاکم، سوری دربار کا حجاب دار، مملکت کا میر توڑک، اپنے سلطان کا تنبول دار، کیا یہ پانچ ہزار شیر شاہی سواروں کا سالار ہے جو اتنی گراوٹ کے ساتھ، ایسی رسوا کن باتیں اور کم ظرف خیال پال رہا ہے؟ اور ناموس باختہ عورتوں کی طرح خیال ہی خیال میں اپنے رفیقوں پر طعنہ زنی کرتا اور منافقت سوچتا چلا آتا ہے؟ نہیں! عمر خان جنتِ مکانی کا بیٹا ایسی اٹھلی باتیں کیسے سوچ سکتا ہے۔

تف ہے مجھ پر! نفیس ہے مجھ سوار پر اور لعنت اس نحوست آثار گھوڑے پر!

عیسیٰ خان نے ایک ٹھنڈے غصے میں لرزتے ہوئے زین کا تسمہ کھول کر، گھوڑے کا ساز اور یراق اور زین اور زین پوش زمین پر گرا دیا اور اپنے نیام کو چوڑائی کے رخ سے جریب کی طرح گھوڑے کے پٹھے پر مار کر اسے بوجھ کھینچنے والے جانور کی طرح بازار کی طرف ہنکا دیا اور چیخ کر کہا، ”تف ہے تجھ پر! تیری سواری نے مجھے عیسیٰ خان نہ رہنے دیا۔ اولعنتی جانور! تیری نصف ساعت کی رفاقت نے مجھے چوہے جیسا خود غرض اور مکینہ بنا دیا۔ تف ہے تجھ پر!“ اور اس طرح چننا منی گوڑ کے پیش کیے ہوئے گھوڑے کو بے آبرو کر کے سڑک پر ہنکا دینے کے بعد، سنبھل کا حاکم عیسیٰ خان لکبور سروانی، گرد اور خفت میں اٹا ہوا، خود اپنے احتساب سے نڈھال، اقامت گاہ سلطانی کی طرف پیادہ پا روانہ ہو گیا۔



ملفوظاتِ بھپوتا

کسی کے بزرگوں، علی الخصوص والد کے منہ بولے چچا کی جسمانی موت پر کھلکھلا کر ہنسا بڑی ذلیل بات ہے۔ مگر یہ بات اپنے سیاق و سباق ہی میں اچھی لگے گی اس لیے ابتدا سے عرض کرنا زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے۔ سو عرض کرتا ہوں:

یہ اس زمانے کی بات ہے جب آنجہانی اڈولف ہٹلر کی فولاد اور کانکریٹ سے کھینچی ہوئی سیگفریڈ لائن تاش کے پتوں کے مانند بکھرنے والی تھی۔ لفٹ وائفے کے باجروت طیارے تھکے ماندے بریدہ پر گدھوں کی طرح وسطی یورپ کی روندی ہوئی زمینوں پر ایک ایک کر کے ڈھہ رہے تھے، اتحادیوں کا ریلارور پر دستک دے رہا تھا (اور بقول شخصے آخری جنگِ عظیم اپنی انتہا کو پہنچ کر لوٹنے والی تھی) کہ یہ گنہگار، نیکر پہنے ورنا کیولرڈل اسکول بانسواڑا کے سامنے سے گزرا۔ ڈرل ماسٹر استاد وینکلا ناتھن ویدی، بیکنٹھ مکانی، اسکول کے پھانک سے ٹیک لگائے دو تون کر رہے تھے۔ مجھے نیکر پہنے گزرتے ہوئے دیکھ کر انھوں نے تبسم فرمایا، اپنی ران پر تھپکی دی اور دانت پر دانت جما کر بولے کہ ”ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔“ یہیں سے میری شعری زندگی کا آغاز ہوتا ہے۔

آنجہانی وینکلا ناتھن ویدی صغری (میری صغری) سے ہی مجھ خاکسار پر توجہ فرمانے لگے تھے۔ مگر عالم تھے، ان کے دادا پترویدی، باپ تری ویدی اور پھوپا

دویدی تھے۔ پھوپی کی خواہش تھی کہ بھتیجے وینکٹا ناتھن بھی کم سے کم پھوپا جتنی نگم وڈیا پر اپت کر لیں۔ اس لیے اس نیک خاتون نے انھیں بچپن ہی سے چھوٹے دویدی جی کہہ کر پکارنا شروع کر دیا تھا۔ مگر میرے استاد، کہ تلمیذِ اسفل السافلین تھے، ویدوں پر انوں کا علم کسی کسی یا وہی حوالے سے کس طرح قبول کر لیتے؟ انھوں نے ایک روز پھوپا دویدی کے سر پر چھاچھ کی گاگرالٹ دی اور مغلظات سناتے بھاگ کھڑے ہوئے۔

ان دنوں بانسواڑا چھاؤنی میں زور شور سے بھرتی ہو رہی تھی۔ استاد محترم نے چھاؤنی کی راہ لی، موپلا کوارٹر ماسٹر حوالدار کو چپل پہنے پہنے فوجی سلیوٹ پھٹکارا۔ موپلا مسکرایا۔ اس نے استاد کے دانت دیکھے، قد اور سینے کی پیمائش کی، اسپرنگ والی مشین پر ان کا وزن کیا اور پنڈت ہونے کے ناتے انھیں لائگریوں میں ہیلپر ریکروٹ کے عہدہ جلیلہ پر بھرتی کر لیا۔ سترہ برس سرکارِ انگلشیہ کی خدمت کرتے ہوئے عہدہ لانس نائک تک ترقیاں پائی تھیں۔ استاد مکرم، باعزت ریٹائر بھی ہو جاتے اور تاحیات پنشن بھی پاتے اگر میس حوالدار سبرامنیم کی خباثت آڑے نہ آ جاتی۔ اس فٹز مساق نے استادِ معظم کو سرکاری بطخوں کے انڈوں میں خیانت کا ارتکاب کرتے ہوئے بالآخر دھر ہی لیا۔ کورٹ آف انکوائری بٹھا دیا گیا اور کیوں کہ کرنل کمانڈانٹ کے روبہ رومسروقہ انڈے استاد کے برانڈ کوٹ کی جیبوں سے برآمد ہوئے تھے، انگریز کا زمانہ تھا، اس لیے کھڑے کھڑے چھاؤنی بدر کر دیے گئے۔ بدنہادوں نے استاد کو بانسواڑا کینٹ گارڈ روم کے بڑے پھانک سے بہ اس ہیئت مجموعی دوڑا لیا کہ استاد مکرم کے جسم پر ایک کچھا اور سینڈو بنیان تھی، یا جینیو کا کچا دھاگا، جو اس مردود سبرامنیم نے استاد کے کان سے لپیٹ دیا تھا۔ خبیثوں نے سرکاری کریپ سول جوتے تک اتروا لیے تھے۔

خوش قسمتی سے ان دنوں بانسواڑا ورنہ کیولر مڈل اسکول میں ڈرل ماسٹر کی اسامی خالی تھی۔ آنجہانی وینکٹا ناتھن جی دویدی مناسب کپڑے پہن کر قواعد پریڈ کرتے ہوئے اسکول میں اور پھر اس خاکسار کی شعری زندگی میں در آئے۔

اردو، ہندی، موپلائی، ٹمل، کنڑ، ملیالم، انگریزی اور عربی؛ گویا نوزبانیں، قواعد پریڈ اور بھرت ناٹیم میں نے استاد دویدی جی سے سیکھے۔ ہر چند کہ انگریزی اور عربی میں ترتیب وار، فرانس ڈی ژورو صاحب (کہ کرنل کمانڈانٹ کے آبدار تھے) اور پانچویں موپلا ریگی۔ منٹ کے ایک چاؤش لانس دفعدار (نام جن کا اب ذہن سے نکل گیا ہے) میرے بنیادی

استاد رہے۔

استاد دَویدی استادوں کی اس نسل سے تھے جو اب ناپید ہے۔ (اور پہلے بھی نایاب تھی) آنجہانی نے منہ کھول کر کبھی منہ سے کچھ طلب نہ کیا، جب جو سمجھ میں آیا اور جتنا بن پڑا، اٹھالیا۔ اپنی اس اصول پرستی کے ہاتھوں جب تک جیے اور جس حد تک جیے، معاشرتی اور قانونی مشکلات کا شکار رہے۔ استغنا کا یہ عالم تھا کہ ایک بار علاقہ مدھیہ پردیش کی سیر کو تشریف لے گئے۔ ایک روز کھجور او کے مندر کی دیواروں پر تراشے ہوئے سیکڑوں برس پرانے مٹھن کے ہیجان خیز نقش دیکھتے ہوئے بعالم استغراق استمنا بالید فرماتے تھے کہ پکڑے گئے۔ عیاذ باللہ! کیا آدمی تھے! بیس دن کی جیل کاٹ کر واپس آئے تو دنیا تیاگ دی، سنیاں لے لیا۔ تاہم تقسیم ہند سے سترہ روز پہلے کالپی کے جنگل میں ایک مادہ ہرن کو دیکھا، قابو کیا، قابلِ دشنام رویہ اختیار کیا۔ پھر پکڑے گئے۔ انجمنِ انسدادِ بے رحمی بر حیوانات کے کسی بدنہاد انسپکٹر نے چالان کر دیا۔ مقامی ویٹری نے ان کا اور ہرن کا طبی معائنہ کیا۔ انگریز کا زمانہ ابھی سترہ دن باقی تھا۔ الزام درست ثابت ہونے پر استاد کو پھر بیس روز قیدِ با مشقت کی سزا سنائی گئی۔

یہ رہا ہوئے تو ملک آزاد تھا۔ استاد محترم کے یہ بیس روز گویا ان کی زندگی میں ایک اور انقلاب کا پیش خیمہ ثابت ہوئے۔ جیل سے باہر آ کر سنیاں ترک کیا اور رائے پور کے سینٹرل سنی مے کے باہر لیمن سوڈے کی بوتلوں کا اسٹال لگا لیا۔ فلم اسٹار مادھوری کے عشق میں مبتلا ہوئے اور بوتلوں کے ڈھکنے کھولتے کھولتے ایک دن آخری شو کے بعد داعی اجل کو لبیک کہا: حیف در چشم زدن...

اس عاصی نے اپنا پہلا شعری مجموعہ ”وینکلا درشن“ استاد کو شردھا نجلی بھیجتا کیا تھا۔ دوسرے مجموعے کا نام ”چھاچھ کی لٹیا“ بھی استاد وینکلا جی کی زندگی کے اہم واقعے سے متاثر ہو کر رکھا گیا ہے۔ خدا بڑا مسبب الاسباب ہے۔

یادش بخیر، بانسواڑے سے ڈھائی تین کوس پر ایک قدیم شو آلیہ تھا۔ کبھی چھٹے، سہ ماہے کوئی مہنت، پجاری مندر کا صحن بھارنے، دیواستھان کو جل پروسنے، سندور چندن دینے آنکلتا یا کوئی بھولا بھٹکا پینڈو، ڈنڈوت کرتا، ناریل چڑھاتا ایک دروازے داخل، ہوتا دوسری راہ نکل جاتا۔ غرض کہ عجب پُر ہول جگہ تھی۔ دیواستھان پر کرونا ندھان، اما کانت، سجن آنند، نٹ ور، گریجا پتی شکر کی اُجول آکرتی تھی اور سرخ پتھروں والے صحن کے بچوں بیچ کوئی سولھے فیٹ

پاٹ کی سنگین یونی پراٹھائیس فیٹ کا لنگم نصب تھا کہ سخت ہیبت و جلال کا مقام تھا۔ ایک بار بانسواڑا ورنا کیولر مڈل اسکول کے اساتذہ اور شاگردوں کا جتھا پکنک منانے نکلا تو شریر لمڈوں کی ایک ٹولی شو آئیہ میں جا گھسی۔ پورے ضلعے میں ایک میں ہی مسلمان طالب علم تھا (ضلعے کی مسلمان اکثریت ندانی اور کفش دوزی سے شغف رکھتی تھی، حصول علم کا کوئی خاص شوق نہیں تھا)۔

ہر چند کہ بزرگوں نے ہر مسلک، ہر دھرم کا احترام کرنا سکھایا تھا مگر آخر کو میں نٹ کھٹ تھا۔ ایک عجب طرح کی للک اٹھی کہ مجھ ناہنجار سے اٹھائیس فیٹ کا یہ لنگم دیکھا نہ گیا، جوتے اتار یونی پر چڑھ گیا۔ جیب سے رنگین چاک نکالی اور شیولنگ پ اردو میں ”عید مبارک“ لکھ کر بھاگ کھڑا ہوا۔ ہائے ہائے کیسے لوگ تھے اور کیا زمانہ تھا۔ ریاضی کے استاد آنجہانی پر شوقم رائے گوالکرجی، بیکنڈھ نواشی نے، کہ اردو سے نابلد تھے، یہ تصور کرتے ہوئے کہ میں ناہنجار عقیدت و احترام کے حرف لکھنے یونی پر چڑھا ہوں، تبسم فرمایا اور بولے کہ اگر زندہ بچ گیا تو یہ مسلمان لڑکا دوسرا ملک محمد جانی بنے گا اور ایک نئی پدماوت لکھے گا۔ بھمدلہ، استاد گوالکرجی یہ مشروط پیش گوئی لفظ بہ لفظ پوری ہوئی ہے۔ اسی لیے میں اپنا دوسرا مجموعہ کلام بھی، کہ بہ فیض ربی پہلے مجموعے کے بعد پدماوت ثالث کا درجہ رکھتا ہے، حاضر خدمت کر چکا ہوں۔

میرے دوسرے استاد کہ جن کے فیض صحبت سے مجھے علم عروض میں درک ہوا یہی آنجہانی گوالکرجی تھے۔ یہ پشتینی پیشے کے اعتبار سے ورق گر تھے۔ بعد کو ریاضی داں ہوئے۔ اپنے دور شباب میں چاندی کے ورق کوٹتے ہوئے موصوف نے موگریوں کی ضربوں میں اپنے اندر کا آہنگ خود ہی دریافت کیا تھا؛ کہ خبر نہیں صوفیہ کی سنگت میں ورق نقرہ پر والہانہ رقص فرمایا تھا؟ مجھے تو بس اتنا معلوم ہے کہ اسکول کے سالانہ جلسے میں جب میں استاد اسماعیل میرٹھی کی شہرہ آفاق نظم ”پن چکی“ پڑھنے کھڑا ہوا تو پہلے ہی شعر کا دوسرا مصرع بھول گیا۔ سات بار لحن بدل بدل کر پہلا ہی مصرع پڑھ چکا تیس پہ بھی مصرع ثانی یاد نہ آیا تو پریشانی لاحق ہوئی۔ یہ البتہ دماغ میں رہ گیا تھا کہ چکی کا قافیہ پکی، ہے سو آٹھویں بار، مرتا کیا نہ کرتا کے مصداق، میں نے شعر پڑھ دیا کہ:

نہر پر چل رہی ہے پن چکی
دھم دھما دھم دھما کی پکی

اور سلام کر کے ڈاکس سے اتر آیا۔ ابھی اپنی نشست تک پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ ”ہرے ہرے ہرے رام“ کا نعرہ مار، شفیق استاد پر شوقم رائے گوالکرجی نے دبوچ لیا۔ اللہ اللہ، بیکنٹھ نواشی استاد روتے جاتے تھے، میرا منہ چومتے جاتے تھے اور بار بار فرماتے تھے: ”تاہرو پنگل گھنٹرو جبر ہائیں۔ تاہرو پنگل گھنٹرو جبر ہائیں“ بعد کو معلوم ہوا کہ موصوف میرے علم عروض کی تعریف فرماتے تھے۔

استاد معظم شری گوالکرجی کسی زمانے میں شعر بھی کہتے تھے اور ورق گری کی نسبت سے موگری تخلص کرتے تھے۔ عقیدے کے حساب سے دگمبر جینی تھے سوفطرت سے از حد قریب رہنا پسند فرماتے تھے۔ اسکول سے گھر پہنچتے ہی الف ننگے ہو جاتے اور دوسرے دن اسکول جانے تک اسی حالت میں رہتے۔ کیسے لوگ تھے اور کیا زمانہ تھا! برہنگی استاد کے باوجود کیا مجال تھی جو ان کے اس عمل سے کوئی سماجی مسئلہ کھڑا ہو جاتا۔ مسئلہ پیدا نہ ہونے کی ایک وجہ تو یہی تھی کہ استاد مکرم گوالکرجی کا کبر سنی کا دور تھا کوئی اسی کے پیٹے میں ہوں گے۔ علاوہ ازیں ایک رسویے اور جھاڑو بہار والی عورت کے سوا دوسرا کوئی ان کے گھر آتا بھی نہ تھا۔ یہ دونوں بھی ڈیپ سی ڈائیونگ، یعنی غوطہ خوری کے تقریباً آہنی لباس میں، سیاہ اوپیک چشمے پہن کر گھر میں داخل ہوتے تھے اور جتنی دیر خانہ استاد میں رہتے یہی لباس اور یہی چشمے استعمال کرتے تھے۔ شری گوالکرجی موگری، خدا کے فضل سے، صرف بانسواڑے میں کوئی اکاون برس گھر آنگن میں ننگے ٹہلتے اور علم و فضل پھیلاتے رہے۔ آخری عمر میں سلسل بول کی شکایت ہو گئی تھی۔ دسمبر کی ایک رات میں کسی وقت پیشاب پینے اٹھے اور حقیقت اولیٰ سے جا ملے۔ مادر زاد ننگے آئے تھے، مادر زاد ننگے روانہ ہوئے:

اس رند کی بھی رات کئی جو کہ عور تھا

ورنا کیولر مڈل اسکول بانسواڑا اور خود بانسواڑا چھاؤنی علم و ادب کے وہ روشن مراکز تھے جہاں اول اول شعر گوئی کی میری فطری صلاحیتیں صیقل ہوئیں اور اردو، ہندی، مراٹھی، ملیالم، کنڑ، موپلائی، ٹمیل وغیرہ کے زبان و بیان، املے، روز مرے، محاورے، ضلیع جگت اور ابے تے رواں ہو گئے۔ پھر خاندان کے بزرگوں کی حوصلہ افزائیاں اس پر مستزاد۔ ہر چند کہ یہ عاصی گھر کی مرغی تھا مگر بانسواڑے اور نواح بانسواڑا کے دوسرے خن بچوں کے برخلاف خوش نصیب تھا۔ للہ الحمد، اس گھر کی مرغی کو کبھی دال برابر نہ بننے دیا گیا، جس کے لیے یہ مرغی خاندان

کے بڑوں کی ممنون ہے۔ اللہ ایسا خاندان اور ایسی مرغی ہر ایک کو نصیب کرے! آمین۔

کامٹی کے ملک الشعراء، شیخ ضمیر الحسن پٹا کا مٹوی رشتے میں میرے خالو ہوتے تھے۔ بانسواڑے میں ان کا سال بہ سال ورود گویا ضلع بھر کے سخن بنجوں اور سخن فہموں کے لیے ابرِ رحمت کی آمد کے مصداق ہوتا۔ وہ وہ مشاعرے برپا ہوتے کہ کان پڑی آواز سنائی نہ دیتی۔ حضرت پٹا کا مٹوی کا یہ دستور خاص تھا؛ اور مراعاتِ ملک الشعراء میں یہ بات شامل تھی کہ مشاعرے کے آغاز و اختتام پر اور مشاعرے کے دوران بھی، دو چار چھ بار، جہاں جہاں پٹا صاحب مناسب سمجھتے انھیں زحمتِ کلام دی جاتی تھی۔ کسی کو دم مارنے کی مجال نہیں تھی۔ بھلے دن تھے۔ ضلع کے لوگ متواضع اور عالی ظرف تھے پھر فصل کاٹ لینے اور کھلیان بڑھا دینے کے بعد علاقے کے لوگوں کو کام بھی کیا ہوتے۔ ان دنوں راتیں ویسے ہی بے کار جاتی تھیں۔ ندانی اور کفش دوزی کا باریک کام لالٹینوں اور ڈبیوں کی مدھم روشنی میں تو ہونے سے رہا؛ اس لیے خلد آشیانی پٹا صاحب کو دی جانے والی مراعات کو کم ہی موقعوں پر چیلنج کیا گیا اور بات معمولی لاٹھی پونگے سے آگے نہ بڑھ سکی۔ یہ اکا دکا واقعات بھی، علاقے میں حضرت پٹا کے چند بد انجام ہم عصروں کے گھس آنے کی وجہ سے ہوئے۔ میں تو اسے علم و ادب کی خوش نصیبی کہوں گا کہ یہ وہی زمانہ تھا جب پٹا صاحب کے برادرِ خورد محکمہ مال گزاری میں واصل باقی نوایں تھے۔ وہ بفضلِ تعالیٰ با اثر آدمی تھے۔ چنانچہ ہر سال مشاعرے کے زمانے میں حفظِ ماتقدم کے طور پر گرد و پیش کے بارہ پندرہ تھانوں سے مسلح کنسیدان طلب کر لیتے۔ محکمہ مال گزاری کے چوب دار، پٹے والے، محرر، دفتری، جریب بردار تو ہمہ وقت موجود رہتے تھے۔ یہ ساری نفری مشاعرہ گاہ کو گھیرے میں لے لیتی اور مشاعرہ ختم ہونے سے قبل کسی کو اٹھنے نہیں دیتی تھی۔ مشاعرے نہایت پرسکون اور پاکیزہ ماحول میں ہوا کرتے۔ ہر شب اکثر و بیش تر پٹا صاحب غفرلہ کا کلام سماعت کیا جاتا تھا اور دوسرے فضول گو، تک بندوں کی تگ و تاز سے ضلع بھر کی سماعت و سخن فہمی محفوظ و مامون رہتی تھی۔ اک پٹا کا ہی طوطی بولتا تھا۔

میرے لیے مشاعروں کی یہ راتیں گویا دعائیں مستجاب ہونے کی راتیں ہوتی تھیں۔ حق مغفرت کرے، خلد آشیانی پٹا خالو جب بھی بانسواڑے تشریف لاتے مجیروں کی ایک فاضل جوڑی اپنے سامان میں باندھ لاتے۔ مشاعرے کی تاریخ سے تین شب و روز پیش تر جناب خلد آشیانی اور یہ گنہگار ریہرسل شروع کر دیتے اور مجیروں کے کھناکوں سے بانسواڑا

صدر، بستی کلاں اور مضافات بانسواڑ اکھنکھنا اٹھتے۔ دراصل پاپا صاحب کا طرزِ شعر خوانی تمام اگلوں پچھلوں سے مختلف اور منفرد تھا۔ مطالعے سے مقطعات تک شعر خوانی کرتے ہوئے حضرت پاپا صاحب بحر کے آہنگ پر اپنے مجیرے کھنکھاتے رہتے تھے (جو ظاہر ہے ملک الشعرائی کے حساب سے خاصے بڑے اور وزنی تھے)۔ عجب سماں بندھتا تھا۔ یہ خاکسار ڈانس سے اتر کر حاضرین میں داخل ہو جاتا اور گھل مل جاتا اور پاپا صاحب کی ردم سنتا ہوا، یہ عاصی، اپنے چھوٹے مجیروں کی جوڑی سے اس طور سنگت دیتا کہ حاضرین کی ایک ایک قطار میں گردش کرتا ہوا پاپا صاحب کی غزل کو مطالعے سے مقطعات تک پہنچاتا۔ آج کی زبان میں یوں سمجھیے کہ اسٹیریو کا لطف آتا ہوگا۔ کبھی کوئی باہر کا آدمی ان جانے پن میں میرے کرتے کی جیب میں دوئی، چوئی بھی ڈال دیتا تھا، مگر کیوں کہ یہ عمل غیر کفو پر دیسیوں، رگیروں اور تلنگوں وغیرہ کی طرف سے معصومیت میں سرزد ہوتا تھا اور دینے والے کی نیت نیک ہوتی تھی، اس لیے اس عاصی نے کبھی اسے عزتِ نفس کا مسئلہ نہیں بننے دیا۔ جو کچھ جس نے دیا، ازراہ استغنا جیب ہی میں پڑا رہنے دیا اور خاموشی اختیار کی۔ ورنہ ممکن تھا کہ یہ بات پاپا صاحب غفرلہ کے علم میں آ جاتی وہ خدا معلوم کیا اُدھم مچاتے۔ گمان غالب ہے کہ مجھ خاکسار سے یہ سکے لے کر اپنے تصرف میں لاتے۔ یہ بات بہرِ نوع کامٹی کے ملک الشعرا کے لیے کسی طور مناسب نہ ہوتی۔ بہر صورت، جو بھی ہو، اللہ دلوں کے بھید جاننے والا ہے۔

ہم عصروں کے علاوہ بعض سخن نا آشنا کج فہم لوگوں نے؛ جن میں خاندان کے چند بڑی عمروں کے مصلحت ناشناس لفنگے بھی شامل تھے، حضرت پاپا کے طرزِ شعر خوانی پر اور اس عاصی کی پاکھنڈ پھیری پر نکتہ چینی بھی کی اور کہا کہ شاعر کے لیے اپنا کلام مجیروں کی سنگت میں نذرِ حاضرین کرنا معیوب ہے اور ایک نو عمر لڑکے کو مثل بچہ جمورا کے حاضرین میں کھڑتالیں اور مجیرے کھڑکانے کے لیے بھیج دینا سفلہ پن ہے اور چنناں ہے اور چنیں ہے۔ مگر پاپا غفرلہ، جانتے تھے کہ ہر اجتہاد کرنے والے کو، پٹی ہوئی روش سے ہٹ کر چلنے والے ہر مجدد کو، ایسی صورتِ حال کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ چنناں چہ انھوں نے دور اندیشی سے کام لیا، اپنی وضع نہ چھوڑی؛ معترضین میں سے بعض کو سمجھا بھجا کر یا ڈرا دھمکا کر، خوشامد درآمد سے یا پیسا کوڑی سے امداد بہم پہنچا کر، اور چند کو افرادی قوت استعمال کر کے شراٹگیزی سے باز رکھا۔ پاپا صاحب کی یہ نو طرزِ شعر خوانی بالآخر قبولیتِ عام حاصل کر کے رہی۔ یہ عاصی اسی طرزِ نو ایجاد پر آج

تک عمل پیرا ہے۔ اس بزرگ کی عطا کردہ مجیروں کی جوڑی آج بھی اس گنہگار کی بیاضوں کے متصل دھری رہتی ہے اور وقتاً فوقتاً کام آتی ہے کہ تحفہ درویش ہے۔ اللہ تعالیٰ ملک الشعرا شیخ ضمیر الحسن پنا کو اجر عظیم دے اور مرقدِ پنا کو کھنکھاتے ہوئے نور سے بھر دے۔

خاندان کے دوسرے بزرگ جنہوں نے اس ہیچ مداں کو اپنے کنزِ علم کے لعل و جواہر سے نوازا؛ تاؤ شجاع الدین رنجیدہ تھے جنہیں اس خاکسار کے پدرِ محترم، پیار سے بھائی افسوس کہہ کر پکارتے تھے۔ عوام الناس میں یہ ”رنجیدہ ڈپٹی“ کے نام سے پہچانے جاتے تھے، کس لیے کہ تاؤ مرحوم ڈپٹی کنزرویٹر فارسٹ تھے اور محکمہ جاتی فرائض کی بجا آوری کے دوران ہلاک ہو گئے تھے۔ محکمے کے ناظم اعلیٰ، مسٹر ایبرنا تھی پائن وڈ نے سرکارِ والا تبار سے ان کے لیے حسن کارکردگی کے تمنغے درجہ اول کی سفارش کی تھی۔ حسن کارکردگی کا یہ تمغہ مل بھی جاتا مگر ان کے برادرِ نسبتی نے جو وقتِ ہلاکت موقع پر موجود تھا اور تاؤ رنجیدہ سے خاصیت رکھتا تھا، محکمہ جاتی تفتیش کے دوران سفلی پن کا مظاہرہ کیا اور اپنے بیان میں دو اور گواہوں کی شہادتوں کے ساتھ یہ درج کرادیا کہ شیر نے جس وقت تاؤ غفرلہ پر حملہ کیا اس وقت وہ (تاؤ) لکروندوں کی جھاڑی کے عقب میں حوائجِ ضروری سے فارغ ہو رہے تھے۔ حکومتِ وقت تاؤ رنجیدہ کے حوائجِ ضروری کو یقیناً نظر انداز کر دیتی؛ مگر محکمے کی دستاویزات اور روزناموں کی جانچ پڑتال کے دوران یہ انکشاف ہوا کہ وقوعے کے روز تاؤ شجاع الدین جنت مکانی کو جائے حادثہ سے ساڑھے گیارہ سو میل دور ولایتِ کمایوں میں کسی خدائی خوار رینج پوسٹ کا معائنہ کرنا تھا؛ جس کے لیے مرحوم نے خود اپنے قلم سے روانگی درج کی تھی، ٹی اے وغیرہ کا چالان بھرا تھا اور رقم وصول کی تھی۔ چنانچہ کورٹ آف انکوائری بیٹھ گیا۔ خاندان کے بڑوں نے مسٹر پائن وڈ تک سفارشیں پہنچائیں؛ یہاں تک کہا کہ ٹی اے کی رقم، جو دو سو ستر سٹھ روپے کچھ آنے بنتی تھی، تاؤ کے ورثا سے لے کر خزانہ عامرہ میں جمع کرادی جائے گی۔ مگر پائن وڈ خبیث نے ایک نہ سنی۔ یہ مشکل تاؤ کے خلاف تادیبی کارروائی بعد از مرگ رکوائی گئی؛ جس کی سفارش کورٹ آف انکوائری نے کی تھی۔ پھر بھی اس ملعون مشرک نے تاؤ کی فائل پر سوگ کا سیاہ حاشیہ بنا کر لکھا کہ ”ایکس، ڈی، سی، ایف، دی لیٹ، ایس یور رنجیدہ جغرافیہ کا مجرم ہے۔ اسے موجودہ جائے حادثہ پر نہیں، بلکہ یہاں سے ساڑھے گیارہ سو میل دور ولایتِ کمایوں کی رینج پوسٹ نمبری ایک سو انتالیس کی کسی مقامی جھاڑی کے عقب میں حوائجِ ضروری سے فارغ ہونا تھا۔ پھر اگر

وہ زندہ بچ جاتا تو دوسو سڑھ روپے اتنے آنے کا حق دار ٹھہرتا اور مرجاتا تو تمغائے حسن کارکردگی درجہ اول پاتا۔ یا قسمت یا نصیب۔“

تاؤ رنجیدہ، انگریزی زبان پر جیسا عبور رکھتے تھے اس کے بیان کے لیے ایک الگ دفتر درکار ہے۔ مختصر عرض کردوں کہ ان کے حکام، جو بیش تر انگریزی نسل سے تھے، (جن میں وہ ملعون پائے وڈ بھی شامل تھا کہ جس کا اوپر ذکر ہوا ہے) اپنے اکثر مسودات نظر ثانی اور تصحیح کے لیے تاؤ رنجیدہ کے پاس بھجوا دیتے تھے۔ اہل شامت نے اڑا رکھا تھا کہ یہ مراسلے جو رنجیدہ ڈپٹی کو انگریزوں سے ملا کرتے تھے، دراصل جواب طلبی یعنی شوکاز کے نوٹس ہوتے تھے۔ واللہ اعلم بالصواب۔ بہر حال ان کی عربی اور فارسی دانی کا شہرہ چار دانگ عالم میں تھا کہ نجد و فارس سے ’مجتہدین زریکثر‘ صرف کر کے عربی و فارسی صرف و نحو کے مسائل پر تبادلہ خیال کرنے جبل پور، بانسواڑے، کٹنی، رائے پور، ساگر، غرض جہاں جہاں تاؤ جنت مکانی کا قیام ہوتا، آیا کرتے تھے اور تاؤ کے لسانی اجتہاد سے، کہ جو کبھی کبھی لسانی فساد پر منتج ہوتا، فیض اٹھاتے تھے۔ تاؤ غفرلہ کو اللہ نے سوز و گداز سے مملو آواز دی تھی۔ اس پر ان کا بتا کر پڑھنا گویا سونے پر سہاگے کا کام کرتا تھا۔ ترنم کے ساتھ ”ما مقیمان کوئے دلداریم“ سناتے تو مصرعے کی تصویر بن جاتے۔ ان کے ماموں اور میرے رشتے کے دادا شیخ عبد الجلیل محنت کسمندوی چیچک رو تھے اور رائے پور میں دلدار حسین قصاب کی گلی میں ایک نزاع میں مجروح ہو کر فوت ہو گئے تھے۔ تاؤ رنجیدہ کو ان کی عبرت ناک موت کا صدمہ تا عمر رہا۔ اکثر دادا عبد الجلیل محنت کو یاد کرتے تھے۔ ان گنہگار آنکھوں نے یہ سماں دیکھا ہے کہ تاؤ رنجیدہ، ترنم کے ساتھ ”ما مقیمان کوئے دلداریم“ پڑھتے اور اشاروں سے مصرعے کی شرح کرتے جاتے۔ عجب منظر ہوتا۔ تاؤ مغفور بھیروں ٹھاٹھ کی کسی راگنی میں ارشاد فرماتے ”ما آ آ آموں ںں“ اور اپنے چہرے پر تیزی سے انگلی مار مار کر گویا چیچک کے نشانات کا اشارہ کرتے، یعنی اپنے ماموں (اور میرے دادا) عبد الجلیل محنت کا سوانگ بھرتے۔ پھر سیدھے ہاتھ کو دلدار حسین قصاب کے بغدادی کی طرح تول کر تیزی سے دادا عبد الجلیل کا قیمہ بناتے اور رقت کے ساتھ فرماتے ”ماموں قیمہ“ پھر سم پر گویا زخمی ہو کر گر پڑتے اور ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہوئے بار بار کہتے ”نکوئے دلداریم۔ نکوئے دلداریم۔“ آنکھوں سے آنسو جاری ہو جاتے اور بھیروں ٹھاٹھ کی اسی راگنی میں لیٹے لیٹے بار بار مصرعے کی تکرار فرماتے رہتے کہ

”ماموں قیمہ نکوئے دلداریم۔ مامقیمانِ کوئے دلداریم۔“ اللہ بس باقی ہوں۔

تاؤ شجاع مرحوم کے بیان کو بھی ایک دفتر چاہیے۔ مختصراً عرض کرتا ہوں کہ بے عدیل بزرگ تھے۔ کسرِ نفسی کا یہ عالم تھا کہ اپنے تجرّ علمی کو بتخرّ علمی کہتے تھے۔ اکثر فرمایا کرتے تھے: ”میں عاصی بیچ میدان اپنے پرانے بڑے بڑے اکابرینِ سلف سے استفادہ حاصل کرتا ہوں۔ میرے پاس میرا اپنا کیا ہے۔ گھر کی مرغی دال مساوی۔“

سو یہی میں گناہ گار وحید العصر بھوتا بھی عرض کرتا ہوں اور اپنے ملفوظات کا پہلا دفتر اختتام کو پہنچاتے ہوئے وہی اگلی بات پھر دہراتا ہوں کہ کسی کے بزرگوں، علی الخصوص والد کے منہ بولے چچا کی جسمانی موت پر کھلکھلا کر ہنسنے بڑی ذلیل بات ہے۔ مگر اس بیان کی وضاحت کا اب موقع نہیں رہا۔ بشرطِ زندگی پھر کبھی عرض کروں گا۔ و ما توفیقی الا باللہ۔



مردہ گھر میں مکاشفہ

وہ میلی سی ٹوپی اوڑھے تھا۔ بار بار کے دھلے ہوئے ملگجے کپڑوں سے اس کی مالی ابتری کا اندازہ ہوتا تھا۔ آنکھوں سے لگتا تھا کہ روز سرمہ لگاتا ہے۔ مجموعی طور پر وہ نیک دکھائی دیتا تھا۔

میں نے اسے این اوسی دکھایا تو تپاک میں وہ دہرا ہو گیا، کہنے لگا، ”اس کی کیا ضرورت تھی جناب! ویسے اگر ساتھ میں آپ دو فوٹو ٹے ٹ کاپیاں بھی لے آتے تو بڑی مہربانی ہوتی۔“

میں نے اپنا لفٹن بکس اور تھر موس اٹھایا اور جانے کو ہوا تو وہ بڑی نیکی سے ہنسا اور کہنے لگا، ”ابھی رہنے دو جناب! دوبارہ کہاں جاؤ گے۔ پھر کبھی آؤ تو خیال رکھنا۔ آپ اپنے ہی آدمی ہو۔“ مجھے بڑی حیرت ہوئی، میں اس کا آدمی نہیں تھا تو پھر وہ ایسا کیوں کہہ رہا تھا۔

بہت مشکلوں کے بعد مجھے این اوسی ملا تھا۔ میں نے بائیس صفحوں کا سوال نامہ بھرا تھا، ایک سو چالیس تصدیق ناموں، حلف ناموں، رکنیت ناموں، استحقاق ناموں اور عزا داری کی پرچیوں کی نقلیں فراہم کی تھیں؛ ساتھ میں طبی جدولیں اور دندان سازی کے چارٹ مہیا کیے تھے، تب کہیں جا کے مہینوں میں مجھے یہ این اوسی ملا تھا۔ میں کسی کا آدمی ہوتا تو کاہے کو

مجھے یہ کھلیڑاٹھانی پڑتی۔ مگر میں خاموش رہا، مجھے صبح سے شام تک اس آدمی کی معیت میں وقت گزارنا تھا اور میں نہیں چاہتا تھا کہ صبح ہی صبح اسے ناراض یا بیزار کر دوں۔

میں نے ٹفن بکس اور تھرموس دوبارہ فرش پر رکھے تو وہ بولا، ”جناب! آپ انہیں اوپر رکھ دو آرام سے۔ کوئی حرج نہیں ہے۔“ اس نے میرے ٹوکنے سے پہلے میرا تھرموس اور ٹفن بکس اٹھایا اور دونوں قریبی سلیب پر پڑی لاش کے سینے پر رکھ دیے۔

”ایلو جناب! اب آپ بھی آرام سے بیٹھ جاؤ۔“ یہ کہتا ہوا وہ کونے کی طرف بڑھا اور وہاں سے ایک پہیہ ٹوٹی وھیل بیرو کھینچ لایا۔ ”میں تو جی ڈیوٹی پر ہوں، شام تک کھڑا رہوں گا، آپ اس میں بیٹھو آرام سے۔“ وہ ہنسا، ”بے کار پڑی ہے۔ برف تو اب آتی نہیں۔“

”کیوں، برف کیوں نہیں آتی؟“

”آپ تو جانتے ہیں ناجی، برف اب کدھر آتی ہے۔“

میں نہیں جانتا تھا؛ لیکن میں چپ رہا اور دھیرے دھیرے چلتا ہوا وھیل بیرو (Wheel Barrow) کے پاس پہنچ گیا۔

”میں نے تو جی کتنی بار لکھوا کے پہنچوایا کہ ادھر ایک بیچ ڈلوادو، بڑے بڑے عزت والے لوگ آتے ہیں، مگر جی کوئی سنتا ہی نہیں ہے۔“

اس نے یقیناً لکھوا کر پہنچوایا ہوگا، مگر کیوں کہ میں حتمی طور پر یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا، اس لیے چپ رہا۔

وہ میرے این اوسی کی چار تہیں بنا چکا تھا۔ اب اس نے اسے اپنی بنڈی کی اندرونی جیب میں رکھ لیا، پھر بڑے تجسس سے پوچھنے لگا، ”آپ تصویر بھی بناؤ گے جی یا صرف ’مشاہدہ‘ کرو گے؟“ وہ صرف کو صرف اور مشاہدے کو ہائے خطی سے ادا کرنے کی کوشش کر رہا تھا؛ مگر اس میں حرج کچھ نہیں تھا اس لیے میں نے جواب دیا کہ میں تصویر نہیں بناؤں گا۔

میرا جواب سن کر وہ اثبات میں سر ہلاتے ہوئے بڑی چالاکی سے اپنی بنڈی کی جیب تھپکنے لگا۔ اسی جیب میں کچھ دیر پہلے اس نے میرا این اوسی رکھا تھا۔ کہنے لگا، ”ہاں جی بالکل ٹھیک کہہ رہے ہو آپ، سفید این اوسی صرف مشاہدے کا ہوتا ہے۔ اس پے تصویر بنانے کی اجازت نہیں ہوتی۔ تصویر والا این اوسی نیلا ہوتا ہے۔ نیلا آج کل دے نہیں رہے کسی کو، حالات صنی نہیں ہیں۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا، وہ کہنے لگا، ”تو ٹھیک ہے جی آپ

بیٹھیں، میں ذرا نکا کھول دوں، گرمی ہوگئی ہے۔“

اس نے کونے میں لگا نکا کھول دیا تو یکساں آواز کے ساتھ پانی بہنے لگا۔ میں نے دیکھا، نل والے کونے سے ایک نالی شروع ہوتی تھی جو کوئی بالشت بھر چوڑی تھی اور فرش میں خاصی گہری بنائی گئی تھی۔ یہ نالی لاشیں رکھنے والے چاروں سلیبوں کا چکر لگاتی ہوئی مردہ گھر کی مغربی دیوار کو چھیدتی کہیں باہر نکل جاتی تھی۔ نالی جہاں سے دیوار کے پار جاتی تھی وہاں ایک مضبوط جالی لگی تھی۔ شاید چوہوں، تل چٹوں اور ناپسندیدہ چیزوں کو آنے سے روکنے کے لیے یہ انتظام کیا گیا تھا۔

اس نے نل کھولا، تو مہارت کے ساتھ بنائے نالی کے ڈھال پر پانی تیزی سے بہنا شروع ہو گیا۔ کچھ ہی دیر میں آس پاس ہلکی سی خنکی کا احساس ہونے لگا۔

”آپ نے دیکھا جناب! عسولاً تو یہاں برف کی ضرورت ہی نہیں پڑنی چاہیے۔“ اس نے اصولاً کو عسولاً کی طرح ادا کیا تھا جو ظاہر ہے، بے معنی لفظ تھا۔ کہنے لگا۔ ”بَرَف نہیں بھیجتے تو نہیں ناں بھیجیں، یہاں پانی کی ٹھنڈک ہی کافی ہوتی ہے جناب! ویسے میرے پاس یہ بھی ہے۔“ اس نے مجھے سیاہ صابن دانی جیسا ایک ٹرانزسٹر ریڈیو دکھایا۔ یہ ٹرانزسٹر ریڈیو اس نے کالی ریشمی ڈوری کی مدد سے اپنی کلائی میں پہن رکھا تھا۔ کہنے لگا، ”اگر کبھی خدا نخواستہ تعفن پھیلنے کا خطرہ ہوتا ہے جناب! تو میں اسے چلا دیتا ہوں۔“

اس نے ٹرانزسٹر چلا دیا۔ کوئی فضول سی عورت ایک فضول سالمی نغمہ گا رہی تھی جس میں وطن کی بلائیں لینے اور اس کے چہرے پر نظر کا ٹیکا لگانے کا ارادہ ظاہر کیا گیا تھا۔ میں نے نغمہ سنتے ہوئے یہ بات نوٹ کی کہ طبلہ بجانے والا، دوسرے تمام سازندوں اور اس فضول سی عورت پر حاوی آ گیا تھا۔ ٹھیکے ہی سے پتا چل رہا تھا کہ اپنی اس کامرانی پر بہت خوش ہے اور اب کسی کو پنپنے نہیں دے گا۔ میں مسکراتے مسکراتے رک گیا۔ یہ مسکرانے اور اس طرح کی باتیں نوٹ کرنے کی جگہ نہیں تھی۔

وہ میری طرف دیکھ رہا تھا، پہلے مسکرایا، پھر خوش دلی سے ہنسا، کہنے لگا، ”یہاں سب چلتا ہے جناب! آپ آرام سے مسکراؤ۔ خیر ہے۔ یہاں کوئی نہیں دیکھتا۔ ویسے جناب! بات کیا تھی؟“

وہ ابھی تک مسکرا رہا تھا۔ ظاہر ہے ایسی صورت میں اسے اصل بات میں کیسے بتا

دیتا۔ خاموش رہنا بھی مناسب نہیں تھا، اس لیے میں نے ٹالنے کو کہہ دیا کہ میں برف کے بارے میں سوچ کر مسکرا رہا ہوں۔ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گیا، کہنے لگا، ”ہنسنے کی بات نہیں ہے جناب! رونے کا مقام ہے۔ مجھ سے پہلے جو اس جگہ ڈیوٹی دیتا تھا اس کا رشتے کا بھائی شہر میں سوڈے لیمن کی ریڑھی لگایا کرتا تھا۔ وہ روز آتا تھا اور ساری برف اٹھالے جاتا تھا اور یہاں لاشیں پڑی سڑتی رہتی تھیں۔ تو بہ تو بہ رہا میرا! دیکھیں ناں جی آدمی کو اس قدر بے حس بھی نہیں ہونا چاہیے جی۔ مرنا سب نے ہے۔“

مجھے اُس بے حس، خبیث، لالچی آدمی کی حرکت کا سن کر بہت تکلیف پہنچی تھی۔ مگر اب کیا کیا جاسکتا تھا، بات پرانی ہو چکی تھی اس لیے میں سر جھکا کر وہیل بیرو میں بیٹھ گیا۔ وہ کہنے لگا، ”لاچ میں آدمی کس حد تک گر سکتا ہے جناب! آپ ’عندازہ‘ نہیں لگا سکتے۔“ یہ کہہ کر اس نے نیک آدمیوں کی طرح ٹھنڈی سانس لی۔ ”ہاہہ!“ بے حس آدمی کی خباثت کو یاد کر کے وہ بہت اداس ہو گیا تھا۔ میں نے تسلی کے الفاظ کہنے کے لیے اس کی طرف رخ کیا اور دیکھا کہ وہ تو خود سر گھمائے بغیر، صرف پتلیاں پھرا کر، چالاکی سے میرا ردِ عمل دیکھنے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس وقت پہلی بار مجھے شک ہوا۔ میں سوچنے لگا ممکن ہے اتنا نیک نہ ہو جتنا وہ نظر آتا ہے۔ تاہم بدگمانی اچھی چیز نہیں ہوتی۔ میں نے اس خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور کچھ اور سوچنے لگا۔

مگر وقت اور جگہ دونوں ایسے تھے کہ زیادہ دیر تک کچھ بھی سوچنا ممکن نہیں تھا۔ میں نے نوٹ کیا تھا کہ یہاں برابر کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا ہے جو سوچنے کے عمل کو روک روک دیتا ہے۔ اس وقت بھی دو باتیں ایک ساتھ ہونے لگیں۔ کونے والے نل سے شروع ہو کر جو ڈھلوان نالی سلیبوں کے چکر لگاتی مردہ گھر سے باہر چلی جاتی تھی۔ میں نے اس کے بہتے ہوئے پانی میں ایک تل چٹا دیکھا؛ جب وہیل بیرو میں بیٹھے بیٹھے گردن اچکا کر میں نے اس منظر کی تصدیق کرنا چاہی، تو اس نے اپنے ہاتھ میں پہنے ہوئے ٹرانزسٹر ریڈیو کی آواز ایک دم بڑھا دی۔ حیرت ہے، میں نے سوچا، آخر اسے یہ سب کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ مگر ایسی کچھ زیادہ حیران ہونے والی بات بھی نہیں تھی، مجھے ان سب باتوں کے لیے تیار ہو کر آنا چاہیے تھا۔

دوسری سب تیاریاں تو میں کر کے آیا تھا۔ ٹفن بکس اور تھر موس تک لے آیا تھا۔

دونوں چیزیں سامنے سلیب پر رکھی تھیں۔ انھیں دیکھ کر مجھے یاد آیا کہ میں دوپہر کے لیے آلو کی قتلیاں تلو کر لایا ہوں۔

میں تشویش کے ساتھ اٹھ کھڑا ہوا۔ مجھے ٹفن بکس ہٹا دینا چاہیے۔ قتلیاں، ٹفن بکس میں رکھتے وقت بہت گرم تھیں۔ نچلے خانے میں ہونے کی وجہ سے قتلویں کی تمام گرمی اس وقت لاش کے سینے میں منتقل ہو رہی ہوگی۔

مجھے وکیل بیرو سے اٹھتے دیکھ کر اس نے ریڈیو بند کر دیا اور خصوصیت سے دیکھتا ہوا میری طرف بڑھا:

”کیا بات ہے جناب؟ آپ آرام سے نہیں بیٹھ سکتے؟“

”یہ یہاں سے ہٹانا ہے۔“

”یہاں سے ہٹاؤ گے تو پھر کہاں رکھو گے؟“

”یہ الماری جو ہے سامنے۔“

”ہاں ہے تو؟ الماری کا کیا کرنا ہے؟“

”اسے کھولو، میں ٹفن بکس اور تھرموس اندر رکھوں گا۔“

”الماری نہیں کھلتی جناب!“

”کیوں؟“

”دیکھو جناب! میں نے آپ سے این اوسی کے دو فوٹو سٹے ٹ مانگے تھے جو آپ

پیش نہ کر سکے۔ یہ تو میری مہربانی تھی جو پھر بھی آپ کو...“

”مجھے نے روکا تھا۔ میں تو کاپیاں بنوانے جا رہا تھا... اس میں کیا ہے... ٹھیک ہے۔

اب لے آتا ہوں۔“

وہ بہت فتح مندی سے بولا، ”اب تو ٹائم گزر گیا جناب! شام سے پہلے آپ باہر

نہیں جاسکتے، نہ کوئی اب یہاں آسکتا ہے۔ آڈریہی ہے۔“

”کمال ہے! کس قسم کے آدمی ہو تم؟“

”دیکھ لو... اپنا تو یہی ہے۔“ کہہ کر وہ دوبارہ ریڈیو چلانے کو ہوا، مگر کچھ سوچ کر

کلائی کی گھڑی دیکھنے لگا۔ گھڑی دیکھتے ہوئے اس نے بڑی نیکی سے اپنے سر پر ٹوپی ٹھیک کی

اور ”ایلو جناب!“ کہہ کر وہ دوسرے سلیب پر چڑھ گیا، جو مجھ سے دور اور دیوار کے بالکل

قریب تھا۔ میں سمجھا اب یہ اپنا دن کا کام شروع کرنے والا ہے۔ مگر اس نے عجیب حرکت کی: سلیب پر کھڑے کھڑے، میری طرف دیکھتے ہوئے، اس نے دیوار کا سہارا لیا اور میلے کپڑے سے ڈھکی ہوئی، تلے اوپر رکھی، تینوں لاشوں پر جوتوں سمیٹ چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ لاشیں ابھی سخت نہیں ہوئی تھیں اس لیے اسے چڑھنے میں مشکل پڑ رہی تھی۔ میں نے دیکھا، وہ بری طرح ڈگمگانے لگا ہے۔ ایک بار گرنے کو ہوا تو اتر آیا، میری طرف دیکھتے ہوئے کھیانی ہنسی ہنسا، اور دوبارہ لاشوں کے پیروں کی طرف سے چڑھنے کی کوشش کرنے لگا۔ بالآخر دیوار کا سہارا لیے وہ سب سے اوپر والی لاش کی رانوں پر پیر جماتا، پیٹ پر سے ذرا سا چھل کر سینے پر کھڑا ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ وہیں سے کھڑے کھڑے اس نے داد طلب نظروں سے میری طرف دیکھا اور بولا، ”دیکھا جناب آپ نے؟“

میں نے کوئی جواب نہ دیا۔ اس نے بہ ظاہر بے تعلقی سے میری طرف پشت کر لی۔ لمحے بھر کو دیوار کی طرف منہ کیے خاموش کھڑا رہا۔ یا شاید وہ منہ ہی منہ میں کچھ کہہ رہا تھا جو میں سن نہ سکا۔ شاید وہ مجھے سنا بھی نہیں رہا تھا۔ پھر وہ بالکل خاموش ہو گیا۔ اب اس نے اپنے دونوں بازوؤں کو ڈنٹر پلٹتے ہوئے پہلوان کی طرح خم دے کر، بازوؤں پر اپنے بدن کا سارا زور ڈال دیا، اور دیوار کی طرف اپنا چہرہ بڑھایا۔ وہ شاید وہاں کسی قسم کا نشان تلاش کر رہا تھا۔ میں نے غور کیا تو دیکھا؛ وہ دیوار پر ٹنگی ایک فریم کی ہوئی پینٹنگ کی طرف جھک رہا تھا۔ اس نے فریم کے شیشے سے ایک بار اپنے ہونٹ مس کیے اور ہٹ گیا۔ پھر اس نے گھوم کر میری طرف نظر کی اور فاتحانہ انداز میں مسکرانے لگا۔ مسکرا چکا تو اوپر والی لاش کے حلق پر دونوں پیر جمائے لمحے بھر کو کھڑا رہا۔ پھر جست لگانے سے پہلے، کسی ایتھلیٹ کی طرح، اس نے اپنے گھٹنے ذرا خم کیے اور زرخرے پر سے فرش پر چھلانگ لگا دی۔

سلیب کے پاس کھڑے کھڑے اس نے مجھ سے کہا، ”دیکھا جناب والا آپ نے؟“

تو یہ ہے!“

اس کی یہ ساری کارروائی میرے لیے حیران کر دینے والی اور لایعنی تھی۔ میں خاموش رہا اور دیوار کی طرف دیکھنے لگا۔ میں نے پہلے توجہ نہیں دی تھی؛ مگر اب جو پینٹنگ پر غور کیا تو دیکھا وہ کسی قسم کی خطاطی کا شاہ کار تھا۔ کسی نے بہت عرق ریزی سے نیلی زمین پر زرد رنگ استعمال کرتے ہوئے دو لفظ لکھے تھے ”ہاہا“ میں نے دو لفظ اس لیے کہے کہ لکھنے

والے نے ایک ”ہا“ ایک طرح لکھا تھا اور دوسرا ”ہا“ دوسری طرح۔ بس دو ہی سِلے ہلے (Syllables) تھے ”ہاہا“۔ اور اس شخص نے اتنی دقت اور مصیبت کے ساتھ سلیب اور لاشوں پر چڑھ کر اس ”ہاہا“ کو بوسہ دیا تھا! مگر کیوں دیا تھا؟ یہ بات میری سمجھ سے باہر تھی۔

میں بہت دیر سے بڑی بڑی باتوں پر خاموش رہا تھا؛ مگر یہ جاننا تو ہر صورت میں ضروری تھا کہ اس نے جو کچھ کیا، کیوں کیا، اس لیے میں نے پوچھ ہی لیا۔ وہ بولا، ”جناب والا! کیوں کا جواب تو کوئی بھی نہیں دے سکتا۔ آپ کو پہلے بھی کوئی جواب نہ ملا ہوگا۔ تو اب تک آپ کو عقل آجانی چاہیے تھی۔“

اس نے حسبِ توقع، عقل کو عقل کہا تھا۔ میں خاموش رہا تو وہ بولا، ”دیکھیں ناں جی۔ پیٹ تو سب کے ساتھ لگا ہوا ہے۔“

میں اس کی بات سن کر گھبرا گیا۔ ہائیں! ان باتوں کا پیٹ سے کیا تعلق؟

وہ ہنسا۔ ”آپ سے دل مل گیا ہے جی اس لیے بتائے دیتا ہوں، ورنہ آپ تو جانتے ہیں کہ بڑ بڑ بڑ بڑ بڑ“ وہ آگے بھی بہت کچھ کہتا رہا لیکن میں اس کے ریڈیو کے شور میں کچھ بھی نہ سن سکا۔ سن بھی لیتا تو کچھ زیادہ فرق نہ پڑتا، اس لیے کہ وہ عیاری کی باتیں کر رہا تھا اور چالاکی سے آنکھیں چلاتا ہوا مسکرا رہا تھا۔

اس کے بارے میں اڑائی گئی افواہیں مجھے اس وقت حرف بہ حرف سچی لگیں۔ مگر بنا کسی ثبوت کے ان افواہوں پر پوری طرح یقین بھی تو نہیں کیا جاسکتا تھا۔ اس نے اپنی صورت، ٹوپی اور بندھی؛ تینوں چیزیں اتنی نیکی سے پہن رکھی تھیں کہ افواہوں کو اس سے منسوب کرتے کچھ عجیب سا لگتا تھا۔

مگر اس نے ٹھیک کہا تھا کہ مجھے اس وقت تک عقل آجانی چاہیے تھی۔

میں اس عرصے میں وہیل بیرو سے اٹھ کھڑا ہوا اور اس سلیب کی طرف خاصا بڑھ آیا جس سے ٹیک لگائے وہ کھڑا تھا۔ اپنی عیار باتوں کے جوش میں اس نے دھیان ہی نہ دیا کہ میں اتنا آگے بڑھ آیا ہوں۔ چناں چہ، جب میں نے آنکھ بچا کر لاشوں پر ڈھکے ہوئے میلے کپڑے، کا ایک کونا چٹکی سے پکڑا اور ایک ہی جھٹکے میں کھینچ کر اسے دور پھینک دیا، تو وہ ہڑبڑا گیا اور کچھ کرنے کو ہوا؛ مگر اب کچھ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ سلیب کی تینوں لاشیں میرے اور اس کے سامنے کھلی پڑی تھیں۔

میں نے دیکھا مُردوں کے بدن کے سب بال مونڈ دیے گئے تھے؛ حد یہ کہ پلکیں تک اتار لی گئی تھیں؛ اور مونڈنے والے نے اناڑی پن میں استرا چلاتے ہوئے جگہ جگہ سے لاشوں کے پوٹے تک کاٹ دیے تھے۔ ہر لاش کے رب کیج (Rib cage) کو ۸ کے ہندسے کی شکل میں کاٹا گیا تھا اور سب سینے جام کی کسوت کی طرح کھلے پڑے تھے۔ ایک ہی نظر میں اس کارروائی کی وجہ سمجھ میں آ جاتی تھی۔

میں نے دیکھا اوپر کی لاش کے پھیپھڑے، معدہ، دل اور جگر وغیرہ؛ جو کبھی اندر سے کھینچ کر نکالے گئے ہوں گے، پھر واپس نہیں رکھے گئے تھے۔ اس بنیادی کمی کو یوں پورا کرنے کی کوشش کی گئی تھی کہ لاش کے جینیٹلز (genitals) تراش کر سینے میں بھر دیے گئے تھے جو اس وقت بڑی بے چارگی سے ایک کونے میں پڑے تھے، کیوں کہ بیدار نہ ہوں تو بدنصیب جگہ ہی کتنی گھیرتے ہیں۔ میں نے ان کی فطری جگہ پر نظر ڈالی تو دیکھا کہ وہاں بہت عیاری اور منافقت سے چاندی کے ورق لگا کر جینیٹلز کی غیر حاضری چھپانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس کوشش میں بلاشبہ ناکامی ہوئی تھی۔

جب میں نے اس کی طرف دیکھا تو شرمندہ ہونے کے بجائے وہ بڑی ڈھٹائی سے ہنسنے لگا، بولا، ”میں نے جناب کو پہلے ہی اَرْض کیا تھا کہ پیٹ تو سب کے ساتھ لگا ہوا ہے۔“ وہ پھر پیٹ کا حوالہ دے رہا تھا۔ عرض کو ”اَرْض“ کہتے ہوئے بھی اسے شرم نہ آئی۔ میں کہنے کے لیے کوئی سخت بات سوچ ہی رہا تھا کہ وہ مصالحت کے انداز میں بولا، ”دیکھو ناں جی! ایک تو آدمی سسرال والوں سے بڑا آجڑ ہوتا ہے۔“ اور وہ بے آواز ہنسنے لگا۔

میں نے نوٹ کیا کہ اسے جہاں عین کا استعمال کرنا چاہیے تھا، وہ وہاں الف کا بے دریغ استعمال کر رہا تھا۔ نیکی کا پول کھل چکا تھا، اسی لیے اس کی عینیں ختم ہو چکی تھیں، اس کی ہائے حطی کا بھی دور دور پتا نہیں تھا۔

خیر، وہ کہنے لگا، ”دیکھو جناب! سسرال والوں کے ساتھ میل ملاپ سے رہنا پڑتا ہے۔ ایک ہی سالا ہے میرا۔ پوشش کا کام کرتا ہے۔ ایک بار بولا بھائی جی، صوفے میٹر لیس میں بھرنے کے لیے مال نہیں ملتا۔ اگھتر کے بعد سے پٹ سن ملنا بند ہو گیا ہے اور روئی پڑتی ہے جی بہت مہنگی۔ تو آپ کو بھائی جی، اَلَا تالا نے اِڑت دے رکھی ہے اور کہنے لگا بھائی جی، آپ کی ذمہ داری میں جو سارا مال پڑا ہے وہ صنایا ہی جاتا ہوگا۔ ہی ہی ہی۔ پھر کہنے لگا کہ

بھائی جی، لاشوں کو فرق کوئی نہیں پڑے گا۔ بھلے ہی اوپر بال ہوویں، بھلے ہی نہ نہ ہوویں۔ ہی ہی ہی۔ بڑا ہی مشکرا ہے۔ مگر بات صُحی کہہ رہا تھا۔ ایں نا جناب؟ تو آپ سمج گئے نا جی؟ سسرال والوں کے ساتھ تو جی میل ملاپ کے ساتھ رہنا ہی پڑتا ہے۔“

اب وہ سلیب کے پاس سے ہٹ گیا تھا اور خوشامد میں ہاتھ ملتا ہوا میری طرف آرہا تھا۔ ”یہ خادم، جناب! فل ہال آپ کی اور کوئی خدمت تو کر نہیں سکتا۔ یہ بتائیں جناب! آپ کا کوئی مُرگی شُرگی کا فارم ہے؟ کوئی چڑیا شُر یا پالنے کا شوق ہے آپ کو؟ تکلف کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ اس نے بازو لہراتے ہوئے مردہ گھر کے پورے منظر کو اشارے میں لے لیا اور بولا: ”دیکھیں نا جناب! ادھر کتنے ہی من پڑا خراب ہوتا ہے۔ پرندے و گیرہ بھی تو اسی کی مخلوق ہیں جناب! خراب ہونے سے تو اچھا ہے یہ سب اس کی مخلوق کے کام آجائے۔“ اس نے عقیدت کے ساتھ دیوار پر ٹنگی پینٹنگ کی طرف دیکھا اور نیکی کے ساتھ آہ بھری۔ ”ہاہہ! اگر جناب! آپ اپنے ٹفن بکس کا ایک دو خانہ خالی کر دیویں تو جی، بڑی مہربانی ہوگی۔ فل ہال تو جناب والا! آپ کی بس یہی خدمت کر سکتا ہوں۔“

خود اپنے بارے میں اب یہ بتانا ضروری ہو گیا ہے کہ میں جلد مشتعل ہونے والا آدمی نہیں ہوں۔ ہیجان اور تشدد سے دور رہنا چاہتا ہوں۔ لیکن اس وقت اس کی باتیں سنتے ہوئے میں انتشار اور ہیجان میں کاپنے لگا۔ اس لیے ضروری ہو گیا تھا کہ میں یہ جگہ چھوڑ دوں۔ میں نے اپنا ٹفن بکس اور تھر موس اٹھایا اور مردہ گھر کے دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ شخص میرا ارادہ بھانپ گیا تھا؛ اس لیے دروازے کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ اب وہ بالکل بدلا ہوا آدمی تھا۔ اپنے سفید، سفاک دانتوں کی نمائش کرتا ہوا وہ میرے راستے میں کھڑا تھا اور جس طرف سے بھی میں دروازے تک پہنچنا چاہتا تھا، وہ مجھ سے پہلے پہنچ کر میری راہ بند کر رہا تھا۔

میں پیدائشی خوف زدہ آدمی نہیں ہوں۔ مگر یہاں گزارے ہوئے وقت نے میرا پٹا پانی کر دیا تھا۔ میں اپنے پائینچوں میں کھڑا کاپنے لگا۔ ہاتھ میں اٹھائے ہوئے ٹفن بکس اور تھر موس ایک دوسرے سے ٹکرا رہے تھے، یہ دہشت کا لٹے ٹو (Tattoo) تھا، اس وقت مردہ گھر میں اگر کوئی آواز تھی تو یہی تھی۔

اس نے میرا خوف دیکھ کر فتح مندی کے ساتھ کئی بار ”ہاہا“ کہا۔ یہ دیوار کی پینٹنگ والے سلے بلز تھے۔ کچھ ہی دیر پہلے اس نے بڑی وقت اور عقیدت کے ساتھ انھیں چوما تھا۔

اب وہ انھیں میرے خلاف استعمال کر رہا تھا۔ میں پوری طرح گھر چکا تھا اور دہشت کے ٹٹو اور اس کی ”ہاہا“ کے درمیان کوئی بے ہمتی کا فیصلہ کرنے ہی والا تھا کہ کسی نے ہلکے سے دستک دی۔

یہ باہر کی آواز نہیں تھی؛ کسی نے الماری کا پٹ تھپتھپایا تھا۔ کوئی الماری کے اندر تھا! مگر الماری کے اندر کون ہو سکتا ہے؟ مردہ گھر کی الماریوں میں موت کے سوا کون ہوگا۔ کیا یہ میری سماعت کا دھوکا ہے؟ مگر نہیں وہ آواز پھر آئی۔ اس مرتبہ اس نے بھی وہ آواز سنی۔

اس نے وہ آواز سنی اور پیلا پڑ گیا۔ وہ الماری کی طرف بڑھنا چاہتا تھا کہ میں نے، جواب تک اپنے پائینچوں میں کھڑا لرز رہا تھا، اچھل کر اس کا رستہ روک دیا۔

اسے ناپسندیدگی سے گھورتے ہوئے میں نے الماری کے پٹ سے کان لگا دیے۔ اندر کوئی سانس لے رہا تھا اور دستک دیے جا رہا تھا۔ کوئی تھا جو باہر آنا چاہتا تھا۔ میرا دل مسرت سے بھر گیا۔

مردہ گھر میں میرے علاوہ کوئی اور بھی ہے، جو زندہ ہے اور باہر آنا چاہتا ہے۔

یہاں کوئی اور بھی زندہ ہے اور جینا چاہتا ہے۔



شہر گونے کا محض ایک آدمی

ایک ایسے آدمی کا تصور کیجیے جس نے کونے سے امام کو خط لکھا ہو کہ میرے ماں باپ فدا ہوں، آپ دارالحکومت میں ورود فرمائیے، حق کا ساتھ دینے والے آپ کے ساتھ ہیں۔ اور وہ آدمی اپنے وجود کی پوری سچائی کے ساتھ اس بات پر ایمان بھی رکھتا ہو، مگر خط لکھنے کے بعد گھر جا کر سو گیا ہو۔

جیم الف ایسا ہی ایک آدمی ہے (بلکہ شاید یہ وہی آدمی ہے) جسے مسلم بن عقیل کے واقعے کی خبر ملی تو اس نے زانو پیٹ لیے، گریباں چاک کیا اور بہت دیر تک روتا رہا۔ پھر اس نے سیر ہو کر کھانا کھایا اور سو گیا۔

ادھر گواہی دینے والے آسمان حشم سچوں نے نہر فرات کے کنارے خیمے گاڑے اور صبر کی تاریخ شروع ہوئی۔

جب دس ہزار دینار زادوں نے امام کے مقابل صف بندی کی تو یہ آدمی زیتون کے روغن میں اپنی روٹی چور چور کے کھا رہا تھا۔ پاس ہی دودھ سے بھرے پیالے میں حلب کے خرے پڑے بھیگتے تھے اور شیشے کے ایک ظرف میں کوئی عرق تھا اور یہ ظرف تنخ سے زیادہ سرد ہو رہا تھا۔

خبر ملی کہ اشترار آمادہ فساد ہیں، تو اس آدمی نے روغن میں سنے ہوئے دونوں ہاتھ

طمانیت کے ساتھ اپنے چہرے پر تلے اور کہنے لگا، ”امام حق کے ساتھ ہیں اور حق غالب آنے والا ہے۔“ پھر اس نے ڈکار لی، امام کو یاد کیا اور ان کے لیے، اور ان کی جماعت کے لیے اللہ کی نصرت طلب کی اور دسترخوان کے برابر پڑے تکیے سے ٹیک لگالی۔ پھر وہیں کروٹ لے کر سو گیا۔ جب خبر آئی کہ بچوں پر پانی بند کر دیا گیا ہے تو روتے ہوئے اس نے اپنے ہاتھ کی ایک ضرب سے عرق کے ظروف اوں دھادیے اور پکار کر کہنے لگا کہ وائے افسوس! سگ دنیا ابن زیاد نے اور اس کے زرخیز کتوں نے اپنی جانوں کو ہلاکت میں ڈال دیا! اس بار وہ بہت دیر تک رویا اور کرب و انتشار میں جاگتا رہا۔ کہیں صبح ہوتے ہوتے اسے نیند آئی۔

پھر پتا چلا کہ ایک پاکیزہ خصلت جوان، بچوں اور بیماروں کے لیے بھرا ہوا مشکیزہ لاتا تھا کہ بد خصالوں کے ہاتھوں شہید ہوا۔ یہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اب کے اس نے ایک پہر نالہ و شیون کیا اور سینہ زنی کی اور اب کے بھوک اور پیاس اور نیند اس سے رخصت ہو گئے اور یہ سوچتا رہا کہ کچھ کرے، اس لیے کہ ان صادقوں کے لیے اس کا دل خون روتا تھا۔

سو اس نے کچھ اور نہ کیا، بس گڑ گڑا کر دعا کی کہ بار الہا! تیرے محبوب کی آل اپنے گھروں سے نکلی ہے اور تو جانتا ہے کہ وہ لوگ حق پر ہیں اور تو ہی ان کا حامی و ناصر ہے۔ پھر کیوں کہ اس تمام کاوش سے یہ کسل مند ہو گیا تھا اس لیے روتے روتے اس نے کچھ دیر کو آرام کیا اور دیوار سے ٹکے ٹکے سو گیا۔

پھر کسی نے پکار کر کہا کہ سگ دنیا شمر ذوالجوشن نے کسی بھیانک جرم کے ارادے سے امام کی طرف گھوڑا بڑھا دیا ہے۔ تب اور تب ہی یہ چیخ مار کر اٹھا... یہ بالآخر اٹھا اور اس نے عجیب کام کیا کہ اپنے چہرہ کو سہارنے والی تھوئی جھٹکے سے اکھاڑ لی۔ اسے گرز کی مانند گردش دیتا ہوا نہر فرات کی طرف بڑھا؛ اور حق تو یہ ہے کہ لمحے بھر کو اس نے یہ نہ سوچا کہ اس چہرے کے نیچے اس کی عورت اور اس کے بچے بیٹھے ہیں۔

بلاشبہ امام کے لیے اس کی محبت حد درجے کی تھی۔

یہ چہرہ کی تھوئی اٹھائے دوڑا جاتا تھا اور شریروں، بد خصالوں، قاتلوں کے لیے اس کے پاس کلمات ناملائم تھے اور کبھی کبھی یہ فحش کلامی بھی کرتا تھا۔ اس لیے کہ سخت آزرده تھا۔ اور لگتا تھا کہ ان ہزاروں سگان دنیا کو، کہ جو بچوں، گواہی دینے والوں کو قتل کرنے آئے تھے، یہ اپنی مغالطات سے پارہ پارہ کر دے گا۔ اس کی فحش کلامی کچھ عرصے تک جاری رہی، پھر بند

ہو گئی۔ کس لیے کہ آگے مقامِ ادب تھا۔ آگے وہ مطہر سماعتیں تھیں جنہوں نے مقدس رسولؐ کو کلام فرماتے سنا تھا۔

تو بس ایک لمحے میں اس کی وابستگی اور اس کے باطن کی سچائی نے ظہور کیا اور اس ایک لمحے میں کہ شمر نجس کا وارِ امامؑ پر ہوتا، اور انسانی تاریخ کا سب سے بھیانک جرم سرزد ہو جاتا؛ اس ایک لمحے میں یہ شخصِ امامؑ اور قاتل کے درمیان کھڑا تھا۔ پھر اس نے ایک دل ہلا دینے والا نعرہ سر کیا اور اپنی ٹیڑھی میڑھی لٹھی سے ایسی ایک ضرب لگائی کہ شمر ذوالجوشن اپنے خود کی نجس چوٹی سے اپنے مرکب کے زنگ آلود نعلوں تک ہل کر رہ گیا۔ اور لکڑی ٹوٹ گئی۔ تب شمر نے گھوڑے کو مہمیز کیا اور اسے، جو بہت تاخیر سے، اور نہتہا ہی اپنے ذی حشم مہمان کی سپر بنے آنکلا تھا... اسے روندتا ملتا ہوا اپنے آخری جرم کی طرف بڑھ گیا۔ یہ شخص گرا... دودھ، پنیر، شہد اور روغنِ زیتون اور تازہ خرے سے پلا ہوا اس کا بدن امامؑ کے تصدق ہو گیا۔

اور پھر وہ آخری جرم سرزد ہوا جس نے ترائی پر چمکنے والے سورج کو سیاہ کر دیا۔ اور رات آگئی۔ اور رات میں کسی وقت بلند قامت گھوڑوں پر سوار حر بن ریاحی کے قبیلے والے آئے اور صرف اپنے آدمی کا لاشہ اٹھالے گئے۔

اور پھر زمرِ د اور یاقوت اور مشک اور عنبر کے بہتر تابوت لے کر تاریخ آئی، جس نے بہتر آسمان شکوہ لاشے سنبھالے۔ ان میں ایک سر بریدہ لاشہ صبر و رضا والے اور استقامت والے امامؑ کا تھا، کہ جن کا قدم بلندی پر تھا، سوانحیں بادلوں پر جگہ ملی۔

پھر سگانِ دنیا کے ورثا اپنے مسخ شدہ حرام مردے کھینچ لے گئے۔ اور میدانِ خالی ہو گیا۔ مگر یہ آدمی (کہ جس کی کہانی میں نے سنانی شروع کی ہے) یہ وہیں پڑا رہا۔ شمر کے گھوڑے کی لید میں سنے ہوئے اس کے سری پائے، بھیجا اور قیمہ وہیں پڑا رہ گیا؛ جسے صبح دم چیونٹیوں کی پہلی قطار نے دریافت کیا اور آہستہ آہستہ منہدم کرنا شروع کر دیا۔ اور یہ انہدام تادیر جاری رہا۔

تو ایک ایسے آدمی کا تصور کیجیے جس نے امامؑ کو خط لکھا ہو، اور خط لکھنے کے بعد گھر جا کر سو گیا ہو؛ مگر آخری لمحے میں اپنے باطن کی سچائی اور اپنی وابستگی کا اظہار کرے اور عجیب طرح سے مقبول بارگاہ ہو۔ ایک ایسے آدمی کا تصور کیجیے... یہ آدمی جیم الف ہوگا۔ (جس کی

کہانی میں اس وقت سنا رہا ہوں۔)

مگر جسے یہ چند سطریں لکھ کر میں نے سب سے پہلے سنائیں، وہ جیم الف تو ایک چھوٹے سے ملک کے چھوٹے سے گھر میں لکھ لکھا کر اپنے چھوٹے سے کنبے کو پال رہا ہے۔ وہ تو چھوٹی چھوٹی سبک باتوں سے گاتی، گنگنائی، دکھ سہتی ہوئی غزلیں بناتا ہے اور ایک چھوٹی زبان کے چھوٹی چھوٹی اشاعتوں والے جریدوں میں چھپوا دیتا ہے۔ کئی روشنائی میں اپنا نام چھپا ہوا دیکھ کر خوش ہو لیتا ہے۔ مشاعروں میں گا بجالیتا ہے۔ نہ کبھی اس سے بڑے گناہ سرزد ہوئے نہ اس نے خیر کا کوئی بڑا کام کیا۔ چھوٹی موٹی نیکیوں پر، اور ہلکی پھلکی معصیتوں پر اس کا گزارا ہے۔ میں نے سید الشہداء کے نام نامی کے ساتھ اس آدمی کا تذکرہ کرنے کی جسارت اس لیے کی کہ میں اس کی وابستگیاں بتا دینا چاہتا ہوں۔

تو سنئے، بات کوئی پرانی نہیں ہے۔ یہ آدمی ایک بار کسی مشاعرے میں بلوایا گیا تو میزبانوں سے کہنے لگا ”مجھے پیسے نہ دو۔ یہاں سے بیت اللہ قریب ہے، مجھے عمرہ کرادو۔ تمہارا کوئی زیادہ خرچ بھی نہ ہوگا۔“ پھر عمرہ کرنے گیا تو طواف کرتے ہوئے بے ڈھنگے پن سے دھاڑیں مار مار کے رونے لگا (سمجھو تو اتنی عمر میں اس سے یہی ایک نیکی صادر ہوئی ہے)۔... یا اسے اس کی بے بسی کہہ لو۔ کہہ رہا تھا: ”میں نے حرم شریف میں دنیا کے پہلے مظلوم اور مستقیم آدمی سے لے کر فلسطینیوں تک، سب کے لیے دعا کی۔ اور رونا مجھے اپنی ضلالت اور بے بسی پر آتا تھا کہ میں اگر کر بلا کے سن ہجری میں ہوتا، تو اپنے گھر میں پڑا کلپتا رہتا۔ مجھ میں اتنی استقامت بھی نہ ہوتی کہ جلانے کی لکڑی کھینچ کر ہی ظالموں کے سامنے جا کھڑا ہوتا اور گھوڑوں تلے روند دیا جاتا۔“ کہنے لگا، ”دیکھ لو میں یا سر عرفات کے سن ہجری میں ہوں اور سوائے گالیاں بکنے اور دعائیں مانگنے کے کچھ نہیں کر سکتا۔ میں تو کسی جارج ٹینک کے سامنے جا کھڑا ہونے کی ہمت نہیں رکھتا۔ مجھے گھر گھڑاتی ہوئی لوہے کی اس پٹی سے خوف آتا ہے جو لمحے بھر میں قیمہ بنا دیتی ہے... مگر میں ضمیر کی اس گھر گھڑاتی ہوئی آواز سے بھی قیمہ ہوا جاتا ہوں جو ہم میں سے اکثر کو سنائی دے رہی ہے۔“ اور آخری بات اس نے مجھ سے یہ کہی کہ بھائی! میں بھی اور تم بھی؛ اور ہم سب، اصل میں اپنی مصلحت اور منافقت کے کو فے میں آباد ہیں اور حق کے لیے جنگ کرنے والی کسی مستقیم Entity سے آنکھ نہیں ملا سکتے، خواہ وہ استقامت کی سب سے بڑی علامت حسین ہوں یا ہم عصر تاریخ کے فلسطینی۔

میں اس کا شانہ اپنے قلم سے چھوتا ہوں۔ یہ نائٹ بنانے کی رسم ہے... پہلے اس موقع پر قلم کی جگہ تلوار استعمال کی جاتی تھی... تو میں اسے مایوسی اور بے بسی کا نائٹ مقرر کرتا ہوں اور اس سے کہتا ہوں: کہ پیارے جیم الف! ہمیں ہمارے پنیر اور روغنِ زیتون اور خرے کھا گئے۔ اور پیارے جیم الف! چیونٹیوں کی پہلی قطار ہمیں دریافت کر چکی ہے کہ ہمارا انہدام کبھی کا شروع بھی ہو چکا۔

سواب اپنے گھر جاؤ اور کھانا کھا کر آرام کرو۔



برجِ خموشاں

میں ایک نو تعمیر عمارت میں ہوں۔

یہ ایک برج سا ہے۔

برج کسی نامقدس، ناہنجار ٹوٹم کی طرح ایک طرف جھک گیا ہے۔ ابتدا میں اسے گرے کا مرکز قرار دے کر عموداً نصب کرنے کا وعدہ کیا گیا تھا؛ مگر بنیادی بددیانتی سے کام لیتے ہوئے، اسے ٹیڑھا گرایا گیا۔ پھر زمین کی کشش دوسری سب چیزوں پر حاوی آگئی، اس لیے برج، زاویہ قائمہ بنانے سے قاصر رہا... اور ایک طرف جھکتا چلا گیا۔ جب یہ ہو چکا، تو خاموشی کے ساتھ طے کیا گیا کہ اب اسے صرف کریا کرم کے لیے استعمال کیا جائے گا۔ اس طرح، زندوں کے لیے تعمیر ہونے والی اس عمارت کو، برجِ خموشاں بنادیا گیا اور یہ بات مجھ سے چھپائی گئی۔

مجھے برج کے جھک جانے پر، یا اس کے نئے استعمال پر، یا بات کے چھپائے جانے پر کوئی اعتراض نہیں۔

اب تو کسی چیز پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔ اعتراض اسے کرنا چاہیے جس کے بس میں کچھ ہو۔ میرے بس میں کچھ نہیں ہے۔ صرف تماشا ئی ہونا میرے اختیار میں ہے، اس لیے میں صرف تماشا دیکھ رہا ہوں۔

میں سر اٹھائے برج خموشاں کے دہانے سے نظر آتے روشن آسمان کی طرف دیکھ رہا ہوں؛ اور دیکھ رہا ہوں کہ مردار خور پرندوں کے غول روشن آسمان کے مقابل آکر اسے ڈھک لیتے ہیں۔ ممکن ہے یہ بصری دھوکا ہو۔ (ٹیلی وژن پر ابھی ابھی یہی کہا گیا ہے) مگر میں اپنی ہڈیوں میں محسوس کر رہا ہوں کہ ابتلا کا آغاز ہو چکا ہے۔

خواتین و حضرت! مجھے گمان ہے کہ میں کسی حد تک زندہ آدمی ہوں اور غلطی سے یہاں موجود ہوں؛ کہ شاید یہ برج غلطی سے میرے گرد تعمیر کر دیا گیا ہے۔ اس لیے امید کرتا ہوں کہ آپ کا روایتی خداوند، مجھے اب چیخنے کی توفیق عطا فرمائے گا۔
(ایک آدمی کی چیخ، جس کے بعد سناٹا)



مرتبان — آوازوں کا ایک ناطک

میں : ایک مرد، زندگی کرنے کی رقت انگیز امنگ لیے ہوئے۔ حوصلے کے ساتھ سب عذاب جھیلتا ہوا، ہارتا ہوا۔

وہ : ایک روح زندہ۔ 'میں' کے لیے ایک چاہت، ایک دردمندی لیے ہوئے۔ جو کچھ ہو رہا ہے اس سے خوف زدہ، سوالوں سے بھری ہوئی، جواب لاتی ہوئی، معصوم۔

لینچ من (Lynchmen) کرخت، غیر انسانی، روبوٹ (Robot) آوازوں والے راکھشس؛ جو اپنے زمانی تسلسل میں کبھی سفید، کبھی سرخ، کبھی سبز رنگوں میں دستیاب رہے۔ یہ کسی بھی احساس کے بغیر، محض ایذا پہنچانے والی ایجنسیاں ہیں۔ انھیں اس سے غرض نہیں کہ ان کے بھیجے ہوئے عذاب کسی بے جان شے پر مرکوز ہیں یا کسی جان دار پر۔ یہ کسی نظریے، کسی نصب العین پر یقین نہیں رکھتے؛ یہ تو بس چیزوں کو حاصل کرنے، انھیں آخر تک اپنے قبضہ قدرت میں رکھنے یا حصول میں ناکامی پر انھیں پوری طرح تباہ کر دینے پر ایمان لائے ہیں۔

راوی : ہر قسم کے انوالومنٹ (involvement) سے بچنے والا (جیسے کہ سب راوی ہوتے ہیں)۔

[حاوی صوتی تاثر: ہوا کا جھونکا ایک چٹیل میدان سے گزرتا ہوا طوفانی جھکڑ بن جاتا ہے کیوں کہ اس منظر میں اس کے لیے کوئی رکاوٹ نہیں؛ بس درختوں، عمارتوں، ٹیلوں سے خالی ایک میدان ہے۔ کبھی کبھی ہوا کا زور ٹوٹ بھی جاتا ہے تاہم ہلکی ہوا مسلسل چلتی رہتی ہے۔]

راوی: (خوف زدہ خسی آواز میں، جو ہر کہانی کہنے والے کی پہچان ہے) یہ ایک خوب صورت منظر ہے۔ جلاوطنی کے تیسرے میل پر ایک وسیع و عریض میدان، درختوں اور عمارتوں سے خالی، حد نظر تک تروتازہ ہری دوب سے ڈھکا ہوا۔ اور سامعین! اس مرغ زار کے بیچوں بیچ خاردار تاروں سے ایک احاطہ کھینچ دیا گیا ہے اور احاطے کے بیچوں بیچ کھلے آسمان کے نیچے ایک آدمی کھڑا ہے، ایک صحیح و سالم آدمی۔ یہ احاطے کے عین وسط میں، کھلے آسمان کے نیچے... مگر نہیں! (راوی کی آواز خوف کی سسکی بن جاتی ہے) جی نہیں! اس کے سر پہ کھلا آسمان نہیں ہے کیوں کہ پورے احاطے پر شفاف محدب شیشے کی چھت پڑی ہے... اور... اور یہ چھت خم کھائے ہوئے دہرے مجوف شیشوں کی چار دیواری پر کی ہوئی ہے۔ خدایا! یہ تو ایک بہت بڑا ہوا بند مرتبان ہے اور اس... مرتبان کی استرکاری خاردار تاروں سے کی گئی ہے اور اس چوکور مرتبان کے بیچوں بیچ...

میں: میں ہوں! میں!

راوی: جی ہاں جیسا کہ میں نے بتایا یہ آدمی کھڑا ہے۔ اور یہ اکیلا ہے۔

میں: نہیں! میں اکیلا نہیں ہوں۔ 'وہ' بھی ہے۔

وہ: ہاں، میں بھی ہوں... میں... ہوں!

میں: 'وہ' میرے ساتھ ہے... اس لیے کہ میں زندہ ہوں۔

راوی: (پریشانی کے ساتھ بے بس آواز میں) مگر مجھے تو خاردار احاطے کے پار،

اس مرتبان میں صرف تم نظر آ رہے ہو۔ میں کسی اور کو نہیں دیکھ پا رہا، اور سامعین! یہ بہت عجیب بات ہے۔ میں... میں کسی جگہ میں نہیں پڑنا چاہتا۔ میں یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔ جی نہیں۔ خدا حافظ!

(گھبرائے ہوئے قدموں کی چاپ دور ہوتی ہے)

میں: (پکار کر) سنو! احاطے میں تو صرف میں ہوں۔ 'وہ' جو ابھی بولتی تھی میری

موجودگی میں شریک ہے۔ میرے ساتھ ساتھ ہے اور آزاد ہے۔ 'وہ' مجھ سے کلام کرتی ہے، مجھ سے پوچھتی ہے کہ...

وہ: تمہارے سب دن کہاں گئے؟

میں: میرے سب دن میرے پاس ہیں۔

وہ: پھر کیا پریشانی ہے؟

میں: میری آکسیجن ختم ہوتی جا رہی ہے۔

وہ: اچھا، تو تم اس مرتبان میں اپنی آکسیجن ساتھ نہیں لائے تھے؟

میں: جلا وطنی کے تیسرے میل تک جتنی آکسیجن لاسکا تھا، لے آیا تھا۔ وہ ختم ہو گئی۔

وہ: اور آکسیجن لے لو۔ کس کے پاس ہے؟

میں: جو خاردار تاروں اور شیشوں کے باہر بھی ہیں۔ ان کے پاس ہے۔

وہ: کون ہیں وہ؟

میں: (خوف کی سرگوشی) شش... آہستہ بات کرو، سن لیں گے۔ وہ لُنج من

(Lynchmen) ہیں مجھے لُنج (Lynch) کر دیں گے۔

وہ: ہونہ! میں نہیں ڈرتی۔ (چہکتی ہوئی آواز میں) اوپر دیکھو۔ چھت کے پار

سورج کس قدر بڑا ہے۔ آسمان کتنا نیلا اور کتنا قریب ہے۔

(طرب ناک موسیقی کی ایک لہر روم روم سے گزر جاتی ہے)

میں: (بے دلی سے) ہوں۔ مجھے معلوم ہے۔ شاید وہ مجھے بصری دھوکے میں

رکھنا چاہتے ہیں، شاید اسی لیے انھوں نے چھت پر محذب شیشہ لگا رکھا ہے۔

وہ: بڑے تنکی مزاج ہو... یہاں کب سے ہو؟

میں: یہیں ہوں، ہمیشہ سے۔ یہ بھی ممکن ہے مجھے کہیں اور سے لایا گیا ہو۔ یا

ہو سکتا ہے... انھوں نے مجھے یہاں سے کہیں اور منتقل کر دیا ہو... (الھ کر) پتا نہیں۔

وہ: یہ جگہ نہیں پہچانتے؟

میں: کیسے پہچان سکتا ہوں۔ اگر پہچاننے کے لیے دیکھنا چاہوں تو بے شک سراٹھا

کے دیکھ سکتا ہوں۔ مگر آسمان آسمان سب ایک جیسے ہوتے ہیں اور سورج ہر جگہ ہے۔

وہ: تم آس پاس بھی تو دیکھ سکتے ہو۔

میں: ہوں۔ دیکھ سکتا تھا۔ مگر انھوں نے یہ دیواریں دُہرے مجوف شیشوں سے

بنائی ہیں۔ ان دیواروں کے پار تو چیزیں اتنی چھوٹی دکھائی دیتی تھیں کہ پہچانی نہیں جاتی تھیں؛

اس لیے میں نے باہر دیکھنا چھوڑ دیا۔ (کھسانی ہنسی) اگر کوئی باہر سے مجھے دیکھ لے تو ایشیوں کے پار سے میں بھی اسے بہت چھوٹا نظر آؤں (استہزائیہ ہنسی) مگر یہ اطمینان ہے کہ یہاں مجھے باہر سے دیکھنے والا کوئی نہیں ہے۔ یہ عجیب جگہ ہے۔

وہ: پہلے کہاں تھے تم؟ کیا یہ وہی جگہ ہے جہاں تمہیں ہونا چاہیے؟
میں: یہ کہنا مشکل ہے کہ پہلے کہاں تھا اور اب کہاں ہوں یا یہ وہی جگہ ہے جہاں مجھے ہونا چاہیے۔

وہ: مطلب؟... یہ کوئی اور جگہ ہے؟
میں: (چنچ کر) مجھے نہیں معلوم... نہیں معلوم کہ یہ کوئی اور جگہ ہے یا یہ کوئی جگہ ہے بھی کہ نہیں۔

(اچانک ایک غیر انسانی، غیر زمینی موسیقی کی سنناہٹ، مردے ڈھونے والی گاڑی کے پہیوں کی چرچراہٹ اور دلدلوں سے اٹھتے ہوئے بلبلوں کا شور ہمیں بتا دیتا ہے کہ لنچ من آگئے ہیں۔ ایک ”کئی چہرہ“ ہنسی کسی بھی قسم کی ذاتی توہین سے مبرا مشینوں کی غیر شخصی استہزا کی طرح ابھرتی ہے اور الیکٹرونک بیپ بیپ کے ساتھ ایک ”کئی چہرہ“ آواز کہتی ہے!)
لنچ من: یہ جگہ تو ہے، تم نہیں ہو (بیپ بیپ) جگہ تو ہے، تم نہیں ہو (بیپ) تو ہے، تم نہیں ہو (بیپ) ہے، تم نہیں (بیپ) نہیں۔

وہ: (خوف کی سسکاری) یہ کون تھا؟

میں: لنچ من۔

وہ: تمہارا شور سن کر آگئے ہوں گے؟

میں: (دانت پیس کر) انھیں کہیں سے آنا نہیں پڑتا اور وہ ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ کسی نہ کسی رنگ میں؛ کبھی سفید، کبھی سرخ، کبھی سبز... وہ ہر وقت موجود رہتے ہیں۔ بس رنگ بدلتے رہتے ہیں۔

وہ: رنگ؟ رنگ کیوں بدلتے ہیں؟

میں: دھوکا دینے کو۔ یہ ظاہر کرنے کو کہ اب جو آئے ہیں وہ، وہ نہیں ہیں جو پہلے تھے... لیکن وہ ہیں سب ایک ہی۔ بس اپنی بیپ اور اپنے رنگ بدلتے رہتے ہیں (گہری سانس) کبھی سفید۔ کبھی سر... (مشکل سے سانس لینے کی تیز آواز) س... س...

وہ: (تشویش) کیا ہوا؟

میں: میری آکسیجن ختم ہونے والی...

وہ: آکسیجن ختم ہوگئی تو کیا کرو گے؟

میں: (مشکل سے سانس لیتے ہوئے) معلوم... نہیں... مجھے کچھ... نہیں معلوم...

دم گھٹ رہا ہے...

وہ: ان سے تھوڑی سی آکسیجن مانگ لو نا۔

میں: آکسی جن کی... یہ آخری ٹیوب بھی... یہ بھی انہوں نے ہی دی تھی۔

وہ: تو اور لے لو۔

میں: (مشکل سانسوں سے) بدلے میں... بڑی بڑی چیزیں مانگتے ہیں۔

وہ: تو دے دو۔

میں: ...اور... کیا دے دوں؟... دیواروں کے پار دیکھنا چھوڑ چکا۔ اب صرف

آسمان کی طرف یا اپنے اندر دیکھتا ہوں... (سانس بے قابو ہو جاتی ہیں)

وہ: (چنج کر) یہ بھی چھوڑ دو۔ دے دو، یہ بھی دے دو۔

میں: پھر... رہ ہی کیا جائے گا میرے پاس... س... س...

وہ: تمہارے پاس تمہارے سب دن رہ جائیں گے۔ یہ کیا کم بات ہے۔ سنو!

آسمان کی طرف اور اپنے اندر دیکھنا چھوڑ دو۔ دے دو۔ یہ بھی دے دو۔

میں: (سانس اکھڑ رہی ہے مگر لہجے میں بڑی چاہت ہے) آس مان... اس قدر

نیلا، اتنا قریب اور سورج... (چنج کر) میں کیسے چھوڑ دوں؟ میرے تو اندر بھی یہی آسمان... یہی

بہت بڑا سورج ہے۔

وہ: (التجا کرتے ہوئے) دے دو۔ چیزوں کو ان کے اصل قامت میں دیکھو۔ اتنا

بڑا سورج؟ ایسا قریب آسمان؟ یہ غیر منطقی ہے۔ اوپر دیکھنا، اپنے اندر دیکھنا چھوڑ دو۔ دونوں

چھوڑ دو۔ (گھگھیا کر) سنو! تمہارے سب دن تمہارے پاس رہیں گے۔ یہ سورج دے دو۔

آسمان دے دو۔

میں: (غیر انسانی چنج کے ساتھ) آ آ آ آ آ... مم میں (ایک گہری سانس) میرا

دم گھٹ رہا... ہا، ہا، ہا۔

وہ: (چنچ کر) دے دو۔ سب کچھ دے دو۔

(موسیقی کا تاثر جیسے ایک زبردست کرائس (crisis) گزر جائے پھر سکون

ہو جائے)۔

میں: (ہار مانتی ہوئی آواز) دے دیا۔ میں نے (گہری سانس) اپنا سورج، اپنا

آسمان دے دیا۔

(وہی غیر زمینی موسیقی، اپنی سنناہٹ، چرچراہٹ اور ٹوٹتے بلبلوں کے شور کے

ساتھ بیپ بیپ کرتی فیڈ ان (fade in) ہوتی ہے اور کھنک کے ساتھ کوئی چیز آگرتی ہے)۔

میں: (مسرت کی آواز) ہا... ہا... واہ! آکسیجن کی ایک اور ٹیوب! نئی ٹیوب!

انہوں نے اندر ایک اور ٹیوب اچھال دی ہے (خوب گہرے زندگی بخش سانس لیتا ہے) ایک

غیر منطقی آسمان، ایک فریک (freak) سورج کے بدلے سودا برا نہیں... کیوں؟ ہبہ! (فکر کے

ساتھ) مگر یہ روشنی کو کیا ہوا... یہ... یہ دن ہے یا رات؟ (چنچ کر) دن ہے یا رات؟... اور یہ

(دھاڑتا ہے) میرا ایک دن کس نے اٹھالیا! (روتا ہے) میرے سب دنوں میں سے ایک دن

کس نے اٹھالیا؟

وہ: (اداسی سے) تم نے نہیں دیکھا؟ انہوں نے شیشوں اور خار دار تاروں کی

دوسری طرف سے اپنے بالوں بھرے شفیق پنچے بڑھائے تھے اور ایک ہی حرکت میں آکسیجن

ٹیوب پھینکتے ہوئے تمہارا ایک دن بھی اٹھالیا تھا۔

میں: (روہانسی آواز میں) زیادتی ہے! یہ زیادتی ہے! میں نے انہیں اپنا سورج،

اپنا آسمان دے دیا تھا۔ پھر یہ... یہ کیوں کیا انہوں نے؟ میرا ایک دن! مجھے تو اپنے سارے ہی

دن عزیز ہیں۔ انہوں نے بد عہدی کی ہے۔ مجھ سے دو دو وصولیاں کی ہیں... یہ کمینہ پن ہے...

حر مزدگی ہے... غلط ہے، یہ غلط ہے!

وہ: تمہی نے تو کہا تھا کہ وہ لنچ من ہیں۔ لنچ من کسی عہد کے پابند تو نہیں ہوتے۔

میں: مگر ان کا پہلا سودا تو ٹھیک تھا۔ میں نے دیواروں کے پار دیکھنا ترک کیا

تھا، انہوں نے ایک ٹیوب دے دی تھی۔ تو اب ایسا کیوں کیا؟ پہلے ایسا کیوں نہیں کیا تھا؟

وہ: اپنا اعتبار قائم کرنے کو... تمہیں اپنا گاہک بنانے کو... اور اب تم ان کی

ضرورت نہیں ہو، وہ تمہاری ضرورت ہیں۔ سودا تمہارے ہاتھ سے نکل گیا۔

میں : (دکھ کے ساتھ) میرا ایک دن میرے ہاتھ سے نکل گیا... اور آسمان اور سورج بھی... باہر کے سارے منظر بھی... خدایا! وہ : تمہیں آکسیجن تو مل گئی نا۔

میں : (مری ہوئی آواز میں) ہاں... اور مجھے آکسیجن ملتی رہے گی... ہر بار ایک ٹیوب آکسیجن کے بدلے، وہ مجھ سے میرا ایک دن لے لیا کریں گے۔ وہ : بہت سے دن ہیں تمہارے پاس۔ بہت سے دن ہیں۔

میں : (اسی رو میں) میرا ایک دن لے لیا کریں گے؛ یہاں تک کہ میں کسی دن... اور وہ رات ہی ہوگی... میں کسی رات، بے دن اور بے آکسیجن ہو جاؤں گا۔ دیکھنا یہی ہوگا۔

(موسیقی کا ایک نوٹ (note) سوئی کی نوک کی طرح چبھتا ہوا بیدار ہوتا ہے۔)

وہ : (سرگوشی) خاموش ہو جاؤ!

میں : یہ اب کیا ہے؟ سوئی کی نوک کی طرح چبھتی ہوئی یہ روشنی اوپر کے اندھیرے سے اتر کر آرہی ہے۔ کیوں؟ وہ : یہ سورج تو نہیں ہو سکتا۔

میں : سورج کیسے ہو سکتا ہے... وہ تو میں ترک کر چکا... اور سورج سوئی کی نوک کی طرح نہیں اترتا تھا... مجھے یاد ہے... وہ تو پورا آسمان اجال دیتا تھا۔ یہ تو باہر کے سیاہ مخمل میں ایک سوئی کی نوک بیدار ہوئی ہے۔

اور یہ... (خوف کی سسکی) یہ میری طرف آرہی ہے... (موسیقی کا یہ نوٹ سنسناتا ہوا تکلیف دہ حد تک چیخنے لگتا ہے)... یہ چھت کے شیشے سے اتر کر میری طرف... اوہ (ایک زبردست الیکٹرونک لیش، (electronic lash)، ابلیس کے ہنٹر کی طرح چٹختا ہے۔ اس نوٹ کے سرے پر ایسی ایک آواز ہے جیسے سرخ لوہے کو تیزاب میں بجھایا جا رہا ہو) یہ لیزر (laser) شعاع تھی جو سورج کی بددعا کی طرح گرجتی ہوئی اتری اور...

وہ : کچھ جل رہا ہے۔ کیا جل رہا ہے؟

میں : (خوف کی بے چارگی میں) اووو۔ اس نے — لیزر شعاع نے، میرے پیروں کے پاس کی زمین جلا دی۔

(سوئی کی نوک جیسا چبھتا ہوا نوٹ پھر بیدار ہوتا ہے)

وہ: روشنی کا ایک خدنگ پھر بیدار ہوا ہے... دیکھو... اوپر دیکھو۔

میں: (آواز میں لرزش ہے) ہاں۔ آواز سن رہا ہوں۔ اوپر نہیں دیکھ سکتا۔ اب صرف جھلسی ہوئی زمین کی طرف ہی دیکھ سکتا ہوں۔ یاد نہیں؟ میرا اوپر دیکھنا موقوف ہوا (آواز کا خدنگ سنناتا ہوا چیخنے لگتا ہے۔ الیکٹرونک کوڑا لگتا ہے۔ سرخ لوہا تیزاب میں بجھتا ہے۔ 'میں' بھیا تک چیخ مارتا ہے۔) میرے پیر... پیر میرے پیر!

وہ: گوشت جلنے کی بو کہاں سے آرہی ہے؟

میں: (روتا ہے) میرے پیروں کی دسوں انگلیاں جلادیں۔ جلادیں۔ اودو۔ ہوو... ہوع ہوع (الٹیاں کرنے کی آواز گریے پر حاوی آجاتی ہے) میرے پیچ... پے پے پے (آواز کا خدنگ سنناتا ہوا چیخنا شروع کرتا ہے پھر اچانک رک جاتا ہے)۔

وہ: حوصلہ رکھو اب کچھ نہیں ہوگا۔ حوصلہ رکھو۔ انھوں نے زاویہ بدل دیا ہے۔ اپنے مہربان پنچے بڑھا کر انھوں نے چھت کا زاویہ بدل دیا ہے۔ سکون سے کھڑے رہو... اب کچھ نہیں ہوگا۔

میں: (بوکھلایا ہوا ہے) کیا؟... کچھ نہیں ہوگا؟ میں... مگر میرے پیر آگ نے گلا دیے۔ میں اب صرف ٹخنوں تک ہوں۔ (چیخ کر) میں اب ٹخنوں سے شروع ہوتا ہوں۔

وہ: کھڑے رہو۔ ٹخنوں سے اوپر تو تم سالم ہو... کیا یہ کم بات ہے؟

میں: (کھسیا کر ہنستا ہے، پھر اطمینان کا سانس لیتا ہے) ہاں ہاں۔ چلو غنیمت ہے۔ ٹخنوں سے اوپر تو میں پورا ہوں... کوئی زیادہ... زیادہ فرق تو نہیں پڑا (ہنستا ہے)۔

(وہی غیر زمینی موسیقی جس میں مردے ڈھونے والی گاڑی کے پہیوں کی چرچراہٹ، دلدلوں سے اٹھتے بلبلے اور بیپ بیپ کی آوازوں کے ساتھ ایک روبوٹ ہنسی بھی شامل ہے 'میں' کی ہنسی پر سپر امپوز (superimpose) ہوتی ہے)۔

میں: بہہ! وہ آگئے!

وہ: وہ موجود ہیں۔ تمھی تو کہہ رہے تھے کہ وہ کہیں نہیں جاتے۔

میں: (سرگوشی میں) یہ... یہ کیا ہو رہا ہے! وہ میرا ایک دن اور اٹھا رہے ہیں۔

(چیخ کر) انھوں نے میرا ایک دن اور اٹھا لیا... میرا ایک... (خود اپنے منہ پر ہاتھ رکھ دیتا ہے)

وہ : (سرگوشی) ہاں۔ یہی دانش مندی ہے۔ منہ بند رکھو، ورنہ وہ ایک اور دن اٹھالیں گے۔

میں : مگر کیوں؟

وہ : انھوں نے چھت کا زاویہ تمہارے حق میں جو بدل دیا تھا۔ تمہیں لیزر شعاع سے جو بچایا تھا۔ اس کی اجرت تو وصول کریں گے۔

میں : (مری ہوئی آواز میں) ہاں... ہاں... میں ممنون ہوں۔

وہ : کہو مت! وہ یہ بات جانتے ہیں۔ اسی لیے انھوں نے اپنی مہربانی کے صلے میں تمہارا ایک دن اور اٹھالیا۔

میں : پروا نہیں، میرے پاس ابھی بہت سے دن ہیں۔

وہ : یہ بھی نہ کہو... سن لیں گے۔

میں : (مایوسی سے) انھیں معلوم ہے (سوئی کی طرح چبھتا ہوا نوٹ چینتا ہے، الیکٹرونک کوڑا لٹکتا ہے، آواز کے سرے پر تیزاب میں سرخ لوہا بجھتا ہے) ہا آ آ آ آ پینڈ لیاں... میری پینڈ لیاں (روتا ہے) بچاؤ۔ مجھے اس سے بچاؤ۔ (سنسناہٹ بیدار ہو کر درمیان سے اچانک منقطع کر دی جاتی ہے) ہائے... ہا آ آ آ۔

وہ : دیکھا چھت کا زاویہ پھر بدل دیا انھوں نے... وہ تمہیں مارنا نہیں چاہتے۔ زندہ رکھنا چاہتے ہیں۔

میں : (روتا ہے) ہاں... ہاں۔ میں ممنون ہوں... شکریہ ان کا... وہ... اپنی مصلحتیں وہی خوب جانتے ہوں گے... مگر وہ مجھے کیوں زندہ رکھنا چاہتے ہیں؟ کیوں؟ دیکھو اب تو میں (روتا ہے) میں اب پینڈ لیوں تک رہ گیا ہوں۔

وہ : (سمجھاتے ہوئے) یوں نہ سوچو... دیکھو... پینڈ لیوں تک ہی سہی، تم ہو تو۔ تمہارا ہونا ہی بڑی بات ہے۔ سمجھے؟

میں : ہاں... ہاں... میں ہوں تو... اور... دیکھو (ہنستا ہے) اب کے انھوں نے لیزر شعاع روکی لیکن اس مہربانی کے بدلے میں میرا ایک بھی دن نہیں اٹھایا... (گلوگیر آواز میں) میں ان کی اس شفقت کا بدلہ کس طرح اتار سکتا ہوں... سنو... میں ان کے اس کرم کے صلے میں اپنا ایک دن پیش کرتا ہوں۔

وہ: (تیز سرگوشی) ٹھہرو!... جلد بازی نہ کرو!

میں: (کھسائی ہوئی ہنسی) کوئی حرج نہیں۔ میں اپنا ایک دن خود سے پیش کر رہا ہوں۔ (غیر زمینی سنسناہٹ، مُردے ڈھونے والی گاڑی کے پہیوں کی چرچراہٹ کے ساتھ بلبلے ٹوٹنے کی آواز اور بیپ بیپ شروع ہوتی ہے۔) وہ اپنے پنچے بڑھا رہے ہیں۔ میرا ایک دن کا عطیہ وصول کرنے کے لیے، وہ اپنے شفیق پنچے بھیج رہے ہیں نا؟

وہ: (گنبھرتا کے ساتھ) ہاں... وہ اپنے بالوں بھرے پنچے بڑھا رہے ہیں اور ایک دن نہیں... انھوں نے تمہارے دو دن اٹھالیے ہیں۔

میں: (الجھن کے ساتھ) دو؟ کیوں؟

وہ: کیا خبر؟ تمھی تو کہتے ہو کہ وہ اپنی مصلحتیں تم سے زیادہ سمجھتے ہیں۔

میں: (حیران ہے، چیختا ہے) یہ سب کیا ہے؟... میں نے تو اپنا ایک دن پیش کیا تھا... (چیخ کر) وہ دھوکے باز ہیں، منافع خور ہیں۔

وہ: (سرگوشی) خاموش رہو! کیا کرتے ہو! (لنچ من کی آمد کی موسیقی) انھوں نے ایک ساتھ تمہارے کئی دن اٹھالیے!

میں: میں... میں ان سے بیزار ہوں۔ (چیخ کر) ان سے نفرت کرتا ہوں... نفرت کرتا ہوووووو!

(اب سوئی کی طرح چبھتا ہوا موسیقی کا جونوٹ بیدار ہوا اس میں بادلوں کی گرج بھی شامل ہے جو اپنے مہیب الیکٹرونک کوڑے سے وار کرتی ہے۔ اس مہلک وار کے پس پردہ ذبح ہوتے ہوئے ایک ہزار آدمیوں کی آواز ہا ہا... ہا ہا... ہا ہا کہہ رہی ہے۔ یہ بین اور ماتم کی پتا پانی کر دینے والی آواز ہے۔)

وہ: (چیخ مارتی اور رونا شروع کر دیتی ہے) انھوں نے گردن سمیت تمہارا سراڑا دیا۔ تمہیں... تمہیں خاموش رہنا تھا... اب تو... تم پنڈلیوں سے شانوں تک ہو... بس اپنی پنڈلیوں سے اپنے شانوں تک کھڑے ہو۔

(ایک ہزار ذبح ہوتے ہوئے آدمیوں کی ہا ہا کار دھیرے دھیرے فیڈ ہو جاتی ہے۔) میں کی بہت ہی کم زور آواز، جیسے کسی غار سے ابھرتی ہے۔ وہ اب آخر تک اسی طرز سنائی دے گی۔

میں : رومت۔ ٹھیک ہے... انھوں نے سراڑا دیا ہے اور میں اپنے بازوؤں کو بھی اپنے شانوں سے الگ ہوتے ہوئے دیکھ رہا ہوں اور میں رانوں تک پگھلتا جا رہا ہوں۔ (کوئی چیز تھپ کی آواز سے گرتی ہے) یہ میرے دونوں بازو گر گئے۔ الگ ہو گئے شانوں سے... اب زمین پر پڑے جلتی ہوئی مٹی کے ساتھ معدوم ہو رہے ہیں... شاید ہی بچیں... میں دیکھ رہا ہوں؛ دونوں کو کہنیوں تک تو آگ نے چاٹ لیا (غیر انسانی ہنسی ہنستا ہے)۔ میں اب زیادہ قریب سے دیکھ سکتا ہوں۔ کیوں کہ رانوں تک تو ختم ہو گیا... اب اپنے پیچ سے شروع ہوتا ہوں... (ہنسی) زمین کو زیادہ قریب سے دیکھنے کی سہولت مل گئی ہے مجھے۔

وہ : (ہچکیاں) انھوں نے تمہارے سب دن اٹھالیے۔ مجھے جانا ہوگا۔ اب جانا ہوگا۔ میں : نہیں! (گھگھیاتا ہے) نہیں... مت جاؤ (روتا ہے) میری یہ نئی پہچان تو دیکھ لو... میرے دنوں کا غم نہ کرو... بازو میرے راکھ ہوئے۔ لیکن دو پنچے تو ہیں، مضبوط سیاہ بالوں سے ڈھکے ہوئے دونوں پنچے۔ انھیں آگ نے نہیں جلایا... دیکھو... اپنی بے تاب انگلیوں کی حرکت سے زندہ، یہ دو پنچے ہیں جو چیزوں کو حاصل کر سکتے ہیں۔ انھیں پکڑ سکتے ہیں۔ بے شمار چیزوں... چیزوں... چیزوں کو پکڑ سکتے ہیں۔ حاصل کر سکتے ہیں... دیکھو مٹی کی آگ بجھ گئی۔ تم کہاں چلی گئیں... میری نئی پہچان تو دیکھتی جاؤ۔ کہاں گئیں... دیکھو دو پنچے ہیں... اور ایک مشک نافہ جو میرا پنجر توڑ کر، مجھے لیے ہوئے زمین پر جا گرا تھا اور اب نئی زندگی کے نئے امکانات سے پارے کی طرح لرز رہا ہے... اب تو میں مکمل ہوا ہوں۔ اس مرتبان کی پہنائی میں آج میں مکمل ہوا ہوں۔ ہاں... میں تمہیں دیکھ رہا ہوں... میں نے تمہیں دیکھ لیا ہے... ایک روشن غبار کی طرح تم شیشے کے اس حصار میں گشت کر رہی ہو۔ چھت اور دیواروں سے بے تابانہ لپٹتی ہوئی۔ باہر جانے کا راستہ ڈھونڈتی ہوئی۔ اوں ہنک! راستہ کوئی نہیں۔ یہیں میرے پاس رہو۔ میری نئی تکمیل میں، میرے پنچوں، میرے مشک نافے کی پہچان میں رہو... زندگی!۔ میرے ساتھ رہو... مجھے چھوڑ کر نہ جاؤ۔ شیشے میں کوئی درز نہیں جو تمہیں راہ دے۔ لوٹ آؤ... لوٹ آؤ۔ (چینتا ہے) زندگی! زندگی!

(شیشہ ٹوٹنے کا زبردست چھنا کا سنائی دیتا ہے۔ ساتھ ہی کسی پرندے کے اڑنے کی آواز دور ہوتی ہوئی... کو اڑا بھرتا ہے... ڈوب جاتا ہے)۔ میں : چلی گئی! (چینتا ہے) شیشے کا قفس توڑ کر چلی گئی اور... (غیر انسانی ہنسی) اور

مجھے بھی آزاد کر گئی۔ (شیشے کی کرچیاں ٹوٹی جاتی ہیں جیسے کوئی انھیں روندتا ہوا جا رہا ہے) میں آزاد ہوں۔ درختوں، ٹیلوں، عمارتوں سے خالی ہری دُوب سے ڈھکے ہوئے اس مرغ زار کے پھیلاؤ میں... میں آزاد ہوں۔ خاردار تاروں سے اور شیشوں سے ترتیب دیا ہوا میرا قفس راکھ ہو گیا... میں اب اپنے پنجنوں اور اپنے مشک نافے کی توانائی سے ہری ہری گھاس پر دور دور تک لڑھکنے پر قادر ہوں۔ کوئی روک نہیں... میں ہری گھاس کو جھلستا، بدرنگ لیس دار مادے کی لکیر بناتا، حدِ نظر تک لڑھکتا ہوا جاسکتا ہوں۔ گھاس میں چھپے اپنے گم شدہ دنوں، کوکہ شاید اپنے نئے دنوں کو، ڈھونڈ کر لاسکتا ہوں۔ میں دوسری بہت سی چیزوں چیزوں چیزوں کو حاصل کر سکتا ہوں۔ پکڑ سکتا ہوں۔ بہت سی چیزیں چیزیں چیزیں۔ جی۔

(وہی مہلک سنسناہٹ جو مردہ گاڑیوں کے پہیوں کی چرچراہٹ اور دلدلوں سے اٹھتے بلبلے ٹوٹنے کی آوازوں اور بیپ بیپ سے مخصوص ہے اور لنچ من کی آمد کا پتا دیتی رہی تھی، اب واشگاف انداز میں شروع ہوتی ہے۔ اس میں راکھشوں کے غیر شخصی استہزائی قہقہے ہیں جن میں 'میں' کا قہقہہ شامل ہو جاتا ہے)۔

میں: ہاہ... ہاہا یہ تم ہو لنچ من! پیارے لنچ من تم ہو؟ میں سمجھتا تھا (ہنتا ہے) میں سمجھتا تھا میں آئینہ دیکھ رہا ہوں۔ (ہنتا ہے) تمہارے یہ بالوں بھرے شفیق پنچے، سیاہ چھپے سمور کی یہ غلیظ گیندیں، تمہارے مشک نافے، جن پر چاہت اور خوف کی نیلی وریدوں کا جال بچھا ہوا ہے۔ یہ تم ہو۔ ہاہا ہا ہا یہ من موہنی شکلوں والے۔ میری نئی پہچان والے۔ میری نئی تکمیل کے عکس۔ یہ تم ہو۔ تم ہو عوع عوع (الٹیاں کرتا ہے، تھوکتا ہے) یہ میں ہوں کہ تم ہو۔ میں تم سے کچھ الگ تو نہیں۔ کوئی دوسرا تو نہیں۔ 'وہ' چلی گئی جو مجھے تم سے الگ رکھتی تھی۔ 'وہ' چلی گئی (روتا ہے) 'وہ' گزر گئی۔ 'وہ' چلی گئی۔ تو اب ہم کیوں نہ دائرہ وار رقص کریں۔ کیوں نہ کریں رقص کہ 'وہ' چلی گئی۔

(ایک unholy رقص کی موسیقی جو اسی بیپ بیپ، اسی چرچراہٹ اور بلبلے ٹوٹنے کی آواز سے مرتب ہے، شروع ہوتی ہے۔ گھناؤنے قہقہوں اور سسکیوں پر یہ رقص ختم ہوتا ہے،)۔
میں: (بس ایک بار گھٹی ہوئی متاسف آواز) 'وہ' چلی گئی۔ 'وہ' گزر گئی۔

[جیسا کہ آخر میں سب آوازیں ڈوب جاتی ہیں۔ یہ آواز بھی ڈوب جاتی ہے]۔



مرتبان — ایک سمری☆

میرے سب دن لُنج من کے پاس ہیں۔

پہلے یوں نہیں تھا۔ کچھ ایسا یاد پڑتا ہے کہ جلا وطنی کے تیسرے میل پر انھوں نے خاردار تاروں سے ایک احاطہ کھینچ دیا تھا اور اس احاطے میں، کھلے آسمان کے نیچے، مجھے چھوڑ دیا تھا۔ مگر وہ کھلا آسمان بھی نہیں تھا، کیوں کہ پورے احاطے پر شفاف محدب شیشے کی چھت پڑی تھی۔ میں سراٹھا کر دیکھتا تھا تو محدب شیشے کے پار، سورج بہت بڑا اور آسمان بہت قریب دکھائی دیتا تھا۔ پہلے پہل میں یہی سمجھا کہ وہ مجھے بصری دھوکے میں رکھنا چاہتے ہیں شاید اسی لیے اس احاطے میں چھوڑ دیا ہے۔

میں شاید ابھی تک اسی احاطے میں ہوں... یا ممکن ہے، انھوں نے مجھے کہیں اور منتقل کر دیا ہو... کیوں کہ معلوم کرنے کے لیے دیکھنا چاہوں تو سراٹھا کر دیکھ سکتا ہوں... مگر آسمان آسمان سب ایک جیسے ہوتے ہیں۔ یا گرد و پیش دیکھ سکتا ہوں... مگر وہاں چیزیں اتنی چھوٹی ہیں کہ پہچانی نہیں جاتیں؛ اس لیے یہ کہنا مشکل ہے کہ پہلے میں کہاں تھا اور اب کہاں ہوں، یا یہ وہی جگہ ہے جہاں مجھے ہونا چاہیے، یا یہ کوئی اور جگہ ہے، یا یہ کوئی جگہ ہے بھی کہ نہیں۔

پہلے پہل میں یہی سمجھا تھا کہ یہ کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس لیے کہ خاردار تاروں کے

☆ یہ کہانی میرے پہلے مجموعے میں ”ایک ذلیل سائنس فکشن“ کے عنوان سے شائع ہوئی تھی۔

باہر انھوں نے دُہرے مجوف شیشوں کی چہار دیواری بنادی تھی؛ سوان شیشوں کے پار ہر چیز بہت چھوٹی نظر آتی تھی۔ مجھے یقین ہے کہ اگر کوئی باہر سے مجھے دیکھتا تو میں اُسے بہت چھوٹا نظر آتا۔ مگر لنچ من کے سوا باہر سے دیکھنے والا کوئی نہیں تھا، اس لیے یہ لرزہ خیز اطمینان موجود تھا کہ مجھے باہر سے دیکھنے والا کوئی نہیں ہے۔

ایک دن... کہ پتا نہیں وہ رات تھی... میں نے جب باہر کی طرف دیکھا تھا تو مجھے ہر چیز پہلے سے بھی کہیں زیادہ چھوٹی نظر آتی تھی، اور میں نے گھبرا کر طے کیا تھا کہ چیزیں اتنی زیادہ چھوٹی نہیں ہوتیں؛ اور جو کچھ میں دیکھ رہا ہوں غیر منطقی ہے، اس لیے اس کا وجود نہیں ہے۔ اس لیے میں جہاں ہوں، وہ کوئی جگہ نہیں ہے۔ اس پر ان کی آواز بہت ہنسی تھی اور اس نے کہا تھا کہ یہ جگہ تو ہے، تم نہیں ہو۔

اس دن کے بعد سے... کہ پتا نہیں وہ رات تھی... میں نے چہار دیواری کے پار دیکھنا چھوڑ دیا۔ اب صرف آسمان کی طرف یا اپنے اندر دیکھنے لگا۔ مگر اس صورت میں مشکل یہ تھی کہ چھت والے محدب شیشے کے پار، اور میرے اندر، مجھے ہر چیز ضرورت سے زیادہ بڑی نظر آتی تھی؛ اور میں چوں کہ چیزوں کو ان کے اصل قامت میں دیکھنا چاہتا تھا، اس لیے جھنجھلا گیا، سو میں نے محدب شیشے کے پار اور اپنے اندر دیکھنا بھی چھوڑ دیا۔ وہ یہی چاہتے تھے۔ چنانچہ اس دن... کہ پتا نہیں وہ رات تھی... انھوں نے خوش ہو کر شیشوں اور خاردار تاروں کے دوسری طرف سے پنچے بڑھائے اور آکسیجن کا ایک ٹیوب میری طرف اچھال دیا۔ اور اس کے بدلے میں میرا ایک دن اٹھالیا۔

پہلے پہل مجھے اپنے اس ایک دن کے چھن جانے پر کوئی خاص دکھ نہیں ہوا۔ یہ نہیں کہ مجھے اپنے دن عزیز نہیں تھے۔ مجھے اپنے سارے ہی دن عزیز تھے، مگر سب سے زیادہ ضرورت مجھے آکسیجن کی تھی۔ جلا وطنی کے تیسرے میل تک جتنی آکسیجن میں لاسکا تھا، لے آیا تھا۔ اب چھت کے محدب شیشے اور چہار دیواری کے مجوف شیشوں کے ہوتے نئی آکسیجن حاصل نہیں کر سکتا تھا۔ اس لیے اس دن... کہ پتا نہیں وہ رات تھی... جب انھوں نے آکسیجن کا یہ ٹیوب میری طرف اچھالا اور اس کے بدلے میں میرا وہ دن اٹھالیا؛ تو میں اس اطمینان اور اس علم کی گھناؤنی دہشت سے کانپ اٹھا کہ مجھے آکسیجن ملتی رہے گی، اور ہر بار ایک ٹیوب آکسیجن کے بدلے وہ مجھ سے میرا ایک دن لے لیا کریں گے؛ یہاں تک کہ کسی دن... یا ممکن

ہے وہ رات ہی ہو... میں بے دن اور بے آکسیجن ہو جاؤں گا۔

اب جب کہ مجھے آکسیجن کا ٹیوب مل گیا تھا، اور میں احاطے کے وسط میں کھڑا محب شیشے کے گرجتے ہوئے ارتکاز کو اپنے پیروں کی طرف بڑھتا دیکھ رہا تھا، (کہ میں اب صرف جھلسی ہوئی زمین کی طرف ہی دیکھ سکتا تھا) تو مجھے بے دن ہو جانے کی دہشت نے آن پکڑا۔ اور جب محب شیشے کی لیزر شعاعوں نے میری آنکھوں انگلیوں اور دونوں انگوٹھوں کو چائنا شروع کر دیا اور جلتی ہوئی مٹی اور جلتے ہوئے گوشت کی بو میری طرف بڑھنے لگی، اس وقت میرے لیے بے آکسیجن یا بے دن ہو جانا، دونوں بے معنی ہو گئے اور میں نے پکھلتی ہوئی آٹھ انگلیوں اور پکھلتے ہوئے دو انگوٹھوں کے اس لیزر دائرے میں قے کر دی۔

تب اچانک، انھوں نے سیاہ سخت بالوں والے مہربان پنچے بڑھا کر چھت کا زاویہ بدل دیا۔ مرتکز کرنوں کی یکساں غیر شخصی گرج بند ہو گئی اور پکھلتی ہوئی مٹی اور پکھلتے ہوئے گوشت اور ہڈیوں نے پکھلنا موقوف کر دیا۔ تاہم، میں نے اطمینان کا سانس لیا کہ چلو ٹخنوں سے اوپر تو ہیں پورا ہوں۔

اور اس دن... کہ پتا نہیں وہ رات تھی... انھوں نے اس اطمینان کے بدلے میں میرا ایک دن اور اٹھالیا۔

یہ پریشانی کی بات تھی، مگر میں اس کا اظہار نہیں کرنا چاہتا تھا کہ کہیں وہ اسی بہانے مجھ سے میرا ایک اور دن نہ چھین لیں۔ پھر اچانک ہی یہ ہوا کہ محب شیشے کے اذیت پہنچانے والے زاویے نے گرجتی ہوئی کرنوں کے سفیر میری پنڈلیوں پر اتار دیے، اور میں پنڈلیوں تک ختم ہو گیا۔ مجھے پنڈلیوں سے اوپر زندہ رکھنے کے جتن میں (یا ممکن ہے کوئی اور مصلحت ہو) انھوں نے اپنے سیاہ بالوں بھرے شفیق پنچے بھیج کر چھت کا زاویہ پھر سے درست کر دیا، اور اس دفعہ مجھ سے کوئی اجرت نہیں مانگی۔ میرا ایک بھی دن نہیں اٹھایا۔ یہ بات مجھے اچھی لگی، سو میں نے شکر گزاری میں اپنا ایک دن ان کے حوالے کر دیا۔

انھوں نے ایک کی جگہ دو دن اٹھالے!

میں جھنجھلا گیا، اور اس کے ساتھ ہی محب شیشے کے مادر بخاطر تکاز نے اپنی ایک مہیب گرج سے گردن سمیت میرا پورا سراڑا دیا۔ اور اب کے تو انھوں نے حد ہی کر دی کہ سیاہ سخت بالوں والے مسیحا پنچے بھیجنے کی بجائے انھوں نے پنچے بڑھا کر ایک ساتھ میرے کئی دن

اٹھالیے۔ میں کیا کرتا، بس محدب شیشے کے نیچے پنڈلیوں سے شانوں تک کھڑا رہا اور جھنجھٹایا کیا اور پگھلتا اور معدوم ہوتا گیا۔ محدب شیشے کی عذاب کرنیں بند ہونے میں نہ آئیں اس لیے کہ جو بالوں بھرے دل نواز پنچے چھت کے شیشے کا زاویہ درست کر سکتے تھے، وہ اب تالیاں بجانے لگے تھے اور کسی طرح رکنے ہی میں نہ آتے تھے۔ فنا کرنے والی کرنوں کے فنا کرنے والے ارتکاز نے پیڑ و سے شانوں تک میرا پورا دھڑ، اور پہنچوں تک میرے دونوں بازو پگھلا دیے تھے اور میں محض پنڈلیوں سے پیڑ و تک تھا۔ یا میرے دونوں پنچے باقی تھے۔ ان باقی رہ جانے والی چیزوں کے علاوہ چھت کے شیشے تلے ایک ایک انچ پر لیزر شعاعیں تھیں اور دس لاکھ بادلوں کی گرج تھی۔ میں نے خاموشی سے خود کو ان کے حوالے کر دیا؛ تو انھوں نے میرے سب دن اٹھالیے اور معدوم کرنے والی شعاعوں نے جو کچھ بچا تھا، معدوم کر دیا۔ بس میرے دونوں خبیے اور دونوں پنچے چھوڑ دیے۔

اور اب مجھے، کہ میرا ایک بھی دن میرے پاس نہیں؛ اور مجھے، کہ میں صرف خبیے اور پنچے ہوں، یہ یاد آرہا ہے کہ محدب اور مجوف شیشوں میں عذاب کے آخری دن... کہ پتا نہیں وہ رات تھی... میں نے پہلی بار انھیں دیکھا تھا اور ان کی تکمیل کا قائل ہوا تھا۔

وہ باہر کی کھلی فضا سے تالیاں بجاتے آئے تھے اور مجھ سے بغل گیر ہونے کو بڑھے تھے اور میں نے دہشت کی چینیں اور پہچان کی کلاکاریاں ماری تھیں۔ اس لیے کہ وہ مرغزار کے پھیلاؤ میں شبنم آلود ہری ہری دوب پر لڑھکتے آرہے تھے؛ اور اپنے پیچھے پگھلی ہوئی دوب اور جھلے ہوئے دنوں کے بدرنگ لیس دار مادے کی لکیر چھوڑتے جاتے تھے۔ میں نے ان کے من موہنے گھناؤنے پن کو چھو کر دیکھا تھا اور مرغزار کی شبنم آلود ہری دوب پر ہری الٹیاں کی تھیں... کیوں کہ وہ ہر طرح مکمل تھے، کہ ان کی پہچان میں گھنے سیاہ سخت بالوں والے دو مہربان پنچے تھے اور سیاہ چپچے سمور کی دو غلیظ گیندیں تھیں، جن پر چاہت اور خوف کی نیلی وریدوں کا جال بچھا ہوا تھا۔ اور یاد آرہا ہے، کہ میرے سب دن انھی کے پاس تھے۔

اور یاد آرہا ہے، کہ میں نے شبنم آلود ہری دوب کو پکارتے ہوئے سنا تھا اور میں دوسرے دنوں کی تلاش میں لیس دار مادے کی بدرنگ لکیر بناتا چل پڑا تھا۔ کہ پتا نہیں ابھی تک اسی احاطے میں ہوں۔



غصّے کی نئی فصل

پہلی اشاعت: ۱۹۹۷ء

فہرست

۱۹۵	ایک بے خوف آدمی کے بارے میں
۱۹۸	غصے کی نئی فصل
۲۱۱	سے لون
۲۳۲	سرکس کی سادہ سی کہانی
۲۵۰	وقائع نگار
۲۷۲	جشن کی ایک رات
۲۷۹	برجیاں اور مور
۲۸۷	ہٹلر، شیر کا بچہ
۳۰۹	ریڈیو والے نواب صاحب
۳۱۳	دیوان جی
۳۱۷	پیدل ولندیزی
۳۲۰	طوفان کے مرکز میں
۳۳۹	سارنگ
۳۵۱	ایک سنجیدہ ڈی ٹیکٹو اسٹوری

ایک بے خوف آدمی کے بارے میں

کشور خان جنگلی وال میرا ساتھی ہے۔ ہم دونوں بندرگاہ پر کام کرتے تھے۔ ہم دونوں ہی شہروں کی اس تھکی ماندی دُلھن... کراچی... کے گرفتار ہیں۔ دونوں اپنی اپنی زاد بوم سے آ کر یہاں بس گئے اور اس خوب صورت، بد صورت، مشکل، من موہنے، سفاک اور چہیتے اور جادو بھرے شہر کے دامِ محبت میں اس طرح گرفتار ہوئے کہ اب کہیں اور دل نہیں لگتا۔ اسی شہر میں ہمارے گھر بنے، اسی شہر میں بچوں کی کلکاریوں سے یہ گھر آباد ہوئے۔ اب یہ ہمارے بچوں کا شہر ہے اور ہمارا شہر ہے۔ کبھی کبھی اس شہر کی رفتار اور اس کے بوجھ سے دل اُوبنے لگتا ہے تو اپنے اپنے جنگلی گاؤں لوٹ جانے کو جی چاہتا ہے مگر عجیب قصہ ہے کہ دو دن کے لیے بھی ہم اس شہر سے ہٹ کر جہاں تو سب کچھ پھیکا پھیکا لگتا ہے۔ دوسری سب بستیاں کاٹنے کو دوڑتی ہیں۔ ہم پھر کراچی لوٹ آتے ہیں۔

کشور خان برسوں پہلے گاؤں ڈاک خانے جنگلی سے مزدوری کرنے یہاں آیا تھا۔ یہ گاؤں صوبہ سرحد کے گلزار ضلع سوات کی پھولوں بھری تحصیل ڈگر میں بسا ہوا ہے۔ اس گاؤں کے کسی روشن محلے مداحیل میں کشور خان رہتا تھا۔ یہ جب جنگلی سے کراچی آیا تو بس اتنی اردو جانتا تھا کہ رگیروں سے وقت پوچھ لے اور کیماڑی کا رستہ معلوم کر لے۔ اس نے کیماڑی پہنچ کر بندرگاہ پر مزدوری شروع کر دی۔ محنت سے کام کیا تو بندرگاہ والوں نے اسے قاصد بھرتی کر لیا۔ اس

نے سر پر ٹین کی ایک چھت ڈال لی اور کراچی میٹرک کا کورس خرید لایا۔ دن میں یہ گھنٹی کی آواز پر دوڑ دوڑ کے کام کرتا رہا اور راتوں میں اپنا کراچی میٹرک کا کورس پڑھتا رہا اور پاس ہو گیا۔

پھر اس نے انٹر کی کتابیں خرید لیں۔

پھر بی اے کی کتابیں خرید لیں۔

اس عرصے میں اس نے محسوس کیا کہ میر تقی اور انیس اور مرزا غالب اور ڈپٹی نذیر اور اقبال اور اسماعیل میرٹھی اور احمد ندیم قاسمی بہت پیارے لوگ ہیں اور اس نے فیض احمد فیض سے محبت کرنا سیکھ لیا اور فراق گورکھ پوری کی چاہت میں مبتلا ہو گیا (اگرچہ فراق کا پورا نام ہندوؤں جیسا تھا)۔

ایک دن اس نے مجھ سے کہا کہ یارا اسد خانا! اردو بڑا پیارا چیز ہے، بالکل میری پشتو کی طرح۔ پھر ایک اور دن اس نے بڑی راز داری سے مجھے بتایا کہ وہ اب اردو میں کہانیاں لکھنے لگا ہے۔

میں نے کہا، قربان کشور خان شاباشے۔

کشور خان نے جب انٹر پاس کیا تھا تو بندرگاہ والوں نے اسے بابو بنا دیا تھا، اسے ایک میز اور ایک کرسی دے دی تھی جس پر بیٹھ کر فارغ وقت میں اس نے آدم خان درخانے کی کہانی اپنے طور پر لکھی اور فلم اشار بدر منیر کی جرأت اور دلیری کو سامنے رکھ کے بھی ایک کہانی لکھی اور سید سلیمان ندوی علیہ الرحمہ کے ”خطبات مدراس“ آرام آرام سے پڑھے۔

مجھ ناچیز نے اپنی کتاب ”کھڑکی بھر آسمان“ چھپوائی تو کشور خان بہت خوش ہوا، کہنے لگا، ”خان صیب! دوست کا کتاب چھپے تو لگتا ہے جیسے دوست کے باڑے میں میٹھے پانی کا چشمہ نکل آیا ہے۔ یارا! تیرے کو کتاب مبارک ہو۔“ پھر کچھ شرما کے بولا، ”میں نے بھی ایک کتاب لکھی ہے، آپ مشورہ دو تو اس کو چھپوا دوں، بولو تو نہیں چھپواؤں۔“

میں نے کشور خان کو ہمت اور بے خوفی سے ترقی کرتے دیکھا ہے۔ مجھے معلوم ہے اسے بہت آگے بڑھنا ہے۔ مجھے خبر ہے یہ اپنی ماں کو اور اپنے بال بچوں کو ایک اور خوشی دینا چاہتا ہے اور اپنے ”گراں“ والوں اور اپنے دوستوں کے درمیان سر بلند ہونا چاہتا ہے۔ ایسے بے خوف آدمی کا رستہ کون روک سکتا ہے؟ میں نے کہا، ”بسم اللہ! ضرور چھپواؤ اپنی کتاب۔“ اور میں نے اسے اپنے خطاط دوست سید اسحاق بزمی سے ملوا دیا۔ سید اسحاق بونیر (سوات) کے سید

بادشاہ کی اولاد میں سے ہیں، گویا ایک طرح سے کشور خان کے مرشد زادے اور گرائیں ہیں۔ انھوں نے بہت پیار سے ان صفحات کی کتابت کردی اور کشور خان کی کتاب تیار ہو گئی۔

میں اردو ادب کا طالب علم، اس جادو زبان کے طلسمات کا اسیر، اپنے ساتھی کشور خان چنگلی وال سے اس بات پر خوش ہوں کہ اس نے اردو زبان سے پیار کیا... اتنا پیار کہ ایک کتاب لکھ دی۔

کشور خان کا کوئی دعویٰ نہیں۔ ہم عصر ادیبوں میں اسے کوئی نہیں جانتا، کوئی نہیں جانے گا۔ اس کا کوئی گروہ، کوئی 'لابی' نہیں۔ ہائی برو اسے کبھی تسلیم بھی نہیں کریں گے، ظاہر ہے۔ مگر کشور خان کو اس بات سے کوئی پریشانی نہیں ہے۔ وہ تو صرف اپنے چھوٹے بیٹے اکبر خان کراچی وال کو جرأت اور جواں مردی اور کامرانی کی ایک کہانی سنانا چاہتا ہے اور کہنا چاہتا ہے کہ بچہ اکبر خانا! دیکھا، تمہارا باپ تیرا قومی زبان کا مصنف ہے۔

اس کتاب کو چھپوانے میں جتنے پیسے خرچ ہوئے اتنے پیسوں میں کشور خان اپنے کئی شوق پورے کر سکتا تھا... دو مینڈھے خرید سکتا تھا، سوٹ سلوا سکتا تھا، ایک اور کمرے پر ٹین ڈلوا سکتا تھا... مگر وہ بلند ہمت بہت ہے، وقت کے سمندر میں اپنے لکھے ہوئے لفظوں سے ایک ٹاپو بنا دینا چاہتا ہے، چھوٹی موٹی ابدیت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسے خبر ہے کہ چاہے کتنے ہی چاؤ سے پالا جائے، مینڈھے اپنی طبعی عمر کو پہنچ کے مر جاتے ہیں۔ سوٹ بھی تار تار ہو جاتے ہیں۔ چھتیس بالآخر بیٹھ جاتی ہیں۔

اسے ایک دانش ور ثے میں ملی ہے کہ:

کہ ترا دل و خستو شاہان او سلطانان... وغیرہ وغیرہ۔

یعنی دنیا سے بڑے بڑے بادشاہ اور سلاطین اٹھ گئے تو کیا ہوا؟ ان کی وجہ سے کوئی فرق نہ آیا۔ اگر ایک لمحے میں ہزاروں آدمی فنا ہوتے ہیں تو دوسرے ہی لمحے ہزاروں پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس آمد و رفت کا کوئی حساب نہیں، ایک بحر بے پایاں ہے جو بہا چلا جاتا ہے۔ (رحمان بابا)۔

اور اس بحر بے پایاں میں ایک چھوٹا سا بے خوف آدمی ایک چھوٹی سی کتاب سے اپنا ننھا سا ٹاپو بنا رہا ہے۔ خدا اُسے خوش رکھے۔



غصے کی نئی فصل

حافظ شکر اللہ خان اپنی بات اجمالاً ہی کہنا پسند کرتا تھا۔
حافظ شکر اللہ خان اچھا خاصا صاحبِ علم اور کم گو آدمی تھا، شاید اسی لیے اپنی بات اجمالاً کہنا پسند کرتا تھا، چناں چہ اسے تفصیلات سے اور وقت ضائع کرنے سے الجھن ہوتی تھی۔

گٹھے ہوئے ورزشی بدن کا یہ پڑھا لکھا روہیلہ، آس پاس کے دیہات میں غصہ ور مشہور تھا۔ شاید اسی لیے پیٹھ پیچھے اسے حافظ گینڈا کہا جاتا تھا۔
یہ بات حافظ شکر اللہ خان کے علم میں تھی کہ اسے حافظ گینڈا کہا جاتا ہے مگر وہ ایک نوع کے حلم و درگزر سے کام لیتا تھا۔ اس نے اب تک صرف اُن لوگوں کو زد و کوب کیا تھا جنہوں نے توہین کے ارادے سے اور عداوت سے اس کے منہ پر حافظ گینڈا کہا تھا۔ نادانستہ گینڈا کہنے والوں، بچوں، اور ہم چشموں کی بے تکلفانہ بے ادبی کو وہ منہ پھیر کر ٹال دیا کرتا تھا۔
حافظ شکر اللہ خان گینڈے میں ایک عجیب بات اور بھی تھی۔ وہ لادین لوگوں اور دوسرے مذہبوں مسلکوں والوں سے بھی خندہ پیشانی سے پیش آتا تھا۔ کہتا تھا بھل منسی میں کچھ خرچ نہیں ہوتا۔ وہ ہمارا کیا لیتے ہیں جو ہم سے متفق نہیں، وہ بے چارے تو ویسے ہی نقصان میں ہیں۔ دیہات میں بے ہوئے کسی بھی ملاں کا یہ رویہ عامتہ المسلمین کو حیران

کر دینے کے لیے کافی ہونا چاہیے تھا، مگر لوگ حیران نہیں ہوتے تھے... انھیں حافظ شکر اللہ خان کا مزاج معلوم تھا۔

حافظ شکر اللہ خان، کوہ سلیمان کے دامن میں دریائے گول کے کنارے آباد ایک گاؤں روہ ری میں رہتا تھا۔ اس نے اپنے بزرگوں سے سن رکھا تھا کہ روہ ری گاؤں، صاحب السیف سلطان عادل، شیر شاہ سوری کے بزرگوں کا آبائی وطن ہے۔ شیر شاہ کے دادا ابراہیم خان سوری اپنے نو عمر بیٹے میاں حسن خان کے ساتھ روہ ری سے چلے تھے تو پھر لوٹ کر نہیں آئے تھے۔ ابراہیم خان نے پنجاب کے شہر نانول میں اور میاں حسن خان سوری نے سہرام، بہار، میں انتقال کیا تھا۔ سب کی طرح حافظ شکر اللہ خان بھی سمجھتا تھا کہ جب باپ اور دادا نہیں آئے تو اب سلطان شیر شاہ اس بھولے سرے گاؤں میں کیا آئیں گے۔ اس طرح استدلال کر کے حافظ شکر اللہ خان نے طے کیا کہ اگر پہاڑ میری طرف نہیں آتا تو لاؤ میں ہی پہاڑ کی طرف چلوں۔ پس شکر اللہ خان گینڈے نے گھر والوں سے مشورے کے بعد دار الخلافہ جانے کا ارادہ کر لیا اور تیاریاں شروع کر دیں۔ شکر اللہ خان نے ملک پنجاب و ملتان سے آگے سرہند، بہار، بنگالہ، مالوہ اور خاندیش کے نظم و نسق اور خوش حالی کے قصے اور عالموں، دانش مندوں کا احوال سنا تھا۔ اس نے روہ ری گاؤں کے فرزند جلیل فرید خان شیر شاہ کے قصے سنے تھے جس نے قلیل مدت میں آٹھ سو کوس لمبی شاہراہ بنوائی تھی، زمینوں کا انصرام درست کیا تھا، ہند کے شورش زدہ علاقوں میں امن قائم کیا تھا، اور اپنی تلوار اور تدبیر سے فتنہ انگیزیوں اور شرارتوں کا خاتمہ کر کے خلقت کے لیے خدا کی زمین رہنے لائق بنادی تھی۔

شکر اللہ خان گینڈا ایک بار یہ سب اپنی آنکھوں سے دیکھنا چاہتا تھا۔ وہ ایک بار سلطان عادل شیر شاہ کو بھی دیکھنا چاہتا تھا۔ اس لیے اس نے اللہ کا نام لیا، گھوڑے پر زین کسی، گاڑھے کی ایک چادر میں وہ کتابیں باندھیں جن سے زیادہ دن جدا نہیں رہا جاسکتا تھا، اور شیر شاہ سے ملنے چل پڑا۔

حافظ شکر اللہ نے اپنے بڑوں سے سیکھا تھا، اور سرکاروں درباروں سے ہو کر آنے والوں سے سن رکھا تھا، کہ لوگ کسی تاج دار کی خدمت میں پیش ہوں تو انھیں نذر گزارنی ہوتی ہے، کوئی ایسا تحفہ دینا ہوتا ہے جو پیش کرنے والے اور قبول کرنے والے دونوں کے لیے قیمتی ہو۔ حافظ نے بہت سوچ بچار کے بعد فیصلہ کیا تھا کہ حضرت والا جاہ، سلطان ہند کے لیے

اسے کیا سوغات لے جانی چاہیے۔

شکر اللہ خان اپنے گاؤں کے اس بٹے پر گیا تھا جہاں بزرگ بتلاتے تھے کہ کبھی سوریوں کا حجرہ اور باڑا تھا۔ اس نے تین مرتبہ کھو بے بھر بھر کے اس بٹے کی مٹی اٹھائی تھی اور زربفت کے ایک پارچے میں، جو اسے کسی لشکری نے جزدان بنانے کی غرض سے دیا تھا، یہ مٹی باندھ لی تھی۔

زربفت کے پارچے میں بندھی یہ مٹی اور اپنی پسندیدہ کتابیں اٹھائے حافظ شکر اللہ خان پہلے اپنی پھوپھی کے گھر حسن ابدال پہنچا۔ حسن ابدال میں سات روز ٹھہر کے بافندوں کی ایک جماعت کے ساتھ وہ لاہور آ گیا۔ لاہور خوش اوقات بے فکرے لوگوں کا شہر تھا اور شکر اللہ کم آمیز، خاموش طبع آدمی۔ وہ پانچ روز بافندوں کے ڈیرے پر پڑا سفر کی تھکن دور کرتا رہا۔ شہر کی چمن بندی اور بھیڑ بھڑکا دیکھنے بھی نہ نکلا۔ چھٹے روز رسد لے جانے والے بنجاروں کی بیل گاڑیوں کے ساتھ ہولیا اور گھوڑے کو تھکائے بغیر دارالخلافہ کی منزلیں سر کرنے لگا۔

حافظ شکر اللہ خان روہ ری سے کچھ رقم لے کر چلا تھا۔ حسن ابدال میں محبت کی ماری پھوپھی نے مٹھی بھر چاندی کے سکے حافظ کے کیسے میں ڈال دیے تھے اور لاہور تک جن بافندوں کے ساتھ آیا تھا وہ بھلے لوگ تھے، حافظ کو راہ میں کچھ خرچ ہی نہ کرنے دیتے تھے، کہتے تھے ہمارے لیے یہ سعادت کی بات ہے کہ ایک عالم و فاضل ملاں ہم سفر ہے۔ چنانچہ دارالخلافہ جاتے ہوئے شکر اللہ خان کے پاس اچھی خاصی رقم موجود تھی۔ راستے بھر بنجارے اس کوشش میں لگے رہے کہ اس رقم میں سے کچھ ہتھیالیں مگر حافظ گینڈے نے موقع ہی نہ دیا۔ بنجارے اس کے علم و فضل سے تو کیا مرعوب ہوتے، گینڈے نے اپنے گٹھے ہوئے بدن اور اپنی تلوار سے انھیں قابو کیا اور بالآخر رسد کے اس قافلے سے پچھڑ ہی جانے میں عافیت سمجھی۔

لاہور بہت پیچھے رہ گیا تھا۔ دارالخلافہ ابھی کچھ فاصلے پر تھا۔ سرکاری سراہوں میں بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی۔ پیسے کی بچت بے شک تھی مگر حافظ ہجوم سے گھبراتا تھا۔ جیسے جیسے دارالخلافہ نزدیک آ رہا تھا سڑک کے آس پاس بستیوں کی تعداد بھی بڑھ رہی تھی۔ ان بستیوں میں مساجد بھی تھیں اور منج کی سرائیں، مہمان خانے بھی۔ حافظ شکر اللہ خان نے سوچا، مسجدوں کے منتظمین تو خوش ہو کر اسے ٹھہرائیں گے۔ پھر خیال آیا کہ پیش اماموں، مؤذنوں کی روٹی میں حصہ بٹانے کی بجائے کیوں نہ رقم خرچ کر کے کسی نجی سرائے میں ٹھہر جاؤں۔ منزل دو

منزل سر کر کے شہر پہنچ جاؤں گا۔ پھر ضرورت پڑی تو کوئی نوکری کر لوں گا۔ دارالخلافوں میں ہزار کام ہوتے ہیں۔ تو اس طرح نجی مہمان خانوں، سرایوں میں رکنا ٹھہرتا، حافظ شکر اللہ خان دارالخلافے پہنچ گیا۔

شہر کی وہ سرائے جہاں حافظ نے ٹھہرنے کا ارادہ کیا تھا، کتب خانے کے نزدیک تھی۔ شکر اللہ خان نے سوچا، شہر گھومنے سے بھی کیا ملے گا؟ شہر بھی ایک سے ہوتے ہیں۔ مجھے یہاں چند ہی روز تو رہنا ہے۔ یہ دن سرکاری کتب خانے میں لگا دوں گا۔ کتابیں دیکھنے، اپنے مطلب کی چیزیں نقل کرنے سے اچھی سیر اور کیا ہوگی۔ وہ سرائے کے منتظم سے ملا، سرائے میں ٹھہرنے کا کرایہ، کھانے پینے کا خرچ معلوم کیا۔ سہولتوں کے اعتبار سے کرایہ زیادہ نہ تھا۔ کھانے پینے پر بھی وہی خرچ آ رہا تھا جتنا بڑے شہروں میں اچھی سرایوں میں ہوتا ہے۔ بس ایک مشکل تھی، سرائے میں کوئی سموچا کمرہ، کوٹھری خالی نہ تھی۔ سرائے کے منتظم نے کہا، ”چاہو تو چار بستروں والے کمرے میں ایک بستر آپ لے سکتے ہو۔“

حافظ بولا، ”ارے بھائی! جو ہجوم کے ساتھ ہی رہنا ہوتا تو مفت کی سرکاری سرائیں کیا بری تھیں؟“ سرائے کا منتظم کتابوں کا پشتارہ دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ یہ روہیلہ ملاں رات بھر چراغ جلا کر کتابیں پڑھے گا یا چلے کھینچے گا، یہاں اس کا گزارا مشکل ہے۔ اس نے حافظ شکر اللہ کو قریب کی ایک سرائے کا پتا بتلا دیا۔ کہنے لگا، ”آپ فاضل عالم آدمی ہو۔ وہاں کمرہ کوٹھری خالی ملے گی، اور اپنے مطلب کے لوگ بھی مل جائیں گے۔“

”اپنے مطلب کے لوگ“ منتظم نے مسکرا کر کہا تھا۔ اس وقت یہ بات حافظ گینڈے کی سمجھ میں نہ آ سکی، تاہم اس نے زیادہ غور نہ کیا۔ وہ راسیں تھامے گھوڑے کو چلاتا ہوا دوسری سرائے میں پہنچا تو خوش ہو گیا۔ یہاں ایک پورا کمرہ خالی تھا، جگہ صاف ستھری اور کم خرچ تھی اور دوسری جگہوں کے مقابلے میں شور شرابا بھی بہت کم، سمجھو نہ ہونے کے برابر تھا۔

حافظ نے سرائے کے اصطبل میں اپنا گھوڑا باندھا۔ کمرے میں کتابوں کا بقیچہ، رزفقت کی پوٹلی، ہتھیار اور دوسرا سامان رکھا، کاغذ قلم دان سنبھالا اور کتب خانے کی راہ لی۔ حافظ گینڈا سخت کوش پہاڑی آدمی، کھانے پینے میں شہریوں کی طرح تکلف کیا کرتا۔ کتب خانے میں دن گزارنا تھا، چار چھ مٹھی بھنے ہوئے چنے فرغل کی جیب میں ڈالے اور جم کے بیٹھ گیا۔ دوپہر بعد حافظ شکر اللہ ظہر کی نماز کے لیے اٹھا، کتب خانے کے چھوٹے باغیچے میں ترنج

کے ایک ہرے بھرے پھل دار درخت کے سائے میں فرض پڑھے، مٹھی بھر چنے چبائے، پانی پیا۔ کتب خانے کی سیڑھیوں کے پاس دھوپ میں ایک پھیری والا آن بیٹھا۔ وہ کونلے کی انگلیٹھی سے برتن باندھے، بہنگی سی بنائے، راستوں، بازاروں میں عربی قہوہ بیچتا پھرا تھا۔ سکون کی جگہ دیکھ کر اب جوستانے بیٹھا تو شکر اللہ خان کو اس تھکے ماندے کی بیٹھک بھلی لگی۔ قہوے کی طلب نہ تھی مگر حافظ نے اس سے قہوہ خریدا اور پاس ہی سیڑھیوں پر بیٹھ کر پینے لگا۔ قہوہ اچھا تھا۔ حافظ شکر اللہ خان جیسے کھل اٹھا۔ دو تین فغان قہوے کے اور خرید کیے۔ دام دے کر اٹھنے ہی کو تھا کہ دیکھا کتب خانے کے دروازے سے ایک نو عمر آدمی برآمد ہوا ہے۔ وہ ادھر ہی آرہا تھا۔ نو وارد نے حافظ کو کتابوں کے درمیان بیٹھے دیکھا ہوگا، سلام کر کے بولا، ”فاضل! کچھ دیر بیٹھیے۔ ایک فغان میری طرف سے پی لیجیے۔“

نو جوان نے اہل زباں کی رواں فارسی میں بات کی تھی۔ گینڈے نے مسکرا کر شکریہ ادا کیا اور بیٹھ گیا۔ ”ٹھیک ہے، ایک فغان اور سہی!“ اس نے قہوہ لیا، نو وارد کو اپنا نام بتایا، اس کا نام پوچھا۔ آنے والا اصفہان سے آیا تھا۔ وہ اپنا نام فے روز بتاتا تھا۔ دونوں ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہے۔ فے روز منطق اور تواریخ کی تعلیم لے رہا تھا اور شہر جون پور کے کسی فاضل کی شاگردی کی نیت سے گھر سے نکلا تھا۔

قہوہ ختم کر کے دونوں سیڑھیاں چڑھتے پھر کتب خانے میں جا بیٹھے۔

حافظ شکر اللہ مغرب تک کتب خانے کے فراخ درتچے سے لگا بیٹھا پڑھتا رہا۔ اذان سے کچھ دیر پہلے وہ اٹھا اور کتب خانے سے نکل گیا۔ دو رگوشے میں کتابوں کے چھوٹے سے انبار کے پاس بیٹھا فے روز اصفہانی کا غذ پھیلانے کچھ نقل کر رہا تھا۔

شکر اللہ خان کا یہ پہلا دن بھر پور گزرا تھا۔ عشا سے قبل سرائے میں کھانا کھا کے اس نے بازار کا ایک چکر لگایا۔ شہر کے مرکزی علاقے میں افغانوں کے نو تعمیر مدرسے سے ملی ہوئی چھوٹی سی مسجد تھی۔ حافظ نے وہاں عشا کی نماز پڑھی۔ پھر کچھ بھٹکتا، پوچھتا پاچھتا وہ اپنی سرائے میں لوٹ آیا۔ تھکا ماندہ تھا۔ فوراً ہی سو گیا۔

خدا معلوم حافظ گینڈے نے ایک پہر نیند لی ہوگی یا دو پہر، جو اسے آدھے جاگتے آدھے سوتے میں لگا کہ جیسے ایک آدم خور غول بیابانی چیختا بلبلاتا اس کا پیچھا کر رہا ہے۔ وہ بھاگنا، جان بچانا چاہتا ہے مگر زمین نے جیسے اس کے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔ بدن کی پوری

طاقت سے وہ خود کو آزاد کرنا چاہتا تھا۔ پہلے پہل اسے کام یابی نہ ہوئی۔ غول بیابانی بھرے ہوئے اونٹوں کے گلے کی طرح بلبلاتا، تعزیر سہتے جان داروں کی طرح پکارتا، مین کرتا، اس کے بالکل پیچھے، سمجھو دو قدم کے فاصلے تک آ گیا۔ آدم خور اپنے پنجے بڑھا کر حافظ شکر اللہ کو چھو سکتے تھے، اور کسی ایک نے تو اپنا نوکیلا پنجہ بڑھا کر اس کی پشت پر خراشیں بھی ڈال دیں... بس یہ شکر اللہ خان نے ایک دبی ہوئی چیخ ماری اور جاگ پڑا۔ وہ بستر پر اٹھ کر بیٹھ گیا۔

معاذ اللہ! یہ کیسا خواب تھا، حافظ نے سوچا۔ مگر یہ سراسر خواب نہیں تھا، کچھ حقیقت بھی تھی۔ کس لیے کہ چیخ پکار اور غیظ کی آوازوں سے کمرہ جیسے بھرا ہوا لگتا تھا۔ حافظ کے بدن کے روٹنے کھڑے ہو گئے۔ خدا پناہ میں رکھے! یہ کیسی آوازیں ہیں؟ یہاں، اس کمرے میں، یہ کیسی بلائیں آگھسی ہیں؟ اس نے اٹھ کر چراغ کی لو بڑھائی۔ تکیے کے نیچے ہاتھ پہنچا کر اپنا پیش قبض نکالا، نیپے میں اڑس لیا۔ کمرے میں کوئی اور نہ تھا، بس یہ روٹنے کھڑے کرنے والی آوازیں گرد و پیش سے، اوپر سے، حد یہ کہ فرش تک سے چلی آرہی تھیں۔

حافظ گینڈے نے بدن کو ڈلائی میں اچھی طرح لیٹا، چراغ اٹھایا، اور نیام کی ہوئی تلواریں لیے کمرے سے باہر آ گیا۔ سوچ رہا تھا کہ کہیں سرائے پر رہزنوں نے تو حملہ نہیں کر دیا۔ مگر یہ بھرا پرا شہر تھا، اور شہر بھی کون سا... دار الخلافہ۔ شیر شاہ کی عمل داری میں ڈاکوؤں لٹیروں کی یہ ہمت کہاں ہو سکتی تھی کہ بستیوں پر یوں چڑھ دوڑیں۔ رہزنوں کی تو اس وقت بن آتی ہے جب حکمران کم زور یا بددیانت ہوں۔ شیر شاہ نہ تو کم زور سلطان تھا نہ بددیانت حکمران۔ حافظ شکر اللہ خان نے سوچا، شاید سرائے میں آگ لگی ہے اور لوگ جانیں بچا کر بھاگتے ہیں، مگر اس نے برآمدے میں نکل کر دیکھا، وہ صحن کی طرف بھی گیا، اسے کہیں سے جلنے کی بو نہ آئی۔ برآمدے میں اس نے دیکھا، ہر کمرے میں روشنی ہو رہی تھی مگر مسافر، مکین کوئی نہ تھا۔ صحن میں الاؤ جلتا تھا پر الاؤ کے پاس بیٹھنے والا کوئی نہ تھا۔ نہ سائیں، خادم، چوکیدار، جریب بردار، نہ کوئی مکین، نہ مسافر۔ دور دور تک کسی کا پتا نہ تھا۔

پھر حافظ کو سرائے کی چھت پر مشعلوں کی روشنی نظر آئی۔ آوازیں چھت ہی سے اٹھ رہی تھیں۔ اس نے چھت پر جانے کا زینہ تلاش کیا اور چراغ اور تلواریں اٹھائے دھڑ دھڑاتا ہوا اوپر پہنچ گیا۔

وہاں حافظ شکر اللہ خان گینڈے نے عجیب منظر دیکھا۔

اس نے دیکھا کہ سرائے کی چھت پر طرح طرح کے چراغوں، مشعلوں، دیوں، شمعوں، روشن ہانڈیوں سے جیسے رات میں بھی دن کا سماں ہے اور چالیس سے پچاس کی تعداد میں عورت مرد دائرہ بنائے بیٹھے ہیں اور حلق سے غیظ و غضب کی آوازیں نکالتے ہیں۔ کبھی تو ایسا لگتا تھا جیسے اب اٹھیں گے اور ایک دوسرے کو پھاڑ کھائیں گے... مگر اس طیش، اتنے غضب کے باوجود کوئی بھی اپنی جگہ سے ہلتا تک نہیں، دوسرے پر حملہ نہیں کرتا۔ بس اپنے سامنے بیٹھے مرد یا عورت کو غصے کی آوازیں کر کے آنکھیں نکال نکال کے دانت نکوستے ہوئے دہلائے جاتا ہے۔

حافظ گینڈے نے چراغ نیچے رکھ دیا۔ تلوار اپنے بدن کی اوٹ میں کرلی اور حیرت میں ڈوبا ان لوگوں کو چیخ پکار کرتے دیکھتا رہا۔

اس نے ان میں بہت سوں کو پہچانا۔ سرائے کا مالک، جو دن میں اپنی پشت اور کہنیاں تکیوں سے ٹکائے بیٹھا ادھ کھلی آنکھوں سے مہمانوں کو آتے جاتے دیکھتا رہتا تھا، وہاں موجود تھا۔ منتظم، جو ہر مہمان کو اپنا مالک بلکہ مرشد سمجھتا تھا اور ہر ایک کے آگے بچھا جاتا تھا، اس وقت وہاں جما بیٹھا تھا۔ مطبخ کے ملازم، جو سارا دن پکانے اور چکھنے میں گزار دیتے تھے اور کھا کھا کے وزنی ہو گئے تھے، وہ بھی بیٹھے تھے۔ کئی خدمت گار، اصطبل کے خادم اور سائیس، اور سب سے زیادہ حیرت کی بات یہ کہ سرائے میں ٹھہرے ہوئے مسافر بھی جو اپنے لباس اور آسودہ حال طمانیت بھرے چہروں کی وجہ سے الگ پہچانے جاتے تھے، اس حلقے میں موجود تھے۔ حیرت پہ حیرت یہ تھی کہ مہمان بھی سب کی طرح چہرے مسخ کیے، دانت نکالے، آنکھیں پھاڑے اپنے سامنے والے کو دیکھتے ہوئے بلبلارہے تھے۔

”یہ میں کن لوگوں میں آ گیا؟“ شکر اللہ خان نے سوچا، ”یا یہ کوئی خواب ہے؟“

مگر یہ خواب نہیں تھا۔ وہ سبھی لوگ جنھیں حافظ شکر اللہ نے دن کے وقت معقول طریق پر آتے جاتے، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے دیکھا تھا، اس وقت نصف شب گزار کر وحشت زدہ ہو رہے تھے۔ ”کیا یہ کسی قسم کے جنون میں مبتلا ہیں؟“

کیا یہ لوگ بہ یک وقت کسی دورے سے گزر رہے ہیں؟ کوئی خفیہ جماعت محفل کرتی ہے؟ یا کوئی شیطانی گروہ اپنی بھیانک رسمیں ادا کر رہا ہے؟

ابھی حافظ گینڈا یہاں سے ہٹنے اور کمرے میں اپنے سامان کے پاس لوٹنے کا سوچ ہی رہا تھا کہ ایک شخص حلقے سے اٹھا اور چہرے پر اس طرح ہاتھ پھیرتا کہ جیسے نیند سے ابھی

بیدار ہوا ہو، حافظ کی طرف آیا۔ حافظ نے دیکھتے ہی اسے پہچان لیا۔ یہ سائیس تھا جس کے سپرد اس نے اپنا گھوڑا کیا تھا۔ سائیس کے بعد ایک ادھیڑ عمر کی عورت، جو اپنے تیکھے نقوش اور اپنی کھال کی رنگت سے کسی سرد ملک سے آئی لگتی تھی، حلقہ چھوڑ کر اٹھی اور چہرے پر ہاتھ پھیرتی حافظ کی طرف آئی۔ سائیس اور عورت نے نرمی سے حافظ کا ایک ایک ہاتھ تھام لیا اور اسے حلقے کی طرف کھینچنا چاہا۔ عورت کی نظر حافظ کی تلوار پر پڑی تو اس نے چنجی آواز میں کہا، ”توبہ! تم ہتھیار کیوں لائے ہو؟ یہ حلقہ غیظ کا حلقہ ہے۔ تلوار کا یہاں کیا کام؟ اسے رکھ دو... ہمارے ساتھ آؤ۔“

شکر اللہ خان نے سختی کے ساتھ عورت کی گرفت سے ہاتھ چھڑا لیا۔ سائیس نے اب تک نرمی سے اس کا ہاتھ تھام رکھا تھا، اب جو حافظ نے عورت کی گرفت سے ہاتھ چھڑایا تو سائیس نے سختی کے ساتھ دونوں ہاتھوں سے حافظ کی کلائی پکڑ لی اور اسے حلقے کی طرف کھینچنے لگا۔ ”آؤ! آؤ آغا... اور دیر نہ کرو۔ تمہیں تو پہلے ہی دیر ہو چکی ہے۔“

”یہ میں کس وبال میں پھنس گیا ہوں؟“ حافظ گینڈے نے غصے سے جھٹکا دے کر سائیس کی گرفت سے کلائی چھڑائی اور ہاتھ اٹھا کر دور ہو جانے کا اشارہ کیا۔ پھر اس نے چراغ اٹھایا اور تیز تیز قدم لیتا زینے کی طرف چلا۔

ہاتھ چھڑا کر جاتے ہوئے اسے سبھی نے دیکھا، اس لیے پورے حلقے نے بہت ہی غضب ناک آواز میں اپنی ناپسندیدگی ظاہر کی۔ سیڑھیاں اترتے ہوئے شکر اللہ خان کو یوں لگا جیسے وہ تمام چالیس پچاس وحشی جھپٹتے ہوئے پیچھے آئیں گے اور اسے پھاڑ کھائیں گے۔ حافظ گینڈے نے اتنا بھیانک غصہ یا آوازوں سے غصے کا ایسا وحشی اظہار، پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ وہ دُلائی لپیٹے، کسی بھی پر تشدد واقعے کا سامنا کرنے کو تیار، ایک ایک قدم اترنے لگا۔ کیا خبر کب چراغ رکھ کر اسے تلوار کھینچ لینی پڑے۔ بالآخر اس نے خدا کا شکر ادا کیا کہ سب وحشت زدہ سرائے والے اور مسافر چھت پر اپنے حلقے ہی میں بیٹھے غصے کے جھاگ اڑاتے اور بھیانک آوازیں نکالتے رہے، سیڑھیاں اتر کے کوئی نہ آیا۔

صحن میں آکر حافظ نے عافیت کا سانس لیا۔ وہ برآمدے میں پہنچا۔ اس نے سرائے کے منصرم کا حجرہ دیکھا، پھر قطار میں بنے مہمانوں کے کمرے دیکھے۔ سب دروازے کھلے تھے، سب کمرے خالی تھے۔ شکر اللہ خان آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے کمرے میں آیا اور

چراغ گیر پر چراغ رکھ کر بستر پر بیٹھ گیا۔

تو یہ بات تھی جو پہلی سرائے کے منتظم نے کہنا چاہی تھی۔ کہتا تھا تمہارے اپنے مطلب کے لوگ ملیں گے۔ اس گیدی نے مجھے وحشت زدہ مجنون سمجھ کر ادھر ہنکا دیا۔ شکر اللہ خان گینڈے کو اتنا غصہ آیا کہ اگر دن کا وقت ہوتا تو وہ فی الفور اس پہلی سرائے کے منصرم کو جا پکڑتا اور سواری کے چابک سے اتنا دھنکتا کہ گیدی کو تا عمر یاد رہتا، مگر حالات کا تقاضا یہ تھا کہ غصے پر فی الحال قابو پالیا جائے، غور و فکر کیا جائے۔

”میں کسی بے آباد ویرانے میں نہیں، بستی میں ہوں۔ اور بستی بھی کیسی، ایک گنجائش سے زیادہ آباد شہر، جو شیر شاہی مملکت کے قلب میں واقع ہے، اس کا دار الخلافہ ہے۔ یہاں دیوان شرطہ اور دیوان قانون موجود ہیں۔ سڑکوں پر سے طلا یہ بھی گزرتی ہے۔ پھر کیا وجہ ہے کہ میں خود کوئی کارروائی کروں؟ میں تو ان مجنوں کے خلاف، جو خلقت کی نیند میں خلل انداز ہو رہے ہیں، شکایت درج کراؤں گا اور ابھی اسی وقت درج کراؤں گا تا کہ میری نیند خراب ہوئی سو ہوئی، دوسرے بندگان خدا تو سکون سے اپنی نیند پوری کر لیں۔“

حافظ گینڈے نے باہر جانے کے ارادے سے کپڑے پہننا شروع کیے۔ ابھی وہ پوری طرح تیار بھی نہ ہوا تھا کہ چھت سے آتی غیظ و غضب کی آوازیں یک لخت بند ہو گئیں۔ حافظ نے دروازہ کھول کر دیکھا، صحن میں روشنیاں اور سائے حرکت کر رہے تھے۔ پھر اکا دکا مہمان برآمدے سے گزرتا شروع ہوئے۔

ایک خوب صورت بچہ اپنی ماں کا ہاتھ تھامے گزر رہا تھا۔ حافظ متوجہ ہوا تو بچے نے مسکرا کر دیکھا۔ عورت نے بچے کو مسکراتے ہوئے پا کر حافظ شکر اللہ خان کی طرف نظر کی۔ پھر بچے کے تتبع میں وہ خود بھی مسکرا نے لگی۔

چیزیں لحظہ لحظہ بدلنا شروع ہو گئی تھیں۔

پہلے بچہ مسکرایا تھا، پھر اس کی ماں مسکرائی تھی، پھر اس نے گاتی گنگلاتی آواز میں حافظ گینڈے کو سلام کیا تھا، ”سلام علیک فاضل! خیر باشد؟“

حافظ کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ مسکراتی ہوئی اس وجہ و باوقار عورت سے کیا کہے۔ اس نے آہستہ سے کہا، ”بحمد اللہ... سب عافیت۔“

عورت بچے کا ہاتھ تھامے، اس کی طرف مسکرا کر دیکھتی اور اپنی بڑی بڑی روشن

آنکھیں جھپکاتی ہوئی گزر گئی۔ سرائے کا ایک خادم برتن اٹھائے حافظ کے کھلے دروازے کے سامنے سے گزرا۔ اب وہ بھی مسکرا رہا تھا۔ اس نے سر کے اشارے سے حافظ شکر اللہ کو سلام کیا اور گزر گیا۔

خادم کے دفع ہوتے ہی دو مسکراتے ہوئے مسافروں کے ساتھ آہستہ آہستہ چلتی ہوئی ادھیڑ عمر کی وہی عورت برآمدے میں آئی جس نے چھت پر حافظ کو روکنا چاہا تھا۔ وہ دروازے کے سامنے سے گزری تو بہت شفقت، بڑی اپنائیت سے صاحب سلامت کرتی، حافظ کو زرب لب دعا دیتی گزر گئی۔

یا خدا! یہ کیا ماجرا ہے؟ یہ سب لوگ جواب میری طرف مسکرا مسکرا کر دیکھ رہے ہیں، مجھے سلام کرتے اور دعا دیتے ہیں، کچھ ہی دیر پہلے میرے لیے... اور ایک دوسرے کے لیے بھی... دشمنوں سے بدتر تھے۔ کینے اور کدورت اور حد درجہ طیش اور غضب ناک کی سے دیکھتے تھے اور خوں خوار درندوں کی طرح دھاڑتے گرجتے تھے، اور اب دیکھو کیسی اپنائیت اور مہر و محبت سے ایک دوسرے کے ہاتھ میں ہاتھ ڈالے، ایک دوسرے سے چھوٹی چھوٹی مہربانیاں اور صلہ رحمی کرتے اپنے اپنے کمروں کی طرف جارہے ہیں۔

مطبخ کا ایک فربہ اندام خادم برآمدے سے گزرتا ہوا ٹھٹھکا، پھر ادب کے ساتھ حافظ شکر اللہ کی طرف بڑھا اور بولا، ”غلام نے تازہ بخنی تیار کی ہے۔ آغا کا حکم ہو تو پیش کروں؟ ان شاء اللہ پسند کیجیے گا۔“

حافظ گینڈے نے بے مہری سے اس مسخرے کی طرف دیکھا۔ لو بھلا گیدی بخنی کو پوچھتا ہے! آدھی رات کو بد نصیبوں نے سوتے سے جگا دیا اور اب یہ شخص بخنی سے میری تواضع کرنا چاہتا ہے۔ دھت! حافظ نے بستر سے اٹھ کر اس مسخرے فربہ اندام باورچی کے چوڑے چکلے چہرے پر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔

مگر سرائے کے اس آخری اہل کار کا تپاک دیکھ کر حافظ شکر اللہ خان گینڈے کا غصہ جھاگ کی طرح بیٹھ گیا تھا۔ اس نے پھر کپڑے تبدیل کیے اور سونے کی کوشش کی، اور بوالعجبی! اسے نیند بھی آگئی۔

صبح خادموں، منصرموں کا رویہ ایسا ہی پرتپاک کا روباری تھا۔ دن نکلنے پر انھوں نے خبر دی تھی کہ گرم پانی رکھ دیا گیا ہے، آغا حمام کر لیں۔ پھر لوزیات اور شربت اور غذائیں اور

قہوہ جس تواضع اور کثرت سے پیش کیا گیا وہ بھی غیر متوقع نہیں تھا۔ مسافروں، مہمانوں نے باہم وہی تپاک برقرار رکھا تھا۔ کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ آدھی رات کے وقت یہ سب لوگ آوازوں سے اور اپنی چلت پھرت اور دھمکیوں سے ایک دوسرے کی جان کے گاہک بنے ہوئے تھے۔

حافظ کو دیر ہو گئی تھی۔ آج بعد نماز عصر اسے مسندِ عالی برمازید کور کی رُوبہ کاری میں پیش ہو کر عرضی گزارنی تھی کہ وہ دربارِ عام میں سلطانِ ہند حضرت شیر شاہ سوری کی کورنش سلامی کو حاضر ہونا چاہتا ہے، کیوں کہ وہ نہ صرف سلطان کی رعایا میں سے ہے بلکہ ان کے جدی گاؤں روہ ری کا باشندہ بھی ہے۔

کتب خانے میں بیٹھنے کے لیے اس کے پاس دوپہر تک کا وقت پڑا تھا۔ حافظ شکر اللہ خان کاغذوں کا پلندا اور قلم دان بغل میں مار، کتب خانے روانہ ہوا۔

پچھلے دن کی طرح وہ اسی درتچے کے برابر جا بیٹھا۔ اس نے اپنے مطلب کی کتابیں نکلوا کر مطالعے میں گم ہو جانا چاہا، مگر آج کا دن پچھلے دن جیسا نہ تھا۔ رہ رہ کر شکر اللہ کو رات کا شور و غل یاد آ رہا تھا۔ اسے وہ دہشت اور بے چینی یاد آئی جو چھت سے اترتے ہوئے اس نے سیڑھیوں پر محسوس کی تھی۔

اپنا قلم دان اور کاغذ چھوڑ کر حافظ شکر اللہ خان باہر باغ میں جا کر ٹہلنے لگا۔ کھلی ہوا میں یکسوئی بحال ہوئی تو اندر جانے کا قصد کیا۔ دیکھا، گزشتہ دن کا ملاقاتی فے رُوز کتب خانے کی طرف آ رہا ہے۔ شکر اللہ خان سلام کلام کے لیے ٹھہر گیا۔ فے رُوز اصفہانی پوچھنے لگا، ”فاضل! آج غور و فکر میں ہو؟ کیا مطالعے کو طبیعت نہیں کرتی؟“ حافظ نے ٹالنے کو کچھ کہہ دیا۔ فے رُوز بولا، ”تھکے ہوئے ہو؟... کیا رات اچھی طرح سو نہ سکے؟“

حافظ گینڈے نے پھر ٹال دیا لیکن فے رُوز کے استفسار پر رات والی پریشان کن کیفیت اسے یاد آ گئی۔ حافظ نے سوچا، چند روز اس شہر میں اور رہنا ہے، فے رُوز سے کسی معقول سرائے کا پتا پوچھ لیتا ہوں۔

پوچھنے پر اصفہانی نوجوان نے کئی سرائیوں کے پتے نشان بتائے، ان کے کرایے اور سہولتوں کی تفصیل بیان کی۔ شکر اللہ خان کے لیے ان میں سے کوئی بھی مناسب نہ تھی، کسی کا کرایہ زیادہ تھا، کوئی سرائے کتب خانے سے دور تھی اور بعضی پر شور منڈیوں بازاروں کے بچپوں

بچ تھیں۔ فے روز جاننا چاہتا تھا کہ اس وقت جہاں حافظ ٹھہرا ہوا ہے، وہاں کیا مشکل پیش آئی ہے جو وہ سرائے بدلنے کے درپے ہے۔ حافظ شکر اللہ خان کو مجبوراً ساری بات بتانی پڑی۔

فے روز اصفہانی پوری کہانی سن کر بجائے ہم دردی جتانے کے ہنس پڑا۔ کیا بوالعجبی ہے! حافظ گینڈے پر جو گزری تھی وہی شہر میں پہلے روز فے روز کو بھی پیش آئی تھی۔ کہنے لگا، ”مگر فاضل! قدرت مجھ پر مہربان تھی۔ مجھے سرشام ہی علم ہو گیا تھا کہ یہ مردوزیوں کی سرائے ہے۔ میں تو اپنا سامان اٹھا کر رات سے پہلے ہی نکل آیا تھا۔“

حافظ شکر اللہ خان مردوزی نام کی کسی جماعت سے واقف نہ تھا۔ سچ تو یہ ہے کہ اس نے پہلی بار یہ نام سنا تھا۔ پوچھنے پر اصفہانی نے بتایا کہ صدیوں کی تعلیماتِ مدنیت کا بگاڑ اس فرقہ مردوزیاں کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ کہنے لگا، ”یہ تو نہیں معلوم کہ ان کا معلم کون ہے اور مرکز کہاں ہے، بس اتنا جانتا ہوں کہ صاحبانِ شوکت اسے اپنے مقاصد کے حصول میں مفید اور فیض رساں پاتے ہیں، سو دارالخلافتوں میں یہ مسلک خوب پھل پھول رہا ہے۔ صاحبانِ ثروت کی دیکھا دیکھی کم حیثیت لوگ بلکہ اب تو شاگردِ پیشہ بھی اس جماعت میں داخل ہوتے جاتے ہیں۔“

شکر اللہ خان گینڈا اس فرقے کی عمومی فکر سمجھنا چاہتا تھا، تو اصفہانی نے بیان کیا کہ مردوزی اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ آدمی کا مزاج محبت اور غصے اور نفرت سے مل کر تشکیل پاتا ہے، مگر اپنی تہذیب اور تعلیم اور تمدنی تقاضوں سے مجبور ہو کے انسان اپنا غصہ اور اپنی نفرت ظاہر نہیں ہونے دیتا، جس سے فتور واقع ہوتا ہے اور نفرت مزاج کی سطح سے نیچے جا کر سڑنے لگتی ہے۔ پھر یہ آدمی کے اندر ہی پلٹی بڑھتی ہے۔ آدمی سمجھتا ہے کہ وہ غصے سے پاک ہو چکا اور اس کے مزاج کی ساخت غصے اور نفرت کے بغیر ممکن ہو گئی۔

مردوزی کہتے ہیں، ایسا نہیں ہوتا۔ غصہ آدمی میں ساری زندگی موجود، مگر پوشیدہ رہتا ہے؛ تاہم اگر دن کے خاتمے پر اسے ظاہر ہونے، یعنی خارج ہونے، کا موقع دیا جائے تو ایک دن ایسا آئے گا کہ آدمی غصے اور نفرت سے پوری طرح خالی ہو جائے گا۔ مردوزی اس کیفیت کو تکمیل کا نام دیتے ہیں۔

”اس لیے،“ فے روز کہنے لگا، ”اسی تکمیل کو پانے کے لیے، مردوزی فرقے کا ہر فرد رات کو حلقے میں بیٹھتا ہے اور چیخ پکار کر کے اپنی دن بھر کی کمائی ہوئی نفرت اور دن بھر کا

پالا ہوا غصہ خارج کر دیتا ہے، اور باقی رات اور اگلے تمام دن کے لیے ایک مہذب، مکمل، مہر و محبت سے بھرا ہوا انسان بن جاتا ہے۔“

فے روز اصفہانی نے ضمناً یہ بھی اطلاع دی کہ سلطان شیر شاہ کا وزیر دربار، امیر برمازید کور مردوزی ہے۔

”إنا لله وانا اليه راجعون۔“ شکر اللہ خان نے جو تفصیل سے بے زار ہو جایا کرتا تھا، فے روز کا طولانی بیان سن کر کہا، ”إنا لله وانا اليه راجعون! تو ان قرمز ساقوں نے غصے اور نفرت جیسے قیمتی انسانی جوہروں کو ضائع کرنے کی سبیل بھی آخر نکال ہی لی۔“

اور یہاں حافظ شکر اللہ خان گینڈے کے نا تمام سفر کی روداد ختم ہوتی ہے۔ یہ واضح رہے کہ حافظ شکر اللہ خان گینڈا اپنی بات اجمالاً ہی کہنا پسند کرتا تھا۔ وہ صاحبِ علم اور کم گو آدمی تھا، شاید اسی لیے تفصیل سے حذر کرتا اور وقت ضائع کرنے سے الجھتا تھا۔

اس نے آدمی میں موجود غصے کے اس طرح بالالتزام ضائع کیے جانے پر کوئی نوحہ نہیں لکھا، اگرچہ گاؤں لوٹنے سے پہلے کاغذ کے ایک پرزے پر وزیر دربار مسندِ عالی، امیر برما زید کور کے نام چند سطور اس انداز کی لکھیں کہ انھیں یہاں نقل نہیں کیا جاسکتا۔

رخصت ہوتے ہوئے کتب خانے کی سیڑھیوں پر حافظ شکر اللہ خان گینڈے نے زربفت کا وہ پارچہ فے روز اصفہانی کو تحفے میں پیش کر دیا جس پارچے میں روہ ری، کوہ سلیمان سے مٹی باندھ کر لائی گئی تھی۔ سوریوں کے باڑے کی مٹی حافظ شکر اللہ نے برف جیسے سفید پھولوں کے اس تختے میں جھاڑ دی جو سیڑھیوں سے شروع ہو کر کتب خانے کے احاطے کی دیوار تک پہاڑی چشمے کی طرح جھاگ اڑاتا چلا گیا تھا۔

اگلی صبح جب فے روز اصفہانی کتب خانے کی سیڑھیاں چڑھ رہا تھا تو اچانک پھولوں کے تختے پر اس کی نظر پڑی۔ جیسے ایک جسمانی ضرب نے اسے کھڑے سے سیڑھیوں ہی پر بٹھا دیا۔

کل تک جس تختے میں برف کی طرح سفید پھول کھلے تھے آج اس میں انگارہ سے لال گلاب دہک رہے تھے۔



سے لون

کوٹھے پر پلے ہوئے اس لاوارث کو... مجھے... آج دن تک خبر نہیں ہے کہ باپ کیا ہوتا ہے، ماں کیا ہوتی ہے۔

میری 'مائی باپ' سمجھو تو، مالکن کہو تو، بس وہی لاجی بائی تھیں۔

یا پھر اپنے ہذا استاد بھاول پوری تھے، مگر استاد کی بات میں بعد میں بتاؤں گا۔ لاجی بائی جب بہت لاڈ کرتیں تو مجھے ”بچہ“ کہہ کے پکارتی تھیں، ”میرا بچہ!“ مگر مجھے معلوم ہے میں ان کا نہیں تھا۔ لاجی کالے پالک بلکہ سمجھو بے تنخواہ کا نوکر تھا میں۔ اور لڑکیوں کے لیے کبھی تو میں لاڈ کا لڈو اور کبھی کھیل تماشا تھا۔ سبھی آتے جاتے میرے سر پر چیت لگایا کرتی تھیں، سالی رنڈیاں!

مگر لاجی کے سوا کوئی دوسرا مجھے گالی نہیں نکال سکتا تھا۔

فلیٹ پر آنے والے مہمانوں، ملاقاتیوں سے میں بات نہیں کرتا تھا۔ نہ وہ مجھ سے بات کرتے تھے۔ کسی کام کو بھی نہیں کہہ سکتے تھے۔ نیچے سے پان سگریٹ ٹھنڈا گرم لمباری ہوٹل کا لڑکا لاتا تھا۔ اٹھنی چوٹی روپیہ بھی اس کو ملتا تھا۔

لاجی صاحب مجھے کبھی دس پندرہ روپیہ خرچ کرنے کو دیتی تھیں، جو میں ہذا استاد کے پاس جمع کرا دیا کرتا تھا۔ یہ پیسے میرے اپنے تھے۔ آدمی کے پاس کچھ تو اپنا ہونا چاہیے۔

جس کے پاس کچھ بھی نہ ہو وہ آدمی کس کام کا۔

میرا بہت جی چاہتا تھا کہ میں اس پیسے سے استاد ہڈا پہلوان کے لیے، چھوٹی موٹی سہی، کوئی چیز خریدوں، سب کے سامنے انھیں دوں جیسے ان کے پٹھے ان کے لیے کبھی عطر، سرمہ، رومال لاتے تھے۔

استاد ہم لوگوں پر بڑا پیسا خرچ کرتے تھے۔

استاد کے لیے ایک بار میں عطر کی شیشی لے گیا تھا مگر انھوں نے لینے سے انکار کر دیا تھا۔ بولتے تھے، ”نہیں اوئے، تیرے سے نہیں لوں گا۔“

میں نے پوچھا تھا، کیوں، تو کچھ سوچ کے بولے تھے، ”تو چھوٹا بہت ہے، اس لیے۔“ مگر چھوٹے تو ان کے بہت سے پٹھے تھے۔

میں چپ ہو گیا تھا۔ میں ان کا پٹھا نہیں تھا شاید اس لیے استاد نے مجھ سے عطر نہیں لیا ہوگا۔

مگر کسی نے... خبر نہیں کس نے... ایک مرتبہ مجھ سے کہا، ”استاد تیرے پیسے کو حلال کا پیسا نہیں سمجھتے۔ کوٹھے کی کمائی ہے اس لیے پرہیز کرتے ہیں۔“

”کیوں بھلا؟“ میں نے بات کہنے والے سے بہت حجت کی تھی، ”کیوں جی؟ میری کمائی کوٹھے کی کمائی کیسے ہوئی؟ میں گھر کا سب کام کرتا ہوں۔ کیا یہ محنت کی کمائی نہیں ہے؟ لاجی صاحب جو کبھی دس، کبھی پندرہ روپے دیتی ہیں، کیا وہ میری تنخواہ نہیں ہوتی؟“

ایک بار صفائی کرتے ہوئے مجھے درمی کے نیچے سے پچاس کا نوٹ ملا۔ مجھے معلوم تھا یہ نوٹ لاجی صاحب کا یا لڑکیوں میں سے کسی کا نہیں ہے۔ میں نے وہ سنبھال کے رکھ لیا، سوچ لیا یہ بھی استاد کے پاس جمع کرادوں گا۔

ہاں، یہ تو میں نے بتایا نہیں کہ ہڈا پہلوان کی لکڑی کی ٹال تھی۔ ہماری بلڈنگوں کے مین بازار میں جس قسم کے پہلوان ٹہلتے پھرتے تھے، ہڈا استاد ویسے نہیں تھے۔ برابر کے محلے میں ان کی یہ ٹال تھی اور بکرا منڈی میں ان کا گھر اور اکھاڑا تھا۔ وہ دس بیس شاگردوں کو زور کراتے تھے۔ یہاں اور خود ان کے محلے میں ہڈا پہلوان کو ہڈا استاد کہا جاتا تھا۔ انھیں پہلوان کے بجائے استاد کہا جانا یوں بھی صحیح تھا کیوں کہ گردنوں میں کالے دھاگے اور تعویذ ڈالے چار چھ اور بھی پہلوان ہماری بلڈنگوں کے آس پاس موڑھے بچھائے بیٹھے رہتے تھے یا دکانوں کے

تھڑوں پر اپنے چمچوں سے مالش کرایا کرتے تھے۔ جیسے رشیدا پہلوان، بے لو پہلوان وغیرہ۔ یہ لوگ یا تو پولیس کے ٹاؤٹ تھے یا اپنے ہاتھ پیروں کے بل پر پاڑے کی عورتوں، ان کے دالوں سے بھتا وصول کرتے تھے۔

ہمارے پاڑے سے ہذا استاد کا تعلق صرف جلانے والی لکڑی کا تھا، سوئی گیس اس وقت تک آئی نہیں تھی۔ ہماری سڑک کے زیادہ تر دکان دار مٹی کے تیل والے چولھے اور اسٹوو جلاتے تھے۔ تنور ہوٹل اور نہاری ہوٹل والے البتہ ٹال سے لکڑی منگاتے تھے۔ ان میں سے کسی پر اگر لمبی رقم چڑھ جاتی تو بھی ہذا استاد نہ خود ادھر وصولی کے لیے آتے تھے نہ اپنے کسی شاگرد کو بھیجتے تھے۔ کسی وکیل کا ایک مرگلا منشی ہذا استاد کی رقمیں وصول کرنے ادھر آتا تھا۔ استاد اسے جو مختانہ دیتے تھے وہ بل چڑھانے والے گاہکوں کے حساب میں ٹانک لیتے تھے... اصول کی بات تھی۔

میں نے شاید ابھی یہ بھی نہیں بتایا کہ لوگ ہذا استاد کے پاس امانتیں رکھایا کرتے تھے جو وہ اپنی لال کتاب میں چڑھا لیا کرتے تھے۔ اکثر رقمیں، زیور رکھوانے والے ہذا استاد کے شاگردوں کے رشتے دار تھے، ان میں بھی زیادہ تر عورتیں تھیں۔ ہمارے پاڑے کی عورتیں اوّل تو مال اپنے ڈب میں رکھنا پسند کرتی تھیں، دوسرے اگر کوئی چاہتی بھی تو استاد کی ٹال پر قدم نہیں رکھ سکتی تھی، رقمیں زیور رکھوانا تو دور کی بات ہے۔ ہذا استاد گانے بجانے والی عورتوں سے پردہ کرتے تھے۔ سڑک پر بھی بے آواز دیے اگر کوئی سامنے آ جاتی تو گالیاں کھاتی تھی۔

اور گالیاں استاد کی ایسی ہوتی تھیں کہ کیا کسی نے سنی ہوں گی۔ اونچی آواز سے اپنی بھاول پوری میں استاد شروع ہو جاتے تو بہت دیر میں رکتے تھے۔

ہذا استاد کی لال کتاب میں میرے نام کا بھی کھاتا کھلا ہوا تھا۔ محلے کے لوگ مجھے جاوید لاجی والا کے نام سے پہچانتے تھے۔ استاد نے اپنی کتاب میں میرا نام جاوید اصیل لکھا ہوا تھا۔ سب سے ہنس کے کہتے تھے کہ یہ چھوکرالڑا کے مرغ کی طرح سینہ تان کے چلتا ہے اس کز کے اسے اصیل کہتا ہوں... اصیل مرغ۔ مگر اصل وجہ میں جانتا تھا۔ ایک بار کسی نے مجھے استاد کے سامنے لاجی والا جاوید کہا تھا تو استاد ایک دم بگڑ گئے تھے، بولے تھے، ”چھوکر کسی بھلے گھر کا ہے اور تم اسے رنڈی کے نام سے جوڑ رہے ہو۔ لاجی پاجی سے اس کا کیا ناتا۔ نصیبوں کا پھیر ہے جو ایک اصیل چھوکر کوٹھے پر پڑا ہوا ہے۔ اب میرے سامنے کسی نے

اسے لاجی والا کہا تو دیکھنا مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“

استاد کی تجوری میں میرے نام پر ایک کم دو سو چالیس روپے جمع تھے۔

اب جو دری کے نیچے سے پچاس روپے ملے تھے تو میں نے حساب لگایا کہ میرے پاس ایک کم دو سو نوے روپے ہو گئے ہیں۔ اُس زمانے میں یہ بہت بڑی رقم ہوتی تھی۔

میں نے سوچا بس گیارہ روپے اور ملاؤں گا تو تین سو کی رقم ہو جائے گی۔

دوسری صبح میں بازار کرنے نکلا تو پہلے سیدھا استاد کی ٹال پر پہنچا، ہاتھ اٹھا کے دور سے انھیں سلام کیا۔ استاد اونچی آواز میں بولے، ”آیا اوئے اصیلا آیا بی۔“

میں نوٹ مٹھی میں دبا کے لے گیا تھا، استاد کے حوالے کر دیا کہ لیجیے میرے حساب میں ٹانک لیجیے۔ انھوں نے لال کتاب نکالی، میرے پیسے لکھ لیے، نوٹ اندر تجوری میں رکھ آئے۔ مجھ سے بولے، ”بیٹھ۔“

میں بیٹھ گیا تو کہنے لگے، ”جے کوئی کام نہیں ہووے تو ادھر ہی بیٹھ۔ میں بال کٹا کے، خط بنوا کے آدھے گھنٹے میں آجاتا ہوں۔“

ٹال پر چاروں آدمی لکڑی پھاڑ رہے تھے، میرے یا کسی کے بیٹھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ مجھے حیرت ہوئی۔ دو باتیں قاعدے کے خلاف ہو رہی تھیں۔ ایک تو استاد کام کے وقت ٹال چھوڑ کے کہیں جاتے نہیں تھے، دوسرے بال کاٹنے، خط بنانے کے لیے موجود حجام استاد کے پاس خود آتا تھا۔

میں نے کہا، ”استاد! آپ بیٹھو۔ میں موجود کو بلا لاتا ہوں۔“

کہنے لگے، ”نہیں۔ موجود کو نہیں۔“

میں نے کہا، ”پھر جس کو بولو۔ آپ کیوں جارہے ہو؟ جس کا کام ہے وہ ادھر ہی آئے گا۔“

دھیرے سے کہنے لگے، ”ہا آں۔ جس کا کام ہے وہ آپ ہی جارہا ہے۔“ یہ کہہ کے وہ حاجیوں والا پیلا رومال کندھے پر ڈال ٹال سے نکلے اور اس گلی میں مڑ گئے جو ہماری بلڈنگوں والی سڑک سے جا ملتی تھی۔

استاد ہدایت اللہ پہلوان گانے بجانے والیوں کی سڑک پر جارہے تھے۔

یہ تیسری ان ہونی بات ایسی ہو رہی تھی جو اتنے برسوں میں کسی نے کبھی ہوتے نہیں

دیکھی تھی...

ٹال کے تینوں مزدور ہاتھ روک کے کھڑے ہو گئے مگر ساگر دادا، جو ٹال کے سب سے پرانے آدمی تھے، اسی طرح لکڑیاں پھاڑتے رہے۔ دوسرے آدمی چپ کھڑے استاد کو گلی میں گم ہوتے دیکھ رہے تھے۔

مجھ سے خاموش نہ رہا گیا، میں نے کہا، ”ساگر دادا! یہ استاد کہاں جا رہے ہیں؟“
انہوں نے اسی طرح ککھاڑا چلاتے ہوئے کہہ دیا، ”خط بنوانے۔“
”وہ تو پتا ہے۔ پر ہماری والی سڑک پر استاد کبھی آج دن تک گئے نہیں۔“
ساگر دادا نے ککھاڑا روک لیا، بولے، ”اب جایا کریں گے۔“
”کیوں؟“

”ادھران کے پیر نے ’سے لون‘ کھول لیا ہے۔“

ان کا پیر کون؟ میں استاد کے کسی پیر کو نہیں جانتا تھا اور پیر کے ’سے لون‘ کھولنے والی بات بھی میری سمجھ میں نہیں آئی تھی، میں نے ساگر دادا سے پوچھ لی۔
کہنے لگے، ”مجھ سے کیا پوچھ ریائے وئی؟ ابھی آجائیں گے، استاد سے ہی پوچھ لینا۔“
یہ ساگر دادا کی پرانی ترکیب تھی۔ جتنا بتا رہے تھے انھیں اس سے زیادہ معلوم تھا۔
چاہتے تھے میں خوشامد کر کے پوچھوں پھر وہ بتائیں۔ خیر، میں نے خوشامد کی تو انھوں نے پیر کے ’سے لون‘ کا پورا قصہ بتایا۔

کہنے لگے کہ ہذا استاد کے مرشد کسی دوسرے شہر سے یہاں آ گئے ہیں۔ فقیر ہیں، اپنی روزی خود اپنے ہاتھ کی محنت سے کماتے ہیں۔ دوسرے شہر میں، اور اس سے پہلے کئی شہروں میں، ان کے بال کاٹنے، خط بنانے کے سے لون تھے۔ سردیوں میں حمام بھی گرم کرتے تھے۔ مرشد اپنے سے لون میں کوئی نوکر نہیں رکھتے۔ خود حجام کا سب کام کرتے ہیں۔
ان کے مریدوں میں سے جس کا جی چاہتا ہے، بار بار کام سیکھ کے سے لون میں آ بیٹھتا ہے اور مرشد کا ہاتھ بٹانے لگتا ہے۔ گاہک جو دے دیتا ہے، لے لیتے ہیں۔ وہ پیسے دینا بھول جائے یا ویسے ہی نہ دے تو مانگتے نہیں۔ جو مرید جتنا کمائے وہ اسی کا ہوتا ہے۔ مرشد کو جو آمدنی ہوتی ہے اس سے وہ اپنے روٹی کپڑے کرائے کا انتظام کرتے ہیں۔ نون، تیل، لکڑی، آٹا اپنا خرید کے لاتے ہیں۔ راشن ختم ہو جائے اور کمائی نہ ہو تو روزے پہ روزہ رکھ لیتے ہیں۔ جس

روز پیسے زیادہ آجائیں اس روز اپنی روٹی لانے سے پہلے فالتو پیسوں کے بتاشے خرید کے بچوں کو بانٹنے نکل جاتے ہیں اور جب تک بتاشے ختم نہیں ہو جاتے واپس نہیں آتے، چاہے رات کے بارہ بج جائیں۔ مرید بھی سارے اپنی کمائی سے اپنی روٹی کا بندوبست کرتے ہیں۔ مگر مرید لوگ کمایا ہوا باقی کا روپیہ سے لون میں لگا دیتے ہیں۔

ساگر دادا نے ایک اور خاص بات بتائی، کہنے لگے، ”مرشد صاحب اپنا سے لون ہمیشہ طوائفوں کے بازار میں کھولتے ہیں، اس لیے ان کے گاہکوں میں زیادہ تر تماش بین ہوتے ہیں۔ مرشد انھیں بنا سنوار کے، عطر، خوش بو لگا کے رخصت کرتے ہیں۔ باجے گا جے، تماش بینی، حرام پائی میں رات گزار کے جو گاہک سے لون پر واپس آتا ہے مرشد جی جان سے اس کی خدمت میں لگ جاتے ہیں۔ اس کے لیے پانی گرم کرتے ہیں، سرمالش کرتے، بدن دباتے اور اپنے ہاتھوں سے نہلاتے، پیٹھ ملتے ہیں۔“

پھر کہنے لگے کہ مریدوں میں کچھ تو اچھے پیسے والے لوگ ہیں اس لیے اُن کے مرشد ایک کے بعد جس بھی دوسرے شہر کے چکلے میں دکان خریدنے کی کوشش کرتے ہیں، وہ لوگ پچھلا سے لون بیچ کے نئی جگہ خرید دیتے ہیں۔ تو بس، ایک شہر سے دوسرے شہر یہی سلسلہ چل رہا ہے۔

ساگر دادا نے جو یہ ساری باتیں بتائیں، اس وقت پوری طرح پلے نہ پڑیں لیکن میں سوچ میں پڑ گیا۔ سولہ سترہ برس کی عمر تو ایسی ہوتی ہے کہ مرشد صاحب کا یہ حال سن کے ہنسی بھی آئی۔ اچھے مرشد ہیں، تماش بینوں، رنڈی بازوں کی ایسے خدمت کر رہے ہیں جیسے خدا کے خاص بندوں کی خدمت کی جاتی ہے۔

مگر میں نہ تو ہنسا، نہ دادا ساگر کے سامنے مرشد کا مذاق اڑانے والی کوئی بات کہی۔ میں نے سوچا، ہذا استاد کو معلوم ہوگا تو وہ خفا ہوں گے، گالیاں دیں گے، ہو سکتا ہے ہاتھ چھوڑ بیٹھیں۔

کوئی گھنٹے بھر بعد ہذا استاد واپس آئے تو چپ چپ تھے، خط بھی نہیں بنا ہوا تھا۔

میں نے پوچھا، ”استاد! خط نہیں بنوایا؟“

بولے، ”ہاں، موقع نہیں ملا۔“

میں نے پوچھا، ”موقع استاد؟ کیا بھیڑ زیادہ تھی؟“

بولے، ”نہیں... بس موقع... ہاں اوئے برخوردار! تجھ سے ایک بات پوچھنا تھی۔
اچھا ہوا تو گیا نہیں۔“

میں نے کہا، ”استاد! جاتا کیسے۔ آپ بیٹھنے کو جو کہہ گئے تھے۔“
بولے، ”اچھا؟ میں کہہ گیا تھا؟ خیر... تیرے سے یہ پوچھنا تھا... تو یہ بتا پتر! پچاس
روپے تیرے پاس کدھر سے آئے؟“
میں نے کہا، ”بس آگئے۔“

استاد پیار سے بولے، ”بیٹا! کچھ پتا تو چلے کدھر سے آئے؟“
میں ٹالنے کو ہنسنے لگا۔ وہ بگڑ گئے، بولے، ”جے بتائے گا نہیں کہ کدھر سے آئے
پیسے تو اچھا نہیں ہوگا۔ سمجھ لے۔“

استاد خفا ہو گئے تھے۔ جان بچانے کی ایک ہی صورت تھی۔ میں نے بتا دیا کہ دری
صاف کرتے ہوئے ملے ہیں، مگر یہ نہ لاجی کے ہیں، نہ لڑکیوں کے۔ کسی کے نہیں ہیں۔
کڑوے پن سے بولے، ”کسی تماش بین کے گرے ہوں گے؟“
میں نے کہا، ”مجھے کیا پتا، میں نے تو کسی کی جیب سے نہیں نکالے... نہ کسی نے
میرے ہاتھ پر رکھے۔“

کہنے لگے، ”سوچ لے۔ کسی آتے جاتے نے خوش ہو کے تو نہیں دیے تھے؟“
میں نے کہا، ”خدا کا واسطہ ہے استاد! آپ کو پتا ہے، لاجی صاحب میرے کو
بلڈنگ کے ان سب چکروں سے دور رکھتی ہیں۔“

چمک کے بولے، ”ہاں اوئے تیری لاجی صاحب کو...“ استاد نے اپنی بھاول پوری
میں لاجی کے لیے ایک گرجتی ہوئی گفتار سنائی۔ پھر کہنے لگے، ”ٹھیک ہے پتر! ٹھیک ہے مگر یہ
سمجھ لے زہر ہوتی ہے یہ حرام کمائی، ہاں۔“

ہذا استاد کی بہت سی تقریریں حرام کمائی اور زہروالی بات پر ختم ہوتی تھیں۔
استاد کا شک شبہ دور ہو چکا تھا۔ مجھے بھی اطمینان ہو گیا۔ وہ اداسی سے پگڑی اتار
اپنے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔

خط نہیں بنوا پائے تو شاید اس کی پریشانی تھی۔
ہذا استاد مجھے اپنے پٹھوں کی طرح سمجھتے تھے۔ وہ میرے اٹھارہ برس کے ہونے کا

انتظار کر رہے تھے۔ کہتے تھے، ”جیسے تیسے یہ تھوڑا وقت نکال لے اس رنڈی کے ساتھ، پھر تجھے ٹال پر بلالوں گا۔ کیوں کہ بی اٹھارہ برس میں بندے کے ہاڑ مضبوط ہو جاتے ہیں، پھر چاہے ککھاڑا چلاؤ، آرا کھینچو، کچھ بھی کرلو، بدن کی بڑھوتری کو نقصان نہیں پہنچتا۔“

ان کا جی تو بہت کرتا تھا مگر اس وقت اپنی ٹال پہ وہ مجھے نوکری نہیں دے سکتے تھے۔ میں لکڑی پھاڑ لیتا، آرے کھینچ لیتا، اتنی جان تو مجھ میں تھی، پر ان کا کہنا تھا کہ کچے ہاڑ کے لڑکے کو ککھاڑا اٹھانا جیسے ہرن کے بچے کو تانگے میں جوتنا ہے۔ ”نا ہی نا۔“

لاجی صاحب کو میرے ٹال پر جانے آنے کا معلوم تھا۔ ہذا استاد سے میرا ملنا جلنا انھیں پسند نہیں تھا۔ مجھے کبھی روکا تو نہیں لاجی نے مگر میرے سامنے ہذا استاد کو موقع بے موقع کو سننے یا گالی نکالنے سے وہ باز بھی نہیں آتی تھیں۔

کوٹھوں پر زیادہ گالی وہی چلتی ہے جس میں کسی مرد کے مرد نہ ہونے کی خبر دیتے ہیں۔ لاجی کو یقین تھا کہ استاد ہدایت اللہ ہذا پہلوان بھاول پوری کے ساتھ بھی یہی قصہ ہے، ورنہ اس سڑک کی عورتوں کو وہ اتنی گالیاں کیوں نکالتے۔

استاد کے گھر ایک ہی بیٹا پیدا ہوا تھا جو بارہویں برس میں تیز بخار میں اللہ کو پیارا ہو گیا۔ لاجی کہتی تھیں، ایک مر گیا، دوسرا نہ ہو سکا، اس کی وجہ بھی وہی تھی جس کا طعنہ وہ گالی کی شکل میں دیتی تھیں۔

ہمارے فلیٹ والی نا جو بڑی منہ پھٹ تھی۔ وہ جب بھی لاجی صاحب سے ناراض ہوتی اور لکڑی، ایندھن اور ٹال کا یا استاد کا ذکر نکل آتا تو نا جو کہتی تھی، ”بھری جوانی میں لاجی کا دل آگیا تھا ہذا بابا پر... پر وہ قلندری پہلوان ہیں، لنگوٹ کے ٹپکے، لاجی صاحب کے ساتھ کا ہے کو منہ کالا کرتے۔ بس جی سے لاجی ہذا بابا کو گالیاں نکال رہی ہے۔ آج دن تک چپ نہیں ہوئی۔“ یہ بات ایک بار لاجی نے بھی سن لی۔ جوتی لے کے اٹھی تھیں لیکن نا جو اپنے فلیٹ سے نکل کے ہنستی ہوئی ملتان بانی کے فلیٹ میں جا گھسی۔ لاجی صاحب نے دو دن بات نہیں کر اس سے۔ سب کو پتا تھا نا جو بکواس کرتی ہے۔ لاجی صاحب پیسے کے سوا کبھی کسی پر عاشق نہیں ہوئی تھیں۔

عاشقی پر خیال آیا۔ ہمارے فلیٹ میں عشق عاشقی کا بہت چرچا ہوتا تھا۔ بالکل ایسے جیسے سبزی منڈی میں آلو گو بھی کی بات ہوتی ہے۔

دوسری جگہ کا تو پتا نہیں، اس فلیٹ کی سب لڑکیوں نے ایک نہ ایک پکا عاشق لگا رکھا تھا۔ پکے عاشقوں کو ان وقتی مہمانوں سے دور رکھا جاتا تھا جو دوسرے شہروں، قصبوں سے آ کر دل لگی، تماش بینی میں کچھ وقت گزار کے چلے جاتے تھے۔ پھر اگر انھیں اچھی سروس ملی ہوتی تو وہ دوبارہ بھی آتے تھے۔

عارضی مہمانوں کا ایک جتھا اپنے شہر کا بھی ہوتا تھا۔ یہ لوگ ہلکے تماش بین ہوتے تھے اس لیے کوٹھے کوٹھے گھوم کے ہری چمک مویشیوں کی طرح تازہ مال پر منہ مار کے آگے بڑھ جاتے تھے مگر کوٹھوں پر ان کی عزت کوئی نہیں کرتا تھا۔

ناجو کا پکا عاشق ایک کالا کلونا گوانی 'ڈفونا صاحب' تھا۔ ڈفونے کا نام تو کچھ اور تھا، فلیٹ کی لڑکیوں نے اسے اس نام سے پکارنا شروع کر دیا تھا۔

جارج ڈفونا انگریزوں کے زمانے میں ایئر فورس کے ہوائی اڈے پر افسروں کی میس میں آب دار کی نوکری کرتا تھا۔ اس کا کام بس افسروں کو شراب پلانا تھا۔ میزوں پر برف کے تھرموس، لیموں کی باریک باریک قاشیں اور شراب کے ساتھ لی جانے والی گزک لگانے کا کام ڈفونا کے دوسرے ماتحت کرتے تھے۔ جارج ڈفونا تو صرف افسروں کو "گڈ ایوننگ سر" کہنے اور ان کی شراب سامنے رکھ کر مسکراتے ہوئے میز سے ہٹ جانے تک کا پابند تھا۔ خالی گلاس ہٹانا بالکل ہی نئے ماتحت کی ذمہ داری تھی۔ ہاں، بچی ہوئی شراب سنبھالنے یا نئی سیل بند بوتلوں کی ہیر پھیر ڈفونے نے اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ وہ بچی ہوئی شراب میں سے اپنے اور ماتحتوں کے حصے لگاتا تھا۔ شیر کا حصہ اپنے لیے رکھتا تھا... اصول کی بات ہے۔

چرائی ہوئی سیل بند بوتلوں کو وہ خاص موقعوں کے لیے اور اپنے خاص دوستوں کے لیے سنبھال کے رکھتا تھا۔ لاجی صاحب کو کمرس کی ایک سیل بند باٹلی ضرور پیش کی جاتی تھی۔

ڈفونے نے ناجو کو شراب پر لگانے کی بہت کوشش کی تھی۔ کئی برس تک، وہ جب بھی آتا آدھے آدھے گھنٹے، "بے بی کم آن... کم آن بے بی" کی رٹ لگا کے ناجو کو پینے پر آمادہ کرتا مگر ناجو کہتی تھی، "میں کڑوی چیز نہیں پیتی۔" ڈفونا ہنستا تھا اور کہتا تھا، "کروا کیڈھر ہے بے بی سویٹ... یہ تو ہنی کا مافک ہے، بائی گاڈ پی کے تو ڈیکھو تم۔"

انگریزوں کے جانے کے بعد بھی برسوں آفیسرزمیس میں بار قائم رہی اور جارج ڈفونا بوتلیں کھول کھول کے، الٹا سیدھا ناپ ناپ کے پیگ بناتا رہا پھر موقع ملا تو وہ کسی ہوائی

کمپنی میں گھس گیا۔ پیگوں، باٹلیوں کی جگہ جم کے اب دوسرے ہی ہیر پھیر کرنے لگا۔ اس نے ایک لمبی سی گاڑی خرید لی اور اپنی بیوی کو بار بار گوا بھیجنے لگا۔

ڈفونے صاحب کی لمبی شیور لے گاڑی میں ہم لوگ کئی دفعے سمندر کی سیر کو جا چکے تھے۔ یہ سیریں زیادہ تر سردیوں میں ہوتی تھیں۔ اس زمانے میں ڈفونے کی بیوی کرسمس کی لمبی چھٹیاں گوا میں اپنے بھائی کے پاس گزارتی تھی اس لیے بہت دن تک جارج ڈفونے سے پوچھنے والا کوئی نہیں ہوتا تھا۔

ایک برس کرسمس پر کیا ہوا کہ ڈفونا صاحب اپنی لمبی شیور لے کی جگہ ٹیکسی پر بیٹھ کے آیا۔ میں شام کے سودے کے لیے تھیلی اٹھائے اسی وقت فلیٹ کی سیڑھیاں اتر کر فٹ پاتھ پر آیا تھا جو میں نے دیکھا کہ ڈرائیور ڈفونے کو سہارا دے کے ٹیکسی سے اتار رہا ہے... اتار کیا رہا تھا، سمجھو کھینچ کے نکال رہا تھا۔ ڈفونے کے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک بوتل تھی۔ وہ اتنی پے ہوئے تھا کہ اسے اپنے پیروں پر کھڑے رہنا مشکل ہو رہا تھا۔

میں نے بڑھ کے کچھ مدد کرنا چاہا تو ٹیکسی والا بولا، ”یارا، اس مصیبت کی اولاد کو بٹھا کے پشے مان ہو گیا ہوں۔ تیرے کو کچھ پتا ہے ادھر اس کا وارث کون ہے؟“
مجھے ٹیکسی والے کی بات پر ہنسی آگئی تو جارج ڈفونا نے نہ معلوم کیوں آنکھیں پھاڑ کے مجھے دیکھا اور پہچان کر بولا، ”ہے! جو یڈ مائی بوائے، تم آگیا ہے؟“

ٹیکسی والے کے چہرے پر رونق آگئی۔ پوچھنے لگا، ”تم اس کو جانتا ہے؟“
میں نے کہا، ہاں تو وہ بولا، ”اس کا جیب میں سے بارہ روپیا چار آنہ نکال کے میرے کو دیو۔ میں خدا کا شکر کر کے ادھر سے جائے۔“
میں نے پوچھا، ”لالہ! شکر کس بات کا؟“

بولا، ”ہاں نا۔ شکر کیوں نہیں کرے گا؟ شکر کرتا ہے اس جنجال نے میرا ٹیکسی میں الٹی ملٹی یا دوسرا کوئی مصیبت نہیں کیا۔“

ڈفونا جتنی دیر بجلی کے کھمبے سے ٹکا لہراتا رہا میں نے اس کی جیبوں میں اس کا بٹوا تلاش کیا، ٹیکسی والے لالہ کو کرایہ دیا۔

ڈفونے کے پرس میں سو سو پچاس پچاس کے نوٹ تھے یا دس اور ایک کا نوٹ۔ کل گیارہ روپے کھلے تھے۔ لالہ نے کہا، ”ٹھیک ہے یارا۔ یہ ئی گیارہ روپیا دیو۔ ہمارا جان

چھوڑو۔ استغفر اللہ!“

ٹیکسی چلی گئی تو مجھے فکر ہوئی کہ اب ڈفونا صاحب کا کیا کروں۔ اتنی خراب حالت میں اسے فلیٹ پر لے جا کے مجھے لاجی کی گالیاں نہیں کھانی تھیں۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا، کوئی ہماری طرف نہیں دیکھ رہا تھا۔ ڈفونے کو کھمبے سے ٹکا ہوا لہراتا چھوڑ کر سودے کی تھیلی سنبھالے میں تو کھسک لیا۔

بیس پچیس منٹ بعد فلیٹ میں واپس آیا تو دیکھا ڈفونا لاجی کے کندھے سے لگا بھوں بھوں کر رہا ہے اور ناجو، بیلا اور گل بدن ان دونوں کو گھیرے کھڑی ہیں۔ لاجی صاحب نے بڑی مشکل سے ڈفونے کی گرفت سے اپنی گردن چھڑائی اور سانپ کی پھنکار جیسی آواز میں مجھ سے پوچھا، ”کیوں رے او؟ اس سارے بھڑوے کو فلیٹ کے دوازے پر تو چھوڑ گیا تھا؟“

”واہ! میں کائے کو چھوڑ جاتا؟“ میں نے شور کیا۔

کہنے لگیں، ”خبر نہیں کون اس دلدر کو ہمارے دروازے پر پھینک گیا ہے... ذرا پتا کرنا جاوید، کون تھا۔ میں تو ایسے لتے لوں گی، رحامی نہیں تو۔“

لاجی کی اس پریشانی میں بھی گل بدن منہ چھپا کے ہنس رہی تھی۔ ذرا کی ذرا رک کے بولی، ”جاوید! پتا ہے یہ کیوں رو رہا ہے؟ اس کی عورت ادھر گوا میں مر گئی ہے۔ تار آیا ہے۔ ناجو کو بولتا ہے چل میرے ساتھ گوا چل... اپن میری کو ڈفن کر کے آتے ہیں... کھکھ کھک کھی! میری اس کی عورت کا نام ہے۔“

میری کا نام سن کے ڈفونا نے لاجی کی گردن چھوڑ گل بدن کی طرف دیکھا۔ روتے ہوئے بولا، ”گل بدن! میرا ساتھ تم چلو۔ ہم لوگ ڈفن کر کے آوے۔ ہاں؟“

گل بدن بولی، ”دھت!“

ناجو نے قہقہہ مارا، ”ہاں ہاں جارح! اسے لے جا۔ اسے صحیح ڈفن کرنا آتا ہے۔ ابھی اپنے شاجی کو ڈفن کر کے بیٹھی ہے۔“

گل بدن کا مستقل عاشق جبل شاہ وڈیو پندرہ روز پہلے مرا تھا۔ اس کا کمدا رہمیں آکر خبر کر گیا تھا اور ہمارے فلیٹ سے جبل شاہ کی نشانی ایک رلی، ایک ناشتے دان لے کے شاہ جی کی زمینوں پر لوٹ گیا تھا۔

ناجو نے جو کہا اس سے ڈفونا کو یہ بات سمجھ میں آگئی کہ گل بدن اس کے ساتھ گوا چل سکتی ہے۔ مگر جب گل بدن نے دو تین بار اسے جا جادفع ہوا اور دھت دھت کیا تو وہ لاجی کے پیروں پر گر گیا۔ خوشامد کرنے لگا کہ گل بدن کو میرے ساتھ گوا بھیج ڈے میڈم، گاڈ المائی تیرا بیڑا پار کرے۔

آدھے گھنٹے اور یہ تماشا چلتا رہا پھر لاجی صاحب نے رشیدا پہلوان کے پٹھے بھورے جابر کو بلوایا۔

ڈفونا پرانا آدمی تھا اس لیے لاجی نے ذرا مروّت شرم کی۔ بھورے جابر کو سمجھا دیا کہ اسے آرام سے ٹیکسی میں لاد کے گرجے کے سامنے والے کمپاؤنڈ میں چھوڑ آئے۔ لاجی نے بھورے جابر کو دو طرف کا ٹیکسی کا کرایہ بھی دیا کیوں کہ ڈفونے کو جس کسی نے بھی فٹ پاتھ سے اٹھا کے ہمارے فلیٹ کے دروازے پر پہنچایا تھا اس نے اس کا پرس اور دو بوتلوں میں سے ایک اپنے لیے رکھ لی تھی۔ ڈفونے کی جیب میں بس ایک کالا رومال پڑا رہ گیا تھا۔

اس دن کا بھیجا ہوا جارج ڈفونا ہفتے بھر بعد لوٹ کے آیا۔ وہ آیا تو نیا سوٹ پہنے تھا اور ناجو کے لیے صدر کی سب سے بڑی دکان سے ہری ڈنڈیوں والے سفید پھولوں کا ہاتھ بھر لمبا گل دستہ لایا تھا۔ وہ لاجی، چمپا، یاسمین اور بیلا کے لیے بھی چھوٹے موٹے تحفے لایا تھا۔ گل بدن سے خفا ہوگا، اس سے بات بھی نہیں کر رہا تھا۔

ناجو سے کہنے لگا، یہ پھول گل دان میں لگا کے پانی بھر کے اپنے بستر کے پاس میز پر رکھ لینا۔

ناجو نے اسے خوش کرنے کو کہہ دیا کہ اچھا ابھی لگا دوں گی۔ پاس ہی گل بدن کھڑی تھی، پھول سونگھ کے بولی، ”اچھی خوش بو ہے... پرانے کا فور جیسی... اوہو! سمجھ گئی!... اڈھر سے بچا کے لایا ہے، میری کے ڈفن میں سے۔“

ناجو اور لاجی کے سوا فلیٹ کی سب عورتیں منہ دبا کے ہنس پڑیں۔ غصے میں جارج ڈفونے کی رنگت اور کالی ہوگئی۔ اس نے گل بدن کی طرف نفرت سے دیکھا اور اپنے غصے کو تھوک کی طرح اڑاتے ہوئے بولا، ”فک یو!... یو بلا ڈی بچ!... گو فک یو سیلف!“ اور اٹھ کے باہر کی طرف چلا۔

اتنے غصے میں ڈفونے کو کبھی کسی نے نہیں دیکھا تھا۔

لاجی نے ایک بار گل بدن کی طرف گھور کے دیکھا اور کہا، ”رحامی نہیں تو!“ پھر جاتے ہوئے جارج ڈفونے کو وہ پیار سے پکارنے لگیں، ”جارج! اے بیٹا سن تو! جارج پتر بات تو سن۔ او بر خوردار! گل بدن کی بات کا برا کیوں مناتا ہے۔ ارے مذاق کرتی ہے تجھ سے۔ جارج!“

مگر ڈفونا فلیٹ کا دروازہ آہستہ سے بند کر کے، مڑ کے دیکھے بغیر جا چکا تھا۔ تیسرے دن جارج ڈفونا ہمارے فلیٹ پر آخری بار آیا۔ وہ بہت برے حال میں آیا تھا۔ مجھے، رشید پہلوان اور بھورے جابر کے ساتھ مل کے اسے ڈنڈا ڈولی کر کے نیچے پھینک آنا بالکل اچھا نہ لگا۔ افسوس ہوا مگر مجبوری تھی۔ وہ بری طرح پیے ہوئے تھا۔ آتے ہوئے خدا معلوم کسی گاڑی یا رکشا سے ٹکرایا تھا یا کھلے گٹر میں جا گرا تھا یا کسی کے ہاتھوں پٹا تھا جو اس کے کپڑے پھٹے ہوئے، کیچڑ میں لت پت تھے، گھٹنے کہنیاں ادھڑی ہوئی تھیں اور پیشانی اور گالوں پر کی کھال پھٹ گئی تھی، خون رس رہا تھا۔

وہ ہمارے فلیٹ میں گھسا تھا اور اپنی عورت میری کا نام لے لے کے کچھ بکنے لگا تھا۔ پہلے تو سب سمجھے کہ گل بدن پر حملہ کرنے کے ارادے سے فلیٹ میں گھسا ہے مگر وہ نشے میں ایسا غٹ تھا کہ گل بدن، ناجو، لاجی صاحب کسی کو نہیں پہچان پارہا تھا۔ بس اسے تو اپنی میری کی تلاش تھی۔

میں نے بھورے جابر اور رشید پہلوان کے ساتھ مل کے اسے اٹھایا اور بلڈنگ کے سامنے فٹ پاتھ پر چھوڑ دیا۔ بھورا جابر فٹ پاتھ پر پڑے جارج کو اپنے بوٹ کی ٹھوک مارنے کے لیے ذرا پیچھے ہٹا ہوگا؛ اس نے لات چلانے کے ارادے سے پاؤں اٹھایا تھا کہ رشید پہلوان نے کڑک دار آواز میں ڈانٹا، ”نہیں بے!“ بھورا جابر رک گیا اور منہ ہی منہ میں گالی نکالتے ہوئے جارج کے پاس سے ہٹ گیا۔

مجھے عجیب شرمندگی ہو رہی تھی جیسے جارج ڈفونے کی اس خواری کا میں ذمے دار ہوں۔ میں نے اپنا جھکا ہوا سراٹھایا اور بلڈنگ میں داخل ہونے کے لیے مڑا۔ پھر کنکھیوں سے دیکھنا چاہا کہ سڑک پر کس کس نے مجھے جارج کو ڈنڈا ڈولی کر کے فٹ پاتھ پر گراتے ہوئے دیکھا ہے۔ دن کا وقت تھا، بہت سے لوگ تھے۔

کوئی خاص چہرہ پہچان میں نہ آیا تو میں نے سر گھما کر دور تک نظر دوڑائی۔ سڑک

کے دوسری طرف بہت سے لوگ جمع ہو گئے تھے اور وہ ادھر ہی دیکھ رہے تھے۔ میں ایک ہی جھلک میں پہچان گیا۔ اس ہجوم میں ہذا استاد شامل تھے۔ میں نے سوچا ٹھیک تو ہے۔ وہ خط بنوانے، بال کٹوانے آئے ہوں گے۔ ان کے آدمی ساگر دادا نے بتایا تھا کہ ہمارے اس بازار میں اب استاد کا برابر آنا جانا رہے گا، یہاں ان کے مرشد نے سے لون کھول لیا ہے۔ مگر میں نے عجیب بات دیکھی... اتنے دن ہو گئے تھے استاد نے ابھی تک خط نہیں بنوایا تھا۔ ہمیشہ پگڑی پہننے والے استاد ننگے سر تھے۔ ان کے سر کے بال بھی بڑھ گئے تھے۔ وہ ہجوم میں گھرے ہوئے اداسی کے ساتھ جارج کوفٹ پاتھ سے ہاتھوں پیروں کے بل اٹھتے دیکھ رہے تھے۔

ڈفونہ کئی بار اٹھا اور گرا مگر کسی نے آگے بڑھ کر اسے سنبھالنے کی ہمت نہ کی۔

ہمت میں نے غلط کہا۔ کسی نے ضرورت ہی نہ سمجھی کہ کوٹھے سے پھینکے ہوئے اس کچرے کو سیٹتا۔ سب کو معلوم تھا کہ تھوڑی دیر میں علاقے کا تھانے دار آئے گا، اسے اٹھالے جائے گا اور دو چار دن کے لیے بند کر دے گا۔ رشیدا پہلوان نے تھانے میں جھگڑے کی خبر پہنچوا دی تھی۔

لوگ یہ سب دیکھ دیکھ کے اکتا چکے ہوں گے کیوں کہ میں نے دیکھا سڑک کے دوسری طرف جو بھیڑ جمع تھی اب چھٹنے لگی تھی پر میں نے دیکھا استاد ہذا بھاول پوری اسی طرح سر جھکائے ڈفونے کا اٹھنا گرنا دیکھے جا رہے تھے۔ استاد کو میں نے اتنا ڈھال کبھی نہیں دیکھا تھا۔ پھر اچانک ہی عجیب بات ہوئی۔

بڑی بڑی آنکھوں والا لمبے قد کا ایک جوان آدمی جس کے لہراتے ہوئے سیاہ چمکیلے بال کندھوں تک آرہے تھے، سفید کرتہ تہ بند پہنے ننگے پاؤں سڑک پر دوڑتا ہوا آیا اور گھٹنے ٹیک جارج ڈفونے کے برابر بیٹھ گیا۔ اس نے ایک ہاتھ جارج کے سر کے نیچے لگایا دوسرا ہاتھ اس کی مڑی تڑی ٹانگوں کے نیچے پہنچا کر ایک ہی بار کے مضبوط جھکولے میں بچے کی طرح ڈفونے کو سنبھال کر فٹ پاتھ سے اٹھ کھڑا ہوا۔

ڈفونے کو اور خود کوفٹ پاتھ سے اٹھاتے، زور لگاتے ہوئے اس نے کہا تھا، ”ال... لل... لا... ہ!“ پھر جیسے دوڑتا ہوا آیا تھا اسی طرح وہ اپنا بوجھ اٹھائے پرانی مارکیٹ کی طرف دوڑنے لگا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی ڈفونے کو اٹھالے جانے والے اس آدمی کے پیچھے میں چل

پڑا۔ کچھ اور لوگ بھی تیز قدم مارتے پیچھے چلے آرہے تھے۔

پرائی مارکیٹ کی طرف مڑنے والی سڑک پر میرا آنا جانا کم ہی ہوتا تھا۔ ادھر کریانے کی چھ آٹھ دکانیں تھیں۔ سڑک پر ویلڈنگ اور ٹین کا کام کرنے والے بیٹھتے تھے۔ ایک لائڈری اور ساتھ میں حجام کی دکان تھی۔

سفید کپڑوں والا جوان آدمی ڈفونے کو اٹھائے حجام کی دکان کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ہذا استاد ساتھ ساتھ بھاگتے ہوئے آئے تھے۔ وہ میرے برابر سے تیزی سے نکلے اور دونوں ہاتھ بڑھا کر انھوں نے جارج ڈفونے کو سنبھالنے میں جوان کی مدد کرنی چاہی، مگر اس نے اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے استاد کی طرف دیکھا اور گہری گونج دار آواز میں ایک بار نرمی سے مگر جم کے کہا، ”نہیں!“

استاد نے ہاتھ کھینچ لیے اور جوان کو رستہ دے کر وہ ایک طرف ہاتھ باندھے خاموش کھڑے ہو گئے۔

ڈفونے کو اٹھائے ہوئے وہ جوان حجام کی دکان میں چلا گیا۔ کسی نے اندر سے دکان کے پردے کھینچ دیے۔

بلڈنگ والا ایک پڑوسی، دو تین رہگیر، ہذا استاد اور میں دکان کے سامنے کھڑے رہ گئے۔

میں نے گھبرا کے ہمسائے کی طرف دیکھا۔

ہمسائے نے دھیرے سے کہا، ”یہ مرشد ہیں۔“

اچھا؟ تو یہ ہذا استاد کے مرشد ہیں اور یہ ان کا ’سے لون‘ ہے۔

ہذا استاد کو کئی دن کے بڑھے ہوئے شیو کے ساتھ ’سے لون‘ کے سامنے نڈھال اور

افسردہ کھڑا چھوڑ کے میں سر جھکائے دھیرے دھیرے چلتا ہوا بلڈنگ میں آ گیا۔

دیر سے میں باہر تھا۔ ڈفونے کی وجہ سے لاجی صاحب ویسے ہی غصے میں تھیں، مجھے

چوروں کی طرح گھر میں گھستے دیکھ کر شروع ہو گئیں۔ برسوں سے جو گالیاں نہیں سنی تھیں، سننا پڑیں۔

دن بھر کسی سے بات نہ کی، میں خاموشی سے اپنا کام کرتا رہا۔ شام کے لیے سودا

لینے گیا تو سیدھا استاد کی ٹال کی طرف نکل گیا۔ دن میں جو کچھ دیکھا تھا وہ میری سمجھ میں نہیں

آیا تھا۔ ارادہ تھا استاد سے پوچھوں گا۔ یہ سب آخر کیا ہو رہا ہے؟ مرشد صاحب ڈفونے کو اٹھا

کے اپنے 'سے لون' میں لے گئے تھے۔ استاد نے ہاتھ لگانا چاہا تھا تو مرشد نے منع کر دیا تھا۔ کیوں؟ اور یہ استاد کو کیا ہو گیا ہے؟ ہفتے چھ دن کے بڑھے ہوئے خط کے ساتھ ننگے سر، میلے ملگے کپڑوں میں ادھر ہی گانے بجانے والیوں کے بازار میں دکھائی دے رہے ہیں۔ ہمیشہ کلف لگی پگڑی سر پر رہتی تھی، اب وہی پگڑی مٹ میلے سانپ کی طرح گلے سے لپٹی رہتی ہے۔ سر کے بالوں، مونچھوں کو دسمہ مہندی لگاتے تھے۔ بالوں کی جڑیں سفید نکل آئیں، انھیں پرواہی نہیں ہے۔ استاد بیمار تو نہیں ہو گئے؟

ٹال پر پہنچا تو استاد کے نوکر اسی محنت سے کام میں لگے تھے۔ چار چھ پٹھے بھی بکرا منڈی والے اکھاڑے سے آئے ہوئے بیٹھے تھے۔ استاد نہیں تھے۔ میں نے پوچھا تو ان کے ایک پٹھے نے مری ہوئی آواز میں کہہ دیا کہ خط بنوانے گئے ہیں۔ مطلب، وہیں اپنے مرشد کے سے لون کے سامنے کھڑے ہوں گے۔

مجھے پریشانی ہونے لگی۔ میں ساگر دادا کے پاس جا بیٹھا۔ وہ ریتی سے آرے کے دندا نے گھس رہے تھے۔ میں نے جاتے ہی استاد کا پوچھا۔ دادا نے ایک بار نظر اٹھا کے مجھے دیکھا، بولے کچھ نہیں۔ مجھے غصہ اس بات کا تھا کہ دوسروں کو، بلکہ سبھی کو، ساری بات معلوم ہے... مجھے کوئی کیوں نہیں بتاتا۔

میں نے ساگر دادا سے اب کے ذرا غصے سے پوچھا۔

انھوں نے ریتی ہاتھ سے رکھ دی۔ میری طرف ذرا سا جھک کر بولے، ”میں ان پڑھ آدمی ہوں جاوید! استاد اور ان کے مرشد صاب اور مرید سارے، وئی یہ جانکار لوگ ہیں۔ پرسوں چوتھ کتنی ہی دیر تک میں ادھر سے لون میں بیٹھا رہا۔ مطلب یہ کہ آخر پتا تو چلے کہ ہذا استاد کو کیا پریشانی ہے؟ بیمار ہو گئے ہیں؟ کوئی ہو رہا ہے؟... آخر پتا تو چلے۔ پر جاوید! کوئی پتا نہیں لگتا۔ استاد پہلے دن تیرے سامنے خط بنوانے سے لون کی طرف گئے تھے۔ مرشد نے دکان پر نہیں چڑھنے دیا۔ گھنٹا دو گھنٹا سڑک پر بیٹھ کے آگئے۔ پھر دوسرے دن گئے، سارا دن بیٹھے رہے۔ مرشد صاب نے دنیا کے بال کاٹے، خط بنایا، مالش کی، ناخن لیے، مگر ہذا استاد کی طرف نظر ہی نہیں ڈالی۔ یہ سارا دن ادھری بھوکے پیاسے بیٹھے رہے۔ رات کو لوٹ کے یہیں ٹال پر آ کے لیٹ گئے۔ سوئے کیا ہوں گے، میری تو جب آنکھ کھلی، کروٹیں بدل رہے تھے۔ صبح بھی بکرا منڈی والے گھر نہیں گئے۔ سویرے سے پھر ادھری نمبر لگا دیا۔ کچھ سمجھ نہیں آتا۔

اوں ہنک! آج اتنے دن ہو گئے، یہ نئی چل ریائے۔“

میں نے پوچھا، ”کھانے پینے کا کیا ہے؟“

ساگر دادا بولے، ”رات میں ایک ٹیم روجن داری مجوروں کے، میرے ساتھ بیٹھ کے ایک آدھا ٹکڑا توڑ لیتے ہیں، ہور بس۔ بادام دودھ، آجوش، لسی وی، سب کھلائیاں پلائیاں بند ہیں۔“

استاد کا ایک پٹھا میرے برابر آ کے بیٹھ گیا تھا۔ پوچھنے لگا، ”تو جاوید اکیل ہے نا؟“ میں نے کہا، ”ہاں۔“

بولاً، ”استاد بڑا ذکر کرتے ہیں تیرا... تو ابھی اُدھر جائے گا، سے لون کی طرف؟“ میں نے ہاں میں سر ہلایا تو وہ جھپٹ کے گیا اور استاد کے پلنگ کے سرہانے رکھی کپڑے کی ایک تھیلی اٹھالایا، میری طرف بڑھا کے بولا، ”یہ لے جانا ادھر۔ سیب ہیں۔ تیرا بڑا مان کرتے ہیں استاد۔ تو کہے گا تو شاید... دو چار سیب کھالیں گے۔“ میں نے کہا، اچھا، مگر مجھے امید نہیں تھی۔

دومنٹ اور ٹال پر بیٹھ کے میں مرشد والی حجام کی دکان پر آ گیا۔

ہذا استاد دکان کا رستہ چھوڑ کے، ہاتھ باندھے، سڑک کی طرف پیٹھ کیے کھڑے تھے۔ سے لون میں مرشد اور ان کے دو مرید گاہکوں کی خدمت میں لگے ہوئے تھے۔ مرشد صاحب پتلا کنگھا، پتلی قینچی سنبھالے گدھا گاڑی والے شپے کے انگریزی بال کاٹ رہے تھے۔ مرشد گاہک کی کرسی کے دائیں طرف ہوتے تو ہذا استاد اُس طرف اپنا رخ کر لیتے۔ وہ بائیں طرف آتے تو استاد ادھر کو منھ کر لیتے۔ انھوں نے میرے سلام کا جواب دیا تھا نہ ہی میری طرف دیکھا تھا۔

ٹوٹے ہوئے ہار کی طرح گردن میں ملگجی پگڑی ڈالے، جھکی ہوئی او بڑکھا بڑ موچھوں اور چھ سات روز کی کچھڑی ڈاڑھی میں استاد اپنا سایہ لگتے تھے۔ میرے حلق میں جیسے کچھ پھسنے لگا۔ جی چاہا استاد سے لپٹ کے رونے لگوں۔ یہ وہ طرزے وال بھاپوری پہلوان ہی نہیں تھے جنہیں میں جانتا تھا۔ یہ تو کوئی تھکا ہارا بوڑھا آدمی تھا جو بھک منگوں کی طرح حجام کی دکان کی طرف منھ کیے خدا معلوم کس انتظار میں کھڑا تھا۔

میں نے استاد کے مرشد کی طرف دیکھا۔ ٹھیک اسی وقت مرشد نے اپنی بڑی بڑی

آنکھوں سے ادھر نظر ڈالی۔ ان کی آنکھوں میں دنیا جہان کی نرمی اور مروت تھی۔

وہ سب کے لیے اتنے پیے، اتنے مہربان تھے تو پھر ہذا استاد پر ایسی سختی کس لیے؟ میں نے مرشد صاحب کے لیے اپنے دل میں ایک شکوہ سا، بلکہ ایک غصہ جیسا محسوس کیا۔ کوٹھے پر پلے ہوئے اس لڑکے کو... مجھے... آج دن تک خبر نہیں ہے کہ باپ کیا ہوتا ہے، ماں کیا ہوتی ہے۔ بس ہذا استاد مجھے باپ جیسے لگتے ہیں۔ مگر مرشد صاحب نے میرے اس باپ کو یہ کیسا باندھ رکھا ہے۔ کیا حالت کردی ہے استاد کی۔ میں رُندھے ہوئے گلے کے ساتھ اپنے غصے میں سیبوں کی تھیلی پکڑے حجام کی دکان پر چڑھ گیا۔

”سلاما لیکم!“ میں نے تیکھے پن سے مگر تمیز سے سلام کیا تھا اور کہا تھا، ”میں جاوید ہوں، ان کا... ہذا استاد کا... بچہ۔“

مرشد نے گاہک کے سر سے قینچی کنگھا ہٹالیا۔ مسکراتی ہوئی ان کی بڑی بڑی آنکھیں جیسے سینے میں اتری جا رہی تھیں۔

بولے، ”وعلیکم السلام!... اچھا جاوید ہو؟ پر کیا لے آئے، اسیل!“

انھیں استاد کا دیا ہوا میرا یہ نام معلوم تھا۔

میں نے بے خوفی سے کہا، ”مرشد! سیب لایا ہوں... استاد کے لیے۔“

”ہوں!“ انھوں نے مسکراتے ہوئے سڑک پر ہاتھ باندھے کھڑے ہذا استاد کی طرف دیکھا، نرمی سے بولے، ”سیب لائے ہو؟ یہ بتاؤ حرام کمائی کے تو نہیں ہیں؟“

میں چپ رہا تو بولے، ”یہ سیب حلال کمائی کے ہوں گے؟ کیوں بھی اسیل!“

میں کیا جواب دیتا۔ خاموشی سے استاد کی طرف دیکھنے لگا۔

اپنے مرشد کے اس سوال پر ہذا استاد نے دونوں ہاتھ جوڑ کے چہرے کے سامنے کر لیے تھے۔ میں نے دیکھا استاد کا پورا بدن کانپ رہا تھا۔

میں سمجھ گیا۔ مرشد نے یہ بات مجھ سے نہیں کہی تھی۔ یہ بات ہذا استاد کے لیے تھی۔ ٹھیک اسی وقت سامنے سڑک پر سے چمنیا بائی گزری۔ یہ ستر بہتر برس کی بیمار عورت کسی زمانے میں بلا کا ناچتی تھی۔ سنا ہے ہزار ہزار میل سے اس کے بلاوے آتے تھے۔ اب یہ گٹھیا کی مریض تھی، اور لاوارث۔ جان پہچان کی کوٹھے والیوں اور دو چار دلالوں نے اس کا

روزینہ مقرر کر دیا تھا۔ کوئی آٹھ آنے، کوئی ایک روپیہ روز اس کے ٹھکانے پر بھجوا دیتا تھا۔ بس گزارا ہو جاتا تھا۔

مرشد نے اب جو استاد سے بات کی تو ویسے ہی نرمی کے ساتھ، بولے، ”اگر حلال کمائی کے ہیں تو... ہدایت اللہ! یہ سامنے ماں جا رہی ہے میری، سیب اسے دے دو۔“ مرشد نے نرم سیاہ لٹیں جھٹکتے ہوئے اپنے سر سے چمنیا بائی کی طرف اشارہ کیا تھا اور سیبوں کی تھیلی مجھ سے لے کر نیچے سڑک پر کھڑے استاد کی طرف بڑھائی تھی۔

استادیوں چلے جیسے مُردے میں اچانک جان پڑ گئی ہو۔ دکان کے تختے کے پاس آ کر وہ جھکے انھوں نے دونوں ہاتھ اٹھا کر سیبوں کی تھیلی سنبھالی، اسے ایک بار اپنے سر پر رکھا، پھر سڑک پر مشکل کے ساتھ آہستہ آہستہ جاتی ہوئی چمنیا بائی کے پیچھے لپکے۔

”اماں!“ ہذا استاد نے اسے آواز دی، ”اماں!“

چمنیا بائی کو کبھی کوئی اماں نہیں کہتا تھا۔

ویسے بھی وہ اونچا سننے لگی تھی۔ استاد کی دوسری آواز پر وہ رکی تو انھوں نے دونوں ہاتھوں پر رکھی سیبوں کی تھیلی اس کی طرف بڑھا دی۔

”اماں، سیب ہیں تیرے لیے۔“

چمنیا بائی نے آنکھیں پٹپٹائیں، ”سیب؟ میرے لیے؟ آں؟“

ہذا استاد نے ہاں میں سر ہلایا تو آنکھوں میں ٹھہرے ہوئے آنسو گالوں پر لکیریں بنا کر بہنے لگے۔

بوڑھی مرگلی ڈانسر نے کانپتا ہوا اپنا سوکھا پنجا بڑھا کر سیبوں کی تھیلی اٹھالی۔ ہذا استاد نے دونوں ہاتھ پیشانی تک پہنچا کر چمنیا بائی کو سلام کیا، پھر کلمے کی انگلی اٹھائے ہوئے ہاتھ اونچا کیا اور ایک ہی جگہ پر ”ایلی ایلی“ کر کے ناچتے ہوئے ایک پھیرا لیا۔ پھر وہ مڑے اور حجام کی دکان کے تختے کے پاس پہلے کی طرح ہاتھ باندھ کے کھڑے ہو گئے۔

میں دکان سے اتر آیا تھا۔ گدھا گاڑی والا شینا کرسی چھوڑ کے ایک طرف کھڑا تھا۔ مرشد نے مسکرا کر پہلے شپے خرکار کو، پھر ہذا استاد کو دیکھا۔ نرمی کے ساتھ دھیرے سے بولے، ”ہدایت اللہ! آؤ بھئی۔ اب تمہارا نمبر ہے۔“

میں نے استاد کو دکان پر چڑھتے نہیں دیکھا۔ مجھے معلوم تھا، ان کی خوشی کو پھوارے

کی طرح اچھلتے ہوئے اب تو سبھی دیکھیں گے۔

میں بھاگتا ہوا ٹال کی طرف چلا گیا۔

پندرہ بیس منٹ بعد یہی سڑک جو قبرستان کا رستہ لگتی تھی، جشن والی رونق دکھلا رہی تھی۔
ہذا استاد کے پٹھے طبل اٹھالائے تھے اور نعرے مارتے ہوئے دکان کے آگے بھنگڑا
ڈال رہے تھے۔ کسی نے دکان کا پردہ کھینچ دیا تھا اس لیے نظر تو آنہیں رہا تھا کہ مرشد کے 'سے
لون' میں کیا ہو رہا ہے، بس ایک چہل پہل، ایک گہما گہمی لگتی تھی۔

کوئی آدھے گھنٹے بعد 'سے لون' کا پردہ واپس کھینچ دیا گیا۔ ہذا استاد کرسی پر تھے۔
سڑک کی طرف ان کی پیٹھ تھی۔ وہ اٹھے اور مڑے تو سب نے دیکھا کہ ان کے بال ترشے
ہوئے، خط بنا ہوا تھا۔ مونچھیں اسی طرح چڑھی ہوئی تھیں جیسی سب ہمیشہ سے دیکھتے آئے
تھے۔ بے حساب خوشی سے اور مردوں والے سنگھار سے استاد کا چہرہ چمک رہا تھا۔ ان کی گردن
میں سرخ رنگ کا جھلمل کرتا نیا سیلا بھی پڑا تھا۔

استاد کے پٹھوں نے دیکھا اور اپنے اکھاڑے کی فتح کا نعرہ لگایا، ”ایلی ایلی ایلی،
قلندر ایلی سے در، قلندر ایلی سے در۔“ اس وقت ساگر دادا کا ہاتھ طبل پر تھا۔
بلڈنگوں کی بالکنیاں دور دور تک گانے بجانے والیوں اور انھی جیسے مردوں عورتوں
سے بھر گئیں۔

استاد اور ان کے تین چار پیر بھائی اس وقت دکان میں نظر آ رہے تھے۔ مرشد کہیں
اندر ہوں گے۔ میں نے دیکھا استاد بار بروالی کرسی کے پیچھے گئے جہاں مرشد کھڑے ہو کر کام
کرتے تھے۔ انھوں نے جھک کر فرش کے اس حصے کو چھو لیا، پھر جو مٹی انگلیوں کی پوروں سے
لگی رہ گئی اسے پیشانی پر مل لیا۔ استاد نے گردن میں پڑا سرخ سیلا اب سر سے باندھا اور
”قلندر“ کا نعرہ مار جوانوں کی طرح کود کر سڑک پر آ گئے اور جس طرح جیتا ہوا پہلوان ایک
ٹانگ پر اچھلتا اکھاڑے کا چکر لگاتا ہے، استاد ہذا نے طبل کی تھاپ پر ”ایلی ایلی“ پکارتے
ہوئے طوائفوں والی سڑک کا دورہ شروع کر دیا۔

”قلندر ایلی سے در“ کرتے استاد کے سب شاگردان کے ساتھ تھے۔

ہماری بلڈنگوں والی سڑک کے لیے وہ یادگار دن تھا۔ لگتا تھا یہاں کا سب کچھ بدل

گیا ہے۔

بعد میں کسی نے بتایا کہ 'سے لون' کا سودا ہو گیا تھا۔

مرشد اور ان کے مرید اگلے روز پتا نہیں کب چلے گئے۔

استاد ہدایت اللہ بھاول پوری نے کہاں جانا تھا، اُسی ٹال اور اُسی بکرا منڈی کے اکھاڑے پر جمے رہے۔ لیکن استاد اب دوسرے ہی آدمی تھے۔ بیسواؤں، گانے بجانے والیوں کو گالی تک نہیں نکالتے تھے۔

بلڈنگوں والی سڑک کی وہ دکان اب بھی 'مرشد کا سے لون' کہلاتی ہے۔ دکان خریدنے والے نے مرشد کو دور سے دیکھا تھا۔ وہ تو مرید بھی نہیں ہوا تھا، مگر نئے بورڈ پر اُس نے یہی لکھوا دیا تھا۔ سردیوں میں پابندی سے وہ حمام گرم کرتا تو ہفتے میں ایک بار استاد لکڑی کے اچھے اچھے سوکھے لٹکوں سے ہاتھ گاڑی بھر کے خود مرشد کے سے لون پہنچا آتے تھے۔ سے لون والے سے پیسے لینا، سمجھوان کے لیے حرام تھا۔ اس وقت بھی وہاں کے زیادہ تر گاہک وہی تماش بین لچے لفنگے ہوتے تھے جو گانا سننے، حرام پائی کرنے بلڈنگوں والی سڑک پر نکل آتے تھے۔

شام پڑے استاد کبھی سڑک پر آ جاتے اور ان لوگوں کو سر میں تیل پھیل ڈالے، عطر ملے، کلائیوں پہ موتیے کے ہار لپیٹے تماش بینی کے ارادے سے تیز تیز قدموں جاتے ہوئے دیکھتے تو کہتے تھے، "مولا بڑا بے پروا ہے یار! کیا پتا مرشد ہوری کو پھر ادھری بھیج دیوے... ان گرے پڑوں کو بھی مرشد میرا، اسی طرح اٹھالیوے جیسے جارج خبرے کون کو فٹ پیری سے لا اللہ کر کے اٹھالیا تھا... ہاں یار، جیسے مجھ برے کو اٹھالیا تھا!"



سرکس کی سادہ سی کہانی

جیپ چل رہی تھی۔

وہ ابھی کہیں پہنچے نہیں تھے۔

تین چار گھنٹے سے جیپ چل رہی تھی۔ جیپ والا کسی سرکس کا رنگ ماسٹر تھا جس نے ان دونوں کو پیدل جاتا دیکھ کر بٹھالیا تھا، ”ارے پیدل کیوں جا رہے ہو؟ آؤ جی بھائی صاحبو بیٹھو! بیٹھ جاؤ!“

بھائی صاحبو اس نے عادتاً کہا ہوگا کیوں کہ جنھیں اس نے بٹھایا تھا ان میں ایک مرد تھا، دوسری عورت۔

رنگ ماسٹر کہیں سے پوری بوتل لگا کے چلا تھا۔ آدمی دل پھینک تھا اور خوب باتیں بنا سکتا تھا۔

کہنے لگا، ”اب صبح ہونے والی ہے، میرا نشہ ٹوٹ رہا ہے اسی لیے جلدی پہنچنا چاہتا ہوں بھائی صاحبو!“ پھر بولا، ”دن اُوگے تک سرکس گراؤنڈ آجائے گی۔ اور وہاں بھائی صاحبو! میں تم دونوں کو بڑا جنگلی ناشتا کراؤں گا۔“

پچھلے بیٹھی عورت اپنے آدمی سے دھیرے سے کچھ کہہ کر ہنسی ہوگی تو رنگ ماسٹر نے جیپ کی رفتار ذرا دھیمی کر کے اونچی آواز میں کہا، ”ہاں بھائی صاحبو؟ کیا بات ہوگئی؟ ہمیں بھی

سناؤ۔ ہم بھی نہیں گے۔“

عورت انجن کی آواز پر اپنی آواز بلند کر کے بولی، ”کچھ نہیں جی، بات کیا ہوگی۔“
رنگ ماسٹر ٹھٹھا مار کے ہنسا، ”کچھ تو ہے جس کی راز دھاری ہے۔ بہت دیر سے
آپ دونوں بھائی صاحبوں کے راز و نیاز کی آواز آرہی ہے۔ کیا کوئی موج میلہ چل رہا ہے
پیچھے؟... ہا ہا ہا! ہاں نا بھائی صاحبو!“

مرد نے کوئی کڑوی بات کہنے کے لیے اشارٹ ہی لیا تھا کہ عورت نے اس کے منہ
پر ہاتھ رکھ دیا اور رنگ ماسٹر سے پوچھا، ”سرکس گراؤنڈ اور کتنی دور ہے؟“

وہ بولا، ”بس بھائی! سمجھو پہنچ گئے۔ پہلے ہمارا ہی ٹینٹ ہے۔ اس وقت اس میں
ہماری بیلا جی سو رہی ہوں گی۔ ان کو تو ہم اٹھائیں گے نہیں۔ وہ کچی نیند سے اٹھ جائیں تو سارا
سارا دن گندی گندی گالیاں بکتی ہیں۔ اس لیے آپ بھائی صاحبوں کے لیے ہم خود ہی کوئی
ناشتا واشتا تیار کر لیں گے... ہاں بھائی صاحبو!“

مرد نے آدھی جھونکھل، آدھے مسخرین میں کہا، ”اچھا بھائی صاحبو!“
عورت ہنسنے لگی۔

مرد نے پھر پوچھا، ”مگر بھائی صاحب! تم نے یہ نہیں بتایا کہ یہ بیلا جی کون ہے۔
بیوی ہے تمھاری؟“

رنگ ماسٹر بولا، ”بیوی ویوی کوئی نہیں۔ وہ رکھیل ہیں ہماری۔“
عورت اور زور سے ٹھٹھے مار کے ہنسنے لگی تو ’بھائی صاحبو‘ خود بھی ہنسا، بولا، ”آپ
صاحبوں کو گشتی سرکسوں کا کچھ پتا ہی نہیں ہے، اسی لیے ہنستے ہو۔ ارے ہم اگر اپنے ساتھ کوئی
بیوی ویوی رکھیں تو چل چکا سرکس۔ چل ہی نہیں سکتا۔ بالکل بھی نہیں۔“

مرد کو اس کی باتوں میں مزہ آنے لگا تھا، اس نے پوچھا کہ کیوں نہیں چل سکتا؟
کہنے لگا، ”بیویاں تو ویسے ہی اپنے مردوں کی پتلونیں پھاڑ رکھتی ہیں، ہوشوں
حواسوں میں نہیں رہنے دیتیں۔ اور بھائی، ہمارا کام جان جو کھم کا کام ہے۔ کوئی ساٹھ فٹ
اونچے تار پر چل رہا ہے بھائی صاحبو! تو کسی نے اوپر پٹرول چھڑک کے آگ دکھا کے، سو فٹ
کی اونچائی سے بالشت بھر کے ٹب میں چھلانگ لگانی ہے۔ کوئی شیر کے منہ میں اپنی کھوپڑی
دیے بیٹھا ہے بھائی صاحبو! تو کسی نے ریچھ کے پچھائے میں ہاتھ دے کے کرتب دکھانے

شروع کیے ہیں... الغرض سب سرکس والے اپنی جان پر کھیل کے روزی کمار ہے ہیں۔ ایسے میں کون عقل سے پیدل طوطیا ہوگا جو اپنے اوپر چڈی گٹھانے کو ایک بیوی بھی رکھے گا۔ نا صاحبو نا! ہم لوگ تو رکھیلوں و کھیلوں سے گزارا کر لیتے ہیں۔ شروع سے یہی چل رہا ہے... اور کیا!“

عورت ہنستے ہنستے دُہری ہو گئی۔ بڑی مشکل سے ہنسی تھام کے ٹکڑوں ٹکڑوں میں بولی، ”اور یہ جو... رکھیل تمھاری، تمھیں گالی دیتی ہے گندی گندی... یہ کیا ہے؟ اس نے بھی تو تمھارے اوپر چڈی گانٹھ رکھی ہے؟“

وہ بولا، ”نا بھائی صاحبو! نا۔ بیلا جی ٹائم ٹائم سے گالی نکالتی ہے... وہ جو بولتے ہیں نا کہ تیرے ہونٹ کتنے شیریں ہیں کہ گالیاں کھا کے بھی وہ سررا بے مزہ نہیں ہوتا... تو وہی قصہ ہے بھائی صاحبو! پھر اگر بیلا جی ڈاہ لنگ کبھی بے سری بولنے لگتی ہیں، آؤٹ ہونے لگتی ہیں، تو آپ کا فلک شیر رنگ ماسٹر ان کی سڑائی بھی کر دیتا ہے... تاہم بیویوں کی سڑائی نہیں کی جاسکتی... بہ وجوہ!“

عورت نے پوچھا، ”سڑائی کیا ہوتی ہے؟“
فلک شیر رنگ ماسٹر (یہی اس کا نام تھا) بولا، ”آپ سڑائی نہیں جانتیں بھائی صاحبہ؟ ارے پھینٹی لگانے کو بولتے ہیں۔ چار چوٹ کی مار لگائی نہیں کہ بیلا جی پھر گنے کی طرح سیدھی اور میٹھی۔“

مرد نے کہا، ”ہاں ماسٹر! یہ بتاؤ بیوی کو جو پھینٹی نہیں لگائی جاسکتی اس کے کیا وجوہ ہیں؟“

رنگ ماسٹر بولا، ”حیرت ہے صاحبو! آپ بیوی والے ہو کے بھی یہ وجہ نہیں جانتے... خیر، اس ٹائم کیوں کہ آپ کی میم صاحب سامنے موجود ہے یہ نکتے کی باتیں پھر کبھی عرض کروں گا۔ لو جی! آگئیں سرکس گراؤنڈز۔“

انھوں نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سب طرف پیلے بلبوں کی جھالیں ٹنگی نظر آ رہی تھیں۔ سورج نکلنے میں دیر تھی۔ ایک عمومی سناٹے میں ڈیزل یا کیروسین سے چلنے والے رجزیٹروں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ میلے کچیلے اور آل پہنے، گٹھنوں تک کے ربڑ کے جوتے چڑھائے بہت سے آدمی جانوروں کو کھانا پانی دینے اور پنجرہ کی صفائی کرنے خیموں

کے درمیان سے نکل نکل کے آ جا رہے تھے۔ پیپے لگے پنجروں کی ایک قطار خیموں چھو لدا ریوں کے بیچ کھڑی کر دی گئی تھی۔ اب مختلف جانوروں کی بھی ہلکی ہلکی آوازیں آنا شروع ہو گئی تھیں۔ وہ شاید جیپ کی آواز سے بے آرام ہو کر بیدار ہو رہے تھے۔ جیپ رک گئی۔

رنگ ماسٹر انجن بند کر کے اترتے نشے اور شرارت کے ساتھ عورت مرد کو دیکھ کر آنکھ مارتا ہوا پردہ اٹھا، پنجوں کے بل اپنے ٹینٹ میں چلا گیا۔ دو تین منٹ بعد پکنک باسکٹ جیسی بید کی صندوق کی صندوق ٹوکری اٹھائے وہ برآمد ہوا اور ہونٹوں پر انگلی رکھ کے انھیں پیچھے آنے کا اشارہ کرتا خیموں کے بیچ بیچ چلنے لگا۔ ڈانگریوں والے ورکر اس کے سائے کو پہچان پہچان کر سلام کر رہے تھے۔

بلبوں کی پیلی روشنی میں سرکس کے خیمے کچھ زیادہ اُجاڑ اور صبح کی آوازوں کے ہوتے بھی خاموش اور افسردہ لگ رہے تھے۔ تاہم اس افسردگی اور اُجاڑ پن میں دور ایک بہت بڑا خیمہ روشنی سے اور چمکیلی آوازوں سے چھلکتا ہوا دکھائی دیا۔

رنگ ماسٹر اپنی پکنک باسکٹ اٹھائے اسی روشن خیمے میں داخل ہو گیا اور اندر رک کر اپنے مہمانوں کا انتظار کرنے لگا۔ اب وہ اونچی کھلکھلاتی آواز میں انھیں خیمے میں چلے آنے کو کہہ رہا تھا، ”چلے آؤ بھائی صاحبو! آ جاؤ۔ رکنا نہیں ہے۔ توقف نہیں کرنا ہے۔ یہ خیمہ بے تکلف ہے بھائی صاحبو! شیروں، اثر دہوں سے پنجا کرنے والے دیروں کے لیے طاقت سے بھرپور ایک دم بم فولادی ناشتے اسی خیمے میں ملیں گے۔ سمجھے بھائی صاحبو! تکلف نہیں کرنا ہے، یعنی توقف نہیں کرنا ہے۔ بس آ جاؤ۔“

رنگ ماسٹر کے اور مہمانوں کے خیمے میں داخل ہوتے ہی اندر کے سب ان کی طرف متوجہ ہو گئے۔

مگر نہیں، ”ان کی طرف“ زیادہ درست نہیں ہے، کیوں کہ سب رنگ ماسٹر اور عورت ہی کو دیکھ رہے تھے۔ مرد تو جیسے ان کے ساتھ تھا ہی نہیں۔

گٹھے ہوئے بدن والے تین چار بونوں نے منہ میں انگلیاں ڈال کر تیز تیز سیٹیاں ماری تھیں اور ”ہا ہا ہا“ کی آواز نکالی تھی۔ رنگ ماسٹر خود کو اس وقت سرکس کے رنگ میں اُترا ہوا سمجھ رہا تھا۔ اس نے سیٹیوں کے جواب میں ایک قدم آگے بڑھ کر عورت کو خود سے بھڑالیا، اس

کی کمر میں ہاتھ ڈال کے جھک جھک کر ہاتھ ہلاتے ہوئے کسی بات کی داد وصول کرنے لگا۔
ہجوم میں سے ایک نے چیخ کر کہا، ”وا بھئی واہ... ماسٹر فلک شیر نے ایمان سے یہ
نمبر ون ماشوک گھیرا ہے!“

رنگ ماسٹر نے خوش ہو کے ٹھٹھا لگایا اور داد وصول کرتے ہوئے پھر ہاتھ لہرایا۔
عورت کا مرد غصے سے بے قابو ہو گیا۔ اس نے بڑھ کر رنگ ماسٹر کی کلائی پکڑی اور
جس ہاتھ سے وہ عورت کو گھیرے ہوئے تھا وہ ہاتھ جھٹکے سے کھینچ کر ہٹا دیا۔
ہجوم نے خوشی کا نعرہ مارا ”واہ!“ وہ سب سمجھ رہے تھے اب رقیبوں کی لڑائی شروع
ہوگی مگر انھیں مایوسی ہوئی۔

عورت نے ہنستی ہوئی آنکھوں سے اپنے مرد کو دیکھا اور ہجوم سے چیخ کر کہا،
”سنوے سنو۔ رنگ ماسٹر میرا ’ماشوک‘ نہیں ہے۔ میرا ’ماشوک‘ یہ ہے۔“ اس نے کمر میں
ہاتھ ڈال کے اپنے آدمی کو ہجوم کے سامنے کر دیا۔ پھر ہنستی ہوئی آواز میں چیخ کر کہنے لگی،
”ارے رنگ ماسٹر تو میری ماں کا بھائی ہے۔ ماما ہے میرا۔ سمجھو اس میرے ’ماشوک‘ کا میا سر
ہے۔ کچھ سمجھے میا سر کیا ہوتا ہے؟“

ہجوم نے ایک آواز ہو کے کہا، ”ہاں، سمجھ گئے۔“
”کیا ہوتا ہے؟“ عورت نے پھر ہنستے ہوئے پوچھا۔
دو تین آوازوں نے گا کر کہا، ”ماشوک کا سر ہوتا ہے۔“ اور باقی سب تالیاں
بجانے لگے۔

رنگ ماسٹر بے وجہ کھلا پڑتا تھا۔ وہ ہر سمت میں جھک جھک کر اور ٹھک ٹھک کر کے
اپنی ایڑیاں بجا رہا تھا جیسے یہ پورا شو اسی کے لیے ہو رہا ہو۔ اسے بات بات پر داد وصول کرنے
کا شوق تھا۔

وہ تینوں اور پکنک باسکٹ کسی میز تک ابھی پہنچے بھی نہ ہوں گے کہ تالیاں بجاتے
سرکس والوں نے اپنی میزیں چھوڑ دیں اور انھیں گھیر لیا۔
مرد کا غصہ یا جھوٹا جھل، جو بھی تھی، اب ختم ہو چکی تھی۔ سرکس والے کھلے دل کے
لوگ لگتے تھے۔ ان کی باتوں سے عورت کی، یا کسی کی بھی تو ہین نہیں ہوتی تھی۔ وہ تو اپنی خوش
مزاجی اور امنگ میں نئے دن کا استقبال کر رہے تھے۔

رنگ ماسٹر نے میز سنبھالتے ہی سرکس والوں کو دھکے دیتے ہوئے کافی جگہ بنالی اور پکنک باسکٹ اپنی کرسی کے قریب فرش پر رکھ دی۔ اب اس نے کرتب دکھانے کے انداز میں باسکٹ سے ایک ایک چیز نکالنی شروع کی جو وہ اپنی مرضی سے کبھی عورت کے، کبھی مرد کے اور خود اپنے سامنے رکھتا گیا یا واپس باسکٹ کے حوالے کرتا گیا۔

ہر چیز دیکھ کر ہجوم داد دیتا یا تالی بجاتا تھا۔

باسکٹ سے وِسکی کی بوتلیں، بیئر کے ٹن، لمبے ڈنٹھلوں والے شیشے کے گلاس، پنیر کے سر بند ڈبے، کانٹوں دار تار، ڈبے کھولنے والے کٹر، کاگ اڑانے والے گھومے ہوئے اوپنر، پیچ کش اور دھمکیاں، الٹی میٹم اور بڑھیا بسکٹوں کے ٹن، بٹر پیپر میں لپٹی روسٹ کی ہوئی سالم مرغی، جھوٹی تسلیاں، دلا سے اور ڈینگیں، کافی پینے کے مگ، دھاندلیاں، کانٹے، چھریاں، اسلحے، پلیٹیں، ٹشو پیپر، وہاٹ پیپر، تھوڑی بہت امداد، آٹھ دس نارنگیاں، اتنے ہی سیب، مخمل کی خوب صورت تھیلی میں بند سخت سینکی ہوئی ڈبل روٹی، مکھن لگی روٹی، روٹی لگا مکھن، صرف روٹی اور صرف مکھن، کچھ اور روٹی، شہد کا جار اور وٹامن کی گولیوں کی شیشی... بے شمار چیزیں۔

سب نکلی آرہی تھیں۔ لگتا تھا عمر و عیار کی زنبیل ہے جس سے نعمتیں اور جھڑکیاں اور عشرتیں اور بہلاوے اور دوسری سب چیزیں بس چلی آرہی ہیں۔

رنگ ماسٹر نے گولیوں کی شیشی اٹھا کر ہاتھ بلند کرتے ہوئے، ہجوم کو ’درجہ بہ درجہ‘ آنکھ ماری اور اپنی اعلا نچیوں والی آواز میں عورت اور مرد کو مخاطب کر کے کہا، ”اور بھائی صاحبو! یہ ہیں اصلی سلاجیت کی جوہری گولیاں، یہ شیرنی کے دودھ اور کنوارے ریچھ کی کمر سے حاصل کیے ہوئے ایک خاص جوہر میں گوندھ کے تیار کی گئی ٹیبلٹیں ہیں بھائی صاحبو! جو حکیم ارسطا طالیس اصلی کی ایجاد ہیں صاحبو! اور موج میلے کی کارکردگی میں سمجھو کہ تیر بہ ہدف ہیں۔ اس لیے...“ اب وہ باقی ہجوم سے مخاطب تھا، ”اسی لیے بھائی صاحبو! یہ گولیاں میں اس معزز جوڑے کو پیش کرتا ہوں۔ اور کیوں نہ پیش کروں کہ اس وقت پورے سرکس گراؤنڈ میں ان دونوں سے زیادہ اس کا حق دار اور کون ہوگا... بتاؤ کون ہوگا؟“

ہجوم نے، جواب ہر طرف سے انھیں گھیر چکا تھا، چیخ کر ایک آواز میں کہا،
”کوئی نہیں!“

رنگ ماسٹر نے حکم دیا، ”اچھا تو ان کے لیے ایک ایک گلاس سادہ پانی لاؤ۔“

پانی آگیا۔

رنگ ماسٹر نے مرد اور عورت کو حکم دیا، ”تو بھائی صاحبو! دو دو گولیاں سلاجیت اصلی ممسک قرص جوہری درجہ اول آپ دونوں کھالو۔ فوراً... رام بھلی کرے گا۔“ عورت نے انکار کر دیا۔ مرد نے ہاتھ بڑھا کر شیشی اٹھالی۔ اس پر لکھا ہوا پڑھا۔ عام سی وٹامن بی کمپلیکس کی گولیاں تھیں۔ اس نے دو نکالیں اور پانی سے نگل لیں۔ رنگ ماسٹر سمیت ہجوم نے ”ہا آ... شیر کا بچہ ہے!“ کہہ کر تالی بجائی۔ مرد اٹھا، تعظیم کو جھکا اور اس نے داد وصول کی۔

وہ بھی ان کے رنگ میں رنگتا جا رہا تھا۔ اسے دیکھ کر عورت بھی اٹھی۔ اس نے بھی دو ’ممسک جوہری‘ گولیاں نکالیں، ہتھیلی پر رکھ کر پورے حلقے کو دکھائیں۔ حلقے سے پسندیدگی کی گونج سنائی دی۔

”ہا آ آ آ!“

عورت نے پہلے ایک پھر دوسری گولی پانی سے نگلی اور وہ اپنے مرد کی طرح داد وصول کرنے کو جھکی، اپنی فراک کا گھیرا تھام کر، دونوں گھٹنے خم کر کے اس نے ہجوم کو تعظیم دی۔

”ہا آ۔ شیر کی بچی ہے ماشوک! شیر کی بچی ہے۔“ اور ہجوم نے تالیاں بجانی شروع کر دیں۔

دو بونے میزوں کے بیچ خالی جگہ میں ایک دوسرے کے بچوں میں پنچے پھنسا کر گھسن گھیری ناچنے لگے۔

رنگ ماسٹر اور مہمان عورت مرد نے بھی تال دینی شروع کر دی۔ جو ہجوم انھیں گھیرے ہوئے تھا وہ اب گھسن گھیری ناچتے بونوں کی طرف گھوم گیا اور بڑے جوش سے تال دے دے کر کچھ گانے لگا، اس لیے تینوں اس تال دیتے گاتے ہجوم میں شامل ہو گئے۔ ان کی مرکزی حیثیت ختم ہو چکی تھی... اسپاٹ لائٹ سمجھو اب ان بونوں پر تھی۔

”تری درادا۔ تری درادا۔ تانا تانا، تن تانا۔ اوتری درادا۔ تری درادا۔“

نہ معلوم کیا گیت تھا۔ وہ جوڑا بھی سب کے ساتھ چیخ چیخ کر ”تری درادا“ کرنے لگا۔ کوئی پانچ سات منٹ یہ ناچ، تالیاں اور ”تری درادا“ چلتا رہا۔ پھر جس طرح اچانک بونوں نے ناچنا شروع کیا تھا، ایک دم ہی انھوں نے بند کر دیا۔ دونوں ہنستے اور ایک

دوسرے کی پیٹھ تھپکتے ہوئے دائرہ توڑ کر ایک طرف نکل گئے اور کرسیاں کھینچ کر بیٹھ گئے۔
ہجوم چھٹ گیا۔ سب اپنی میزوں پر چلے گئے۔ عورت اور مرد کو لیے ہوئے رنگ
ماسٹر اپنی میز کی طرف بڑھا اور... ٹھٹھک کر وہیں کھڑا رہ گیا۔

رنگ ماسٹر کی میز پر شیر کی کھال سے بنا کوسٹیوم پہنے، گل مچھوں والا ایک لمبا تڑنگا،
چوڑا چکلا اور ادھ ننگا باڈی بلڈر بیٹھا پر شور طریقے سے رنگ ماسٹر کے سبب کھا رہا تھا... کھا نہیں
رہا تھا، چر رہا تھا۔ باڈی بلڈر کے دونوں ہاتھوں میں ایک ایک سیب تھا اور وہ اپنے مضبوط سفید
دانتوں سے کبھی ایک سیب کو، کبھی دوسرے کو پھنساتا اور سر کا جھٹکا دے کر جیسے اکھاڑتا تھا، پھر
خچر کی طرح منہ چلاتے ہوئے چبانے لگتا تھا۔ سیبوں کے رس سے گل مچھوں سمیت اس کا نچلا
آدھا چہرہ چمک رہا تھا اور پھل کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے اس کی ہتھوڑے جیسی ٹھوڑی اور
بالوں بھرے سینے پر گر رہے تھے۔

”سرلپ سرلپ“ کی آوازیں سن کے اب دوسرے بھی ادھر دیکھنے لگے تھے۔
رنگ ماسٹر کو سامنے پا کر بھرے منہ کے ساتھ باڈی بلڈر ”ہو ہو ہو“ کر کے ہنسا۔
مرد پریشان ہو کر کبھی اسے کبھی رنگ ماسٹر کو دیکھنے لگا۔
رنگ ماسٹر غصے میں کانپنے لگا تھا۔

باڈی بلڈر بھونڈی آواز میں ہنستے ہوئے بولا، ”کیا سوچ رہا ہے؟ آ... مار مجھے! آ!“
عورت اور مرد نے سوچا، ”کیسی اچھی صبح طلوع ہونے والی تھی۔ اب سب کچھ برباد
ہو گیا ہے کیوں کہ ماحول میں غصہ ہے اور سب کے ساتھ کہیں کوئی دھاندلی کی جا رہی ہے۔“
رنگ ماسٹر نے سر جھٹک کر پیشانی پر ہاتھ پھیرا... بالکل اس طرح جیسے کوئی نیند کے
جھونکے سے پیچھا چھڑانا چاہ رہا ہو۔

باڈی بلڈر نے ہنستے ہوئے اسے پھر لکرا، ”آ... مار!“
رنگ ماسٹر عورت کی طرف گھوم گیا۔ دھیرے سے بولا، ”تم دونوں ایک منٹ کو ذرا
باہر جاؤ۔“

خیمے میں سناٹا ہو گیا۔

عورت نے رنگ ماسٹر کے شانے پر ہاتھ رکھا تو وہ ایک بار ایسے تھڑایا جیسے بجلی کا
زندہ تار اسے چھو گیا ہو۔ وہ پہلے کی طرح دھیرے سے کہنے لگا، ”نہیں بی بی! مجھے چھونا مت...“

اب ہاتھ نہیں لگانا۔ بالکل نہیں۔“

عورت کو اندازہ نہیں تھا۔ اس نے، ”اب ایسا بھی کیا“ کہہ کے رنگ ماسٹر کی پیٹھ تھپکنا چاہی تھی کہ وہ منہ اٹھا کے پوری طاقت سے چیخا: ”ہا آ آ آ آ!“ پھر اس نے جھپٹ کر قریب پڑی کرسی اٹھائی اور باڈی بلڈر کے سر پر چلا دی۔

مرد نے دل میں سوچا، ”یہ گیا شیر کی کھال والا گل ٹچھڑ... اب نہیں بچتا۔“ مگر باڈی بلڈر نے بیٹھے ہی بیٹھے ہاتھ اٹھایا اور بازو کے پُر گوشت حصے پر یہ وار روک لیا۔ کرسی ٹوٹ کے گر گئی۔

مرد نے اپنی عورت کو بانہ سے پکڑا اور کھینچتا ہوا اسے خیمے سے باہر لے گیا۔ جاتے ہوئے اُس نے سنا اندر سے ایسی آوازیں آئی تھیں جیسے سائنڈ پھنکار تے ہوئے ایک دوسرے پر جھپٹ رہے ہوں۔ خیمے میں بھرے ہوئے لوگوں نے ”نانانا“ کہتے ہوئے کسی کو باز رکھنے کے لیے ایک ساتھ شور مچانا شروع کر دیا تھا۔

وہ دونوں خیمے سے نکل کر دو قدم ہی چلے ہوں گے کہ اندر ”پھٹ“ کی سی آواز ہوئی۔ لگتا تھا چھوٹے بور کا فائر آرم چلایا گیا ہے۔ کسی کے دھم سے گرنے کی بھی آواز آئی تھی۔ مرد واپس اندر جھپٹا۔ عورت اس کے پیچھے تھی۔ رنگ ماسٹر اپنی میز کے قریب ہاتھ میں پتیل کا چھوٹا سا جیبی پستول لیے کھڑا تھا۔ پستول کی نال سے ابھی تک دھواں نکل رہا تھا اور باڈی بلڈر کی کرسی الٹی پڑی تھی۔

برابر سے ایک بونا، ”مار دیا رے مار دیا، آسو بلے کو مار دیا،“ چلاتا ہوا باہر بھاگا۔ کوئی اور اسے روکتا ہوا پیچھے چلا تھا مگر بونا بہت تیز دوڑ رہا تھا۔

عورت مرد نے فرش پر گرے ہوئے باڈی بلڈر کو دیکھا۔ وہ ٹوٹی کرسیوں کے بلے میں پڑا اپنا دایاں شانہ سختی سے دبائے اٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کی انگلیاں خون میں بھیگتی جا رہی تھیں۔ آسو بلا (بونے نے اس کا یہی نام لیا تھا) مرا نہیں تھا۔ وہ اٹھ کر بیٹھنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ وہ اب تک منہ چلا رہا تھا۔ ”ہو ہو“ کر کے ہنستے ہوئے اس نے منہ میں بھرے سیب کے ٹکڑے اور لگدی فرش پر گرا دی اور بولا، ”پستول چلاتا ہے... حرامی!“

رنگ ماسٹر نے اسے مارنے کو ایک اور کرسی اٹھالی... اس کے دیسی پستول سے شاید ایک ہی فائر ہو سکتا تھا۔

مرد رنگ ماسٹر کو حملے سے روکنے کے لیے بڑھ رہا تھا کہ خیمے کے لوگوں اور بونوں نے چیخ کر کہا، ”نہیں بھائی۔ قریب مت جانا۔ بالکل مت جانا۔“

مرد سوچنے لگا، ”ارے! رنگ ماسٹر نے زخمی آسو کو مارنے کے لیے کرسی اٹھائی ہے۔ یہ کیسے لوگ ہیں، مجھے آگے آنے سے روک رہے ہیں۔“ مگر اس نے کنکھیوں سے دیکھا کہ وہ سب کے سب ایک جتھے کی صورت میں رنگ ماسٹر کو گھیرتے جا رہے تھے۔ ہر ایک نے ایک ایک کرسی اٹھا رکھی تھی۔ ہر کرسی کی ٹانگیں کسی چار انگلیوں والے پنچے کی طرح رنگ ماسٹر کی طرف اٹھی ہوئی تھیں۔ وہ گھیرا ڈال چکے تب رنگ ماسٹر کو اندازہ ہوا کہ وہ گھر گیا ہے۔

اس نے دیکھا اور حملے کے لیے اٹھائی ہوئی اپنی کرسی فرش پر رکھ دی اور اسی پر بیٹھ گیا۔ پھر سر جھکا کر اپنے جوتوں کے درمیان فرش کو گھورنے لگا۔
اب وہ ایک پرسکون اور فکر مند آدمی تھا۔

عورت مرد نے سرکسوں میں کٹیلے جانوروں کو کرسی کے بڑھتے ہوئے پنچوں سے قابو میں آتے دیکھا تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ان کے سامنے ایک انسان... خود کٹیلوں کا تماشا دکھانے والا رنگ ماسٹر... کرسی سے قابو میں آ گیا تھا۔
ایک بار پھر خیمے میں سناٹا ہو گیا۔

ایک چھوٹی سی آواز نے، کسی بچے کی آواز، نے اچانک سوال کیا، ”یہاں کیا ہو رہا ہے؟“
عورت مرد گھوم گئے۔ خیمے کے دروازے میں ایک لڑکی اکھڑی ہوئی تھی... آٹھ نو برس کی بچی۔ اس نے اپنی چھوٹی سی تجسس بھری آواز میں پھر پوچھا، ”جانم! کیا ہوا تھا ابھی؟“
اُس نے یہ سوال رنگ ماسٹر سے کیا تھا۔

”کچھ نہیں، ڈاھ لنگ!... تم کیوں آگئیں؟ جاؤ... سو جاؤ۔“ رنگ ماسٹر نے جس طرح کہا تھا اس سے انھیں شک سا ہوا۔ دونوں نے پھر دیکھا۔ اب کے غور سے دیکھا۔
وہ بچی نہیں، عورت تھی، پوری عورت... وہ بونی تھی۔

بونیا نے پوچھا، ”جانم! یہ ایسا کیوں بیٹھا ہے؟“ وہ آسویلے کی طرف اشارہ کر رہی تھی، ”کیا ہو گیا اس کو؟ کیسے چوٹ لگ گئی؟“

عورت نے سوچا، ”جھوٹ بول رہی ہے۔ یہ خوب جانتی ہے کیا ہوا ہے۔“ بونی کو خبر کرنے والا بونا اس کے پیچھے پیچھے خیمے میں آ گیا تھا۔

”کیا ہوا اسے؟“ اس نے پھر پوچھا۔

”کیا خبر؟“ رنگ ماسٹر نے پھر سر جھکا کر فرش کو گھورنا شروع کر دیا تھا۔

آسو بلا کبھی بونی کو کبھی رنگ ماسٹر کو سر گھما گھما کے دیکھتا رہا تھا۔ اب جو رنگ ماسٹر نے ”کیا خبر؟“ کہہ کے سر جھکا لیا تو آسو فرش پر سے اچانک اٹھ کھڑا ہوا اور شکایت کے لہجے میں بولا، ”بیلا جی! بیلا جی! اس نے پشتول مارا ہے... حرامی نے۔“

خوب! تو رنگ ماسٹر کی رکھیل بیلا جی یہ ہے... بونی۔

آسو کی بھڑی آواز میں ماسٹر کے لیے گالی سن کر بیلا جی کی تیوریاں چڑھ گئی تھیں۔ بلے کی طرف دیکھے بغیر اس نے منہ بگاڑ کر کہا، ”بک بک نہیں کر!“ اور خاموش بیٹھے ہجوم میں سے ایک کو انگلی کے اشارے سے بلا یا، ”اوسن، ادھر آ... ہاں تجھی سے کہہ رہی ہوں۔ لے جا اس سالے کو... کپوڈ راٹھ گیا ہوگا... اس کی مٹی کرادینا۔“

ہجوم سے جو نکل کے آیا وہ بھی بونا تھا۔ وہ بھنبھناتے ہوئے شکایت آمیز لہجے میں بولا، ”ابھی کدھراٹھا ہوئے گا کپوڈر۔ رات پوری باٹلی نکا کے گیا تھا۔“

”جا جا، سالا بالشر! ادھر ہی جرح کرنے لگا ہے حرام کا! ابے جاتا ہے یا پچھائے پہ ٹھڈا کھائے گا۔ گاں...!“

رنگ ماسٹر ٹھیک کہتا تھا، بیلا جی کچی نیند سے اٹھا دی گئی تھی... اب یہ دن بھر گندی گندی گالیاں بکے گی۔

گالی کھا کے بونا زخمی آسو کے پاس گیا اور ہاتھ پکڑ کر اسے خیمے سے باہر لے چلا۔ لگتا تھا کریکٹ کے بیٹ کو اس کی بال کھینچے لیے جا رہی ہے۔

جوں ہی آسو اور بونا خیمے سے نکلے، بونی بیلا جی حلق سے لاڈ کی آوازیں نکالتی، رنگ ماسٹر کے جوتوں پر پیر رکھتی، اُچھل کر اس کی گود میں جا بیٹھی۔ ”اررے میرا فلک شیر! پھلکو میرا... کیا بات ہو گئی ذراہ لنگ؟... تجھے کیوں غصہ آ گیا؟ آں؟ میری جان! پشتول کائی کو چلایا تو نے اس... اس پونے پہ کائی کو چلایا پشتول؟“

بونیا رنگ ماسٹر کے بڑھے ہوئے شیو پر اپنے رخسار رگڑنے لگی اور پیچ پیچ کی آوازیں نکالتی ہوئی کچھ یوں ظاہر کرنے لگی جیسے وہ اس کے بوسے لے رہی ہے، یا لینا چاہتی ہے مگر حاضرین کی وجہ سے جھجکی ہے۔

رنگ ماسٹر اس کی پہنچ سے دور ہونے کو اپنا چہرہ دائیں بائیں ہٹا کر اسے روکتا رہا، ”نا ڈاہ لنگ! نا بیلا! اری بات تو سن۔“

مگر بیلاجی کالا ڈ اور نقلی چوما چاٹی چلتی رہی اور بار بار وہی سوال کہ کیا بات ہوگئی؟ کیوں غصہ آگیا؟ پستول کائی کو چلایا؟

رنگ ماسٹر نے بیلاجی کی غیر معمولی توجہ سے بچنے کو شاید ایک بار منہ کھول کر بتا دینا چاہا بھی مگر پھر ”ہاں، وہ، یہ“ کہہ کر چپ ہو گیا۔

”بتانا، کیا بات ہوگئی جانم؟“ بیلاجی اب اپنے پھلکوفلک شیر کی گود میں کھڑی ہوگئی، اس کے کھلے گریبان میں دور تک اپنا انگوٹھیوں بھرا ہاتھ ڈال دیا اور اندر ہی اندر رنگ ماسٹر کا ادھیڑ سینہ تھپتھپانے لگی۔ اسے گدگدی ہو رہی تھی یا کوئی اور بات ہوگی جو وہ سرخ ہو گیا اور گھگھیا نے لگا، ”بس کر۔ ذرا ٹھہر تو۔ اری دیکھ تو سب ہیں... بھلا یہ کون سا وقت ہے؟ بیلا! او بیلاجی! نہیں سنے گی؟“

بونئی بیلاجی مم مم مم کرتی ہوئی جیسے خود بھی اپنی مصروفیت میں مگن ہو رہی تھی کہ فلک شیر دلاور نے ہتھیار ڈال دیے اور منہ سے رال گراتے ہوئے بولا، ”سن بتاتا ہوں... بتاتا ہوں۔ اس نے... اس نے سالے نے میرے سب کھا لیے تھے... اس لیے، اس لیے گولی ماری ہے۔ چل ہاتھ نکال... اُتر!“

بیلاجی بہت فتح مند اور مسرور اپنے فلک شیر ڈاہ لنگ کی گود سے اتر آئی۔ اس نے خیمے میں موجود لوگوں اور بونوں کی طرف جیتی ہوئی عورت کے غرور سے دیکھا اور حکم دیا، ”پھلکو کی باسکٹ میں اس کی سب چیزیں واپس رکھ دو۔“

خیمے میں موجود لوگ، حد یہ ہے کہ بونے تک بے تعلقی اور بیزاری بلکہ ایک دھیمی نفرت سے یہ سب کچھ دیکھتے رہے تھے۔ ان میں سے کسی نے بیلاجی کی بات پر توجہ نہ دی۔ عورت مرد دیکھ رہے تھے کہ بعض بونوں تک نے جماہیاں لی تھیں۔

”تمھاری بھیں کا یہ، کا وہ... سنا نہیں، میں نے کیا کہا ہے؟“ بونئی نے منہ بگاڑ بگاڑ کر گالی گفتار بکنی شروع کر دی تھی۔

عورت نے حیرت سے اپنے مرد کو دیکھا۔ دھیرے سے بولی؟ ”اس چھوٹی ڈبیا سی عورت میں کتنا گند بھرا ہے!“

مرد کچھ نہ بولا۔ اسے بھوک لگنی شرع ہو گئی تھی... صبح تڑکے سے بلکہ آخری پہر کے اندھیرے سے اب تک انھوں نے بڑی دیوانگی کے ساتھ وقت گزارا تھا۔ رات جاگتے ہوئے کٹی تھی۔ بھوک تو لگنا ہی تھی۔

بیلاجی کی گالی گفتار سن کر سب ہی بونے جلدی جلدی رنگ ماسٹر کا سامان اس کی باسکٹ میں بھرنے لگے تھے۔

بونے نے اب عورت مرد کی طرف توجہ کی۔ ایسا لگتا تھا دونوں پر اس کی نظر پہلے نہ پڑی ہوگی۔ اس نے ایک بار مرد کو دیکھا، منہ بنایا، پھر عورت کو دیکھا تو اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ جھک کر اس نے رنگ ماسٹر کے کان میں کچھ کہا۔ اس نے بہت سختی سے انکار میں سر ہلایا، دبی ہوئی آواز میں بولا، ”تو پاگل ہو گئی ہے! اری وہ میاں بیوی ہیں۔“

بیلاجی رنگ ماسٹر کی کرسی کے پیچھے کھڑی تھی، اب وہ اس کے برابر آگئی۔ وہ جھکی ہوئی برابر اس سے کچھ کہے جا رہی تھی۔

رنگ ماسٹر ایک دم کرسی سے اٹھ کھڑا ہوا۔ بیلاجی گرتے گرتے بچی، کھسیا گئی، مگر اس نے ڈپٹ کر بہت غصے سے مرد کو دیکھا اور بولی، ”اورے او... کیا دیکھتا ہے؟ کون ہے تو؟ کدھر سے آیا ہے... سالا پرورٹ!“ وہ نہ معلوم کیوں اسے یہ عجیب طعنہ دے رہی تھی۔

مرد کے جواب دینے سے پہلے رنگ ماسٹر بول اٹھا، ”مہمان ہیں میرے... ان سے کیا پوچھ رہی ہے؟ بتایا نا، میرے ساتھ آئے ہیں دونوں۔“

بونے نے فلک شیر کی کہی بات اُن سنی کر دی، اسی گندے لہجے میں مرد سے پوچھنے لگی، ”اورے او... یہ رنڈی کون ہے تیری؟... ماں ہے؟“

اب مرد کے کچھ کہنے سے پہلے اس کی عورت آواز بنا کے ہنسی، بولی، ”اری او پاگل! کیسی بھلکڑو ہے... کیا پھر بھول گئی؟ اری اس کی نہیں میں تیری میاں ہوں۔ نایکہ ہوں ادھر کی... آٹھ آٹھ آنے لے کے میں ہی تو چھوڑتی جاتی ہوں... پورے کا آٹھ آنہ، بونے کا چار آنہ، پونے کا ایک آنہ... یاد آیا؟“

رنگ ماسٹر کا منہ تھتا ہوا تھا لیکن عورت کی بات سن کے اس نے چہرہ اٹھا کے ایک زبردست قہقہہ لگایا، پھر پیٹ پکڑ کے ہنسنے لگا اور ہنستے ہنستے بولا، ”آج ملی ہے یہ تیرے سر کی استاد... شاباشے... ہا ہا ہا... یہ ملی ہے۔“

بیلاجی کرسی کے پیچھے سے غصہ ور نیولے کی طرح خنی خنی کی آواز نکالتی ہوئی جھپٹی اور اس نے بہ یک وقت عورت کی طرف کک چلایا اور مرد کے پیٹ میں گھونسا مارا۔ عورت اس کے لیے تیار تھی۔ اس نے اپنی طرف آتے کک کو ہاتھ بڑھا کر ذرا اوپر اٹھا دیا۔ بونی کا توازن بگڑ گیا اور وہ گر گئی۔ مرد کی طرف چلایا ہوا اس کا گھونسا اوچھا پڑا... ذرا سا نیچے۔ مارے تکلیف کے وہ دُہرا ہو گیا۔

بیلاجی بونی فرش پر پڑی ہوئی اسے... مرد کو، خدا معلوم مرد ہی کو کیوں... طرح طرح کی گالیاں دے رہی تھی، ”تیری ماں کو بھیس کے یاں کاواں... جَرانی سالانا مردا، گونگو کی اولاد، سورا دَلّا کدھر کا...“

رنگ ماسٹر فلک شیر نے ہنسی سے بے حال ہوتے ہوئے بھی جھک کر فرش پر پیچ و تاب کھاتی بونی کو اس کی کمر کے گرد بازو ڈال کر چھوٹے مچلتے ہوئے بندل کی طرح اٹھایا اور بغل میں مار خیمے سے نکل گیا۔ وہ بری طرح ہاتھ پیر چلا رہی تھی۔

تین بونوں نے رنگ ماسٹر کی پکنک باسکٹ اٹھائی اور مشقت کی آوازیں نکالتے وہ بھی پیچھے چل پڑے۔

دور سے بیلاجی کی چیختی چیختی آواز آرہی تھی، ”ان دونوں سالوں کی بھیس کا یہ کاوہ کا دَلّا سالافش ٹولا... اور وہ سالی رانڈ...“

عورت نے تھکی ہوئی بیزار خوش مزاجی سے ہاتھ جھاڑ کر کہا، ”گئی سسری... جان چھوٹی۔“

”مگر وہ تو کھانے کی سب چیزیں لے گئے ہیں۔ اب کیا ہوگا؟“

عورت نے لاعلمی میں کندھے اُچکائے۔

پیچھے سے کسی نے دھیمی گمبیر آواز میں کہا، ”میرے ساتھ آؤ، ناشتا کرادوں گا۔“

عورت مرد نے مڑ کر دیکھا۔ نیلا اور آل پہنے، ٹول بکس اٹھائے ایک سنجیدہ چہرے والا عرب، ایرانی یا شاید پاکستانی جیب میں ہاتھ ڈالے سکون سے کھڑا تھا اور انھیں ساتھ آنے کو کہتا تھا۔

اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا، ”میرا نام بادل ہے۔ ادھر الیکٹریشن لگا ہوا

ہوں۔“

مرد نے ہاتھ ملاتے ہوئے محسوس کیا کہ اس کے ہاتھ کے لمس میں سختی آدمی کا کھر

دراپن اور بے غرضی تھی۔

”تم پاکستانی ہو؟“ مرد نے بادل سے پوچھا۔

”پتا نہیں... میں اور والد صاحب مسقط میں پیدا ہوئے تھے... دادا صاحب بلوچستان سے گیا تھا۔“

بادل انھیں لیے ہوئے میزوں کے درمیان راستہ بناتا خیمے کے پچھلے حصے کی طرف چلا۔ میزوں کے گرد بیٹھے ہوئے لوگ اب اپنے مگوں، گلاسوں اور پیالوں میں جھکے ہوئے چائے، کافی جیسا کچھ پینے لگے تھے۔ عورت مرد نے دیکھا ان کنگ اور گلاس جھڑی ہوئی تام چینی اور پتلے ایلومینیم کے تھے، پیالیاں، کوریں کنڈے جھڑی اور بے جوڑ تھیں۔ تام چینی کی کالونچ لگی رکابیوں اور اردو کے پرانے پیلے پڑے اخباروں پر بھورے بدرنگ آٹے کی گیندیں سی رکھی تھیں اور بہت سے پکے زرد کھیرے، چیرا دیے ہوئے اور نمک مرچ لگے، کھڑی میز پر پڑے لڑھک رہے تھے۔

کوئی کوئی ور کر بے دلی سے آٹے کی ان بھوری گیندوں کو اٹھا اٹھا کے کتر لیتا تھا... کھیلوں کو تو ان کے دیکھتے کسی نے چھوا بھی نہیں۔

وہ دونوں اور بادل بڑے روشن خیمے کو چھوڑ کر باورچیوں کی چھولداری میں آ گئے۔ یہاں چینیوں جیسی مہربان صورتوں کے آدمی عارضی چولھوں پر کچھ پکاتے تھے یا گرم کر رہے تھے۔ وہ کچھ بولے تو معلوم ہوا، شکلیں بے شک چینیوں جیسی ہیں مگر وہ چینی نہیں ہیں۔

بادل نے دھیرج سے سمجھاتے ہوئے ان سے کچھ کہا تھا۔ وہ لوگ اس مرد اور عورت کے بارے میں بات کر رہے ہوں گے کیوں کہ ان میں سے کوئی بھی عورت مرد سے آنکھ نہیں ملا رہا تھا۔ کچھ بحثا بحثی کے بعد چینی دکھائی دینے والوں میں سے ایک نے ہاں میں سر ہلایا اور اپنے ایک ساتھی کو اشارہ کیا۔ وہ کہیں سے تین فولڈنگ کرسیاں اٹھا لایا جو اس نے ایک صندوق کے پاس بچھا دیں۔ صندوق ایک طرح کی میز بن گیا۔

بادل اور عورت مرد بیٹھ چکے تو باورچیوں میں سے ایک، بڑے خیمے کی طرف کھلنے والے دروازے میں اسٹول ڈال کے، رستہ روک کے بیٹھ گیا۔ اسے ڈر ہوگا کہ کہیں ادھر سے کوئی اور نہ آ جائے۔ دوسرے باورچی ان کے لیے ناشتا تیار کرنے لگے۔

بادل نے بتایا، ”دیگوں والی چائے بے کار ہے۔ یہ آپ لوگ کوئی چائے بنا کے

دیں گا۔“

مرد نے دھیرے سے کہا، ”مہربانی ہے تمھاری۔“
وہ بولا، ”مگر ادھر ہمارا کوئی عمل دخل نہیں ہے دوست۔ یہ لانگری لوگ ویسا ہی طبیعت کا اچھا ہے۔“

بادل چیوں نے آلو ابالنے کو چڑھا دیے۔
بادل آہستہ آہستہ باتیں کرتا ہوا اس ناکافی ناشتے کی پیشگی معذرت کرنے لگا جو ابھی ان دونوں کے سامنے لایا بھی نہیں گیا تھا۔ مگر مرد نے کہا کہ بھائی محبت سے جو بھی مل جائے گا نعمتوں سے بڑھ کر ہوگا۔

بادل بولا، ”دوست ادھر بڑا کڑکی ہے۔“ بتانے لگا کہ ویسے تو سرکس چل ہی نہیں رہا اور جو تھوڑا بہت آتا ہے تو وہی تینوں ’مردار‘ آپس میں بانٹ لیتے ہیں۔ ورکروں کو وعدے وعید کے سوا دیتے ہی کچھ نہیں۔ بے زبان جانوروں تک کو بھوکا مار رکھا ہے... سب کو بس آدھے پیٹ ملتا ہے۔

مرد نے سوچا، تینوں سے وہی تینوں مراد ہوں گے، رنگ ماسٹر، باڈی بلڈر اور بیلا بونی۔
اخباروں پر پڑی آٹے کی گیندیں اور پکے پیلے کھیرے دیکھ کر اسے پہلے ہی حیرت ہوئی تھی۔ یہ وہ ناشتا تھا جسے رنگ ماسٹر ”طاقت سے بھرپور ایک دم بم فولادی ناشتا“ بتا رہا تھا!
اس نے پوچھا، ”جب کچھ ملتا ہی نہیں ہے تو تم سب لوگ سرکس کا پیچھا کیوں نہیں چھوڑ دیتے؟“

بادل بولا، ”کدھر جاوے؟ سب لوگ کا شناختی پرچی سرکس کے ساتھ ہے۔ ویسے بھی باہر کے حساب سے دم، لیاقت کوئی نہیں ہے۔ نہیں کام ملے گا، نہیں کوئی کدھری گھسنے دیں گا۔“
مرد کو بونی اور رنگ ماسٹر کی سنگت یاد آئی۔ اس نے ویسے ہی، کچھ نہ کچھ کہنے کو، کہہ دیا کہ وہ دو ایک طرف ہیں اور باڈی بلڈر ایک طرف، میرے تو خیال میں وہ کچھ دبا ہوا ہے اور خطرے میں ہے۔ رنگ ماسٹر کے پستول سے ابھی مرتے مرتے بچا ہے۔ تم اس کا ساتھ کیوں نہیں دیتے۔ تمھارا بھی فائدہ ہے۔

بادل یہ سب سن کر ہنسا، کہنے لگا، ”آسو بلا بھی ایک حرامی ہے۔ انھی کا آدمی ہے۔ آپ کیا سمجھتے ہو؟ وہ جو آسو کو دھتکارتی تھی، وہ کیا تھا؟... بھی سب نائک تھا۔ اصل پوچھو تو وہ

آسو ہی کا عورت ہے۔ رنگ ماسٹر کو تو بس ابھی پھنسا رکھا ہے۔ یا پھر سمجھو کسی کی بھی نہیں ہے۔ ابھی تھوڑی دیر کو فلک شیر کے خیمے میں گئی ہے۔ ادھر سے اپنی تسلی کرا کے بلے کے ٹینٹ میں جا کے پڑ جائے گی۔ چوما چائی کر کے اس مردار کو منائے گی۔ کمپوڈر کو ٹھڈے مار مار کے بلے کے بازو پر ایک دم نئی بینڈ تاج لگوائے گی۔ بھلے ہی اسے بخار ہووے نہیں ہووے، سر پے ٹھنڈے پانی کی چٹی رکھے گی۔ پھر شام تک ادھری پڑی سوتی رہے گی۔“

مرد نے کہا، ”خوب!“

”شام کے بعد شو چلے گا۔ شو کے پیچھے وہ فلک شیر کے خیمے میں جا سوئے گی۔ سب کو پتا ہے۔ آسو کے گولی پڑنے کی خبر لے کے بونا بھاگا بھاگا ادھر ہی گیا تھا۔“

”عجیب بات ہے!“

بادل بولا، ”بس ایسا ہی انتظام ہے۔“... ”انتظام“ کا لفظ کہتے ہوئے اس نے کراہت ظاہر کی تھی۔

”یہ بتاؤ، اب جو گولی چلی ہے اور بلا زخمی ہو گیا ہے تو رنگ ماسٹر کے اور اس کے بیچ دشمنی نہیں ہو گئی؟“

”ہاں برابر ہو گئی۔ مگر یہ سب وقتی دشمنی ہے۔“

مرد نے دھیرے سے کہا، ”عورت پہ ان کی دشمنی نہیں ہوتی... سیبوں پہ ہو گئی؟“

”عورت؟ کیسا عورت؟... وہ عورت مورت نہیں ہے۔ پائٹر ہے بھئی، ہم نے بولا

ہے نہیں۔ سب چیز میں وہ بھی حصہ بٹاتی ہے۔ پھر یہ بھی ہے ان لوگ کا دوستی دشمنی سب ٹائم ٹائم سے ہوتا ہے۔ کتنی دفعے وہ مردار اس کو اٹھا کے پھینک چکا ہے۔ کبھی یہ اس پر فیر کرتا ہے، کبھی وہ کرتا ہے۔ مرتا کوئی نہیں۔ بھاگتا کوئی نہیں۔ ہر بار سیزن کے شو ختم ہونے پہ یہ لوگ یار دوست بن جاتا ہے، حصہ بخرا کرتا ہے۔ ہم لوگ کو تسلی دیتا ہے، بولتا ہے انتظار کرو۔ بونی اپنی کہتی ہے۔ باڈی بلڈر اپنی کہتا ہے۔ وہ بولتا ہے میں رنگ ماسٹر کی کمر توڑ دوں گا، بس دیکھتے رہو۔ فلک شیر کہتا ہے، آسو بلے کو زندہ نہیں رہنے دینا ہے۔ دوست! ابھی یہ بھی ہو سکتا ہے بلے کے ٹینٹ میں اس وقت وہ خود بھی بیٹھا ہووے۔ تین گلاس سامنے رکھے، بوتل کھولے لگا پڑا ہو یا پھر کھڑے ہو ہو کے ٹھک ٹھک ایڑی بجا بجا کے بلے کا اور بونی کا گلاس بھرتا ہووے یا آنکھ مار مار کے ٹھٹھے لگاتا ہووے... ان لوگ کا ہمیشہ سے ایسا ہی ہے۔“

مرد اور کیا کہتا، اس نے کہا، ”ان کو مار کے نکالو۔ سرکس تو تمھی لوگ چلاتے ہو۔
بس، چلاتے رہو۔“

بادل بلوچی نے کوئی جواب نہ دیا۔ اُسے اپنی سنجیدہ آنکھوں سے دیکھنے لگا۔
جنریٹروں کی آوازیں آنی بند ہو گئی تھیں۔ لگتا تھا باہر دن نکل آیا ہے۔
مگر یہ کون بتاتا کہ نکلا بھی ہے کہ نہیں... سبھی تو اندر تھے۔



وقائع نگار

فلم دیکھنے نکلا تھا، نہ ویزا لیا تھا نہ کچھ۔ ڈالڈا کے ڈبے بھر کے ایک ٹرک جا رہا تھا۔ مولو کہنے لگا، جاتا ہے تو اس میں چلا جا فلم دیکھ کے آ جانا۔ میں نے کہا، ہو، چلا جاتا ہوں پر واپسی کا کیا ہوئے گا؟ بولا، یہی واپس آئے گا بیڑی کا پتالے کے، آ جانا۔ میں نے کہا، ہو۔ پر یاد دیکھ لے کہیں ادھر کے ٹلے نہ پکڑ لیں۔ مولو بولا، ہندو جیسی تو شکل ہے تیری، کوئی شک بھی نہیں کرے گا۔ چلا جا، چلا جا۔ ہرو بھرو ڈرتا کیوں ہے؟ کوئی گڑ بڑی ہو تو ایسے ایسے کرنا، ادھر فلاں فلاں جگہ جانا، ایک بہت بڑا سرجن ہے دو بے، اس کو ملنا، ایسا ایسا بولنا۔ وہ تیرے کو سیٹ کر دے گا۔ میں نے کہا، لے پھر میں چل پڑا... اور میں ٹرک پہ چڑھ گیا۔

پہنچ گیا۔ فلم دیکھی۔ بہت مزہ آیا۔

مگر فلم دیکھ کے نکل رہا تھا تو ٹلوں نے دیکھ لیا۔ پہچان گئے کہ ادھر کا نہیں، ادھر کا ہے۔ یا اللہ خیر۔ میں ڈپٹ لیا۔ وہ پیچھے پیچھے سیٹی بجاتے ہوئے۔ خیر جی، جیسا مولو نے بتایا تھا ویسا ہی میں نے کیا۔ جدھر جانے کا بولا تھا، گیا۔ گھستا چلا گیا۔ ادھر بہت بڑا ایک سرجن تھا، دو بے اس کو ملا۔ وہ بولا، ”یہ کوئی مسلائی نہیں ہے، میں سیٹ کرادوں گا۔“ تو خیر جی اس نے سیٹ کرادیا۔

اس نے کسی سے فون پہ بات کی۔ ایک آدمی آیا۔ وہ میرے لیے بھی ہاسپٹل کے

نوکروں کا اور آل، ٹوپی، جوتے، دستانے، منہ پر باندھنے کا ماسک... یہی سب اٹرم سٹرم لایا تھا۔ میں نے سب کچھ پہن لیا۔ ہم ہاسپٹل کی اصل بلڈنگ سے ٹرالیاں دھکاتے ہوئے ایک چھت پڑے رستے پر آگئے۔ میں نے جگہ سمجھنے کے لیے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو پھولوں کے قطعوں اور رنگین پتوں والی جھاڑیوں کے پار، پورچ میں ٹلوں کی دو گاڑیاں رکتی دیکھیں۔

میرا ساتھی اپنے ماسک کے نیچے سے بڑبڑایا، ”لو دیکھو۔ آگئے سالے۔ دیری نہیں کرتے۔“ ہم وارڈوں کے پیچھے جونیئر اسٹاف کے کوارٹروں والے علاقے میں نکل لیے۔ میرے ساتھی نے ٹرالی روک کے ایک کوارٹر دکھایا جس کا نمبر تیرہ تھا۔ کہنے لگا، ”یہ میرا کوارٹر ہے۔ اب یہ ہم دونوں کا ہے۔“

میں نے پوچھا، ”تم اکیلے رہتے ہو؟“

کہنے لگا، ”نہیں۔ میں رہتا ہوں، میری بیوی پدمارہتی ہے۔“

میں بولا، ”اچھا۔“

”مالوم ہے، ہماری جہان میں پدما کسے کہتے ہیں؟“

میں خوب جانتا تھا۔ میں نے کہا، ”ہاں۔ کنول کے پھول کو۔“

وہ ہنسا، کہنے لگا، ”دو کمرے ہیں اس کوارٹر میں۔ ایک میرا اور پدما کا ہے، دوسرا

اب تمہارا ہو جائے گا۔“

میں نے کہا، ”میری وجہ سے تم لوگوں کو تکلیف تو نہیں ہوگی؟“

”کاہے کی تکلیف؟ تم سکل سے اچھے آدمی لگتے ہو۔ پدما کو چتا نہیں ہوگی۔“

”ہوں۔“ میں اور کیا کہتا۔

وہ بولا، ”گھر کا تو یہی ہے۔ گھر والی کا مجاج دیکھ کے چلنا پڑتا ہے۔ تین مہینے پیچھے

بھی ایک مسلمان بھائی کو میرے کوارٹر میں ٹھیرایا تھا ڈاک صاب نے۔ پر وہ کیسا آدمی تھا؟

میں گھر میں نہیں ہوتا تھا تو پدما سے الٹی الٹی باتیں کرتا تھا۔“

مجھے ضرورت نہیں تھی جو پوچھتا کہ کیسی الٹی الٹی باتیں کرتا تھا، اس لیے چپ رہا۔

وہ خود ہی خاصا بگی آدمی تھا، بولا، ”کبھی وہ کہتا تھا ہاسپٹل میں بھوت ہوتے ہیں۔

دن ڈوبنے اور دن نکلنے کے بیچ کھلے پھرتے ہیں۔ جس کسی کو نجر آجائیں، بس اس کی جان کے

لاگو ہو جاتے ہیں... سالہا ڈراتا تھا پدما کو۔“

میں نے بات ختم کرنے کو کہہ دیا کہ ہاں، بعض لوگوں کو ایسی ہی بے کار باتیں کرنے کا شوق ہوتا ہے۔

”نہیں، بے کار باتیں نہیں تھیں۔ بڑا ہسیار تھا۔ کہتا تھا مجھے بھوت اتارنا آتا ہے اور کھبر نہیں کیا کیا آتا تھا اس کو۔ لالچی نہیں تو۔“

میں نے سوچا کوئی عیار آدمی ہوگا، ان میاں بیوی سے پیسے کھینچنا چاہتا ہوگا۔ یہی بات میں نے اس سے کہی تو پوچھنے لگا کہ عیار کسے کہتے ہیں؟ میں نے بتا دیا۔ وہ چالاکی سے ہنسا، بولا، ”عیار جیسا عیار تھا! باتوں میں چلا کے کام نکالنا چاہتا تھا۔“

مجھے رستے میں رے رے کے الجھن ہونے لگی تھی۔ میں نے پھر بات ختم کرنے کو کہا، ”ہاں بڑے بڑے نوسر باز ہوتے ہیں، ہر ایک سے رقمیں کھینچنے کے چکر میں رہتے ہیں۔“

وہ ہنسا، ”ہاں جی۔ پر وہ اور بھی چکر میں تھا۔ مالوم ہے؟ ایک دفے میری نائٹ ڈیوٹی تھی۔ اس نے ہمارے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹایا۔ دو بجے ہوں گے رات کے۔ پدما اکیلی تھی۔ پوچھنے لگی کیا بات ہے؟ بولا، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔ ابھی ابھی بھوت نجر آیا تھا، اگر کوئی واندہ نہ ہو تو مجھے اپنے کمرے میں آجانے دو، ایک طرف پڑ رہوں گا..... اور بولا، آدمی دو ہوں تو بھوت کچھ نہیں کہتا..... کچھ سمرے بھیا؟ وہ سالا کس چکر میں تھا؟“

اس آدمی کی باتیں سن کے مجھے خفت سی ہونے لگی تھی۔ کس قسم کا آدمی ہے؟ مجھے یہ سب کیوں سنا رہا ہے؟ میں، ہوں! کہہ کے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

وہ اپنے بیان کے جوش میں کہتا چلا گیا، بولا، ”ہم نے کچھ کیس چھپا کے رکھا تھا۔ ہمارے ہی کمرے میں تھا۔ کوئی چار ہجار کے نوٹ ہوں گے۔ پدما نے سوچا یہ مسلمان بھائی پیسے ہتھیانے کے چکر میں بھوت ووت سے ڈرنے کا پا کھنڈر چار رہا ہے؛ اصل تو کمرے میں آنا چاہتا ہے۔ کھبر ہے کیا کیا پدما نے؟“

میں کچھ نہ بولا تو اس نے دوبارہ اسی لہجے میں پوچھا، ”کھبر ہے کیا کیا پدما نے؟“

میں نے بے زاری سے کہا، ”اس نے دروازہ نہیں کھولا ہوگا؟“

”ناں ناناں۔ جی، وہ بہت ہسیار ہے، اس کو بولی تو جا اپنے کمرے میں، میں ادھر ہی آتی ہوں، دیکھتی ہوں کیسا بھوت ہے... اور جب وہ ٹل گیا تو اپنے کمرے میں تالا ڈال، پدما ترنت دوسرے کمرے میں کھد پہنچ گئی۔ بولی، لے، ہو گئے دو آدمی..... اب تو بھوت کچھ نہیں

کہے گا؟ آجا، ادھر لیٹ جا..... یہ لے اپنا تکیہ..... ہا ہا ہا دیکھا؟ اس سالے کی کوئی بھی چالاکی نہیں چلنے دی پدمانے۔“

میں اس گدھے کی صورت دیکھتا رہ گیا۔ یا تو یہ بالکل ہی گیا گزرا بے عقل آدمی ہے یا اپنی پدما کی طرح بہت ہسیار ہے اور یہ سب سنا کے مجھے کوئی پیغام دینا چاہتا ہے۔ سالا! گرا ہوا آدمی! مگر میں چیپ ہی رہا۔

کچھ دیر وہ اپنی گھر والی کی چالاکی پر سر ہلا ہلا کے ہنستا رہا پھر بولا، ”یہ کوارٹروں کے آگے مردہ کھانا ہے۔“

”مردہ خانہ؟“ مجھے دھچکا کا سا لگا تھا۔ مگر دھچکا لگنے کی کوئی بات نہیں تھی۔ اسپتالوں میں مردہ خانے ہوتے ہی ہیں۔

وہ میری صورت دیکھ کے ایک دم خوش ہو گیا۔ ٹھٹھا مار کے ہنسا، بولا، ”مردے کھانے کا سن کے ایسا چونکے کیوں؟“

میں نے کہا، ”بس ایسے ہی۔ چونکنے کی کیا بات ہے۔ مردہ خانہ تو ہو گا ہی۔“

بولا، ”ہاں مردہ کھانا بھی ہے اس کا اشٹاف بھی ہے۔“

میں نے بے دھیانی میں کہا، ”اچھا؟“

کہنے لگا، ”ادھر اشٹاف میں پہلے ایک ہی آدمی تھا..... اب دو ہو گئے ہیں۔“

”اچھا۔“ مگر میں نے سوچا، مجھے یہ سب سنانے کی کیا ضرورت ہے؟

”سمزے؟ دو کس طرح ہو گئے ہیں؟“ پھر پوچھنے لگا، ”کھبر بھی ہے کون دو؟“

میں اس کی صورت تنکے لگا۔

کہنے لگا، ”کیا اب بھی نہیں سمز آئی؟ ہم دو ہیں نا۔ ایک تم، ایک میں۔ پہلے

مردوں کو سیٹ کرنے کا، ادھر ادھر پہنچانے کا کام میں اکیلا کرتا تھا۔ اب تم میرے اسسٹنٹ ہو کے آگئے ہو۔ دونوں مل کے سنبھال لیں گے، ان سالوں مردوں کو۔“

وہ چلتے چلتے یہ سب کہہ رہا تھا۔ میں وہیں کا وہیں کھڑا رہا۔

حد ہو گئی! مجھے نہ صرف ایک مردہ گھر کے انڈینٹ کے ساتھ ٹھہرایا جا رہا ہے بلکہ

اس کا مددگار تک بنا دیا گیا ہے۔ اس دو بے کو یہ کیا سوچھی ہے؟

اس نے..... پدما کے میاں نے ٹرالی دھکانا بند کر دی اور مڑ کے میری طرف دیکھنے

لگا، بولا، ”کیا بات ہے؟“

بات کیا ہوگی۔ مجھے اب طرارہ آچلا تھا۔ میں نے پوچھا، ”کیا واقعی میں تمہارا اسٹینٹ ہوں؟“

وہ بولا۔ ”ہاں، کوئی تو ہوتا اسٹینٹ۔ کام کر کر کے میری کمرہ گئی ہے۔ مردوں کو سلیب پر سے ٹرالی اسٹریچر پر اور ٹرالی سے سلیب پر چڑھانے اتارنے میں یہ جانو آدمی کی ایسی تیزی ہو جاتی ہے۔“

مجھے بہت غصہ آیا۔ جی چاہا دو بے سالے کے کمرے میں گھس جاؤں اور اسے اچھی سنا دوں مگر اسپتال کی مین بلڈنگ پر نظر پڑی تو یاد آیا کہ وہاں پورچ میں ٹلوں کی دو گاڑیاں کھڑی ہیں۔ غصہ کرنے کا وقت نہیں تھا۔

میں خاموشی سے مڑا اور اپنے مردہ گھر کے ان چارج، اس پدما کے میاں کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

وہ ٹرالی دھکاتا ہوا سیدھا مردہ خانے تک پہنچا۔ ٹرالی چھوڑ، جیب سے چابی نکال، اس نے دروازہ کھولا اور قطاروں میں بنے چھوٹے چھوٹے چبوتروں پر رکھی بارہ پندرہ لاشوں سے میرا تعارف کرانے لگا۔

”یہ مرڈر کا کیس ہے۔ اسے برف ورف دے کے ابھی ادھر ہی روکنا ہے۔“
 ”روکنا ہے“ ایسے کہہ رہا تھا جیسے نہیں روکا تو مرڈر کیس والی لاش اٹھ کے چل دے گی اور یہ ”برف ورف دے کے“ بھی خوب تھا۔ برف دے کے روکنا ہے، رشوت دے کے روکنا ہے۔

پھر کہنے لگا، ”یہ بڑی بی رات میں آئی تھی، لکھ پتی لوگ کا مردہ ہے۔ اسے لے جائیں گے تو دان پن کرتے ہوئے، نوٹ بانٹتے ہوئے لے جائیں گے۔ تمہارے میرے حصے میں بھی ٹھیک ٹھاک کچھ ٹپ آجائے گی۔ اور یہ..... ادھر والا بڈھا۔ یہ کنگلا ہے۔ اس کی بھلی چلائی ہے۔ اسے برف دینے کا نہیں ہے۔ میں چپ رہا۔ مردہ گھر کے سب پنکھے گھوں گھوں کر کے چلتے رہے۔“

اسی طرح ایک ایک مردے کے بارے میں خبریں دیتا وہ اس ٹھنڈی، دواؤں کی بو سے بو بھل ہوا میں مجھے لیے لیے گھومتا پھرا۔ جیسے خود سیر کر رہا ہو اور مجھے سیر کر رہا ہو۔

ایک مردے کو دکھا کے بولا۔ ”یہ جیب کترا تھا، پولیس کی ٹارچر سے مرا ہے مگر دیکھو اس کے انگوٹھے سے بندھے کارڈ پے لکھا ہے کہ نمونے میں چل بسا..... سالے جھوٹے کہیں کے! اور اسے دیکھو موٹے تو ندل کو۔ یہ جیبی جندہ تھا تو بڑا دھرماتما بنتا تھا۔ اس کے سینکڑوں شش مطلب چیلے، پیار کرنے والے بس آتے ہی ہوں گے اسے لے جانے..... تم ڈر رہے ہو کی اتنی بھاری لاس ہے، ہم کیسے کھسکائیں گے، کیسے ٹرائی پہ رکھیں گے..... ناں ناں ہمیں ہاتھ بھی نہیں لگانا پڑے گا۔ اس کے ساگرد، یہ موٹے موٹے تگڑے لڑکے بے جے رام، بے سیارام کرتے گھس آئیں گے اور اسے ایسے اٹھالے جائیں گے جیسے چیونٹیاں نکتی دانے کو اٹھالے جاتی ہیں۔ نکتی دانہ سمرتے ہو؟“

میں نے کہا، ”ہاں، مٹھائی ہوتی ہے۔“

وہ ہنسا، کہنے لگا۔ ”اس سالے موٹے دھرماتما کے چیلے چائے منوں مٹھائی اپنے ساتھ لائے ہوں گے۔ اس کو لے جاتے دکھت سے مٹھائی بانٹنا شروع کر دیں گے..... بس، نے یم ہے ان کا۔ مٹھائی وہ سب سے پہلے تمھیں اور مجھے دیں گے۔ کھیال سے لینا۔ دونوں ہتھیلی جوڑ کے اور جتی بھی دیں لے لینا، گرنے مت دینا۔ جراسی بھی گری نہیں تو حرامی مار مار کے تمھارا بھرتا بنا دیں گے۔ بھرتا سمرتے ہو؟“

وہ اسی طرح بکواس کرتا چلا۔ بارہ تیرہ میں سے ایک کسی مسلمان کی میت بھی تھی۔ مجھے سے کہنے لگا، ”یہ تمھارا مسلمان بھائی ہے، کھبر ہے مجھے کیسے پتا لگا؟“

میں نے ویسے ہی بے خیالی میں پوچھ لیا، ”کیسے؟“

وہ ہنسا، بولا، ”کیسے پتا چلتا؟ جب ٹھنڈے پانی کا ساور مارنے کو اس کا کپڑا پڑا سب اتار کے فینکا تو دیکھا کی.....“

میں نے جلدی سے کہا، ”ہاں ہاں..... اچھا اچھا ظاہر ہے۔“

پھر کہنے لگا، ”یہ ٹرائی ادھر ہی چھوڑ دیتے ہیں، آؤ کوارٹر پہ چلیں، کچھ کھاپی لیں۔“

وہ کھانے پینے کا ذکر اس شوق اور بے تکلفی سے کر رہا تھا جو گھر کے باورچی خانے

ہی میں اچھی لگتی ہے۔

میں نے منہ بنا کے ٹال دیا کہ ابھی کھانے کو جی نہیں چاہ رہا۔

بولا، ”کوئی نئی بات نہیں ہے بھیا۔ سب کے ساتھ ہوتا ہے۔ مردوں کی اٹھا دھری

کر کر کے بھوک تو کھل کے لگنے لگتی ہے پر جب نوالہ توڑ تو حلق سے نہیں اترتا۔ پہلے پہل سبھی کے ساتھ ہوتا ہے۔ تم تو مسلمان بھائی ہو تمہارے ساتھ تو اور بھی مشکل ہے۔“

”اور مشکل کیسی؟“

”ارے یہی نا کی تم لوگ ماس کھاتے ہو۔ ماس سمزتے ہو؟ ارے گوشت اوست..... اور ادھر کا تو تم جانو یہاں سے وہاں تک گوشتی گوشت.....“

میں نے پھر بات کاٹی دی، ”ہاں ہاں سمجھتا ہوں..... آؤ چلو۔“

وہ ہنسا۔ چلتے چلتے رکا۔ مڑ کے لاشوں کی طرف مسکراتے اور ہاتھ ہلاتے ہوئے بولا، ”او کے بے بی..... سی یو! بابا بابا..... پتا ہے امریکن فلموں میں بڑی بڑی جوان لڑکیوں کو بے بی بولتے ہیں..... ادھر آج ایسی کوئی جوان لڑکی تو نہیں ہے ایک سنہتالی عورت ہے تھوڑی جان دار..... بابا بابا..... وہ کوئی کھاس نہیں ہے، کالی کلوٹی ہے۔ پر بھیا جی..... ادھر تو کبھی کبھی ایسی فل فلوٹیاں آتی ہیں کی بس ساور مارتے رہو اور دیکھتے رہو۔ ایک ڈچ عورت آئی تھی، عورت کیا لڑکی..... اسے گولی مار دی تھی دوسری ڈچ عورت نے۔ بھیا جی! پہلے میں سمزتا تھا جیسا آدمی کا سر کا بال ہوتا ہے ویسا ہی اس کا..... پر یار اوئے ہوئے ہوئے.....“

میں نے کندھے پہ ہاتھ مار کے اسے آگے کر لیا۔ ”چلو..... چابی سنبھال لو۔ میں کنڈا کھینچ کے تالا دبانے والا ہوں۔ بعد میں مت کہنا کہ چابی اندر رہ گئی ہے۔“

وہ ہڑبڑا کے اپنی جیبیں ٹٹولنے لگا۔ ”نہیں نہیں، ٹھیک ہے..... تم دبا دو تالا، یہ رہی چابی۔“

خدا خدا کر کے اس کی بکواس بند ہوئی۔

اس کے کوارٹر پر آئے تو دیکھا باہر تالا پڑا ہے۔ تالا کھولتے ہوئے بتانے لگا کہ اس کا ناشتا بنا کے پدما سبزی ترکاری لینے بازار چلی جاتی ہے۔ وہ جب تک آئے ہمیں بریک فاسٹ کر لینا چاہیے۔ کہنے لگا، ”پر یار تم تو منے کر رہے ہو۔ پھر اکیلے بریک فاسٹ کرنے میں کیا مجا..... پدما آئے گی اسی کے پاس بیٹھ کے میں کچھ کھا پی لوں گا۔ تو پکی بات؟ تم کچھ نہیں کھاؤ گے؟“

میں نے انکار میں سر ہلایا۔ وہ میرا ہاتھ پکڑے پکڑے کوارٹر میں داخل ہو گیا۔ صحن میں تلسی کے پودے کا سنگھاسن تھا، جس کے قدموں میں گیندے کے پھولوں سے ابلتی ایک

کیاری تھی۔ آنگن کو خوب جی لگا کے جھاڑ بہارا گیا تھا۔

پدما کے گھر والے نے ایک کمرے کا تالا کھول دیا۔ کہنے لگا، ”یہ تمہارا کمرہ۔ یہاں بستر ہے، ایک کرسی بھی پڑی ہے اور یہ دیکھو فرس پہ سیتل پائی ڈالی ہوئی ہے، چٹائی، چٹائی..... تنکوں کی چٹائی سمزتے ہو؟ بس تو مرجی ہے بسترے پہ لیٹو، مرجی ہے سیتل پائی پہ بیٹھو لیٹو، یوگا کرو..... تم یوگا کرتے ہو؟ نہیں کرتے ہو گے۔ مسلمان بھائیوں میں یوگا کی چرچا نہیں ہے۔ وہ تو ایک ہی کام جانتے ہیں..... بل کی دو کام..... ماس کھاتے ہیں اور ماس سے ماس..... ہاہاہا..... برا مان گئے؟ چلو چھوڑو میری مسکھری کی آدت ہے۔ تو میں اب جا رہا ہوں اپنے کمرے میں۔ کوئی چیخ کی جرورت ہو مجھے یا پدما کو آواج دے لینا۔ چھوٹے موٹے کام کھس ہو کے کر دیتی ہے برا نہیں مناتی پدما۔ بولتی ہے مجوان کی ٹہل سیوا میں ایسی کون اڑچن ہے..... اچھا!“

”اچھا“ کہہ کے جیسے ہی وہ سامنے سے ہٹا کسی نے دروازہ تھپتھپایا۔ اپنے کمرے میں جانے کی بجائے اس نے بڑھ کے دروازہ کھول دیا۔ ”ہا آ! پدما رانی! اچھا ہوا دیری نہیں لگائی تو نے۔ دیکھ ڈاک صاب نے اب کی کسے ساتھ کیا ہے۔ دیکھ لے یہ بھی مسلمان بھائی ہے۔ ہاہاہا بھوت پریت سے ڈرے گا یہ بھی۔“

وہ بولی، ”چل بکواس نہیں کر۔“ اس نے یہ بات غصے میں نہیں اٹھلا کے کہی تھی۔ پھر وہ سامنے آئی۔

تنگ مراٹھی کپڑوں میں خوب چمک دار سیاہ بالوں کی کسی ہوئی چوٹی گوندھے اور انگوٹھے کے ناخن جتنے گھماؤ والا ناک کا کوئی دیہاتی زیور پہنے وہ مسکراتی ہو دروازے میں آکھڑی ہوئی تھی۔ اس کا رنگ سانولا ہونٹ دبیز اور آنکھیں بڑی بڑی تھیں۔ وہ بازار سے آرہی تھی مگر لگتا تھا کچی نیند سے اٹھ کے آئی ہے۔ وہ مجھے دیکھ کے ہولے سے ایسے مسکرائی جیسے پرانی جان پہچان ہے، بولی، ”پدما نام ہے میرا۔“

میں نے بھی بتا دیا کہ کون ہوں۔

وہ ہنسی۔ دانت اس کے ایک دم سفید اور ہنسی کی آواز بچوں جیسی تھی۔ مگر صرف آواز ہی بچوں جیسی تھی۔ دیکھنے میں تو اس کی ہنسی کسی بہت جان کار عورت کی ہنسی تھی، گھیرتی اور الجھاتی ہوئی۔

وہ کمرے میں آنے کو بڑھی تو اس کا آدمی کہنے لگا، ”چل چھوڑ! اسے لیٹنے بیٹھنے دے یہ ابھی کچھ نہیں کھائے گا۔ بولتا ہے بھوک نہیں ہے۔“

”اچھا اچھا۔“ کچھ دیر وہ دروازے میں رکی رہی پھر ہاں میں سر ہلاتی اور چالاک سے مسکراتی ہوئی چلی گئی۔

میں بیٹھ گیا۔ سوچنے لگا یہ کن لوگوں میں آ گیا ہوں؟ یہ دونوں بھلا کس چکر میں ہیں؟ بڑے شہروں کا یہی ہے۔ سب طرح کی مخلوق آ کے بس جاتی ہے۔ میرا کیا ہے، ایک آدھ روز میں نکلنے کا آسرا ہو جائے گا۔ ابھی سنبھل کے گزارا کر لوں۔ دیکھا جائے گا۔ اور یہ ہے کہ محنت سے جان چرانے والا آدمی نہیں ہوں میں، پھر بھی مردے؟ اللہ خیر کرے۔

کچھ دیر بے چینی سے کرسی پر بیٹھا پہلو بدلتا رہا پھر بستر جا لیٹا۔

نہ معلوم کتنی دیر سوتا رہا۔ کسی کے اٹھائے بغیر آپ ہی آپ بیدار ہو گیا۔ دوپہر ڈھل چکی تھی۔ یاد آیا، میں پورے کپڑوں میں موزے پہنے پہنے سویا تھا مگر اس وقت بھاری چادر سی اوڑھے اٹھا تھا۔ گھبرا کے میں نے اپنی ٹانگوں اور بازوؤں کو ہاتھ لگایا، بدن پر میرے اپنے کپڑے نہیں تھے۔ نہ معلوم کیسے میں نے لمبا انڈرویئر اور سینڈو بنیان پہن رکھی تھی۔ موزے بھی اترے ہوئے تھے۔ یہ کیا چکر ہے؟ میں اٹھ کے بیٹھ گیا، میرے اپنے کپڑے سلیقے سے تہہ کیے ہوئے سرہانے رکھے تھے۔ اور..... میں نے دیکھا فرش پر کچھی سیٹل پاٹی پہ چادر اوڑھے کوئی لیٹا تھا۔

ابھی میں پوری طرح کچھ سمجھ بھی نہیں پایا تھا کہ سیٹل پاٹی پر لیٹے ہوئے نے کسما کے کروٹ بدلی، چادر سرک گئی اور خوب گندھے ہوئے سیاہ چمکیلے بالوں کی چوٹی جیسے خود اپنی طاقت سے اچھلی اور تنکوں کی ٹھنڈی چٹائی پر جا پڑی۔

اللہ خیر کرے، میں نے دل میں کہا۔ پھر کانسی کے کنگن بجے اور چادر پھینکتی ہوئی مردہ گھر کے انچارج کی عورت پدما تنکوں کی چٹائی پر اٹھی اور آلتھی پالتھی مار کے بیٹھ گئی۔

مراٹھی لباس اس قابل نہیں ہوتا کہ کوئی بھی صحت مند عورت فرش پر آلتھی پالتھی مار کے بیٹھ سکے۔ ویسے زیادتی کی بات الگ ہے۔ کوئی دھاندلی پر ہی تل جائے تو کیا کیا جاسکتا ہے۔

وہ عورت پدما دھاندلی پر تلی ہوئی تھی، اسی جان کار، چالاک طریقے سے ہنسی اور

بولی، ”ساری دوپہری سو کے نکال دی۔ ہاں؟“

میں نے چادر سے خود کو اچھی طرح لپیٹ لیا اور سر ہانے تہہ کیے رکھے اپنے کپڑوں کی طرف اشارہ کر کے پوچھا، ”یہ یہاں کس نے رکھے؟“

”میں نے رکھے۔ اور کون رکھے گا؟“ وہ چمکتے دانتوں کے لشکارے میں بولی اور میں سنائے میں آ گیا۔

میں جو کچھ پہنے ہوئے تھا، پتا نہیں وہ کہاں سے آیا ہوگا؟ اسے میں نے اپنے بدن پہ خود نہیں چڑھایا تھا۔ یہ تو میرا تھا ہی نہیں۔ اور سب سے بڑی بات، میرے بدن پر یہ آخر چڑھایا کس نے؟

میں نے پوچھا، ”جو میں پہنے ہوں..... یہ کس نے پہنایا ہے؟“

”سمپورنا نے،“ اس عورت نے اسی طرح بیٹھے بیٹھے انگڑائی لی تھی۔

”سمپورنا؟ کون سمپورنا؟“

”سمپورنا میرا آدمی اور کون۔“

”اس نے؟..... اس نے کیوں.....؟“

وہ بات کاٹ کے اٹھلا کے بولی، ”وہ نہیں پہناتا تو کیا میں پہناتی؟..... وارے

وا!“

اور وہ منہ پر ہاتھ رکھ کے جیسے شرما کے ہنسنے لگی۔

مجھے غصہ آرہا تھا۔ ”مگر یہ کیوں کیا؟ تیرے آدمی کو آخر ایسی کیا.....؟“

”لو!“ وہ الٹا برا مان گئی۔ ”تیرے کپڑے سوتے میں مسل رہے تھے، یہ کون برا کیا

ہم نے؟“

میں نے اسے ڈانٹا، ”کس قسم کے لوگ ہوتے؟ کیا ضرورت تھی بھلا؟ اور یہ بنیان،

کچھا جو پہنایا ہے، کس کا ہے یہ؟ کہاں سے آیا ہے؟“

میرے ڈانٹنے کا اس پر کوئی اثر نہیں ہوا، اپنے بھرے بھرے ہونٹوں کی چونچ سی بنا

کے بولی، ”میرے کو کیا کھبر کس کا ہے؟“

”کہاں سے آیا؟“

”آئے گا کہاں سے۔ ارے وہی سمپورنا مردے گھر سے اٹھالایا ہوگا۔“

”مُر.....؟“ میں چادر پھینک کے اٹھا، پھر فوراً ہی خود کو چادر میں لپیٹ کے بیٹھ گیا۔

وہ مجھے انڈرویئر پہنے دیکھ کے آنکھوں پہ ہاتھوں کی اوٹ کیے گھوم گئی تھی اور بے ر کے ہنسنے جا رہی تھی۔

دھیرے، دھیرے کہے جا رہی تھی، ”بے سرم نہیں تو..... بے سرم۔“
اس سالے سپورنا نے مجھے کسی مردے کا انڈرویئر بنیان پہنا دیا ہے! میں غصے میں جیسے کانپتا لرزتا کپڑے اٹھا کے باہر بھاگا، عورت کے ہنسی سے بے حال ہونے کی آوازیں رسوئی تک آتی رہیں۔ چھوٹے سے کوارٹر میں غسل خانہ کہاں سے آتا۔ میں نے رسوئی گھر میں سیمنٹ کا چبوترہ بنا دیکھ لیا تھا، پانی سے بھری ایک بالٹی بھی رکھی تھی۔ انڈرویئر بنیان پھینک جلدی جلدی میں نے ڈونگے سے خود پر پانی بہا لیا اور جیسے تیسے کپڑے پہن کے سردی سے کانپتا واپس اپنے بستر پر آ گیا۔

وہ اب بستر پر پچھی چادر کی سلوٹیں درست کرنے کے بعد پٹی پر بیٹھی مزے سے ٹانگیں ہلا رہی تھی۔

مجھے بھیگا ہوا اور سردی سے کانپتا دیکھ کے بولی، ”دیکھا؟ کیسا چلایا تجھے۔ ارے بدھو! تو نے دیکھا بھی نہیں، بالکل نیا نکور کچھا بنیان ہے، سپورنا کے لیے لائی تھی، ابھی ہیکن بھی نہیں کھولی تھی اس کی..... کیسا چلایا تجھے..... دیکھا؟“ پھر ہنستے ہوئے بولی، ”سردی کے ٹیم تجھ سے شان کرنے کو بولتی تو صاف منے کر دیتا۔ اب آیا نا جھٹ پانی ڈال کے..... صابن کی مست کھس بو آرہی ہے ترے پاس سے۔“

بکواس عورت تھی۔ میں نے چادر کھینچ کے خود کو سردی سے بچانے کے لیے پلیٹنا شروع کر دیا تو ہاتھ بڑھا کے وہ میری مدد کرنے لگی۔ میں نے ہاتھ جھٹک دیا تو جھوٹ موٹ کے غصے میں بڑبڑانے لگی، ”دیکھو رے کیسا نا کدرا مجوان ہے، ہم سیوا کرتے ہیں یہ سسر اگھہ ہوتا ہے۔“

میں ایسا کون گل فام ہوں کہ کہیں جاؤں تو عورتیں لڑکیاں جان کو آجائیں، مگر جو ہور ہاتھ سا منے تھا۔

میں سوچ رہا تھا کسی طرح اس سرجن دو بے مل کے درخواست کروں کہ میرا پیچھا چھڑاؤ اس مردہ گھراٹاف سے۔ جب تک میرا ٹرک نہیں آجاتا رہائش کی اجرت میں وہ مجھ سے کام لے لے۔ میں ہر طرح کی محنت مشقت کر لوں گا، ہاسپٹل کے کچن میں برتن

دھونے، سبزی ترکاری صاف کرنے، کاٹنے، تیار کرنے تک پہ راضی ہوں۔ وہ مالی کام دے دے یا کچھ نہیں تو وارڈ بوائے کا اسسٹنٹ بنادے، مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔

ابھی میں پوری طرح اپنی درخواست سوچ بھی نہیں پایا تھا کہ وہ عورت بڑی سی تھالی میں کچھ کھانے کو لے آئی، بولی، ”کھانے کا ٹیم نکال دیا۔ چھوٹا بریک فاس کر لے پھر بڑا کام کرنا ہے۔“

میں نے پوچھا، ”کیسا کام؟“

بولی، ”کتنے ہی دن کے رکے ہوئے کام ہیں۔“

”رکے ہوئے؟“ میں نے پوچھا تو اس نے ہاں میں سر ہلایا، یہ نہ بتایا کہ کس طرح

کے کام ہوں گے۔

ناشتے میں سوچی سے بنا نمکین حلوہ تھا جسے ساؤتھ میں اُپ ما کہتے ہیں۔ ایک بڑا سا خوشبودار قلمی آم اور دو مٹھی چیوڑا تھا کھٹ مٹھا۔

میں نے خاموشی سے جا کے کلی کی، ہاتھ دھوئے اور شوق سے یہ انوکھا مزے دار ناشتا کیا۔ وہ تھال واپس لے گئی اور دو گلاس بھر کے چائے لے آئی۔ ایک اس کے لیے تھا جسے وہ دونوں ہاتھوں میں تھام کے آلتھی پالتھی مار کے میرے سامنے چٹائی پر بیٹھ کر پینے لگی۔

مگر وہ جس طرح بیٹھی تھی اس سے کوئی بھی الجھن میں پڑ سکتا تھا۔

چائے اچھی تھی۔ میں نے تعریف کی تو بولی، ”یہ کچھ نہیں۔ چائے تو کبھی کسی ٹیم تجھے پلاؤں گی..... کیسری، کستوری چائے۔“

مجھے معلوم نہیں تھا کیسری کستوری چائے کیا ہوتی ہے۔ میں نے پوچھ لیا۔

بولی، ”جاfran اور جڑی بوٹی ملاتے ہیں چائے میں۔“

میں نے سوچا ہوگی کچھ۔ تفصیل کیا پوچھنی۔ وہ ٹکٹکی باندھے میری صورت دیکھتی رہی۔ دیر تک میں کچھ نہ بولا تو کہنے لگی، ”تو نے پوچھا نہیں کستوری چائے ابھی کیوں نہیں بنائی میں نے تیرے لیے؟“

میں نے کہا، ”اس میں پوچھنے کی کیا بات ہے؟“

بولی، ”ہے ایک بات۔ پر میں تجھے بتاؤں گی نہیں۔ تو سمجھے گا بالکل کھیاں نہیں ہے

لاج سرم بیچ کھائی ہے پد مانے۔“

”چائے بنانے، نہ بنانے میں لاج شرم کیسی؟“

بولی، ”جب بتاؤں گی نا تو تیری سز میں آجائے گی سب بات۔“

میں سمجھ رہا تھا کہ وہ بھی اپنے میاں کی طرح بکواسی ہے، اس لیے چپ رہا۔

اچانک پوچھنے لگی، ”تو نے کبھی عورت رکھی ہے؟“

ابے لے! یہ کس قسم کا سوال ہے؟ میں اس کی صورت دیکھنے لگا، وہ اپنی زبان رخسار

میں ٹکائے، چھوٹا سا ایک شریر ٹیلا بنائے، اپنی بڑی بڑی آنکھوں سے مجھے تنکے جا رہی تھی۔

میں نے کچھ الجھن، تھوڑی جھنجھل کے ساتھ اسے دیکھا تو خود ہی

بولی، ”نہیں رے، لگتا ہے بالکل کورا ہے، پھر تو کیسری کستوری تجھے نہیں بچے گی۔ ابھی نہیں

پلاؤں گی۔ سمپورنا کدھری سے کوئی جنانی تیرے لیے گھیر کے لائے گا، اسی ٹیم کیسری چائے

دوں گی تیرے کو..... اور کیا۔ دوسری جنانی نہیں ہوئی تو مجھے کوئی اپنے لیے مصیبت بلانی ہے؟

چائے پی کے تو تو نے بے ناتھ کا بجار ہی بن جانا ہے، میری تو سامت آجائے گی۔..... میرا

سمپورنا بے چارہ! اور جو اس نے کوئی بات کہہ دینی، روک ٹوک کرنی، تو تم دوئی جنے سانڈوں

کی طرح پل پڑو گے ایک دوسرے پہ، ناں رے ناں..... ہی ہی ہی۔“

وہ ہنستی رہی۔ میرا گلا خشک ہو رہا تھا۔ میں نے سوچ لیا کہ ابھی دو بے جی سرجن

سے مل کے یہ مسئلہ حل کرنا ہے۔ ایسے گزارا نہیں ہو سکتا بھائی۔ انسان کا بچہ ہوں۔ فرشتہ نہیں

ہوں۔ ہاں۔

میں ہاتھ دھو کے آیا تو وہ پلاسٹک کی ایک بالٹی میں صابن اور اسپنج کا ٹکڑا ڈالے صحن

میں آکھڑی ہوئی، صورت سے لگتا تھا کہ کام کا موڈ بنا کے آئی ہے۔ اب وہ چھیڑ چھاڑ، کھلواڑ

کے موڈ میں نہیں تھی۔۔

میں نے پوچھا، ”کیا کرنا ہے؟“

بولی، ”کام۔ یہ ایک بالٹی پونچھا تیرے واسطے اٹھا لیا ہے۔ آجا میرے ساتھ۔“

”جانا کہاں ہے؟“

بولی، ”سب کھبر لگ جائے گی، آجا۔“

کوارٹر میں تالا ڈال کے وہ مردہ گھر کی طرف چلی۔ میرا جی گھبرانے لگا۔ اب کیا وہ

مجھے مردے نہلوانے کے لیے لے جا رہی ہے؟ مگر وہ برابر بنے کھلے شیڈ کی طرف مڑ گئی، کھلے

شیڈ میں اسٹیل کے ریک کھڑے تھے۔ جن میں ایک ہی سائز کے پلاسٹک کے ٹب جیسے اوپر تلے جمے ہوئے تھے۔ ٹبوں سے دواؤں کی ناگوار بو اٹھ رہی تھی۔ خاصے موٹے پلاسٹک سے بنے یہ ٹب اتنے بھاری تھے کہ اکیلی پدماریک سے ایک اتارنا چاہتی تھی تو اس سے اتارنا نہ گیا۔ میں نے مدد کی تب کام بنا۔

وہ ریکوں کے پیچھے جا کر ایک اور بالٹی اسپنج اور صابن کا ٹکڑا اٹھالائی اور نل میں لگا ربر پائپ سنبھال، ٹب کو تر کرنے لگی۔ پھر اس نے چکنے پلاسٹک پر اسپنج سے جھاگ بنا بنا کے خوب صابن ملا اور مجھے دکھا دکھا کے بہت دیر تک اسے اندر سے صاف کرتی رہی۔ میں نے اور اس نے ٹب الٹ دیا تو پدما نے بتایا کہ باہر کی سطح کس طرح صاف کی جاتی ہے۔ کچھ دیر میں وہ جگمگانے لگا۔ اس کے اشارے پر میں نے وہ صاف کیا ہوا ٹب خالی ریک پر سوکھنے کو رکھ دیا۔

میں اور پدما دوسوا دو گھنٹے اسی طرح مصروف رہے۔ پھر اس نے پوچھا کہ اگر مجھے ٹب صاف کرنے، سنبھالنے کا طریقہ آگیا ہے تو اب وہ جائے گی۔ اسے اور بہت کام ہیں۔ میں نے کہا، ”ہاں تم جاؤ۔ میں سمجھ گیا ہوں۔“

کافی رات تک میں اسی شیڈ میں پلاسٹک کے ٹبوں کو صاف کر کر کے ریکوں پر رکھتا رہا۔ رات میں کسی وقت سمپورنا آیا۔ کہنے لگا، ”چل کوارٹر میں نہادھو کے کچھ کھاپی لے۔“ میں نے کہا، ”ہو!“

سمپورنا اور اس کی عورت کس چکر میں تھے، یہ تو ابھی کہا نہیں جاسکتا تھا، مگر عام سوجھ بوجھ کا آدمی بھی جان سکتا تھا کہ یہ جوڑا کوئی گڑبڑ کر رہا ہے۔ پہلے میاں نے اپنے مہمان، کسی مسلمان بھائی کا قصہ سنا کے مجھے بتانا چاہا تھا کہ اس کی پدما کتنی ’چالاک‘ ہے، پھر خود پدما نے اپنی اٹھک بیٹھک، اپنے انداز اور صاف صاف باتوں سے مجھے مائل کرنے اور ڈھب پر لانے کی کوشش کی تھی۔ ان لوگوں سے دور رہنا ضروری تھا۔ ٹھیک ہے، دیکھ لوں گا۔ صبح تک تو میرے جانے کا کچھ ہو ہی جائے گا۔

ہم دونوں کوارٹر میں پہنچے تو کسی انتظام کے تحت سرجن دو بے وہاں پہلے سے بیٹھا تھا۔ اسٹول کھینچ کے اس نے مجھے بھی بٹھالیا، کہنے لگا، ”ٹھیک سے سنو۔ پولیس تمہاری تلاش میں کئی گھنٹے سے ادھر ہاسپٹل میں سرچ کر رہی ہے، شام کو آگئے تھے باسٹرڈ اور اسٹاف سے

پوچھ کچھ کر رہے تھے۔“

یہ پریشانی کی بات تھی۔ میں اپنے تشویش ظاہر کی تو سرجن نے تسلی دی۔ اصل میں وہ احسان جتانہ چاہتا تھا اور یہ بتا رہا تھا کہ میری وجہ سے خود وہ خطرے میں آگیا ہے۔ میں نے کہا، ”مجھے پورا پورا خیال ہے کہ میری وجہ سے آپ کی پوزیشن خراب ہو سکتی ہے۔“

اُس نے ہاں میں سر ہلایا پھر بولا، ”سمجھ دار آدمی ہو۔ میں پولیس سے بچا تو لوں گا، اس میں کھڑے بھی ہے، کھد میری اپنی جیب سے کھرچا بھی بہت ہو رہا ہے۔ تو اب بتاؤ بدلے میں تم میرے لیے کیا کر سکتے ہو؟“

میں نے کہا، ”جو آپ کہیں۔ میں رقم کا بندوبست کر سکتا ہوں۔ ٹرک آجائے، آپ جو رقم مانگیں گے ادا کر دوں گا۔ مجھے بس وقت دے دیجیے۔“

دو بے بولا، ”کیش رقم مجھے نہیں چیتے۔ میری پاس بہت پیسا ہے۔ تم سے تھوڑا کو آپریشن مانگتا ہوں۔ ایسا کرو کی جو آفر میں اس ٹائم دے رہا ہوں اس پہ کھوب سوچو سمجھو پیچھے، مجھے جواب دینا۔ ہاں؟“

میں نے کہا، ”آپ اپنی شرط یا آفر جو بھی ہے، بتاؤ۔“

کہنے لگا، ”ایک ساتھ میرے بہت سے آدمی نوکری چھوڑ کے چلے گئے ہیں۔ دہلی میں کوئی ہاسپٹل کھلا ہے اس کی بھرتی کبھی جگے ہو رہی ہے۔ تو لمبی لمبی پے کی لالچ میں کبھی اسکاؤنڈرل چلے گئے۔ ادھر کے کام چور بے ڈھنگے ورکر میں بھرتی نہیں کر سکتا۔ سارا کچھ برباد کر دیں گے اسی لیے چاہتا ہوں کہ جیسی تک میں تمہارے جیسے سمجھ دار اور مجبوظ باڈی والے ورکر نہیں بھرتی کر لوں، اس وقت تک تم میرے ہاسپٹل میں کام کرتے رہو۔ پر بھائی جی! یہ جان لو بدلے میں ٹھہرنے کی جگہ اور کھانا ہی ملے گا۔“

میں نے کہا، ”ٹھیک ہے میں کام کر رہا ہوں، کرتا رہوں گا۔ پر پتا تو چلے کہ کتنے دن رہنا، کام کرنا ہوگا؟“

سرجن بولا، ”ویسے تو پوزیشن سنبھالنے میں پانچ ویک لگے گا۔ پر میں چار دیک میں چھٹی دے دوں گا کیوں کی تمہارے لیے اگلا ٹرک چار ویک میں آنے کا ہے۔“

میں نے کہا، ”یہ تو بہت ٹائم ہے۔“

بولا، ”سوچ لو، ایسا ہی ہے..... اگلے ٹرک کی ٹائمنگ ایسے ہی سیٹ ہو رہی ہے۔“
میں نے کہا، ”ٹھیک ہے..... میرے رہنے کا کوئی اور بندوبست کر دو۔“
پوچھنے لگا، ”کیوں؟ سمپورنا کے گھر کوئی تکلیف ہے؟“
میں نے کہا، ”میاں بیوی کے بیچ ایک اجنبی آدمی کا رہنا، جو نو جوان بھی ہو، کسی طرح صحیح نہیں ہے۔“

سرجن ہنسنے لگا، ”یہ تمہیں کس نے بتایا کی دونوں میاں بیوی ہیں؟“
میں نے کہا، ”کون بتاتا؟ یہی دونوں کہہ رہے تھے۔ پھر رہتے جو ایک ساتھ ہیں۔“ میں نے سمپورنا کی طرف دیکھا، وہ دانت نکالے مسکرا رہا تھا۔
”ارے یہ دوست دوست ہیں، میاں بیوی نہیں ہیں۔ ہاں، یہ الگ بات ہے کی بستر مسہری کی کمی بیشی کی وجہ سے بے چارے ایک ساتھ گجرا کر رہے ہیں۔ ہا ہا ہا“
سرجن نے یہ بات سمپورنا کی طرف دیکھتے ہوئے کہی تھی۔ اس نے پھر دانت نکال دیئے تھے۔

میں ان کی صورتیں دیکھتا رہ گیا..... یہاں کیسی کیسی باتیں دیکھنے کو مل رہی ہیں۔
”خیر، جو بھی ہو کسی کے ساتھ بھی..... چاہے میاں بیوی ہوں، چاہے نہ ہوں میرا رہنا ٹھیک نہیں ہے۔ میں تو چھڑے چھانٹ مردوں کے ساتھ بھی رہنے سے پریشان ہوتا ہوں۔ کوئی اکیلا کوارٹر، الگ تھلگ کمرہ ہی دے دو مجھے۔ میں اپنا ٹائم نکال لوں گا۔“
سرجن بولا، ”ٹھیک ہے۔ ایک دو دن گجرا کر لو۔ کچھ کر دوں گا۔“
پھر وہ کہنے لگا کہ کام کے ڈیٹیلز تو مجھے پدما اور سمپورنا ہی بتائیں گے، چاہے میں ان کے ساتھ رہوں نہ رہوں۔

”اور کام؟“ کہنے لگا، ”کام سبھی طرح کے آتے رہتے ہیں چنتا نہ کرو۔ سیکھنے میں کوئی اڑچن نہیں آئے گی۔“

وہ رات ایک بجے تک کوارٹر میں بیٹھا بک بک کرتا رہا۔ اس کے جاتے ہی نہادھو کے سردی سے لرزتے کانپتے، کچھ زہر مار کر کے میں اپنے کمرے میں آیا تو دیکھا میرے بستر پر میرے کبل میں پدما لپٹی پڑی ہے۔

یہ کس طرح کا پریشر ڈالا جا رہا ہے؟ لگتا ہے کہ کسی طے شدہ منصوبے کے مطابق

ہور ہا ہے یہ سب کچھ۔

”کیا چکر ہے؟ جاؤ یہاں سے! جاؤ اپنے کمرے میں۔“

میں نے شور کیا تو وہ اٹھ بیٹھی۔ اس کے آدمی..... مطلب سپورنا نے میری آواز سن کے پر شور طریقے سے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا۔ گویا اپنی طرف سے اس نے اس سارے معاملے سے ہاتھ جھاڑ لیے تھے۔

وہ اسی طرح بستر پر بیٹھی ہتھیلیوں سے آنکھیں ملے جا رہی تھی؛ جیسے رات کی شفٹ سے گھر لوٹتے میاں کے آنے پر، بیوی کچھ آسودہ کہ آگیا ہے اور نیند خراب ہونے پر کچھ ناراض ناراض سی بیٹھی، بستر پر آنکھیں ملتی ہے۔

میں نے دوبارہ اسے بستر خالی کرنے کا اشارہ کیا تو پوچھنے لگی، ”ڈاک صاب سے بات ہوگئی تیری؟“

میں بہت چڑ گیا تھا۔ ”تجھے میری بات ہونے نہ ہونے کی کیا فکر ہے، جا اپنے کمرے میں..... سونے دے مجھے۔ تھکا ہوا ہوں اور دیکھ نہیں رہی کپکپی چھوٹ رہی ہے۔“ بولی، ”میں تو سب دیکھ رہی ہوں پر تیری سبز میں جرا نہیں آتا۔ لے۔“ اس نے آدھا کبل کھینچ کے جیسے میرے لیے فالتو کر دیا، آدھے بستر پہ میرے لیے جگہ بنادی۔ ”جھگڑتا کیوں ہے۔ آجا۔“

یہ ڈھنائی میرے لیے نئی چیز تھی۔ میں نے کہا، ”دیکھو۔ مجھے غلط سمجھ رہی ہو تم۔ اس کو ارٹر میں مجھے ایک دور گزارنا ہیں۔ تم اگر مجھے اکیلا چھوڑ دوگی تو مہربانی ہوگی تمھاری۔“ کہنے لگی، ”میں تجھے کیا کہتی ہوں؟ کوئی کھا تو نہیں جاؤں گی۔ مرا جا رہا ہے ڈر کی مارے، ارے ایک باجو آ کے پڑ جا۔ میری طرف سے تو اکیلا ہی ہے۔ چل تو کہے تو اب بات بھی نہیں کروں گی۔“

مجھے طرارہ آگیا، ”ٹھیک ہے۔ میں جا رہا ہوں۔ اس سپورنا سارے کو دو ہاتھ مار کے اُس کمرے سے نکالتا ہوں، یہ ہے تو ہی سہی۔“

وہ اٹھی، میرے برابر آکھڑی ہوئی۔ میرے ہاتھ تھام کے (اس کے ہاتھ خوب گرم ہو رہے تھے) خوشامد سے کہنے لگی، ”ناں ناں، تو سپورنا کو مار پیٹ مت کرنا۔ میری اس کی لڑائی ہے، بول چال بند ہے۔ میں اس کے پاس نہیں جاؤں گی، نہیں اسے ادھر آنے دوں

گی۔ ارے ایک ہی بار کی تو بات ہے، مجھے ادھر پڑا رہنے دے۔ سیرے کا مجھے پتا ہے سمپورنا مجھے منالے گا۔“

میں نے فرش پر بچھی سیتل پاٹی کی طرف اشارہ کیا، ”بستر خالی کر دے۔ جا سوتی ہے تو ادھر جا کے سو جا۔ ادھر نہیں ٹکنے دوں گا تجھے۔“

وہ جیسے مجبوری میں اٹھی، میرا کمبل سمیٹی سیتل پاٹی پہ جا کے خوب اوڑھ لپیٹ کے پڑ گئی۔ بستر پر بس تکیہ اور گدا چادر رہ گئے۔

پہلے میں سمجھا یہ اس کی کوئی نئی عیاری ہے۔ مجھے ستانے کو کمبل کھینچ کے چل دی ہے، مگر وہی تین منٹ میں وہ سکون سے خراٹے لینے لگی۔

میرے لیے سردی میں نچلا بیٹھنا دو بھر ہو رہا تھا۔ کسی لحاف کمبل کے بغیر لیٹتا کیسے۔ نیند آنے کا تو سوال ہی نہیں تھا۔ اس کو اٹھانا یا دوبارہ یہ مسئلہ چھیڑنا ٹھیک نہیں تھا۔ میں نے دیکھا گدے کے نیچے دری بچھی تھی تو بستر کی دری پر لیٹ، میں نے چادر اوڑھی اور جیسے تیسے اپنے اوپر گدالے لیا۔ کچھ دیر بے چینی رہا، آخر میں گرم اور پرسکون ہوتا گیا۔

سویرے کے ساڑھے آٹھ پونے نو بجے ہوں گے جو اس عورت نے آواز دے کے مجھے اٹھا دیا، نہ معلوم کس وقت اس نے اوپر سے گدا ہٹا کے مجھے کمبل اڑھا دیا تھا۔

رات کی باتوں کا اثر نہ تو سمپورنا کے، نہ پدما کے چہرے پر تھا۔ معمول کے مطابق ناشتے کی اور کام پر جانے کی تیاری کرتے ہوئے وہ مجھے سے ادھر ادھر کی ہلکی پھلکی باتیں کرتے رہے۔

آج پھر شیڈ میں لے جا کے انھوں نے مجھے پلاسٹک کے ٹب دھونے مانجھنے کی ڈیوٹی دی۔

پدما بولی، ”دھلائی سے تجھے لنچ کے ٹیم تک پھر صمت مل جائے گی۔ کوارٹر پہ آ جانا تجھے اور سمپورنا کو چاول دال بنادوں گی۔“

میں نے ہاں میں سر ہلا دیا، کوئی زیادہ بات اس نے بھی نہ کی۔ میں سمجھ گیا اس سے زیادہ بات کرنے میں میرا ہی نقصان ہے۔

لنچ کے وقت تک میں پلاسٹک کے وہ انوکھے ٹب دھوتا سکھاتا رہا۔ کوارٹر پہ آیا تو سمپورنا اور پدما مجھ سے پہلے کے آئے ہوئے تھے۔ انھیں دیکھ کے لگتا تھا کہ لڑائی کے بعد میل

ملاپ ہو گیا ہے؛ کیوں کہ دونوں بہت پاس پاس بیٹھے تھے۔ دوپہر تھی، پھر بھی پدما نے لپ اسٹک روڑ لگائی ہوئی تھی جو اس سالے سمپورنا کے چوکھٹے پر جگہ جگہ اتر آئی تھی۔ عورت نے ہمیں دال چاول اور آم کا اچار دیا۔ کھانا اچھا بنا تھا۔ مجھے اس میں ہینگ کی مہک بھی آئی، جو اچھی لگی۔

کھانے کے بعد سمپورنا میرے ساتھ ہولیا، کہنے لگا، ”ٹب پورے دھل گئے، اب آؤ ان کی فننگ کر لیتے ہیں۔“

میں نے پوچھا، ”کیسی فننگ؟“

بولا، ”چل تو رہے ہیں، دیکھ لینا۔“

کوارٹر سے نکل کے ہم سیدھے مردہ خانے کی طرف چلے۔ سمپورنا نے چابی نکالی، تالا کھولا، اندر کی لائیں جلائیں اور دروازہ اندر سے مقفل کرنے لگا۔

میں نے پوچھا، ”تالا کیوں ڈال رہے ہو؟“

ہنس کے کہنے لگا، ”اس لیے کی تم بھاگ نہیں جاؤ۔“

ایسی کوئی ہنسی کی بات نہیں تھی، میں نے اس کی طرف سنجیدگی سے دیکھا۔ اب وہ بھی سنجیدہ تھا، اسی وقت میری نظر سامنے مردے رکھنے والے سیمنٹ کے سلیبوں پر پڑی۔ وہاں دو درجن ننگ دھڑنگ، دھلی دھلائی تیار کی ہوئی لاشیں رکھی تھیں۔

مردوں، عورتوں، بوڑھوں، جوانوں کی لاشیں، جنہیں دیکھتے ہی معلوم ہو جاتا تھا کہ پیٹ چاک کر کے ہر لاش کی آلائش نکال دی گئی ہے۔ پلاسٹک اور اسٹیل کے بڑے بڑے ڈرم ایک قطار میں رکھے تھے۔ ان میں وہی دوا ہوگی جس کی ناگوار بو میں نے دو روز تک ٹب دھوتے ہوئے محسوس کی تھی۔ یہ کسی طرح کی گوشت محفوظ کرنے والی دوا تھی یا کچھ اور..... اللہ جانے۔ ڈرموں کے برابر، اوپر تلے، پلاسٹک کے وہ ٹب رکھے تھے جنہیں میں نے دو دن کی محنت سے دھو سکھا کے جگمگا دیا تھا۔

ابھی میں مردہ گھر میں جی ان چیزوں کا جائزہ ہی لے رہا تھا کہ کسی اندرونی کھٹکے سے کوئی بغلی دروازہ کھلا اور سفید کوٹ پتلون، سفید بے داغ گاؤن اور ربڑ کے دستاں پہنے، ربڑ کے اونچے جوتوں میں فرش پر کھس کھس کرتا ہوا، سرجن دو بے آگیا۔ وہ بالکل سامنے، لاشوں سے پٹے سلیبوں کے درمیان کھڑا ہو گیا اور خوش مزاجی سے بولا، ”ہیلو!“

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ میں نے پریشان ہو کے دو بے سے پوچھا۔

وہ بولا، ”آج ہم ان ڈیڈ باڈیز کو پیک کریں گے۔“

”کیوں؟“ میں لا حول پڑھنا چاہتا تھا، مگر نہ معلوم کیوں میں نے سوال کیا تھا۔

سرجن دو بے سمپورنا کی طرف مڑا۔ ”تم نے سمپورنا!..... اسے کچھ نہیں بتایا؟“

وہ بولا، ”ڈاک صاب! میں نے سوچا پہلے سے بتانا کیا جروری ہے۔ ہم جیسی کام

کرنے بیٹھیں گے، اسے سب کھبر ہو جائے گی۔“

”نہیں نہیں یہ برا ہے۔ سچی بات ہے کی مجھے چھپانا، جھوٹ بولنا اچھا نہیں لگتا۔

ارے بھئی جس کسی کو بھی ہمارے لیے کام کرنا ہے اسے کھبر ہونی چہ کی ہم کیا کام کر رہے

ہیں..... مطلب اس کو کیا کام کرنے کا ہے، ہمارے واسطے، ہاں“

پھر وہ اپنے ربڑ کی دستانوں سے کھیلتا ہوا بولا، ”ہم واسطو میں..... مطلب ان

فیکٹ ہم لاشیں جمع کرتے ہیں۔“

”جمع کرتے ہیں؟“

”ہاں، مطلب Collect کرتے ہیں ڈیڈ باڈیز۔“

”پر کیوں؟“

”اسٹور کرنے کے لیے۔“

”اسٹور کس لیے.....؟“

”اسٹور نہیں کرو تو لاشیں Rot ہونے لگتی ہیں اور میموری اور ساہتیہ میں اور ہسٹری

مطلب ایتھاس میں نکل نکل کے آتی ہیں بار بار۔۔۔ کئی کئی ہزار برس کی لاش پانی سے اور

شمشان بھومی سے اور کبرستان سے نکل کے آتی ہے اور کنور ہیملٹ کے پتا کی طرح گڑھیوں

کی برجیوں پے ٹہل لگاتی ہے۔“

باپ رے باپ! یہ کیا بد معاشی ہو رہی ہے؟ میں نے سوچا۔

وہ میرا خیال پڑھ رہا تھا بولا، ”بد معاشی نہیں ہے..... راج نیٹی، مطلب Politics

میں اس پر کار کا Disposal جروری ہے، نہیں تو گدی نہیں سنبھالی جاسکتی۔ اوں ہنک۔“

پر اس کیمیکل سے اور ٹبوں سے، ہمیشہ کے لیے، لاشوں کو کیسے کوئی ڈسپوز آف کر سکتا

ہے؟ جب آگ اور مٹی اور پانی ہزار برس بعد بھی ناپسندیدہ کے ڈے ورز (Cadavers) کو اپنا

Rot پھیلانے سے نہیں روک سکتے، تو یہ سب کیمیکل کیا کر پائیں گے؟

وہ میرا اعتراض سمجھ گیا تو اس نے مجھے بتایا کہ کیمیکل اسپرے کر کے، پلاسٹک کے ایک ٹب میں لاش رکھ دی جاتی ہے اور دوسرے ٹب کو، جو اصل میں ڈھکنے کی طرح کا ہے، سیٹ کر کے لاش کو ایئر ٹائٹ وغیرہ کر دیا جاتا ہے، پھر اندر لاش پر فراموش گاری کا عمل شروع ہوتا ہے۔ لاش کا سب رکارڈ، نام، پتا، زمانہ، اس کے خیالات اور نظریات، اس کی شبیہیں، اس کے لیے کہی گئی نظمیں، اس کے لیے نکالے ہوئے جلوس، سب Liquidate ہوتے رہتے ہیں۔ باہر بھی کوئی اس کا نام نہیں لیتا۔ اس کا نام، پتا، زمانہ، خیالات، نظریات، شبیہیں اور اس کے لیے کہی گئی نظمیں، نکالے ہوئے جلوس ایک Huge غیر متعلق Information Junk میں اچھی طرح پھینٹ دیئے جاتے ہیں کہ کوئی انھیں Salvage نہ کر سکے۔ پھر وہ سب کچھ Ignore کیا جاتا ہے اور کبھی کسی بات کی تردید نہیں کی جاتی کیوں کہ تردید ایک طرح کی Negative موجودگی ہے۔

مجھے متلی آرہی تھی۔ یہ حرام زادہ کس اطمینان سے اتنے بڑے فراڈ، تاریخ کی ایسی بھیا نک Tempering کا سرسری ذکر کر رہا ہے، بالکل نہیں شرماتا اور سمجھ رہا ہے کہ میں اس حرم زندگی میں اس کا ساتھ دوں گا۔ ہرگز نہیں۔ میں نے پرزور احتجاج کرنے کے لیے حلق سے کوئی آواز نکالی۔ جس کا کچھ مطلب نہیں تھا... اس لیے آواز میں جان نہیں تھی۔

دوبے کہنے لگا، ”سنو! پہلے سمپورنا ٹب میں دوا کا اسپرے کرے گا۔ اب تم چاہو تو اپنی کسی دعا سے کام شروع کر سکتے ہو (تم لوگ کو دعا وغیرہ کا بڑا شوق ہے)۔“

میں نے پھنسی ہوئی آواز میں کہا، ”میں یہاں سے جانا چاہتا ہوں۔“

وہ نرمی سے بولا، ”جانے کی بات مت کرو۔ ادھر بھی یہی ہے، بائی گاڈ! کوئی ڈفرنس نہیں ہے۔ ایسا ہے کی تم کو دیکھنے کا چانس نہیں ملا ہوگا۔ ادھر چانس مل گیا ہے۔ اچھا تو اب سمپورنا اور تم اسپرے کیے پلاسٹک کے ان آدھے تابوتوں میں لاشیں رکھتے جاؤ۔ میں اوپر سے ڈھکنے اور لائننگ پٹیاں فٹ کرتا جاتا ہوں۔ کم آن Get Set اینڈ گوا!“

تو اب کیا عرض کروں، برس ہو گئے ہیں۔ ایسا ہے کہ نہ میرا ٹرک آیا ہے، نہ کوارٹر بدلا گیا ہے، اسی کوارٹر کے دو کمروں کے بیچ پدما کی اتھل پتھل ہوتی رہتی ہے۔

مجھے کوئی زیادہ پریشانی بھی نہیں ہے۔ ہم دونوں ہی وقائع نگار، مطلب

scavengers اس کے ونجرز ہیں، جو اپنی Mindless محنت سے ناپسندیدہ میٹرل کو غتر بود کرنے کے عمل میں کسی دو بے وغیرہ کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ سمپورنا اور میں..... ہم پلاسٹک کے تابوتوں میں لاشیں رکھتے جاتے ہیں، اور اوپر سے ڈھکنے فٹ کرتے جاتے ہیں۔ کام صحیح چل رہا ہے۔

قارئین! زیادہ خوش ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ میں یہ قصہ یہاں بیٹھ کے سناربا ہوں اس لیے یوں سنایا ہے۔ اگر وہاں ہوتا تو دوسری طرح سناتا (نام بدل دیتا اور کہیں کہیں ٹچ اپ کر دیتا) ویسے آپ جان گئے ہوں گے کہ ادھر ادھر میں فرق کوئی نہیں ہے۔ دونوں سسٹمز ایک ہی تھیلی کے چٹے بٹے ہیں۔



جشن کی ایک رات

”کہتے ہیں ہما جس کے سر پر سایہ ڈال دے اسے بادشاہی مل جاتی ہے۔“

واواوا۔

”سب مرشد پیر گواہ رہیں میرا سلطان شہباز ہے۔“

وا۔

”شہباز ہے کہ جس پر سایہ ڈال دے اسے شیر جیسا جری بنا دیتا ہے۔“

واواواوا قربان۔

سر مست خان سر بنی، سلطان ہند شیر شاہ سوری کا دودھ شریک بھائی، سامنے قالین پر بیٹھا تمبور بجا رہا تھا۔ ایک نوجوان روہیلہ دوزانو بیٹھا، آنکھیں بند کیے، اپنا ایک کان ہتھیلی کی اوٹ میں لیے کمال استغراق میں خوش الحانی سے پشتو بیت پڑھتا تھا۔ سب جانتے تھے یہ بیت صدر الصدور، دبیر دولت حسن علی خان لکھتے ہیں مگر صدر جہاں نے آج تک نہیں قبول کیا تھا کہ وہ شاعری بھی کرتے ہیں۔ برسرِ محفل وہ اس نوجوان رسالے دار کی تعریف کرتے تھے۔ کہتے تھے خدا نے تجھے اچھی آواز کے ساتھ شعر کہنے کی صلاحیت بھی خوب دی ہے۔ بس تو اتنا خیال رکھنا، اسے اپنی روزی کا وسیلہ نہ بنانا۔ تو رسالے دار ہے، تو نے اپنی روٹی گھوڑے کے پسینے میں گوندھی ہے۔

رسالے دار نے تان اٹھائی...

”سنتے ہیں تختِ اسکندر کا پایہ بلند تھا۔“

وا۔

”بلند تھا... اور مشرق و مغرب اس کے باج گزار تھے۔“

واواوا۔

”مگر میرے سلطان کا تخت اسیل گھوڑے کی پشت ہے۔“

واسبحان اللہ۔

”اور مشرق و مغرب اس کی ٹاپوں کی دھمک سے لرز اٹھے ہیں۔“

اب نو جوان رسالے دار نے بزرگ تنبور نواز کو اپنا کمالِ فن دکھانے کا موقع دیا۔

خود ادب سے گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کے سر جھکا لیا اور جھومنے لگا۔

رسالے دار کے لیے تنبور نواز سرمست خان چار حوالوں سے محترم تھا۔ ایک تو یہ کہ

عمر میں بہت بڑا تھا، نو جوان روہیلہ جانتا تھا کہ اسے بزرگوں کا احترام کرنا ہے ورنہ تلوار اس

کے ہاتھ میں کند اور مرکب اس کی ران تلے سرکش ہو جائے گا۔ دوسرے، سرمست خان

قیامت کا شمشیر زن تھا، خود سلطان شیر شاہ کے سربراہی پر چم تلے قنوج کے معرکے میں اس

نے اپنی تلوار کے جوہر دکھائے تھے۔ تیسری بات یہ کہ سرمست خان بادشاہ کا دودھ شریک

بھائی تھا۔ اور آخری بات یہ کہ ظالم غضب کا تنبور بجاتا تھا۔ اس فن کو سمجھنے والے کہتے ہیں کہ

سرمست کے ہاتھ میں بے جان تنبور کسی جان دار کی طرح کلام کرتا ہے۔

سرمست نے کچھ دیر ساز پر اپنی گرفت اور قدرت کا مظاہرہ کیا، پھر مسکرا کر سر کے

اشارے سے نو جوان روہیلے سے کچھ سنانے کی فرمائش کی۔ رسالے دار سینے پر ہاتھ رکھ کر تعظیماً

جھکا اور اب کے اس نے شہر جائس کے ملک محمد کا ہندوی کلام پڑھنا شروع کیا جس میں شیر شاہ

کے عدل و انصاف کا بیان پر اثر انداز میں کیا گیا تھا۔ حاضرین و اقربان، واسبحان، واواوا،

قربانت شوم، سبحان اللہ کی آوازیں دے دے کر کلام اور گائی کی تعریف کرتے تھے۔ رسالے

دار ابھی پورے دو بیت بھی نہ سنا پایا ہوگا کہ دور دالانوں میں یساوولوں کی آواز کڑکی۔

ایک یساوول تسلسل میں پکارتا تھا، ”نگہ داراں نگاہ داشت! نگہ داراں نگاہ داشت!“

دوسرے نے کڑک کر کہا، ”صاحب ظل ہما... مشیت اللہ فی الارض... خلیفہ زماں...“

سلطان عادل!“

پہلا نقیب تی و رُسر میں پکارا، ”المعدّل!“

دوسرے کا آوازہ، ”المعروف والمعز!“ ابھی بازگشت کرتا تھا کہ پہلے کی گرج سنائی دی:

”بادشاہِ اقلیم ہند بہ تائیدِ ایزدی، حضرت شیرشاہ سوری!“

پھر دونوں یساؤل ایک آواز ہو کر دعائیہ انداز میں پکارے، ”خلد اللہ ملکہ و سلطانہ!“

حاضرین میں کھلبلی مچ گئی۔ صدر الصدور حسن علی خان، جن کی فرمائش پر ”شیر بھون“

کی ڈھنڈا ر عمارت میں تنبور نوازی اور بیت خوانی کی یہ محفل ہو رہی تھی، محفل کے صدر سے اٹھ

کر برہنہ پادالان میں نکل آئے۔ سرمست خان نے تنبور اپنے خادم خاص کے حوالے کیا جو

اسے دوشالے میں لپیٹ کر ستون کی آڑ میں جا کھڑا ہوا اور خود سرمست، صدر الصدور حسن علی

خان کے ساتھ قدم بڑھاتا سلطان کی پیشوائی کو چلا۔ نوجوان رسالے دار، جس نے بیت خوانی

کی سرخوشی میں اپنی دستار کو ذرا سا کج اور بے ترتیب ہو جانے دیا تھا، ہڑبڑا کر اٹھا اور ستون کی

اوٹ میں جا کر نئے سرے سے دستار باندھنے لگا۔ صدرِ جہاں نے سوچا، کسے خبر تھی سلطان

اس طرح اچانک رات کے وقت شیر بھون میں نزولِ اجلال فرمائیں گے۔ میں نے تذکرہ بھی

نہیں کیا تھا کہ حضور کی صحت یابی کی خوشی میں اس طرح شیر بھون میں محفل کرنے کا خیال

ہے۔ واللہ، میں تو پریشان ہو جاؤں گا اگر سلطان نے اس بات کو پسندیدہ خیال نہ فرمایا۔

سرمست خان کو یہ اطمینان تو تھا کہ سلطان اس وقت اپنی ناپسندیدگی ظاہر نہ ہونے

دیں گے... وہ اپنے کو کہ، سرمست کا بہت خیال رکھتے ہیں، کسی دوسرے کے سامنے اسے

خفیف نہیں کریں گے۔ اصل فکر اس کو یہ تھی کہ ہفتے عشرے میں کبھی جب تنہائی میں سرمست

ہاتھ آگیا تو سلطان والا جاہ تبسم فرماتے ہوئے وہی بات پھر نہ کہہ دیں جو پہلے کسی موقع پر

انھوں نے کہی تھی۔ کہتے تھے، سرمست! ابلیس کا سفر بلندی سے پستی کی طرف تھا۔ پروردگار کا

کرم ہے کہ تو پستی سے بلندی کی طرف آیا۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ تو کتے اور کنیریں بچ کر اپنی

روزی کماتا تھا، آج مملکت کے عمائد میں شامل ہے۔ بے شک اس میں تیرے ارادے اور

تیری محنت کا بھی دخل ہے، لیکن اصل اور بنیاد کی بات میں جانتا ہوں۔ تو نے ایک نیک بخت

پاک طینت ماں کا دودھ پیا ہے، اور میں نے بھی۔ ہم دونوں ایک بلندی سے آشنا ہوئے ہیں،

گر نہیں سکتے۔

مگر سرمست خان نے دالان میں تیز قدم بڑھاتے ہوئے انکار میں سر کو جھٹکا دیا، نانانا۔ سلطان کو میری تنبور نوازی پر اعتراض نہیں ہے۔ یاد پڑتا ہے تین چار مرتبہ انھوں نے خود فرمائش کر کے تنبور سنا ہے۔ نہیں، وہ ناپسند نہیں کریں گے۔

صدر جہاں حسن علی خان، سرمست خان سرہینی، جلال خان بن جلو، رائے رایان ٹوڈرل، زین خان نیازی، سامانہ کا ملک بدر الدین مرل، ہیم چند کوٹھی والا، سر خاصہ خیل برما زید کور اور دریا خان سروانی جیسے عمائد سلطنت اور سلطان کے دیرینہ رفیق؛ پھر دو تین وہ امرا جنہیں پچھلی دفعہ بنگالے آنے پر سلطان نے ”امیر آسمان شکوہ“ کا خطاب دیا تھا، لکھنوتی کا قلعہ دار، رسالے کے دس بیس اعلیٰ عہدے دار، گورو بنگالے کے بارہ پندرہ زمیں دارانِ عمدہ اور ستونوں اور پردوں کی اوٹ میں کھڑے درجنوں معتمد اہل کار اور خدام خاص اپنے مرتبے کے اعتبار سے یا تو قالین بچھے دالان میں سلطان والا جاہ کی پیشوائی کے لیے بڑھے، یا اپنی اپنی جگہوں پر ایک ضابطے میں دھڑکتے دل کے ساتھ سر و قد کھڑے ہو گئے اور دیوان میں سلطان والا جاہ کے ورود اور اپنی اپنی کورنش کا انتظار کرنے لگے۔ پھر بیسیوں ایسے بھی تھے جو ستونوں اور بھاری پردوں کی اوٹ میں یا دالانوں کے نیم تاریک حصے میں چلے گئے۔

دالان کا موڑ مڑ کر سلطان شیر شاہ سوری، خاصہ داروں کی مشعلوں، چھت سے لٹکتے فانوسوں اور دیوار گیر ہانڈیوں سے روشن دیوان کے دالان کبیر میں آئے تو حسن علی خان نے دیکھا وہ مسکرا رہے تھے۔ دل سے ایک بوجھ سا ہٹ گیا۔ انھوں نے خدا کا شکر ادا کیا۔

حسن علی خان، سرمست خان، راجا ٹوڈرل، برما زید کور، اور دو چار اور جو پیشوائی کو بڑھے تھے انھوں نے سب سے پہلے کورنش دی۔ سلطان شیر شاہ کی مسکراہٹ اور حوصلہ افزا ہو گئی تھی۔ وہ دالان ہی میں رک گئے۔ خادم خاص شاور خان غلزنئی جو چاندی کا خاص دان اٹھائے پیچھے پیچھے آ رہا تھا، مناسب فاصلے سے ٹھہر گیا۔ وہ بھی مسکرا رہا تھا۔ اس کے پیچھے مسیح الملک تھے، وہ بھی رک گئے۔ سب کے پیچھے خاصے کے جوان بتوں کی طرح بے حرکت ہو گئے۔ حسن علی خان نے سب کی نمائندگی کی، مسکراتے ہوئے کہا، ”اے آمدنت باعث آبادی ما!“

سلطان نے اپنی بھاری گونجیلی آواز کو وقت اور موقع کی مناسبت سے عمداً نرم کیا اور کہا، ”حسن بابا! تم نے میرے سب دوستوں کو یہاں تنبور سنانے کو بلا بھیجا اور مجھے اقامت گاہ میں اکیلا چھوڑ دیا۔ مگر میں کہاں رکنے والا تھا... دیکھو آ گیا۔“

صدر جہاں نے شگفتگی کے ساتھ اس دوستانہ شکوے کا مناسب جواب دیا، شکر گزاری کے الفاظ کہے اور عرض کیا کہ عالم پناہ کی تشریف آوری سے شکرانے کی اس محفل کا اصل مقصد پورا ہو گیا ہے، وغیرہ وغیرہ۔

جلال بن جلو دو دن پہلے لکھنوتی پہنچا تھا، وہ سلطان کو بہت دن بعد دیکھ رہا تھا۔ اس نے سوچا ایسی شدید بیماری بھی اس پھولوں ڈھکی چٹان کو بہت زیادہ نہ بدل سکی۔ وہی سرخ و سپید رنگت، دور تک اتر جانے والی خدنگ آنکھیں، عقاب کی چونچ کی طرح ناک، ہر وقت جیسے مسکراتے بھرے بھرے ہونٹ، نیشِ عقرب کی طرح چڑھی ہوئی مونچھیں جن سے ہیبت و دبدبہ ظاہر ہوتا تھا؛ ساتھ ہی دارالعلوم کے نرم خو عالموں جیسی ڈاڑھی جو مزاج کے تحمل اور خداداد مسرت کی غمازی کرتی۔ ایک کم ستر سال کی عمر کے باوجود لگتا ہے پینتالیس اڑتالیس برس کا پختہ کار مرد ہے جس نے سہولت کے ساتھ زندگی کرنے کا کوئی نسخہ معلوم کر لیا ہے اور ابھی پچاس برس اور اسی ڈھب سے زندہ رہنے کی لگن رکھتا ہے۔

سلطان، حسبِ معمول، دائیں ہاتھ پر ہلکی سیف باندھے تھے جو کسی زمانے میں غزنی اور خراسان کے اسلحہ سازوں کا کارنامہ سمجھی جاتی تھی۔ دائیں رخ پر اکثر تلوار باندھنے سے اس خیال کو تقویت پہنچتی تھی کہ دونوں ہاتھوں سے تلوار چلانے کے باوجود سلطان شیرشاہ کو بائیں ہاتھ میں تلوار لینا اچھا لگتا ہوگا۔ وہ اس وقت ہلکے جامے پر مخمل کی سادہ نیم آستین پہنے تھے۔ دستار کی جگہ ایک درمیانے طول و عرض کا ریشمی رومال غیر رسمی طریق پر سر سے باندھ رکھا تھا جس پر سبک ساجیغہ بہار دے رہا تھا۔ لباس سے یہ اندازہ ہوتا تھا کہ سلطان دربار میں تشریف نہیں لائے بلکہ دوستوں میں بیٹھ کر دکھ سکھ کی سادہ باتیں کہنے اور سننے کی نیت لے کر آئے ہیں۔

سلطان نے سرمست خان سربینی کی طرف جیسے مصنوعی بیزاری سے دیکھا اور کہا، ”کو کلتاش! کیا تم نے میرے اور اپنے سخت کوش دوستوں کو ساز بجا کر نرم کرنے کا تہیہ کر لیا ہے؟“ سرمست خان نے مسکرا کر جواب دیا، ”خدا نے سلطان والا جاہ کو صحتِ کاملہ سے نوازا ہے... یہ ایک شب یقیناً سلطان اپنے کو کلتاش کو عطا کریں گے تاکہ ایک بار تو عقابوں کے مسکن میں بلبل کو بولتے سنا جاسکے۔“

”واللہ! سرمست خان تو لکھنوتی آ کر شاعروں کی طرح کلام کرنا سیکھ گیا ہے... حسن

بابا! کیوں نہ تم اسے علم عروض اور شعر گوئی کے نکات بھی سمجھا دو۔“
حسن علی خان نے مسکراتے ہوئے کہا، ”سلطان عادل ہمیشہ سے جانتے ہیں کہ
خاکسار حسن فن شعر گوئی سے نابلد ہے۔“

”ہاں ہاں، بے شک، یہ تو میں بھول ہی گیا تھا،“ شیرشاہ نے یہ بات ایک غماز
مسکراہٹ کے ساتھ کہی تھی۔ راجا ٹوڈرل، سربنی، شناور غلزی اور دوسرے اکابر، جو واقف
حال تھے اور سلطان کے روبرو مسکرانے کی جسارت کر سکتے تھے، مسکرائے۔ حسن علی خان نے
معصوم صورت بنالی جس سے سلطان کے مزاج کی شگفتگی میں اضافہ ہوا۔ انھوں نے سربنی کو
مخاطب کیا، ”میں نے دُور سے سنا تھا کوئی خوش الحان تمھارے تنبور کی آواز سے آواز ملا کر کچھ
پڑھتا تھا... کیا پڑھ رہا تھا؟ کون تھا؟“

سر مست خان نے عرض کیا، ”ایک رسالے دار ہے۔ ملک محمد جاسی کے بیت پڑھتا
تھا جو اس نے سلطان والا جاہ کی شان میں ہندوی زبان میں تحریر کیے ہیں۔“
شیرشاہ اب دیوان میں داخل ہو چکے تھے۔ حاضرین نے کورنش گزاری اور اسی
طرح سرود کھڑے رہے۔ روہیلوں کے دستور کے مطابق ساز و نغمے کی محفل میں درباری
آداب کو کچھ نرم کر دیا جاتا تھا۔ اس لیے دیوان کے صدر میں پہلے سے بچھے قالینوں پر ایک
قالین اور گاؤ تکیہ جو سلطان کے پسندیدہ آتشی رنگ کا تھا، فوری طور پر بچھا دیا گیا۔ سلطان
شیرشاہ پاپوشیں اتار کر تکیے سے جا نکلے۔ خادم خاص پاپوشیں سنبھال کر عقب میں جا بیٹھا۔
سلطان ہند نے حاضرین محفل کو اشارہ کیا۔ دستور کے مطابق وہ بھی جنھیں دربار عام میں
کھڑے رہنا ہوتا تھا، بیٹھ گئے۔

شیرشاہ نے پوچھا، ”ہمارا خوش آواز رسالے دار کہاں ہے؟“
افسران دربار نے اشارہ کیا، نو جوان رسالے دار، عالی مسند کے روبرو آیا، کورنش ادا
کی۔ سلطان نے فرمایا، ”رسالے دار! تمھیں کوئی قدیم رجز یاد ہو تو سناؤ۔ میں اس مجلس کو
سپاہیوں کی مجلس ہی دیکھنا چاہوں گا۔“

نو جوان روہیلہ سینے پر ہاتھ باندھ کر خم ہوا۔ سربنی نے اپنے خادم خاص کو اشارہ
کیا۔ اس نے دو شالے میں لپٹا تنبور اپنے آقا کو پیش کر دیا۔ سر مست نے اجازت لے کر تنبور
کے تار ملانا شروع کیے۔ پھر جب سلطان نے اپنے اس رضاعی بھائی کی طرف مہر و مروت

سے دیکھا تو اس نے رجز کی کوئی شعلہ فشاں دھن چھیڑ دی۔

صحت یابی کے بعد سلطان شیر شاہ نے خود کو جشن کی یہ ایک رات دینا منظور کیا تھا۔
مگر اس ایک رات کے آگے پیچھے، حرب و جدال کی جاں کاہ مشقتوں اور مشکل
فیصلوں کے کرب سے پسینا پسینا بے شمار راتیں تھیں جن کا حساب کسی وقائع نگار نے اس طرح
نہ رکھا جیسا کہ حساب رکھنے کا حق ہوتا ہے۔ اور جب دیکھتے ہی دیکھتے معاشرہ تاریخ کا آگ
برساتا سورج سوانیزے پر آ پہنچا تو بہت سی چیزیں اپنے معنی کھو بیٹھیں اور مٹی ہو گئیں۔
بس پتھر کی ایک سفید سل کہیں پڑی رہ گئی جس پر ادھیڑ عمر کے ایک آدمی کو شیر سے
پنچہ کرتے دکھایا گیا تھا۔



بُرجیاں اور مور

لاجی بائی اسیر گڑھ والی نے تقسیم کے فوراً بعد یہاں آ کر نیپئر روڈ کا یہ فلیٹ بسا لیا تھا۔ لاجی بائی اپنی ایک نوپچی اور ایک لے پالک لڑکے کے ساتھ بمبئی کے بیلارڈ پیئر سے جہاز پر سوار ہوئی تھی اور جہاز سے اتر کر یہاں کیماڑی کے میول مینشن میں موتی سیٹھ شکار پوری کے فلیٹ میں پندرہ روز ٹھہری تھی۔

وہ ایسے ہی نہیں چل پڑی تھی، بڑا مال لائی تھی۔ اسی لیے موتی سیٹھ کے مشورے سے اس نے نیپئر روڈ پر چوراہے کا یہ فلیٹ خرید لیا۔ پھر ایک شاگرد سے چار شاگردیں ہو گئیں اور وہ جم کر اپنی بیٹھک چلانے لگی۔ گلابی شیڈ والی یہ لائیں، پنکھے، صوفہ سیٹ، قالین، مخمل والے گاؤتیکے... جواب کجلائے ہوئے، میلے میلے سے لگتے ہیں... لاجی نے اُسی زمانے میں خریدے تھے۔

رنڈیوں، ڈیرے دارنیوں کے بارے میں افواہیں نہیں اڑا کرتیں۔ اسکیٹڈل، افواہیں تو شریف زادیوں کا کھیدا ڈالنے کے لیے پھیلائی جاتی ہیں، مگر عجیب بات تھی، لاجی بائی کے بارے میں جاپانی روڈ پر اور شہر میں طرح طرح کی باتیں اڑی ہوئی تھیں۔

کوئی کہتا تھا اس کا اصل نام لیلا ہے، کوئی کہتا تھا نہیں، لیلیٰ ہے اور یہ اسیر گڑھ کے مہاراج کی درباری گائیکہ تھی۔ کوئی کہتا تھا ناں جی ناں، مہاراج نے بس ڈال رکھا تھا؛ اسے

گانا وانا تو آتا نہیں، پنڈت کوکا کاشمیری کے سب شاستر پڑھے بیٹھی تھی، سمجھو علم مسہری کی منتہی تھی یہ لیلیا بائی، اسی لیے تو مہاراج نے...

یہ آخری بات دل کو لگتی تھی، کیوں کہ گانے والی آواز تو لاجی کی کبھی کسی نے سنی نہ تھی۔ خیر خواہوں نے مشہور کر دیا تھا کہ نوعمری میں کوئل کی طرح کوکتی تھی لاجی بائی، مگر دشمنوں نے سیندور کھلایا، بس بیٹھ گئی ہمیشہ کے لیے۔ خود لاجی بائی نے یہ بات کبھی مان کے نہ دی کہ اسے سیندور کھلایا گیا تھا، نہ کبھی اس نے یہ کہا کہ اسے سیندور نہیں کھلایا گیا تھا۔

پتا نہیں کس سن میں ایک بہت قریب کے آدمی نے، جواب زندہ بھی نہیں، لاجی بائی سے گانے کی فرمائش کی تھی لاجی نے کہا تھا کہ ڈپٹی صاحب (قریب کا آدمی ڈی ایس پی ریٹائر ہوا تھا) تو لاجی نے کہا تھا، ”ڈپٹی صاحب، ہم ایک کے لیے گاتے تھے یا ایک لاکھ کے لیے۔ اب نہ وہ ایک رہا نہ ایک لاکھ۔ اب کیا گائیں۔ ہمارے تو بول بھی یہاں سمجھ نہ آئے کسی کو۔“ مگر یہ سب چالاکی کی باتیں تھیں۔

لاجی بائی کو گانے بجانے سے کیا ملتا جو چار مسہریاں چلانے میں یافت ہو جاتی تھی۔ گل بدن، لاجو، بیلا اور یاسمین... دو چار برس بعد لڑکیاں بدل جاتی ہوں گی، مگر چاروں نام یہی رہتے تھے۔ انھیں واجی سا گانا سکھا دیا جاتا ہوگا تاکہ مجروں کی آڑ میں سب چلتا رہے۔

مختصر یہ کہ لاجی بائی کی چار ’شاگردیں‘ تھیں اور وہ لمدا جس کا اوپر ذکر آیا ہے۔ سب اُسے ’لاجی والا‘ کہتے تھے۔



سب مجھے لاجی والا جاوید کہتے تھے۔

ہم لوگ جب یہاں آئے تھے اور لاجی صاحب نے یہ فلیٹ خریدا تھا، اُس وقت بہت ہوا تو میں سولہ سال کا ہوں گا۔

فلیٹ پر آنے والوں سے میں بات نہیں کر سکتا تھا۔ کوئی مجھ سے کام کے لیے بھی نہیں کہہ سکتا تھا۔ نہ ہی مجھے کسی سے کچھ لینے کی اجازت تھی۔ لاجی صاحب اس معاملے میں بہت سخت تھیں۔

پھر مجھے لوگوں میں بیٹھنے کا ڈھنگ آیا، بات کرنے کی تمیز آگئی۔ ویسے میل جول

میں نے کم ہی رکھا۔

بس ایک مظہر علی خاں تھے، بینک افسر، جن سے میری دوستی سی ہو گئی تھی۔ کبھی کبھی میں اُن کے دفتر چلا جاتا تھا۔ وجہ یہ تھی کہ مظہر علی خاں کو ٹھے پر آتے ضرور تھے مگر تماش بین نہیں تھے۔ لاجی صاحب کے ’پرستار‘ تھے وہ۔ اُن کی عمر اُس وقت چوبیس پچیس سال ہوگی... سمجھو میری عمر کے ہوں گے۔

میں یہ قصہ اپنی یا لاجی صاحب کی وجہ سے نہیں، مظہر علی خاں کی وجہ سے سنا رہا ہوں۔ بڑے دلیر آدمی تھے، پتا نہیں کہاں ہوں گے اب۔

مجھے یاد ہے پہلی بار وہ فلیٹ میں آئے تو دوپہر کا وقت تھا۔ خبر نہیں کیسے فلیٹ کا دروازہ کھلا رہ گیا تھا۔ لاجی صاحب لاؤنچ میں بڑے تخت پر گاؤتکیہ اور ٹیبل فین لگائے، لمبل کی چادر گیلی کر کے پیروں پر ڈالے آرام سے پڑی کچھ گنگنار ہی تھیں کہ ایک خوب صورت جوان، سفید قمیص پر سرخ عنابی ٹائی باندھے، سرج کی کالی پتلون اور چمچھاتے ہوئے بوٹ پہنے فلیٹ کے دروازے پر طبلہ سا بجا کے ہیلو کہتا ہوا گھس آیا۔

لاجی بولیں، ”کیا وحشت ہے؟ کہاں گھسے آرہے ہومیاں؟“

یہ ’میاں‘ مظہر علی خاں تھے۔ انھوں نے بڑھ کر لاجی صاحب کے پیر چھوئے۔ لاجی نے پیر سمیٹ لیے۔ وہ آنکھیں پھاڑے خاں صاحب کو دیکھے جارہی تھیں۔

مظہر علی خاں ہنستی ہوئی آواز میں بولے، ”بہت دن سے آپ کے درشن کرنا چاہتا تھا۔ آپ موسیقی کی تاج دار ہیں، بادشاہ ہیں اس فن کی۔“

لاجی کی تیوریاں چڑھی ہوئی تھیں۔ بولیں، ”برخوردار، غلط جگہ آگئے ہو... وہ ادھر نہیں رہتیں۔“

خاں صاحب ہنس کر بولے، ”ہمارے لیے تو آپ ہی ملکہ موسیقی ہیں۔ اس علاقے میں تو بس آپ ہی کا حکم چلتا ہے، باقی سب آپ کی رعایا ہیں۔“

اس خوشامدانہ جھوٹ اور ڈھٹائی پر لاجی ایک دم ہنس پڑیں۔ وہ ہنسیں تو مظہر علی خاں خود بھی ہنسنے لگے۔ بولے، ”میڈم! اسی مہینے سامنے بینک میں اسٹنٹ منیجر ہو کر آیا ہوں۔ اس وقت آپ کا اکاؤنٹ مل جائے تو بہت اچھا ہے۔ کھاتا کھلوا لیجی میری برانچ میں۔“

لاجی صاحب انھیں دلچسپی سے دیکھتے ہوئے اب گاؤ تکیے سے ٹک گئی تھیں۔ ہنس کے کہنے لگی، ”برخوردار! ایسی کیا مصیبت پڑ گئی ہے جو اکونٹ کے لیے کوٹھے جھانکنا شروع کر دیے؟“

بولے، ”ایک حرام الدہرا فرنگر گیا ہے۔ کہتا ہے اسٹنٹ سے پکا منیجر اُس وقت تک نہیں بنے دوں گا جب تک اتنی رقم کے اتنے اتنے کھاتے نہیں کھلواؤ گے۔“

”پھر؟ کوئی کھاتا کھولا بھی یا ایسے ہی؟“

منظہر علی خاں کہنے لگے، ”میں تو آپ کے سوا یہاں کسی کو جانتا نہیں۔ اور میرا منیجر، وہ بالکل ہی گیا گزرا دبو آدمی ہے۔ وہ تو آپ کو بھی نہیں جانتا، اتنا نیک ہے۔ صبح پونے نو بجے گاڑی سے اتر کر بینک میں گھس جاتا ہے، پھر پونے پانچ بجے اندر سے نکل کے گاڑی میں... اور چالیس کی اسپید سے اڑتا ہوا اس علاقے سے باہر۔“

لاجی صاحب نے کہا، ”سبحان اللہ!“

منظہر خاں بولے، ”تو پھر بسم اللہ کیجیے... بچیوں کو بھی بلو لیجیے۔ میں کھاتوں کے بارے میں انھیں بھی سمجھا دوں گا۔“

چوبیس پچیس برس کے ان خاں صاحب نے ”بچیوں“ کا ذکر جس طرح کیا تھا اس سے لاجی بس نہال ہو گئیں۔ بہت دیر تک منہ پر ہاتھ رکھے ہنسی روکنے کی کوشش کرتی رہیں، پھر ایک دم ہنسی میں جیسے پھوٹ پڑیں۔

منظہر علی خاں معصوم شکل بنائے کبھی لاجی کو کبھی مجھے دیکھتے رہے۔ لاجی ہنسے جارہی تھیں تو خاں صاحب مجھ سے بولے، ”بھیا، ذرا بلا لو سب کو... ٹائم کم ہے۔“

میں نے لاجی کی طرف دیکھا۔ انھوں نے ہنستے ہنستے ہاں میں سر ہلا کے مجھے لڑکیوں کو بلانے کا کہہ دیا۔

منظہر علی خاں ہنستی ہوئی لاجی کو سمجھانے لگے، ”میڈم، ہنسی کی بات بھی ہے اور نہیں بھی ہے۔ دیکھیے نا، گنتی کے دن ہیں اور لاکھوں روپے کے اکاؤنٹ کھولنا ہیں۔ آپ ہی بتائیے، میں گھنٹوں اور پیروں کو ہاتھ نہ لگاؤں تو اور کیا کروں؟“

فرصت کا وقت تھا۔ لڑکیوں نے لاجی صاحب کی ہنسی کی آواز سن لی تھی۔ انھوں نے لاؤنج میں جمع ہونا شروع کر دیا تو خاں صاحب ایک ایک کو سمجھا کر بچت اور بینکاری کے

فائدے بتانے لگے کہ دیکھیے، انسان کتنا غیر محفوظ ہوتا ہے، اور عورتیں تو آپ جانتی ہیں بہت ہی زیادہ غیر محفوظ ہوتی ہیں... خاص طور پر وہ خواتین جنہیں اپنے پیشے میں چمکنے کے لیے بہت کم ٹائم ملتا ہے، جیسے آپ لوگ...

”خواتین“ اور ”پیشے“ کے لفظ سن کے تو لاجی کے ساتھ سبھی نے ہنسنا شروع کر دیا تھا۔
 خاں صاحب کی تقریر چل رہی تھی۔ کہہ رہے تھے، ”آپ لوگوں کے لیے تو بینک اکاؤنٹ رکھنا اور پیسے بچانا بہت ضروری ہے۔ تاکہ برسات کے دنوں میں جب... جب کہ سایہ بھی ساتھ چھوڑ جاتا ہے... سمجھ رہی ہیں نا آپ؟ جب قدردان، نیازمند، پیسا کوڑی خرچ کرنے والے، ناز اٹھانے والے نہیں رہتے تو ایک بینک اکاؤنٹ ہی ہوتا ہے جو سہارا بنتا ہے...“
 لڑکیوں میں سے کچھ ابھی تک منہ پر ہاتھ رکھے ہنسے جا رہی تھیں۔ خاں صاحب ذرا دیر کو رکے ہوں گے کہ گل بدن ایسے شروع ہو گئی جیسے مشاعرے میں داد دے رہی ہو، ”واہ بھائی جان! واہ سبحان اللہ! بہت اچھی تقریر کرتے ہو!“

خاں صاحب نے بھی مشاعرے کے شاعر کی طرح چار انگلیاں سیدھی کر کے اُن پر انگوٹھا ٹکایا، پیشانی سے لگا کر آداب عرض کیا اور اُسی رفتار میں پھر چل پڑے۔
 گل بدن پیچھا چھوڑنے والی کب تھی، سب سے کہنے لگی، ”یہ بہت ڈھیٹ، بہت پگڑا ہے۔ کوٹھوں پر بہت آنا جانا رہا ہے اس کا... سارنگی بجاتا تھا پہلے۔“

لاجی صاحب کی ہنسی رک گئی تھی، انہوں نے گل بدن کو گھورنا شروع کر دیا تھا۔
 مگر مظہر علی خاں نے گل بدن کے فقرے کے جواب میں خود اپنے گالوں پر طمانچہ لگائے، بولے، ”توبہ کرو بائی توبہ... سارنگی بڑا مشکل ساز ہے۔ گنی، گن وان لوگوں کا کام ہے سارنگی بجانا...“

گل بدن بے سرا بول گئی۔ لڑکیوں کی طرف دیکھ کے کہنے لگی، ”تو پھر کوٹھوں کے لیے گاہک گھیر کے لاتا ہوگا۔“

لڑکیاں سب سُٹ ہو گئیں۔ ہر ایک کو احساس تھا کہ گل بدن اوچھا بول گئی ہے۔
 لاجی صاحب تو جیسے پہلی پڑ گئیں۔ مظہر علی خاں کا گورا چٹا رنگ ایک دم سرخ ہو گیا تھا۔ مگر انہوں نے کھنکھار کر سر جھٹکا، ہونٹوں پر زبان پھرا کر اور گل بدن کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہنے لگے، ”نہیں بائی جی! اب ایسے بھی گئے گزرے نہیں ہیں ہم... قصہ یہ ہے کہ بزرگوں

نے اپنے وقتوں میں، اللہ بخشے، بڑی رنڈی بازیاں کی تھیں، تو وہ بے خوفی ہے خون میں۔“
گل بدن کھیا کے لا جواب ہو گئی۔ لاجی صاحب نے ہاتھ بڑھا کر مظہر علی خاں کا
شانہ تھپک دیا، ”برخوردار! کچھ خیال مت کرنا۔ پاگل ہے یہ سری“
خاں صاحب کچھ دیر بیٹھ کے، لاجی سے وعدہ لے کے، کہ وہ اکاؤنٹ کھلوانے کا
سوچیں گی، چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد لاجی نے دھیرے سے کہا تھا، ”کیا لڑکا ہے بھی... مالک
خوش رکھے!“

دو چار بار مظہر میاں پھر آئے۔ لاجی صاحب پہنے کشمیر ملک اینڈ لسی شاپ کے
مالک کو کھلوا دیا تھا، اُس نے اور بالٹی فلٹر بیچنے والے ٹین ماسٹر نے سب سے پہلے خاں صاحب
کے حساب میں کھاتا کھلوا دیا، پھر سگریٹ کا ہول سیل والا گجراتی بھائی بھی دھیرے دھیرے لائن
پر آ گیا۔

مظہر علی خاں ان سب اکاؤنٹس کے لیے لاجی صاحب کا شکر یہ ادا کرنے آئے تو
کرسی پر بیٹھتے ہی انھوں نے اپنا بریف کیس کھولا اور چپٹا سا ایک ڈبّا نکالا۔ وہ شہر کی سب سے
بڑھیا دکان سے لاجی کی پسند کی مٹھائی لائے تھے۔ یہ ڈبّا انھوں نے ہاتھوں پر رکھ کر لاجی کی
طرف بڑھا دیا۔

لاجی نے پوچھا، ”یہ کس واسطے؟“

کہنے لگے، ”سوچ لیا تھا لیلاجی کا منہ میٹھا کراؤں گا۔“

”مگر کیوں برخوردار؟ ٹین ماسٹر اور کشمیر ملک والے نے کھاتا کھول لیا، کیا اس

واسطے؟“

خاں صاحب بولے، ”نہیں لیلاجی، کھاتے واتے تو کھلتے رہتے ہیں... وہ سب نہیں۔“

”تو پھر؟“ لاجی نے کہا، ”پہیلیاں کیوں بجھواتا ہے برخوردار! ہاں بھلا؟“

”دیکھیے، اس طرح ہے،“ مظہر میاں نے مٹھائی کا ڈبّا کرسی پر رکھ دیا، خود تخت پر

لاجی صاحب کے برابر آ بیٹھے، ”اس طرح ہے میڈم، کہ میں... اُس روز جو میں آپ کے فلیٹ

میں گھس آیا تھا اور چپڑ چپڑ باتیں کرتا تھا تو یہ مت سمجھیے کہ بونگی مارتا تھا۔ مجھے اُس روز بھی خبر تھی

کہ آپ کون ہیں۔ صرف خبر ہی نہیں، اُس وقت تک میرے پاس آپ کے پانچ گراموفون

رکارڈ آچکے تھے۔ چھٹا، جس کی بہت دن سے تلاش تھی، کل ملا ہے۔ لیلا جی! میں نے سوچ لیا تھا، وہ رکارڈ جس دن میرے ہاتھ لگ جائے گا تو آپ کا منہ بیٹھا کراؤں گا۔ وہ آپ کے آنے کے بعد نکالا تھا کمپنی نے۔ آپ کے پاس بھی نہیں ہوگا۔ وہی لہیا بلاول کہ... دیاری کہاں گئے وہ لوگ...“

لاجی بس مظہر علی خاں کی طرف دیکھے جا رہی تھیں۔ خاں صاحب نے ابھی بولنا ختم بھی نہ کیا تھا کہ لاجی نے جیسے نیند میں دہرایا، ”دیاری کہاں گئے...“ پھر وہ جیسے پوچھنے لگیں۔ ”الہیا بلاول؟ نایک صمد کی الہیا؟“

مظہر میاں نے سر ہلایا، ”جی وہی۔“

لاجی صاحب نے اپنے چہرے پر ہاتھ پھیر کر آہستہ سے پوچھا، ”کون ہو تم؟ کیسے جانتے ہو مجھے؟“

”میں؟ میں نے بتایا تو تھا، بینک میں نوکر ہوں، آپ کی اسی سڑک پر جو بینک ہے... اور میڈم، آپ کو کیسے جانتا ہوں؟ تو آپ کو لیلا جی، آپ کو تو بہت سے لوگ جانتے ہیں۔ ہزاروں، شاید لاکھوں... سن بیٹیس کے بعد کجریاں کس نے گائی ہیں آپ کے سوا؟ کون ہے؟ کس نے گائی ہوں گی؟ لیلا بانی اسیر گڑھ والی کی طرح کون گا سکتا تھا؟... میڈم، ہر اتوار کو صبح سے شام تک سنتا ہوں آپ کے رکارڈ۔ اسیر گڑھ کے نئے نوے جیلے جنگل ہو سکتے ہیں آپ کے سروں میں، اور مور، لیلا جی، اسیر گڑھ کے قلعے کی برجیوں پر بیٹھے ہوئے مور اور مورنیاں بولتی ہیں۔ میں نے وہ آوازیں نہیں سنیں... مگر ایک جان کار نے، ایک خوب سنے ہوئے نے مجھے سب آوازیں پہنچوا دی ہیں۔ لیلا بانی، میڈم، خدا جانتا ہے، مجھے موسیقی کی سمجھ اتنی نہیں ہے، مگر آپ کی گائی کجریوں کے ایک ایک نوٹ کی شکل کاغذ پر بنا کے دکھا سکتا ہوں۔“

لاجی صاحب سختی سے اپنے منہ پر ہاتھ جمائے بیٹھی مظہر میاں کی باتیں سن رہی تھیں۔ انھوں نے لیلا بانی اسیر گڑھ والی کہا تو لاجی نے چہرے پر ایک بار ہاتھ پھیر کر بے آواز دہرایا، ”لی لا!“

فلیٹ میں سناٹا تھا۔ میں دیوار سے ٹکا سب سن رہا تھا۔

یوں لگ رہا تھا جیسے لاؤنج میں، سامنے، کسی گزرے زمانے کی میت رکھی ہے۔

مظہر علی خاں نے لاجی صاحب کے آنسو دیکھ لیے تھے۔ وہ اٹھے۔ انھوں نے

بریف کیس اٹھالیا۔

لاجی صاحب زانو پر کہنی ٹکائے، مہندی لگی اپنی گول مٹول ہتھیلی پر ٹھوڑی رکھے بت بنی بیٹھی تھیں۔

اپنا بریف کیس ایک ہاتھ سے دوسرے ہاتھ میں جھلاتے ہوئے خاں صاحب نے اشارے سے لاجی صاحب کے بت کو سلام کیا اور فلیٹ کے دروازے کی طرف بڑھے۔ لاجی صاحب نے دھیرے سے کہا، ”ٹھہرو!“ خاں صاحب رک گئے۔ لاجی نے کہا، ”پھر آنا!“

مظہر علی خاں نے کہا، ”جی میڈم! آؤں گا۔ ریکارڈ اور باجا بھی لاؤں گا۔“
 ”نہیں! وہ مت لانا۔“

”جی اچھا۔“ اور مظہر میاں اُس روز پنجوں کے بل چلتے ہوئے فلیٹ کی دہلیز پار کر گئے۔ جیسے اپنے پیارے کی موت پر خاموشی سے پرسادے کے کوئی نکل جاتا ہے، بالکل اسی طرح۔



ہٹلر، شیر کا بچہ

یہ ایک حوالاتی کی کہانی ہے۔

فیلڈ مارشل کا زمانہ تھا، ٹریڈ یونین سرگرمیوں پر پابندی لگی تو چھوٹی بڑی مزدور پارٹیوں کے دفاتروں پر چھاپے پڑنے لگے۔ پولیس والے آتے، دفتری ریکارڈ، فرنیچر، ٹائپ رائٹر اور تنخواہ دار اور رضا کار سب قسم کے کارکنوں کو ٹرکوں میں ڈال کے لے جاتے۔ سرسری سماعتیں ہوتیں، کسی کو ماہ چھ ماہ کی سزا سنائی جاتی، کسی کو پانچ دس کوڑے مارے جاتے، بعضوں کو قید اور کوڑے دونوں ملتے۔ یہی سب چل رہا تھا۔

میں ان دنوں کھوسہ کی ٹریڈ یونین میں رضا کارانہ کام کر رہا تھا۔ اکیلا تھا۔ گزارے کے لیے ایک کوچنگ سینٹر میں انٹر کی انگریزی پڑھاتا تھا۔ خدا معلوم ڈیڑھ سو کہ دو سو ملتے ہوں گے... میرے لیے بہت تھے۔ کھوسہ کو میرا کوچنگ سینٹر میں پڑھانا برا لگتا تھا۔ کہتا تھا، اول تو وہ پیسے بہت کم دے رہے ہیں، ایک طرح سے 'پھوکٹ' میں کام لے رہے ہیں، دوسرے کوچنگ سینٹر چلانا علم کا 'پروٹی ٹیوشن' ہے۔ کھوسہ چاہتا تھا میں کل وقتی ٹریڈ یونینسٹ بن جاؤں، اسی کے ساتھ رہوں، کھاؤں، پیوں، فاقے کروں۔

ٹریڈ یونین آفس میں میرے علاوہ ریکارڈ کیپر، ٹائپسٹ اکبری خاتون، رشید خاں پیون اور خود کھوسہ، گویا ہم چار آدمی بیٹھتے تھے۔

پولیس آئی تو ہم تینوں کو لے گئی۔ رشید اس وقت چائے لینے گیا ہوا تھا، بچ گیا۔ اکبری کا گرفتاری کا پہلا موقع تھا، میں پہلے بھی جاچکا تھا، اور کھوسہ تو ایک طرح سے عادی تھا۔

کھوسہ بحیم شحیم، بات بات پر مشتعل ہونے والا، اپنی عزت آپ کرنے والا قبائلی جوان تھا۔ گاؤں کے بااثر لوگوں اور بڑے بوڑھوں سے اس کی بن نہ سکی تو وہ کراچی چلا آیا۔ ماسکو کی چھپی ہوئی اردو انگریزی کتابیں پڑھ پڑھ کے انقلابی ہو گیا۔ بے خوف اور کھرا آدمی تھا، بات کرنا بھی جانتا تھا۔ اس نے کارنر میٹنگیں کیں، پوسٹر لگائے، اپنے آس پاس آدمی اکٹھا کر لیے، ایک مزدور پارٹی بنالی اور بار بار بند کیا جانے لگا۔

اکبری خاتون میری ہم عمر ہوگی، یعنی کوئی اٹھائیس تیس برس کی۔ پہلے کہیں اس کی شادی ہوئی تھی جو چل نہ سکی۔ وہ اپنے بیمار باپ اور دو چھوٹے بھائیوں کے ساتھ کسی مضافاتی بستی میں رہتی تھی۔ تھوڑا بہت ٹائپ کرنا جانتی تھی، پاکستان کے سوشیو اکونومک نظام سے خفا تھی اور ضرورت مند تھی۔ فارغ وقت میں مجھے اس سے باتیں کرنا اچھا لگتا تھا۔ کھوسہ کو یقین تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے عشق کرتے ہیں، حالاں کہ ایسا نہیں تھا... اکبری اور میں دوست تھے، اور بس۔

خیر، تو ہمارے اعزازی لیگل ایڈوائزر کو ہماری گرفتاری کی خبر لگی، اس نے درخواستیں وغیرہ ٹائپ کیں اور رہائی کی کوششیں کرنے لگا۔

ایک دوروز میں شاید رہائی کی کوئی صورت نکل آتی، مگر کھوسہ نے سب گڑبڑ کر دیا۔ ابتدائی سماعت کے لیے کسی نئے نویلے ڈی سی کے سامنے ہمیں پیش کیا گیا۔ وہ ڈی سی میری بد قسمتی سے کھوسہ کا ہم علاقہ نو جوان نکلا۔ اس کے سادہ سے سوال کے جواب میں کھوسہ نے اس کی، یعنی اپنی، مادری زبان میں خدا معلوم کتنی دیر تک کیا کچھ کہا اور غیرت، بے غیرتی کے کیسے کیسے بھیا تک طعنے کھوسہ نے اسے دیے کہ آدھے گھنٹے میں کوئی تیس سنگین قسم کے مقدمے قائم کر دیے گئے اور ہمیں بڑے بھاری گارڈ کے ساتھ لے جا کر کراچی سے میلوں دور کسی بدنام پولیس لائنز کی حوالات میں بیڑ دیا گیا۔

میں نے موجودہ حالات سے فوری طور پر سمجھوتا کر لیا۔ ٹریڈ یونین کی اوکھلی میں سر دیا تھا اور وہ بھی کھوسہ کی انقلابی مزدور یونین میں، دھموکوں سے پھر کیا ڈرنا! کھوسہ کی طرح

میں بھی گنگناتا ہوا لاک اپ میں داخل ہو گیا کہ ستون دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ۔ یہ لاک اپ بھی سب حوالاتوں کی طرح منحوس در و دیوار والی تھی۔ فرش سے پانچ ساڑھے پانچ فٹ بلندی تک دیوار پر کالا رنگ پھرا ہوا تھا۔ پتھر جڑے ننگے فرش پر دو جگہ ملیشیا کے پرانے کمبل تہہ کیے پڑے تھے۔ کونے میں ایک طرف کمبلوں کا ایک ڈھیر اور تھا۔ دوسرے کونے میں، نالی کے ساتھ، سیمنٹ کی بالشت بھرا اونچی حد بندی سی تھی۔ اس پر بھی کالا پینٹ لگایا گیا تھا۔ پینٹ تازہ تھا یا شاید ادھر فینائل ڈالی گئی ہوگی تو اس کی بو پھیلی تھی۔ حوالاتیوں کو چھوٹی موٹی ضرورت کے لیے بار بار غسل خانے کون لے جاتا، یہ کونا ان کے لیے تیار کر دیا گیا تھا۔ ہم دونوں ایک ایک کمبل پر جاٹکے۔ پولیس والوں نے پر شور انداز میں حوالات کا دروازہ بند کیا تو کمبلوں کے تیسرے ڈھیر میں حرکت ہوئی۔ ڈھیر سے ایک سر برآمد ہوا۔ کوئی حوالاتی خوب ہی اوڑھے لیٹے سویا پڑا تھا اور اب اٹھ رہا تھا۔

بڑھے ہوئے شیو اور بکھرے ہوئے بالوں والے اس سوکھے سڑے آدمی نے کھنکھار کے گلا صاف کیا۔ میں نے دیکھا اس کے اوپری ہونٹ پر بالکل پیچوں پیچ بڑی سی مکھی بنی تھی، یہ اس کی ہٹلر کٹ مونچھ تھی۔ گلا صاف کر کے اس نے لجلجی خوشامدانہ آواز میں پولیس والوں سے کہا، ”عالی جاہ! حضور، اتنا شور کیوں کرتے ہو؟“ اور دوبارہ کمبل کی کولی مار کر وہ اس میں غائب ہو گیا۔

ہم دونوں بھوکے تھے۔ اپنے جیبے کے حساب سے کھوسہ تو کچھ زیادہ ہی بھوکا ہو جاتا تھا مگر اس پرانے حوالاتی کو دیکھ کر وہ ایک دم کھل اٹھا۔ ہنس کے کمبلوں کے ڈھیر سے کہنے لگا، ”ہٹلر صاب! او عالی جاہ! ذرا کمبل سے بھارتشریف لاؤ۔“

ڈھیر والا اب کے پورا کا پورا باہر آ گیا۔ پہلے اس نے بہت غور سے کھوسہ کو دیکھا۔ ایسے لمبے چوڑے آدمی اس نے کم ہی دیکھے ہوں گے، بہت متاثر ہوا۔ مجھے بھی بڑی توجہ سے دیکھنے کے بعد وہ بولا، ”بندہ نواز! آپ لوگ کس جرم کی پاداش میں یہاں آئے ہو؟“

کھوسہ نے خوش ہو کے پوچھا، ”پاداش کیا ہوتا ہے عالی جاہ صاب؟“

ہٹلر ہنسا اور پہلو بدل کر آلتھی پالتھی مارا اپنے کمبل کے دائرے میں مزے سے بیٹھ

گیا، کہنے لگا، ”آدمی شان دار ہو۔ پر لطف اور با ذوق بھی معلوم ہوتے ہو۔ بندہ پرور! کام کیا کرتے ہو آپ؟“

کھوسہ کو اس سے باتیں کرنے میں مزہ آرہا تھا، اپنی آواز میں روکھا پن ڈال کر کہنے لگا، ”ہم نقب لگاتاؤں۔ چوری چماری کرنے والا بد معاش لوگ سے اور اسمگلر لوگ سے ہم بھٹا لیتاؤں۔ کوئی مرڈر کا امیدوار مل جاوے، مطلب جس کا جینا ضروری نہیں ہووے اور ہم لوگ کو پیسے کا تنگی بھی ہووے، تو کبھی چھ آٹھ مہینے میں کوئی قتل متل بھی کر لیتاؤں۔ بس!“

”ماشاء اللہ!“ ہٹلر نے تھوک نکل کے کہا۔ وہ سمجھ نہیں پارہا تھا کہ ہم کیا ہیں، تاہم اس کے منہ پر ہوائیاں اڑنے لگی تھیں۔ پھر بھی اس نے حوصلے سے میری طرف سرگھمایا، پوچھا، ”صاحب زادے! اپنا کیا مشغلہ ہے؟“

میرے جواب دینے سے پہلے کھوسہ بول پڑا، ”یہ کسی کوٹھے پر پھوٹ میں انگریزی پڑھاتا ہے۔“

”حق... قا!“ ہٹلر نے حلق سے بطخ جیسی آواز نکالی جیسے یہ بات اسے بہت مزے کی لگی ہو۔ کہنے لگا، ”مگر کوٹھوں پہ، حضور والا! کچھ بھی پھوٹ کا، مطلب مفت کا کچھ بھی نہیں ہوتا واں... بس مفت کی بدنامی اور رسوائی نصیب ہوتی ہے بالا خانوں پر... ہبہ ہبہ ہا ہا... اور واں انگریزی کون پڑھتا ہوگا سرکار؟ یہ تو سب کہنے کی باتیں ہیں... سب کہنے کی باتیں ہیں، کچھ بھی نہ کہا جاتا... نو جوان ہیں ابھی یہ صاحب زادے، ابھی تو ان کے شباب، ان کی رعنائی کے دام لگیں گے بالا خانے پر، آگے آگے دے...“

”چپ کرو چٹنی!“ کھوسہ پر اچانک بھوک کا غلبہ ہوا تھا، ایک دم بھر گیا۔ کہنے لگا، ”لمبا لمبا الفاظ بول کے ہمارا دماغ خراب نہیں کرو۔ نہیں ادھر تمہارا کمبل میں ہی پارسل بنا دے گا ہم لوگ... ہٹلر، سالا، بکواسی!“

میں نے سمجھایا، ”کھوسہ! اوں ہوں... کھوسہ! کیوں بلا وجہ! پہلے تو خود ہی تم نے مذاق کیا، اب بگڑ رہے ہو۔“

میں نے دیکھا، ہٹلر نے میرے ساتھی کے بھڑکنے کا برا نہیں مانا تھا۔ چپ ہو جانے کا حکم سن کر دھیرے سے کہا تھا، ”جو مرضی بندہ پرور!“ اور اس نے احتیاط سے خود کو کمبل میں لپیٹنا شروع کر دیا تھا۔

کھوسہ کا غصہ اس وقت تک جیسے ختم ہو چکا تھا۔ ہٹلر سے وہ کہنے لگا، ”اے اے، سن بی سن۔ اوں ہنک۔ تم جاتا کدھر ہے بی کچھوے؟ کمبل میں واپس نہیں جاؤ۔ ہم جو پوچھتا

ہوں اس کا جواب دیو... اور ابھی زیادہ بات نہیں کرنا۔ ہاں؟“

ہٹلر پھر دھیرے سے بولا، ”جو حکم، بندہ نواز!“ اور کمبل اس نے آہستہ سے گرا دیا۔

”تم ادھر کیسے آیا بی؟“ کھوسہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔

ہٹلر کو حوصلہ ہوا، وہ کمبلوں کے درمیان لہرایا، بولا، ”بس علی جاہ! یہی مت پوچھیے... کم ہوں گے اس بساط پہ ہم جیسے...“ اسے پھر فوراً ہی میرے دوست کی دھمکی یاد آ گئی، جلدی سے کہنے لگا، ”یعنی یہ نہ پوچھیے تو بہتر ہے سرکار!“

”کیوں بی؟“

”رسوائیاں بھی ساتھ چلیں دم بہ دم کے ساتھ... کوچے میں آ کے بیٹھ رہے ہر قدم کے ساتھ... حضور والا! محض بے وجہ بدنام کرنے کو مجھے یاں پہنچا دیا گیا ہے۔“

مجھے یقین تھا یہ شعر جو ہٹلر نے سنایا خود اسی کا ہوگا... اتنے ہی پاگل پن کا شعر تھا۔ میں نے سوچا یہ باز نہیں آ سکتا۔ لچھے دار باتیں کرنا اس کی معذوری ہے۔ کھوسہ بھی منہ پھیر کے مسکرا رہا تھا۔ بولا، ”کس نے بدنام کیا ہے بی تم کو؟“

کہنے لگا، ”مجھ پر الزام بے وفائی ہے... جھوٹا الزام لگایا ہے خود میرے محبوب نے مجھ پر... بلا وجہ ایک ناکردہ گناہ کی پاداش کے جرم میں بند کر دیا گیا مجھے۔“ ہٹلر اب بالکل ہی بے قابو زبان بولنے لگا تھا۔

میں نے پوچھا، ”کیا جرم کیا ہے آپ نے؟ مطلب کیا جرم نہیں کیا جو وہ لوگ کہتے ہیں کہ آپ نے کیا ہے؟“

”زنا بالجبر!“

”کھوسہ ایک دم ہنس پڑا، بولا،“ اڑے بی بڑا استاد، خرکوز یہ خبیث ہے رے پتھر... بھلا تم زور زبردستی کا مجرم ہے بی؟ ہا ہا ہا۔“

”اوہو... اوہ، ہوں... آپ سمجھے نہیں عالی جاہ! زنا بالجبر کا ارتکاب نہیں کیا... ناں... بالکل نہیں حضور والا! میں اور میرا محبوب بہ رضا و رغبت ملتے رہے ہیں ایک زمانے سے، چناں چہ اس روز بھی ہماری ملاقات میں وہی سرشاریاں، سرمستیاں...“

”چل اے! خرمستی پہ مٹی ڈال۔ اصل بات بول۔“

”اصل بات یہ ہے بندہ پرور کے دشمنوں نے محبوب سے جھوٹا بیان دلوا کے مقدمہ

قائم کرادیا۔ پولیس کو کثیر رقم چڑھا دی گئی... اور اب، ناکردہ گناہ ہیں آرزوگی سے ہم۔“
 ہٹلر کی صورت، اس کی مضحکہ خیز باتیں، اس کی عجیب طرح کی بے بسی دیکھ کے مجھے ہنسی آگئی۔ وہ شکایت کے انداز میں میری طرف مڑا۔ کہنے لگا، ”ہنسو میاں! ہنس لو برخوردار! کہ ہم وہ ہیں جن کو عہدِ جوانی نہیں ملا۔“

کھوسہ بولا، ”جھوٹ نہیں بولو ہٹلر! تم کو تو قسم سے ایسا جنگی جوانی ملا ہے کہ لاک اپ میں پہنچا دیائے اسی جوانی مردار نے۔“
 ہٹلر اب خود بھی راز داری سے مسکرا نے لگا تھا۔ بولا، ”مگر جوانی کیا ہوئی عالی جاہ! ایک رات کی کہانی ہوئی۔“

اس پر تینوں ایک ساتھ ہنس پڑے۔ لاک اپ کے باہر سے ڈیوٹی والے سپاہی نے خبردار کیا، ”شور نہیں کرواؤ۔“

اس آدمی ہٹلر سے ہماری اچھی خاصی دوستی ہوگئی۔ چائے پیچنے والا بڑی بھاری کیتلی پر بورے، چیتھڑے لپیٹے، ٹونٹی میں کارک لگائے حوالاتیوں، سپاہیوں کو چائے دیتا ہوا آیا تو ہٹلر نے ہم دونوں کو اور ڈیوٹی والے سپاہی کو چائے پلوائی۔ ہم نے منع کیا تو کہنے لگا، ”بندہ پرور! ناچیز کی یاں گیس بٹیوں، سائیکلوں کی دکان ہے، خوب چلتی ہے آپ کی دعا سے، پیسے کوڑی کی کمی نہیں۔ وہ تو مقدر ہی کھوٹا ہے نسیاں کا۔“

کھوسہ نے گھبرا کے پوچھا، ”نسیاں کون بی؟“
 بولا، ”نسیاں اس خاکسار، بیچ مدان کا تخلص ہے۔ پورا نام ہے مرزا وحید الرشید بیگ نسیاں خان پوری۔“

میرے دوست نے انکار میں سر ہلایا، ”نہیں بی اتنا لمبا نام نہیں ہوتا... تیرا نام ہٹلر ہے۔ ہٹلر حوالاتی۔ کیسا؟“

ہٹلر نے دھیرے سے کہا، ”جو مرضی، عالی جاہ!“
 جب تک حوالات میں روشنی رہی، ہٹلر نے اپنے ہاتھوں کی حرکات اور چہرے کے تاثرات سے حسین حسین عورتوں کے دل آویز سراپے اور لفظی تصویریں بنا بنا کر، ان کے ساتھ گزارے ہوئے دل پذیر وقت کی تفصیل سنا سنا کر ہمیں الجھائے رکھا۔ ہر عورت جو اس کے ہتھکڑی میں آئی ”ناگتھا“ تھی۔ ہٹلر ہی وہ پہلا آدمی تھا جس نے اسے ”راہِ عشق میں سفر آشنا“ کیا

تھا۔ ہر عورت کم سے کم لکھ پتی کی بیٹی تو ضرور تھی اور ہنلر کو لے کر قبرص، موریشس یا سرنگا پٹم فرار ہونا چاہتی تھی۔ مگر ہنلر کے اپنے ’اصولاتِ عشق‘ ایسے تھے کہ وہ کسی بھی محبوب کو ’کانٹوں کے سفر کی رہ نور دی‘ پر لگانا نہیں چاہتا تھا اس لیے چند راتیں سرخوشی، مدہوشی و سرشاری کی ساتھ گزار کے ہنلر ہر دفعہ بھاگ جاتا تھا اور اب ان میں سے ہر عورت کو یاد کر کر کے غزلیں کہہ رہا تھا۔ میری طرف دیکھ کر ایک بار سنجیدگی سے کہنے لگا، ”کیا خیال ہے بندگانِ عالی! کیا یہی شریفانہ طریقہ نہیں ہے؟“

میں نے پوچھا، ”کیا مطلب؟ کیا غزلیں وزلیں کہنا؟ ہاں جناب، بہت شریفانہ بات ہے۔“ تو مزے میں سر ہلا ہلا کے ہنسنے لگا۔

مگر ہم پکنک پر نہیں آئے تھے۔ اس وقت صوبے کی بہت بدنام پولیس لائنز میں تھے۔ دو گھنٹے بعد ہی گارڈ آئے اور کھوسہ کو لے گئے۔

میں اپنے دوست کے تیور دیکھ کر ڈر رہا تھا۔ الہی خیر کرنا۔ شعلہ مزاج آدمی ہے، کسی اور مشکل میں نہ پڑ جائے۔

آدھے گھنٹے بعد کھوسہ کو واپس حوالات میں لایا گیا تو وہ مسکرا رہا تھا۔ کہنے لگا، ”وہی بے غیرت نے اپنا آدمی بھیجا تھا۔“

معلوم ہوا، ڈی سی کا پیش کار آیا تھا جو کھوسہ ہی کے قبیلے کا تھا، کہہ رہا تھا صاحب سے معافی مانگ لو، نہیں تو بڑے چکر میں پڑ جاؤ گے۔

میں نے کھوسہ سے پوچھا، ”پھر؟ تم نے کیا کہا؟“

کہنے لگا کہ اپنی زبان کی ایک بیت کہلا بھیجی ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ ادھر بے غیرت نہیں ہوتے، پھر بھی کوئی نظر آ جائے تو سمجھ لینا اپنا نہیں کوئی غیر ہے اور جھوٹ بولتا ہے یا پھر اس کی ماں نے اس کے باپ سے جھوٹ بولا تھا۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔

اپنے انقلابی جوش اور باولے پن میں کھوسہ بہت ہی گہرے پانی میں اتر گیا تھا۔ ڈی سی کے پیش کار سے اگر وہ صرف ایک لفظ ”نہیں“ کہلا بھیجتا تو زیادہ سے زیادہ چھ ماہ کی سزا سنا دی جاتی، قصہ ختم ہو جاتا۔ مگر اب جو یہ بیت کہلا بھیجی ہے تو معلوم نہیں کیا حشر کریں گے اس پاگل کا۔ میں منہ لٹکا کے ایک طرف بیٹھ گیا... اب کیا ہو سکتا تھا۔

ہٹلر اپنی ایک طرفہ بکواس کرتا رہا۔ میں چپ رہا۔ اس وقت کچھ بھی اچھا نہیں لگ رہا تھا۔

اندھیرا ہو گیا تو دو کانٹیل ہتھکڑیاں لے کے آئے اور ہٹلر کو اپنے ساتھ لے جانے لگے۔ کانٹیلوں کو دیکھتے ہی ہٹلر کی سٹی گم ہو گئی تھی۔
جاتے جاتے وہ آہستہ سے کہنے لگا، ”حضور! اب یہ مجھے تشدید کے لیے لے جا رہے ہیں۔“

شاید تشدد کہنا چاہتا تھا، پولیس والے اسے پوچھ گچھ کے لیے لے جا رہے ہوں گے۔ ہٹلر کے جانے کے بعد ہم دونوں اپنے اپنے کمبلوں پر جا لیٹے۔ اس مرزا وحید الرشید بیگ نسیاں خان پوری نے اپنی مسلسل باتوں سے اتنا تھکا دیا تھا کہ خبر بھی نہ ہوئی اور ہم گہری نیند سو گئے۔

رات میں کسی وقت حوالات کا دروازہ بڑی آواز سے کھولا گیا۔ سپاہیوں نے خوب ڈپٹ کر گالی بھی دی جس سے میری آنکھ کھل گئی۔ کانٹیل اندر لاگ اپ میں آ کر ہٹلر کی ہتھکڑیاں کھول رہے تھے۔ وہ بلا ضرورت اسے گالی بھی دیتے جاتے تھے۔ ہٹلر بے چارہ آواز نکالنا تو کجا ٹھیک سے کھڑا بھی نہیں ہو پا رہا تھا۔ سپاہیوں کے جانے کے بعد وہ کم زوری سے کھڑا کچھ دیر ڈگمگاتا، لہراتا رہا پھر دیوار کا سہارا لے کر آہستہ آہستہ چلتا ہوا اپنے بستر کی طرف گیا اور کراہتے ہوئے دراز ہو گیا۔

یقیناً پولیس والوں نے اسے بہت پیٹا تھا۔

کھوسہ لیٹے سے فوراً اٹھ بیٹھا۔ مجھ سے کہنے لگا۔ ”یار کا مرید! پہرے والے کو بولو پینے کا پانی لاوے۔“

میں نے سلاخیں بجا کر پہرے والے کو متوجہ کیا، وہ جب قریب آیا تو اسے مگا تھا دیا۔ پانی آ گیا تو مجھ سے مگا لے کر کھوسہ ہٹلر کے سرھانے جا بیٹھا، تھوڑا پانی چلو میں لیا، اس کے منہ پر چھینٹے مارے، ہاتھ پھیر کر چہرہ گیلایا، پھر سہارا دے کر اسے اٹھایا، پانی پلایا، میں بھی برابر بیٹھ گیا تھا۔ پانی پی کر ہٹلر نے آنکھیں کھول دیں۔ کھوسہ نے پوچھا، ”کیسا ہے تم؟“

ہٹلر کے چہرے پر جیسے کسی لہر کے ساتھ ایک دم چالاکی آ گئی۔ اس نے پہلے لاک اپ کے دروازے کی طرف سرگھمایا، پھر ہمیں دیکھ کر آنکھ ماری اور سرگوشی میں بولا، ”بندہ نواز!“

نا چیز ٹھیک ہے... بس خاموشی سے دیکھتے رہو، بے مثال اداکاری کر رہا ہے یہ خادم۔“
”اداکاری؟ واڑے وا!“ کھوسہ پریشان ہو گیا۔

ہٹلر نے مسکراتے ہوئے کراہ کے کروٹ بدلی اور بولا، ”جی جناب!“
ہم دونوں اس طرح بیٹھے تھے کہ اگر سامنے سے کوئی کھڑا دیکھ رہا ہوتا تو بھی ہٹلر کی حرکات و سکنات اسے نظر نہ آتیں۔ اب وہ کہنی ٹکا کر نیم دراز ہو گیا اور ہمیں دیکھ دیکھ کر مسکرانے لگا۔ مجھے بے چینی ہوئی۔ میں نے پوچھا، ”کیا بات ہے؟ کیوں لے گئے تھے تمہیں؟“

کہنے لگا، ”بڑے افسران کو ہمارے دشمنوں نے اپنے ساتھ ملا لیا ہے اور چھوٹے عملے... نائب صوبے دار، حوالدار، نانک، لیس نانک... کو مال پانی خرچ کر کے ہم نے قابو کر لیا ہے۔ سمجھے جناب؟ اوپر سے حکم آتا ہے کہ بھی مرزا وحید الرشید بیگ نسیاں کو ہلاؤ جلاؤ، مارو پیٹو، پوچھ گچھ کرو، نچلا عملہ کہتا ہے جو حکم سرکار اور ہمیں رات میں لے جا کے وہ ایک کمرے میں بٹھا دیتے ہیں۔ چائے پلاتے ہیں، بسکٹ کھلاتے ہیں... نائب صوبے دار تو اخبار بھی پڑھ کر سناتا ہے۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہم ہائے وائے کا شور اور واویلا کرتے رہتے ہیں تاکہ سب یہ سمجھیں ہم پر تشدید کی جارہی ہے۔ تو میاں! دوسرے تیسرے دن یہ نانک ہوتا ہے۔ ابھی تک مجال ہے جو پولیس نے ہمیں انگلی بھی چھوئی ہو۔ گویا بس زنداں میں بھی مزے آرہے ہیں بندہ نوازیوں کے۔“

کھوسہ نے منہ پر ہاتھ رکھ لیا، وہ بے آواز ہنس رہا تھا۔ ہٹلر نے بھی منہ بھیج کر کندھے اچکاتے ہوئے ہنسا شروع کر دیا۔
عجیب طرح کا فتنہ آدمی تھا!

ہم دونوں نے اس کی عیاری پر اسے داد دی تو ہٹلر کھل اٹھا، کہنے لگا، ”آپ ہم درد لوگ ہو۔ اگرچہ یہ بڑے کام ریڈ صاحب...“ اس نے کھوسہ کی طرف اشارہ کیا، ”یہ... خطرناک آدمی معلوم ہوتے ہیں۔“ پھر اس نے خوشامدانہ انداز میں کھوسہ سے کہا، ”برامت ماننا سرکار! آپ نے خود ہی فرمایا تھا کہ آپ کرائے کے قاتل ہو۔ صحیح رقم ملے تو آدمی کو پار لگا دیتے ہو۔“
کھوسہ ہنسنے لگا، ”اڑے ہٹلر! بی تم مذاق مسخری کو نہیں سمجھتا؟ یار کیسا بے ذوق ہے!“

ہٹلر اب مطمئن نظر آنے لگا تھا، بولا، ”آپ حضرات نے ہم دردی کی ہے، اس حقیر فقیر کے ساتھ حسن سلوک کیا ہے اس لیے میں نچلے عملے سے آپ کی سفارش کر دوں گا۔“
 ”کیسی سفارش؟“

بولا، ”یہی جو سہولیات مجھے میسر ہیں، آپ کو بھی مل جائیں گی، مثلاً آپ کے لیے بھی بازار سے اول درجے کا کھانا آئے گا۔ ادھر کاراشن جو رواجاً حوالاتیوں کو ملتا ہے، وہ تو گدھے، بھینس، بکریاں بھی نہیں کھا سکتیں اور جناب بڑے کام ریڈ! آپ کے لیے بندہ پرور! سگریٹ تھری کاسل وغیرہ، اور حضور چھوٹے کام ریڈ! آپ کے لیے شکار پور کی مٹھائیاں میں خصوصیت سے لکھوادوں گا کہ تقاضائے مہمان نوازی ہے۔“
 کھوسہ نے کہا، ”اتنا خرچا نہیں کرو یا ہٹلر!“

”خرچا؟ ہنہ! دوستوں کے لیے نسیاں کا دل گویا گنجے قارون کا خزانہ ہے عالی جاہ! علاقے کی سب سے بڑی گیس بٹی سائیکل شاپ ہے خاکسار کی۔ ہفتے کے سو ڈیڑھ سو الگ سے پُجرا رہا ہوں پولیس والوں کو۔ اب اتنے خرچے پر ہم تین بھائی عیش نہ کریں تو تینوں پر لعنت ہے۔“

اس بات پر ہم تینوں دل کھول کر ہنسے مگر خاموشی سے کیوں کہ پہرے والے سپاہی کو اپنی ہنسی نہیں سنا سکتے تھے۔

کھوسہ کی بے ضرورت شوریدہ سری سے میرے دل پر جو بوجھ سا تھا، ہٹلر کے تماشوں سے وہ کم تو ہوا تھا۔

آدھی رات گزار کر ہٹلر کے نیاز مند پولیس والوں کا آدمی ہمارے لیے کھانا لایا۔ اچھا کھانا تھا۔ کچھ ایسا انتظام تھا کہ آس پاس جب کوئی ان کا اپنا آدمی ہوتا تھا تو وہ ہٹلر کو عیاشیاں کر دیتے تھے، باقی وقت سختی اور ضابطے کی پابندی کا نائک چلاتے رہتے تھے۔

کھانے سے پہلے ہم راز پولیس والے نے ہٹلر اور کھوسہ کو بہت احتیاط سے ایک بوتل اور دو گلاس بھی دیے تھے۔ کھوسہ کو تھری کاسل کے سگریٹ بھی مل گئے تھے۔ اس کے تو مزے آ گئے۔ ہٹلر خود بوتل سے شغل کرتا تھا مگر تمباکو سے اس کا پرہیز تھا۔ کہتا تھا، بوتل سے ’دفور شباب‘ میں مدد ملتی ہے جب کہ تمباکو جواں مرد کو ’مردِ کمتر‘ بناتا ہے۔ کھانے کے دوران وہ یہی سب اصول سمجھاتا رہا۔

کھوسہ اب اپنے اور میرے بارے میں زیادہ پریشان نہیں تھا۔ اس وقت اس کے پاس بوتل تھی۔

وہ اور وحید الرشید نسیاں دے دے قہقہے لگاتے، مزے مزے کی باتیں کرتے رہے۔ خالی بیٹھے بیٹھے مجھے کراچی اور ٹریڈ یونین آفس اور اکبری خاتون سب یاد آرہے تھے۔ مجھے لے آئے، اکبری کو وہ شاید ادھر نہ لائے ہوں گے۔ کھوسہ اور ڈی سی کی زبانی جنگ سے میرا تو کوئی تعلق نہیں تھا مگر کیوں کہ میں کھوسہ کا دوست ہوں، مرد ہوں، انہوں نے مجھے بھی یہاں پہنچا دیا۔ اکبری کو شاید ادھر نہ لائے ہوں گے۔

احتیاطاً میں نے ہٹلر سے پوچھ لیا کہ کیا کسی عورت کو بھی کراچی سے ادھر لایا گیا ہے؟ ہٹلر بولا، ”ہاں کہتے ہیں کوئی خاتون آئی تو ہے۔“

میں سناٹے میں آ گیا۔ اکبری کا سن کے طبیعت پریشان ہو گئی۔ مجھے اس طرح دیکھ کر سرور میں آئے ہوئے کھوسہ نے بھی نوٹ کیا۔ پوچھنے لگا تو میں نے کہا، ”خبر نہیں یا اکبری کو کیوں لائے ہیں؟ یہاں کہاں رکھا ہے؟ کھانے پینے کو بھی کچھ دیا ہے یا...؟“ کھوسہ اس وقت ہر چیز کو ہلکے پھلکے لے رہا تھا۔ تسلی دینے لگا کہ بی ٹھیک ہی ہوگی، تو فکر نہ کر۔

ہٹلر نے پوچھا کہ کیا بات ہے یہ ’کام ریڈ برخوردار‘ کس لیے پریشان ہے؟ کھوسہ نے بتا دیا... ہٹلر سے کہنے لگا، ”بی وہ خاتون جس کو پولیس ادھر لائی ہے وہ اپنے کام ریڈ کا دلبر ہے۔ اسے فکر پڑ گئی ہے۔ بس یہ بات ہے۔“

ہٹلر نے کھانے سے ہاتھ اٹھالیا، تشویش سے بولا، ”اوہو! تو وہ ان برخوردار کا محبوب مجازی ہے جس کے ساتھ ضلعی حکام اپنا منہ کالا کر رہے ہیں؟“

یہ بات سن کر تو جیسے میرا دم ہی نکل گیا۔ ہٹلر میرا چہرہ دیکھ رہا تھا، معذرت کرنے لگا۔ بولا، ”میری مراد وہ نہیں تھی جو تم سمجھے ہو میاں۔ دراصل سینئر پولیس حکام نے اُس خاتون کو یہاں کسی لاک اپ میں نہیں رکھا ہے بلکہ صرافے میں ایک جوہری ہے، اُس خبیث نے کوئی جگہ ان امور کو سرانجام دینے کے لیے بنا رکھی ہے، وہاں چوکی پہرے میں رکھا ہے اسے۔ آج تو خیر نہیں، مگر کل سے ضلع کے شوقین مزاج حکام جوہری کے اس ٹھکانے پر آنا شروع ہوں گے... یعنی کل سے آبروریزی کا پروگرام ہے۔“

میں نے دیکھا کھوسہ اس کیفیت میں داخل ہو چکا تھا کہ کسی بات کی بھی اب اسے کوئی زیادہ فکر نہیں تھی۔

ہٹلر میری ہم دردی میں کچھ دیر سر جھکائے، کھانے سے ہاتھ روکے بیٹھا رہا۔ پھر میری پیٹھ تھپک کر بولا، ”تم کھانا کھاؤ کام ریڈ! کچھ سوچ لیں گے۔ مرزا وحید الرشید بیگ نسیاں اب اتنا عاجز بھی نہیں ہے کہ غلط کار حکام سے آپ کی عفت مآب...“

میں نے جلدی سے کہا، ”کھوسہ جو کچھ کہہ رہا ہے ایسا بالکل نہیں ہے۔ ویسے وہ ہمت والی عورت ہے۔ ہم لوگوں کی ساتھی ہے۔ یونین آفس میں کام کرتی ہے۔“

کھوسہ کچھ دیر کو اپنی کیفیت سے جیسے بیدار ہوا، ہٹلر سے کہنے لگا، ”ہاں بی... اکبری کو تکلیف نہیں پہنچنا چاہیے۔ مزدور تحریک کے لیے ڈوب مرنے کا بات ہوئیں گی۔“

ہٹلر نے مستعدی سے کہا، ”نہیں پہنچے گی تکلیف۔ آپ دونوں بھائی بے فکر رہو... بس! یہ میرا وعدہ ہے۔“

کھوسہ، بوتل کی عطا کی ہوئی بے فکری میں سو گیا تھا۔ ہٹلر پڑیا کھول کر پان کھانے لگا۔ مجھ سے پوچھتا تھا کہ اگر کھاؤ تو تمہارے لیے بیٹھا پان منگا دیتے ہیں۔ میں نے کہا، نہیں۔

میں پان کا پھینکا ہوا کاغذ اٹھا کر پڑھنے لگا تو ہٹلر کو یاد آیا کہ میں کہیں کچھ پڑھاتا بھی ہوں۔ اس نے خوش ہو کر جیب سے ایک پنسل اور کاغذوں کا چھوٹا سا رول نکال کر مجھے تھما دیا۔ کہنے لگا، ”یہی میری غزلیں ہیں۔ ایک پولیس والے سے لکھوائی تھیں۔ کیا کرتا، کوئی اور میسر نہ تھا۔ میاں ذرا پڑھ کے سناؤ، میں چیک تو کر لوں، ایسا نہیں اس حرام الدہر نے لکھتے ہوئے کچھ کمی بیشی کر دی ہو۔“

مجھے بڑی حیرت ہوئی... یہ نسیاں خان پوری پڑھا لکھا نہیں تھا! مجھے حیران دیکھ کر وہ ہنسا۔ بولا، ”جناب والا! نسیاں تخلص اسی لیے رکھا ہے فدوی نے کہ سائیکلوں، گیس بیٹوں کی مصروفیات میں پڑھا لکھا سب بھول چکا ہے یہ ناچیز... یاد تھیں مجھ کو بھی رنگا رنگ بزم افروزیں... جو کہ اب نقش و نگار طاق نسیاں ہو گئیں۔“

اکبری کی وجہ سے ذہن پریشان تھا مگر رات دیر تک میں ہٹلر کی منحوس غزلیں بلند آواز سے پڑھتا رہا۔ وہ کہیں کہیں ”تصحیح“ کراتا رہا۔ آخر میں خود بھی اونگھ گیا۔

دوسرے دن پولیس والے ہٹلر کو سویرے ہی لے گئے۔ وہ اسی طرح خوف کی اداکاری کرتا ہوا گیا تھا۔

ادھر یوں لگتا تھا کہ پولیس والے جیسے ہمیں بھول گئے ہیں۔ پہرے کے سپاہی اور آتے جاتے کانشیل یا افسران ہماری طرف دیکھ بھی نہیں رہے تھے۔

دھوپ چڑھے چائے پیچنے والا آیا تو پہرے والے نے چار چار پاپے لسکٹ اور گلاس بھر بھر کے چائے ہمیں دلادی۔ کھوسہ کورات کی سب باتیں یاد آ گئی تھیں۔ وہ اس وقت بہت غصے میں تھا اور گرم صم بیٹھا تھا۔ بسکٹوں پاپوں کو اس نے ہاتھ بھی نہیں لگایا۔ چائے پی کر ایک طرف خاموش بیٹھ گیا۔

جب تک کھوسہ اپنا غصہ اپنے اندر اتارتا رہا میرے لیے اسے سنبھالنا آسان رہا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد میں تسلی اور حوصلے کا کوئی فقرہ کہہ دیتا اور وہ ہوں ہاں کر دیتا۔ لاک اپ کے ماحول میں اداسی، مگر ظاہری سکون تھا۔ لیکن پولیس والوں کو دیکھ کر کھوسہ کا پارہ چڑھتا جا رہا تھا۔ اس نے کچھ کچھ بولنا شروع کر دیا تھا۔ وہ لمحہ موجود کے جبر اور پچھلی ایک صدی کی نا انصافی پر بلند آواز میں گالیاں بکنے لگا اور اردو، انگریزی اور اپنی مادری زبان میں چھوٹی چھوٹی تقریریں کرنے لگا۔

میرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ کیوں کہ بار بار وہ کہہ رہا تھا کہ اکبری کو ان درندوں سے چھڑانے کے لیے فوری طور پر کچھ کرنا ہوگا... یہ ضروری ہے۔ پھر جو بھی ہو پروا نہیں۔ جان تو ایک روز ویسے بھی جانی ہے۔

میں نے کہا، ٹھہر جاؤ یار، یہ ہٹلر کام کا آدمی ہے، اسے آ لینے دو، کچھ کرتے ہیں، اس کے رابطے استعمال کر کے یہاں سے بھاگ نکلنے کی کوئی ترکیب سوچتے ہیں۔ (آدمی خود کو کیسے کیسے بہلاوے دیتا ہے!)

دوپہر کے قریب شہر کے کسی ہوٹل سے کھانوں سے بھرے ناشتے دان آ گئے۔ تھوڑی دیر بعد ہٹلر بھی آ گیا۔ پہلے کی طرح اسے دو پولیس والے سہارا دے کر لائے تھے۔ لگتا تھا ہٹلر اب جو حوالات میں آئے گا تو ایسا گرے گا کہ پھر اٹھ نہیں سکے گا۔

اس کی اداکاری دن کے وقت بھی بہت کامیاب تھی۔ وہ آیا تو میں نے بتا دیا کہ کھوسہ بہت طیش میں ہے، کہیں کچھ الٹا سیدھا نہ کر بیٹھے۔

ہٹلر یہاں بھی بہت کام کا آدمی نکلا، اس نے کھوسہ کو سمجھایا، تسلی دی اور کھانا کھلا دیا۔ کہنے لگا، ”بندہ نواز! اچھا ہی ہوا جو خاکسار کو پولیس والے سویرے ہی لے گئے تھے، کس لیے کہ نائب صوبے دار کسی کام سے نکلنے والا تھا۔ میں نے روک لیا، کہا کہ بھئی سن، اپنا دوست چھوٹا کام ریڈ اس بی بی کے عشقِ صادق میں مبتلا ہے جسے بڑے افسرانِ خراب کرنا چاہتے ہیں۔“

میں نے شور مچایا، ”واہ ہٹلر! بلا وجہ یہ کیا کہتے پھر رہے ہو؟“ وہ چالاکی سے مسکرایا۔ کہنے لگا، ”سنو تو حضرت! عشقِ عاشقی کا ذکر کرو تو پولیس والے تک بات جلد سمجھ لیتے ہیں... خیر، تو میں نے کہا وہ بی بی جسے حکامِ بالا خراب کرنے پر تلے ہوئے ہیں، اسے ہر قیمت پر بچانا ہے، پیسے چاہے جتنے خرچ ہوں۔ کچھ ایسا کرنا ہے کہ خبیث افسرانِ بالا اپنے امورِ حیثیت میں دو چار روز اور کامیاب نہ ہو سکیں۔ نائب صوبے دار کہنے لگا، دو دن کا تحفظ ملے گا، زیادہ کی گارنٹی نہیں دیتا اور روپے پورے ایک ہزار خرچ ہوں گے۔ میں نے کہا، دیے! وہ امید دلا کے چلا گیا۔ یہ خاکسار اس کے کمرے میں انتظار کرتا رہا۔ دو گھنٹے گزار کے عالی جاہ! وہ آیا تو اس نے عجیب بات کہی۔“

کھوسہ آگے جھکا ہوا پوری توجہ سے ہٹلر کی باتیں سن رہا تھا۔ بے چین ہو کر بولا، ”کیسا عجیب بات؟“

ہٹلر کہنے لگا، ”بھئی نائب صوبہ یہ خبر لایا کہ حکامِ بالا نے بالائی اس خاتون کو شہری ٹھکانے سے ہٹا کر بیرونِ شہر کسی ڈانک بنگلے میں پہنچا دیا ہے اور کل طلوعِ آفتاب کے وقت سے شوقینِ حکام کی سواریاں بادِ بہاریاں نازیبا حرکات کے لیے ڈانک بنگلے پہنچنا شروع ہو جاویں گی۔“

کھوسہ نے کہا، ”تو ٹھیک ہے ہم یہ سامنے والا گارڈ کا گن چھین کے دو چار کو مار دوں گا۔ قومی سپر ز کا خبر بردہ بر بنیں گا۔ پھر حکامِ بالا حرام خور کا جو مرضی ہو کر لیوے... پروردگار کا قسم ہے ہم اس کوشش میں جان دے سکتاؤں... سمجھا آپ لوگ؟“

ہٹلر نے شانے پر ہاتھ رکھ کر اسے ٹھنڈا کیا۔ بولا، ”سرکار! آپ کی طرح میں بھی متفکر ہوں... متفکر ضرور ہوں مگر عاہ جاہ! دیکھیے کچھ نہ کچھ کر ہی رہا ہوں۔ فوری مسئلہ یہ ہے بندہ پرور! کہ نائب صوبے دار نے ایک ہزار کی میری آفر لوٹا دی ہے۔“

میں نے گھبرا کے پوچھا، ”کیا مطلب؟ ایک ہزار کی آفر کیوں لوٹا دی؟“

ہٹلر بولا، ”میاں کام ریڈ بلند اقبال! سمجھا کرو۔ نائب صوبے دار کی اوقات ہی کیا ہوتی ہے... اس کے سامنے فی الوقت ہاتھیوں کا لشکر کھڑا ہے۔ اگر میرے اس کے رابطے کا پول کھل جائے تو پانچ منٹ لگیں گے اور نائب صوبے صاحب کو بھی فنگر پرنٹ لے کر سامنے والی حوالات میں بیڑ دیا جائے گا۔ سویرے سے سرکاری اکونٹ میں اس سالے کی بھی چائے روٹی آنے لگے گی۔“

حالات واقعی سخت پریشان کن ہو چکے تھے۔

کھوسہ دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا۔ پھر ہٹلر سے پوچھنے لگا کہ وہ ڈاک بنگلہ جس میں اکبری کو رکھا گیا ہے، شہر کے کس رخ پر ہے؟ برسوں سے یہ نسیاں خان پوری ہی کا شہر تھا اس نے جگہ سمجھا دی۔ کھوسہ کئی بار آچکا تھا۔ جگہ اس کی دیکھی ہوئی تھی۔

مگر ہم حوالات میں بند بیٹھے تھے۔ ڈاک بنگلے کا پتا سمجھنا نہ سمجھنا برابر تھا۔ حالت تو یہ تھی کہ ہتھکڑیاں ڈلوائے بغیر ہم اپنی ضرورت سے غسل خانے بھی نہیں جاسکتے تھے۔ کانٹیل زنجیر تھامے باہر کھڑا رہتا تھا۔

کھوسہ کی طرح میں بھی سوچ میں پڑ گیا تھا۔ نسیاں خان پوری ہٹلر نے دھیرے دھیرے گنگناتے ہوئے اپنے گھٹنے پر دو انگلیوں سے طبلہ بجانا شروع کر دیا تھا۔ وہ شاید غزل بنا رہا تھا۔

اسی پریشانی میں کچھ دیر میں سویا بھی۔ دن کے وقت بھی برے برے خواب آتے رہے۔ ہر طرف ہتھکڑیاں، بیڑیاں اور بے چاری اکبری کی خواری دیکھتا رہا۔

شام کو آدمی چائے لے کے آیا تو میں نے پہرے والے سے کہہ کے اپنے اور کھوسہ کے لیے اسپرین کی ٹکیاں منگوائیں۔ گولی کھا کے، چائے پی کے بیٹھا تو ذرا ذہن کھلا۔ ہٹلر اپنے عاشقانہ معرکوں کا بیان شروع کرنے والا تھا کہ کھوسہ نے ”چپ کروڑے!“ کہہ کے اس کا حوصلہ پست کر دیا۔ وہ پھر گھٹنے پر انگلیاں بجانے لگا۔ شاید خفا ہو گیا تھا۔ خود سے کوئی بات ہی شروع نہیں کر رہا تھا۔

کھوسہ نے اپنے طور پر حوالات سے نکل بھاگنے کے امکان پر اس سے مشورہ طلب کیا تو ہنسا۔ کہنے لگا، ”عالی جاہ! آپ تجربے کا آدمی ہو مگر بات ایک دم لڑکوں بالوں جیسی کر رہے ہو۔ اے حضور! یہ مضافات کا تھا نہ نہیں ہے، پولیس لائنز کی لاک اپ ہے۔ یہاں

نقشب بھی لگاؤ گے تو بندہ نواز! اگلی کسی حوالات یا اس سے اگلی میں جا نکلو گے۔ فرار ناممکن ہے کام ریڈ صاحب!“

کھوسہ لاک اپ میں ٹہل ٹہل کے بڑبڑاتا رہا کہ بس اکبری کو لے کے ایک بار ہم لوگ کھلی جگہ میں نکل جائیں، پھر نمٹ لیں گے جو بھی سامنے آئے گا۔ ہٹلر کھوسہ کے ساتھ ٹہلنے لگا۔ ایک بار رک کر بولا، ”اچھا کچھ ہم کرتے ہیں، کچھ آپ کیجیے۔“

”ہم کیا کرے؟ بولو؟“

”آپ عالی جاہ! دعا کیجیے۔ ایک منصوبہ ذہن رسا میں بن تو رہا ہے۔ کاش اس وقت رات سے پہلے نائب صوبایا حوالدار ایک بار مجھے بلا لے۔ آپ بس دعا کیجیے کہ مجھے بلالیا جاوے... رابطہ ہو جائے میرا۔ پھر میں کچھ کرتا ہوں۔“

میں نے اپنی پریشانی میں ایک احمقانہ تجویز یہ دی کہ ہٹلر خود سے نائب صوبے دار کے پاس چلا جائے۔

وہ سن کے ہنسا، کہنے لگا، ”خود سے کوئی جاتا ہے عقوبت کی طرف کو؟“

خدا کرے اس کا پولیس والا کوئی آجائے... میں دعا کرنے لگا اور ہٹلر نے ٹہل ٹہل کر، بہ قول خود، منصوبے کی سلوٹیں نکالنی شروع کر دیں۔ مگر اس نے بتایا نہیں کہ منصوبہ کیا ہے۔

آخر مغرب بعد ایک میلا کچھلا حوالدار لاک اپ کے سامنے سے گزرا تو ہٹلر نے ”شش“ کر کے اسے متوجہ کیا، پھر آنکھیں گھما پھرا کر، انگلیاں چلا چلا کر اسے کوئی پیغام دیا۔ حوالدار چلا گیا، دس منٹ بعد ہی کانٹیل ہتھکڑیاں لے کر آئے اور لرزتے کانپتے ہٹلر کو تفتیش خانے لے گئے۔ میں نے اطمینان کا سانس لیا۔ دل کہہ رہا تھا کچھ نہ کچھ ہوگا ضرور جو ہمارے لیے بہتر ہوگا۔

انتظار جان لیوا ہوتا ہے۔ ایک پہر گزر گیا پھر کہیں جا کے پولیس والوں کے بوٹوں کی چاپ سنائی دی۔ تین کانٹیل ہٹلر کے ساتھ آئے تھے۔ دو اسے سہارا دیے ہوئے تھے تیسرے نے پہرے والے کو بلا کر لاک اپ کھلوا دیا۔

ہٹلر حسب معمول آہ اوہ کرتا ہوا بستر تک آیا اور جس طرح شیشے کی کرچیوں سے بنی بچجات پر کوئی لیٹتا ہوگا وہ اپنے بستر پر دراز ہو گیا۔ پولیس والے چلے گئے تو ہٹلر نے زور سے کراہ کر کروٹ لی۔ اشارے سے ہمیں اپنے پاس بلایا۔ پھر ایک بار کروٹ بدلتے ہوئے ہٹلر

نے اپنا نیفہ ٹول کر کوئی چھوٹی چمک دار سیاہ چیز نکالی اور کھوسہ کو پکڑا دی۔ سرگوشی میں اس نے کہا، ”عالی جاہ! سنبھال کے رکھیے گا۔ پورا لوڈ ہے۔“

ہماری حیرت کا کوئی ٹھکانا ہی نہ تھا۔ کھوسہ نے ہٹلر کی اور پھر میری صورت دیکھی اور اس سیاہ چیز کو، جو جیسی قسم کا پستول تھا، اپنی بیلٹ میں لگا کر اوپر سے بش شرٹ برابر کر لی۔ ہٹلر نے مکاری کی ایک زور دار آہ کی جس پر کھوسہ نے آہستہ سے کہا، ”واڑے ہٹلر! تم افلاطون ہے بئی۔“

جواب میں ہٹلر مسکرایا، بولا، ”تفصیلات ابھی عرض کروں گا عالی جاہ! فی الحال اپنے کمبلوں پر تشریف لے جائیے۔“

پانچ دس منٹ تک وہ کراہنے، آہ بھرنے، غش کھا جانے کی اداکاری کرتا رہا۔ جب اطمینان ہو گیا کہ پہرے والا یا کوئی اب ادھر نہیں آئے گا تو اٹھ بیٹھا۔ کہنے لگا، ”دو ہزار روپے نائب صوبے نے صرف پستول حوالے کرنے کے لیے ہیں۔ کارروائی کے بعد پستول واپس کرنا ہوگا اور فرار کرانے کی اجرت آٹھ ہزار روپے الگ دینا ہوں گے۔ یعنی اس طرح سمجھیے کہ مہینے بھر کے اندر دس ہزار روپے اور یہ پستول میری گیس بتی سائیکل شاپ پر پہنچوانے ہوں گے اور حضور والا! اگر پیسے کی اگائی میں، بہ فرض محال، کچھ اور وقت چاہیے تو سرکار میری شاپ پر کھلوا بھیجنا... میں نائب صوبے کو سمجھا لوں گا۔ تاہم،“ ہٹلر نے ایک بار پھر کہا، ”تاہم، ہر صورت میں ساٹھ روز کے اندر اندر پیسے اور پستول پہنچ جانے چاہئیں۔“

کھوسہ نے خوشی سے جیسے چھلکتے ہوئے کہا، ”ساٹھ دن کو چھوڑو یار ہٹلر! ہم دس روز میں پیسا اور ہتھیار بھیج دوں گا۔“

آگے اس نے بتایا کہ فرار کی صورت یہ ہے کہ فجر سے ایک دم پہلے نائب صوبے کا خاص آدمی لاک اپ کے پہرے پر ہوگا۔ وہ کھٹکا کر کے ہم دونوں کو اٹھا دے گا۔ ظاہر یہ کیا جائے گا کہ جیسے ہم غسل خانے جانے کے لیے اٹھے ہیں۔ یہ پہرے والا بعد میں لاک اپ کے سامنے ایسے پڑا ہوا ملے گا جیسے حملہ کر کے اس پر قابو پالیا گیا تھا۔ یہاں سے نکل کے ہم خاموشی سے لاک اپ کے پچھواڑے پہنچیں گے جہاں نائب صوبے دار کی اسکوٹر پٹرول بھری تیار کھڑی ہوگی۔

ہٹلر نے ہمیں اسکوٹر کی فالتو چابی دی۔ کہنے لگا، ”اسکوٹر ٹاپ کنڈیشن میں ہے۔“

بس حضور! آپ دونوں لاک اپ کے پچھواڑے سے ایم ٹی ورکشاپ کی طرف ہو لینا۔ ویسے تو بہ فضل تعالیٰ خطرہ نہیں ہے، تاہم، کوئی پیچھا کرے تو دو ہوائی فیر کافی ہوں گے۔ ادھر کے گیٹ پر اپنا آدمی پہرہ دیتا ہوگا۔ آپ دونوں یہ ایک ایک چادر اوپر ڈال لینا۔ غیر دیکھے گا تو سمجھے گا دودھ والے آئے تھے، کواٹروں میں دودھ دے کے جا رہے ہیں... اور سرکار! آگے کا یہ ہے کہ آگے تو آپ کا اور اکبری خاتون کا نصیب ہی کام کرے گا۔ ڈانک بنگلے پر افسرانِ بالا کے دو آدمی ہوں گے... ان کے خاص الخاص بندے، انھیں پستول و ستول چلا کے زیر کرنا ہوگا۔ تو یہ ہے جناب والا! بس، خاتون کو اپنے پیچھے اسکوٹر پر بٹھا کے آپ تینوں نکل جانا... ہرچہ بادا بادا!

خوشی سے میری بانچھیں کھلی جاتی ہوں گی، کچھ اور نہ سوچھا تو میں نے ہٹلر سے پوچھا، ”اور اسکوٹر کا کیا ہوگا؟“

ہٹلر راز داری سے ہنسا، کہنے لگا، ”حضرت! ضلع کی حدودیں پار کرتے کرتے پٹرول پورا پڑ جائے گا۔ آپ کے پاس عالی جاہ! آتشیں اسلحہ ہے، وہ دکھا کے کوئی گاڑی ٹرک قبضے میں کر لینا، اسکوٹر وہیں چھوڑ دینا۔ پولیس والے کا مال ہے، سدھائے ہوئے قبوتر کی طرح آپنی آپ نائب صوبے کے پاس پہنچ جائے گا۔ ہرچہ بادا بادا!“

کھوسہ بھی بہت لگن ہو گیا تھا۔ خوب ہنس رہا تھا۔ کہنے لگا، ”او بادا بادا کے بچے! بھلا تیرا کیا بنے گا؟ ہم لوگ کے ساتھ تم نہیں چلیں گے؟“

ہٹلر نے مسکرا کر کہا، ”فدوی کو مفرور ہونے کی کیا ضرورت ہے سرکار! ناچیز کو اس دفعے بھی کورٹ سے باعزت بری کیا جاوے گا۔“

میں نے حیران ہو کے پوچھا، ”یہ آپ نے اس دفعے بھی کیا کہا؟ کیا پہلے بھی زور زبردستی کا کوئی کیس چلا تھا؟“

نسیاں خان پوری ہٹلر خوب صورتی سے مسکرایا، ”عالی جاہ! دو برس میں بالجبر کا یہ تیسرا مقدمہ قائم کرایا ہے ناچیز کے دشمنوں نے، ہے ہے ہے۔“

”کیا مطلب؟ اسی محبوب کے ساتھ تین مرتبہ کیس کیسے بنایا؟“

ہٹلر نے اپنی چمک دار آنکھیں پھرا کر جواب دیا، ”نہیں بندہ پرور! وہ جو کہتے ہیں نا کہ پرندے مختلف تھے ہر دفعے اور ہر دفعے تھی قوت پرواز بھی وکھری... تو وہ معاملہ ہے۔ ہے

ہے ہے۔“

تھوڑا کچھ کھاپی کے ہم سونے لیٹ گئے۔

مجھ ایسا امن پسند آدمی بھی خیالوں میں فرار کی تیاریاں کرنے لگا اور پستولیں چلانے لگا۔ کھوسہ کا قبائلی خون تو پوری طرح جوش میں تھا۔ رات ڈیوٹی والے پہرے دار نے باتیں کرنے کو منع کیا۔ وہ الجھ گیا۔ ہٹلر نے اور میں نے مصلحتیں سمجھا کہ اسے بہ مشکل قابو کیا۔ پولیس والے رات میں ہٹلر کو پھر ایک بار لے گئے۔ وہ جاتے ہوئے کہہ گیا کہ حضور سونا مت، میں ابھی آتا ہوں۔ شاید کوئی ضروری نکتہ رہ گیا ہے جبھی اس وقت لے جا رہے ہیں۔

مگر دو گھنٹے سے زیادہ ہو گئے وہ لوگ ہٹلر کو نہیں لائے۔ ہم انتظار میں اونگھ چلے تھے کہ پولیس لائنز ہی میں کہیں سے دو بار گولی چلنے کی آواز آئی اور سیٹیاں بجنے لگیں۔ کوئی گڑ بڑ ہو رہی تھی۔

میں ہمیشہ کا محتاط آدمی، میں نے کہا، ”کھوسہ! پولیس لائنز میں کہیں گڑ بڑ ہوئی ہے۔ ایسا کر، پستول مجھے دے دے۔ اس وقت پاس رکھنا ٹھیک نہیں ہے۔ میں ادھر کہیں ڈبلیوسی میں چھپا کے آتا ہوں۔ نائب کا آدمی جب سویرے یہاں سے ہمیں نکالے گا تو اٹھاتے چلیں گے۔“

کھوسہ راضی نہیں ہوتا تھا۔ کہنے لگا کہ ہاتھ آیا ہتھیار میں تو نہیں چھوڑتا۔ میں نے کہا، ”پاگل مت بن۔ کوئی گڑ بڑ ہوئی ہے، وہ لوگ ادھر بھی آ کے حوالا تئوں کی تلاشی لیں گے۔ یہی طریقہ ہے۔ بیٹھے بٹھائے ہم لوگ پھنس جائیں گے۔ کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ تو پستول دے دے بھائی میرے! یہ ہاتھ سے نہیں جائے گا... سمجھو پاس ہی رہے گا۔“ بہت مشکل سے کھوسہ نے پستول میرے حوالے کیا۔ میں ہاتھ جوڑ کے سنتری کی خوشامد کر کے، ہتھکڑی ڈلوا ڈبلیوسی گیا اور رومال لپیٹا ہوا پستول اور اسکوٹر کی چابی چھت کی ٹانگوں میں چھپا آیا۔

سمجھو بال بال بچے۔ کیوں کہ جیسے ہی لاک اپ میں واپس آ کے میں کمبل پر لیٹا ہوں گا کہ باہر جیپ گاڑیاں آ کر رکیں اور بہت سے پولیس والے دھڑ دھڑاتے ہوئے لاک اپ کھلوا کے اندر آ گھسے۔ انھوں نے ہماری اس طرح تلاشی لی کہ کیا کبھی کسی کی تلاشی لی گئی

ہوگی۔ ساتھ آنے والا نائب صوبے دار بہت پر جوش اور خاصا پریشان تھا۔ میں نے سوچا مخالف گروپ کا ہوگا۔ شاید کسی نے ہماری مجبوری کر دی ہے۔

فرار کا منصوبہ ناکام ہو چکا تھا۔ ہٹلر بھی لوٹ کر نہیں آیا تھا جو کچھ معلوم ہوتا۔ صبح ہماری طرف افسروں کی بڑی آون جاون، گہما گہمی رہی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ قصہ کیا ہے اور رات کیا گڑ بڑ ہوئی تھی۔

کہیں دوپہر کے بعد چائے والے سے پوچھنے کا موقع ملا۔ اس نے جو بات بتائی تو سرچکرا گیا۔ بالکل بھی عقل میں آنے والی بات نہیں تھی۔ کہنے لگا، ”رات میں جو گولیاں چلی تھیں تو عبدالوحید سائیکل گیس بتی والے کو، وہی جو ادھر تمہارے ساتھ تھا، گارڈ نے گولی ماری تھی۔“ وحید ہٹلر اگلے کسی لاک اپ کے ڈبلیوسی کی دیوار پھلانگ رہا تھا۔ دونوں گولیاں پیٹھ میں لگیں۔ اسی وقت مر گیا تھا... بے چارہ!

حد ہو گئی! ہٹلر ادھر ہمارے فرار کے لیے لین دین کر رہا تھا، ادھر خود دیواریں پھلانگتا ہوا مارا گیا۔ کہہ رہا تھا باعزت بری ہو جاؤں گا۔ یہ قصہ کیا ہے؟ بات سمجھ میں نہ آئی۔ عجیب طرح کی الجھن اور اداسی رہی۔

مگر شام تک ہم پوری طرح مصروف ہو گئے اور یہ سب جیسے بھول گئے۔ کراچی سے وکیلوں کے ساتھ اکبری اور تین دوست آ گئے اور ان کے ساتھ اخبار والے بھی۔ اکبری کو دیکھ کے ہم نے خدا کا شکر ادا کیا۔ ہٹلر مرحوم کی اطلاع درست نہیں تھی یا وہ کسی اور عورت کا کہہ رہا ہوگا... اکبری خاتون کو کراچی ہی سے رہا کر دیا گیا تھا۔

دوسرے دن سویرے مقامی عدالت سے ہم دونوں کی بھی ضمانت ہو گئی۔

پستول اور اسکوٹر اور فرار وغیرہ جیسے اب افسانوی باتیں لگ رہی تھیں۔

وکیل اور اکبری کچھ کاغذوں کی نقلیں نکلوانے پیش کار کی طرف گئے ہوئے تھے۔ ہم

نے سوچا چائے خانے میں ان کا انتظار کریں گے، ایک ایک چائے بھی پی لیں گے۔

میں پیالی اٹھا کے ہونٹوں سے لگانے ہی والا تھا کہ سامنے کی میز پر بیٹھے ہوئے

آدمی نے گھوم کر ادھر دیکھا۔ پیالی میرے ہاتھ سے گرتے گرتے پچی۔

مڑ کر دیکھنے والا مرزا وحید الرشید ہٹلر مرحوم تھا۔ وہی مکھی مونچھ، وہی چمک دار فٹین

آنکھیں، وہی سوکھا سنا قد بت۔

مگر یہ کیسے ممکن ہے؟ ہٹلر تو بیت الخلا کی دیوار پھلانگتا ہوا پولیس کی گولی سے مارا گیا۔ کھوسہ بھی ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ وہ بھی پریشان ہو گیا۔

میز پر کہنیاں ٹکا کر بیٹھے ہوئے ہٹلر آدمی نے بیرے کو آواز دی... تب پتا چلا کہ یہ ہٹلر نہیں ہے، اس جیسا کوئی دوسرا آدمی ہے کیوں کہ اس شخص کی آواز بہت کڑک دار تھی۔ بے چارے ہٹلر کی طرح مسمی نہیں تھی۔

نہ معلوم کیوں اپنی کرسی چھوڑ کر میں اس کے پاس جا کھڑا ہوا، ”معاف کرنا بھائی! آپ کی صورت ہمارے ایک دوست سے بہت ملتی ہے۔“

ہٹلر کے ہم شکل نے آنکھیں پٹپٹائیں۔ اداسی سے اپنی کڑک دار آواز میں بولا، ”ہاں صاحب ہر جگہ یہی ہوتا ہے۔ سب مجھے بھائی صاحب سمجھتے ہیں۔ میں وحید صاحب کا چھوٹا بھائی ہوں، عبدالحمید۔“

کھوسہ نے دھیرے سے کہا، ”افسوس ہوا وحید صاحب کا سن کے۔“

ہم شکل نے اثبات میں سر ہلایا، ”ہاں جی، مقدر کی بات ہے۔“

”کیا ہوا تھا؟“ کھوسہ بولا، ”کیا ضرورت تھا بئی فرار ہونے کا؟ اتنا بڑا کیس تو نہیں تھا۔ ریپ کا الزام اگر وہ لوگ ثابت بھی کر دیتا...“

”ریپ؟“ ہم شکل بھائی نے اپنی کڑک دار آواز میں پوچھا، ”صاحب! چوری کی سائیکلیں خریدنے کا الزام تھا، وہ بھی جھوٹا۔ آپ زور زبردستی کی بات کرتے ہو؟ وحید بھائی بہت شرمیلے آدمی تھے۔ غیر عورت سامنے آ جاتی تھی تو ہکلا نے لگتے تھے، یہ تو حالت تھی ان کی۔“

”اوہ!“ کھوسہ میری طرف دیکھنے لگا۔

”پھر بھی بھائی!“ میں نے کہا، ”ایسا کون سا کیس تھا۔ کوئی قتل کا مقدمہ تو تھا نہیں... کیوں فرار ہو رہے تھے۔“

”آپ کو نہیں پتا صاحب،“ بھائی بولا، ”آپ کو کیا پتا... انھیں ایک ساجش میں آلہ کار بنایا گیا تھا۔“

”کیسی سازش؟“ میں نے کھوسہ کی طرف دیکھا۔

ہم شکل نے کھنکھار کر گلا صاف کیا، ”ایک ڈی سی حرامی کا دشمن کوئی مزدور لیڈر ادھر بھائی صاحب کے ساتھ حوالات میں بند تھا۔ ڈی سی کے گر گے نائب صوبے دار نے وحید

بھائی کو دھوکا فریب دے کے مزدور لیڈر کو لاک اپ سے فرار ہونے کی لائن سمجھوائی۔ لوگ بولتے ہیں مزدور لیڈر کو ایک پستول بھی بھائی کے ہاتھ سے پہنچوا دیا، اس ماں کے پوت نے... ساجش یہ تھی کہ لیڈر حوالات سے فرار ہوئے گا۔ نائب صوبا، کتے کا جنا، اُدھر پہلے سے چھپا بیٹھا ہوگا۔ لیڈر کے پستول میں ہوں گے بے کار کے کارتوس۔ بس نائب صوبا بھون ڈالے گا اسے۔ آگے وہ لوگ کہہ دیں گے کہ جی پولیس مقابلے میں مارا گیا۔“

کھوسہ نے ہاتھ بڑھا کر سختی سے میرا بازو تھام لیا۔

”بس،“ ہٹلر کا بھائی بولا، ”تو سمجھے جناب؟ بھائی صاحب کو اللہ بخشے، رات میں عین موقعے پہ پتا چلا کہ کیا ساجش، حرام پائی ہو رہی ہے۔ وہ اسی ٹیم، کا کوس کا بہانہ کر کے پیٹ پکڑے پکڑے گئے، دیوار پہ چڑھ کے لیڈر کو ہتھیار کرنے۔ وہ اُدھر کودنے ہی والے تھے کہ گارڈ لوگوں نے گولی چلا دی۔“

کھوسہ کا چہرہ سفید پڑ گیا تھا، لگتا تھا کرسی سے گر جائے گا۔ مگر پھر وہ سنبھلا، لرزتا ہوا کرسی سے اٹھا، اس نے اپنے بازو پھیلا دیے۔ اور ہٹلر کے بھائی عبدالحمید کو سینے سے لگا لیا۔

”یار! خدا پروردگار کا قسم ہے! دل ہل گیا ہے میرا۔ شیر کا بچہ تھا تیرا بھائی!“



ریڈیو والے نواب صاحب

اس وقت تک بجلی سب گھروں میں نہیں آئی تھی، اور ریڈیو تو محلے میں کسی ایک گھر میں ہوتا ہوگا۔ بہت سے محلے تو ایسے تھے کہ وہاں ریڈیو والا گھر بھی نہ تھا۔ ہمارے محلے میں نواب صاحب کے ہاں بجلی بھی تھی اور ریڈیو بھی۔ دوسری عالمی جنگ چھڑی ہوئی تھی اور ہمارے دادا کی تسلی صرف اخبار پڑھ کر نہیں ہوتی تھی۔ پھر نواب صاحب کی ان کی دوستی بھی بہت تھی، اس لیے جب نواب صاحب نے بار بار مدعو کیا تو دادا بھی ریڈیو سننے جانے لگے۔ ہماری حیثیت دادا کے اے ڈی سی کی تھی، چنانچہ نواب صاحب کی ریڈیو والی محفل میں ہم بلا ناغہ شریک ہوتے تھے۔

نواب صاحب کی ڈیوڑھی میں جہاں شام کو فرش دھلنے کے بعد صندوق کا صندوق ریڈیو اٹھا کر لایا جاتا اور فرش میں تقریباً نصب کیا جاتا تھا، مہمانوں کی بھاری بھر کم کرسیوں کے ساتھ ہمارے لیے بھی بنا ہتھوں کی ایک چھوٹی کرسی بچھنے لگی۔ ہماری کرسی دادا والی کرسی اور نواب صاحب کی آرام کرسی کے درمیان ڈالی جاتی تھی، وہ اس لیے کہ ہم دادا کے قرب کی وجہ سے ڈسپلن میں بھی رہیں اور ریڈیو کی نیلی آنکھ کو آوازوں کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ جھپکتے ہوئے بھی دیکھتے جائیں، کیوں کہ ریڈیو کی گھن گرج اور اس کی بھاری بھر کم موجودگی میں ایک یہی چیز ہماری دلچسپی کی تھی۔ نواب صاحب کی آرام کرسی کے قریب اسے بچھائے جانے کا

ایک فائدہ، یا نقصان، یہ ہوا کہ ہمیں نواب صاحب کو قریب سے دیکھنے اور محلے کے بچوں کے لیے ان کی جاسوسی کرنے کا بہت اچھا موقع مل گیا۔ ان کے لباس، کنجوسی اور حد سے بڑھی ہوئی صفائی پسندی کے سوا، بہ ظاہر، کوئی ایسی بات نواب صاحب میں نہیں تھی جو محلے کے بچے اور افواہ پسند لوگ ان میں اتنی دلچسپی لیتے۔ ہم نے ایک خاص بات ضرور نوٹ کی تھی کہ نواب صاحب مسکراتے بہت کم تھے اور کبھی ضرورت پڑے تو یہ کام وہ بڑی خست سے کرتے تھے، جیسے مسکرانے میں بھی کچھ خرچ ہوتا ہو۔ اسی طرح کپڑوں کا معاملہ بھی تھا۔ وہ اپنے گھر میں، یا گھر کے سامنے سڑک پر ہوتے تو چو خانے والی تہ بند اور بے داغ سفید نیم آستین پہنے رہتے۔ یہ نیم آستین واسکٹ سے بس اتنی مختلف تھی کہ واسکٹ میں کہنیوں تک آستینیں نہیں بنائی جاتیں۔ نواب صاحب یہ لباس اور کھڑاویں اپنے گھر میں اور گھر کے عین سامنے تک پہنے رہتے تھے؛ اگر انھیں دس قدم سڑک پار کر کے ہمارے گھر بھی آنا ہوتا تو وہ پورے لباس میں آتے تھے، یعنی شیروانی اور شیروانی ہی کے کپڑے کی ٹوپی، ڈھیلا پے جامہ اور سیاہ یا بادامی پیٹنٹ چمڑے کے پمپ جن پر اسی رنگ کی ریشتی تتلی ٹکی ہوئی۔

نواب صاحب مراق کی حد تک صفائی پسند تھے۔ گھر کا تو ذکر ہی کیا، انھیں سامنے سڑک پر بھی بے ترتیبی برداشت نہیں ہوتی تھی۔ شاید یہی ان کی نامقبولیت کی اصل وجہ تھی۔ ہمارے علاقے کے لیے یہ لباس اور اتنی صفائی پسندی کچھ انوکھی سی بات تھی۔ پھر نواب صاحب، جو محلے کے سب سے آسودہ حال آدمی تھے، اس وجہ سے بھی مقبول نہ ہو سکے ہوں گے کہ کنجوس تھے۔ ہم بچوں کو تو ان کی کنجوسی سے کوئی زیادہ سروکار نہیں تھا، ہاں محلے کی ذیلی گلیوں میں کچھ فاصلے پر جو لوگ رہتے تھے انھیں اس بات کا بہت قلق تھا کہ نواب صاحب کے گھر کوئی تقریب کیوں نہیں ہوتی۔ ان کے گھر کبھی دیگیں نہیں کھڑکتی تھیں... کوئی اولاد ہی نہیں تھی جو یہ سب پھیلاوا کیا جاتا۔ قریب و دور کے عزیز شاید اس بات پر ناراض بھی رہتے تھے کہ اس قدر مال و متاع کے باوجود نواب صاحب یا ان کی بیگم کوئی بچہ کیوں نہیں گود لے لیتے۔

ہمیں نواب صاحب سے بس اتنی شکایت تھی کہ ایک مدت سے ان کی ریڈیو محفل میں شرکت کر رہے تھے، پھر ہم بچے بھی تھے، کبھی جو ہمارے لیے اندر سے کوئی اسکٹ، ٹانی یا پچھل انھوں نے منگوایا ہو۔ نوکر ایک جہازی قسم کا پیچوان ضرور اٹھالتا تھا، یا بلور کی طشتری میں

پندرہ بیس لالچیاں رکھ جاتا تھا۔ پیچوان اور لالچیاں، ہمارے لیے دونوں ہی بے کار تھیں۔
پیچوان تو دادا تک کے لیے بے کار تھا۔

محلے کے لڑکوں، اور گاہے گاہے ذیلی گلیوں میں رہنے والوں نے اپنی ناپسندیدگی اور ملال کے اظہار کا ایک طریقہ یہ نکالا تھا کہ نواب صاحب کی دیوار پر یا ان کے بڑے پھانک پر کونلے، گیر ویا کالک سے لکیریں کھینچ دیتے، یا آدمی، درخت یا چڑیا کی شکلیں بنا دیتے تھے، جو اس زمانے میں بہت آسانی سے چند ہی لکیروں میں بن جاتی تھیں۔ دیواروں پر کافر وغیرہ لکھنے کا رواج نہیں تھا، ورنہ وہ بھی ضرور لکھا جاتا۔

یہ بدرنگ لکیریں اور شبیہیں جیسے نواب صاحب کے دل پر خراشیں ڈال دیتی تھیں۔ وہ اپنی نیم آستین، تہ بند اور کھڑاویں پہنے، کوچی، تسلا یا رنگ کا ڈبا اٹھائے گھر سے نکلتے، اور لاحول پڑھ پڑھ کر انھیں مٹانے یا ان پر پلستر کرنے کا جتن کرتے۔ اور لکیریں اور شبیہیں بنانے والے دور ذیلی راستوں اور گلیوں کے موڑ پر کھڑے نواب صاحب کو اور ان کے نوکر کو ہلکان ہو ہو کر لکیریں مٹاتے، سفیدہ اور رنگ پھیرتے دیکھتے اور خوش ہوتے۔

بہت سے لوگ نواب صاحب کے خلاف افواہیں اڑا کر بھی دل کا غبار نکالا کرتے تھے۔ ایک مقبول افواہ، جو ہمارے گھر میں بھی گشت کر چکی تھی، یہ تھی کہ ان کی زمینوں، باغوں سے جو اعلیٰ قسم کے آم اور دوسرے پھل آتے ہیں، نواب صاحب وہ اپنے گھر والوں تک کو نہیں کھانے دیتے۔ شیروانی، ٹوپی اور پمپ شوز پہن کر خود جاتے ہیں اور ریل کی بلٹی چھڑا کر براہ راست ساری پیٹیاں پھل بازار میں نیلام کر آتے ہیں۔

اس افواہ کو اس لیے تقویت پہنچتی تھی کہ نواب صاحب نے کبھی جیتے جی ہمارے گھر بھی چار آم نہیں بھیجے۔ ہاں ان کے انتقال کے بعد، لوگ بتاتے ہیں کہ جب تک بیگم زندہ رہیں، موسم کے پھل پیٹیوں کے حساب سے ہمارے ہاں بھیجتی رہیں۔

دادا کے سوا سب کو امید تھی کہ ایسے نامقبول اور بے رابطہ آدمی کی زندگی تو خیر تھی ہی، موت بھی بڑی پھسپھسی ہوگی، مجال ہے جو گھر والوں کے سوا کوئی آنکھ نم ہو جائے۔ مگر نواب صاحب نے تو مر کے بھی کو حیران اور اکثر کو شرمندہ کر دیا۔

بتاتے ہیں کہ فجر سے پہلے ان کا انتقال ہوا اور کہیں عصر کے بعد جا کے دفن کرنے کی نوبت آئی۔ خدا معلوم کہاں کہاں سے، کیسی کیسی سواریوں پر اور پیدل، کس کس شکل و

صورت اور حلیے کے لوگ آنا شروع ہوئے ہیں کہ سڑک کا تو ذکر ہی کیا، تمام ذیلی راستے اور گلیاں میلے کچیلے کپڑے والوں، ڈھول بھرے بالوں اور پسینے میں شرابور چہرے والوں سے، اور برہنہ پا لوگوں سے بھر گئیں۔ ان میں کئی مذہبوں مسلکوں کے لوگ تھے اور سب اپنے اپنے طریق پر نواب صاحب کی نجات کی دعا کرنے آئے تھے۔ یہ سبھی پہلی بار اُجالے میں اس بڑی سڑک پر آئے تھے اور دن کی تیز روشنی میں آنکھیں پٹ پٹا رہے تھے۔ یہ سب وہ لوگ تھے جو مکان کے پچھلے دروازے پر رات کے اندھیرے میں آتے تھے اور مہینے میں جب بھی ضرورت پڑتی تھی اپنی پنشن لے جاتے تھے۔

نواب صاحب کی اس چوری چھپے کی کارروائی میں صرف ان کی بیگم اور نوکران کے ہم راز تھے۔

آج ان کو گزرے کوئی پینتالیس، پچاس برس ہو گئے ہیں۔ جب بھی بھولے بسرے زمانے کے اس بھلے مانس کو یاد کرتا ہوں، ذہن میں تصویر بنتی ہے تو یہی کہ مراق کی حد تک صفائی پسند نواب صاحب گھسی ہوئی بے داغ نیم آستین، تہ بند اور کھڑاویں پہنے بہت سے میلے کچیلے، پٹے ہوئے اور محروم لوگوں میں گھرے بیٹھے ہیں اور کنجوسی کے ساتھ مسکراتے ہوئے مٹھیاں بھر بھر کے سکتے اور نوٹ اچھال رہے ہیں۔



دیوان جی

دیوان جی کا پورا نام لوگوں کو یاد نہیں رہتا تھا... شرافت، نجابت یا سخاوت علی خاں جیسا کوئی شان دار نام تھا۔ محلے کے چند ہی لوگوں کو یہ نام یاد رہتا ہوگا، مگر وہ گنتی کے لوگ بھی انھیں دیوان جی کہہ کر پکارتے تھے۔

پولیس کے محکمے سے ریٹائر ہوئے دیوان جی کو اتنا طویل عرصہ گزر چکا تھا کہ لگتا تھا وہ ہمیشہ سے ریٹائرڈ حوالدار ہیں، یعنی اس عہدے کا نام ہی ریٹائرڈ حوالداری ہے جس پر دیوان جی بیس تیس برس فائز رہے اور اب اتنے ہی عرصے سے پنشن وصول کر رہے ہیں۔

بہت قریب کے پڑوسیوں کو، یعنی جن سے ان کی بول چال بند نہیں ہوئی تھی، وہ اپنی وردی پہنی ہوئی ایک تصویر بھی دکھایا کرتے تھے۔ حقیقی زندگی کی طرح وردی والی تصویر میں بھی دیوان جی کی ناک پر وہی غصہ لہریں لیتا نظر آتا تھا جو وردی اترنے کے بعد برسوں سے لوگ دیکھ رہے تھے، اور امید کرتے تھے کہ ساری زندگی دیکھتے رہیں گے۔ جھنجھلاہٹ اور چڑھی ہوئی تیوریوں کے بغیر انھیں سوچا بھی نہیں جاسکتا تھا۔

دیوان جی چند ہی لوگوں کا لحاظ کرتے تھے۔ لحاظ کرنے کا مطلب یہ تھا کہ تلخی، چڑچڑاہٹ اور دشنام کے بغیر گنتی ہی کے لوگوں سے بات کرتے تھے۔ میں ان خوش نصیبوں میں سے تھا جن سے وہ درشت لہجے میں بات نہیں کرتے تھے، بلکہ کبھی کبھی تو کوئی فقرہ مسکرا کر

بھی کہہ دیا کرتے تھے، ہرچند کہ یہ مسکراہٹ والا فقرہ اکثر کسی دوسرے کی شان میں نا ملائم ریمارک کی صورت میں ادا کیا جاتا تھا۔

دیوان جی بالکل تنہا آدمی تھے، بے اولاد تھے اور اہلیہ اُن کی انتقال کر چکی تھیں۔ رشتے داروں کو، بہ قول خود، وہ منہ نہیں لگاتے تھے۔ گویا نوکری اور بیوی سے فراغت نصیب ہونے کے بعد اب ان کی واحد مصروفیت کریانے کی وہ چھوٹی سی دکان تھی جو عام لوگوں میں دیوان جی کی کیبن کے نام سے مشہور تھی۔ ہماری کالونی کے آدھے میل کے دائرے میں کوئی اور دکان ہوتی تو دیوان جی کی کیبن کبھی کی بند ہو چکی ہوتی۔ کیوں کہ دور دور تک کوئی اور دکان نہیں تھی اس لیے لوگ بہ درجہ مجبوری دیوان جی ہی سے سودا خریدتے تھے۔

دیوان جی کی کیبن کے چلنے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ ہر چیز صاف ستھری، خالص بیچتے تھے۔ چیزوں کے مناسب دام مقرر کرنے کے بعد اگر کوئی کم کرنے کو کہتا تھا تو دیوان جی ذاتی طور پر مشتعل ہو جاتے تھے۔ یہ ذاتی اشتعال اس عمومی غصے سے الگ اور شدید تر ہوتا تھا جس کا سامنا تو ہر ایک کرتا ہی رہتا تھا۔

میرے گھر کی ایک دیوار دیوان شرافت، نجابت، سخاوت علی خاں کی کیبن سے بالکل ملی ہوئی تھی، اور دن اور رات کے ان حصوں میں کہ جب کیبن کھلی ہوتی، میں اور میرے گھر والے اُن کے غصہ ہونے کی آواز سنتے رہتے تھے۔ کسی نے کم پیسے دیے، کوئی سودا اُدھار مانگ بیٹھا یا خریدے ہوئے سودے کی برائی کر بیٹھا، تو سمجھیے ہلچل مچ جاتی تھی۔ بہت کم گاہک ایسے تھے جنہوں نے برسوں کے پھیلاؤ میں دیوان جی پر گراں فروشی کا الزام لگایا ہو۔ اگر کسی نے مغالطے میں کہہ بھی دیا ہوگا کہ دیوان جی فلاں چیز مہنگی بیچ رہے ہو تو اس نے جلد یا بہ دیر اُن سے معذرت کر لی ہوگی۔

دیوان جی مہنگا بیچنے، کم تولنے یا سودے میں ملاوٹ کرنے کی طرح، معذرت کو بھی ناپسندیدہ عمل سمجھتے تھے۔ کسی نے کبھی انھیں معذرت کرتے نہ دیکھا نہ سنا۔ ان کا مشہور قول تھا کہ میاں ہم وہ کام ہی ناں کرتے جس پر شرمندہ ہونا پڑے۔ مگر مجھے، اور دور دراز کے محلے میں رہنے والے کم سے کم دو انسانوں کو معلوم تھا کہ دیوان جی نے زندگی میں ایک بار ضرور معذرت کی ہے۔

برساتوں کے دن تھے۔ ایک رات کوئی گیارہ کے بعد کسی نے دستک دی۔ میں نے

جا کر دیکھا کہ دیوان جی چھتری تانے دروازے پر کھڑے ہیں۔ چہرہ بارش کے پانی سے دھلا ہوا یا پسینے میں شرابور ہے۔ مجھے دیکھتے ہی بولے، ”ساتھ چلیے۔ ایک قصہ ہو گیا ہے۔“
یا اللہ خیر! کوئی بات بہت ہی غیر معمولی ہوئی ہے، ورنہ یہ صاحب اس طرح کسی کو اپنا ساتھ دینے کے لیے نہیں کہتے۔ میں برساتی اوڑھ کر ساتھ ہولیا۔ سڑک پر کچھ دور چلنے کے بعد بولے، ”خفت کی بات ہے۔ میں آپ کو گواہ بنانا چاہتا ہوں، اس مارے لیے چلتا ہوں۔“
میں نے تفصیل نہیں پوچھی۔ کوئی فائدہ نہیں تھا۔ مجھے علم تھا وہ مناسب وقت پر خود بتا دیں گے۔

تقریباً ایک میل ناہموار میدانوں، اندھیری سڑکوں، گلیوں سے گزارتے ہوئے وہ مجھے ریلوے پھاٹک کے قریب بنے کچے پکے مکانوں کے جمگھٹے کے پاس لے گئے۔ ایک درخت کی ناکافی پناہ میں مجھے ٹھہرنے کو کہا، اور ریلوے ملازمین کے ان مکانوں میں سے کسی مکان میں داخل ہو گئے۔

کچھ دیر بعد اندھیرے میں کسی کے قبہقہہ مار کر ہنسنے اور دیوان جی کے خفا ہونے کی آواز آئی۔ اُن کے ساتھ دو آدمی آرہے تھے۔ قریب آئے تو دیکھا ان میں ایک بارہ چودہ برس کا لڑکا ہے۔ لڑکا نیند میں تھا اور آدمی تھوڑی تھوڑی دیر بعد ہلکی آواز میں ہنس رہا تھا۔ نہ معلوم کیوں دیوان جی اس وقت زیادہ غصے میں نہیں تھے، ورنہ جس انداز میں وہ شخص ہنس رہا تھا اسے دیکھتے ہوئے خدشہ تھا کہ اُن کے ہاتھوں پٹ جائے گا۔

خیر، وہ آدمی ذرا سنبھلا، سنجیدہ ہوا، تو دیوان جی کہنے لگے، ”سُنو بھئی، شام کو یہ لڑکا سودا لینے آیا تھا۔ میں نے حساب کر کے پیسے لوٹائے تو ایک روپے کا یہ نوٹ میرے ہاتھ سے چھوٹ کے ڈبوں بوروں کے بیچ گر گیا۔ نہ میں نے دیکھا نہ اس نے۔ یہ بولا آپ نے ایک رُپیا کم دیا ہے دیوان جی! میں نے کہا بکواس کرتا ہے بے۔ خیر یہ بھی صئی تھا میں بھی صئی تھا۔ تو بھائی! میں نے اس کو چور بنا کے لوٹا دیا۔ ابھی شام کو دکان کا سامان سمیٹنے لگا تو نیچے پڑا ہوا یہ نوٹ مل گیا۔ لے بھی لڑکے! یہ اپنا نوٹ سنبھال۔ تو سمجھے صاحب! لڑکا چور نہیں ہے۔ میں نے ہی جھک ماری تھی۔ آؤ بھائی چلو۔“

لڑکے کا باپ پھر ہنسا۔ کہنے لگا، ”کوئی بات نہیں دیوان جی! کوئی بات نہیں۔“
دیوان جی کو جیسے دورہ پڑ گیا۔ پوری طاقت سے دھاڑے، ”بات کیسے نہیں ہے

بے؟ میں بستر پر لیٹا تو نیند نہیں آئی۔ گواہی کے لیے ایک بھلے آدمی کو اتنی دور بارش میں پیدل چلا کے لایا ہوں۔ خفت الگ ہوئی... تو اپنے اس لڑکے کو سمجھا دے یہ پھر میری دکان پہ ناں آوے۔ نہیں تو ٹانگیں چھانٹ دوں گا، ہاں! پیسے سنبھالنا بھی نہیں آتا باؤ لے کو۔“



پیدل ولندیزی

ہم ادب کے طالب علم تھے، اور ہیں۔ اُس زمانے میں نیا نیا لکھنا شروع کیا تھا، اس لیے گھوم پھر کر نظموں میں اور زندگی میں ہم کہانیوں جیسے کردار تلاش کرنے لگتے تھے۔ ہمیں، ہمارے دوستوں کو، مغرب سے آنے والی ادبی تحریکوں میں اور سیاحوں میں بڑی دل آویزی محسوس ہوتی تھی۔ چناں چہ جب اپنے شہر کی سڑکوں پہ ہم نے پیدل ولندیزی صاحب کو دیکھا تو نہ صرف پوری طرح متوجہ ہو گئے بلکہ سب دوستوں نے چندہ کر کے انھیں کافی ہاؤس میں چائے کی دعوت بھی دے دی۔

پیدل ولندیزی کا اصل نام جان واؤڈا تھا۔ پہلی ملاقات میں انھوں نے ہمیں اپنا سونے والا تھیلا، یعنی سلپنگ بیگ پہن اوڑھ کر دکھایا، اپنی زنبیل دیکھنے کو دی اور وعدہ کیا کہ اگلی ملاقات میں وہ ہمیں اپنی انگریزی نظمیں بھی سنائیں گے۔

وہ بڑی چٹک مٹک باتیں کرتے تھے، حالاں کہ اب جتنی ہماری عمر ہے اس سے وہ دو برس بڑے تھے، جو ظاہر ہے ہمیں اُس زمانے میں متقدمین کی عمر لگتی ہوگی۔ ہمیں بہت حیرت ہوتی تھی کہ پیدل ولندیزی پیادہ پا دنیا کا سفر کر رہے ہیں اور گھٹیا، وجعِ مفاصل، عرق النسا اور بعض اعصابی بیماریوں کا تذکرہ کرنے کے بجائے ڈچ لوک گیت اور لطیفے سناتے ہیں اور اچھے، بلکہ کم اچھے لطیفے پر بھی دل کھول کر ہنستے ہیں۔

دوسری بار ہم نے پیدل ولندیزی کو ٹورسٹوں والے ہوٹل میں چار کورس کا باضابطہ ڈنر دیا۔ خود ہم دوستوں نے اپنے لیے مکھن لگے دو دو ٹوسٹ اور بنا کریم کی کافی منگائی۔ ولندیزی کو سمجھا دیا کہ ہم چاروں نے دوپہر کا کھانا دیر سے کھایا ہے اس وقت کچھ ہلکا ہی کھائیں گے، تم کھانا کھاؤ، ہم بس کافی اور ٹوسٹ لیں گے۔

پیدل ولندیزی ہماری وضاحت پر مسکرا کر چپ ہو گئے... انھیں ہم طالب علموں کی مالی حیثیت کا اندازہ ہوگا۔ پھر یہ بھی تھا کہ پیدل ولندیزی جان واؤڈا جھوٹ بولنے والوں میں خود بھی استاد کا درجہ رکھتے تھے، اتنی رعایت تو ہمیں دیتے ہی۔

اگلی چند ملاقاتوں میں انھوں نے ہمیں اتنی بہت سی فرضی اور حقیقی مہمات کے قصے سنائے کہ ہمارے لیے یہ تمیز کرنا مشکل ہو گیا کہ واقعہ کہاں تک ہے اور تخیل کہاں سے شروع ہوتا ہے۔ بعض واقعات تو سرتاسر افسانہ معلوم ہوتے تھے، مگر یہ سنانے والے کا کمال تھا کہ پلک تک نہیں جھپکنے دیتا تھا۔

ہم سے داد وصول کرنے کی نیت سے، یا اپنے جوش بیان میں، کبھی کبھی وہ اپنی جھوٹ اور عیاری کا کوئی اصل واقعہ بھی سنا دیتے۔ ہمارا ساتھ دینے کے لیے وہ منہ پر نیپکن رکھ کر شانے اچکاتے ہوئے دیر تک بے آواز ہنستے رہتے۔ اپنی ایک عیاری کا ذکر وہ بہت شوق سے کرتے تھے کہ کس طرح انڈونیشیا کے شہر جکارتا سے ایک سال جنوری کے مہینے میں وہ اپنے مڈاحوں اور میونسپل نمائندوں سے پھولوں کے ہار پہن کر روانہ ہوئے۔ شہر سے سترہ میل دور ایک نیک دل کسان کے گھر کافی پینے رکے۔ پھر کچھ ایسا ہو گیا کہ اگلے سال جنوری تک پیدل ولندیزی اسی کسان کے ہاں ٹھہرے رہے۔ وہ اس کے ٹرک اور ٹریکٹر کی دیکھ بھال کرتے، اسے اپنی مہمات کے قصے سناتے، اور بدلے میں تین وقت کا کھانا، اور جو بھی کسان کے اور ان کے نصیب میں ہوتا، پاتے رہے۔ دوسرے سال کی جنوری ختم ہونے سے پہلے پیدل ولندیزی نے پھر جکارتا کی طرف منہ کیا۔ سترہ میل پیدل چلتے ہوئے شہر میں داخل ہوئے اور اپنے پچھلے برس کے مڈاحوں سے دوبارہ ہار پھول پہن لیے۔ پھر وہ کئی ماہ تک جکارتا والوں کو اپنے ’جنوری سے جنوری تک کے‘ روگٹے کھڑے کر دینے والے واقعات سناتے رہے۔

ایک بار وہ ہم سے الوداعی ڈنر لے کر اور خود اپنے بیان کے مطابق ایک بحری جہاز میں لفٹ لے کر آسٹریلیا روانہ ہو گئے۔ آٹھ ماہ وہاں رہنے کے بعد لوٹے تو بہت نڈھال اور

کجلائے ہوئے تھے۔ آسٹریلیا کا موسم اس بار انھیں راس نہیں آیا تھا۔ کسی نے اڑا دیا کہ پچھلے چھ ماہ میں کتنی ہی بار ہم نے اپنی آنکھوں سے پیدل ولندیزی جان واؤڈا کو ادھر اپنے ابراہیم حیدری ویلج میں مچھیروں کے ساتھ بیٹھے دیکھا ہے۔

ہم پھر چندہ کر کے پیدل ولندیزی صاحب کو استقبالیہ ڈنر دے رہے تھے۔ کسی نے ابراہیم حیدری والی بات دہرانا چاہی۔ ہم لوگوں نے پہلے ہی جملے پر اسے روک دیا۔ ہمیں رونگٹے کھڑے کر دینے والی کہانیوں کی، اور پیدل ولندیزی کو مناسب قوت بخش غذا کی ضرورت تھی۔ یقین کیجیے، اس پورے انتظام میں عینی شاہدوں اور حلف اٹھوانے والوں کی کہیں کھپت نہیں تھی۔

پیدل ولندیزی صاحب تو ہمارے گروپ کے میر باقر علی داستان گو تھے۔ ان میں اور خلد آشیانی میر باقر میں محض اسلوب کا فرق تھا، یعنی یہ کہ ولندیزی صاحب ہر کہانی کے ہیرو یا تو خود ہوتے تھے یا ہیرو کے دائیں ہاتھ پر ایک سوئی لیے بہ ذاتِ خود کھڑے ہوتے تھے اور اسے مناسب مشوروں سے نوازتے رہتے تھے۔ خدا معلوم جان واؤڈا صاحب اب کہاں ہیں۔ اگر زندہ ہوں گے تو شاید بوڑھے ہو گئے ہوں گے، اور ہو سکتا ہے نہ بھی ہوئے ہوں۔



طوفان کے مرکز میں

میں اور میرے ہم عصر، ہم ایک طوفان کے مرکز میں ہیں۔ اندر سے یہ دائرہ بالکل شانت دکھائی دیتا ہے۔ سب کچھ جما جمایا اور unruffled ہے یہاں۔
ہاں طوفان کا outer perimeter ایک پیس دینے والے فشار میں سنسناتا، گھٹمن گھیری کھاتا رہتا ہے۔ وہاں ہم رہتے ہیں، outer perimeter میں۔ مگر میں 'رہنے' کی بات نہیں کرتا... وہ الگ کہانی ہے۔

میں طوفان کے مرکز، اس شانت دائرے میں گزارے ہوئے وقت کو بیان کر رہا ہوں، جہاں ہم 'رہتے' نہیں تھے، جایا کرتے تھے۔



طوفان کا مرکز صدر کا زیرِ ز میں راستے والا چوک ہوتا تھا (زیرِ ز میں راستہ ابھی نہیں بنا تھا)۔ یہیں کارنر پر... جہاں اب گھڑیوں اور فوٹو گرافی کی بہت سی ونگر دکانیں ہیں... تئیں بیٹیس سیڑھیاں چڑھ کے ماؤنٹ اوپس واقع تھا... یعنی انڈیا کافی ہاؤس... جو خداوند زیوس کی سیٹ تھی، جہاں دوسرے تمام دیوتاؤں کا جماؤ ہوتا تھا۔

اُس وقت تک طے نہیں ہوا تھا کہ خداوند زیوس کون ہے، دوسرے کبھی دیوتا طے شدہ تھے۔ یہ ہر روز اکٹھا ہوتے، لمحہ لمحہ ایک نئی دنیا تخلیق کرتے اور، کمال ربوبیت سے، جاری

دنیاؤں کی پرورش فرماتے۔

یہاں muses کھلے، چھوٹے پھرتے تھے، خاص طور پر شاعری اور مصوٰری کے میوز۔ ایک بار لاہور سے سرخ چگی ڈاڑھی والا ظہیر کا شمیری بیٹیس سیڑھیاں چڑھ کے یہاں پہنچا تو سیڑھیوں پر سے پکارتا گھسا کہ ”روحانی بچو! میں آگیا ہوں۔ میرا احترام کرو، میں ظہیر کا شمیری ہوں۔“

اُس کی ہری آنکھیں، سرخ چگی ڈاڑھی اور سرخ گھونگھریا لے لمبے بال اور اُس کی aquiline ناک، اُس کا مہنتوں کی طرح دوسروں کو ”روحانی بچو“ کہنا، اُس کی لاف زنی، سبھی پسند آئیں۔ ویسے بھی نیوی بلیو قمیص، چوکیٹی دھاری دار سوٹ اور سفید نرم ٹائی میں وہ مرتخ کا باشندہ دکھائی دیتا تھا، جو بہت معقول بات تھی۔

سب نے اثبات میں سر ہلائے اور اتفاق رائے سے اُسے (ظہیر کا شمیری کو) جبلِ اومپس پر عارضی، اعزازی زیوس مقرر کر دیا۔ تاہم اُسے جتا دیا کہ دیوتاؤں کو تمھاری کلراکسیم پسند آئی ہے، اس لیے تمھیں عارضی، اعزازی خداوندِ اومپس مقرر کیا جا رہا ہے۔ ظہیر کا شمیری خوش ہوا، اس نے یہ مسند قبول کی، دوسروں کی نظمیں سنیں، اپنی نظمیں سنائیں۔ بہت اچھے تین گھنٹے گزارے۔ اٹھنے سے پہلے سب دیوتاؤں نے اُسے properly معزول کیا۔
دو تین روز بعد وہ خوش خوش لاہور چلا گیا۔



انڈیا کافی ہاؤس (جبلِ اومپس) کی بلندی سے نیچے فانی انسانوں کی دنیا پر نظر ڈالو تو سامنے Thomas & Thomas والا فٹ پاتھ شروع ہوتا دکھائی دیتا ہے۔ ٹامس والے فٹ پاتھ پر چلو تو جہاں اب الیکٹرونکس کا جنگل ہے اور کان پڑی آواز نہیں سنائی دیتی، وہیں کہیں بائیں ہاتھ پر فریڈرکس کیفے ٹیریا اور کیفے جارج آ جاتے تھے۔

کیفے جارج اور فریڈرکس کیفے ٹیریا کو بالترتیب ’جارج‘ اور ’کیفے ٹیریا‘ کہا جاتا تھا۔ کیفے ٹیریا کا درجہ وہ تھا جو سیزروں کے روم میں ’فورم‘ (Forum) کا ہوگا۔ سب کچھ جو قابلِ ذکر تھا، ’شہریوں‘ کو یہیں عطا کیا جاتا تھا۔ سڑکوں پر اُتنے ہی کم آدمی ہوتے تھے جتنے چار ایکٹ کی کسی تمثیل میں سما سکیں۔ فٹ پاتھ پر اس سے بھی کم آدمی ہوتے ہوں گے، کیوں کہ جو ہوتے تھے وہ کچھ دیر بعد وقار کے ساتھ اپنی کتابیں اور تمباکو کے ٹن اور پائپ سنبھالے کیفے

ٹیریا کے صحن میں چلے جاتے تھے۔ زیادہ دیر تک باہر نظر آنا کوئی بھی پسند نہیں کرتا تھا۔
لوگ آہستہ چلتے تھے، اور جو کوئی دوڑتا ہوا آتا تھا تو اس کی کوئی پر شکوہ، کلاسیکل
بلکہ بلبیکل (Biblical) وجہ ہوتی تھی۔ یعنی:
ایسا ہوا کہ بستی کی سمت سے ایک شخص دوڑتا ہوا آیا۔ اُس نے پکار کر کہا
کہ سنو، اُن بھیجے ہوؤں پر توجہ کرو جو تم سے کبھی کچھ طلب نہیں کریں
گے۔ سنو، کہ فلاں ابن فلاں کیفے ٹیریا میں وارد ہوا ہے اور وہ اپنی نظم
سناتا ہے۔ وغیرہ۔



بسوں کے شاہ جی ٹائم کیپر لوگ کیفے ٹیریا کی کرسیوں پر اکڑوں بیٹھنے کے لیے ابھی
آنا شروع نہیں ہوئے تھے، اُن کے آنے میں ایک دو برس، ایک دو گندھارے، باقی تھے۔
اس لیے ابھی یہ لوئر مڈل کلاس اور لوئر لوئر مڈل کلاس کے پڑھے لکھے snob لڑکوں کی دنیا تھی،
اور وہ کسی قیمت پر اپنی ہائی برو مفلسی (بے زری) کو تیزی سے کمائی (یا ہتھیائی) ہوئی دولت
سے متصادم ہوتے دیکھنے پر تیار نہیں تھے۔

ہم سب یہاں، طوفان کے مرکز میں موجود ہیں جہاں شانتی اور unruffled
peace ہے۔ ابھی یہیں ہیں ہم، ٹامس اینڈ ٹامس کے فٹ پاتھ سے گئے نہیں۔



یہیں کہیں ایک پرانی (وکتورین) ٹیلر شاپ تھی جس کا مالک فلم 'پکار' کے ہیرو
(پرنس آف منروا) اداکار صادق علی کا فین تھا۔ اُس نے ڈھائی فٹ بائی دو فٹ کے گولڈ فریم
میں چوکیٹی رنگ میں اندارج کی ہوئی اداکار صادق علی کی ایک huge تصویر لگا رکھی تھی جس
میں وہ فیلٹ ہیٹ پہنے جھک کر سامنے دیکھتے ہوئے دکھائے گئے تھے۔

ٹھیک اُس وقت جب کوئی یہ تصویر دیکھ رہا ہوتا، جیتے جاگتے صادق علی (خود پرنس
آف منروا مووی ٹون) ٹیلر شاپ سے پچاس گز دور کے پی ٹل والی گلی کے ٹکڑ پر، پان کی
دکان کے برابر، ایک اونچے اسٹول پر بیٹھے اپنے سابق پرستاروں سے دو دو، پانچ پانچ، دس
دس روپے نذرانہ لے لے کر کوٹ کی جیب میں رکھتے جاتے تھے۔ عام طور پر اُن کا شیو بڑھا
ہوتا تھا اور فالج سے نڈھال ایک ہاتھ دوسری جیب میں پڑا رہتا تھا۔

نذرانہ دینے کا طریقہ یہ تھا کہ آنے والا صادق علی کو سلام کرتا اور ہاتھ ملانے کے بہانے مٹھی میں دبایا ہوا نوٹ اُن کے ہاتھ میں چھوڑ دیتا۔

ہمارے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ پانچ پانچ دس دس کے نوٹ آتے رہتے تھے مگر کبھی ہمت نہیں پڑی کہ صادق علی کو سلام کر کے ہاتھ ملاتے اور ایک نوٹ اُن کے ہاتھ میں چھوڑ کر ہٹ جاتے... شاید ہمارے حساب سے 'پکار' کے ہیرو کو اس طرح نوٹ پکڑا دینا (تقریباً) sacrilegious تھا۔



ہم طوفان کے مرکز میں ہیں۔

صدر کے زیرِ زمیں راستے سے سگر والوں کے موجودہ شوروم کی طرف چلو تو جھلمل کرتی، اُبلتی پڑتی دکانوں کے بیچ کہیں پھنسی ہوئی ایک مسکین سی بیکری نظر آتی ہے... پارسیاں بیکری۔ یہ بیکری کبھی کیفے پارسیاں کا حصہ ہوتی تھی۔ اس وقت اسے تلاش کرنا پڑتا ہے۔ پہلے (ایک متواضع اور کریم النفس) کوہِ ندا کی طرح یہ آپ کو خود پکار لیتی تھی۔ پارسیاں بیکری اور کیفے پارسیاں کو ایک فوری طور پر مہیا analogy سے سمجھا جاسکتا ہے: آج کی پارسیاں بیکری اسٹول پر بیٹھے ڈھیلے ڈھالے کوٹ والے صادق علی کی طرح ہے۔

اور جو پارسیاں بیکری مجھے، میرے ہم عصروں کو یاد ہے وہ جوہو کی ریت پر (دو گھنٹے کے لیے! Omygod پانچ ہزار میں خریدی گئی!) فینسی بگھی چلاتے، جگمگاتے، پرنس آف منرو صادق علی جیسی تھی۔

O Mighty Caesar! Dost thou lie so low?

Are all thy conquests, glories, (etcetera etcetera)

Shrunk to this little (etcetera etcetera)?

پارسیاں بیکری اس شہر کی (correction: اس دنیا کی) بہترین 'پے ٹیز' بہت مناسب داموں پر فراہم کرتی تھی۔ اور یوں بھی تھا کہ اگر آپ اپنی جاننے والی لڑکی کے ساتھ پارسیاں میں داخل ہوئے ہیں اور آپ کے لیے کوئی فیملی کیبن خالی نہیں ہے، تو یہ فوری طور پر ان دو خوش مزاج ایرانی بھائیوں کا ذاتی مسئلہ بن جاتا تھا جو پارسیاں کے مالک تھے اور ہر

گا ہک کو عادتاً مسکرا کے وِش کیا کرتے تھے۔



ہم طوفان کے مرکز سے باہر نہیں آئے۔

موجودہ سنگر شوروم کے سامنے، ایلفنسٹن اسٹریٹ ہی پر، کتاب محل تھا... کل تک تھا۔ آغا سرخوش قزلباش اور اُن کے شاپ اسٹنٹ ہر promising شاعر ادیب مصوّر کو پہچانتے تھے اور بڑھ کر مصافحہ کرتے، احوال پوچھتے تھے۔ کتابیں دکھاتے، ان پر باتیں کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ promising ادیب شاعر مصوّر اردو کتاب خریدنے کی تو بالکل استطاعت نہیں رکھتے، مگر وہ یہ سب کچھ کرتے تھے کیوں کہ وہ خود بھی، اور ہم بھی اُس وقت آغا شاعر کے اسٹیلشمنٹ میں ہوتے تھے... ساٹھ ستر برس پیچھے کے کسی ٹائم زون میں۔



زیر زمیں راستے والے ٹریفک سکنل اور سنگر والے چوک کے بیچ (پاریسیاں بیکری کے سامنے) ایک پروٹسٹنٹ چرچ ہے۔ چرچ کا فٹ پاتھ طوطا فال والوں اور وزن کی مشین والوں کے سوا ہمیشہ سے خالی رہتا ہے۔ ایک وقت اس فٹ پاتھ پر ایسا آیا تھا کہ یہاں درجنوں makeshift بک اسٹال قائم ہو گئے تھے۔

دراصل صدر کوآپریٹو مارکیٹ بن رہی تھی تو وہاں کی دکانیں اور اسٹال وقتی طور پر یہاں آگئے تھے جو بڑی یکسوئی سے چرچ والے فٹ پاتھ پر L-shape بناتے آگے امیریکانو والی سڑک پر چلے گئے تھے۔ کچھ دن دھیرج میں گزار کے ان بک اسٹالوں کی یونین کے عہدے داروں نے چرچ کے کرتا دھرتا فادر لوگوں کو تجویز پیش کی کہ حضرات! اگر فٹ پاتھ کے ساتھ لگی چرچ کی زمین سے ایک دو قاشیں لے کر چند درجن فینسی بک شاپس بنوادی جائیں تو ہزاروں ہزار روپے (اُس وقت بڑی رقم ہوتی تھی) چرچ کو ہر ماہ مل جایا کریں گے۔ منصوبہ یہ ہے کہ بدہیت کینین ہٹا کر ایک جیسی دکانیں تعمیر کی جائیں گی (نقشہ آپ حضرات پسند فرمائیے گا)، تو ایک جیسی جدید دکانوں سے شہر کا چہرہ improve ہوگا، پھر مطالعے کے عمل میں، کہ خیر کثیر ہے، چرچ کا تعاون خداوند کی خوشنودی کا باعث بھی ہوگا (N.B.: خداوند شاہد ہے کہ ان makeshift اسٹالوں پر چیپ فکشن اور 'صالح' عالمی ادب کے ساتھ ساتھ خیر سے پورنوگرافی بھی مہیا رہتی تھی۔)

چرچ والے فادروں نے کہا، آپ کا فرمانا بجا ہے۔ ہم اس اتوار کو چرچ کمیٹی (جیسی کہ اپنی مسجد کمیٹی ہوتی ہوگی) سے مشورہ کریں گے اور پیر کو جواب دیں گے۔ پیر کو یونین کے عہدے دار گئے۔ فادروں نے کہا، پیارے ہمسایو! ہم چرچ کے اخراجات پورے کرنے کے لیے لونگ ریگیشن میں طشتری گھماتے ہیں؛ مسیحی نمازی حسبِ توفیق چرچ کے لیے طشتری میں کچھ ڈال دیتے ہیں۔ اگر ہم نے اپنے چرچ کو خود کفیل بنا دیا تو اس ضمن میں اجماع فادراں ہے کہ ہمارے مسیحی نمازی (آخر کو بندہ بشر ہیں) رفتہ رفتہ چرچ کی کفالت میں تساہل برتنے لگیں گے۔ کتنے ہی نمازی، جو اس معصوم خوش فہمی میں اتوار کے اتوار چلے آتے ہیں کہ اُن کی آمد سے چرچ کی امداد ہو جاتی ہے، آنا چھوڑ دیں گے۔ آپ کی تجویز سے پیسے تو بہت مہیا ہو جائیں گے تاہم نمازی کم ہوتے جائیں گے جو نہ ہمیں خوش آئے گا نہ خداوند کو۔ اس لیے عزیزو! ہم دکانیں نہیں نکالیں گے، طشتری گھما کے گزارہ کریں گے۔ و ما علینا الا البلاغ۔



کوآپریٹو مارکیٹ بنانے کے لیے پلاٹ سے کتابوں کی کمپنیں ہٹائی گئیں تو مہینوں تک یہ حصہ دیہات کے شاملات کی طرح ہر ایک کے کام آتا رہا۔ موالیوں چرسیوں سے لے کر سانڈے کا تیل بیچنے والوں، ”بچہ جمورا آئے گا؟ آگیا!“ کا کھیل دکھانے والوں اور بغیر تکلیف کے محض ایک رومال سے دانت نکالنے والوں تک کا جماؤ رہنے لگا۔ ٹھٹ کے ٹھٹ لگے رہتے۔

ایک بار ہم نے ایک متدین شکل و صورت کے صحت مند آدمی کو دیکھا جو بار بار جتا رہا تھا کہ وہ عطاء اللہ شاہ بخاری کی آنکھیں دیکھے ہوئے ہے اور ابھی کینٹ اسٹیشن پر اتر کے سیدھا چلا آ رہا ہے۔ وہ یہ بھی بتا رہا تھا کہ اُس کا کوئی مشن ہے جس کی تکمیل کے لیے اس نے یہ پُرصوبت سفر اختیار کیا ہے۔

اُس نے بڑی روانی سے ایک تقریر شروع کی جس میں علمائے سوء سے ملت کو خبردار کیا گیا تھا اور جو تباہیاں وہ اس خاص شعبے میں لائے ہیں اُن کا بڑا گرافک بیان تھا۔ اس کا استدلال اچھا خاصا رہا ہوگا جیسی تو ہم اس خبردار کرنے والے ایللی یاہ پوسٹین پوش کی چمک اور گھن گرج سے بندھے کھڑے رہے۔ Ancient Mariner کے قابو میں آئے شادی کے مہمان کی طرح ہم اُس کی وائلڈ بلکہ قطعی مجنونانہ آنکھ کے حصار میں رُ کے کھڑے تھے کہ اچانک

کہیں کوئی گڑبڑ ہوگئی۔ علمائے سوء کی حرم زدگیاں گناتے گناتے اُس نے قدموں میں پڑے اپنے تھیلے سے ایک مرتبان نکالا اور (اُس متدین شکل و صورت والے نے) امساک کی چمک دار گولیاں بیچنی شروع کر دیں۔

اس واقعے کے بعد مہینوں تک ہم طوفان کے مرکز سے دور رہے، بیرونی محیط میں اپنا کچھ پڑھنا لکھنا، روٹی کمانا کرتے رہے۔

شاید ہمیں جلد shock لینے والے میٹھے برس لگے تھے۔



تقریباً اُسی زمانے میں مجوزہ کوآپریٹو مارکیٹ کے وسط میں اچانک ایماں کی حرارت والوں نے زمین پر قبضہ کر کے شب بھر میں ایک مسجد بنادی تھی۔

کئی سمتوں سے نعرۂ تکبیر اللہ اکبر اور دوسرے اہم نعرے لگائے گئے۔ اخباروں میں بڑی لے دے بھی ہوتی رہی۔ قرونِ اولیٰ کی مسجدوں کے حوالے quote کیے گئے، لکھا گیا کہ مسجد کی زمین کے لیے شرطِ اول اس کا مالک سے خریدا جانا ہے۔ جواب میں لکھا گیا کہ آخر فلسفہ ہنگامی ضرورت بھی تو کوئی چیز ہے۔ کوآپریٹو مارکیٹ بنانے والوں نے گڑگڑا کر کہا کہ اللہ! ہمیں مارکیٹ بنانے دو، ہم اندر ایک مسجد بنا کر نذر کر دیں گے۔

۵۸ء یا ۵۹ء کا سال تھا۔ ایوب حکومت نے (جو نہ معلوم کیا تھی، مگر کسی نظریاتی گمک کا سہارا لیے بغیر تھی اور کہیں کہیں ڈاؤن ٹو ارتھ ہو سکتی تھی)، کچھ پکڑ دھکڑ بھی کی۔ اس سر تاسر ٹرانسپیرنٹ کارروائی میں صدر کے ایک مشہور کیفے کا سرسیدی حلیے کا (تاہم ملاں ٹائپ) مالک پیش پیش تھا۔ اُس نے حکومت کے مسجد دشمن (یا شاید اسلام دشمن) رویے کے خلاف جہاد کی تلقین بھی کی تھی اور کچھ دن کے لیے وہ بند بھی کر دیا گیا تھا۔ پھر شاید کہیں کوئی مصالحت ہوگئی۔ اُسی سال، یا شاید بہت برسوں بعد، (what difference does it make?) سرسیدی حلیے کا وہ ملاں ٹائپ خوش خوش راہی ملکِ عدم ہوا۔ مسجد وہیں ہے اور سنا ہے آباد ہے۔



موجودہ صدر پوسٹ آفس سے (جو آج کے زیرِ زمین راستے کے دہانے پر واقع ہے)، پیراڈائز چوک تک کئی درجن (اگر یہ مبالغہ ہے تو سمجھیے ایک درجن) بک اسٹال تھے جن پر زیادہ تر گوانی... ڈی سوزے، ڈی کاٹے... سیلزمین یا مالک ہوتے تھے۔ آدھی آستینوں والی

قمیصیں (جن کی آستینوں کو اور بھی دو بار فولڈ کر کے اور بائی سپس، ٹرائی سپس دکھا دکھا کے پہنا جاتا تھا)، کروکٹ بال، اونچی پتلونیں (جن کے پانچوں اور کریپ کے سول والے جوتوں کے نیچے سے شوخ رنگوں والے سوکس کے چیک ڈزائن لشکارے مارتے تھے) اور کوئی کوئی ڈسٹنہم کا فیلٹ ہیٹ بھی پہنے ہوتا تھا... اصل نسل، برانڈ نیو، امپورٹ کیا ہوا ڈسٹنہم پورے دس روپے کا ملتا تھا، یا پندرہ کا۔

شام ہوتے ہی یہ ڈی سوزے، ڈی کاٹے بہت مستعدی سے اسالوں پر آکھڑے ہوتے۔ یہ رہگیزوں کو کبھی ”ہیلو“ کہتے کبھی مسکرا کر ”ہاؤ ڈی“ کرتے۔ کوئی دوسرے شہر سے آتا ہوگا تو سمجھتا ہوگا کہ یہ گھر سے کتابیں بیچنے نہیں! Howdy Man! کہنے اور مسکرانے کے لیے آتے ہیں۔

اور کتابیں؟ O my god! ... پیلی کن، پینگوئن وغیرہ کی کوئی بھی اوسط درجے کی کتاب، پرنٹنگ انک کی مسحور کرنے والی سگندھ کے ساتھ اور ٹائٹل پر (WOW!) پیپر بیک بائنڈنگ مشین کی داب سے پڑی کسی جادو بھری ہلکی سلوٹ کے ساتھ، almost aphrodisiac، پانچ سات روپے میں مل سکتی تھی۔

یہ اسال والے اپنے مستقل گاہکوں کو پہچانتے تھے (جیسے گاؤں قصبے کے دکان دار پہچانتے ہیں) اور یہ راہ چلتے ٹوکتے بھی تھے، ”ہے... ینگ مین! ہومر کی ’اوڈیسی‘ گرم کیک کے مافک سیل ہو رہی ہے۔ ٹیک کیئر مین! ففٹین بکس بارگین پر اس ہے... ابھی بھی مس کیا تو you know فیر نہیں ملیں گا۔ کم آن، ٹیک ون!“

ہم مسکرا کے ڈی سوزے، ڈی کاٹے کی صورت دیکھنے لگتے۔

وہ سمجھ جاتا۔ مسکرا کر ونک کرتا۔ ”اوکے، ہاؤ میچ؟ ابھی کٹلا پٹی سا ہے؟ وہ میرے کو

دیو، کتاب اٹھاؤ اینڈ رن۔ Run for your life! بہہ بہہ ہا ہا! بیلینس نیکسٹ ٹائم دینا۔“ Bye

گریز: اور اب کھوڑی گارڈن کا بازارِ ردی فروشاں۔ یہ فی الاصل کتاب دوستوں کا کنز مخفی تھا۔ یہاں سے ایک بار ہمیں Complete Works of Shakespeare تول سے ساڑھے چودہ آنے میں ملی تھی۔ ڈھائی روپے دے کر ہم نے اُس کی جلد بنوائی اور گولڈ لیٹرز سے

اُس پر اپنے ممدوح کا نام چھپوایا۔ تاہم ساڑھے چودہ آنے ادا کر دینے کے بعد اُس دن ہمیں (بوجہ) بازارِ روڈی فروشاں سے پی آئی بی کالونی تک کا راستہ پیدل طے کرنا پڑا۔



ہم پھر لوٹتے ہیں۔ اور ہم کے پی ٹل والی گلی سے زیادہ دور نہیں جائیں گے۔ یہ سینما... کے پی ٹل... کسی شیکسپیر پسند (یا طالب علم دوست) ستارہ ایدھی کی ملکیت میں ہوگا۔ یقیناً ایسا ہی ہوگا کیوں کہ اگر ایسا نہ ہوتا تو کیوں وہ ہم (اُس وقت کے انٹر، بی اے کے طالب علموں) کو اتنے مزے کراتا۔

دونوں ڈرامے The Twelfth Night اور Julius Caesar بالترتیب انٹر اور بی اے کے لازمی انگریزی کے کورسوں میں شامل تھے؛ تو امتحانوں کے قریب آتے آتے کے پی ٹل میں دونوں فلمیں میٹنی شو میں دکھائی جاتی تھیں۔ دونوں بلیک اینڈ وائٹ تھیں، جب کہ 'جولینس سیزر'... جیمز مین، مارلن برانڈ والی... تو کلاسکس میں گنی جاتی ہے۔ ایک روپے میں 'چاہے کہیں بھی بیٹھو' کے اصول پر دس پندرہ دن تک یہ فلمیں یہیں رہتی تھیں۔ مشہور تھا کہ چار شودیکھ لے تو بیس میں سے بارہ نمبر تو بونگے سے بونگا اسٹوڈنٹ بھی پیٹ لے گا۔

جب تک شیکسپیر چلتا پورا ہال... پہلی صف سے آخری صف تک... بھرا رہتا۔ فرصت پائے ہوئے کچھ گوانی، کچھ پارسی مرد عورتیں، اور باقی بانوے ترانوے فی صد طالب علم... لڑکے لڑکیاں... ونگلز میں بھی کھڑے ہوئے، بالکنی کی دیوار پر بھی نکلے ہوئے، لڑکے لڑکیاں ملے جلے، behave کرتے ہوئے، ایک استاذ الاساتذہ کی مجلس میں سمجھو دوزانو بیٹھے... یہ کسی دوسرے منطقے، دوسری صدی کی بات لگتی ہے... مگر سب جانتے ہیں کہ سب کچھ ایسا ہی تھا۔

گمبیر کا سینس اپنی جھلسن میں ایک اداس بروٹس کو سیزر کے خلاف بھڑکار رہا ہے: لڑکے لڑکیاں سخت غصے میں کاسینس کے ساتھ ساتھ... بلکہ آگے، کئی جگہ اُس سے آگے آگے... کہتے جاتے ہیں (سیزر اُس وقت سخت نامقبول آدمی ہے)؛ تو اتنی نوے آوازیں ایک ساتھ اپنا venom صرف کر رہی ہیں:

Why, Man He doth bestride the narrow world

Like a Coiossus, and we petty men
Walk under His huge legs, and peep about
To find ourselves dishonourable graves.

رات کا آخری پہر ہے۔ بروٹس اپنی حویلی کے چمن میں ٹہل رہا ہے۔ سناٹے میں دور کہیں کسی بے چین پرندے کے پروں کی پھڑ پھڑاہٹ سنائی دیتی ہے۔ بروٹس (جیمز میسن... فلسفیوں جیسا دھیما، اُداس آدمی) اپنے کلچرڈ لہجے میں خادم کو پکارتا ہے:

What Lucius, Ho!

اور کہتا ہے، ”ستاروں کو دیکھ کر تو نہیں کہہ سکتا، دن ہونے میں کتنی دیر ہے...“ پھر حسرت سے: ”لو سیس جیسی نیندیں کاش! مجھے مل سکتیں۔“

یہ سب باتیں وہ جاتی ہوئی رات کے احترام میں سرگوشیوں میں کہہ رہا ہے۔ سیکڑوں چلبے نوجوانوں سے بھرے ہال میں سناٹا ہے۔ وہ اپنے خادم لو سیس کو پھر آواز دیتا ہے۔ اسکرین پر لو سیس نظر آتا ہے مگر اُس (اداکار) کے بولنے سے پہلے، برابر کی تیسری چوتھی سیٹ سے پی آئی بی کالونی، ناظم آباد کی چمک لیے ہوئے ایک جونیر آواز بہت احترام سے پوچھتی ہے:

Call'd you, my Lord?

لڑکے لڑکیوں کی بے ساختہ کھلکھلاہٹ سے کے پی ٹل جیسے چھلک پڑتا ہے۔ کوئی بک ورم جھنجھلاہٹ میں حکم دیتا ہے: Silence! اور پورا ہال پھر دم سادھ لیتا ہے۔ فلم چلتی رہتی ہے۔ فلم چل رہی ہے... میاری! کہاں گئے وہ لوگ؟



کے پی ٹل والی گلی کتابیں پڑھنے، کتابیں سوچنے، کتابیں لکھنے والوں کی گلی تھی۔ یہ عزیز حامد مدنی صاحب کی گلی تھی۔ یہ سفید شیروانی اور سرخ مخملی ٹوپ والے بلگرامی صاحب کی گلی تھی، جنھوں نے مدنی صاحب کی طرح کتابیں نہیں لکھیں اور جن کے بارے میں میں اس کے سوا کچھ نہیں جانتا کہ سنا ہے محمد حسن عسکری کے بعد انگریزی کے جید استادوں میں اُس وقت اُنھی کا نام لیا جاسکتا تھا۔

اور یہ گلی فلم پکار کے ہیرو، بجھے ہوئے، فالج زدہ پرنس صادق علی کی گلی تھی۔
اس کوچے میں 'کیفے گلوریا' بھی تھا جہاں مناسب پیسوں میں نئے گندم کی مہک
والے نرم، دبیز سلاسنوں پر لائل پور کا بہت سا خالص مکھن لگا کر گاہکوں کے حوالے کیا جاتا تھا،
جہاں سکھا شاہی کپوں میں اُسی وقت دم کی ہوئی چائے ملتی تھی، جس کی مہک پچاس قدم دور
سے بے چین کر دیتی تھی۔

کے پی ٹل والی گلی کے ایک یا دوسرے سرے پر کامریڈ ڈانگے کی شکل کے، ذہین
چہرے اور درمیانہ قد کا ٹھہ کے ایک صاحب کھڑے نظر آتے تھے۔ اُن کے بارے میں مشہور تھا
کہ ذہن پرست (?) ہیں اور میرامن کا انگریزی میں ترجمہ کر رہے ہیں۔ اوپر کافی ہاؤس میں
بھی وہ ایک طرف بیٹھے نوٹس لیتے دکھائی دیتے تھے۔ ہم نے پندرہ برس انھیں اسی طرح
دیکھا۔ نہ معلوم کس نے اڑا دیا تھا کہ وہ میرامن کا ترجمہ کر رہے ہیں، آج تک تو کوئی ترجمہ
سامنے نہیں آیا۔ برسوں ہم کامریڈ ڈانگے کے اُن ہم شکل کو ڈھونڈتے رہے، نہ وہ نظر آئے نہ
میرامن۔

کے پی ٹل والی گلی اب کہیں نہیں ہے۔ اُس کی جگہ آواز اور حرکت کی ایک
furious tunnel ہے جس میں بے حیثیت فضول چیزیں بیچنے اور خریدنے والوں کے ہجوم
کسی نیند کے عالم میں ہلتے اور آپس میں جھک جھک کرتے رہتے ہیں۔



اب یاد آتا ہے کہ ہم جب تک طوفان کے مرکز میں رہتے، بے غم رہتے تھے۔
بھوک، ضرورتیں، تنہائی، ناکامیاں، فرسٹریشن، حکمرانوں کی دھاندلیاں... سب طرح کا کذب و
دغل اس دائرے کے باہر سنسناتا ہوا گھٹمن گھیریاں کھاتا رہتا تھا۔ بیرونی محیط ایک پیس دینے
والے فشار میں تھا جس میں سروائیو کرنے کے لیے ہم سب، لومپس کے ہم سبھی دیوتے، اپنے
اپنے طور پر کچھ نہ کچھ جتن کر رہے تھے۔ باہر عافیت نہیں تھی، کبھی نہیں رہی... یہ ہم سے زیادہ
کون جانتا ہوگا! تاہم دوسرے باہمت لوگوں کی طرح ہم نے سروائیو کیا... یا نہیں کیا۔ اب یاد
آ رہا ہے... ہم میں سے بعض لوگ جاں بر نہ ہو سکے۔

قمر زیدی نام کا ایک لڑکا تھا۔ شعبۂ انگریزی میں میرے ساتھ داخل ہوا تھا۔
”تھنک“ (think) کو ہمارے اترنگے ساتھیوں کی طرح nasal تلفظ میں ”فنک“ کی طرح

ادا کرتا تھا جو شعبہ انگریزی کے ایک سال پرانوں کا میگزیم ہوتا تھا (یا اب بھی ہے، پتا نہیں)۔ وہ پرانے، پھر نئے کیمپس میں بار بار کی دھلی ہوئی اپنی نائیلون کی قمیصوں، زین کی پتلونوں میں ملبوس قہقہے مارتا آتا جاتا رہا۔ وہ میرے ہی محکمے میں کلر کی کرتا اور کسی انقلاب کے خواب دیکھتا تھا کہ حکمرانوں کی چھیٹ میں آگیا۔ شاید اُس نے کوئی پوسٹر لکھا تھا۔

(کا مرید؟) قمرزیدی کو (عمر بیس سال یا اُس سے کم) کسی سمی کورٹ نے اتنے اتنے ماہ کی سزا سنائی ہوگی یا کوڑے لگوائے ہوں گے، یا ابھی سزا سنانے، کوڑے لگوانے کی نوبت ہی نہیں آئی تھی، پوچھ گچھ کے مرحلے ہی میں تھا کہ اس کے باپ کی موت واقع ہوگئی اور حکام نے اُسے جنازے میں شریک ہونے کے لیے خصوصی اجازت نامہ دے کر گھر بھیج دیا۔ یا شاید اُسے اس لیے چھوڑ دیا کہ پوچھ گچھ میں کہیں کوئی گڑبڑ ہوگئی تھی اور، آج کے برخلاف، اُس وقت قید و بند میں کسی کا واصل بہ حق ہونا حکمرانوں کے لیے بدشگونی سمجھا جاتا تھا۔ (Human rights violation and all the relevant shit.) تو وہ خصوصی اجازت پر (انسانی ہم دردی اور ترحم کی بنیاد پر؟) گھر آیا ہوا تھا جو اُس نے خون کی قے کی اور مرگیا۔ شاید دوسرے دن، یا اُسی دن باپ کی تدفین کے بعد، اُسے بھی گاڑ داب دیا گیا۔ دوسرے کامریڈوں نے قمرزیدی کی قبر پر بھی ”ستونِ دار پہ رکھتے چلو سروں کے چراغ“ والے مشہور شعر کی تختی لگا دی۔

میں ایک بار مجروح سلطان پوری کی فرمائش پر کیمرا لے کے اُس کی قبر ڈھونڈتا ہوا میوہ شاہ گیا بھی تھا... وہ جگہ ہی نہ مل سکی۔

وہ جگہ ملتی بھی کیسے۔ وہ طوفان کے مرکز کے باہر تھی، براہِ راست تمام سنسنی ہٹوں کی زد میں تھی۔



طوفان کے مرکز کے باہر بہت سی casualties ہوئیں اُن میں سے ایک میرے لیے (یہ یقیناً ایک پٹا ہوا استعارہ ہے) نئے گھاؤ کی طرح آج بھی رِس رہی ہے۔

یہ کراچی یونیورسٹی سے فلسفے میں فاضل، سعید الدین احمد (اور اگر اس کے کوئی معنی ہیں تو، گولڈ میڈلسٹ) کی کیج وٹی ہے۔ میں نے یہاں پولیس محروروں کا پسندیدہ تلفظ ’کیج وٹی‘ لکھا ہے، اس لیے نہیں کہ مجھے پولیس محرور پسند ہیں بلکہ اس لیے کہ یہ تلفظ بزنس لائیک،

انفارمل، کولڈ بلڈڈ، جاہلانہ اور تقریباً ان ہیومن لگتا ہے، اور اس تمام صورتِ حال میں ایک نحوست آثارِ سنگِ مزار کی طرح جڑا ہوا ہے۔

مجھے سعید الدین احمد کے سانچہ ارتحال کی کوئی اطلاع نہیں۔ خدا معلوم وہ ابھی تک ویبکی ٹیبل کی طرح زندہ ہے یا اس کی مشکل آسان ہو گئی۔

سعید الدین احمد نے مجھے جون ڈن (John Donne) پڑھایا تھا۔ وہ تھا تو میرا ہم مکتب ہی، مگر فلسفے کا فارغ التحصیل ہونے اور بھیا نک حد تک ذہین ہونے کے ناتے وہ میرا میٹا فرزکس کا اُن اوفیشل استاد بن بیٹھا تھا۔ مگر مجھے یہ واقعہ شروع ہی سے سنا دینا چاہیے۔

سعید الدین احمد اپنی looks میں پچاس فی صد دراوڑی، پچاس فی صد نیگرو اور سو فی صد دکھنی تھا۔ نرسمہا راؤ کی طرح چوڑے نتھنوں اور مارٹن لوتھر کنگ جونیئر کے سے افریقی سر والے اس فٹ بالر کے چہرے پر کنگ جیسی نرمی اور ذہانت تھی اور موٹے چشمے کے پیچھے سے جھانکتی، "I have a dream" کہتی اُس کی آنکھیں اسے ایک دم ساؤتھ انڈیا سے آیا ہوا کنگ جونیئر بنادیتی تھیں۔

پان منڈی جونا مارکیٹ سے ملحق کراچی یونیورسٹی (اولڈ کیمپس) کے شعبہ انگریزی میں، میں نے اُسے پہلی بار دیکھا تھا۔ یہاں پہنچنے کے لیے شعبے کے آدھے کمپاؤنڈ پر قابض لکڑیوں کی ٹال سے اور woodlanders کے بیچ سے لہراتے ہوئے گزرنا ہوتا تھا (وہ لیکچروں کے دوران بھی ٹھاٹھا کر کے کھاڑے چلاتے رہتے تھے)۔ ٹال سے گزر کر اور ایک سکڑا سمنٹا، گھماؤ دار زینہ چڑھ کے شعبے کا سیمینار آجاتا تھا (جو L-4 روٹ کی کسی بھی بس کے برابر لمبائی چوڑائی رکھتا تھا)۔

میں پہنچا تو وہاں سیمینار روم کے دفتری خلیل بھائی کے ساتھ ایک بیٹنج پر وہ بیٹھا تھا... سعید الدین احمد!

وہ خلیل بھائی کے بچوں کے نام پوچھ رہا تھا اور ہر نام پر واہ واہ کر کے داد دے رہا تھا: مزرم بل، واہ! اور مُس تن صر اور مدُث ثر، سبحان اللہ! پھر کہنے لگا، ”خلیل بھائی! اپنے اگلے بیٹے کا نام میکسی بلین رکھنا۔“ خلیل بھائی یہ سن کر سر ہلا ہلا کر ہنسنے لگا۔ بولا، ”سعید الدین، تم باز نہیں آؤ گے! میں جب فلسفے کے سیمینار میں تھا تو اُس وقت بھی میرے کو ایسے ہی چلایا

کرتے تھے۔ اب یہاں بھی آگئے۔“

میں نے اپنا تعارف کرایا، سامنے دوسری بیچ پر بیٹھ گیا، تو اس نے خلیل بھائی سے میرے لیے چائے بنانے کو کہا اور مسکرا کر مجھ سے بولا، ”آئی فنک یو آر رادرارلی۔“

"An early bird? Haanh? Out to get a worm... that's me!

Ha! Ha! Ha!

کڑک چائے کے گلاسوں پر ہم دوست بن گئے۔

ہم دونوں اپنی چلت پھرت سے سمجھو پہلے ہی دن اگلی ڈیسکوں پر، استادوں کے بالکل سامنے پہنچ گئے تھے۔ سن اُنسٹھ ساٹھ کے طاقت ور بیورو کریٹس کے بچوں بچیوں اور مستقبل کے ڈپٹی اور ہوم اور ایڈیشنل سیکریٹریوں اور مستقبل کے سکتے ہوئے انگلش ٹیچروں اور آنے والے دنوں کے عادی مے خواروں اور compulsive زانیوں کے درمیان ہم دو آدمی پٹیوں چڑھے انگوٹھوں کی طرح دھڑکتے ہوئے بالکل الگ نظر آنے لگے: پہلے اپنے کم حیثیت کپڑوں اور اپنے سوراخ والے، خوج خوج کرتے جوتوں کی وجہ سے، پھر اپنے ٹیوٹوریلز کی ’اے پلس‘، ’اے اور بی پلس‘ گریڈنگ کی وجہ سے۔

ہمارے استادوں، پروفیسر نقوی، پروفیسر مسز مایا جمیل اور صدر شعبہ، پروفیسر (اب مرحوم) ڈاکٹر علی اشرف، نے سعید کو رفتہ رفتہ سوالوں کے جواب دینے سے روک دیا۔ علی اشرف صاحب نے کہا، ”سعید الدین احمد! تم ڈیلیفی کے موٹے چشمے والے Oracle ہو۔ ہر سوال کا جواب تمہارے پاس ہوتا ہے۔ تو دوسروں کو بھی بولنے دو۔“ Now behave yourself and keep quiet.

رفتہ رفتہ ہم دونوں صبح کا ناشتا بھی ساتھ کرنے لگے جو گندم کے بنیادی مزے والی سادہ کڑک روٹی ہوتی تھی جسے (لمبا پانی) چائے کے گلاسوں میں ڈبو ڈبو کے بھگویا اور basic realities پر مکالمہ کرتے ہوئے کھایا جاتا تھا۔ مگر یہ سعید کی چالاکی تھی جو اس نے میرے ساتھ ناشتے کا پاکھنڈر چایا تھا۔ وہ بال بچوں والا آدمی تھا، گھر سے کھاپی کے چلتا ہوگا۔ میرا گھر تو تھا نہیں، کسی بھی کزن، کسی بھی خالہ، پھوپھی کے ہاں میں سو جاتا تھا اور سویرے ہی سویرے چل پڑتا تھا، تو مجھے پان منڈی کے چائے خانوں میں ناشتا کرنا ہوتا تھا۔ اور کیوں کہ بالکل اکیلا تھا اور پیسے کی میکانکس کو سمجھتا نہیں تھا، تو کبھی میری مالیات سیٹ ہوتی تھی اور کبھی اپ

سیٹ... اور اپ سیٹ کا مطلب تھا کہ پھر مجھے صبح کا ناشتا ایک بجے اپنے دفتر جا کر کرنا پڑتا تھا جہاں ایمر جنسی میں اُدھار دینے والے میرے ساتھی موجود رہتے۔ (کیروینو انٹونی گو مز مجھے اُدھار دینے والوں کا سرخیل تھا۔ ماشاء اللہ وہ ابھی زندہ اور خوب صحت مند اور خوش حال ہے اور روز شراب پیتا ہے۔ میں اُس کے لیے دعا کرتا ہوں کہ طویل برسوں تک وہ ایسا ہی چونچال رہے، اور دعا کرتا ہوں کہ جب وہاں پہنچے جہاں اُسے پہنچنا ہے تو اسے کسی محترم رومن کی تھلک سینٹ کی ہمسائیگی نصیب ہو۔ Amen! تو یہ ٹونی گو مز میرا کفیل انچیف تھا اور بیس تاریخ کے بعد سے مجھے دو روپے روز اُدھار دینے لگتا تھا۔)

لیکن میں سعید الدین احمد کی بات کر رہا تھا۔

سعید نے اپنی ساؤتھ انڈین دلش میں اس 'سیٹ، اپ سیٹ' مالیات اور 'ناشتا حاضر، ناشتا غائب' مسئلے کا حل یہ نکالا کہ وہ میرے ساتھ کڑک روٹی کھانے اور چائے پینے لگا۔ اکثر و بیش تر وہ بل ادا کرنے کی کوشش کرتا جو ساڑھے پانچ چھ آنے ہوتا تھا۔ ہم ساتھ ہی بس پکڑتے تھے۔

ایک روز بس میں بیٹھے بیٹھے میں نے کہا، ”سعید الدین احمد! جون ڈن مجھ پر نہیں کھل رہا۔ اُس کی مابعد الطبیعیات میری گرفت میں نہیں آتی۔ پٹھان بھائی ہوں، شاید اس لیے۔ کروڈ، کھری، رف، فزیکل چیزیں میری پکڑ میں جلد آ جاتی ہوں گی۔ مینا فزکس شاید بھاری پتھر ہے۔“ وہ اپنی ساؤتھ انڈین ہنسی ہنسا جو کسی بھی تامل ٹائیگر کی طرح بے خوف بلکہ تقریباً violent تھی۔ پھر بولا، "Is that so?" اور اس نے کھڑے ہو کر بس کی وہ ڈوری کھینچ دی جس سے گھنٹی بجتی اور بس رک جاتی تھی۔ ہم ابھی بہ مشکل برنس روڈ تک ہی پہنچے تھے کہ وہ مجھے لے کے اتر گیا۔

بس سے اتر کے آہستہ آہستہ بندر روڈ پر آتے اور رتن تلاؤ کے بعد فٹ پاتھ سنبھالتے آدھا گھنٹا لگ گیا۔ پی آئی بی کالونی تک ہم شام ہوتے پہنچے۔ کالونی تک ڈن میرے لیے اتنے اندھیرے میں نہ رہا جتنا رتن تلاؤ کے فٹ پاتھ پر تھا۔ اب ایک مکر چاندنی میں اُس کے خدو خال واضح ہو رہے تھے۔ سعید نے اُس کا وہ مختصر مجموعہ نہیں کھلوایا جو مسز مایا جمیل نے recommend کیا تھا۔ دوسری کتابوں کے ساتھ وہ کتاب میری گرفت میں پسینے پسینے ہوتی رہی اور سعید اپنی یادداشت سے ڈن کے اسٹانز اپہ اسٹانز quote کرتا اور اپنی دھار

دار intellect سے اُسے آبِ رواں بناتا چلا گیا۔

دوسرے دن میں نے کہا، ”سعید! مجھے لگتا ہے تم ڈاکٹر جو سن ہو اور میں تمہارا بوسویل جو سوال کر کر کے تمہارا ٹیپا کر دے گا۔ میں بہت دن ضائع کروں گا تمہارے۔“ وہ چپ ہو گیا۔ پھر ہنسا۔ پھر آبِ دیدہ ہو گیا، اخلاقاً کہنے لگا، ”تم بوسویل سے زیادہ ذہین ہو۔ اور جو سن کا کیا کہتے ہو؟ وہ تو دیوزاد تھا، مجھے اُس کے مماثل مت کرو... میں ایک کم مایہ، مسکین مبتدی ہوں جو بہت کچھ سیکھنا چاہتا ہے مگر خود میں اتنا بوتا نہیں پارہا۔“ یہ بوتے والی بات اُس نے عجیب کہی تھی... شاید کسی طرح کی premonition تھی۔

ایک بار میں اُس کے ساتھ اُس کے گھر جا چکا تھا۔ گولی مار کی امام بارگاہ کے پیچھے کہیں کسی گراؤنڈ کے پاس اس کا بے پلستر کا، ٹین چڑھا مکان تھا۔ اُس کی بیگم کہیں پڑھاتی تھیں۔ بچے سبھی پڑھ رہے تھے۔ گھر میں ایک نستعلیق غربت کا راج تھا۔ تاہم بیگم سعید نے وضع داری نباہی تھی، چائے کے ساتھ پلیٹ میں پاپے رکھ کے پیش کیے تھے۔ پھر دوسری بار میں اکیلا گیا جب اُس کی بیماری کا سنا۔ کوئی گبیہر بات تھی۔ مجھے اُس کے گھر میں گھستے دیکھ کر محلے کے لڑکوں نے کہا، ابے پاگل پروفیسر کے گھر کوئی آیا ہے۔

اس بار اس کے بچے کچھ سہمے ہوئے، کچھ شرمندہ سے لگے۔ بیگم اُداس مگر باہمت دکھائی دیں۔

وہ اپنے ہی استغراق میں تھا۔ چھت کی ٹن شیٹس ایک جگہ سے سرک گئی تھیں تو روشنی کا ایک shaft اس کے نیم تاریک کمرے میں در آیا تھا جس میں غور سے دیکھنے پر بے شمار روشن ڈسٹ پارٹیکلز گردش کرتے دکھائی دیتے تھے۔ سعید الدین نے خوش ہو کے مجھے وہ دکھایا۔ کہنے لگا:

Worlds on worlds are rolling ever
From creation to decay;
Like the bubbles in th' river
Sparkling, bursting etc. etc.

کچھ دیر بیٹھ کر میں تقریباً روہانسا اور scandalized وہاں سے چلا آیا۔
اس پورے پھیلاوے پر کہ جس میں لوگ پیدا ہوتے، ضائع کیے جاتے، مار دیے جاتے ہیں، مجھے بڑا غصہ تھا۔

پھر کسی نے بتایا وہ دھول بھرے پیروں میں ہوائیں چپلیاں ڈالے، غیر معمولی رنگوں کا پھٹا ہوا اکیڈمک گاؤن اپنے شانوں پر پھیلائے، چورنگی میں ملا حلوائی کے فٹ پاتھ پر کھڑا رہتا ہے۔ لوگ اُس سے بچ بچ کے گزرتے ہیں مگر وہ اُن کی طرف دیکھتا بھی نہیں، اپنی (تامل ٹائیگر والی) ہنسی ہنستا ہوا خود سے طویل مکالمے کرتا ہے جو کبھی انگریزی میں ہوتے ہیں، کبھی اردو اور کبھی فارسی میں:

”بشنواز نے چوں حکایت می کند، وز جدائی ہا شکایت می کند، سینہ خواہم شرحہ شرحہ از فراق، تا بگویم شرح درد اشتیاق، کز نیساں تا مرا بریدہ اند، اور کیا اور کیا کہ مردوزن نالیدہ اند... یعنی کہ بانسری سے سنو وہ کیا کہتی ہے اور فراقوں جدائیوں سے (رنجور ہو) شکایت کرتی ہے تو کہتی ہے کہ مجھے تو برہ میں کھول دیے گئے گھائل سینے چاہئیں تاکہ میں اپنے عشق کے درد کی شرح کر سکوں کیوں کہ جب سے مجھے اپنے نیتان سے، اپنے بانسوں کے بن سے اکھاڑ دیا گیا ہے، اور کیا اور کیا ہوا ہے، اُس وقت سے میں روتی ہوں تو سب جن روتے ہیں...“
وہ نوئیل لاریٹ فزی سٹ ڈاکٹر سری وی رمن کا گرائیں تھا۔ جیتا اور باہوش رہتا تو اس بھاگوں بھرے شہر کا ایک luminary ہوتا۔ میں عاجز اُس کا گرائیں کہلاتا۔

میں نئے کیمپس میں جانے لگا تھا جہاں ابھی سیمنٹ کی کاٹی ہوئی بو اور چونے قلعی ڈسٹپیر کی نئی چمک سانسوں کو اور آنکھوں کو بھلی لگتی تھی۔

ایک بار خبر ملی کہ وہ بھی کیمپس آنے لگا ہے... سعید الدین احمد!
پتا چلا ایک روز پروفیسر مایا جمیل کی کلاس میں انھیں اپنی ماں کہتا گھس گیا تو انھوں نے اسے تسلی دی۔ کرسی منگا کے اُسے اپنے پاس بٹھالیا اور لیکچر جاری رکھا۔ پھر وہ اُسے اپنے کمرے میں لے گئیں۔ چائے منگائی، اپنے ہاتھ سے بنا کے پلائی۔ ایک لڑکے کو بلا کے بہت سے نوٹ اُسے دیے اور کہا، ”رکشا کرلو۔ انھیں ان کے گھر چھوڑ آؤ۔ پھر آ کے مجھے بتانا۔“
پروفیسر مایا جمیل وہی ہیں جنھیں قرۃ العین حیدر نے اپنی کسی کہانی میں یاد کیا ہے (شاید میرے بھی صنم خانے، شاید سیتا ہرن... معلوم نہیں!)۔

آخری بار مسلم لیگ کوارٹرز کے قریب ایک پنساری کی دکان کے سامنے وہ مجھے نظر آیا۔ شاید اُس کے لیے منقی خریدی جا رہی تھی۔ ایک شریف صورت ساؤتھ انڈین بڑے میاں اس کا ہاتھ تھامے کھڑے تھے۔ میں نے سلام کیا۔ وہ پہچان گیا۔ پوچھنے لگا، ”اسد! کیسے ہو؟“ میں نے کچھ بھی کہہ دیا۔ وہ بولا، ”اب میں ٹھیک ہوں۔“ مگر یہ باتیں اُس نے آنکھیں جھکا کے کہی تھیں اور اُس کی آنکھوں میں سرمہ لگا تھا۔ اس کا ایک ہاتھ آپ لرز رہا تھا اور تامل ٹائیگر والی ہنسی کی جگہ چہرے پر ایک fixed معذرت خواہانہ مسکراہٹ ہمہ وقت موجود تھی۔

شریف صورت ساؤتھ انڈین اُس کے باپ تھے۔ کہنے لگے، ”اب یہ روبصحت ہیں۔ شکر ہے پروردگار کا۔ بڑا بچہ سترہ اٹھارہ برس کا ہو گیا ہے، ایک جگہ ٹائپسٹ لگ گیا ہے تو مالی پریشانیاں بھی کم ہوئی ہیں۔“

میں نے دیکھا، بجلی کے نپے تلے دو لیٹج سے جھٹکے دے کر اور strong کیمیکلز کے محتاط مگر مسلسل dosage سے تامل ٹائیگر کو زنجیر کر دیا گیا تھا۔ اُس کا بدن بحال ہو چکا تھا، وہ کھانا کھاتا، نہاتا، کپڑے تبدیل کرتا تھا۔ مگر بڑے میاں نے بتایا کہ پڑھ نہیں سکتا، ذہنی کام نہیں کر سکتا۔

میں نے سوچا اُس کا forte تو اُس کا لشکارے مارتا ذہن ہی تھا، ذہن نہیں رہا تو باقی جونچ رہا وہ سعید الدین احمد تو نہیں، ایک hulk ہے۔ ایک صحت یافتہ ویجی ٹیبل۔ میری دلچسپی ختم ہو گئی۔ جس طرح میری دل چسپی خود اپنی کہانی کے ایک کردار ناصر الدین ہمایوں میں ختم ہو چکی ہے۔

اونچے قد کا ٹھکے سفیدوں سفید ناصر الدین ہمایوں کا forte اُس کی حیران کن قوتِ مردی تھی۔ وہ ہر شب نشان زدہ گھروں میں سیڑھی لگا کر اتر جاتا اور نائسٹ بی بیوں کو deflower کرتا۔ کہانی کے کسی ناہنجار موڑ پر خداوندِ قدوس نے (Of course an act of God!) ایک پین لیس آپریشن کے ذریعے اُسے اُس کے خسیوں سے علاحدہ کر دیا۔ اب وہ صرف ایک half-witted non-entity اور ایک incommunicable hulk تھا... ناصر الدین ہمایوں۔

An idiot (mouth-fucked by an imbecile

Jaguar with much sound and fury)

Signifying nothing.

سعید الدین اپنی سوڈ کے بعد بیرونی محیط میرے لیے اعصاب شکن ہوتا جا رہا تھا۔ میں طوفان کے مرکز میں لوٹ آیا۔ وہاں کسی بھی فلم کو ایک بار دیکھتا، پھر اُسی کو دوسری بار دیکھنے کے لیے قطار میں لگ جاتا۔ بہت بے سمت وقت گزر رہا تھا۔ مگر میں پرسکون ہوتا گیا اور کسی عافیت کے بہلاوے میں دھیمہ ہوتا گیا۔

کہنے کو اب کچھ نہیں رہا، میں اپنے بیان کے اختتام پر ہوں اور طوفان کے مرکز میں۔



تو ہم مرکز میں تھے جو شانت اور تقریباً unruffled ہوتا ہے۔

مگر ابھی ہم وہیں تھے جو بیرونی محیط سے فیلڈ مارشل کا بیٹا کئی سو ٹرکوں کا جلوس لے کر بندر روڈ سے طوفان کے مرکز میں داخل ہوا اور اُسے درمیان سے قطع کرتا، unruffled دائرے کو توڑتا، میوزیکل فاؤنٹین کی طرف نکل گیا۔ طوفان کا مرکز اُتھل پتھل ہو گیا۔

وہ... جسے برسوں، گندھاروں بعد، سفید ریشمی واسکٹ کی اوپری جیب میں مرون کلر کا رومال اُس کے اسپیکر کی کرسی پر بیٹھنا تھا... بوڑھی فاطمہ جے پر اپنے پپا کی concocted فتح کا جشن مناتا، اپنے (سروس؟) ریوالور سے بے حساب گولیاں چلاتا، طوفان کے محفوظ دائرے کو ہمیشہ کے لیے دو نیم کرتا، سنسناتا ہوا، صاف نکل گیا۔ تیس ٹرکوں پر تو صرف اُس کے وہ کارندے سوار تھے جو بید کی گھومی ہوئی چھڑیوں سے ڈھول تاشوں پر ضربیں لگا رہے تھے کہ درگہ درگہ... درگہ درگہ... درگہ...

ہم سمجھ گئے کہ عافیت کا دائرہ اب کہیں نہیں رہا۔

اور عافیت ایک relative term ہے، اور جتنے دن بھی رہنا ہے براہِ راست سنسنائٹوں کے بیچ رہنا ہے۔

تو اب ہم وہیں ہیں۔

The fault, dear Brutus, is not in our stars

But in ourselves, that we

(bookworms etcetera)

are underlings.



سارنگ

نوعمر گریجانند گنیش نے پلے والا بٹن دبا دیا، سوئڈ پھیلا کر آسائش کی سانس لی اور اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں سامنے اسکرین پر جما دیں۔ دیولوک کے وشنو نرسری اینڈ کنڈرگارٹن وڈیالیے کا گروڈ آنے میں ابھی دیر تھی۔ لنچ بکس کا ڈھکنا کھولنے اور دو چار مودک... لڈو... لپیٹ لینے میں کیا لگتا، مگر گنپتی گنیش کو یاد آیا کہ مما قالین پر پڑے فوڈ کر مبز دیکھ کے چڑ جاتی ہے، ”کھا مکھا میں یل کرنے گی وہ۔“ اس نے ڈھکن لگا لنچ بکس توند پر سے پھسلا دیا اور اپنی چھوٹی چھوٹی آنکھیں اور چھاج ایسے کان پھر سے اسکرین کی اور کرلیے۔

فرش کے بیچوں بیچ ایک گدا پڑا تھا۔ کونے میں ایک مٹکا اور مٹی کا پیالہ دھرا تھا۔ کمرے میں اندھیرا تھا، پر سلاخیں لگے اونچے روشن دان سے اندر کچھ اُجالا پہنچ رہا تھا۔ گدے پر ایک یووک پڑا آرام کرتا تھا۔

دیکھتے دیکھتے یووک کسمایا اور کروٹ بدل کے اٹھ بیٹھا۔ سر جھٹک کے اس نے جماہی لی اور گھبرا کے کھڑا ہو گیا۔ ”ہے ماں! یہ کون جگہ ہے؟“

اس کی ماں وہاں نہیں تھی۔ کوئی بھی نہیں تھا جو جواب دیتا۔ یووک تیزی سے روشن دان والی دیوار تک گیا۔ دیوار پر ہتھیلیاں ٹکا کر اس نے سر اٹھایا، دھیمے اجالے کے اس ماخذ کو دیکھا اور چیخ کر بولا، ”کوئی ہے؟ ارے کوئی ہے؟“ پھر بڑبڑایا، ”کوئی بولتا ہی نہیں۔“ تھوڑی دیر بعد وہ پھر چیخا، ”یہ کون جگہ ہے بھائی! بتاتے کیوں نہیں؟“ کہیں سے کوئی آواز نہ آئی تو وہ گدے پر آ بیٹھا اور اپنی جانگھ کھجانے لگا۔

اسے کھجاتا دیکھ کے گجانن گنیش کی ہنسی چھوٹ گئی۔ وہ اپنی ران پر سوئڈ مار کے چنگھاڑا۔ کہیں سے عورت کی آواز آئی، ”کیا بات ہے؟ گجانن!“

”کچھ نہیں ماں! کچھ بھی تو نہیں۔“
پکارنے والی اُما تھی، شیو اردھانگی، ماں پاروتی۔

یووک نے جانگھ کھجانی بند کر دی۔ وہ اٹھ کے مٹکے تک گیا، پانی پی کے پھر گدے پر آلیٹا۔ اسے بھوک لگ رہی تھی۔

گریجانند گنیش نے سوئڈ سے اپنی توند سہلائی اور بڑبڑایا۔ ”بھوک تو مجھے بھی لگی ہے۔“
تھوڑی ہی دیر پہلے اس نے بھاری ناشتا کیا تھا۔

یووک کچھ دیر کو سو گیا، پھر جو اٹھا تو دن نکلنے والا تھا۔ روشن دان اور زیادہ اُجل گیا تھا۔ باہر سے کسی گاڑی کے بار بار سلف اٹھانے کی آواز آرہی تھی، انجن اسٹارٹ نہیں ہو پاتا تھا۔ بیٹری کم زور ہوگی۔

گنیش نے کان لگا کے سنا۔ یہ وِدیالیے کا گُرڈ نہیں ہو سکتا، اُس کے آنے میں ابھی دیری ہے۔ ٹھیک ہے نا، گاڑی کی آواز تو اسکرین سے آرہی ہے۔ اس نے پھر آنکھیں جما دیں۔

صبح سے دوپہر، دوپہر سے شام ہوگئی، کوئی نہ آیا۔ بہت بھوک ستاتی تو یووک اٹھ کے پانی پی لیتا، مگر خالی پیٹ تو پانی بھی تکلیف پہنچانے لگا تھا۔ یووک کی بیٹ بڑھتی جا رہی تھی۔

گنپتی گنیش نے جماہی لی اور صوفے کی پشت پر اپنا بازو پھیلا دیا۔ صوفہ چرچرا گیا۔

اچانک ہی یووک کے سرہانے کوئی چیز آگری۔ اس نے پہلے پہل توجہ نہ دی، پڑا رہا۔ پھر کچھ گرا۔ بہت ہلکی آواز تھی، شیشے کی کھنک جیسی۔ یووک نے سرگھما کے دیکھا۔ فرش پر سرخ شیشے کے ٹکڑے پڑے تھے۔ یہ کہاں سے آئے؟ اس نے سر اٹھایا، روشن دان سے اس کے دیکھتے دیکھتے چوڑی کا ایک اور ٹکڑا گرا۔ اُدھر کوئی ہے جو اشارہ دے رہا ہے۔ اس نے گدے سے اٹھ دیوار سے کان لگا دیے۔ ایک اور ٹکڑا گرا۔ اس نے دیوار پر تھپکی دی، جواب میں دوسری طرف بھی کسی نے ہاتھ مارا۔ آواز ہلکی تھی۔

آواز گنیش نے نہیں سنی مگر اس کی دلچسپی بڑھتی جا رہی تھی۔ اس نے پہلو بدلا۔ صوفہ پھر چرچرایا۔

یووک نے کھڑے ہو کے روشن دان کی طرف منہ کیا اور بولا، ”کون ہے؟ ارے، کون ہے اُدھر؟“ کوئی جواب نہ آیا۔ آہٹ بھی سنائی نہ دی۔ یووک نے دیوار پر پھر ہاتھ مارا، اُدھر سے بھی دیوار تھپکی گئی۔ یہ آواز بہت صاف تھی۔

”جے پر بھو!“ گجانن گنیش نے خوشی کا نعرہ لگایا۔ اس کی سمجھ میں آ گیا تھا کہ دوسری طرف بھی کوئی ہے۔

یووک نے پوچھا، ”کون ہو تم؟“ کسی نے سرگوشی کی، ”سور نہیں کرو... آہستہ سے بات کرو،“ یہ لڑکی کی آواز تھی۔ ہے مالک! روشن دان کے پار سے لڑکی بات کرتی ہے! ”کون ہو تم؟“ یووک نے پھر پوچھا۔ لڑکی نے کچھ کہا جو کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ ”پھر سے کہو۔ کیا کہہ رہی ہو؟“ ”میں ہوں۔ اُدھر ان کا کھانا بناتی ہوں۔“

یووک کھانے کا سن کے نہال ہو گیا۔ ”میں بھوکا ہوں۔“
”مجھے کھبر ہے۔“

”کچھ کھانے کو مل سکتا ہے؟“ یووک نے التجا کی، ”ذرا دیکھ کے بتاؤ۔“
”مسکل ہے۔ کہیں آ جا نہیں سکتی،“ وہ بولی، ”مجھے بھی تالے میں رکھتے ہیں۔ جب کھانا بنانا ہوتا ہے یا جب جرورت ہوتی ہے میری، تب لے جاتے ہیں۔“
”ضرورت؟ کیسی ضرورت؟“

”رتی کریا کے واسطے۔“

لڑکی کے منہ سے اتنے کھلے پن سے کہی گئی یہ بات یووک کو بری لگی تھی۔ وہ چپ رہا۔ لڑکی نے سنکوچ سے کہا، ”کچھ کھائے بنا تمہیں بڑا ٹیم گجر گیا۔ ہاں نا؟“
”ہوں۔“

”دیکھو، پکا نہیں کہتی، پر سیرے تمہارے واسطے کچھ لاؤں گی۔ کوسس کروں گی۔“
”سویرے؟ کل نا؟“
”ہاں۔“

وہ بڑ بڑایا، ”صبح میں ابھی بہت دیر ہے۔“
”ہوں۔“

”یہ تو بتاؤ، یہ جگہ کیا ہے؟“
”کار کھانا ہے۔“

”وہ تو ہے۔ دھام کون سا ہے؟“
”کھبر نہیں۔“

تھوڑی دیر بعد یووک نے پوچھا، ”اے، تمہیں کہاں سے لائے ہیں؟“
”کھبر نہیں۔“

”کیوں لائے ہیں تمہیں؟“

”بتلا تو دیا... کھانا بنواتے ہیں اور رتی...“

”اچھا اچھا،“ یووک نے اسے جملہ پورا نہ کرنے دیا۔ ”وہ تم سے کوئی بات چیت نہیں کرتے؟“

”کرتے ہیں، پر کم کم۔“

”ان سے پوچھنا، یہاں سے کہاں لے جائیں گے تمہیں... اور مجھے“

”نہیں بتائیں گے۔ مجھے ماریں گے۔“

”مارتے ہیں؟ کیوں؟“

”چپ! کوئی آ رہا ہے۔“

دوسرے کمرے کا دروازہ کھلا ہوگا۔ آواز اتنی ہلکی تھی کہ بہ مشکل سنائی دی۔ اُدھر کسی

مرد نے دھیرے سے کچھ کہا۔ لڑکی نے اونچی آواز میں پوچھا، ”کیا ہے رے؟“

مرد کی آواز آئی، گھوں گھوں گھوں۔

”پر کیوں؟“ لڑکی نے بگڑے تیوروں سے پوچھا۔

چٹاخ سے طمانچہ پڑا۔ یووک چمک گیا۔ اس کے سیدھے ہاتھ نے دیوار پر گھونسا بنا

لیا تھا۔ دوسری طرف سے اب ایسی آوازیں آرہی تھیں جیسے ہاتھ پائی ہو رہی ہو۔ کپڑے پھٹنے

کا چڑاٹا سنائی دیا اور لڑکی کی دبی ہوئی چیخ۔ یوں لگا جیسے اُسے فرش پر گھسیٹا جا رہا ہو۔ کوئی دروازہ

کہیں زور سے بند ہوا اور پھر سناٹا۔

یووک روشن دان کی طرف منہ اٹھائے یہ آوازیں سنتا رہا تھا۔ اُس کی گردن اکڑ گئی،

جسے سہلاتا ہوا وہ گدے پہ آن لیٹا اور آنکھیں بند کر کے کھانوں کے خواب دیکھنے لگا۔

گریجانند گنیش توند پر سونڈ پھسلاتے ہوئے میٹھے

مہکتے مودک کے بارے میں سوچ رہا تھا جو

پلاسٹک کے شوخ رنگ لنچ بکس میں رکھے تھے۔

وہ گوسوامی تلسی کی لکھی استی گنگنانے لگا

جس میں خود اُس کی مہما کا گن گان کیا گیا تھا

اور ان لڈوئوں کا ذکر تھا: مودک پر یہ مد منگل داتا،

مودک پر یہ... مگر فوراً ہی اُسے خیال آیا کی وہ

بھدی آواز میں گنگنا رہا ہے۔ وہ چپ ہو گیا۔

یووک کتنی ہی بار سویا اور جاگا تھا۔ صبح ہو چکی تھی۔ اندر دھوپ چلی آرہی تھی۔ کوئی

چیز نرم اور گرم روشن دان کے رستے یووک پر آن گری۔ وہ ہڑبڑا کے اٹھا۔ سمجھا ہوگا کوئی جانور

گرا ہے، مگر دوسری طرف سے دیوار پہ ہاتھ مار کے لڑکی نے پوچھا، ”مل گیا؟“

یووک نے سامنے پڑی چیز کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ یہ اُبلّا ہوا آلو تھا، خوب گرم۔ اُس نے چھیلنے کا بھی کشت نہ کیا، کھانے لگا۔

شاید اُس کا منہ جلا ہوگا تو یووک نے تکلیف کی آواز نکالی۔

لڑکی سمجھ کے ہنسنے لگی، بولی، ”ہیاری سے کھارے، گرم ہے۔“

”کرپا تمھاری، بڑی بڑی مہربانی۔“

”یہ اور لے،“ ایک اور آلو پھینکا گیا جو واپس اُدھر ہی گر گیا۔

لڑکی خوش دلی سے ہنسی۔ ”ٹھیر۔ پھر پھینکتی ہوں۔“ اس بار آلو سیدھا گدے پہ گرا۔

وہ بولی، ”پیٹ تو نہیں بھرے گا تیرا، پر پانی پینے جوگا ہو جائے گا۔“

”نہیں ٹھیک ہے،“ یووک نے کہا، ”ٹھیک ہے۔“

”سنو!“ دونوں ایک ساتھ بولے تھے۔ دونوں ہی ہنس پڑے۔

کچھ پیٹ میں پڑا تھا تو یووک ہنسنے جیسا ہو گیا تھا۔ بولا، ”نام کیا ہے تمھارا؟“

”روپکا۔“

”اہو!“ یووک نے حیرت کی آواز نکالی۔

”کیا ہوا؟“

”میرا نام روپ ہے۔“

”اررے! اچنبھے کی بات ہے... ہے نا؟“

”پر ٹھیک ہے،“ یووک نے بات بڑھائی، ”کوئی اتنی انوکھی بھی نہیں۔ میں روپ، تم

روپکا۔“ یہ کہہ کے وہ ہنسنے لگا۔

”گیتو!“ ماں پاروتی کی دلار سے بھری آواز آئی۔

گیتو رمے! جا تیرا گرڈ آگیا۔ جا، دیری نہ کر۔ پاروتی

نے گریجانند کو گیتو کہہ کے بلایا تھا... میرا دم

دار تارا! میری روشنی!

”ہہہ!“ گنپتی بیٹھے بیٹھے سو گیا تھا۔ جھٹکے سے

اٹھ کھڑا ہوا۔ باہر گرڈ رکا ہوا تھا۔ اس کی سن سن

سنائی دے رہی تھی۔ گنپتی گریجانند لنچ بکس اٹھا

کے بھاگا۔ مودک پر یہ مد منگل داتا... مودک پر یہ

مد منگل... اور تو اور، جلدی میں اس نے اسٹاپ والا
بٹن بھی دبایا تھا۔

آوازیں سنیں تو جگت ماتا پاروتی ٹہلتی ہوئی
آگئی۔ ودیالیے کا گرڈ گجانن کو لے کے جا چکا
تھا، اب کام کوئی نہیں تھا۔ گریجا مار اسکرین
کے سامنے صوفے پر آن بیٹھی۔

”روپکا!“

”روپ!... ہاں رے؟“ لڑکی کی آواز اب بہت ٹرس تھی۔

”میں سمجھا تم چلی گئیں۔“

”اب نہیں جاتی۔ اب کہیں نہیں جاتی۔ سنا تو نے؟“

”ہوں۔“

”اور یہ بھی سن لے۔ میں آؤں گی۔ ادھر تیرے پاس ہی آؤں گی۔“

مار پاروتی نے لمبی پتلی انگلیوں سے اپنے رخسار
چھوئے جو مہیشور شو شنکر کے خیال سے گلابی
ہوئے جاتے تھے اور تب رہے تھے۔ جے اماور!
جے دگمبر! جے مہیشور!

”ایسے کیوں ہنستی ہو؟“

”تیری عمر کتنی ہے؟“

”اٹھارہ کا ہوں۔“

”چھوٹا ہے نا۔“

”چھوٹا؟ تم کتنی بڑی ہو؟“

مہیشی کا دھیان ادھر نہیں تھا۔ یووک اور کماری
پہلے کچھ ایسا کہہ گئے تھے جو اس نے سنا نہیں
تھا، یا سنا ہو گا تو دھیان نہیں دیا۔ وہ سوچنے لگی،
پلٹ کے سن لوں۔ پر ایسا بھی کیا ہو گا۔ اما اب
سیدھی ہو بیٹھی۔ کماری سے یووک اس کی عمر
پوچھتا تھا۔

”سترہ برس کی ہوں میں، مگر...“
 ”اگر مگر کیا؟ چھوٹی ہو مجھ سے۔“
 ”میں نہیں، تو چھوٹا ہے۔ ابھی کچھ دیکھا ہی نہیں تو نے۔“
 ”یووک چڑ گیا۔ کہنے لگا، ”تم نے ایسا کیا دیکھ لیا؟“
 دیوار کی اوٹ سے آتی آواز میں دُکھ بھر گیا۔ ”بہت کچھ... جو تو دیکھ سہہ لیتا تو
 چودھے برس کی عمر میں ایک دم بڑھ جاتا... ایک ہی راتری میں۔“
 ”ایک ہی... رات... میں۔“ یووک نے ٹھہر ٹھہر کے دُہرایا۔
 دیوار کے پار اب وہ سسکیاں لیتی تھی۔ ”وہ اٹھانے آئے تھے مجھے۔ میں پکاری،
 بچاؤ، مجھے بچاؤ! کوئی ایک نہیں بولا۔ کوئی آگے نہیں آیا۔“
 یووک نے افسوس کی آواز نکالی، کہا کچھ نہیں۔
 اب جو وہ بولی تو آواز میں ایک ذرا ٹھہراؤ تھا۔ ”یہاں اس وقت جتنے ہیں، سب
 کی روٹی بناتی ہوں، چیرے دھوتی سکھاتی ہوں۔ روج رات میں دن میں، جی مرجی ہو، کھینچ
 لے جاتے ہیں۔ تین برس سے ایسا ہی ہے۔ ان سے پہلے دوسرے تھے۔ اُن سے پہلے
 دوسرے... سب سکتی مان، سبھی تاکت بر۔ جب تک جی کرتا ہے رکھتے ہیں۔ جی بھر جاتا ہے،
 کسی اور کے ساتھ ہنکا دیتے ہیں۔“ وہ روئے جا رہی تھی۔
 یہ کیا کر دیا میں نے؟ یووک دیوار سے لگا بیٹھا بدھا میں سر جھٹکتا تھا... چپ رہوں
 یا دلا سادوں اسے؟

وہ خود ہی چپ ہو گئی۔
 یووک دھیرے سے بولا، ”دکھ ہوا سب سن کے۔“
 لڑکی کی آواز میں چمک تھی۔ ”اررے سب چلتا ہے۔ تو دُکھی مت ہو۔ سال پیچھے
 سنا کے روئی ہوں۔“ اُس نے ہنسنے کی بھی کوشش کی تھی۔
 ”سال پیچھے کسے سنایا تھا؟“
 ”دیبا روں کو۔“
 یووک چپ ہو گیا۔
 لڑکی نے آواز دی، ”روپ!... روپمان!“

”ہوں۔“

”کوئی بات کر۔“

”بات؟... میں یہ بات بھولوں گا نہیں، جو تو نے کہی، بھولوں گا نہیں۔“

”کون بات؟“

”کہ روپکا کشت جھیلی ہے، مصیبت میں ہے۔“

”مصیبت تو روپماں اتنی دیر کی تھی، جتنی دیری تجھے سنایا۔ اب ٹھیک ہوں، پروا نہیں... پکی ہوگئی ہوں۔ ان چندالوں سے بدلہ بھی چکا لیتی ہوں اب تو۔“

”بدلہ؟ وہ کیسے؟“

”ابھی دو کو لڑا دیا نا۔ ایک نے ایک کے چھری مار دی۔ گاڑی ادھر تجھے لے کے آئی، ادھر اُسے لے گئی۔ بچے گا نہیں۔ گردن کی نڑی کٹ گئی ہے۔“

”کس طرح لڑا دیا؟“

”بس... لڑا دیا؟“

”بتاؤ نا، کیسے؟ کیا کیا تم نے؟“

”نہیں بتاؤں گی۔“

”روپکا! یہ کیا بات ہوئی؟ بھلا دوست نہیں ہیں ہم؟“

”دوس؟... دوس کا تو پتا نہیں... پر بتاؤں گی نہیں۔ بڑی بے سہمی کی بات ہے۔“

”تجھے تو بالکل نہیں بتانے کی۔“

”اچھا رہنے دو پھر۔“

”برا کیوں مناتا ہے؟... بس نا، کھتم کر۔“

”ہاں۔ ختم کر دیا۔ پر ایک بات ہے۔“

”کیا؟“

”انہیں پتا چل گیا کہ وہ روپکا کی وجہ سے جھگڑے ہیں تو برا حال کریں گے تمہارا۔“

”اور کیا برا کریں گے چندال؟ ویسے کسی کو مالم نہیں ہوئے گا کی جھگڑا کیسے، کس

وجہ سے ہوا۔“

”وہ پوچھ لیں گے۔ ایک تو زندہ بچا ہوگا۔ وہ جس نے مارا ہے۔“

”وہ نہیں بتائے گا۔ کوئی مرد ایسی بات نہیں بتاتا۔“

”کیا مطلب؟“

”میں نے بات وہ کہی کی دونوں لڑ پڑے، پر ایک نے دوسرے کو بتائی نہیں۔ چپ

کی... کھا موسیٰ کی بات ہے۔“

”خبر نہیں کیا کہہ رہی ہے!“

”اسی لیے کہا تھا ابھی تو چھوٹا ہے۔“

”چل پھر وہی مت شروع کر... جا سو جا۔“

”کھفا ہو گیا؟“

”نہیں نہیں، سوچتا ہوں تو پھر نہ رونے لگے۔ اب سو جا۔ میں تھک گیا ہوں۔“

”ہاں۔ تھک گیا ہے تو سو جا۔ دوس!“

”دیکھا! آخر تو نے دوست کہا نا مجھے۔“

لڑکی دیوار کے پار سے ایسے ہنسی کہ یووک کی کوٹھری میں بسنت آگئی۔

”دیکھا؟ دوست بنا لیا تجھے۔ مجھے دوست کہا نا تو نے؟“ یووک اتر کے بولا۔

وہ پھر ہنسی۔ ”وہ تو ایسے ہی کہہ رہی تھی... جو ووٹھ۔“

ماں جگدمبے نے سیس کا چندر کرن پشپ اُتارا اور

روپکا کی اور پھینک دیا۔

”یہ کیا تھا؟“

”کیا؟“ وہ کھلکھلا کے بولی۔

”جو ابھی دیوار کے پار تیری طرف گیا؟“

”چندر کرن پشپ۔ یہ تو نے پھینکا ہے نا؟“

”میں نے؟... نہیں تو۔“

”جیادہ مت اُتراؤ، جو ٹھے!“

شیو اردھانگی پاروتی ایک مند مسکان لیے اسکرین

پر نظر ڈالتی رسوئی میں چلی گئی۔ یہاں بہت

کچھ ہوتا رہا۔

یووک پوچھ رہا تھا، ”کیا بازار جا رہی ہے؟“

لڑکی بولی، ”ہاں بزار لے جا رہے ہیں سرے۔ ناج، مسالے کھتم ہو گئے۔“
 ”اچھا ہے، چلی جا۔ جتنی دیر یہاں سے دور رہے، اچھا ہے۔“
 ”دیر دُور کیسا۔ ادھر سے دُور اب نہیں رہنا۔ اور جو بڑیا جاؤں گی تو تو بھی سنگ
 ہوئے گا میرے۔“
 ”وہ کیسے؟“

”ہیا میں... ہیا سمرتا ہے؟... ہر دئے، دل۔“
 یووک ہنس پڑا، ”اہ!“
 ”ہنتا کیوں ہے؟ ایتبار نہیں؟“
 ”ہے۔ اعتبار ہے۔ اچھا بتا کیا لائے گی؟ میرے لیے بازار سے کیا لائے گی؟“
 لڑکی کچھ دیر سوچتی رہی، پھر بولی، ”سارنگ۔“
 ”سارنگ کیا؟“

وہ بولی، سب چیج۔
 ”کیا سب چیز؟“

”سن... سارنگ بولتے ہیں جب کسی اپنے کو دینا ہووے اور سمر نہیں آوے کی کیا
 دے۔ جی کرے اس دُنیا سنسار کی، برہمانڈ کی سب ہی چیج دے دیو۔ تبھی بولتے ہیں کی
 تیرے لیے سارنگ لاؤں گی۔“

”اچھا۔ پر یہ سارنگ ہوتا کیا ہے؟ چیز کیا ہے؟“
 لڑکی بولی، ”سب چیج! مکمل کا پھول سارنگ۔ کاجل، کپڑا، موتی، سونا، چراگ دیوا،
 یہ سب سارنگ۔ بانج، ہنس، مور، گھوڑا، سبھی سارنگ اور جیسا تو ہے باگھ، سیر... تو تو بھی
 سارنگ۔ تال، سنکھ، پیپہا، ہرنی، کویل... اے اے! تیرے کو کویل لا دوں؟ کو اُو، کو اُو... ہاں؟“
 ”باولی ہے تو تو۔“

”ابھی سن نا۔ سارنگ بولتے ہیں رات کو، چندرما کو، سور یہ کو، جمین کو، بھنورے کو،
 اور آکاس کو، کبوتر کو، ہل کو، راجے کو، سر کے چھتر کو اور تیرے چرن لگانے چندل کو۔“
 ”چندل؟“

”ارے ہاں نا۔ جسے صندل بولتے ہیں اور چڑیا بھی سارنگ ہے اور عورت بھی...
 عورت چے تیرے کو؟“

”ایک دم مستک الٹ گیا ہے تیرا!“
 لڑکی رو پڑی۔ ”ہاں رے روپ! مہادیو میرا ساشی۔ تو نے تو میرا مستک ہی الٹ
 دیا دے۔“

اور ٹھیک اُسی وقت ایک بھے انکر گتی سنائی دی۔
 مہادیو کا ڈمرو بجتا تھا۔ ایک دامن کی لشکارے میں
 یووک اور کماری کے بیچ کی دیوار ڈھہ گئی۔
 کوٹھری میں پڑے (کتنی ہی رتی کریائوں سے چکڑے)
 میلے کچیلے گدے پر باگھمبر بچہ گیا۔ جے ہو!
 روپ اور روپکا پہلی بار ایک دوسرے کے سامنے آئے۔

”تو روپ ہے؟“ لڑکی نے پوچھا۔
 ”اور تم روپکا... تم نرملا ہو اور اُجولتا بھی۔“
 ”میں چندالوں کی رکھیل روپکا۔“
 ”تم سستیہ ہو، شو اور سندربھی۔“
 ”میری جنگھاؤں کے بیچ اپوتر آگ کی دلدل ہے۔“
 یووک نے اُس کے دونوں ٹخنوں کو چھوا۔ ”تم لجاؤتی اور پوتر ہو اور نزل بھی۔“
 یووک نے اُس کے مستک کو ہاتھ لگایا۔ ”جے ہو!“
 لڑکی نے اُس کے چرن تھام لیے۔
 وہ اُسے باگھمبر پر لے آیا۔

کسی آخری نرتیہ کے پچھواڑے، جہاں کچھ نہیں
 بچا تھا، زانیوں چندالوں کا رستہ روکے ہوئے اب
 ایک نئی اور بے خوف زندگی سراٹھا رہی تھی۔
 روپ اور روپکا، کرونا مئے گریجا پتی مہیش کے
 باگھمبر پر تھے۔ دُنیا بھر کے مسلے مسلائے پڑے
 ہوئے یہ دِلت پُرش اور استری ملن کرتے تھے۔ ان
 کی دھمنیوں میں گریجا پتی مہیشور کے شوکت
 و جلال کا ڈمرو بجتا تھا۔



ایک سنجیدہ ڈی ٹیکٹو اسٹوری

مغلوں سے پہلے... اور اُن کے بعد بھی... ناپسندیدہ سلطان یا ناپسندیدہ سلطانہ سے پیچھا چھڑانے کی راست صورت یہی سمجھی گئی کہ ایک سوا ایک مروج طریقوں میں سے کوئی ایک استعمال کرتے ہوئے اُسے ہلاک کر دیا جائے... تلوار سے یا پھانسی دے کے، وِش کنیا سے ہم بستری کرا کے یا مور کے پر سے تلووں میں گدگدی کرتے ہوئے... جیسے بھی بن پڑے۔

ذاتی طور پر مصنف ان تمام ایک سوا ایک طریقوں کے حق میں ہے مگر کیوں کہ یہ کہانی مزاحمت کرنے والے کے نقطہ نظر سے سوچی گئی ہے، اس لیے فی الحال یہ مصنف رسمی معذرت پیش کرتے ہوئے کہانی سنانا شروع کرتا ہے۔

دریا خان حُجّاب دار پرانے وفاداروں میں سے تھا۔ وہ اقامت گاہِ سلطانی کے قریب کہیں رہتا تھا۔ ایک بار راستہ طے کرتے ہوئے دریا خان بازار کے بھیڑ بھڑکے میں پھنس گیا۔ اجناس کی منڈی کے اس ہجوم میں پھنس کے دریا خان حُجّاب دار نے عجب طرح کی بے بسی اور الجھن محسوس کی۔ اُسے دیر پر دیر ہو رہی تھی۔ یہ الجھن ایک آہستہ سلگنے والے غصے کی

شکل اختیار کرتی جا رہی تھی کہ اُس نے دوسری طرح سے یہ بات سوچی۔ اُس نے غور کیا کہ ناج منڈی کے جمال، گاڑیاں، بہلیاں اور گڈ اس کے راستے میں نہیں آرہے، وہ خود اُن کی راہ کھوٹی کر رہا ہے۔ 'یہ ان کا علاقہ ہے اور میں یہاں اجنبی ہوں' یہ سوچتے ہوئے اُس کے چہرے پہ مسکراہٹ آگئی۔ غصہ ٹل گیا۔

دریا خان کے لباس، اُس کی تلوار کے مرصع نیام یا دستار کے جواہر نگار جیغے پر جس بھی رنگیر کی نظر پڑتی یا جو بھی گاڑی بان اُس کی پر تکلف چال، سرخ و سپید رنگت اور بارعب چہرے کی جھلک دیکھ لیتا، وہ حیران اور مرعوب ہو کر راہ دے دیتا، گاڑی کی رفتار کم کر کے اُسے گزرنے کا موقع دیتا تھا۔

روز مرہ کے مفید کاموں میں مصروف ان سادہ، محنتی لوگوں کو اپنی موجودگی سے اس طرح ٹوکنا دریا خان کو اچھا نہ لگا۔ اُس نے چلتے چلتے ہاتھ بڑھا کر دستار کا زیور اتار لیا، اُسے اپنی جیب کے حوالے کیا۔ کمر کا دوپٹا کھول اُسے سر اور شانوں کے گرد اس طرح لپیٹ لیا کہ زردوزی کی جھلملاتی دستار اور گردن اور شانوں پر پہنے درباری نشان چھپ گئے۔ چہرے کا کچھ حصہ بھی بازار کے گرد و غبار سے اور سرسری دیکھنے والوں کی نظروں سے محفوظ ہو گیا۔ اُس نے آستین سے رومال کھینچ کر اُسے اپنی تلوار کے مرصع نیام پر لپیٹ لیا۔ اب چلتے پھرتے، قریب و دور کا کوئی بھی دیکھنے والا دریا خان کو دیکھ کے ٹھنکتا نہیں تھا۔ وہ خریداروں، بیوپاریوں، حمالوں کے ہجوم میں اب ایک عام سا رنگیر تھا جو اجناس کی منڈی میں اعتماد کے ساتھ راستہ طے کر رہا تھا۔

لوگوں نے اُسے دیکھنا بند کر دیا مگر ادھر ادھر نگاہ ڈالتے ہوئے خود دریا خان نے ایک ایسا شخص دیکھا جو اگرچہ عامیانہ پوشاک پہنے تھا مگر عامیوں میں سے نہ تھا۔ وہ اپنے نکلتے قد کے ساتھ کو بڑ نکال کے چل رہا تھا۔ دریا خان کو یوں لگا جیسے وہ بھی ہجوم میں گم ہونا چاہتا ہے اور یہ احساس ہوا کہ اسے کہیں بار بار دیکھا ہے... مگر کہاں؟ دارالحکومت میں؟ دربار میں؟ دریا خان نے اس کشیدہ قامت آدمی کو نہ صرف دیکھا تھا بلکہ دربار میں پیش بھی کیا تھا۔ ہاں! یہ پرتگالی طبیب زادہ ہے... بھلا سا نام ہے۔ الفانس؟ ناں... افانزو۔ مگر یہ اس وقت یہاں؟ اجناس کی منڈی میں؟

ایک حبشی جمال بڑا سا تھیل اٹھائے افانزو کے پیچھے پیچھے چلا جاتا تھا۔

دریا خان نے سوچا، عجیب بات ہے، جو شخص دیسی درباریوں کو خاطر میں نہ لاتا ہو وہ اس وقت اس حبشی جمال کے ساتھ خوب باتیں کرتا کہیں جا رہا ہے!... تو یہ کہاں جا رہا ہے؟ کہیں بھی جانے سے پہلے دریا خان اپنے تجسس کی تسکین چاہتا تھا۔ وہ دس قدم کے فاصلے سے افانزو اور جمال کے پیچھے چلنے لگا۔

جس شہر میں سلطان یا سلطانہ موجود ہوں، وہاں دیوانِ شرطہ کی ذمے داریوں میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہ بات مملکت کے میر تو زک اور دربار کے حُجّاب دار (یہ دونوں عہدے دریا خان کے پاس تھے) سے زیادہ کون جانتا ہوگا۔ دریا خان جانتا تھا کہ کتنے ہی مخبر اور پرچہ نویس ولایت 'الف' کی سرکار 'با' میں اس وقت زندگی کے ہر شعبے کی ہر عامی اور سرکاری سرگرمی کا مشاہدہ کر رہے ہوں گے اور ڈاک چوکی کے تیز رو نظام کو لیاقت سے استعمال کرتے ہوئے آس پاس کے احوال سمیت اپنے مشاہدات دروغہ ڈاک چوکی کی وساطت سے خود سلطان والا جاہ یا سلطانہ معظمہ تک پہنچاتے ہوں گے۔ مگر دریا نے یاد کیا کہ سلطان کچھ عرصے سے علیل ہیں، اس لیے بے شمار پرچہ نویسوں کی بھیجی ہوئی بے حساب خبریں خود اُن کے ملاحظے میں نہیں آرہیں۔ پھر بھی دیوانِ وزارت آٹھوں پہر بیدار رہنے والا محکمہ تھا تو اس کے ہوتے دریا خان کو ڈاک چوکی کے فرائض ادا کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ تاہم ایک غیر معمولی بات مشاہدے میں آگئی ہے، اس لیے جاننا ضروری ہے کہ یہ شخص افانزو آخر اس وقت جاتا کہاں ہے۔ تجسس دور کر کے دریا اپنی راہ لے گا۔ اگر کوئی غیر معمولی بات اس بارے میں اُس کے مشاہدے میں آئی تو شخصہ کو بلوا کے اس کے علم میں لائے گا، ورنہ سمجھے گا کہ یہ نصف ساعت بازار میں ضائع ہوئی۔

افانزو اور وہ حبشی نارجیل فروشوں کے کوچے کی طرف مڑ گئے۔ یہاں دکانوں پر تازہ سبز کھال کے نارجیل لٹکے تھے۔ کہیں پختہ کتھی رنگ اور گھنی جٹا والے نارجیل کسی شیطانی جنگ و جدال کے بعد بنائے گئے سروں کے میناروں جیسے سجائے گئے تھے تو کہیں مونجھ نوچ لیے جانے کے بعد وہ لکڑی کی بیضوی گیندوں کی طرح پڑے لڑھکتے تھے۔ کسی دکان دار نے نارجیل کا کاسہ توڑ کے اور تازہ کھوپرے کو قاشوں میں تراش کے یہ دکھانے کے لیے انھیں طشتوں میں سجا دیا تھا کہ اُس کے پھل تازہ اور فرہ ہیں۔

دریا خان یہی سب دیکھتا اور دکان داروں کے آوازے سنتا آ رہا تھا کہ اچانک

سامنے کوئی کش مکش اور ہیجان سانسائی اور کھانسی

ہوا یہ تھا کہ بے ڈھنگے پن سے چلتے ہوئے افانزو کے ساتھی حبشی نے اپنا تھیلا سبز نار جیلوں کی ایک سجاوٹ سے ٹکرا دیا تھا۔ تھیلا اُس کی گرفت سے چھوٹ کے زمین پر آواز کے ساتھ گرا تھا اور کھڑ بڑ کرتی بہت سی چیزیں تھیلے سے باہر جا پڑی تھیں۔ تانبے کے قلعی کیے ہوئے کٹورے، بادے، طشتریاں، قاشق، چمچے سب طرف بکھر گئے تھے۔ دریا خان ٹھہر گیا۔ افانزو سخت پریشان اور برہم ہوا، اُس نے طیش میں حبشی کی کمر پہ لات ماری اور اپنی زبان میں بک جھک کرتا اکڑوں بیٹھ کے برتن سمیٹنے میں حبشی کا ہاتھ بٹانے لگا۔

تھیلے کا ٹکرانا، برتنوں کا بکھر جانا، ایک اعتبار سے غیبی امداد تھی۔ یوں لگا جیسے قدرت خود دریا خان کی مدد کر رہی ہے۔ وہ جاننا چاہتا تھا کہ حبشی کے تھیلے میں کیا ہے اور اب اس نے دیکھ لیا تھا۔ یہ کسی باحیثیت گھر کے برتن تھے۔ تاہم ایک بات طے تھی کہ یہ افانزو کے گھر کے برتن نہیں تھے۔ نہ ہی یہ عریقات اور سفوفوں، معجونوں کے ظروف یا طبیبوں کی دوا سازی میں کام آنے والے قرا بے اور بادے تھے۔ پھر سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا افانزو انھیں قلعی کرانے لیے جاتا ہے؟ مگر یہ تو تازہ قلعی سے چمچا رہے ہیں اور دستور یہ ہے کہ قلعی گروں کے پاس برتن بھانڈے نہیں لے جائے جاتے، وہ خود مکانوں پر پہنچ کر قلعی کرتے ہیں۔ یہ برتن نئے خریدے ہوئے بھی نہیں تھے... یہ اگر ابھی خریدے گئے ہیں تو اجناس کی منڈی میں ان کا کیا کام؟ ٹھیکروں، کسپروں کا بازار تو کسی اور ہی طرف ہے۔ دریا خان پہلے سے زیادہ الجھ گیا۔ بھلا الجھنے کی بات نہیں تھی؟ افانزو کا ٹھکانا اقامت گاہ سلطانی کے قریب دریاے یزد کے رخ پر ہے تو پھر راہ سے بے راہ یہ برتن اٹھوائے کہاں جا رہا ہے؟

حبشی نے برتن سمیٹ کے دوبارہ تھیلے میں بھر لیے تھے اور اب وہ زیادہ احتیاط اور مستعدی سے افانزو کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ دریا خان نے ان دونوں کے پیچھے چلتے ہوئے برتنوں کی اقسام اور اُن کی تعداد پر پھر غور کیا۔ سب برتن وہ تھے جو کھانا نکالنے، پیش کرنے میں استعمال ہوتے ہیں، ان میں ایسا کوئی برتن نہ تھا جو کھانا پکانے میں کام آتا ہو۔ دریا خان نے سوچا، سبحان اللہ! یہ میں کو تو ال کے مخبروں، دیوان شرطہ کے دانش مندوں کی طرح برتنوں کی گنتی کیوں سلجھا رہا ہوں؟ راستے کی تھکن اور بھوک کا تو واللہ مجھے خیال ہی نہ رہا۔ اس پر تگالی طبیب بچے سے فراغت ہو تو کچھ زہر مار کروں۔

نار جیل فروشوں کا کوچہ ختم نہیں ہوا تھا کہ دیوان شرطہ کے دو اہل کار پٹکے باندھے،

کمر کسے، سامنے کوچے میں داخل ہو گئے۔ افانزو نے اپنے حبشی سے زربلب کچھ کہا اور خود اُس نے ایک محراب کی اوٹ لے لی۔ دیوانِ شرطہ کے اہل کار دریا خان کو توجہ سے دیکھتے ہوئے اس کے برابر سے نکل گئے۔ اُن کے ہجوم میں غائب ہوتے ہی افانزو نے محراب سے سر نکال کے جھانکا اور دُور تک نظر ڈالی۔ دریا خان مڑ کے ایک نارجیل فروش سے سودے کے دام پوچھنے لگا تھا مگر اُس کا دھیان دکان دار کے جواب پر نہ تھا، جس نے کچھ کہا تھا۔ دریا خان انکار میں سر ہلاتا افانزو کے پیچھے چل پڑا۔ پرتگالی طبیب زادے نے قدم بڑھا کے حبشی جمال کو جالیا تھا۔ ”طبیب زادہ قانون کے خلاف کسی کام میں پڑا ہے جبھی دیوانِ قانون کے اہل کاروں سے چھپتا ہے۔ اب میں اس کا پیچھا نہیں چھوڑنے کا۔“

نارجیل فروشوں کے کوچے سے نکل کر حبشی اور افانزو روغن فروشوں اور نانباہیوں کے علاقے میں پہنچ گئے تھے۔ یہاں ایک حقیر سے قہوہ خانے کے پاس وہ دونوں ٹھہر گئے۔ حبشی قہوہ خانے کے مالک سے کچھ کہتا رہا، وہ سر ہلا کے انکار کرتا تھا، مگر جب افانزو نے اپنی پہنی ہوئی انگشتی اتار کے اُسے دی تو قہوہ خانے کا مالک پہلے تو الٹ پلٹ کر اسے دیکھتا رہا، پھر دونوں کو اندر دکان میں بلا لیا اور خود وہ انگشتی جیب میں ڈال، ایک طرف کوروا نہ ہوا۔

افانزو نے قہوہ خانے کی یکدہری میں جا بیٹھنے سے پہلے دُور تک کوچے میں نظر ڈال کے اپنا اطمینان کیا تھا۔ دریا خان اُس کا ارادہ بھانپ کے پہلے ہی ایک روغن ساز کے کارخانے میں داخل ہو گیا تھا جہاں روغنوں کے بھاؤ پوچھتا اور عدم اطمینان ظاہر کرتا وہ گھومتا رہا۔

کچھ وقت گزر گیا۔ آخر قہوہ فروش اپنی دکان میں واپس آیا اور افانزو کو وہ انگشتی لوٹا کر اُسے اور حبشی کو اپنے ساتھ لیے چل پڑا۔ دریا خان نے روغن فروش سے پیچھا چھڑانے کو یہ کہا کہ میں دام سے خوش نہیں ہوا، مال بہ ہر حال اچھا ہے، کیوں نہ ایک دو دکانیں اور دیکھ لوں۔ یہ کہہ کہ وہ افانزو اور اس کے ساتھیوں کے پیچھے روانہ ہو گیا۔

دریا نے دیکھا، وہ لوگ کچھ دُور ایک چوڑی گلی میں داخل ہو گئے ہیں۔ دو چار بڑے پھاٹکوں والے مکان چھوڑ وہ ایک غیر معمولی بلند دروازے تک پہنچے۔ یہ کسی باختیار معزز کا مکان ہوگا، کس لیے کہ اتنا بلند دروازہ فیل نشین ہی بنواتے ہیں۔ تاہم مکان پر ایک عام خستہ حالی چھائی ہوئی تھی۔ قہوے فروش نے دروازے پر خفیہ دستک دی ہوگی یا شاید روزن سے انھیں کوئی دیکھتا ہوگا، جو خاموشی سے دروازہ کھل گیا اور وہ تینوں مکان میں داخل ہو گئے۔

دروازہ بند کر لیا گیا۔

دریا خان کے لیے یہ وقت بڑے اضطراب کا تھا۔ وہ بہ زور اس مکان میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ شور شرابا سن کے افانزو کسی اور راستے سے نکل جاتا اور ساری محنت اکارت ہوتی۔ دریا خان نے آس پاس کے مکانوں اور گلیوں کا جائزہ لیا۔ بازار کی عمومی سرگرمی جاری تھی۔ کسی نے دریا خان کو یا افانزو اور اس کے ساتھیوں کو نظر اٹھا کے بھی نہ دیکھا ہوگا۔ اُس نے سوچا، وہ کیا کرے؟ کیا دیوان شرطہ سے مدد لے؟ مگر دریا خان اپنے مستقر سے دُور تھا اور وہ دربارِ سلطانی میں اپنے ہم چشموں، ہم رتبہ امیروں کے تمسخر کا نشانہ نہیں بننا چاہتا تھا۔ 'میرے پاس کہنے کے لیے پوری بات اور کوئی واضح الزام تو ہونا چاہیے۔ صرف شک شبہ سے تو کام نہیں چلتا۔'

دریا خان نے کوچے پر نظر ڈالتے ہوئے اس بات کا مشاہدہ کیا تھا کہ اس بڑے رستے اور متصل گلیاروں میں نان بابی، شیر فروش، باورچی بہت سے تھے مگر قہوہ فروشوں کی صرف دو ہی دکانیں تھیں۔ ایک دکان تو وہی تھی جس کا مالک افانزو کو ساتھ لے گیا تھا، دوسری ایک درخت کی اوٹ لیے جیسے بازار میں جھانکتی دکھائی پڑتی تھی اور بہت حقیر اور خستہ حال تھی۔ اس وقت وہاں گاہک کوئی نہیں تھا۔ خیال ہوتا تھا کہ کچھ دیر سے ادھر کوئی آیا بھی نہیں۔ ایک بوڑھی عورت کونے کی انگیٹھی پر کیتلیاں جمائے اور تختے پر فغان اوندھائے حقارت کے ساتھ ہر آتے جاتے کو دیکھتی تھی۔

دریا خان نے اندازہ لگایا کہ اگر کوئی اس کی مدد کر سکتا ہے تو یہی عورت کر سکتی ہے۔ اُسے قیافہ شناسی میں دعویٰ تو نہیں تھا تاہم انتظامی امور میں ایک تجربہ ضرور تھا، جس نے آگاہ کیا تھا کہ ایک کوچے میں ایک ہی طرح کا کاروبار کرنے والے دو دکان داروں میں رقابت تو ہوگی۔ دیگر یہ کہ بڑھیا کا دھندا بہت مندا چل رہا ہے، اسے عام گاہکوں سے شکوہ بھی ہوگا اور سامنے یک درے میں دکان سجائے جو ملعون رقیب بیٹھا ہے، اُس سے تو وہ باقاعدہ نفرت کرتی ہوگی۔

دریا خان نے خود پر جھنجھلاہٹ طاری کی، بڑبڑاتا ہوا بڑھیا کی خالی دکان میں داخل ہو، پاپوشیں اتار، گاہکوں کے چبوترے پر جا بیٹھا۔ عورت نے پیروں سے شروع کر کے دستار کے طرے تک دریا خان کا جائزہ لیا۔ وہ پاپوش سے بندھی قیمتی مہمیز اور پوشاک کی عام نفاست دیکھ کے متاثر ہوئی تھی مگر عادتاً اتنی تلخ مزاج تھی کہ لگتا تھا دریا خان جیسے معزز گاہک کو

بھی خاطر میں نہ لائے گی۔ خاموشی سے خان کا چہرہ دیکھتی رہی۔ دریا خان نے سوچے سمجھے طریق پر عمل کرتے ہوئے کہا، ”تجھے بھی کہیں جانا ہو تو چلی جا۔ میں انتظار کر لوں گا۔“ اُس نے یہ ظاہر کیا تھا جیسے وہ سامنے والے قہوہ فروش سے ناراض ہو کے یہاں آیا ہے۔ عورت گاہک کے جھنجھلانے پر حیران ہوئی۔ وہ سمجھتی تھی جھنجھلانے کا حق اسی کا ہے۔ حیرت سے اپنے اس گاہک کا چہرہ دیکھتے ہوئے بولی، ”مجھے کہیں نہیں جانا... کہو کیا چاہیے؟“

”قہوے اور چار طرف بھنھناتی مکھیوں کے سوا تیرے پاس ہے کیا؟“

بات درست تھی۔ عورت نے مصالحت کے انداز میں چھوٹی سی کیتلی کو انگاروں پر ادھر ادھر جمانے کی کوشش کی۔ بولی، ”یہ تم ٹھیک کہتے ہو۔ ویسے اگر کچھ کھانا چاہو گے تو مشہدی قاسم کی دکان سے تازہ پنیر لادوں گی مگر اُسے دینے کے لیے میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ تمہیں پہلے پیسے دینے ہوں گے۔“

دریا خان بھوکا تھا۔ اُس نے سوچا، کیا حرج ہے، پنیر اچھا ہوا تو کھالوں گا ورنہ غریب بڑھیا خود بھوک لگتی ہے، وہ کھالے گی۔ اُس نے جیب سے چمڑے کی تھیلی نکالی اور دو دام لے کے بڑھیا کی طرف بڑھا دیے، جب کہ پنیر، قہوے اور بہت سی چیزوں کے لیے ایک ہی دام کافی ہوتا۔ بڑھیا حیرت اور جھنجھلاہٹ میں سے کسی ایک کا انتخاب نہ کر سکی۔ ملی جلی کیفیت میں بولی، ”ایک ہی بہت ہے۔“

”رکھ لو،“ دریا خان نے ہلکے غصے میں کہا، ”بد دیانت قہوہ فروشوں کے کوچے میں خود کو زیادہ اعتبار کا ثابت نہ کرو۔ رکھ لو!“

عورت پہلی بار گاہک سے خوش ہو کے بولی، ”آغا! مجھے مرنے کے بعد خدا کو منہ دکھانا ہے۔ کوچے کے شیاطین سے مجھے کیا سروکار!“ اور وہ تیزی کے ساتھ قہوے خانے سے نکل گئی۔ اُس نے سوچ لیا تھا کہ واپس آ کے اس اپنے منحوس رقیب قہوہ فروش کے خلاف ضرور کچھ کہے گی۔ یہ گاہک اُس کے مزاج کا آدمی لگتا ہے۔

وہ لوٹی تو کیلے کے دھلے ہوئے تروتازہ پتے میں لپٹا پنیر کا بڑا سا ٹکڑا اور ایک صاف ستھرے نئے کوزے میں پانی لائی تھی۔ کہنے لگی، ”تم جیسے سردار، ملک التجار کے لائق پانی کا برتن نہ تھا، تو مشہدی قاسم سے کورا کوزہ مانگ لائی۔ لو کھاؤ، میں ابھی قہوہ بناتی ہوں۔“

دریا خان نے ابھی کھانا بھی شروع نہیں کیا تھا کہ بڑھیا نے جلے دل کے پھپھو لے

پھوڑنا شروع کر دیے۔ بولی، ”میں تو کہتی ہوں اُس منحوس قزاق سے ہم غریبوں کا مقابلہ نہ کیا جائے تو اچھا ہے۔ کوئی ایک کاروبار تو ہے نہیں اُس کا۔“ بڑھیا فقرہ پھینک کے گاہک کا تجسس ابھارتا چاہتی تھی... مگر دریا خان کو صحیح وقت کا انتظار تھا۔ کہنے لگا، ”معلوم ہے، معلوم ہے... میں اُس کے کرتوت خوب جانتا ہوں، مگر مجھے کیا۔ اب تو چھ ماہ بعد ادھر آنا ہوگا، وہ جانے اور اُس کے اعمال۔“ بوڑھی عورت نے اثبات میں سر ہلایا مگر یہ سوچ کے پریشان ہو گئی کہ گاہک کو معلومات کے اس ذخیرے سے کوئی دلچسپی کیوں نہیں جو اُس کے سینے میں محفوظ ہے۔

”پنیر اچھا ہے... میں سمجھتا ہوں تو قہوہ بھی اچھا دے گی۔ کم سے کم سامنے والے اُس... اُس لا پروا آدمی سے تو اچھا قہوہ بناتی ہوگی۔“

”میں بازار کی سب سے اچھی دکان پہ نہیں بیٹھی، مگر قہوہ تمہیں اچھا پلاؤں گی۔“ قہوہ سامنے آیا تو دریا خان پوری طرح تیار تھا۔ بولا، ”میں اسے توجہ اور یکسوئی سے تیار کیا ہوا قہوہ کہوں گا۔ تو نے اپنے کام پر دھیان دیا ہے اور دیکھ لے کیسا اچھا قہوہ بنایا ہے۔ بے شک تو انعام کی حق دار ہے۔“ دریا خان نے چاندی کا ایک سکہ نکال بڑی بی کی طرف اچھال دیا۔

بڑھیا غریب نے کبھی، کسی اچھے موسم میں چاندی کا سکہ دیکھا ہوگا! وہ حیرت اور شکر گزاری میں ہکلا نے لگی اور بے رُکے دریا خان کو دعائیں دینے لگی کہ آغا! خدا تجھے یوں رکھے اور یہ عطا کرے اور وہ دے۔ دریا خان اٹھ کھڑا ہوا، پاپوشیں پہنتے ہوئے بولا، ”جاتا ہوں... اور اگر وہ سامنے والا خبیث اپنی دلالی سے لوٹا مجھے مل گیا تو کہیں سے تازیانہ لے کے اُسے اتنا پیٹوں گا کہ...“

”آغا! تم نے دلال اچھا کہا... وہ ملعون اس جہنمی جادوگر کا دلال ہی تو ہے۔ گاہک لاتا ہے اس کے پاس۔“

دریا خان نے پاپوشیں پہننے میں دیر کر دی۔ چاندی کا سکہ نتائج لا رہا تھا۔ اُس نے بڑھیا کو دیکھا، اثبات میں سر ہلایا، بولا، ”جانتا ہوں، جانتا ہوں۔ یہ تو مجھ سے کہہ رہی ہے؟ اُس بد انجام سامری کے چکر میں تو اُسی نے مجھے پھنسایا تھا۔ کہتا تھا آغا! کینز تمھاری مطیع فرماں برداری ہو جائے گی۔ ایسا عمل کرادوں گا اُس بد قماش سے کہ...“

”عمل؟“ عورت حیران ہوئی تھی، ”اے یہ مردہ عملیات کب سے کرنے لگا؟ اُسے

شیطانی دوائیں تیار کرنے سے ہی فرصت کہاں ملتی ہے جو عملیات اور حضرات کرے گا۔“
دریا کو مایوسی ہوئی۔ افانزو اور اُس کا حبشی دواؤں کے لیے اس مکان میں گئے
ہیں۔ ظاہر ہے یہ پرتگالی علم طب کی تعلیم کے لیے یہاں آیا ہے، مددگار طبیب ہے۔ افسوس
دریا خان نے پوری ایک ساعت کسی ایسے نا تجربہ کار نو جوان کی طرح گزار دی جس کا ذہن
اوہام سے اور خیالی داستانوں سے خوب مشتعل ہو۔

وہ مایوسی اور خفت میں دکان سے چلنے کو ہوا کہ بڑھیا نے، جو کچھ نہ کچھ بولے جا رہی
تھی، کہا، ”تم شاید اس قظامہ سے نجات حاصل کرنا چاہتے ہو... اپنی کنیر سے؟“
”ہاں، ہاں،“ دریا نے یوں ہی سر ہلا دیا۔

”یہ خبیث سب طرح کے زہر تیار کرتا ہے۔ کام میں فرد ہے اپنے۔“
”زہر!“ دریا خان رک گیا۔

شاید وہ ٹھیک جگہ آیا ہے۔ شاید صحیح طور پہ کلام کر رہا ہے۔ اُس نے محتاط انداز میں
گول مول بات کی، بولا، ”ہاں، یہی عمل کرایا تھا۔ کچھ بھی نہ ہوا۔“
عورت رازدارانہ دریا کے قریب پہنچی اور دھیرے سے کہنے لگی، ”ایک بات آغا،
میں خدا لگتی کہوں گی! اس منحوس کے تیار کیے زہر اپنا اثر دکھائے بغیر نہیں رہتے۔ آج نہیں تو
ایک ماہ بعد، چھ ماہ بعد، وہ مُردی ختم ضرور ہو جائے گی۔ کنیر تمہاری بچے گی نہیں۔“ پھر وہ فوراً
ہی پوچھنے لگی، ”کس طرح کا دیا تھا اس نے؟ کھانے کا؟ سو گھنے کا؟“
”سو گھنے کا؟“ دریا خان نے بناوٹ کی حیرت ظاہر کی۔

”کیا سمجھتے ہو؟ یہ ایسا زہر بھی تیار کر سکتا ہے جو رنگ کے ساتھ لباس میں سرایت کر
جائے اور پہننے والے کو آٹھ دس روز میں ختم کر دے۔“

دریا خان کا دل بہت زور سے دھڑکا۔ ”کیا ایسا زہر بھی جو برتنوں میں پیوست کیا
گیا ہو؟ اور پھر جب ان برتنوں میں کھایا پیا جائے تو...؟“

”کیوں نہیں آغا! یہ منحوس سب طرح کے کام ہاتھ میں لیتا ہے۔ طاق ہے اپنے

ہنرمیں۔“

مسندِ عالی دریا حُجّاب دار نے چاندی کا ایک سگہ بخش کے بڑھیا کو اپنا مطیع کر لیا تھا۔
وہ سامری منحوس کے بارے میں تفصیلات بتانے پر آمادہ تھی۔ ہر چند کہ اُس کا کاروبار بڑھیا

کے کاروبار سے جدا تھا، دونوں میں براہِ راست کوئی ٹکراؤ نہ تھا۔ بڑھیا نے بتایا کہ اُسے تو اس بات کا غصہ ہے کہ وہ اُس کے رقیب قہوہ فروش سے دلال کا کام لیتا ہے، اُسے اپنی جیب سے حقِ محنت دیتا ہے۔ بڑھیا کو یقین تھا کہ قہوہ فروش گاہوں سے بھی کچھ نہ کچھ ہتھیا لیتا ہوگا۔ دونوں ہاتھوں سے پیسا کھینچ رہا ہے نافر جام۔ قہوہ فروش کو خود کیا محنت پڑتی ہوگی، اُس نے شہر بھر کے آوارہ گرد نکتموں سے کہہ رکھا ہے کہ وہ اپنی آنکھیں کھلی رکھیں۔ ایسوں کو پہچان کے خبر کر دیں جنہیں دشمنوں کو چپ چاپ تے ٹھکانے لگانے کی ضرورت ہے۔ آوارہ گرد نکتے ایسے لوگوں کا پتا نشان قہوہ فروش کو بتا کے آدھی رات کو بھی اپنا انعام لے سکتے تھے۔ قہوہ فروش ضرورت مندوں کے بارے میں پہلے کچھ دوسروں سے مدد لے کے اطمینان کر لیتا ہے کہ سودا طے ہو سکتا ہے، کوئی خطرے کی بات نہیں۔ پھر وہ ضرورت مندوں سے مل کے تفصیل سمجھتا اور زہر فروش سے پوچھ کے رقم بتا دیتا ہے۔ بڑھیا کا خیال تھا، مردود اس رقم میں بھی الٹ پھیر کرتا ہوگا۔

دریا خان بڑھیا سے یہ سن کے بہت پریشان ہوا کہ سامری وہ زہر بھی تیار کرتا ہے جو کھانے کے برتنوں میں سرایت کر جائے اور جب اُن برتنوں میں کھانا اُتارا جائے تو زہر اپنا کام دکھا دے... کھانے والا ہلاک ہو جائے۔ دریا نے افازو کو برتن لے جاتے دیکھا تھا۔ خدایا! اگر یہ برتن سلطان والا جاہ کے استعمال کے ہوئے؟ اللہ رحم کرے!

دریا خان دل کی پریشانی میں دوبارہ چبوترے پر بیٹھ گیا۔ دستار کے پیچ ڈھیلے کر پھر سے باندھنے لگا۔ ”سلطان کو اور سلطانہ کو مالک سلامت رکھے۔ کیسی الجھن کی بات سامنے آئی ہے۔“ دریا نے افازو کو برتن لے جاتے دیکھا تھا۔ یہ طبیب زادہ اقامت گاہِ سلطانی کے قریب رہتا ہے۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ سلطان اور سلطانہ کے استعمال کے برتن ہوں جنہیں یہ حرام خور اُس سامری نابکار سے مسموم کرانے لے جا رہا ہو؟ اللہم! فوری طور پر کچھ کرنا از بس ضروری ہے۔

دریا خان نے سوچا، اگر زہر ساز کے مکان کا یہی ایک دروازہ ہے (جس کا کہ امکان کم ہی ہے) تو افازو اُس کے علم کے بغیر یہاں سے نہیں نکل سکتا۔ اگر کوئی اور دروازہ بھی ہے اور طبیب زادہ یہاں سے نکل کے اپنے شیطانی سامان کے ساتھ سلطانی اقامت گاہ تک پہنچ جاتا ہے تو دریا خان کو کچھ اور کرنا ہوگا... وقت بالکل نہیں ہے۔

تاہم عورت کو مدد دینے پر آمادہ کرنے میں کوئی زیادہ محنت نہ لگی۔ دریا خان نے کہا،

”میں تجھے انعام دوں گا، اتنا کہ تو سوچ بھی نہیں سکتی۔“

بڑھیا کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ وہ محسوس کر رہی تھی کہ اُس کا نصیب پلٹنے میں اب دیر کوئی نہیں۔ بولی، ”آغا! حکم کرو، میں حاضر ہوں۔“

دریا بولا، ”مجھے اس مکان کے بارے میں بتا اور زہر ساز کے بارے میں بھی، اور یہ بھی سمجھا دے کہ مکان میں جلد اور خاموشی سے کیوں کر داخل ہوا جائے۔“

لاچ اپنی جگہ، مگر بڑی بی چکنی گولیاں نہیں کھیلی تھی۔ اپنا اطمینان کرنا چاہتی تھی کہ یہ آغا کہیں دیوانِ قانون کا کوئی عہدے دار تو نہیں ہے۔ کہنے لگی، ”عالی جاہ! میں بہت غریب مسکین بد حال عورت ہوں۔ کوئی بیٹا نہیں جو اس عمر میں میری کفالت کرے۔ آپ بے شک انعام اکرام دو گے، سخی معتبر ہو، لیکن ایک بات قرآن کو بیچ میں لا کے کہو کہ دیوانِ شرطہ کے الجھیٹے میں تو مجھے نہیں ڈالو گے؟“

دریا نے کہا، ”بالفعل دیوانِ شرطہ بیچ میں آیا بھی تو میں قسم کھاتا ہوں، تجھے گزند نہ پہنچنے دوں گا۔ وہ لوگ سبھی تجھے انعام ہی دیویں گے۔ تو بے خدشے میرا ساتھ دے۔“

بڑھیا کہنے لگی، ”یہ تو کہو تم دیوانِ قانون کے عہدے دار، قاضی سر رشتے دار تو نہیں ہو؟“

دریا خان کو الجھن ہونے لگی، ”اگر ہوا بھی تو تیرا کیا نقصان؟“

بڑھیا بولی، ”میرے دس دشمن، دس دوست ہیں۔ گڑے مردے اکھڑنا شروع ہو گئے تو مجھ غریب کا اللہ ہی والی ہے۔“

دریا خان سمجھ گیا تھا کہ خود بڑھیا کے ہاتھ صاف نہیں ہیں اسی لیے ڈرتی ہے۔ کہنے لگا، ”میں سمجھ گیا۔ لے، میں قسم کھاتا ہوں کہ دیوانِ قانون سے میرا کوئی تعلق نہیں ہے اور آج سے پہلے چاہے تو کچھ بھی کرتی رہی ہو، میں تیری گردن کہیں پھنسنے نہیں دوں گا۔ بے فکر رہ... میری پہنچ دُور تک ہے۔“

”آغا سردار! تمھاری شوکت اور دبدبے کو خدا دس گنا بڑھائے۔ مجھے یقین آ گیا۔“

لو اب سنو، کہہ کے بڑھیا ڈھڈھونے اُس مکان کا احوال بتایا جس میں قہوہ فروش رقیب اس ولایتی جوان اور حبشی جمال کے ساتھ داخل ہوا تھا۔ کہنے لگی، مکان کا ایک پچھلا دروازہ بھی ہے جہاں سے وہ دریا خان کو داخل ہونے میں مدد دے گی۔ اندر کہاں کہاں خطرات ہیں، زہر ساز کے آدمی کہاں کہاں پہرہ دیتے ہیں، کس ڈھب کے لوگوں سے اندر واسطہ پڑ سکتا ہے، یہ

بڑھیا نے خوب سمجھا دیا۔ وہ زہر ساز کا حلیہ بیان کرنے سے قاصر تھی۔ بولی، ”جنہوں نے اُسے دیکھا ہے وہ بتانا نہیں چاہتے، یا بتا نہیں سکتے۔ اور وہ نحوست مارا خود کبھی باہر نہیں نکلتا۔“

دریا خان نے چاندی کے بیس بانیس سکے دکان کے تختے پر رکھ کے کہا، ”سن، یہ رقم تیرے لیے نہیں ہے... تجھے تو میں اشرفیوں میں انعام دوں گا۔ یہ سکے رکھ۔ مجھے مکان میں داخل کرنے سے پہلے چار پانچ نکتے شہدے کہیں سے پکڑ لا، انھیں پیسے دے کے یہاں اپنے چبوترے پر بٹھا دے، میری طرف سے قہوہ پلا اور خود بھی سامنے دروازے پر نظر رکھ۔ پر تگالی افانزو اور اس کا جمال یا تیرا حریف قہوہ فروش مکان سے نکلیں تو شہدوں نکتوں کو سمجھا دے کہ وہ کوئی فساد کھڑا کر دیں۔ انھیں روک رکھیں، جانے نہ دیں۔ آگے میں سنبھال لوں گا۔“

اتنے بہت سے روپے دیکھ کے بڑھیا تو سمجھو غش کھا گئی۔ تاہم اس نے خود کو سنبھالا، اس لیے کہ آغا نے اسے طلائی سکے انعام میں دینے کو کہا تھا۔

واللہ اشرفیاں! سونے کی مقدس ٹکیاں! اب تو وہ سامنے والے خبیث کو بندھوا کے ڈلوادے گی۔ تختے پر جو چاندی پڑی ہے۔ اس سے دس درجے کم رقموں پر تو بڑھیا نے اپنے بیٹوں بھتیجیوں سے کتنے الٹے سلتے کام کرائے ہوں گے۔ اس آغا کا دکان پہ آنا کیا ہوا کہ سمجھو نصیبے کا بند دروازہ کھل گیا۔

اُس نے دریا خان کی فرغل کا دامن چھوا اور اپنا ہاتھ چوم لیا، ”آغا ملک! تمہیں تو کہیں کا حاکم ہونا تھا۔ بہ خدائے کریم، کیا حکمت سوچی ہے! میں پلک جھپکتے بازار کے نگھرے شہدوں میں سے دو چار کو پکڑ لاتی ہوں۔ اتنی رقم میں تو وہ اس مردود قہوہ فروش کے ٹکڑے کر دیں گے۔“

دریا خان کا منہ بن گیا۔ الجھ کر بولا، ”او تیرہ بخت! مجھے کسی کے ٹکڑے نہیں کرانا۔ ان شہدوں نکتوں کو سمجھا رکھنا کہ کھینچا تانی اور فضول گوئی سے زیادہ کچھ نہ کریں۔ اور سن لے! مجھے آتا دیکھے تو تو ان شہدوں کو چلتا کر دیجو۔ میں تو بس اتنا چاہتا ہوں کہ وہ مجرم اگر اس راہ سے نکل بھاگنا چاہیں تو تیرے نکتے انھیں جانے نہ دیں۔“

بڑھیا مسندِ عالی دریا خان کو گاہکوں کے چبوترے پہ بٹھا کے چلی گئی اور ذرا دیر میں چار مسنڈوں کو گھیر لائی، ان میں دو تو اس کے اپنے ہی بیٹے تھے۔ کہنے کو یہ چاروں بازار میں جمالی کرتے تھے مگر بازار والے جانتے تھے کہ انھیں جمالی سے زیادہ پتھر پہ کھڑیا سے لکیریں بنا

کے کوڑیوں، ٹھیکروں سے کھیلنا اور بھلیوں، بوروں، ٹوکریوں سے گرا پڑا سامان سمیٹ کے چل دینا ہی آتا تھا۔ کسی باحیثیت رہگیر کو تاک لیتے تو دائیں بائیں دیکھ کے دستِ سوال بھی دراز کر دیتے تھے۔ ایک بار دیوانِ قانون کے اہل کار اُس کے ان بیٹوں بھتیجیوں کو جرمِ گداگری میں کھینچ کے لے جا بھی چکے تھے۔ مختصر یہ کہ چاروں اس قابل تھے کہ ثبوت، شہادت، گواہوں، استغاثوں کے بغیر ہی سلطانی جلا دوں کے ہاتھوں مارے جاتے تو انب تھا۔

خیر، شہدوں نے صدر دروازے کی نگرانی شروع کر دی اور بڑھیا دریا خان کو مکان کا عقبی راستہ سمجھانے لے چلی۔

پچھواڑے گلی کا عجب حال تھا۔ مکان دار کی بے توجہی سے، یا شاید جان بوجھ کے چھوڑی گئی خود رو گھاس اور اونٹ کٹارا جھاڑیوں کی وجہ سے گلیاں جیسے جنگل بیابان ہو رہا تھا۔ خود رو درخت قدِ آدم سے زیادہ بلند تھے اور بہت گھنے تھے۔ یہ کہنا مشکل تھا کہ پتوں شاخوں کے پیچھے مسلسل دیوار ہے کہ کوئی دریچہ، روشن دان یا موکھا ہے۔ گلیاں میں سناٹا تھا۔ دریا خان اور بڑھیا کسی خرنشے کے بغیر مکان کا جائزہ لے رہے تھے۔ اسی دوران دیوار کے برابر اُگے پیپل کے ایک ادھ کچرے درخت کے پاس بڑھیا جا کھڑی ہوئی اور اشارے سے بتانے لگی تو دریا خان کو پتوں کے جمگھٹے اور جھاڑ جھنکاڑ کی اوٹ میں ایک بڑا سا دریچہ نظر آیا۔ بڑھیا اگر اشارہ نہ کرتی تو دریا خان نکلا چلا جاتا، دریچہ اسے ہرگز نظر نہ آتا۔ اس جگہ فرشِ زمین پر گھاس بھی جیسے تہ درتہ اُگی ہوئی تھی۔ بڑھیا نے اشارے سے بانس کی ایک سیڑھی بھی دکھائی جو گھاس میں چھپی پڑی تھی۔ کہنے لگی، ”دریچہ اندر باہر سے کھلا رہتا ہے۔ کیا خبر کب ان بدنہادوں کو بھاگنا پڑے۔ آغا! تم بلا تامل مکان میں اُتر جاؤ۔“

دریا نے سیڑھی لگا کے دیکھا، دریچہ پرانی مگر مضبوط لکڑی کا بنا تھا۔ پٹوں کی سانکل کاری لوہے کی موٹی چھڑیوں، سانکلوں سے ہوئی تھی۔ بند کرنے کو ایک کنڈا سانکل باہر کو ایک اندر کو لگا تھا۔

دریا نے بڑھیا سے کہا، ”سن، میں جاتا ہوں۔ تو صدر دروازے کا خیال رکھنا۔“

وہ خوش ہو کے بولی، ”جی آغا!“ اور جانے کو ہوئی۔

دریا خان بولا، ”ٹھیر تو، نیک بخت! میں اندر اُتر جاؤں تو باہر سے تو درتے کے

پٹ بند کر کے کنڈا چڑھا دینا۔“

وہ بولی، ”کیا فرماتے ہو؟“ بڑھیا کو یقین نہ آیا کہ جو کچھ وہ سن رہی ہے، وہ وہی ہے جو آغا چاہتا ہے... ایسے پرخطر مکان میں خود کو اس طور بند کر لینا کہ صدر دروازہ مسدود ہو تو ان قاتلوں سے بچ نکلنے کی کوئی اور صورت نہ رہے! یقیناً بڑھیا کے سننے سمجھنے میں فرق ہے۔ کون ایسا بے عقل ہوگا جو اس مکان میں بند ہونا چاہے گا؟ پوچھنے لگی، ”کیا فرمایا؟ پھر کہو آغا! تمہارا حکم کس طرح ہے؟“

دریا خان جو چاہتا تھا اس نے پھر بتا دیا۔ عورت کو شک ہوا کہ یہ حاکم آسیب مارا یا سڑی دیوانہ ہے۔ یہ اگر بند ہو گیا اور مارا گیا تو بڑھیا کے انعام کی اشرفیاں تو سمجھو گئیں۔ وہ دریا خان سے حجت کرنے پر تل گئی۔ خان چڑ گیا۔ کہنے لگا، ”نیک بخت! بے کار باتیں نہ بنا۔ میں ملک التجار نہیں، سپاہی ہوں۔ غلط کاروں کی گرفت کرنے کا فوری اور سادہ طریقہ اختیار کرتا ہوں۔ یعنی گھیر کے اور تلوار کے ذریعے۔“ پھر اس نے کمر سے تلوار کھینچ ہاتھ میں لے لی۔ بڑھیا کو اشارہ کیا اور سیڑھی چڑھ کے مکان میں اتر گیا۔

قہوہ فروش بڑھیا کیا کرتی... اُس نے محبوظ الحواس آغا کو اس خطرناک مکان میں، سمجھو سانپوں بچھوؤں بھری بانہی میں، بند کر دیا۔

مسند عالی دریا خان حجاب دار کوئی لڑکا بالا نہیں تھا جو اس نحوست آثار مکان کی ویرانی، بے رونقی سے وحشت زدہ ہو جاتا۔ وہ ایک پختہ کار سپاہی، درجنوں معرکے، سیکڑوں لڑائیاں جھیلا ہوا سردار تھا۔ جس نے دربار دیکھے تھے، انھیں برتا تھا۔ کتنے ہی دریاؤں، ندی نالوں کو کبھی تیر کے، کبھی کشتی ناؤ سے، کبھی اسیلوں کی پشت پر عبور کیا تھا۔ جنگل بیلے راتیں گزاری تھیں۔ لاشوں کے انبار دیکھے اور خود بھی کشتوں کے پستے لگائے تھے۔ اس نے عالی مرتبت سرداروں سے لے کے آدھے دام کی چادر چرانے والوں تک کے معاملات فیصل کیے تھے۔ تاہم عجیب بات تھی کہ اس وقت اس مکان میں وہ بے کیف ہو رہا تھا۔

درتے سے مکان میں پہنچنے کے بعد ہی سے دریا نے خود کو نفرین کرنا شروع کر دیا تھا کہ یہ میں خود کو کہاں لے آیا۔ وہ ایک اچھا منتظم تھا اور اس بات پر برہم تھا کہ اُس نے اس قضیے میں کوڑی بھر فراست کا ثبوت نہیں دیا ہے۔ جوں ہی اُس نے دیکھا تھا کہ افانزو دیوان قانون کے اہل کاروں سے چھپ رہا ہے، اُسے بڑھ کے افانزو کی گدی ناپ دینی چاہیے تھے۔ بہر حال، جو ہوا۔

جس نحوست نشان کمرے میں اس وقت کھڑا دریا خان باہر کی آوازیں سننے کی کوشش کر رہا تھا، اُس میں چوکور پتھروں کا شطرنجی فرش بنا تھا جس میں جگہ جگہ دراڑیں پڑی تھیں۔ مہینوں برسوں کا میل کچیل ان دراڑوں میں بھر گیا تھا۔ فرش پر گرد کی تہ جمی تھی اور ادھر ادھر سے اُڑ کے آنے والے سوکھے پتوں کے ڈھیر لگے تھے۔

باہر دالان کی طرف سے کوئی آہٹ سنائی نہ دی تو دریا دبے قدموں دالان میں نکل آیا جو خاصا چوڑا تھا۔ یہاں بھی فرش پتھر کی سلوں سے بنا تھا۔ صحن کے رُخ پتھر کی جالیوں سے بنائی گئی ایک نیم قد دیوار تھی۔ جالیاں وقت کے ساتھ ٹوٹ گئی تھیں تو ان پر بھی زمانے کی گرد جمی تھی اور جالے لگے تھے۔ صحن کا حال اُس گلیارے سے کچھ بہتر نہ تھا جسے دریا خان مکان کے پچھواڑے بھگتا آیا تھا۔ صحن میں اُگے جامن، پیپل اور نیم کے پیڑوں پر گرگٹوں اور کیڑے مکوڑوں کی اجارہ داری تھی۔ وہاں کہیں پتھر کا فرش نظر آتا تھا، کہیں کمر کمر گھاس اگی تھی۔ دریا کو یقین تھا کہ آنگن کی جھاڑیاں اور گھاس پھونس، سانپوں بچھوؤں سے پٹے پڑے ہوں گے۔ اُس نے گھن اور نفرت کی پھریری لی۔ وہ حملہ کرتے شیر کا سامنا کرنے کو ہر وقت تیار تھا مگر ریشتی ہوئی چیزیں اور سردخون والے سرسراتے ہوئے لکچھے جانور... خدا محفوظ رکھے!

اچانک سامنے دالان میں آواز کے ساتھ دھات کی کوئی چیز آگری۔ دریا خان کو اگلے کمرے سے کسی کے غصے سے چیخنے کی آواز سنائی دی۔ وہ فوراً اس کمرے میں چلا گیا جس سے ہو کر صحن میں آیا تھا۔

دروازے کی اوٹ سے اُس نے دیکھا کہ بکری سے بڑا ایک جانور اُچھل کے دالان میں آیا ہے۔ دریا خان نے ایسا چوپایہ پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس کے بدن پر بکری جیسے بال تھے جن کا رنگ گدلا سفید اور بادامی تھا۔ پچھلی ٹانگوں کے مقابلے میں اگلی ٹانگیں بڑی تھیں اور چلتے وقت یوں لگتا تھا کہ اس کی کمر یا پچھلی ٹانگیں کبھی توڑ دی گئی تھیں جو پھر صحیح طریق پر جڑ نہیں پائیں۔

یہ جانور جو کتے اور سیار کی نسل کا تھا، ایک بار غصے سے کھنکھارا... یا شاید یہ اس کی ہنسی کی آواز تھی۔ دریا کو یقین تھا کہ یہ شیطانی جانور اندر کمرے میں کوئی شیطانی کام کر کے آیا ہوگا جس پر آدمی نے پھینک کے اسے کچھ مارا ہے اور اب یہ اُس پر ہنستا ہے۔ دریا خان حُجّاب دار نے دل ہی دل میں لاحول پڑھی اور تلوار کے قبضے پر اپنی گرفت مضبوط کی۔ اگر یہ منحوس

چوپایہ ہنستا ہوا اس طرف آیا اور اس نے کمرے میں دریا خان کی بوسونگھ لی یا اُسے دیکھ کے حملہ آور ہوا، تو دریا نے حساب لگایا کہ پہلا وار اس کے سر پر کیا جائے گا تاکہ یہ ختم ہو جائے اور دوسرا وار اس کی ٹوٹی ہوئی کمریا پچھلی ٹانگوں پر کیا جائے گا تاکہ بعد میں بھی یہ ابلیس آثار چلتا ہوا قریب نہ آ سکے۔ اس کی منحوس ساخت... بالوں کا گھناؤنا رنگ اور نفرت انگیز ہنسی بتا رہی تھی کہ اس طرح کی چیزیں مرنے کے بعد بھی آگے بڑھ کر اپنے مارنے والے پر حملہ کر سکتی ہیں۔

دریا خان پھر ایک بار بڑبڑایا کہ ”پناہ بہ خدا! یہ میں کس شیطانی طلسم میں آگیا ہوں۔“ جانور کی ہنسی ابھی جاری تھی کہ ایک آدمی جھپٹ کے کمرے سے نکلا۔ اُس کے ہاتھ میں سلگتی ہوئی لمبی سی لکڑی تھی جو اُس نے چوپائے کی کمر پر ماری۔ اُچنتی سی چوٹ لگی ہوگی کہ جانور ہنستا ہوا بھاگا اور دالان کی ٹوٹی ہوئی جالی سے نکل کر صحن کے جھاڑ جھنکاڑ میں غائب ہو گیا۔ دریا نے سنا، وہاں وہ اپنے کسی بھٹ میں چھپا، دبی ہوئی ہنسی ہنسنے جا رہا تھا۔

عجیب الخلق چوپائے کا پیچھا کرنے والے نے بڑبڑاتے ہوئے جھک کر فرش سے دھات کی وہ چیز اٹھائی جو اُس نے چوپائے پر پھینکی تھی۔ یہ بڑا سا کف گیر تھا۔ کف گیر اور جلتی ہوئی لکڑی اٹھائے وہ شخص بڑبڑاتا ہوا لوٹ گیا۔

بڑھیا کی بتائی ہوئی تفصیل کے مطابق یہ باورچی ہوگا اور باورچی خانے میں گیا ہوگا۔ دریا خان کے ذہن میں مکان کا نقشہ بنتا جا رہا تھا۔ آگے خادموں کے کمرے ہوں گے، جس کے بعد زینہ ہوگا جو اوپر مہمان خانے کو جاتا ہے۔ بڑھیا کے خیال میں افانزو کو مہمان خانے میں ہونا چاہیے۔

دریا خان کو جب اطمینان ہو گیا کہ باورچی اب واپس نہیں آئے گا تو وہ نکلا اور دبے قدموں دالان میں چلتا اُس کمرے کے آگے پہنچا اور اُس در کے سامنے سے گزرا جس سے وہ جہنمی چوپایہ کھنکھارتا تمسخر کرتا برآمد ہوا تھا۔ یہاں خادموں کے کمرے تھے جن میں سے بعض مقفل نظر آئے۔ ایک سے اس نے کسی مرد کے کھانسنے کی آواز سنی۔ جھانک کے دیکھا کہ جو کھانستا تھا، گودڑ بستر پہ چادر لپیٹے پڑا ہے۔ سانس لینے کے ہموار انداز سے پتا چلتا تھا کہ سو رہا ہے۔ دریا خان رسائیت سے آگے بڑھ گیا۔ اس نے سوچا، قدرت نہیں چاہتی کہ یہ اجل گرفتہ بد معاش میرے ہاتھ سے مارے جائیں۔ ویسے بھی اس قبیل کے لوگوں کے خون سے اپنی تلوار ناپاک کرنا مناسب نہیں۔ ایسے غلط کار تو جلادوں کے لیے ہوتے ہیں۔

وہ سیڑھیوں تک جا پہنچا تھا۔ اوپر فرش پر لکڑی جڑی تھی اور فرش اور سیڑھیوں پر سستے، بچہ مزدوروں کے ہاتھوں بنوائے ہوئے، کھر درے بھدے قالین پڑے تھے۔ سیڑھیاں چڑھ کے دریا خان نے سب طرف نظر دوڑائی۔ دُور تک کوئی نہیں تھا مگر وہ ٹھٹھک گیا۔ اگر یہ وہم نہیں ہے تو اُسے ایک جوان عورت کی ہنسی کی آواز سنائی دی تھی۔ یہ وہم نہیں تھا... کچھ دیر بعد اُسے پکھاوج کی گمک اور تان پورے کی ترنگ سنائی دی۔ عورت پھر ایک بار ہنسی۔ وہ ابھی ہنستی تھی کہ سارنگی کی دل گداز آواز جیسے بین کرتی ہوئی چلی۔ بجانے والوں نے کوئی حزنِیہ دُھن شروع کر دی تھی۔ عورت کی ہنسی ڈوب گئی۔

رب العالمین! یہ اُس منحوس سامری کا کارخانہ ہے کہ کسی گانے بجانے والی کا مکان؟ یہ تو موت کے سوداگر ہیں، یہاں گانا بجانا یعنی چہ؟ سازوں کی آواز ہلکی ہوئی تو عورت نے بھرپور قہقہہ مارا۔ بڑی کھل کھیلتی ہوئی آواز تھی... طے شدہ طور پر بازار کی آواز۔ اب ایک مرد نے گھوں گھوں کرتے ہوئے کچھ کہا۔ الفاظ سمجھ میں نہ آتے تھے، تاہم بولنے والا ٹھہر ٹھہر کے بولتا یا لکنت کرتا معلوم ہوتا تھا۔ عورت مرد دونوں نے قہقہہ لگایا۔ بڑھیا کے بتائے ہوئے نقشے کے حساب سے یہ آوازیں مہمان خانے سے آرہی تھیں۔ اگر مہمان خانے میں افانزو ہے تو مجھے پہلے اسے قابو میں کرنا ہوگا۔

دریا خان ابھی کوئی مفصل حکمتِ عملی تیار نہ کر سکا تھا کہ مہمان خانے سے زور شور سے ساز بجانے کی اور گانے کی آوازیں آنے لگیں۔ اس بار کوئی طریقہ دُھن بجائی جا رہی تھی۔ گانے والی کسی اجنبی زبان میں گاتی تھی۔ حیرت ہے، بڑھیا نے ایسا تو کوئی اشارہ نہیں دیا تھا کہ یہاں گانے بجانے والے بھی رہتے ہیں۔ خیر، ہو سکتا ہے صاحبِ خانہ مہمانوں کی تواضع اس طرح کرتا ہو۔

دریا خان کمرے کے ٹوٹے دروازے کے پاس جا کھڑا ہوا۔ دروازے سے کمرے کا خالی حصہ دکھائی دیتا تھا۔ ایک بے حیثیت قالین جگہ جگہ سے پھٹا اُدھڑا ہوا کمرے کے فرش کو چھپائے تھا۔ دریا کو چھپر کھٹ کا ایک پایہ بھی دکھائی دیا۔ ابھی تک سموچا آدمی کوئی نظر نہ آیا تھا۔ ایک پرانے چوبی تخت کا سرہانا ضرور دکھائی دے رہا تھا جس پر میلے چیکٹ گاؤتیکے رکھے تھے اور تکیوں سے ٹیک لگائے ایک عورت بیٹھی سارنگی بجاتی تھی۔ اُس کی صرف پشت دکھائی دیتی تھی۔ عورت کسی طرح کا جھرجھرا، جھینا لباس پہنے تھی، جس کے پار سے نیچے پہنے محرم کا

رنگ، ساخت اور ڈوریاں تک نظر آرہی تھیں۔ برابر ہی پکھا وچ بجانے والی تھی جس کا آدھا چوتھائی چہرہ دکھائی دے رہا تھا۔ دونوں اُجلی رنگت کی جوان عورتیں تھیں۔

دریا خان ابھی ساز بجانے والیوں کا جزوی منظر دیکھتا تھا کہ اندر کمرے کی دیوار پر اُسے چمک سی دکھائی دی۔ پردہ ہلا تھا۔ اُس نے کجلا یا ہوا سا قد آدم آئینہ دیکھا۔ آئینے پر دو عکس واضح تھے۔ چھپر کھٹ کے تکیے سے ٹیک لگائے افاز و پیالہ ہاتھ میں لیے بیٹھا تھا اور اُس سے بالکل بھڑی ہوئی اُجلی رنگت کی ایک جوان عورت بیٹھی تھی جس کی آنکھیں سبز اور بڑی بڑی اور سرے سے سنواری ہوئی لگتی تھیں۔ یہی عورت تان پورا اٹھائے گا رہی تھی۔ افاز و کی توجہ اس کے گانے پر نہیں تھی۔ وہ اُس کے لباس کی سلوٹوں میں جیسے کچھ ڈھونڈتا تھا... حرام الدہر، بدمعاش!

اس نے... دریا خان نے... یہ سب دیکھا اور سوچا، یہاں دارالحکومت میں، اقامت گاہِ سلطانی کے بہر حال نزدیک ہی، یہ کیا ہو رہا ہے؟
اُس نے سوچا، دیوانِ شرطہ کو کیا ہوا؟ کیا سب پرچہ نویس اور مخبر نا اہل ہو گئے؟ یا وہ بددیانت ہیں؟

مگر سوچنے کی بات ہے، کہیں ایسا تو نہیں کہ پر تگالی افاز و اپنے مزاج کے مطابق لطف و تفریح کے لیے یہاں اتار رہتا ہو اور میں ایک غیر ضروری محتسب اور مداخلت کار کی طرح اس کی تفریح اور خلوت میں کھنڈت ڈالنے یہاں گھس آیا ہوں؟ مجھے کیا! بہت کروں گا تو ایک تحریری بیان دیوانِ قانون کو ارسال کر دوں گا کہ فلاں فلاں جگہ شراب نوشی کا اہتمام شاید کسی ضابطے، اجازت نامے کے بغیر کیا جاتا ہے، اور ایسی ایسی سرگرمیاں جاری ہیں۔ باقی وہ جانیں، اُن کا کام۔

دریا خان حُجّاب دار ابھی یہیں تک سوچ پایا تھا کہ اُس نے ایک بہت ہی بھیا تک دھماکا سنا... مگر نہیں یہ دھماکا اُس کے سر میں ہوا تھا۔ اُس نے گھوم کے دیکھنا چاہا، گھوم نہ سکا۔ کوئی کند چیز پھر اس کی کنپٹی پر آگئی، اور کوشش کے باوجود دریا خود کو اپنے پیروں پر کھڑا رکھنے میں ناکام ہوا۔

وہ تیورا کر گرنے لگا تو دائیں بائیں سے نکل کے آگے آنے والے پانچ سات شہدوں نے اُس بلند قامت سردار کو سنبھالا اور اُسے اٹھائے ہوئے برابر کے کمرے میں داخل

ہو گئے۔ افانزو کی مے نوشی، اُس کا بے محابا بحس اور گدگدائی گئی عورت کے فحش قہقہے جاری رہے... ساز و غیرہ بھی بجتے رہے۔

آنکھ کھلی تو دریا نے دیکھا کہ اُسے پلنگ پر لٹا کر مضبوط رسوں کی مدد سے اس طرح باندھا گیا ہے کہ اُس کے لیے ہلنا بھی ممکن نہیں۔ سر اُس کا بہت بری طرح درد کرتا تھا اور بھوک کسی درندے کی طرح بدن کے بیچ بیٹھی اُسے بھنبھوڑے ڈالتی تھی۔

”معاذ اللہ! کیا تباہی ہے! غذا کے سوا دماغ کچھ بھی سوچنے سے انکاری ہے۔“ پھر بھی غصے کی ایک لہر نے دریا خان کے بدن میں غیر معمولی طاقت بھر دی۔ اُس نے زور لگا کے رسیاں تڑانا چاہیں۔ ”اگر ابھی اس بندش سے آزاد ہو جاؤں تو ان حرام خور غلط کاروں میں سے ایک کو بھی زندہ نہ چھوڑوں۔ وہ تعداد میں بیس ہوں یا پچاس، مجھ پر ان بے ادب نافر جاموں کو سزا دینا لازم ہے۔ غضب خدا کا! رہزنوں، حرام خوروں نے مجھے اپنی لالٹھیوں سے زد و کوب کیا؟ مجھے؟ دریا خان کو؟“

مگر فوراً ہی اُسے یاد آیا کہ یہ رہزنی کی واردات نہیں۔ دریا خان آپ ہی اس گھر میں چوری سے داخل ہوا ہے۔ مملکت کے قانون کے مطابق اجازت کے بغیر گھر میں اس طرح داخل ہونا جرم اور قابلِ مواخذہ ہے۔ ”پھر بھی... پھر بھی غور طلب بات یہ ہے کہ ان بد قماشوں نے مجھے زد و کوب... مگر نہیں مجھے اصل بات یاد رکھنی چاہیے... اصل بات یہ ہے کہ پرتگالی طبیب زادے کی مدد سے یہاں کوئی سازش تیار ہو رہی ہے۔ شاید میرے سلطان یا سلطانہ کے خلاف۔ ایسی صورت میں اپنے مرتبے اور عہدے کی رُو سے مجھے اختیار حاصل ہے کہ میں اس گھر میں... یا کسی بھی گھر میں جہاں سازش ہو رہی ہو، بہ زور یا بہ حکمت داخل ہو جاؤں اور مجرموں، سازشیوں کا حساب لوں۔ مگر ناں ناں، یہ بات تو مجھے کسی کے سامنے کہنی ہی نہیں ہے۔ جہاں سلطان یا سلطانہ کے نام آ جاتے ہیں، ہر درباری عہدے دار کو وہاں بہت محتاط ہونا پڑتا ہے۔ یہ سازش والی بات تو کسی کے سامنے کہنی ہی نہیں ہے۔ تو پھر کیا کہا جائے؟ ہاں! مجھے کہنا چاہیے کہ اصل میں میں ملک التجار ہوں۔ مشرق، جنوب یا شمال سے آیا ہوں۔ کسی سے سنا تھا کہ یہ سامری موثر زہر تیار کرتا ہے۔ بس آگھسا۔ آگے پھر وہی کہانی نافرمان کنیز والی، جو میں نے قہوہ فروش بڑھیا کے لیے تیار کی تھی۔“

دریا خان ابھی تک اتنا ہی سوچ پایا تھا کہ لوہا چڑھی جریب اٹھائے ایک کریہہ صورت

غلام کمرے میں آگیا۔ کمرہ کیا تھا، یہ جگہ کسی تہ خانے کا خالی ڈھنڈا حصہ لگتی تھی۔ ادھر ادھر بے کار سامان پھیلا پڑا تھا۔ غلام نے آتے ہی پرشور انداز میں ایک پرانا صندوق کھینچ لیا اور صندوق پر بیٹھ کر وہ سکون سے لاٹھی ٹیک، فرش کو ایسے دیکھنے لگا جیسے خاص اسی کام کے لیے آیا ہے۔

دریا خان نے غلام کو مخاطب کیا، ”اونا مراد! مجھے کھول۔ ایسے کیوں بیٹھ گیا؟ مجھے کھول، اپنے مالک کے پاس لے چل۔“

جریب والے غلام نے جیسے اُن سنی کر دی، بے تعلق بیٹھا رہا۔

”خبیث غلام زادے! مجھے کھول دے۔ سنتا ہے؟ مجھے کھول، ورنہ تیرے ساتھ بہت بری ہوگی۔“

غلام نے پلک تک نہ جھپکائی۔

”تیرا مالک کہاں ہے؟ اُسے بلا اور مجھے آزاد کر۔ کیا کہہ رہا ہوں، سنا کہ نہیں؟“

غلام نے جماہی لی اور نیم وا آنکھوں سے دریا خان کو دیکھا، بے تعلق سے مسکرایا اور پھر لاٹھی کی ٹیک لگائے فرش کو تکتے لگا۔

دریا خان غصے کی بے بسی میں چیخ کے بولا، ”او بد انجام! لعنت ہو تجھ پر! ایسا بیٹھا ہے جیسے بہرا ہو، خبیث۔“

عقب سے ایک نرم مردانہ آواز نے ستھرے لہجے میں کہا، ”آپ نے ٹھیک فرمایا، وہ بہرا ہے اور گونگا بھی۔“

دریا نے سرگھما کے دیکھنا چاہا، مگر بالکل عقب میں دیکھنا ممکن نہ تھا۔ جھنجھلا کے اُس نے مطالبہ کیا، ”سامنے آؤ... کون ہو تم؟“

”آغا پہلے اپنا تعارف کرائیں گے۔ صاحب خانہ سے متعلق ہونے کے سبب یہ حق میرا ہے کہ میں آپ سے سوال کروں... بتائیے، کون ہیں آپ؟“ بولنے والے کا تپاک واضح طور پر مصنوعی تھا۔

نہ چاہتے ہوئے بھی دریا خان مشتعل ہو گیا۔ ”ذلیل غلام زادے کی بے ضابطہ اولاد! مجھے کھول دے... پھر میں بتاؤں گا کہ کون ہوں۔“

”چچ چچ، چچ چچ... آغا! آغا!“ بولنے والے نے بہت نرمی سے ملامت کی۔ کہنے لگا، ”آغا! یہ بدکلامی آپ کی شان کے شایان نہیں۔“

”تو کون ہے۔ سامنے آ۔“

”ناں ناناں۔ پہلے آپ اپنا تعارف کرائیں گے۔“

جیسا کہ سوچ کے بیٹھا تھا، دریا خان نے بتایا کہ وہ شمال سے آیا ہے، مسالوں کا تاجر ہے اور اُس ’ملعون‘ سے ملنا چاہتا ہے جو گھر میں بیٹھا ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کیا کرتا ہے۔

عقب سے بولنے والا ہنسا، ”اُس ملعون سے ملنے کیوں آئے ہو؟“

”یہ میں اُسی کو بتاؤں گا۔“

”مجھے بتادو۔ میں تمہاری بات اُس تک پہنچا دوں گا۔“

تس پہ دریا خان نجات دار نے وہی کنیز سے نجات حاصل کرنے والی بات کہہ دی اور جب اُس نے پوچھا کہ مکان میں اس طرح داخلے کی ضرورت کیوں پیش آئی تو کہہ دیا کہ یہ بات میرے علم میں ہے کہ زہر ساز سامری کے سبھی خادم رشوت خور بے دین ہیں، پیسے لے کر بھی مجھے اُس سے نہیں ملنے دیں گے۔ اس لیے مکان میں پوشیدہ طور پر داخل ہوا ہوں۔ جب اُس نے سوال کیا کہ داخلے کا یہ رستہ اُسے کس طرح معلوم ہوا تو دریا کو بوڑھی قبوہ فروش کا ذکر کرنا پڑا۔ پوچھنے لگا، بوڑھی کو تم کب سے جانتے ہو، تو بولا، ”آج پہلی بار اُس کی منحوس شکل دیکھی ہے۔“

”یعنی پہلے اس بوڑھی سے معاملت نہیں رہی؟“

دریا نے کہا، ”نہ۔“

”تو پہلے کس سے معاملت رہی تھی؟... اُس دوسرے قبوہ فروش سے؟“

”ہاں۔“

”اُس سے کس نے ملوایا تھا؟“

”ایک تاجر نے۔“

”نام؟“

”تو تاجر کا نام پوچھتا ہے یا اُس حرام زادے قبوہ فروش کا؟“

عقب سے بولنے والا ہنسا، ”اُس حرام زادے کا نام ہی بتادو۔“

دریا خان نے منہ پر کف لا کر غصے کی آواز نکالی۔ اس طرح کے سوال جواب اُسے

مشتعل کر دیتے تھے۔ تاہم پوچھنے والے نے اپنے نرم مصنوعی لہجے میں پوچھا، ”اگر اُسے...
 قہوہ فروش کو یہاں بلوائیں تو وہ تمہیں پہچان لے گا؟“
 ”کیوں نہیں؟“ دریا خان نے درشتی سے کہا، ”کیسے نہیں پہچانے گا۔ اُس ناہنجار کو
 بھی تو پیسے کھلائے ہیں۔“

وہ ہنستا ہوا سامنے آگیا۔ شکایتاً کہنے لگا، ”تم ایسے سردار کو جھوٹ پہ جھوٹ بولتے
 دیکھ کے مجھے خفت ہو رہی ہے آغا!“ دریا نے دیکھا، یہ وہی قہوہ فروش تھا جو افانزو کو مکان میں
 لایا تھا۔

دریا نے پھر غصے کی آواز نکالی۔ کہا کچھ نہیں۔
 قہوہ فروش نرمی سے بولا، ”ہم تو سبھی کے خادم ہیں... اب کہو، حکم کرو۔“
 دریا خان کا اصرار تھا کہ اُسے کھول دیا جائے اور فی الفور صاحب خانہ سے ملوادیا
 جائے۔ قہوہ فروش پوچھتا تھا، اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ دریا خان اشتعال میں آکر خود
 اُسے یا صاحب خانہ کو نقصان نہیں پہنچائے گا؟
 اسی حیسب بیس میں بہت وقت گزر گیا۔

بالآخر طے پایا کہ دریا خان کلام اللہ کو گواہ کر کے اور اپنی تلوار کی قسم کھا کے اقرار
 کرے گا کہ گھر والوں کے پر امن رہتے خود پر امن رہے گا اور نہ قہوہ فروش پر اور نہ صاحب
 خانہ پر حملہ کرے گا، سکون کے ساتھ اپنا مدعا بیان کرے گا، پھر مہمانوں کی طرح رخصت
 ہو جائے گا۔

اب جب کہ باہمی سلامتی کا معاہدہ طے پا گیا تھا تو قہوہ فروش کا انداز یکسر بدل گیا،
 گھگھکیا کر بولا، ”عالی جاہ! یہ غلام اپنے اہل کاروں کی جانب سے معافی کا خواست گار ہے اور
 خود اپنی طرف سے بھی سو ہزار دفعے معافی مانگتا ہے۔ کیا کریں عالی مرتبت! ہمارا کام ہی سرا
 برا ہے۔ پھر حضور جو اچانک عقبی راستے سے تشریف لے آئے تو...“
 دریا خان نے کہا، ”ٹھیک ہے، ٹھیک ہے۔“

مگر قہوہ فروش بے رُکے بولے جارہا تھا کہ حضور اُس بڑھیا ڈھڈو ہی کو پابند
 کر دیتے... وہ دستک دے کے کسی کو بلا لیتی۔ میری تو کیا اوقات ہے عالی جاہ! واللہ باللہ خود
 صاحب خانہ پیشوائی کو آتا۔ اور یہ کہ تو بہ تو بہ کیسی تقصیر ہوئی ہے ہم غلاموں سے...

دریا خاں حجاب دار جھنجھلا گیا۔ بولا، ”چل چل، اور باتیں نہ بنا بے غیرت! اب ہمیں کھول بھی دے۔“

”حاضر، حاضر!“ کہتے ہوئے قہوہ فروش رسیاں کھولنے لگا۔ گونگے بہرے جریب بردار نے بھی اُس کا ہاتھ بٹانا شروع کیا۔ پلنگ سے کھول دینے کے بعد دونوں بدمعاشوں نے مستعدی سے دریا خان کے ہاتھ پیرسونت کر دورانِ خون بحال کیا۔ دریا خان کی پاپوشیں، کمر سے باندھنے کا دوپٹا، دستار کا بیغہ، رقم والی چمڑے کی تھیلی... غرض ہتھیاروں کے سوا تمام سامان سامنے لا رکھا۔ قہوہ فروش نے دریا کو اپنے ہاتھ سے پاپوشیں پہنائیں، دوپٹا باندھا، دونوں ہاتھوں پر رکھ رکھ کے سب چیزیں دیتا رہا، مگر جب اُس نے ہتھیار طلب کیے تو کھیسیں نکال کے بولا کہ عالی مرتبت ہم تو بڑے کم زور بے حیثیت لوگ ہیں، حضور کے ہتھیاروں کو ایک بار ہاتھ لگانے کی جسارت تو جیسے تیسے کر گزرے تھے، اب ہمت نہیں کہ دوبارہ ہاتھ لگادیں۔ عالی مرتبت جب مکان سے تشریف لے جاویں گے تو وہیں ڈیوڑھی میں تخت پوش کے گدیوں پہ دونوں ہتھیار رکھے ملیں گے، سرکار اپنے دست مبارک سے پہن لیجیے گا۔

دریا خان اس حرام الدہر چاپلوس کی باتیں خوب سمجھ رہا تھا۔ ظاہر ہے جب تک دریا اس مکان میں ہے وہ لوگ اسے غیر مسلح ہی رکھیں گے۔ برا سا منہ بنا کر بولا، ”چل... اس منحوس تہ خانے سے تو نکل۔“

الغرض آگے آگے قہوہ فروش چراغ اٹھائے ہوئے رستہ دکھاتا، پھر دریا خان، اور آخر میں گونگا بہرا غلام، یہ چھوٹا سا جلوس ناہموار سیڑھیاں چڑھتا ہوا تہ خانے سے نکلا اور ایک کچے صحن میں پہنچ گیا۔ یہاں کہیں ہاتھ ہاتھ بھراونچی گھاس تھی اور کہیں بے ترتیب قطعوں میں گھناؤنے رنگوں اور نامانوس شکلوں کے پھولوں پتوں سے ڈھکی جھاڑیاں تھیں جن کی شکل و صورت اور بدبو ہی سے اندازہ ہو رہا تھا کہ یہ زہریلی جڑی بوٹیاں سامری منحوس کی زہر سازی میں کام آنے والی چیزیں ہیں۔

دریا خان نے اوپر کہیں ساز بجنے کی آواز سنی۔ پرنگالی افانزوا بھی تک اپنی مے نوشی اور جشن میں مصروف تھا۔ دریا نے قہوہ فروش کی طرف دیکھا۔ ”یہ کون لوگ ہیں جنہوں نے دن کے اوقات میں رات کی مصروفیات جاری رکھی ہیں؟“

قہوہ فروش نے کوئی جواب نہ دیا، خوشامد سے ہنسنے لگا۔

دریا بولا، ”میں انھی نا فہم لوگوں کو دیکھنے بڑھا تھا جو تیرے آدمیوں نے عقب سے حملہ کر دیا۔“

قہوہ فروش بولا، ”غلام کو اور شرمندہ نہ کیجیے عالی جاہ!“
 دریا خان نے منہ بگاڑ کے کہا، ”تیری شرمندگی میرے سر کا درد دُور نہیں کر سکتی۔“
 وہ بولا، ”یہ حقیر اپنے استاد سے سر درد کی کوئی زود اثر مجرب دوا لے کر حضور کو پیش کر دے گا۔“

دریا خان نے پریشان ہو کر ہاتھ بلند کیے، ”پناہ بہ خدا! تیرے استاد کی مجرب دواؤں سے خدا بچائے رکھے۔“
 قہوہ فروش خوش دلی سے ہنسا، بولا کچھ نہیں۔

جڑی بوٹیوں والے صحن سے بچ بچا کر گزرتے ہوئے یہ تینوں ایک اور ویران دالان میں پہنچے۔ ہر چند یہ جگہ صاف ستھری تھی مگر بے رونق اتنی ہی تھی جتنا گھر کا کوئی بھی حصہ۔ دالان سے ایک سنگی زینہ اوپر گیا تھا۔ زینے پر موٹی بانات کی دری نکھی تھی۔ ایک اور لٹھ بند یہاں اپنی جریب سے ٹیک لگائے ڈھیلا ڈھالا کھڑا تھا۔۔۔ ان لوگوں کو آتا دیکھ کر مستعد ہو گیا۔ دونوں خادم دالان ہی میں رہے۔ دریا اور قہوہ فروش چڑھتے چلے گئے۔

کئی طرح کے دروازوں سے گزرتے، دالانوں کو پار کرتے یہ دونوں ایک دُہرے کمرے میں پہنچے اور ایک بھاری بھر کم دروازے کے سامنے جا رکے۔ قہوہ فروش نے دستک دی۔ جواب میں اندر سے کسی نے کچھ پوچھا۔ قہوہ فروش نے کچھ کہا جس پہ دروازہ کھول دیا گیا اور قہوہ فروش کو بلا لیا گیا۔

دریا خان کو انتظار کرنا پڑا۔ آخر کار قہوہ فروش اور ایک بلند قامت چوب دار کمرے سے برآمد ہوئے۔ چوب دار باہر رہ گیا، قہوہ فروش دریا کو لے تار یک کمرے میں داخل ہو گیا۔ اندر مکمل تاریکی تھی۔ کچھ دیر بعد جب آنکھیں اندھیرے کی عادی ہو گئیں تو دریا خان کو کمرے کے صدر میں نکھی ایک بھاری بھر کم کرسی میں ایک ہیولا بیٹھا دکھائی دیا۔ یہ پستہ قد منحنی آدمی اس بڑی کرسی میں سامنے کے رخ مانگ میں پھیلائے بیٹھا تھا۔ ایسی نشست کے باوجود اس کا پورا سراپا کرسی میں سما گیا تھا۔ کچھ کرسی بڑی ہوگی، کچھ یہ چھوٹا تھا۔ آدمی کے اس ہیولے نے پیروں میں زرکار پاپوشیں پہن رکھی تھیں جن میں شاید یا قوت جڑے تھے۔ دریا

نے سوچا، ہو سکتا ہے یہ اصل پتھر نہ ہوں، بے حیثیت کنکروں سے سجاوٹ کی گئی ہو۔ جو بھی تھا، دریا کو اس کی جوتیوں کے تلے دیکھنا برا لگا۔

یہ بات ہیولے نے محسوس کر لی۔ آہستہ سے کہنے لگا، ”میری معذوری ہے بندہ نواز! کوئی بے ادبی مقصود نہیں۔ میں اپنے گھٹنے نہیں موڑ سکتا۔“ پھر کچھ ٹھہر کر بولا، ”خوش آمدید! مجھے عزت بخشی۔“

اس کی آواز ایسی تھی جیسے شام پڑے کنجوں میں چڑیاں شور کرتی ہوں۔

دریا نے جواباً کہا، ”ہوں۔“ پھر بے وجہ پوچھا، ”تم صاحبِ خانہ ہو؟“

ہیولا اپنی چپھاتی آواز میں بولا، ”آپ کا خادم!“

دریا نے کہا، ”بھلے آدمی! اپنے ملازم سے روشنی لانے کو کہو۔ ہم دونوں ایک دوسرے کی شکل تو دیکھیں۔“

ہیولا اسی چپھاتی آواز میں ہنسا، ”میں بد صورت آدمی ہوں۔ آپ مجھے دیکھ کے بے کیف ہوں گے اور آپ کا مبارک چہرہ میں صرف انگلیوں کے پوروں سے چھو کر دیکھ سکوں گا... نابینا نہیں ہوں تاہم پوری طرح دیکھ نہیں سکتا۔ چھو کے، چکھ کے، سونگھ کے اور سن کے پہچان لیتا ہوں۔“

”ہوں،“ دریا خان نے ہونکارا بھرا۔

وہ چپھایا، ”بعض معاملات میں بصارت سے زیادہ بصیرت کام آتی ہے۔“

”مثلاً کیسے؟“

”مثلاً حضور کا یہ فرمانا کہ آپ کے تردد اور ملال کی وجہ کوئی نافرمان کینر ہے، جی کو نہیں لگا تھا۔ اب آپ کی آواز سن کے یقین ہو گیا کہ ہونہ ہو کینر کا نام مصلحتاً لیا گیا تھا۔ کس لیے کہ آپ تاجر نہیں صاحبِ سیف سردار ہو۔ کینر سے خفا ہوتے تو اُسے بے تامل کاٹ کے پھینک دیتے... میرے پاس آنے کی زحمت کیوں کرتے۔“

دریا نے کہا، ”ہوں... اور؟ اور کیا؟“

وہ بولا، ”اور یہ کہ حضور لشکروں کی سالاری کرتے رہے ہیں، تاہم ادھر چند برسوں

سے درباروں میں رہنا ملا ہے۔“

دریا خان حیران ہوا۔ کہنے لگا، ”خوب!“

”اور درباروں کا یہ ہے کہ ہم رتبہ سرداروں میں چشمکیں چلتی ہی رہتی ہیں۔“
 ہیولا شاید ٹھیک کہہ رہا تھا۔ پچھلے دنوں دبیر دولت شادی خان سیہ رو سے دریا کی تلخ
 کلامی ہوئی تھی۔ ہنہ! بے وجہ وہ اس خوف میں رہتا ہے کہ دریا نجاب دار کہیں دبیر مملکت کی مسند
 پہ نہ آن بیٹھے... کتنے ہی برس سے بھیڑ کے بچے کی طرح اپنی ٹانگوں پر کھڑا لرز رہا ہے شادی خان!
 ہیولے نے اسے ٹوکا، ”حضور کیا سوچنے لگے؟“

”اوں؟... ہاں شاید تم ٹھیک کہتے ہو۔“
 ”جی بندہ نواز! اور بڑوں کی چشمکیں کرسیاں ہلانے والی اور تقدیریں بدلنے والی
 ہوتی ہیں۔ خود عالی جاہ یہاں تشریف لائے، دل نے کہا حضور کا ستارہ اوج پر ہے... حریف
 آپ کا، منہ کے بل گرے گا۔“

دریا نے کہا، ”چلو ہم پہلے آگئے تو ایسا ایسا ہو رہا ہے اور جو ہم سے پہلے وہ سیہ رو
 یہاں پہنچ جاتا تو کسی اور طرح ہوتا... منہ کے بل ہم گر گئے ہوتے۔“
 ہیولا چہچہا کر بولا، ”ناممکن! یہ پتھر پہ لکھا جا چکا۔ شادی خان فرملی کی مسند اُلٹ گئی۔“
 ”شا... دی!“ دریا خان کو یوں لگا جیسے اچانک کہیں سے اس پر وار کیا گیا ہے۔
 ہیولا کیا ہنسا کہ چڑیوں کی چہکار سے کمرہ بھر گیا۔

دریا خان ہکلا رہا تھا۔ ”یہ نام؟... یہ نام جو تم نے لیا... یعنی، یہ کیسے؟“
 ”غلام غیب داں نہیں ہے۔ عالی جاہ نے ابھی خود فرمایا ہے کہ ہم سے پہلے اگر وہ
 سیہ رو پہنچ جاتا... دارالحکومت میں کون نہیں جانتا کہ سیہ رو کون ہے اور سب جانتے ہیں کہ دبیر
 مملکت شادی خان فرملی بہت تشویش کے ساتھ جس عالی مرتبت کے روشن چہرے پر نظریں
 جمائے رہتا ہے، وہ سردار در... یا...“

”نام نہیں!“ دریا خان نے چمک کے کہا، ”نام نہیں! اور اُس سوختہ ساماں کا نام
 لینے کی بھی ضرورت نہیں... سمجھے؟“

ہیولے نے آہستہ سے کہا، ”سمجھا۔“ یا شاید یہ دریا کا وہم تھا کہ اُس نے یہ لفظ کہا۔
 اندھیرے کمرے میں بہت دیر سے سناٹا تھا۔

یہ کیا وبال ہے؟ میں تو سانپ کی اس بانہی میں داخل ہوا تھا کہ معلوم کروں اور اس
 مشتبہ ولایتی افانزو کی حرکات سے باخبر رہوں، دیکھوں کہ کہیں سلطان یا سلطانہ کے خلاف کوئی

سازش تو نہیں ہو رہی۔ لیکن یہاں تو سب کیفیت ہی بدل گئی۔ شادی سیہ رُو کا قصہ درمیان میں کیوں آگیا؟

سامنے کے اندھیرے سے سیہ کار مرشد کی آواز آئی۔ وہ کچھ پوچھ رہا تھا۔ دریا اپنے ہی خیالوں میں تھا، اس نے غور نہیں کیا یا سنا نہیں، پوچھنے لگا، ”کیا کہتے ہو؟“

ہیولے نے بے وجہ ہلکا قہقہہ لگایا۔ بولا، ”عالی منزلت میدان کے شیر ہیں، تاہم مشکل سوالوں کا سامنا کرنے سے گریز کرتے ہیں۔“

”کیا بکتا ہے؟“ دریا خان کو طرارہ آگیا۔

”تو پھر فرمائیے نا کہ حضور کس طرح کی چیز چاہتے ہیں۔ کھانے پینے کے ساتھ دی جانے والی؟ ہتھیار کے چر کے سے اثر کرنے والی؟ عطریا لباس کے ذریعے بدن میں سرایت کرنے والی؟ آخر کس ڈھب کی دارو؟“

دریا خان مُجَّاب دار نے غیظ و غضب کے اظہار میں حلق سے بے معنی آواز پیدا کی جو ہیولے نے ان سنی کر دی۔ وہ اپنی ہی رو میں بولتا رہا۔ کہنے لگا، ”ایک صورت اور بھی ہے سرکار! کہ اس شخص کو، جس کے بارے میں ہم اس وقت بات نہیں کرنا چاہتے، ایک ناکتخدا عورت... سمجھو وِش کنیا، خاص مقاربت کے لیے تیار کی گئی فراہم کی جائے جس کی ایک بار کی قربت ہی مذکورہ شخص کے لیے جان لیوا ثابت ہو۔ تو یہ اور بہت سے طریقے ہیں۔ اب جیسا بھی ارشاد ہو۔“

یہ کس قماش کا آدمی ہے؟ میری بات کیوں نہیں سمجھتا؟ اور سنتا کیوں نہیں؟ اپنی ہی کہے جاتا ہے۔ اور لو بھلا، شادی خان فرملی کے بارے میں یہ کیسی بکواس کرتا ہے۔ وہ میرا حریف مخالف سہی مگر سچ بات کہنے میں کیا جھجکنا۔ شادی آدمی پاک باز ہے۔ وِش کنیا کا حربہ اُس پر نہیں چلنے کا۔ منکوحہ عورتوں کے سوا مقاربت کو وہ منحوس جائز نہیں سمجھتا تو پھر یہ فضول بات ذہن سے نکال دینی چاہیے کہ...

”درست...“ ہیولے نے کہا، ”تو بندہ نواز! عورت کو خارج از بحث سمجھوں؟۔ یہ کہو کہ ہتھیار کے بارے میں کیا خیال ہے؟“

دریا خان دل ہی دل میں ہنسا۔ ہتھیار؟ شادی خان ہتھیار اپنے ہی استعمال کرتا ہے۔ دوسرے کا ہتھیار چھوتا بھی نہیں اور بے مثال تلور یا ہے۔ کون ہوگا جو اُسے خراش بھی

دے سکے!

”بجا ارشاد ہوا... اچھا اگر عطر یا لباس کے تحفے استعمال کراتے ہوئے...؟“
 نہ عطر نہ لباس۔ ایسے تحائف وہ صرف اپنے قرابت داروں اور دوستوں سے لیتا ہے۔
 ”اور برتن؟“

دریا خان کو افانزو کے لائے ہوئے برتن یاد آئے۔ انھی برتنوں کا پیچھا کرتا وہ یہاں تک پہنچا تھا۔ اس نے سلطان اور سلطانہ کی سلامتی سے متعلق اپنی تشویش کو یاد کیا، مگر ساتھ ہی ہیولے کی چھبھاتی ہوئی آواز آئی، جس نے خیال کا سلسلہ توڑ دیا۔ وہ کہتا تھا، ”عالی جاہ! برتنوں کی حکمت میں دیر لگے گی جب کہ شادی خان سوختہ نصیب کو حضور، ازراہ مصلحت شاید اتنا وقت دینے پر تیار نہ ہوں۔“

دریا نے اپنے دل کو ٹٹولا۔ شادی خان سے نجات جس قدر جلد ممکن ہو، بہتر ہے۔ دبیر مملکت کی مسند کے لیے اگرچہ اس نے اتنی چاہت سے پہلے کبھی نہیں سوچا تھا، تاہم... آگے کرسی میں بیٹھے ہیولے نے دریا خان سے اس اہم معاملے میں گفتگو جاری رکھی۔ دریا کی آنکھیں کمرے کی تاریکی کی عادی ہو چکی تھیں۔ وہ بے چینی جو اس نے آتے ہی محسوس کی تھی، اب نہیں تھی۔ دریا، شادی خان سیہ رو کے مسئلے کو طے کر کے جانا چاہتا تھا۔ کیا خوب اتفاق ہے کہ اس شخص نے یہ موضوع خود ہی چھیڑ دیا ہے۔ اس لیے بات فیصلہ کن ہو جائے تو انبہ ہے۔

مگر فی الاصل یہ کوئی اتفاق نہیں تھا کہ دریا خان ہیولے تک آ پہنچا تھا۔ اس تاریک کمرے کے مماثل ایک تاریک کمرہ اور تھا جس میں عین میں اس ہیولے کا ہم شکل ایک سایہ کرسی میں ٹانگیں پھیلائے بیٹھا چہچہا رہا تھا اور اپنے عالی قدر مہمان دبیر دولت شادی خان فرملی کو سامنے بٹھائے عرض کرتا تھا کہ بندہ نواز! غور کیا جائے کہ نجاب دار دریا خان سے (جو شادی خان کی مسند کے درپے ہے) نجات حاصل کرنے کے لیے کیا حکمت وضع کی جاسکتی ہے؟

اور ایسے ہی ایک اور تاریک کمرے میں، ایک اور فراخ کرسی میں ٹانگیں پھیلائے بیٹھا، ایسا ہی ایک اور ہیولا خوشامد میں چہچہا رہا تھا اور دریا اور شادی سے کہیں زیادہ عالی منزلت ایک نرتاج دار (یا شاید وہ مادہ تھی) کو آمادہ کر رہا تھا کہ رعایا پر گرفت رکھنے کے لیے کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ بعض عمائد مملکت کو عطر اور لباس کے تحائف دیے جائیں؟ یا برتنوں کے تحفے؟

اور مواصلت کے لیے بہ حکمت تیار کی گئی ناکتخدا عورتوں کے تحفے؟ کس لیے کہ ان اشیاء سے متعلق حکمت اس خانہ زاد کے پاس فی الوقت موجود ہے۔

اور اس خدائی خوار عمارت کے ہزار خدائی خوار کمروں کی تاریکی سے، جیسے سمجھو چڑیوں کی آوازیں چلی آرہی تھیں، جب شام پڑے وہ کنجوں میں شور کرتی اور چہچہاتی ہیں۔ اور یہاں یہ کہانی ختم اور شروع ہوتی ہے۔



نربدا اور دوسرى كهانیاں

پہلى اشاعت: ۲۰۰۳ء

فہرست

۳۸۳	نربدا
۴۱۲	رگھو با اور تاریخِ فرشتہ
۴۶۶	اک بیٹھے دن کا انت
۴۹۲	نصیبوں والیاں
۵۰۹	جانی میاں
۵۲۶	داستانِ سرائے
۵۳۶	موتیر کی باڑی
۵۶۹	آلی گجر کی آخری کہانی
۵۷۷	ندی اور آدمی
۵۸۲	مرد، عورت، بچہ اور سلوتری
۶۰۲	ایک دشت سے گزرتے ہوئے
۶۱۷	خفت میں پڑا ہوا مرد

نَرَبَدَا

ابھی کوئی کہتا تھا کہ ساؤنت اور دلاور ختم ہوتے جا رہے ہیں۔ endangered species میں سے ہیں۔ یہ بھی سنا تھا کہ بالکل ختم ہو گئے، ڈوڈو پرندے کی طرح۔ اور اگر کہیں اُن کا ذکر ملتا ہے تو بس افسانوں کہانیوں میں۔ مارکیٹ اکونومی اور کنزیومرازم اور احتیاج اور ازلی خود غرضی اور خونی بوا سیر اور ریموٹ کنٹرول نے اُنھیں بالآخر نمٹا دیا، اس لیے اُن پر اصرار کرنا anachronism پر اصرار کرنا ہے۔

چلیے یوں ہی سہی... ذکر کرنے میں تو کچھ نہیں جاتا۔ اس لیے آئیے ذکر کرتے ہیں ساؤنتوں کا۔ ایک کہانی جوڑتے ہیں۔

تو پہلے اُس کا ڈھانچا کھڑا کر لیا جائے۔ زمانہ، جگہیں، لوگ۔

زمانہ؟ وہی جو مجھے کہانیاں سنانے کے لیے اچھا لگتا ہے Sur ...

Interregnum ... بلکہ خود فرید خان شیر شاہ سوری کی بادشاہت کے ساڑھے چار برس کہ جب اُس نے سات آٹھ سو کوس لمبی ایک شاہ راہ بنوائی، زمینوں کا انصرام درست کیا اور ہند کے شورش زدہ علاقوں میں امن قائم کیا تھا اور اپنی تلوار اور تدبر سے فتنہ انگیزیوں کا خاتمہ کر کے خلقت کے لیے خدا کی زمین رہنے لائق بنا دی تھی۔

جگہیں؟ جگہوں میں دریا، پہاڑ، سطح میدان، چھوٹی بستیاں، گاؤں، جنھیں جاننا

اچھا لگتا ہے۔

تو لیجیے، دریا... مگر دریا کو آدمی اور آدمی کو دریا دو سو برس میں اپناتا ہے اور کہیں پان سو برس میں جا کے دوست بناتا ہے۔ میرا اپنا دریا کوئی نہیں، اس لیے لیجیے، میرے پُرکھوں کا اپنا دریا ہو اور یا بُرا بُدا۔ (ترب دامیا!)

اور پہاڑ؟ ست پڑا، یا پھر سمو چا وندھیا چل۔ (بے وندھیا!)

اور بستی؟ مانڈو، جسے فارسی میں مندو لکھا اور بولا جاتا تھا اور ایک گاؤں، بہت چھوٹا سا گاؤں، تل وندھی (جسے فارسی بولتے ہوئے مغل ”تل وند“ پکارتے تھے۔ جیسے پچاس گھروں کا گاؤں نہ ہوا الوند، ہلمند ہو گیا)۔

اور لوگ؟ دورا جپوت باپ بیٹے، نارنگ اور سارنگ... کنور بکرم نارنگ سنگھ اوجینی اور کنور بکرم سارنگ سنگھ اوجینی اور ایک نو عمر لڑکی، کہ جیسی ساونتی کہانیوں میں لڑکیوں کو ہونا چاہیے: بلند قامت، گوری چٹّی، مظلوم... یا شاید مظلوم نہیں۔ اور چار حرام زادے ٹھگ اور بہت سے پٹے پٹائے محروم لوگ اور صاحبِ ثروت باختیار لوگوں کے بے اختیار lackeys اور زر خرید پنڈے اور جی حضوریے اور دوسرے حشرات الارض۔

ہمارے پرئی پل کردار... ساونت اور لڑکی اور ٹھگ... خاندیش سے آتے ہوئے دریا پار کریں گے اور دریا کے پاس ہی بے اس گاؤں تل وندھی میں رکیں گے اور اگر گئے تو آگے شمال کی طرف مانڈو کو روانہ ہو جائیں گے، یعنی یہ منصوبہ ہے۔ کیوں کہ خاندیش کے کھیت مزدوروں کے قافلے کے قافلے مانڈو پہنچ رہے تھے۔ ویسے شیر شاہی بندوبست (کم رفتاری سے ہی سہی) خاندیش کے بد حال مزارعوں تک پہنچنا شروع ہو گیا تھا۔ اُن کے بادشاہ میاں مبارک شاہ نے سلطانِ عادل کی اطاعت قبول کر لی تھی اور اپنی بیٹی کا ڈولا شیر شاہی حرم میں پہنچا دیا تھا۔ مگر بادشاہوں کے دستور کے مطابق شیر شاہ نے مبارک شاہ کی بیٹی کو ملکہ نہیں بنایا۔ فرمان جاری ہوا کہ یہ شاہ زادی اب سلطانِ عادل کی منہ بولی بیٹی ہے، اسے ملک مالوہ بندیل کھنڈ کے فلاں علاقے میں خاصے کے فلاں فلاں گاؤں عطا کیے جاتے ہیں۔ اس طرح خاندیش والوں نے خواب دیکھنا شروع کر دیے کہ ملک پنجاب و دوآبہ کی طرح اُن کے کھیتوں میں بھی اب سونا اگنے لگے گا۔

پرانے خوش حال علاقوں کی طرف نقل مکانی شروع ہو گئی۔ خاندیش میں جن کے

پاس ايك بگهه زمين تك نه هو كى اهيں اميد تهي كه سلطاني قلمرو ميں چند روز ميں اپني محنت سے وه ايك كهيت، ايك باڑے كه تو مالك بن هي جائين گے۔
تواب... آگے چلتے هيں۔

خاندلش كه ميكهى بار علاقه كه مفلوك الحال كسانوں كي ايك خراب و خسته بيل گاڑى۔ بيل گاڑى كو بهك مرے بيلوں كي جوڑى چيونى كي رفتار سے كهينچتى هوئى دريا كي طرف لے جانے كا جتن كر رهي هے۔

اس بيل گاڑى ميں وه تينوں سوار هيں... بڑها بكرم نارنگ سنگه، اس كا بيٹا بكرم سارنگ سنگه اور وه لڑكى۔

نارنگ سنگه كو پرانا دمہ تها۔ بيٹے نے باره پندرہ دن سے ڈاڑهي كو استرا نهين لگايا تها۔ باپ كه سامنے بيٹھ كر استرا چلانا اسے اچھا نهين لگتا تها۔ هاں اپني مونچھوں كو آنكه بچا كه وه كبهي تاؤ ضرور دے ليتا تها۔ لڑكي كه شانے پر تلوار كا پرانا زخم تها... چھه آٹھ دن پرانا۔

لڑكهڑاتي هوئى بيل گاڑى گڑواٹ پكڑے پكڑے برگد كه ايك چھتار كه نيچے پينچ كر رك گئى۔ يهاں جا به جا به قاعده چولھے بنے تھے اور نئے پرانے الاؤوں كه نشان تھے۔ گاڑى ركته هي لڑكا سارنگ ٹهيے سے اٹھا اور تكيے كي موٹھ پر هتھيلى جما كه پھرتى سے الٹى چھلانگ لگاتا زمين پر آكهڑا هوا۔ اس نے يه سب دكھاوے كه ليے نهين كيا تها۔ ايك پهر سے وه گاڑى هانكتا هوا آيا تها تو گاڑى كي ماٹھى چال نے هاتھ پيرون ميں آلكس بهردى تهي، اس سے پيچھا چھڑانا ضرورى تها۔ اب اس نے پكچھلے تختے سے بندھا مشكينزه كهولا اور باپ كو پاني پلايا۔ بوڑھے نے اوك سے پاني پيا تها۔ لڑكي اسے محويت سے ديكھ رهي تهي۔ بوڑھے نے ايك قطره بهي نه كرنے ديا۔ پاني پي كر اس نے كيلے هاتھوں سے اپنا چهره تر كيا اور دهيرے سے كها، ”مااے بھواني!“

لڑكه نے مشكينزه لڑكي كي طرف بڑهايا تو وه شپٹا گئى۔ بولى، ”كوئى برتن، آنخوره... پاني كه ليے كچھ نهين تمهارے پاس؟“

لڑكه نے انكار ميں سر بهلایا، بولا، ”ٹوٹ كيا تها۔ پھينك ديا۔ اوك سے پي لو۔“ لڑكي كهنے لگى، ”مجھے نهين آتا۔ هم لوگ تمھاري طرح اوك سے نهين پيتے۔“ پھر جلدى سے بولى، ”هم پي نهين سكتے۔ بهت سا پاني كرا ديتے هيں، آتا نهين پينا۔“

لڑکا مسکرا دیا۔ بونگے پن سے بولا، ”تو چھاگل سے منہ لگا کے پی لو۔“
 بوڑھے نے، جو ابھی تک بے تعلقی سے دونوں کی باتیں سن رہا تھا، پہلو بدلا اور منہ
 سے غراہٹ کی آواز نکالی۔ لڑکی انکار میں سر ہلاتے ہوئے جلدی جلدی کہنے لگی، ”نہیں نہیں۔
 مشکیزہ جوٹھا ہو جائے گا۔ بتایا تو ہے۔ میں تمھاری قوم سے نہیں ہوں۔“
 ”تو کیا ہوا۔ پر ہاں، ٹھیک کہتی ہو۔ بابا کے لیے جوٹھا ہو جائے گا۔“
 ”اور تمھارے لیے بھی۔“

اس نے انکار میں سر ہلایا۔ ”ناں۔ میرے لیے نہیں۔“ یہ کہہ کے وہ گاڑی میں
 بچھے پیال میں ادھر ادھر ہاتھ مارنے لگا۔ لڑکی کو اس کی بات عجیب لگی تھی تو وہ اس کی طرف
 دیکھنے لگی، مگر لڑکے کے چہرے پہ سادگی تھی۔ وہ سمجھ گئی کہ بات میں کوئی پینترا نہیں ہے۔

بوڑھے نے پوچھا، ”ارے کیا ڈھونڈ رہے رے؟“
 لڑکا جھونجھل سے بولا، ”ایک گڑوی بھی تو تھی اپنے پاس؟“
 بوڑھے نے گہری سانس بھری، ”ہاں یہ رہی۔ پر اس میں تو نمک کی ڈلی بھردی ہے۔“
 ”لاؤ ادھر دو۔“

بوڑھے نے پیتل کی گڑوی لڑکے کی طرف بڑھائی، ”لے، پر کرے گا کیا؟“ اتنی سی
 بات میں اس کا سانس پھول گیا۔

”دیکھتے جاؤ،“ کہہ کر لڑکے نے گڑوی اپنے انگوچھے پہ الٹ لی، اسے کپڑے سے
 صاف کر کے مشکیزے سے پانی لے لڑکی کی طرف بڑھا دیا۔
 لڑکی بہت پیاسی تھی۔ سارا پانی پی گئی۔
 لڑکے نے پوچھا، ”اور چیتے؟“

”نہیں۔“ وہ بولی، ”ابھی بہت دور جانا ہے۔ چار چھ کوس آگے ملے گا دریا۔ بچ
 میں کوئی کنواں باؤلی بھی نہیں۔“

لڑکے نے پانی پینا شروع کر دیا تھا۔
 پانی پی چکا تو اس نے گیلی ہتھیلیوں سے اپنے پوٹے ملے اور کہا، ”ہاہا... کیا مجھے کا
 پانی ہے!“ پھر بولا، ”ای جگے تمھاری دیکھی بھالی ہے؟“
 ”ہوں۔“

”کیسے؟“

”میرے بابا، ملو خان کے بندوبست میں اہلکار تھے۔“

ملو خان کبھی مانڈو کا حکمراں تھا۔ شیر شاہ کے سالار شجاعت خان سوری نے اسے کھدیڑ کے گجرات میں پناہ لینے پہ مجبور کر دیا تھا۔ بوڑھے نے، جو منہ پہ چادر ڈالے پیال پر گٹھری بنا ہانپ رہا تھا، سر اٹھایا اور لڑکی کو کڑی نظروں سے دیکھا۔ ”کیا تھے تیرے باپ؟... ملو کھان کے پاس کیا کرتے تھے؟“

جواب دینے سے پہلے لڑکی نے لڑکے کی طرف دیکھا۔ اس نے سر کے اشارے سے تسلی دی کہ گھبراؤ مت۔ لڑکی بولی، ”شحنہ تھے میرے بابا۔“
 بوڑھے کو جیسے اتنے ہی برے جواب کی توقع تھی۔ ہلکی جھلسن کے ساتھ بولا، ”اچھا، کو تو ال کی بیٹیا ہے؟... کیا نام ہے کو تو ال کا؟“
 ”جمرو شانا تھا میرے بابا کا... گزر گئے۔“

بوڑھا ”اوں“ کہہ کے چپ ہو گیا۔ اس ”اوں“ کا کچھ بھی مطلب ہو سکتا تھا۔ مرضی مالک کی... ہمیں کیا... یا یہ تو ایک دن ہونا ہی تھا... کچھ بھی۔
 لڑکی نے پوچھا، ”آپ جانتے تھے بابا کو؟“
 ”آں؟... نہیں نہیں، بس نام سنا ہے۔ لوگ کہتے ہیں بھلا آدمی تھا جمرو شحنہ۔“
 کانٹا سا نکل گیا۔ لڑکی نے پھر لڑکے کو دیکھا، وہ مسکرا رہا تھا۔ مگر دونوں سمجھ گئے تھے کہ بڑے میاں کو جتنا علم ہے اس سے کم بتا رہے ہیں۔

لڑکی سمجھی بات ختم ہو گئی۔ وہ گاڑی میں اپنی جگہ سنبھالنے کو بڑھی تھی کہ بوڑھے کی ہانپتی ہوئی آواز آئی، ”بھلا تو مانڈو کا امن امان تج کے چندیری میں کھوار ہونے کاے کو گئی تھی؟“
 لڑکی نے سوچا کھیل میں شامل ہوئے بنا چارہ نہیں۔ اس نے بھی ایک گول مول لفظ کہہ دیا، بولی، ”بس۔“

بوڑھا راجپوت گرمی کھا کے بولا، ”چندیری رائے سین میں تو اس... اس پورن مل کی تانا شاہی چل رہی ہے... حرام جادے کی۔“

لڑکے نے دھیمی ملامت سے کہا، ”اہوں... بابا!“
 ”ہاں ہاں سن لیا،“ بوڑھے کی تجل آواز آئی۔ لڑکی نہ ہوتی تو وہ اس حرام جادے

کے لیے اور بھی کچھ کہتا۔

چندیری کا نام سن کے لڑکی کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا تھا۔ اس نے اپنا لہنگا لگڑا سمیٹ کے جیسے کسی ناموجود خنکی سے بچاؤ کرنا چاہا۔ لڑکے نے سوچا شانے کا زخم کھٹک رہا ہوگا جہی بے چاری کا پتی ہے۔ اس نے باپ کو سر کے اشارے سے منع کیا... مطلب، رہنے دے بابا، کوئی اور بات کر... مگر وہ اپنی رو میں بولے چلا جا رہا تھا، ”چندیری رائے سین میں تیرے اپنے کوئی ہیں؟“

لڑکی بے چین ہو کے بولی، ”میں وہاں سے نہیں آرہی، چندیری سے۔ میرا کوئی نہیں وہاں۔“

بوڑھا حجت کرنے پہ تل گیا تھا، ”سیرے بی تو نے یہی بتایا تھا...“
”چھوڑ بابا، یہ کیا لے بیٹھا۔“

بوڑھا پھر گرمی کھا گیا، ”کیا چھوڑوں بھلا؟ بات بھی نہیں کرنے دیتا... ارے جب تو اسے بوڑی سے اٹھا کے لایا ہے، کھونم کھون، جی بی تو یہ ایسے ہی بولتی تھی کی چندیری کی ہوں۔ ارے ہے تو ہے چندیری کی۔ اس میں لکانے چھپانے کی کون بات ہے۔“ بڑبڑاتے ہوئے اس کی آواز ڈوب سی گئی۔ اس نے اوپر چادر لے لی تھی مگر پھر چادر سرکا کے ایک بار پوچھا، ”ادھر تیری شادی تو نہیں ہوئی تھی... چندیری میں؟“

جواب نہیں ملا تو ہانپتے ہوئے اس نے چادر میں دوبارہ سر چھپا لیا۔

لڑکا مزے میں سر ہلا ہلا کے ہنسنے لگا۔ ساتھ میں ڈر بھی رہا تھا کہ بابا کہیں برا نہ مان جائے۔ اس نے منہ مارنے کو پوچھا، ”کہو تو گاڑی بڑھائیں۔ ہاں رے بابا؟... گھنار ستا پڑا ہے؟“
بڑے میاں نے منہ لپیٹے لپیٹے کچھ کہا جو بیٹے کی سمجھ میں نہ آیا۔ دھیمی آواز میں لڑکی سے کہنے لگا، ”تم کہو تو چلتے ہیں۔ یا روٹی بنالیں؟... بھوک لگی ہوگی؟“
”نہیں نہیں... ٹھیک ہے۔“

”کیا ٹھیک ہے؟“

”یہی... ہاں، روٹی بنالو۔ میں بنا دوں گی روٹی۔“ وہ لڑکے سے بات کر رہی تھی مگر

دھیان اس کا رستے پر ہی تھا۔

لڑکے نے نرمی سے اس کے سر کو ہاتھ لگایا۔ ”ڈرو مت۔ بہت آگے آگے ہیں۔“

اب تو ماندو کا پڑوس لگ گیا ہے۔ اب کوئی نہیں آئے گا۔“

لڑکی نے کئی بار ہاں میں سر ہلایا۔ وہ گاڑی سے اترنے کو اٹھی، تختے پر ہاتھ جماتی تھی کہ تکلیف سے چکرا کے پھر بیٹھ گئی۔ گھاؤ میں کھٹک ہو رہی ہوگی۔ لڑکا بولا، ”بیٹھی رہو۔“
”نہیں میں اتروں گی۔“

”تو ٹھیرو... میری پانہ تھام کے اترو۔“ اس نے اپنے مضبوط بازو تختے پر جما دیے، پشتہ سا بن گیا۔ لڑکی پہلے ہچکھی مگر اس کے بازوؤں پر اپنی کہنی اور بازو نکاتی سہولت سے اتر آئی۔ اس کا پیر زمین پر لگتے ہی لڑکا دور ہٹ کے کھڑا ہو گیا۔ ”کھیاں سے ہلوڈ لوگی تو جلدی بھر جائے گا۔ گھاؤ کوئی گہرا نہیں، ای بات اچھی ہے۔“

گاڑی کے ہچکولے سے بوڑھے کی آنکھ کھل گئی۔ اس نے جھپکی لی تھی، سمجھا ہوگا گاڑی چل رہی ہے۔ پھر وہ لڑکے اور لڑکی کو برتن بھانڈے اٹھاتے دیکھ کے تسلی سے سر ہلانے لگا۔ بولا، ”ہاں رے سارنگا! کچھ کھاپی لے، پھر چلنا آگے۔“

لڑکے نے کہا، ”ہو!“ مگر بوڑھا اس کی طرف متوجہ نہیں تھا۔ وہ لڑکی کے لباس کو ایک نکل دیکھے جارہا تھا۔ لڑکے سے کچھ کہتی ہوئی لڑکی اس کے رخ گھومی تو کسی یاد سے بوجھل آواز میں بوڑھا جیسے خود سے کہنے لگا، ”ٹھکرائن نے یہ لہنگا لگڑا آکھری دفعے شورا تری پہ پہنا تھا۔ ہاں رے سارنگا؟... اب پھر شورا تری آرتی ہے۔ کتے ایک دن رہ گئے؟“

لڑکے نے کوئی جواب نہ دیا تو اونچی آواز سے بوڑھے نے لڑکی کو مخاطب کیا، ”یہ لہنگا لگڑا جو تو پہنے ہے نہیں، یہ سارنگ سنگھ کی ماں ٹھکرائن نے...“

لڑکے نے اسے بات ہی پوری نہ کرنے دی۔ بولا، ”ہاں ہاں، شورا تری پہ پہنا تھا۔ ای بتاؤ روٹی کھاؤ گے کی سکر کنڈی بھون دوں؟“

”جو تیرا جی چاہے کر... بات بھی نہیں کرنے دیتا، شالو!... ٹرٹر کیے جاتا ہے۔“

لڑکے نے شرارت سے مینڈک کی آواز نکالی مگر باپ نے تیوریاں چڑھائے رکھیں۔ وہ پیال پر پھیل کے لیٹ گیا تھا اور موٹی دولائی پیروں پر ڈال پھر سے اونگھنے لگا تھا۔ لڑکے نے تھوڑی چلت پھرت سے لکڑیاں اکٹھی کر لی تھیں اور اینٹ پتھر کے کام چلاؤ چولھے میں آگ جلا دی تھی۔

لڑکی چولھے کے پاس جا بیٹھی، بالکل ویسے ہی جیسے ہزاروں برس سے عورتیں

چوہوں کے پاس جا جا کے بیٹھتی رہی ہیں۔ لڑکے نے اسے مسکرا کے دیکھا اور دو پھیروں میں گاڑی سے بہت سی پوٹلیاں اور کلسیاں اٹھا لایا۔ ان میں گھی، دالیں، مسالے، چاول، یہی سب کچھ تھا۔ ایک ہانڈی میں پانی نمک ڈال اس نے دال پکنے کو چڑھا دی۔ لڑکی نے چھاگل سے پانی لے ہاتھ دھوئے اور پرات اور آٹے کی پوٹلی کھینچ کے اپنے سامنے کر لی۔

لڑکے نے پوچھا، ”کیا کرتی ہو؟“

”آٹا گوندھوں گی۔“

”تم گوندھو گی آٹا؟“

لڑکی نے ہاں میں سر ہلایا۔

لڑکا بولا، ”سنو... پہلے بابا کی روٹی میں بنا لیتا ہوں۔ پیچھے تمہارا جی چاہے تو اپنے میرے لیے روٹی بنا لینا۔“

ریشم کے کورے تھان کے سے رنگ والے چہرے پہ گلال پھیل گیا۔ ”اٹا! میں تو بھول ہی گئی تھی کہ تم لوگ میری بنائی ہوئی روٹی نہیں کھاؤ گے۔“

”نہیں نہیں، میں تو کھاؤں گا۔ بابا بھی کھا سکتا تھا پر اس وخت دکھی ہو رہا ہے۔ الجھے گا۔... سنا نہیں، ابھی ماں کو یاد کر رہا تھا۔“

لڑکی سمجھ داروں کی طرح سر ہلاتی چولھے سے دور جا بیٹھی اور لڑکے کو آٹا گوندھتے دیکھنے لگی۔ پھر بولی، ”سارنگ سنگھ!“

”ہو!“

”تم نے اپنی ماں کا سب سے اچھا جوڑا مجھے پہننے کو دیا ہے تو تمہارا بابا اس بات سے ناخوش تو نہیں ہے؟“

لڑکے نے آٹے کو کھلی لگاتے ہوئے ایک بار لڑکی کی طرف دیکھا، ”میرا بابا بڑے دل کا آدمی ہے۔ اوجینی راجپوت ہے، چھوٹی بات من میں نہیں آنے دیتا۔“

لڑکی نے ہاتھ اٹھا کے جیسے اپنی بات سمجھانی چاہی، ”ناں ناں، چھوٹے دل کی بات نہیں ہے... بابا سوچتا ہوگا انھیں سنبھال کے رکھنا تھا... ماں کی نشانی تو ہیں نا یہ؟“

”ٹھیک ہے، پر بابا نے کچھ رکھا ہی نہیں۔ گھر بار کھتم کر کے آگ لگا دی گرہستی کو

بس... کپڑے بچا لیے تھے میں نے۔“

لڑکی چولھے کے پاس کھسک آئی، ”گھر بار ختم کر دیا؟... کیوں؟“
 وہ دھیرے سے بولا، ”ماں نہیں رہی تو گھر بار کس کام کا؟“
 ”گھر بار نہ سہی، پھر بھی۔ رکتا کچھ نہیں۔ جینا مرنا تو چلتا رہتا ہے۔“
 ”ہوں۔ سب چلتا رہے گا۔ راج دھانی پہنچ کے میں سواروں میں نام لکھا لوں گا...
 اپنی گرجھتی پھیلا لوں گا۔“

”اور تمہارے بابا؟“
 ”بابا سادھ لے لے گا۔“
 ”سادھ؟“

”ہاں... جوگی کا بانا پہن لے گا بابا۔ سادھو بن جائے گا۔“
 ”اوہ!“ لڑکی بڑھے راجپوت کے لیے دکھی ہو گئی۔

لڑکے نے ہاتھ کا کام روک دیا۔ ”بابا کہتا ہے... اب ایسا ہے کی زندگی سے منے
 جتا کچھ لینا تھا لے لیا۔“ وہ رکا، دھیرے سے ہنس کر کہنے لگا، ”بابا میرا کہتا ہے کہ تو مل گیا
 مجھے۔ بس اوجینیوں کا نام، ان کی پریم پر اچل پڑی اور اپنا کہتا ہے کی آگے سونیہ ہے اور سناٹا
 جیسا ہے۔ سمجھو ایک اپار چپ سی جس کے بیچ اور جس کے آگے کوئی آکار نہیں، کوئی اواج
 نہیں... بس مون ہے... کھاموسی۔ ای بات کرتا ہے میرا بابا۔“

باپ ہل ڈل رہا تھا۔ لڑکے نے گاڑی کی طرف دیکھا، اونچی چمک دار آواز میں لاڈ
 سے بولا، ”ہاں بابا، تو اٹھ گیا؟ آروٹی کھالے۔“

لڑکا باپ کو روٹی کھلا چکا تو پرات سنبھال لے لڑکی کی طرف آیا، بولا، ”اب اپنے لیے،
 میرے لیے روٹی بنا لو۔“

لڑکی نے روٹی بنالی، دونوں نے ساتھ بیٹھ کے کھا پی لیا۔ برگد متلے ایک پہر گزار
 کے یہ چل پڑے۔ رات آگئی۔ یہ کچھوے کی رفتار سے چلتے رہے۔

نربدا کے پتن تک پہنچتے پہنچتے اگلے دن کا سورج اگنے کو تھا۔ لڑکی نے ایک دھیمی
 اداسی اور شکر گزاری کے ملے جلے سبھاؤ سے نئے دن کا استقبال کیا۔ لڑکا جو ٹھیک پہ بیٹھا اونگھتا
 ہوا، کبھی بیلوں کو ٹٹکارتا، کبھی آٹھا کے بول کہتا، بوڑھے کو باتوں میں الجھاتا چلا آ رہا تھا، آسمان
 کی گلابی دیکھ کے ٹھیکے سے کود گیا۔ اس نے ہاتھ باندھ کے ایک بار اپنی پیشانی کو چھوا، پھر

دونوں مٹھیاں کس کے جیسے کسی ادیکھی کٹار کے قبضے پر گرفت جمائے ہوئے ہوا میں وار کیا، ”جے! ما آاے نرب دا!“

وہ نربدا ماں کی جے کار کرتا تھا۔ لڑکی ہولے سے مسکرائی۔ اس نے روشن آنکھوں سے دیکھا، سامنے گلابی دریا بہہ رہا تھا... نربدا... جیچون گلگونہ رنگ... مگر یہ تو آسمان ہے جو دریا میں اتر آیا ہے۔

ابھی اس نے دریا کے چہرے سے نظریں ہٹائی بھی نہ تھیں کہ صبح کا سناٹا بوڑھے راجپوت کی کوڑے جیسی آواز سے چنچ گیا، ”سارنگا! گڑواٹ کی اور دیکھ۔“ لڑکے نے سر گھمایا۔ ”دیکھ ٹیلے کی اوٹ سے نکل رہے ہیں...“

لڑکی نے اس کے اشارے کی سیدھ میں دیکھا۔

وہ چار تھے۔ گھوڑوں پہ سوار، اپنے ہتھیار دکھاتے ہوئے، سیدھے نیل گاڑی کی طرف آرہے تھے۔ ان کی کئی رنگ کی مندیلیں اور بھگوا، بینجی، مشکئی اور لال صدریاں نئے دن کی روشنی میں چمک کر اجل گنی تھیں اور اصل سے کہیں زیادہ رنگین دکھائی پڑتی تھیں۔

باپ بیٹے کی آنکھیں جیسے شکرے بن گئیں۔ دونوں ایک ساتھ بڑبڑائے، ”بٹ مار ہیں سرے!“ بوڑھے نے پتن کی ریت پہ تھوک دیا۔

دوبارہ اس نے کہا، ”ٹھگ ہیں حرام کے جنے!“ اور شانوں پر پڑی ہوئی اپنی دولائی گرا دی۔ پھر کانوں سے لپٹی چادر پھینک گاڑی کے پیال میں ہاتھ ڈال دیا۔ ذرا کی ذرا میں اس نے اپنی نیام کی ہوئی سروہی، کٹار اور سوا بالشت چوڑی راجپوتی ڈھال پیال سے نکال لی تھی۔ پٹکے میں کٹار اس کے کمر سے نیام کا پر تلا باندھتے ہوئے ”ما آاے بھوانی!“ کہتا وہ گاڑی چھوڑ رساں سے زمین پہ آکھڑا ہوا۔ ایک بار اس نے اپنی تلوار کے قبضے کو چھوا۔ وہ ہاتھ اپنے ماتھے اور آنکھوں پہ پھیرتا ہوا ہونٹوں تک لایا، اسے چوم کر تلوار کے قبضے پر مضبوط گرفت قائم کی اور بیٹے کی طرف دیکھ کر کہا، ”ہاں رے سپتر سارنگ سنگھ!“

لڑکے نے بھی یہی سب کرتے ہوئے دھیرے سے کہا، ”ہاں رے بابا!“

دونوں نے اپنی اپنی تیاری کی خبر دی تھی۔

لڑکے کی کمر سے کھانڈا بندھا تھا۔ کھانڈا بوڑھے کی سروہی سے کوئی سوائی ڈیوڑھی لمبائی کا تھا۔ ایسے ہتھیار بلخ اور بخارا سے منگائے جاتے تھے اور صرف نوجوان تلوریوں میں

مقبول تھے۔ پرانی ڈھب کے ساونت انھیں دیکھ دیکھ کے ہنستے تھے اور طنز کرتے تھے کہ گنوار کھا مرے یا اٹھا مرے... کہتے تھے، ”ای کھانڈا چھوڑ، ککھاڑا کا ہے نہیں باندھ لیہو کمر سے، ہاں بھیا؟“

لڑکی یاد کر کے مسکرائی۔ اس نے بٹ ماروں کو بڑھتے اور دونوں کو تیاری کرتے دیکھا۔ باپ بیٹے کی حرکات میں ایک طرح کی ہمواری اور سبھاؤ میں دھیمپن تھا... گھات کرتے چیتے کا دھیمپن کہ جب وہ زمین سے پیٹ لگائے ایک ایک قدم بڑھ رہا ہوتا ہے۔ ٹھگوں کے تو مرکب تک او بڑکھا بڑٹانگیں مارتے آرہے تھے۔

لڑکے نے اب اپنی طرف کے پیال میں ہاتھ ڈال دیا۔ اس نے ایک سبک سی برچھی اور راجپوتی ڈھال کھینچ نکالی۔ ”ای لو... دونوں تمھارے ہی مطلب کے ہیں۔“ اس نے یہ ہتھیار لڑکی کی طرف بڑھا دیے۔

”اٹا!“ لڑکی نے برچھی سنبھالتے ہوئے بے اختیار تعریف کی۔ چاروں سوار خاصا بڑھ آئے تھے۔ اس نے برچھی ہاتھ میں تولی۔ زخمی شانے کو آرام دینا تھا سو ڈھال کا تسمہ الجھا کر اس نے ہاتھ کو دوسرے شانے پر ٹکا لیا اور ریت میں قدم جما کے کمر سے اوپر اپنا بدن دائیں بائیں جھلاتے ہوئے نیزہ زنی کی ابتدائی مشقیں دہرائی شروع کر دیں۔ وہ منہ ہی منہ میں شمار کرتی جارہی تھی، ”ایک، دو، تین، دائیں! ایک، دو، تین، بائیں! تین، دو، ایک، ہا! ایک، دو، تین، ہا!“ ہر ”ہا!“ پر اس کا برچھی والا ہاتھ ہوا میں مار کرتا تھا۔

لڑکا دیکھ کے مسکرانے لگا۔ مسخرے پن میں اس کی تعریف کی۔ بولا، ”ہاں آں، تمھیں تو یاد ہے۔ واوا! پورا سبک یاد ہے!“ پھر اس نے خود بھی یہ مشقیں دہرائیں۔ ”ایک، دو، تین، دائیں! ایک، دو، تین، بائیں! تین، دو، ایک، ہو! ایک، دو، تین، ہو!“ ”ہو!“ پر اس کا بھی ہاتھ نیزہ پھینکنے کا دکھاوا کرتا تھا۔

گاڑی سے سو قدم دور رہ گئے تو سواروں نے ایک دوسرے کو اشارہ دیا اور رخ مار کے گھوڑوں کو ایڑ دیتے مختلف سمتوں میں انھیں دور تک دوڑائے چلے گئے، جیسے کبوتروں کی ٹکڑی پہ باز جھپٹا مارے اور ٹکڑی پلک جھپکتے بکھر جائے۔ باپ بیٹا تو پھر لڑاکے تھے، لڑکی تک سمجھ گئی کہ چاروں کچھ دور تک اپنے گھوڑے لے جائیں گے، پھر مڑیں گے اور ایک دم نعرے مارتے ہوئے جھپٹ پڑیں گے۔ یہ پینترا طاقت دکھانے، دہشت زدہ کرنے کے لیے تھا۔

بیسویں جنگیں، سیکڑوں معرکے جھیلے ہوئے بوڑھے تلورے نے منہ سے حقارت کی آواز نکالی، ”لہہ! سؤر پالنے والوں کی اولاد! کھلواڑ کرتے ہیں کچودی کے!“ وہ بیلوں کے برابر کھڑا تھا اور انھیں تھکی دیتا جاتا تھا۔ لڑکی نے جس بوڑھے کو اونگھتے اور گاڑی کے دھچکوں سے بے حال ہوتے، کراہتے ہوئے سنا تھا، یہ وہ بوڑھا ہی نہیں تھا۔ اپنی بیماری میں جو راستے بھر ہانپتا ہوا آیا تھا، اس وقت لگتا تھا بہت آرام سے ہے۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ جھکا، اس نے دریا کنارے کی ریت اپنے سیدھے ہاتھ کے انگوٹھے پر لگائی اور ”جے ہو!“ کہتے ہوئے اسے اپنی پیشانی پر تلک کر لیا۔ تلک لگاتے ہوئے اس نے لڑکی کی طرف دیکھا تھا۔ ان بوڑھی انگارہ آنکھوں میں ایسی جوت تھی کہ لڑکی نظر نہ ملا پائی۔ سمجھ گئی کہ یہ آخری نیم ہے۔ وہ اپنی ندی کے قدموں میں پہنچ گیا تھا اور لڑتے ہوئے مر جانے کو تیار تھا۔

مڑ کے دیکھے بنا لڑکی جان گئی کہ اسی وقت لڑکے نے بھی ندی کی ریت سے تلک کیا ہوگا۔

سواروں نے وہی کیا جس کی یہ تینوں توقع کر رہے تھے۔ وہ گھوڑے پھرا کے نعرے مارتے گاڑی کی طرف جھپٹے۔

لڑکی نے کم عمری سے ہی سواروں کو آمنے سامنے کی جنگ کرتے، پہلو سے گھات کرتے، تعاقب اور پسپائی کی لڑائی لڑتے دیکھا تھا۔ اس نے سیکھا تھا کہ لڑائی میں گھڑسوار کے ارادے اس کی چلت پھرت سے زیادہ گھوڑے کے بدن کی حرکات میں نظر آ جاتے ہیں۔ جس ترکمانی استاد نے اسے شہسواری تعلیم کی تھی وہ کہتا تھا کہ لڑتا ہوا سوار اپنا اگلا قدم اپنے گھوڑے کے رگ پٹھوں پہ لکھ دیتا ہے، پڑھنے والی نظر ہونی چاہیے۔ وہ یہ بھی کہتا تھا کہ برے سوار کی پہچان یہ ہے کہ وہ اور اس کا گھوڑا دو الگ الگ بدن نظر آتے ہیں۔ لڑکی نے چند قدموں کے بعد دیکھ لیا تھا کہ حملہ آور نہ اکیلے شمشیر زن ہیں نہ ان کے گھوڑے اکیلے جانور۔ یہ تو چار ٹٹوؤں کو چار چڑی مار دوڑائے لیے آتے ہیں۔ زخمی شانے کے باوجود برچھی لہراتے ہوئے اس نے عجب توانائی محسوس کی۔

جھپٹتے ہوئے سواروں نے گاڑی والوں پر وار نہ کیا۔ وہ برچیوں کی زد سے پرے پانچ پانچ، دس دس قدم کی چھوٹ دے کے کاوا مار گئے اور تھوڑی دور جا کر گاڑی کے گرد ایک

ڈھیلے ڈھالے دائرے میں گردش کرنے لگے۔ انھوں نے دیکھ لیا تھا کہ گاڑی والوں پر ان سب باتوں کا اثر نہیں ہونے کا۔ لڑکی نے سنا، بوڑھا راجپوت اپنے بیلوں کو تھپکتا ہوا کھانسی ملی ہنسی ہنس رہا تھا۔ پھر اس نے اپنی بندیل کھنڈی میں اونچی آواز میں ایک کہاوت سنائی۔ بولا، ”سنورے سنو! اوچھا ہاتھ چلا کے بھگ لیتے تو آدھی پونی، ماشے رتی پھر بھی بات بنی رہ جاتی۔ ارے اس گیدڑ بھسکی نے تو سرے! سبرائی بھانڈا پھوڑ دیاے... ہو ہو ہو۔“ ہنستے ہنستے اسے پھر کھانسی آگئی۔

لڑکے نے زمین پر بے چینی سے پاؤں مارا۔ پکار کے بولا، ”ارے کون ہو رہے تم؟ دھول اڑانے کو کیا اے ای جگے رہ گئی تھی؟ جاؤ! کھیل تم سے کرنے کو ملک کی جمین پڑی ہے... چلو چلو ادھر سے۔“

سواروں نے اپنی گردش روک دی۔ ان میں جو بڑی عمر کا تھا، جس نے ڈاڑھی کو مانگ نکال کے اسے کلوں کانوں پہ چڑھا رکھا تھا، بھاری آواز میں بولا، ”ای کونوں کھیل تم سے نہیں رہے۔ ترنت جواب دے۔ کون ہے تو؟ کاں سے آ رہے؟ کدھر جاتا ہے؟“

بوڑھا راج پوت بولا، ”بھلا تو کون پوچھنے والا؟ شیر شاہ کی رعیت ہیں۔ جدھر کو مرجی کرے گی جان گے۔ چل ادھر سے سورے! گھوڑا کدانا بند کر نہیں بیل بد کے گا۔“

مانگ دار ڈاڑھی والا حقارت سے بولا، رعیت سیر ساہ کی؟ واہ رے وا! ادھر کا کر رہے تھے کھانڈیس ماں؟... ای جنانی تہاری کون ہے؟“

سارنگ سنگھ کڑک کے بولا، ”جنانی ٹھا کروں کے سنگ ہے۔ سمجھو ٹھکرائن ہے۔ نجر پنچی کر، نہیں ہم آنکھ نکال لیں گے۔“

لڑکی نے سوچا لہنگا لگڑا ہوتے بھی یہ جان گئے ہیں کہ ٹھا کروں کی عورت نہیں، میں اور قوم کی ہوں۔

بٹ ماروں میں جو سب سے نو عمر تھا اور لڑکی کو برابر گھورے جا رہا تھا، سارنگ کی بات سن کے اس نے بے سوچے سمجھے گھوڑا بڑھا دیا۔ لڑکی نے دیکھا، راج پوت لڑکے نے ٹھکی ہوئی ریت میں آسانی سے ترچھے ڈیڑھ قدم لیے، پھر نیزے کو تول کے انی کی چمک میں اسے پہلے بائیں طرف، پھر دائیں طرف دکھایا۔ اگر مانگ دار ڈاڑھی والا اپنے نو عمر ساتھی کو گھوڑا پھراتے میں ایک بازو ٹھیل نہ دیتا تو لڑکی نے سارنگ کی چلت کی آخری گنتی دل ہی دل میں

گن لی تھی۔ تین، دو، ایک، ہا! اس آواز پر اس نے خیال ہی خیال میں لڑکے کا نیزہ جیسے سوار کی لال صدری کے بائیں طرف کے تکمے پر مار کرتے دیکھا۔ مگر نہیں، راجپوت لڑکے کا ہاتھ رکا ہوا تھا۔ ہدف نے جگہ چھوڑ دی تھی، نیزہ لڑکے کے ہاتھ ہی میں رہا۔ آگے آنے والے دونوں سواروں کے جانور چمک کے ہٹ گئے۔

مانگ دارڈاڑھی والا گھوڑا سنبھالتے ہوئے بولا، ”جیادہ گرمی مت دکھا ٹھاکر! بات سن بات۔“

بوڑھے ٹھاکر نے حقارت سے ”لہہ!“ کہا۔ لڑکے کو سوار کی بات میں مصالحت سی سنائی دی تھی۔ وہ بولا، ”بات سناتا ہے تو گھڑ سواروں کو ہٹا ادھر سے۔“

بڑی عمر کا بٹ مار، جو ان کا مہتر ہوگا، گھوم گیا۔ اس کے اشارے پہ تینوں نے گھوڑے پھرائے، دور جا کھڑے ہوئے۔ لڑکا بولا، ”ہاں سنا کا بات ہے۔“

مہتر بولا، ”ٹھاکر ہے تو۔ اس کر کے ہم بات کھری کرتے ہیں۔“

لڑکا اس کی آنکھوں میں دیکھ کے بولا، ”اچھا۔“

مہتر نے نظریں چرائیں۔ بولا، ”ہاں... جو پلے پار جانے کی صلا ہے تو ٹھاکر! تین جنوں کی تین مہریں دے ای دو۔ بس... اور نکل جاؤ۔“

بوڑھے کی آواز آئی، ”دھت تیری اوکات پہ!“

لڑکے نے پوچھا، ”اچھا؟ پر مہریں کس بات کی؟“

بولا، ”ٹھاکر! ای دریا کی گھاٹ چوکی ابے اپنے پاس ہے۔“

لڑکے کو اس سے بات کرنے میں مزہ آرہا تھا۔ پوچھنے لگا، ”اپن کون؟“

”مبارک شاہی بندوبست ماں سوار ہیں ہم۔ ای دریا کی گھاٹ چوکی کے مہتر ہیں۔“

بوڑھے راج پوت نے ٹھٹھا لگایا، ”لہہ حرامی جھوٹھے! ارے مبارک شاہی بندوبست

اب کون بات کا؟ تجھے کھبر نہیں پلے پار ماندو ہے ماندو؟ دریا کے دوئی کنارے پہ شیر شاہ کی

تلوار بجتی ہے۔ گیا مبارک شاہ، سرور! گھر جاؤ گھر۔ نچنت ہو کے بیٹھو... جاؤ سورچراؤ اپنے۔“

اس نے لڑکی کی طرف دیکھا۔ ”اے لاڑی!... اورے سارنگ!... چل بیٹھو دوئی گاڑی ماں۔“

بوڑھے نے اپنی بیزاری جیسے ایک ایک لفظ پہ لکھ دی تھی۔

لڑکی سوچ میں پڑ گئی۔ وہ سوار ہونے کو رستہ چھوڑ گاڑی کے پہلو سے جائی، انتظار

کرنے لگی۔

سارنگ نے باپ کے حکم کا جواب دیا، ”ہو!“
یہ فیصلے کا وقت تھا۔ باپ بیٹا جانتے تھے سوار انھیں غافل سمجھ کے یا تو حملہ کر دیں گے یا اور کچھ دور جانے دیں گے۔ بوڑھے تلورے نے گاڑی میں بیٹھنے کو کہا ہے، لڑکا سمجھ گیا وہ سواروں سے پیچھا چھڑانا چاہتا ہے۔

لڑکی نے سر ہلایا۔ گھڑ سوار بالکل ہی گھامڑ ہوئے تو گاڑی پہ ان کے سوار ہوتے وقت حملہ کریں گے! اگر ہشیار ہوئے تو ابھی جانے دیں گے، گاڑی کا پیچھا کریں گے۔
لڑکا سارنگ گاڑی پہ بیٹھنے کو مڑا ہی تھا کہ جیسے طوفان پھٹ پڑا۔ سواروں نے گھوڑوں کو ایڑ دیتے ہوئے ہلہ بول دیا تھا۔

سارنگ نے گاڑی پہ چڑھنے کو اپنا دایاں پیر تختے پر ٹکایا تھا تو یہ آوازیں سنائی دیں۔ اس نے اپنے پیر کو ٹیک بنا کر، بدن کے ایک ہی جھکولے میں گھومتے ہوئے، نیزے والے ہاتھ کو اوجینی کھڑگ داروں کے نعرے کے ساتھ پورے لیش سے پھینکا، ”جے جے“ وکراما!“

”جے جے وکراما!“ بوڑھے کنور نے بازگشت دی۔

لڑکی کچھ زیادہ دیکھ نہ پائی۔ لال صدری والا بٹ مار دھچکا کھا کے الٹ گیا، گھوڑے سے گرا اور ٹھکی ہوئی ریت پر اچھل اچھل کر ایڑیاں رگڑنے لگا۔ ایک نیزہ... سارنگ کا نیزہ... اس کی صدری میں ترازو تھا۔

دو سوار بھاگ لیے۔ انھوں نے، ان کے مرکبوں نے، خاندیش کی سمت پکڑی تھی۔
بوڑھے نے نہ معلوم کس طرح اپنی سروہی کے ایک ہی جے ہوئے وار سے مانگ دار ڈاڑھی والے کا پہلو کھول دیا تھا۔ وہ اپنی تلوار پھینک، جیسے دہرا ہو کے، ایک ہاتھ سے اپنا گھاؤ بند کرنے اور دوسرے سے گھوڑے کو قابو کرنے میں لگا تھا کہ توازن قائم نہ رکھ سکا اور زین سے لٹک گیا۔ مشکلی نے الف ہو کے اسے پھینک دیا۔

بوڑھے نے چیخ کے لڑکی سے کہا، ”لاڑی، باندھ لے اسے۔ میں اس کا جانور گھیرتا ہوں۔“

لڑکا ادھر لال صدری والے کے گھوڑے کو گھیرتا ہوا اسے ہشکانے لگا تھا کہ بد قسمت

جانور اٹے قدموں ہٹا اور ہڑبونگ میں اپنی پچھاڑیاں گرے ہوئے مہتر کی کھوپڑی اور چھاتی پہ مارتا، چھ سات قدم نکلا چلا گیا۔ اس بھاری بندیل کھنڈی ٹٹو کی ہڑبڑی نے مانگ دار ڈاڑھی والے کی کھوپڑی کھول دی تھی۔

باندھنے کو اب کچھ نہیں رکھا تھا۔ لڑکی نے بے بسی میں بڑے میاں کو دیکھا جو مہتر کے جانور کو قابو کرنے ہانپتے ہوئے اس کے پیچھے چل پڑے تھے۔

ذرا سی دیر میں گاڑی والوں اور بٹ ماروں کی لڑائی ختم ہو گئی تھی۔

لڑکی نے سوچا یہ ٹھگ، جو آدھے کھیت رہے اور آدھے بھاگ لیے، کوئی بہت ہی گئے گزرے بے عقل لوگ ہوں گے۔ کھوپڑیوں میں ان کی اتنی سی بات کیوں نہیں گھسی کہ یہ خستہ حال لڑاکے، جن کے بدن پہ ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں ہیں، جو اپنے مرے ڈوبے بیلوں اور ٹوٹی پھوٹی گاڑی کے ساتھ ایسے درشنی ہتھیار لیے پھرتے ہیں، خطرناک لوگ ہوں گے، ایسوں پہ چڑھ دوڑنا جو کھم میں پڑنا ہوتا ہے۔ کیوں نہ سمجھے وہ اتنی سی بات؟ گیدی!

جتنی دیر میں باپ اور بیٹا ٹھگوں کے گھوڑے گھیر کے لائے اتنی دیر میں لڑکی نے گاڑی کے بیل کھول دیے تھے۔ دونوں بیل بہت پیاسے ہوں گے، پانی کے قرب نے انھیں بے تاب کر رکھا تھا، جوئے سے کھلتے ہی دریا کی طرف چلے۔ ایک ان میں سے دوڑ گیا، دوسرا ڈگمگاتا ہوا پیچھے چلا۔ بوڑھا راجپوت دیکھ رہا تھا۔ بیٹے سے بولا، ”سارنگا! گاڑی کھول دے۔ جوڑی بگڑ گئی۔ پانی سے آجاویں تو پتن ماں ہنکا دینا بیلوں کو۔ ملک کا گھاس پانی ہے۔ ادھر دوئی پشو گجاریس گے اپنے دن۔“

لڑکے نے کہا، ”ہنو!“

لڑکی اور لڑکے نے سب ہتھیار، کھال، مشکیزے، کام کے چھ آٹھ برتن بھانڈے اور چادر دولائی ایک گھوڑے پہ باندھ لی۔ لاشوں کو ٹھکانے لگانا تھا تو دونوں جوان لوگ برابر کی پٹھار سے ایلے لکڑی اکٹھا کر لائے۔ راج پوتوں نے اپنی گاڑی پر ہی لاشوں کو ڈال، ادھر ادھر گھاس پھوس لکڑی ایلے جما، بٹ ماروں کی چتاسی بنادی جسے بڑے میاں نے ”لے بھئی چلتے بنو!“ کہہ کے آگ دکھادی۔

لڑکی نے سوچا دریا کے اس پار کا جنجال اسی پار ٹھکانے لگ گیا۔

دریا کی گھاٹ چوکی کوس بھر دور تھی۔ مہتر کے مشکلی پہ باپ بیٹے نے ضد کر کے لڑکی

کو بٹھا دیا تھا۔ لال صدری والے کے ٹوپہ ہتھیار اور سامان بندھا تھا اور اس کی راس بڑے میاں نے سنبھال لی تھی۔ تو کبھی پیدل، کبھی سواری کر کے وہ پیچھے پیچھے چلے آتے تھے۔ مگر لال صدری والے کا جانور برابر کچھ نہ کچھ گڑ بڑ کرتا آ رہا تھا۔ اس کی حیوانی سمجھ میں یہ بات آچکی تھی کہ نیا سوار اس کے مالک کا دوست نہیں ہے۔

جب تک لڑائی یا اس کی تیاری ہوتی رہی تھی بوڑھے راج پوت کا دل لگا رہا تھا، مگر اب اس کی سانس پھول پھول جاتی تھی اور چڑچڑاپن لوٹ آیا تھا۔ سوار ہوتا تو وہ کچھ ہی دیر بعد اتر آتا، گھوڑے کو برا بھلا کہتا اور بیٹے کو ہدایت کرتا کہ مانڈو پہنچ کے اس بدجنان کو چمر قسائیوں کے حوالے کرنا تا کہ اسے مار کے وہ اس کے کھجیائے چمڑے سے ڈھول مڑھیں اور تسے بنائیں، ہڈیوں کھروں سے اس کی سریش نکالیں۔ بیٹا اسے تسلی دیتا آ رہا تھا کہ ہاں رے بابا، ایسا ہی کروں گا۔

ایک بار جب بوڑھے نے یہی چمر قسائیوں والی بات دہرائی تو لڑکی نے کہا، ”بابا کنور نارنگ! ایک روز پہلے آپ نے کسی بات پہ کہا تھا کہ گھوڑا شتریوں کا میت اور جانوروں میں سور یہ نوشی ہے۔ اس پہ تو سور ویر لڑائی کے ہنگام بھی وار نہیں کرتے۔“

بوڑھے کنور نے اُسے کڑی نظر سے دیکھا۔ ”ہاں، سو تو ہے۔“

”تو پھر ٹھنڈے سبھاؤ سے اور جانتے بوجھتے اس گھوڑے کو کیوں قسائی کو دیں گے،

کیوں ماریں گے آپ؟... کیسے؟“

بوڑھا عیاری سے مسکرایا، ”ارے اسے جانتے بوجھتے کون مارے گا لاڑی؟ دوک

روح ماں سرے کی یہ اگلی سِدھی ٹانگ ٹوٹ جاوے گی تب ہی چمر کیسے کو دیں گے نا... ایسے کون دیں گے۔“

لڑکا جو گھوڑوں کے ساتھ پیدل چلا آتا تھا اور ان کی باتیں سن رہا تھا، ایک دم ہنس

پڑا۔ پیٹ پکڑ کے بیٹھ گیا۔ کتنی ہی دیر بیٹھا ہنسی میں جیسے اُمکٹا رہا۔

باپ بھی ہنسنے لگا۔ مڑ کے بیٹے سے بولا، ”چل چل... آ جا... ہنسو نہیں تو!...“

لاڑی سمجھے گی بابا ٹھٹھول کرتا ہے۔“

لڑکی نے گھوڑا روک لیا۔ باپ بیٹے کی طرف باری باری دیکھا۔ سمجھ گئی اور خود بھی

ہنس پڑی۔

مگر یہ ایک ڈیڑھ کوس بڑے جو کھم کے تھے۔
آگے بھی گھاٹ چوکی پہ ایک پریکشا ان کا رستہ دیکھتی تھی... نہ، بلکہ ایک سے زیادہ
آزمائشیں انتظار میں تھیں۔

گھاٹ پہ ایک ہی کشتی تھی جس کا پیندا توڑ کے چندالوں نے پتھر پور دیے تھے۔
کشتی ایک بازو جھکی پڑی تھی۔ بس ایک ہی ڈیڑھ بالشت پانی سے باہر دکھائی دیتی ہوگی۔ چوکی
کے رکھشک پرانے مبارک شاہی سپاہی مرے پڑے تھے۔ ٹھگوں نے کچھ کھلا پلا کے بے خبری
میں ان کے ٹینٹوں کو دبا دیے تھے۔ بارہ تیرہ برس کا ایک ننگا لڑکا کشتی کی اوٹ لیے اٹھلے پانی
میں کھڑا تھر تھر کانپ رہا تھا۔

بوڑھے نے مجلس کے کہا، ”جے ہو پر بھو!“ مطلب، یہی سب دکھانے کو رہ گیا تھا
سو دکھا رہے ہو۔

کہانی کا immediately آگے کا حصہ روٹین اور mundane اور شاید اس لیے
غیر دلچسپ ہو جائے گا اگر ہم یہ سوچنے بیٹھیں گے کہ انھوں نے رکھشکوں کی لاشوں کا کیا کیا
ہوگا؟ رکھشک کب کے مرے پڑے تھے؟ یا ہمارے لوگ دریا پار کرنے میں کیسے کامیاب
ہوئے؟ ویسے پار اترنا اتنا کوئی مشکل نہیں ہوگا کیوں کہ نربدا کو باڑھ دینے والی برساتیں ابھی
دور تھیں اور جن یا تریوں کے پاس ایک چھوڑ دو گھوڑے ہوں ان سے بھیج نہیں کرتا یہ دریا نربدا۔
کیسا ہے یہ دریا نربدا؟ تیکھے مزاج کا نرسمہا یا نرم خو آجبو؟ یہ دیواروں سی اٹھی
چٹانوں کے بیچ سے گرجتا، جھاگ اڑاتا گزرتا ہے تو میدانوں کھلیانوں کے پاس سے شیشہ
دکھاتا نکل جاتا ہے۔ انوٹھا ہے یہ دریا نربدا۔ یہ ابھی لڑاکوں، تلوریوں کا میت ہے تو ابھی
نائیک اور کویراج اس کے بندھو ہیں جو ندی کے بریجوں، گھاٹوں پہ اپنے اچھوتے گیتوں،
راگ راگنیوں کی ورشا کرتے مٹی سے اُگتے ہیں اور ست رنگی دھنش پہ جانو اس کرتے ہیں کہ
بہتا رہے یہ دریا نربدا۔

اور بہتا رہے یہ دریا نربدا۔

سو انھوں نے دریا پار کیا۔ پرلے پار وہی گاؤں تل وندی تھا جو ہم سوچ کے بیٹھے
ہیں... پچاس باون گھروں کا چھوٹا سا پسارا۔ لڑکا جو کشتی کے پاس ملا تھا تل وندی کا ہی تھا۔
باپ اس کا مرچکا تھا۔ اس کا، اس کی دو بہنوں اور ایک چھوٹے بھائی کا خرچ اٹھانے کو ماں

چکی پیس کے گزارا کرتی تھی۔ مگر کام کم تھا، چھوٹا سا گاؤں جو تھا، عورتیں خود ہی پیس ریندھ لیتی ہوں گی۔ کام کم ملنے کی وجہ سے سب کو کبھی فاقے بھی کرنے پڑتے تھے، اس لیے ماں نے اسے کشتی والے کے پاس نوکر رکھا دیا تھا۔

شیر شاہی بندوبست میں گھاٹ چوکی کی کنجی سنبھالنے والا ابھی کوئی آیا نہیں تھا، پرانوں ہی سے کام چل رہا تھا، کہ یہ حرامی ٹھگ آ کے چوکی پہ بیٹھ گئے اور آتے جاتوں کو لوٹنے اور دریا میں بہانے لگے۔

تل ونڈی والے لڑکے کو ان بٹ ماروں نے پہلے ہی دھر لیا تھا۔ یہ کام کا نظر آیا تھا اس لیے اسے مار کے دریا میں نہیں پھینکا تھا انھوں نے۔ گاؤں میں جا کے وہ اس کے جھونپڑے اور گھر والوں پہ قبضہ کر کے بیٹھ گئے۔ وہاں انھوں نے کہہ دیا کہ ہم عورت کے بھائی بند اور بچوں کے مامے ہیں۔

لڑکے کی ماں بہنیں ان مامے لوگوں کی روٹی بناتی تھیں۔ چھوٹا بھائی دریا کنارے تک روٹی پہنچا دیتا تھا اور ادھر سے خبریں لے جاتا تھا کہ کون کون آیا اور کام کی اسامی ہے کہ نہیں۔ کام کی اسامی ہوتی تو اس پار آ کے وہ ٹھگ اسے لوٹتے اور ندی میں بہا دیتے۔ لڑکے سے وہ کہتے رہتے تھے کہ سیدھے سبھاؤ مسافروں کی خبر رکھ، انھیں لاتا لے جاتا رہ۔ اگر کسی کو کچھ بتایا تو ہم ادھر تیرے گھر میں بیٹھے ہیں۔ تجھے، تیرے بھائی کو تو مار ہی دیں گے۔ ماں بہنوں کے ساتھ جو کریں گے وہ تجھے پتا ہے۔

ایک دو مامے گھاٹ چوکی پہ ہر وقت لڑکے کے پاس رہتے تھے۔ رات بے رات یا دن میں دارو پی کے جب جی کرتا تھا وہ اسے ستاتے بھی تھے... وہ مامے حرام کے جنے۔

لڑکے نے یہ سب کچھ روتے ہوئے اور بڑی دیر میں بتایا تھا۔ لڑکی نے اور راجپوت لڑکے نے تل ونڈی جاتے ہوئے اسے بہت تسلی دی تھی۔ بوڑھے نے بس ایک بار یہ کہہ دیا تھا کہ مامے کچھ ددی کے اب ادھر نہیں آئیں گے۔ دو مر گئے ہیں، دو بھاگ گئے۔

لڑکے کو لے کے راجپوت باپ بیٹا اور لڑکی تل ونڈی پہنچے تو رات پڑ گئی تھی۔ سب گاؤں کی طرح یہاں بھی آباد گھروں کے حاشیے پہ چماروں، ڈھیڑوں، پاسیوں کی جھونپڑیاں ہوں گی جو کتے اور سؤر ضرور پالتے ہوں گے۔ ہمارے لوگ ان جھونپڑیوں کے برابر سے گزرے تو کتے بھونکنے لگے اور باڑوں میں بند سؤر وقت بے وقت کی جفتی چھوڑ کے الگ

ہو گئے اور تنگ جگہوں میں بے چین ہو ہو کے کھڑ بڑانے لگے۔

تل ونڈی والا لڑکا اپنے گھر پکھواڑے کی باڑ پھلانگ کے دوڑتا ہوا ڈھائی ہاتھ کے اپنے باڑے میں آواز دیتا ہوا گھس گیا۔ اندر باہر کوئی نہیں تھا۔ پڑوس کی وہ بڑھیا بھی جس کے ہاں ٹھکوں کے آئے پہ لڑکے کی ماں بہنوں نے شرن لی تھی، جھونپڑی خالی کر گئی تھی۔

دوئی گھروں میں اندھیرا اور سناٹا راج کرتا تھا۔ لڑکا رونے لگا۔

بوڑھا راجپوت جھونپڑی کے باہر سر نہیوڑائے کھڑا تھا۔ اس کا بیٹا کھیا سر پنچ کو بلانے گیا تھا۔ لڑکی نے ڈھوٹ کے دیا جلا دیا، کچھ روشنی کر دی۔

دو حصوں کی خستہ حال جھونپڑی تھی جس کے کچے سیلے ہوئے فرش پہ ہاتھی کی جھول کا پرانا موم کپڑ سا ٹکڑا پڑا تھا جس پر گھسے پٹے، چھوٹے بڑے لہنگے، لگڑے، انگے، دھوتیاں، چولیاں، چنزیاں گلہریوں کے اکٹھا کیے ہوئے گودڑسی بکھری ہوئی تھیں۔

تل ونڈی والے لڑکے نے اکڑوں بیٹھ کے انھیں سمیٹنا شروع کیا۔ یہ بے مصرف کام کرتے ہوئے وہ یوں کانپ رہا تھا جیسے تاپ چڑھی ہو۔

لڑکی پاس جا بیٹھی اور خود بھی وہ گودڑ سمیٹنے لگی جو کبھی اچھے دنوں میں چھوٹی بڑی عورتوں کے پہننے کے کپڑے ہوں گے۔ انھیں میں لاکھ کا ٹوٹا ہوا ایک کڑا، بے جوڑ منکوں سے بنایا گیا ایک ہار، چمکی چڑھی ایک آدھی پونی کر دھنی، دانے ٹوٹی سینگ کی دو کنگھیاں، چٹلے، موباف، گودڑ نکلی دو گڑیاں، مٹی کا ایک طوطا جس کی چونچ اور دم جھڑی ہوئی، چھوٹی چھوٹی کپتیاں جو گاؤں کے ان گھڑے کارِ یگر مٹی کے سانچے پہ جانور کی آنت چڑھا کے بناتے اور سکھا لیتے ہیں، پھر ان میں بھٹے کی چھوچھن کا ڈاٹ لگا تیل پھیل رکھنے کے کام میں لاتے ہیں... تو وہ کپتیاں، ایک ٹوٹا شیشہ، ایک اور قلعی اترا کا بچ کا ٹکڑا، ایسی بہت سی... بہت سی چیزیں جن کی سنگت میں چھوٹی لڑکیاں بچپن کا اور لڑکپن کا جادو بھرا زمانہ گزارتی ہیں اور جوانی کی حیران کرنے والی سیما پار کر جاتی ہیں۔ تب یہ طوطے، گودڑ نکلی گڑیاں، پھیل کی کپتیاں، چٹلے موباف، ٹوٹے شیشے، لاکھ اور کا بچ کے ٹکڑے، یہ سارے جادو ٹوٹے دوسرے ارمانوں بھرے طلسمات سے بدل جاتے ہیں۔

لڑکی نے سوچا، جیسے الہ دین کہانی کا جادو گر پرانے چراغ سے نئے چراغ بدل

تو بس اسی طرح یوں آتا ہے اور سب کچھ رنگوں بھرا اور کولابل کرتا اور چمچھاتا چمکتا دکھائی دینے لگتا ہے، کس لیے کہ یہ دوسری گڑیوں، طوطوں، موبافوں، چٹلوں اور جادوؤں کی رُت ہوتی ہے۔ اس کے آکار اور رنگ ہی بڑے انوٹھے ہیں۔

لڑکی ہاتھی کی جھول پر ایک طرف سرک کے بیٹھ گئی۔ اس نے ان پیاری، بے حیثیت، بے قیمت، اُن مول چیزوں کو اپنے لمس سے میلانا ہونے دیا۔ یہ تو تیرہ برس کے اس اکیلے لڑکے کی دنیا تھی اور وہ خود باہر سے آئی تھی۔ لڑکے کی اس باقی بچی دنیا میں اس طرح گھستے چلے جانا اسے اچھا نہ لگا۔ اس کے گلے میں کچھ اٹکنے سا لگا۔ اس نے یاد کیا کہ پھیلی ہوئی اس زمین پہ کہیں ان میں سے دو ابھی زندہ ہیں جنہوں نے اپنے کیٹ بھرے پنچوں سے چھوٹی لڑکیوں کا یہ اچھوتا طلسم گوڈ کے رکھ دیا تھا۔

لڑکی نے خود کو بتایا کہ بالکل خالی کوئی نہیں ہوتا، ہر ایک کے پاس وہ کچھ تو ہوتا ہی ہے جسے مٹایا جاسکے۔ لمبی خشک سالی میں زندہ رہ جانے والی چڑیوں کی طرح محرومی کی بھئی انکر سیما پہ جینے والے ان یتیموں کے پاس اتنا کچھ تو تھا کہ جسے آرام سے برباد کر دیا گیا اور ملیا میٹ کرنے والوں میں سے دو... اس نے پھر یاد کیا کہ وہ دو کہیں نہ کہیں موجود ہیں اور وہ اس پھیلی ہوئی دھرتی پہ سانس لے رہے ہیں۔

لڑکی کو سانس لینا دو بھر ہو گیا۔ وہ جھونپڑی سے نکل آئی۔

دور گاؤں کی اکیلی سڑک سے لوگوں کے چلنے، باتیں کرنے کی آوازیں اور گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دینے لگیں۔ شور قریب آتا گیا۔ سارنگ سنگھ گاؤں والوں کو لارہا تھا۔ لڑکی بڑے میاں کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

بھانت بھانت کی بولیاں بولتے، کھانتے، کھنکارتے، طرح طرح کے ہتھیار اور دیہاتی مشعلیں اٹھائے گاؤں کے کوئی تمیں پینتیس بوڑھے، جوان اور لڑکے سارنگ سنگھ کے پیچھے پیچھے آئے اور جھونپڑی کے آگے کے میدان میں کھڑے ہو گئے۔

باپ اور لڑکی کو باہر دیکھ کے سارنگ سمجھ گیا کہ وہ کہانی جو گاؤں والے سنانے آئے ہیں انھیں معلوم ہو چکی۔

کھیا جھوم سے نکل کے آیا۔ کہنے لگا کہ مہینے بھر سے یہ ڈکیت جھونپڑی پہ قبضہ کیے بیٹھے تھے۔ کہتے تھے ہم چالیس پر گئے کے ویاپاری ہیں۔ خود کو عورت کا بھائی بند بتلاتے تھے۔

کہتے تھے برسات لگنے سے پہلے چلے جائیں گے... یہ سرے جھونپڑی میں رہتے تھے۔ عورت بچاری بچوں کو لے کے پڑوس کی بڑھیا ڈھیرنی کئے اٹھ آئی تھی۔

”کا کرتی بچاری۔ ان ڈکیتوں کھوسڑی والوں کو پکا پکا کے کھلا رئی تھی۔“

آگے کسی نے بتایا کہ چاروں بٹ مار عورت سے، نہ اس کے بیٹوں بیٹیوں سے، کسی کو بات ہی نہیں کرنے دیتے تھے۔ وہ باہر نکلتی تو کنار، بلم، بھالالے کے ایک جرور ساتھ نکلتا تھا، ہنس ہنس کے باتیں مٹھارتا ہوا۔ جیسے سب ائی کھیم کشل ہے، کہیں کوئی گڑ بڑی نہیں ہے۔

”اتے حرامی تھے چاروں۔ سچی بات تو یہ ہے بھیا کی عورت اکیلی ایکانت میں ہوتی تو بھی کسی کے سامنے منہ نہ کھول پاتی۔ پکی بات ہے۔ ان حرام جادوں کو جھبی بھی وہ میکے سے آیا ہوا ہی بتلاتی بچاری۔ ائی ڈری ہوئی تھی۔ ویسے وہ اسے اکیلا ہی کب چھوڑتے تھے۔“

ایک کہنے لگا، ”کبھی ہتھیار باندھ کے ایک دو روج کو لمبے نکلتے تو اونچی اواج میں سب کو سنا سنا کے کہہ جاتے تھے کی اپنا بھائی بند ادھری ہے، سب جنے ہماری بھین کا، اس کے بچوں کا دھیان کرنا اور بھیا! سچ بتائیں، کبھی تو لگتا تھا کی سچ مچ کے ویاپاری ہیں۔ یے لکچے باندھ باندھ کے لاتے تھے اور بساطی کی جھونپڑی میں رکھتے جاتے تھے۔“

ایک بتانے لگا کہ بچوں کا باپ بساطی تھا۔ ”جندگی ماں بھی اس نے بال بچہ کو کون سکھ دیا۔“

کھیا بولا، ”ویسے چاروں بٹ ماروں نے عورت کو کوئی چچ کی کمی نہیں ہونے دی۔ ناج، گھی، تیل، دال، گڑ، سمبھئی ڈھیر کر کے رکھا تھا سسروں نے۔ ایک بات بھل منسی کی یہ تھی کی بساطی کی ودھوا سے ماس اوس کدے نہیں پکوا یا۔ کھد پچھواڑے جا کے بکرا مرگا مار کے اپنا چولھا بنا، اپنے مٹی کے باسنوں میں کھا پکا لیتے تھے۔ دارو چنڈ و بھی ادھر گاؤں میں نہیں پیا۔“

”ہاں، اور جو گھاٹ سے پی پا کے کبھی آگئے تو ائی کوئی کھاس ادھم نہیں کی۔“

”ہاں رے، جو بات جتی ہوتی کہنا چیتے۔ بھگوان کو بھی اک روج منہ دکھانا ہے۔“

یہ آخری بات گاؤں کے پنڈے نے کہی تھی جو بلدی چندن سے خوب اپنا ماتھا اور اپنی بھجائیں رنگے آیا تھا اور دھوتی کے پلے میں ہاتھ ڈالے انڈوے کھجائے جارہا تھا۔

بوڑھا نارنگ سنگھ جو دھیان سے ایک ایک کی بات سنتا اور صورت دیکھتا رہا تھا، کھانسنے لگا۔ پھر بلدی چندن لگے پنڈے کے سامنے اپنا کھنکھار گرا کے ہانپتا ہوا بولا، ”بہنو۔“

جوابات جتنی ہوتی کہنا چیتے۔ اوئی چار مہا پرش دھرماتما لوگ نے جرور ہی پیسا کوڑی دے دلا کے تیرے سے اکھنڈ پاٹھ دھرم کا یہ کرایا ہوئے گا۔ ہاں۔ جتنی بات ہوتی بتانا پنڈے۔ کس لیے کی اک روج تیرے کو ای بھنڈ سار پیٹ، ای تھال جیسو بوتھا بھگوان کو جرور ہی دکھانا ہوئے گا۔ ہاں۔ پکی بات۔“

پنڈا غصہ ہو کے ہاتھ ہلانے، آنکھیں چلانے لگا۔ کچھ کہنے کو ہوا تو ٹھا کر لڑکے نے کڑک کے گالی دی۔ ہجوم سے بولا، ”گنتی میں ایک بیسی سے زیادہ جوان مرد ہو اس گاؤں میں۔ لڑیوں جیسی چڑھی ہوئی ڈاڑھیاں بھی نجر آرتی ہیں۔ ارے نئے نویلے کڑیل پچھیرے کھڑے ہیں مونچھوں کو موم لگائے۔ بے پٹھار پہ ایڑی ماریں تو پانی نکلے... ایسے دھوں تال سورما... تروار برجھی اٹھائے پھرتے ہیں سبرے... پر لعنت ہے تہاری اوکات پہ، لعنت ہے! چار کتے کے جنے بٹ ماروں سے اس بدھوا کو، اس کے بچونگڑوں کو نہیں بچا پائے۔ تھک ہے اس مری مردانگی پہ، تھک ہے!“ پھر وہ راجپوت لڑکا بے بسی میں ہاتھ پھیلائے مشعلوں کے دھویں میں گہرے گہرے سانس لیتا سب کی صورتیں تکنے لگا... طوفان میں آئے درخت کی طرح بس کانپے جارہا تھا۔

بوڑھے ٹھا کرنے بیٹے کے بازو پہ ہاتھ رکھ دیا۔ ”ٹھا کر! ٹھا کر! صبر!... ارے سپتر سب تیری طرح جان ہتھیلی پہ لیے نہیں پھرتے۔ سارے پرش لڑیے نہیں ہوتے رے سارنگ! ارے ان ماں دھنیے، جلا ہے، بکروٹے، کھٹیک، بلا ہی، پنڈے، گھس کھدے، بانے، مکھیے، سر پنج سبھئی پرکار کے جیو ہیں۔ جو اپنی اپنی جان کی کھیم کشل مناتے ہیں تو کون برا کرتے ہیں۔ صبر، ٹھا کر، صبر!“

لڑکی کا جی چاہا کہ اب یا تو بساطی کے لڑکے کی طرح وہ چیخ چیخ کے رونا شروع کر دے یا سارنگ کی طرح خود کو غصے کے حوالے کر دے۔

مگر پھر بھی اس نے دھیرج سے سوچنے کی کوشش کی... ذرا انصاف کرو، یہ سب شیرشاہی قلمرو میں ہوا ہے۔ مانڈو یہاں سے دن بھر کی مسافت پہ ہوگا اور حاکم شجاعت خان سوری بڑا منصف مزاج معدلت گستر حاکم ہے۔ تو پھر کوئی بتلاؤ یہ سب کیسے ہوا۔

سو اس نے اونچی آواز میں ہجوم سے کہا، ”سنو! اس گاؤں سے مانڈو بہت ہوا تو دن بھر کا رستہ ہے۔ ان تیس دنوں میں کیا ایک سوار بھی گاؤں سے نکلنے کی جیوٹ نہیں کر پایا؟...“

ایک بھی؟“

لکھیا بولا، ”ناں ناں جی بائی ٹھکرائن! ایسی بات نہیں ہے۔ بساطی کی عورت کے کئے دو دفعے منے آدمی بھیجا، کی بول بائی مانڈو کھبر کراؤں؟ پر وہ مانتی نہیں تھی۔ بولتی تھی لڑکا گھاٹ چوکی پہ بندی ہے... مار دیں گے اسے۔“

ہجوم میں راہ بناتا ایک نیم وحشی بوڑھا آگے آنے کی کوشش میں دھکا پیل کر رہا تھا۔ کوئی اسے راستہ دینے کو تیار نہیں تھا۔ سب دھتکار رہے تھے۔ کسی نے کچھ پوچھا تو وہ جواب میں مہم کر کے رہ گیا۔ ایک لڑکے نے برچھی کی ڈانڈ سے کچوکا دیا۔ ”چال ایدر سے... چنڈال!“ لڑکی کی اس کی نظر ملی۔ اسے لگا وہ کچھ کہنا چاہتا ہے۔ ”آنے دو، آگے آنے دو اسے۔“

”ارے باؤلا ہے چنڈال۔ بھگاؤ اسے ادر سے،“ بھیڑ میں بہت سے بولے۔ دو ایک نے اس کی ٹانٹ پہ چپت جما دیا۔ ”کا ہے آگیا رے... تو بھاگ جہاں سے۔“

”مم... میری سن ٹھا کر! ای لکھیا لکھیا حرام کا جھوٹا ہے، جھوٹا جھوٹا۔“ ایک لڑکے نے منہ پہ اس کے اٹے ہاتھ کا جھانپڑ دیا، ”چال! سوری کے!“ لڑکے کا رنگ روپ کھائے پیے لکھیا جیسا تھا۔

وحشی نظر آتے بڑھے کو چوٹ آئی۔ منہ سے لار اور خون بہنے لگا۔ اب دو تین اور اسے دھکے دے کے بٹانے لگے۔

”ٹھیسرو، ٹھیسرو رے!“ بوڑھا ٹھا کر بولا، ”آنے دو اسے!“

لکھیا نے حقارت سے کہا، ”سڑی باؤلا ہے سوری کا... جانے دے ٹھا کر د!“

”نن نن نہیں ٹھا کر! ماں بولوں... ای ای حرام کا... جھوٹا ہے۔“

لکھیا کے ناتے دار دکھائی پڑتے جوان نے ایسے ٹکا کے لات ماری کہ بڑھا ہجوم کے دائرے سے باہر جا گرا۔ کوئی بولا، ”اور ایک لگے جما کے!“

سارنگ نے اب نیام کا پر تلا سیدھا کیا، مشعلوں کی روشنی میں آیا اور سب کو جیسے دکھاتے ہوئے دو انگلیوں سے گھنڈی تکتہ کھول دیا۔ اس کی تلوار اب کھینچی جاسکتی تھی۔

بوڑھے نارنگ اور لڑکی نے بھی اپنے دائیں بائیں پھیل کے جگہ بنائی اور بھیڑ کو ہتھیاروں کے درشن کرائے۔

لکھیا نے خواہ مخواہ ہاتھ اٹھا دیا جیسے سب لوگوں کو، جو ویسے ہی پیچھے سرکنے لگے تھے،

پرسکون رہنے کو کہہ رہا ہو۔

سارنگ ڈپٹ کے بولا، ”بڈھے کو اٹھاؤ۔ آگے آنے دو اسے۔ کہنے دو کیا کہتا ہے۔ بات سنو اس کی۔“

کسی نے بڈھے کا ہاتھ پکڑ کے آگے کر دیا۔ وہ لڑکھڑاتا تھا اور اپنے ہاتھ کی پشت سے ہونٹوں پر لگا خون پونچھتا تھا۔

”بولو کیا بولتے تھے؟“

”یہ یہ... مکھیا حرام کا۔“

سارنگ نے سمجھا کے کہا، ”گالی مت دو کوئی کو۔ اپنی بات کہو، اپنی۔“

”ای ی، جھوٹ بولتا۔“

”اچھا؟ کیا جھوٹ ہے؟“

”ہاں، چندال ہے مکھیا۔ جھوٹا... جھوٹ۔“ ہجوم نے ایک ساتھ ہنس کے اس کی آواز

دبانی چاہی۔ نارنگ ٹھا کرنے ہاتھ اٹھا کے چپ کرایا۔ وحشی دکھائی دیتے بڈھے کو حوصلہ ہوا۔

بولا، ”لکھمی کے کئے... بساطی کی بدھوا کے کئے آدمی بھیجا تھا، مکھیا نے... لکھمی کے

کئے۔“

سارنگ بولا، ”اچھا پھر؟“

”آدمی بھیجا تھا لکھمی کے کئے۔“

”ہاں ہاں، پھر؟“

”... بساطی کے، مسلمان کے گھر بیٹھ گئی تھی نا۔“

ہنستی ہوئی بھیڑ کو جیسے سانپ سونگھ گیا۔

”ہاں اس چندال چودے نے آدمی بھیجا تھا کی مرگیا بساطی ابی ابی ابی... گونا

کر لے مجھ سے گونا۔ پنڈے بھی راجی تھے۔ سُدھی کرنے کو راجی تھے... بولتے تھے گونا کر لے

اس حرام کے سے...“

ہجوم کے اندھیرے سے ایک کم زور آواز آئی، ”چندال ہے۔ جھوٹ بولتا ہے سوری کا۔“

کھلے میں تیس پینتیس جانوں کے ہوتے بھی لگتا تھا کوئی نہیں، خالی میدان پڑا ہے۔

جھونپڑی سے اٹھتی بس ایک بار بساطی کے لڑکے کی سسکیاں سنائی دی تھیں۔

بوڑھا ٹھاکر آگے آیا۔ اس نے سرخی تھوکتے اس آدمی کے شانے پہ ہاتھ رکھ دیا۔
 رسان سے پوچھا، ”لڑکے کا باپ مسلمان تھا کا؟... ہاں بھیا؟“
 اس سے پہلے خود لکھیا بول پڑا، ”ہو مسلمان تھا۔“
 ٹھاکر بکرم نارنگ سنگھ اس کی طرف گھوم گیا۔ ”... جیہٹی تم نے... سبرے گاؤں نے
 کھبر نہیں پہنچائی؟... لکھی مسلمان کے گھر بیٹھ گئی تھی... بچے پہ بچہ جن رئی تھی... ہاں؟... کا
 اے مرجی تھی تمہاری؟ کی گاؤں کا کلنک ٹھگوں کے ہاتھ سے میٹ جائے؟... پھر گدے پہ گائے
 دھر کے، پنچت ہو کے بیٹھو سبئی کے سب... ہاں؟“ ہاں کہتے ہوئے راجپوت کی آواز ٹوٹ
 گئی۔ بیٹا سنبھالنے کو بڑھتا تھا مگر پھر رک گیا۔

لکھیا دھیمی آواز میں بولا، ”نہیں... ای بات نہیں ٹھا کر دے!“
 ”تو؟ پھر؟“

”اس سے... لکھی سے، منے مائڈو کا پوچھا تھا۔ پر... نائیں کردی اس نے۔“
 ادھر ادھر دیکھ کے وہ کھیائی ہوئی ہنسی ہنسا۔ ”آپ جانو ٹھا کر دے! جنانی کی اکل میں جو اکیئی بار
 بیٹھ جائے سو...“

”تھپڑ مار کے سبرے دانت جھاڑ دوں گا۔ کوکری کے جنے! لکھیا ہے تو کی
 بدجناروں کی بھڑوت کرتائے؟ سوری کے کلنک!“ بوڑھے نارنگ سنگھ کی آواز جیسے کنویں کے
 جگت پہ گرائی ہوئی تھالی تھی جو باہر کے پھیلاؤ میں اور اندر کی گہرائی میں بجتی چلی جا رہی تھی۔
 ”بابا! بابا!“ سارنگ نے باپ کے شانوں کو اپنی میٹھی گرفت میں لے لیا۔ ”بابا! ای
 تلونڈی جندوں کا گاؤں نہیں، مرے مردوں کا گاؤں ہے۔ مردے نو اس کرتے ہیں ادھر۔
 پہلے میں سمجھتا تھا اس گرام میں ہیجڑے بستے ہوں گے، اس کارن گصہ کرتا تھا۔ پر اب سمجھا
 ہوں... ایے جندوں کا گاؤں نہیں سمان ہے... ہم چار بلاو بے نکل آئے ادھر۔“
 گاؤں کے لوگ پہلے ایک ایک دو دو کر کے، پھر ٹکڑیوں میں، اپنی جوتیاں کھسکھس
 کرتے اندھیرے میں گھل گئے۔

خالی میدان میں کب تک کھڑے رہتے... راجپوت باپ بیٹا اور وہ لڑکی جھونپڑی
 کی پھٹکی کھول سائیوں کی طرح چلتے ہاتھی کی جھول پہ جا بیٹھے۔
 چیتھڑا کپڑوں کے ڈھیر پہ سجدے کی مدد میں پڑا تل و نڈی والا لڑکا سسکیاں لیتا تھا۔



صبح ہوئی تو لڑکی نے گاؤں کے چھوٹے کنویں سے، جو ڈھیروں، چماروں، پاسیوں کے لیے اور بساطی کے گھر والوں کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا، پانی بھرا۔ پانی لاتی تھی تو اس نے دیکھا کہ بوڑھا کنور جھونپڑی کے کھلے دروازے کے آگے ہاتھی کی جھول بچھائے، دولائی اوڑھے بیٹھا ہے۔ پانی کے بھانڈے رکھ لڑکی نے پالاگن کیا تو ٹھا کرنے اس کے سر کو ہاتھ لگا کچھ بد بھاد دیا۔ وہ جا کے آگ چیتا نے کا جتن کرنے لگی۔ ٹھا کر اداس، ادھ کھلی آنکھوں سے اسے دیکھتا رہا۔ سامنے اس کا بیٹا چھتار کے سائے میں پیال ڈالے بے خبر پڑا سوتا تھا۔

آگ چیتا کے لڑکی بوڑھے کے پاس آئی۔ بولی، ”ٹھا کر دڈا! ابھی تمہارے لیے شکر قندی بھونے دیتی ہوں۔ سارنگ اٹھے گا تو روٹی بنادے گا تمہاری۔“

ٹھا کرنے پہلے لڑکی کی طرف، پھر اسارے سے ٹیک لگائے بیٹھے بساطی کے لڑکے کی طرف دیکھا، کھنکھار کے دھیرے سے بولا، ”نہیں لاڑی! شکر قندی رہنے دے۔ میرے اور اس لالت کے لیے ایک ایک روٹی ڈال دے۔ تنگ اچار دے دے... ہم دوئی جنے اہار کر لیں گے۔“ ٹھا کرنے لاوارث لڑکے کو لالت کہا تھا... لاڈلا... اور اس نے لڑکی سے اپنے لیے روٹی بنانے کو کہا تھا۔ لڑکی نے اپنے دل کی مسرت میں کچھ بولنا چاہا۔ مگر نہیں... چپ رہنا اچھا ہے۔ اس نے جو سنا سب ٹھیک ہی سنا ہے اور اس میں حیران ہونے کی کیا بات ہے؟ اس نے بوڑھے کنور کی آج سویرے کی آنکھوں کا لکشن یاد کیا جن میں غصہ تھا اور نمی تھی۔ وہ اپنی اگلی ہنسی والا چہرہ چھپائے شکر گزاری میں مڑی اور چولھے کے پاس آ بیٹھی۔

ٹھا کر اور چھوٹے لڑکے کے لیے اس نے دو روٹیاں بنائیں، ان پہ گھی لگایا اور مٹی کے کونڈے میں روٹیاں اور اچار رکھ کے ٹھا کر کے پاس لے آئی۔ وہ اسارے کے برابر کھڑا کلی کر کے منہ پہ چھینٹے مارتا تھا۔ پھر اس نے چادر لپیٹی، چھوٹے لڑکے کو اشارہ کیا۔ بولا، ”لاڑی کے ہاتھ سے کونڈا لے لے رے اور چل میرے سنگ۔“ خود وہ ایک ہاتھ میں رسی بندھی پیتل کی جگر جگر کرتی گڑوی لیے، دوسرے میں نیام کی ہوئی تلوار سنبھالتا احاطے سے نکل گیا۔ بساطی کا لڑکا پتے سے ڈھکا ہوا کونڈا اٹھائے پیچھے پیچھے تھا۔

ٹھا کر چھوٹے لڑکے سے اونچی آواز میں بات کرتا، مانو سب کو سناتا، گاؤں کے بڑے کنویں کی طرف چلا تھا۔ یہ کنواں تین اونچی جاتیوں کے لیے تھا۔ چوتھی جاتی شودر اور وہ

سب جو شور تک نہیں تھے، بڑے کنویں کے پاس پھٹک نہیں سکتے تھے۔ یہ ان کی پرچھائیں سے بھی خراب ہو سکتا تھا، یہ اونچی جاتیوں والا کنواں۔

کنور تو شتری تھا۔ بڑا کنواں بے شک اس کا کنواں تھا... وہ جب چاہے جاسکتا تھا، آسکتا تھا، پھر جاسکتا تھا... مگر یہ کیا کر رہا ہے ٹھاکر؟ لڑکے کو ساتھ کیوں لے جا رہا ہے؟ بوڑھا ٹھاکر اسے اونچی آواز میں یہی بتاتا آ رہا تھا کہ ہم دوئی جنے بڑے کھوسے پانی کھینچیں گے، پھر ادھر ہی کھوسے کے منچ پہ بیٹھ کے اہار کریں گے۔

لڑکا چپ تھا، یا بہت سے بہت بڑے میاں کی ہر بات پہ ہوں ہاں کر کے سر ہلا دیتا تھا۔ کنور گلیاروں سے گزرتے ہوئے اونچی آواز میں اسے بار بار سمجھا رہا تھا کہ ہم منچ پہ بیٹھ کے روٹی توڑیں گے۔ یہ کھوتیرے باپ کے اور تیری ماں کے گاؤں کا کھوسے... میرا بھی ہے۔ کوئی ہم کو کائے کوٹو کئے لگا۔ ہم دوئی جنے کسی کا کیا لیتے ہیں۔ بس پانی کھینچیں گے، ادھر منچ پہ بیٹھ کے روٹی توڑیں گے دوئی جنے۔ روٹی ابھی گرم ہے۔ لاڑی کے ہاتھ کی روٹی ہے۔ اس نے گھی چپڑ کے دیا ہے اتنا اتنا۔ ساتھ میں امی کا اچار ہے۔ وہ دھیمی نہی ہنسا۔ ہہ ہا۔ ارے سو بھاگیہ ہے اپنا کی گھی چپڑی گرم روٹی امی کا اچار ملا ہے۔ روج روج کون ملتا ہے۔ آ، آجا۔ ادھر رکھ دے کوٹو منچ پہ۔ لے میں پانی کھینچے لیتا ہوں۔

گاؤں کی جو عورتیں پانی بھر رہی تھیں وہ کنور اور چھوٹے لڑکے کو آتا دیکھ کے اپنے برتن بھانڈے سنبھال ہٹ گئیں۔ چلی گئیں اپنے گھروں کو۔ وہیں گاؤں کے لڑکے بھی کھیلتے تھے۔ دو تین خبر کرنے کو دوڑ گئے۔ تین چار وہیں کھڑے رہے۔ سمجھتے تھے کوئی ایسی بات ہونے والی ہے جو انھیں دیکھنی چاہیے۔

لڑکی اور سارنگ سنگھ ہتھیار سنبھالے دوڑے دوڑے آگئے تھے۔ انھوں نے دیکھا ٹھاکر نے کنویں کے جگت سے تلوار نکال دی ہے، گڑوی سے پانی کھینچ وہ منچ کی کچی مٹی پہ کلی کرتا ہے۔ پھر اس نے چھوٹے لڑکے کو اشارہ کیا۔ اس نے بھی گڑوی سے پانی لے منچ کے برابر کلی کی۔ سارنگ سنگھ نے مسکراتی آنکھوں سے لڑکی کی طرف دیکھا۔ کہنے لگا، ”منے بولا تھا

نا؟ بابا میرا بڑا جدی ہے۔“

لڑکی نے مسکراتے ہوئے ہاں میں سر ہلایا۔

چوراہے میں کھلنے والی سب گلیوں میں لوگ اکٹھے ہو گئے تھے۔ بساطی کے بیٹے نے

کنویں کے منج پہ بیٹھ کے کھلی کی تھی تو ایسا لگا تھا کہ جیسے ہزار چھتوں سے لاکھوں مدھوماکھیاں گنجن کرتی اٹھی ہیں۔ سارنگ نے اور لڑکی نے سرگھما کے دیکھا، گاؤں کے سب ہی دیکھتے تھے۔ پنڈا اور مکھیا نہیں آئے تھے۔

بوڑھے کنور نے کونڈے پہ ڈھکا کیلے کا پتا ہٹایا۔ ایک روٹی لڑکے کی طرف سرکائی، دوسری اپنی طرف کھینچی۔ امی کا ایک ٹکڑا اپنی روٹی پہ رکھا، دوسرا لڑکے کو بڑھا دیا۔ پھر چاروں طرف ناراض آنکھوں سے دیکھتے ہوئے نوالا توڑ لیا۔

لڑکا اپنا نوالا منہ کی طرف لے جاتا تھا کہ نارنگ ٹھا کر جھنجھناتی ہوئی آواز میں بولا، ”تجھے بسملہ بولنی کوئی نے نہیں سکھائی رے؟“

بساطی کا لڑکا چمک گیا۔ ڈری ہوئی آواز میں بولا، ”بس ملّا!“
کنور نے تسلی دی، ”ہاں شاباش... اب کھا۔“

اور خود ادھر ادھر دیکھتے ہوئے اس نے منہ میں نوالا رکھ لیا، ”جے جے پر بھو!“
جتنی دیر وہ دونوں کنویں کے منج پہ کھانا کھاتے، پانی پیتے، ہاتھ منہ دھوتے رہے، گاؤں والے گلیوں کے دہانوں پہ موجود رہے۔ بوڑھے ٹھا کر کے اٹھتے ہی گلیاں رے خالی ہو گئے۔ بستی کے بیرونی حاشیے سے چھ آٹھ ڈھیڑ، پاسی، چمار دوڑے دوڑے آگئے تھے۔ وہ پرانے پیپل کی اوٹ لیے اونچی جاتیوں کے کنویں کی درگتی دیکھتے رہے۔ وہ ڈرے ہوئے تو ہوں گے ہی، پر بوڑھے ٹھا کر کو عقیدت سے بھی دیکھتے جاتے تھے اور دانت نکالے مسکرا رہے تھے۔
لڑکی نے ان لوگوں کو مسکراتے دیکھا اور دل ہی دل میں کہا، ہاں یہ ٹھیک ہے۔

کنور بکرم نارنگ سنگھ اوجینی ایک ہاتھ میں رسی بندھی گڑوی، دوسرے میں جوٹھا کونڈا اٹھائے کنویں کا منج چھوڑ کے اپنے بیٹے اور اس لڑکی کی طرف چل پڑا۔ چھوٹا لڑکا دونوں ہاتھوں سے اس کی تلوار سنبھالتا پیچھے پیچھے آ رہا تھا۔



رگھوبا اور تارِ نخِ فرشتہ

میں، رگھوبا پنچ دیناری، گجرات کے برادھو بچوں خسرو خان حسن اور ملک امیر حسام کا حقیقی بھائی، ابھی تک نام کا رگھوبا اور ابھی تک پنچ دیناری ہوں... سو بڑی عافیت ہے کہ جاہ طلبی کے اس آزار سے جس میں میرے دو بھائی مبتلا ہوئے، میں بچا رہا، کس لیے کہ میں، رگھوبا چوڑی ساز، اپنی اصل سے، کہ اپنے گھرانے سے جڑا ہوا ہوں، جانتا ہوں کہ ہم آہن گروں، لکھیروں، چوڑی سازوں کے ہاتھ وہ مفید اور خوب صورت چیزیں گڑھتے بناتے ہیں جو اپنے کام اور اپنی زیبائی میں سلطنتوں سے بڑھ کر ہیں، تو پھر ہم سلطنتوں کے اور سلاطین کے انڈوے کیوں سہلائیں؟ اس خناس میں کیوں رہیں کہ ہم اور ہماری بنائی چیزیں لافانی ہیں؟ اسی لیے میں، رگھوبا چوڑی ساز، عدم کا نرم چارا بننے کو ہر وقت تیار رہتا ہوں۔

میرے دونوں بھائی ایک دہکتی ہوئی آرزو مندی میں دیوانہ وار ریگتے ہوئے دشتِ گم نامی سے باہر آئے اور تارِ نخِ فرشتہ کے تیز و تند دھارے سے جڑ گئے... سواب وہ لرزاں اور لافانی ہیں، سمجھو ایک نہ رکنے والے گرد باد میں ہیں۔ میں رگھوبا... بہت ہشیار... اتہاس کے پیس دینے والے پاٹوں سے بروقت پھسل گیا اور محمد قاسم فرشتہ کی دسترس سے دور، شہرِ ملتان کی ایک بے نام مسجد میں جا چھپا اور اب اپنے خاتمے کا انتظار کرتا ہوں۔

جہاں میں چھپا ہوں یہ بلند کرسی کی مسجد ہے۔ اللہ جانے ستر کہ کچھتر سیڑھیاں

چڑھو تب کہیں صحن کے فرش پر قدم پڑتا ہے۔ سیڑھیوں کے پاس دیوار میں سفید پتھر کی ایک سل جڑی ہے۔ سل پہ لکھا ہے کہ بندہ خدا امیر غازی فلاں نے سن فلاں میں یہ مسجد تعمیر کرائی (خدا اس کے درجات بلند کرے)۔ پتھر کی اس سل کو ایک خاص حکمت سے سرکاؤ تو ایک کھڑکی ظاہر ہوتی ہے اور تنگ سائینہ ایک حجرے میں اترتا دکھائی دیتا ہے۔ اس حجرے میں، میں سال ہا سال سے مقیم اور پابہ رکاب ہوں۔

مسجد بنانے والے امیر کو سلطان علاء الدین نے دس ہزار سواروں کی سرداری دے کر ادھر حاکم مقرر کیا تھا اور ملتان، اُچ اور سندھ اسے جاگیر میں عطا کیے تھے۔ اس سپاہی بچے نے خدا کے فضل اور شوکتِ سلطانی سے تاتاریوں کے ایک کم تیس حملے پسپا کیے، اس واسطے اسے تختی پر غازی لکھا گیا۔ اب یہ اللہ کی مرضی کہ اسے ناگہانی موت نصیب ہوئی، پس بعضوں کے نزدیک یہ غازی شہید بھی ہے۔ واللہ اعلم۔

تاہم اس بندہ خدا نے تاتاریوں کے انتیس حملوں اور بے دین برادھوؤں کی ایک بغلی یلغار کو روک کر مکمل تباہی اور بے غیرتی کی موت سے تختِ دہلی کو بچا لیا۔ یہ کوئی معمولی بات نہیں تھی۔

ان واقعات کا میں عینی شاہد ہوں۔ میں نے چھ سلطانوں کو تخت پر بیٹھتے اور تخت سے اترتے دیکھا ہے... ان میں کم سے کم تین میری جان کے گاہک تھے۔

کتنے ہی برس میں غازی شہید کے بیٹے کا بھی خادم خاص رہا... تاہم بادشاہوں کے غلاموں، خدمت گاروں کی حیثیت ہی کیا؛ ہوتی ہے اور پھر میں تو نو مسلم تھا اور ایک مردود و معتب کا بھائی تھا، مجھے ختم کرتے، یک دم فنا کرتے کسی بھی بادشاہ کو کیا دیر لگتی؟

مگر اللہ کا کرم ہو گیا۔ حضرت شیخ بہاء الدین زکریا کے پوتے شیخ ابوالفتح رکن الدین نے عنایت کی نظر فرمائی۔ آپ کے اشارے پر مجھے اس جنجال سے نکال کر ملتان لے جایا گیا۔ حکم دیا گیا کہ میں اس بلند کرسی مسجد کے مخفی حجرے میں جا بیٹھوں، اللہ بہتر کرے گا۔

اور بلاشبہ اللہ نے میرے حق میں بہتر کیا۔ ورنہ میں تھا کیا؟ ایک بے حیثیت کیڑا! جنگ کے علاقے سے پکڑ کر لائے گئے تین نابالغ لڑکوں میں سب سے چھوٹا تھا میں۔

جیسا کہ بیان کر چکا، میرا نام رگھو بابا تھا۔ جس وقت میں پکڑا گیا میری عمر پورے آٹھ سال کی بھی نہ تھی اور جب فروخت ہوا تو میری قیمت پانچ دینار سرخ ادا کی گئی۔ اسی لیے

برسوں کے پھیلاؤ میں مجھے رگھو بائج دیناری کہہ کے بلایا گیا۔

یہ سب اس وقت شروع ہوا تھا جب خلجی سلطان علاء الدین شاہ نے اپنے ایک سردار کو ملک مالوے کی تسخیر کا حکم دے کر روانہ کیا تھا۔ خلجی لشکر نے وندھیا کی پہاڑیاں اور دڑے پار کیے۔ مندو کا قلعہ اس بے دریغ لشکر کے سامنے مٹی کا حصار ثابت ہوا۔ چھ سات روز کی لڑائی میں گڑھ مندو اور اس سے متعلق گڑھیاں اور کوٹ، سلطانِ دہلی کے مطیع ہو گئے۔ مندو کے راجپوت قلعے دار نے لڑتے ہوئے جان دے دی اور اس کی بے سری فوج نے خلجی پرچموں کی اطاعت میں اپنے کھانڈے ڈال دیے۔

فاتح لشکر کے سالار نے مندو میں داخل ہو کر نہتے شہریوں کے لیے عام معافی کا اعلان کیا تھا۔ میرے ماں باپ دونوں ہی ذرا صبر سے کام لیتے تو ہمارا گھر بسا رہتا، اس طرح تتر بتر نہ ہوتا۔ ماں، نا سمجھ عورت، مندو کوٹ کی شکست کا سن کر کنویں میں ڈوب مری۔ باپ ہم تینوں بھائیوں کو سڑک پر روتا چھوڑ کر سب کے ساتھ فصیل کے رخنے سے نکل بھاگا۔ پھر اس کی خبر نہ ملی۔

اوپنچی ذاتوں کے ناگرک ہمیں منہ نہیں لگاتے تھے۔ ہم لوگ گجرات کے برادھو تھے۔ ہمارا گھر چوڑی والوں کے محلے میں تھا۔ مندو کے لکھیرے شیشے اور لاکھ کے نازک کام کے لیے دور دور مشہور ہیں۔ دوسروں کی طرح ہمارے ہاں بھی شیشے اور لاکھ کی چوڑیاں، کڑے، ونگیاں بنائی جاتی تھیں۔ ڈھائی کاری گروں کا گھر تھا... دو ہمارے ماں باپ اور آدھا کاری گر ہمارا بڑا بھائی جو گیارہ ساڑھے گیارہ برس کا ہوگا اور بس۔ سورج نکلنے سے ڈوبنے تک اتنا کام ہو جاتا تھا کہ پانچ جانوں کا گزارا ہو سکے۔ کچھ برتن، ایک گائے اور چھ بکریاں... یہ ہمارا کل اثاثہ تھا۔

ماں باپ کے جانے کے بعد کچھ دیر تک ہم گھر میں چھپے رہے، پھر سڑک پر آ کر رونے لگے۔ ایک پہر بھوکے پیاسے بے حال سڑک کے کنارے بیٹھے بیٹھے تھک گئے۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جائیں، کیا کریں۔ پھر بڑا، جس کا نام کسم تھا، ہم دونوں بھائیوں کو گھر میں لے گیا۔ بچا کھچا کچھ کھلا کر، چھ آٹھ دھوتیاں، چادریں اور لوٹا کٹورے ایک پوٹلی میں باندھ، وہ ہمیں گھر سے نکال لایا۔ محاصرے اور اس کے بعد کی بھگدڑ میں ہماری بکریاں اور گائے یا تو کوئی کھول لے گیا ہوگا یا آپ ہی رستی تڑا کے بھاگ گئیں۔ زیور، روپیا پیسا کچھ تھا

نہیں، جو تھوڑا کچھ ہوگا وہ بھاگتے ہوئے باپ نے اپنی انٹی میں باندھ لیا تھا۔

ہمارے مقدر کا جو بچا تھا ہم نے سنبھالا اور گھر سے نکل کھڑے ہوئے۔

رات میں ٹوٹی ہوئی فصیل کے بلے پر سے جیسے تیسے گرتے پڑتے کھیتوں اور کھلے میدانوں میں نکلے تو ہم نے بہت سے لوگوں کو سروں پر سامان اٹھائے، گائے بیل بکری کی رسی تھا مے اندھیرے میں بھٹکتے دیکھا۔ سب مندو چھوڑ کر جا رہے تھے، لیکن یہ کسی کو نہیں معلوم تھا کہ کہاں جا رہے ہیں۔ دوسروں کو دیکھ کر ذرا حوصلہ ہوا۔

بڑا بھائی کسم کہنے لگا، ”دیکھو... کوئی پوچھے کہ کون ذات ہو تو یہ نہ بولنا کہ ہم برادھو ہیں... اور چوڑی دنگی کے کاری گر ہیں یہ بھی کسی کو نہ بتانا۔“

مجھ سے بڑا سیارام پوچھنے لگا، ”بھلا کیوں؟“ تو کسم بولا، ”شہر کی طرح رستے میں بھی بامن اور ٹھا کر لوگ دُر دُر کریں گے، پاس نہیں آنے دیں گے۔ رستے میں تو سب ہی کا ایک جیسا حال ہے، سب ہی بھاگ رہے ہیں۔ اس ہا ہا کار میں ذات پات کس بات کی؟ کوئی پوچھے تو بول دینا ہم پنڈت بامن ہیں، ہمارا باپ مائی کے مندر میں پجاری لوگ کا کھانا بناتا تھا۔“

آدھی رات ہوتے ہم چھ آٹھ کوس نکل گئے۔ مجھ سے بڑا سیارام دھلا پتلا تھا، پر ہاتھ پیروں کا جان دار تھا۔ بڑے کسم کو تو سب ہی پہلوان کہتے تھے۔ بس ایک میں ہی کم زور تھا۔ تین کوس چلتے بھاگتے میری حالت ایسی ہو گئی کہ کسم کہنے لگا، ”تھوڑا رک کے، سستا کے چلیں گے۔ چھوٹے کو تھوڑا سو لینے دو۔“ ہم تینوں ایک کنویں کے پاس ٹھہر گئے۔

میں نے شور مچا دیا کہ میں بھوکا ہوں۔ بھوکے پیٹ سو نہیں پاؤں گا۔ جس پر کسم نے پہلے تو مجھے پھٹکارا اور ڈانٹ ڈپٹ دیا۔ پھر مٹھی بھر چنے پوٹلی سے نکال کے دیے۔ چنے کھا کے، پانی پی کے میں سو گیا۔

آنکھ کھلی تو میں نے دیکھا دن نکل آیا ہے۔ ایک گوری چٹی جوان عورت، ادھیڑ عمر کا ایک کالا مرد اور دو چھوٹی لڑکیاں ہمارے پاس کنویں کی منڈیر سے ٹیک لگائے بیٹھی تھیں۔ عورت آگ جلانے کا جتن کر رہی تھی۔ مجھے اٹھتے دیکھ کر دونوں لڑکیاں پاس سرک آئیں۔ چھوٹی کوئی چار سال کی ہوگی۔ اسے گھر سے نکلنا اور اس طرح کنویں کے پاس آ بیٹھنا اچھا لگ رہا تھا۔ پہلے تو وہ ہنس ہنس کے اپنی بڑی بہن سے کچھ کہتی رہی۔ پھر مجھ سے بولی، ”تو بھی

اپنے ماما جی کے گھر جا رہا ہے؟“

میں نے کہا، ”نہیں... ہمارا کوئی ماما نہیں ہے۔“ پھر مجھے بڑے بھائی کی بات یاد آگئی تو میں نے کہا، ”ہمارا باپ مائی کے مندر میں پجاریوں کا کھانا بناتا تھا۔ ہم باسن پنڈت ہیں۔“

میری اس جھوٹ بات میں خبر نہیں اسے ایسا کیا اچھا لگا کہ وہ ماں کے پاس گئی اور اپنی طوطے جیسی تیز آواز میں بولی، ”اے ماں، ماں، ماں، یہ لوگ کا باپ مائی کے مندر میں پجاری لوگ کا...“

کالے مرد نے اسے پوری بات نہ کہنے دی۔ چیخ کر بولا، ”چپکی بیٹھ، نہیں ایک جھانپڑ دوں گا۔ جب دیکھو جب ٹیس ٹیس کرتی رہتی ہے۔“

عورت نے کڑے تیوروں سے مرد کی طرف دیکھا، پھر ہاتھ بڑھا کر چھوٹی لڑکی کو اپنے سے بھڑالیا۔ یہ ماں کی لاڈلی ہوگی، میں نے سوچا اور لٹیا سے چلو میں پانی لے منہ دھونا شروع کر دیا۔ بڑا بھائی کسم ایک دو شاخہ لکڑی اٹھائے کچھ دور درختوں جھاڑیوں میں گھس گیا تھا۔ سیارام کہنے لگا، ”اے رگھو! بھیا کسم نے ابھی ماکھی کا چھتا دیکھا ہے۔ وہ شہد توڑنے گیا ہے۔“

اس نے یہ بات اتنی اونچی آواز میں کہی تھی کہ کالے مرد نے سن لی۔ عورت کے کڑے تیوروں کا غصہ اتارنے کو وہ ہم سے الجھ گیا۔ چیخ چیخ کر کہنے لگا، ”ماکھی کو چھیڑ کے کیا سب کو مصیبت میں ڈالو گے سسر؟ بلاؤ اپنے اس بھائی کو۔“ وہ ہاتھ میں چابک لے کے ایسے اٹھا تھا جیسے اب ہمیں مارنا ہی شروع کر دے گا۔

سیارام بڑا تیز تھا۔ اس کے ہاتھ کا چابک دیکھ کے ہنسا۔ عورت سے کہنے لگا، ”تیرا آدمی بڑا جی دار ہے۔ اپنے چابک سے اس نے دلی لشکر کو بڑی مار لگائی ہوگی... باپ رے باپ!“

سیارام کی بات کا ڈنک ایسا لگا کہ کالے مرد نے چابک کا ہاتھ چلا دیا۔ سیاتیا تھا۔ وہ اچھل کے پیچھے ہٹا۔ کالے نے گالی دی اور اپنے کمر بند میں ہاتھ ڈال کے اس نے چھری کھینچ لی۔ چھری کا پھل دھوپ میں چمک رہا تھا۔

میں نے درختوں کی طرف منہ کر کے شور مچا دیا، ”کسم بھیا!... کسم بھیا! یہ آدمی سیارام کو چھری مار رہا ہے۔“

کالے آدمی نے میری چیخِ پکار سے خیال کیا ہوگا کہ ہم ڈر گئے ہیں۔ وہ اور ڈرانے کو اپنی چمک دار چھری لہراتا ہوا سیارام کی طرف ایسے بڑھا جیسے حملہ کر ہی دے گا۔

میں پوری طاقت سے چیخنے لگا، ”کو سوم! اے کم بھیا!“

جھاڑیاں ہٹاتا ہمارا بڑا بھائی کھلے میں نکل آیا تھا۔ میں نے اس کے ہاتھ میں گوبچن نہیں دیکھا تھا مگر اس نے گوبچن کے پٹے میں چھوٹا سا پتھر رکھ کے اسے اپنے سر کے گرد گھما کے ایسا نشانے پر چھوڑا کہ کچھ نظر تو نہ آیا مگر ہم نے کالے آدمی کی بھیانک چیخ سنی۔ پھر دیکھا کہ وہ اپنے گھٹنے جوڑے ہوئے اور خوب سختی سے گھٹنوں میں دونوں ہاتھ دبائے نیل کی طرح ڈکرائے جا رہا ہے۔

جوان عورت اپنی بیٹیوں کو خود سے بھڑائے بے تعلقی سے آگ روشن کرتی رہی۔

سیارام نے اچھل اچھل کر قہقہے لگانا شروع کر دیے۔ میں ڈر رہا تھا کہ اب یہ کالا ضرور زمین پر پڑی اپنی چھری اٹھا کے سیارام کو زخمی کر دے گا، مگر اتنی دیر میں کم نے گوبچن میں ایک اور پتھر رکھ لیا تھا۔

کالا کچھ دیر تک گالیاں بکتا اور تکلیف کی آوازیں نکالتا رہا۔ وہ کن انکھیوں سے دیکھ رہا تھا کہ بڑے نے گوبچن میں ایک اور پتھر لگا لیا ہے اور سیانے بھاگنے کی تیاری میں پوٹلی سر پر سنبھال لی ہے۔ میں نے بھی لوٹا اور ڈول اٹھا کر بڑے بھیا کی طرف سرکنا شروع کر دیا۔

ہم تینوں درختوں کے پاس اکٹھا ہو گئے۔ کالا آدمی اپنا آپ مسلتے ہوئے وہیں بیٹھا رہا۔ وہ اب خاموشی سے ہمیں گھورے جا رہا تھا۔ میں نے دیکھا غصے یا تکلیف سے اس کا چہرہ پسینے میں تر ہو رہا تھا۔

تھوڑی دیر تک ہم تینوں وہیں درختوں کے پاس کھڑے رہے۔ پھر جب بڑے نے دیکھا کہ آگے کچھ نہیں ہو رہا تو ہم دونوں کو لیے ہوئے کنویں کے جگت کی دوسری طرف چلا گیا۔ یہاں سے ہم کالے آدمی اور اس کے ساتھ کی عورت اور لڑکیوں کو نہیں دیکھ سکتے تھے۔

کم چند بھیا ہمیں نئی جگہ بٹھا کر جھاڑیوں میں گیا اور اپنی دو شاخہ لکڑی اور ماکھی کا ایک چھتا اٹھائے واپس ہوا۔ سیارام نے خوشی میں شور مچا دیا۔ ”واہ رے واہ... ماکھی کا چھتا! واہ رے واہ... واہ رے واہ!“

چھوٹی لڑکی آہستہ آہستہ چلتی ہوئی آئی اور پتھر کی اوٹ سے ہمیں چھتے سے لپٹی

لکھیاں ہٹاتے اور برتن میں شہد گراتے دیکھنے لگی۔ اس نے خاموشی سے خوش ہو کے بے آواز تالیاں بجانی شروع کر دی تھیں۔ شہد نکلتے دیکھنا اسے اچھا لگ رہا تھا۔

میں نے چھتے سے ایک ٹکڑا توڑ کر اس کی طرف بڑھایا۔ بڑی سی رس دار گلاب جامن کی طرح ٹکڑے سے شہد ٹپک رہا تھا۔ لڑکی نے ہنس کے انکار میں سر ہلا دیا۔ میں نے وہ ٹکڑا ایک پتے پر رکھ کے لڑکی کی طرف پھر بڑھا دیا تو وہ خوشی سے کلکاری مارتی آگے آئی اور پتے میں لپٹا ٹکڑا لے کر اسے سنبھالتی ہوئی کنویں کے دوسری طرف چلی گئی۔

اگلے ہی پل لڑکی کی ماں ادھر آئی اور شہد کا وہ ٹکڑا ہمارے سامنے رکھ کے مڑ گئی۔ مجھے برا لگا۔ میں نے کہا، ”چاچی، تیرے کو تو نہیں دیا تھا۔ تو کائے کو واپس کرتی ہے؟“ جاتے جاتے عورت نے مڑ کے دیکھا اور آنکھ سے ادھر اشارہ کیا جدھر اس کا آدمی بیٹھا تھا۔ عورت کے چہرے پر خفگی نہیں تھی۔ وہ اپنے مرد کی وجہ سے واپس کر رہی ہے، میں نے سوچا، چلو کوئی بات نہیں۔

دیر تک کنویں کی اوٹ سے چھوٹی لڑکی کے رونے اور ماں کے چمکانے کی آواز آتی رہی۔

ابھی ہم شہد ختم کر کے ہاتھ منہ دھوتے تھے کہ دور سے گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دیں۔ بڑے نے کھڑے ہو کر دیکھا۔ آہستہ سے بولا، ”بھاگ کے جھاڑیوں میں چھپ جاؤ رے۔“ کالا، اس کی عورت اور بچے آگ چیتانے اور کھانے پینے میں لگے تھے۔ انھیں سوار اس وقت نظر آئے جب وہ سر پر پہنچ گئے۔

وہ تین تھے، خلجی لشکر کی وردی میں، جنگی نسل کے خوب نگڑے گھوڑوں پر سوار۔ وہ سڑک چھوڑ کر کنویں کے پاس بیٹھے ہم لوگوں کو دیکھ کر ادھر آ گئے تھے۔

عورت اور بچے انھیں دیکھ کر گھبرا گئے۔ مرد خوشامد میں ہاتھ باندھ کے کھڑا ہو گیا۔ کسم چند بھیا نے میرے کان میں کہا، ”گھبراننا مت... انھوں نے ابھی تک تلواریں کھینچیں، اور ان کے پاس بھالے نہیں ہیں۔ وہ پکڑنے، حملہ کرنے نہیں آئے۔“ ایک سوار نے ہاتھ اٹھا کر عورت مرد کو تسلی دی۔ بھاری آواز میں پوچھنے لگا، ”گڑھ مندو سے آرہے ہو؟“

کالے نے ہاتھ باندھے باندھے ہاں میں سر ہلا دیا۔

سوار نے پوچھا، ”کوئی سواری، سامان کچھ نہیں۔ کیا بھاگ رہے ہو شہر سے؟“
عورت مرد دونوں خاموش رہے۔ چھوٹی لڑکی بولی، ”ہم ماما کے گھر جا رہے ہیں۔
ادھر بیاہ ہوگا۔“

تینوں سوار مسکرا نے لگے۔ کالے آدمی نے بھی دانت نکال دیے۔
اسی سوار نے، جو دوسرے دو سے عہدے میں بڑا ہوگا، پوچھا، ”تمہارے ساتھ اور
تھے کوئی، وہ کہاں گئے؟“

عورت بولی، ”وہ ہمارے ساتھ نہیں تھے۔ چلے گئے۔“
مرد نے آنکھوں سے ہماری چھپنے کی جگہ کی طرف اشارہ کیا ہوگا، جب ہی سواروں
کے اگوانے ہنستے ہوئے جھاڑی کی طرف دیکھا اور پکار کے کہا، ”آ جاؤ رے، ڈرنے کی کوئی
بات نہیں۔“

کسم بھیا ہم دونوں کا ہاتھ پکڑ کر جھاڑی سے باہر آ گیا۔
”تم لوگ بھی مندو سے آرہے ہو؟“

بڑا بھیا بولا، ”ہاں جی۔“

”کیوں بھاگ رہے ہو؟ مندو میں ہم نے عورت مرد، بوڑھے جوان، سب کو امان
دی ہے۔ تمہارے پاس تو ہتھیار بھی نہیں۔ جو ہتھیار لے کر سامنے آئے صرف اس کی پکڑ
ہے۔ تم کیوں بھاگ رہے ہو؟“

میراجی چاہا کہہ دوں کہ سامنے جو کالا کھڑا ہے اس کی کمر میں اتنی بڑی چھری بندھی
ہے، مگر میں نے سوچا جانے دو۔ دھیرے سے اتنا ضرور کہہ دیا کہ ہماری ماں ڈوب مری اور
باپ بھاگ گیا، اس لیے ہم مندو سے جا رہے ہیں۔

سوار نے میری بات سن کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھا۔ لگتا تھا بات کا اس پر
خاص اثر ہوا ہے۔

دوسرے سوار نے بھیا سے پوچھا کہ تمہارا باپ کیا کام کرتا تھا۔ بھیا نے وہی بات
کہہ دی کہ مائی کے مندر میں باموں کے لیے کھانا پکاتا تھا، ہم پنڈت بامن ہیں۔
سواروں کا اگوا خوش مزاجی سے کہنے لگا، ”تمہیں بھی کھانا پکانا آتا ہوگا۔ ہمارے
ساتھ چلو، ہمارا کھانا پکا دیا کرنا۔ تنخواہ دیں گے۔“

سیارام بولا، ”مگر ہم تو ہندو ہیں۔“

سواروں کے افسر نے اپنے برابر والے سوار کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ بھی ہندو ہے اور بھی ہیں۔ تم ان کا کھانا پکا کے کھانا۔ خوش ہو جائیں گے۔ تین تین برہمن رسوے کسے ملتے ہیں۔“ وہ جسے اس نے ہندو بتایا تھا خوش ہو کے سر ہلانے لگا۔ دوسرا بھی مسکرا رہا تھا۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی، ان کے لشکر میں یہ ہندو کہاں سے آگئے؟ ماں نے تو بتایا تھا کہ خلجی لشکر میں سارے ہی مسلمان ہیں، کوئی پٹھان ہے، کوئی ترکی ہے، کوئی کہیں کا ہے، مگر ہیں سارے مسلمان۔

جاتے ہوئے سواروں نے اپنی خرجیوں سے نکال کر ہمیں ستو کی دو دو تھیلیاں دیں۔ کالے آدمی نے خوشامد کر کے ایک تھیلی زیادہ ہتھیلی۔ سواروں میں وہ جسے ہندو بتایا گیا تھا، جاتے جاتے بولا:

”تم لڑ کے واپس گڑھ مندو جانا چاہو تو ہمارے پیچھے بیٹھ جاؤ۔ گھر مت چھوڑو۔ مندو پہنچ کے تمہارا وظیفہ لگوادیں گے۔“

کسم بھیا کہنے لگا، ”گھر میں اب کچھ نہیں ہے۔ ہم چندیری جا رہے ہیں۔ اب تو ادھر بھی خلجی کا حکم چلتا ہوئے گا۔ ادھر ہی وظیفے کی درخواست دے دیں گے۔“

سوار بولا، ”بڑا ہشیار ہے رے، تجھے سب خبر ہے۔“ سوار چلے گئے تو کالا آدمی انھیں اور سب لشکریوں کو برا بھلا کہتا، بک بک کرتا، عورت اور لڑکیوں سے ستو کی تھیلیاں بٹورنے لگا۔ میں سمجھا لشکریوں کی دی ہوئی چیز رکھنا نہیں چاہتا، پھینک دے گا۔ لیکن اس نے خوشامد کر کے زیادہ ستو لیا تھا۔ میں نے دیکھا کہ کالے آدمی نے عورت اور لڑکیوں کا ستو چھین کے اپنے قبضے میں کر لیا ہے اور کچھ کھاپی کے آرام کر رہا ہے۔

ہم تینوں بھائی ان لوگوں کو کنویں کے پاس چھوڑ کے چل پڑے۔ دو تین کوس گئے ہوں گے کہ ایک بائیے کو درختوں کی چھاؤں میں نیل گاڑی کھولتے دیکھا۔ ہم بھی رک گئے۔ معلوم ہوا بائیے کو گجرات راج جانا ہے، بیلوں کو آرام دینے ایک پہر کورکا ہے، روٹی ترکاری بنائے گا، پھر چل پڑے گا۔

کسم بھیا نے گھگھیا کے کہا کہ ہمیں بھی گجرات لے چلو۔ اس نے بڑی بے مروتی

سے انکار کر دیا۔

کسم اتنی آسانی سے ہار ماننے والا نہیں تھا۔ ”چھ تھیلی ستو ہے ہمارے پاس، وہ سب دے دیں گے۔ تمہارا اوپر کا کام بھی کریں گے۔ ہمیں بٹھا لو۔“
 بانیا بولا، ”ارے آٹھ تھیلی ستو کی تو مجھ سے لے لے۔ مفت کا ستو بہت ہے میرے پاس۔“

بھیا کسم چند نے لاکھ اور شیشے کی چوڑیوں کا ایک گڈا سے دکھایا تو ذرا نرم پڑا۔ کہنے لگا، ”یہ چوڑی کڑے کم ہیں، پر میں لے لوں گا۔ ساتھ میں پیتل کا یہ سارا برتن بھانڈا بھی دینا پڑے گا، تب ہی کچھ بات بنے گی۔ پھر بٹھاؤں گا تینوں کو۔“
 مگر کسم بھیا نے کوشش کر کے ایک تھالی لوٹا بچا لیے۔ بانے کو یہ بات اچھی نہ لگی۔ پھر بھی کہنے لگا، ”چلو تم براہمن ہو، انا تمھو۔ اتنی سہولت کر دیتا ہوں کہ یہ تھالی لوٹا اپنے پاس رکھ لو۔ پر سارے رستے بیلوں کو پانی چارا دینا ہوئے گا تمھارے کو۔ یہ سب تم لوگ کے ذمے۔“

ایک پہر آرام کر کے ہم بانے کی بیل گاڑی میں مالوے کا علاقہ چھوڑ گجرات کی طرف چل پڑے۔

اب اتنے برس بعد سوچتا ہوں تو اس گھڑی کو کوستا ہوں جب ہم نے اس کی گاڑی میں بیٹھ کے گجرات راج کا رخ کیا تھا۔

گجرات میں آئے ہمیں تیسرا دن تھا۔ رستے کی تھکن اتارنے کو ہم شہر کے ناکے پہ ہی گاڑی کھول کر رک گئے۔ بانے کو تو سمجھو مفت کے چوکی دار خادم ملے تھے، وہ ہمیں بیل گاڑی کے پاس چھوڑ کر کچھ بیچنے کچھ خریدنے نکل گیا۔ جاتے ہوئے کہہ گیا کہ دن ہی دن میں لوٹ آئے گا۔ شاید ہماری خدمت گزاری سے خوش تھا تو یہ بھی کہہ گیا کہ سب کے لیے پوریاں مٹھائی لے کے آئے گا، شام میں چولہا جلانے کی ضرورت نہیں ہے۔

ہم تینوں بھائی دن ڈھلے تک سائے میں پیال ڈالے پڑے اینڈتے رہے۔ شام ہونے لگی تو بھوک نے ستایا۔ دور دور تک اور کوئی گاڑی، راہ گیر نہیں تھا۔ ناکا بھی ویران پڑا تھا۔ بانے کا، اس کی مٹھائی پوریوں کا انتظار کہاں تک کرتے۔ ناکے سے ذرا ہٹ کے خر بوزے کا کھیت تھا۔ کسم بھیا کہنے لگا، ”کھیت سے چھ آٹھ خر بوزے توڑ لاتا ہوں۔ کچھ تو

تسلی ہوگی۔“

سیارام ڈر رہا تھا کہ کھیت والا چوکی داری کرتا ہوگا، کہیں اس نے دھریا تو لینے کے دینے پڑ جائیں گے۔

کسم بھیا بولا، ”دیکھا جائے گا۔“ اور وہ لومڑی کی طرح گھات لگاتا کھیت کی طرف چلا۔

ہم دونوں نے ہانک لگائی کہ لینا کھیت میں چور آتا ہے۔

اس وقت ہمیں یہ سب کھیل لگ رہا تھا۔

کسم چند کھیت میں کھڑی جھونپڑی سے ہٹ کے درختوں جھاڑیوں کی اوٹ لیتا ہوا بڑھ رہا تھا۔ کوئی سو قدم تک تو وہ نظر آیا، پھر جھاڑیوں اور کانٹوں کی باڑ نے اسے چھپا لیا۔ میں نے سوچا بھی نہیں تھا کہ اب جو میں بھیا کسم چند کو دیکھ رہا ہوں تو اس طرح سے اسے آخری بار دیکھتا ہوں۔

کسم کو آنے میں دیر ہوئی تو بھیا سیارام بولا، ”میں جا کے دیکھوں کیا بات ہے؟“

میں نے کہا، ”نہیں تم مت جاؤ، مجھے ڈر لگے گا۔“

ہم باری باری درخت پر چڑھے، دور تک نظر ڈالی۔ کسم بھیا نہیں دکھائی دیا۔

رات ہونے لگی تھی۔ بانیا بھی شہر سے نہیں لوٹا تھا۔ سیارام نے الاؤ جلا دیا کہ لوٹتے

ہوئے کسم کو ہم تک پہنچنے میں مشکل نہ ہو۔ وہ روہانسا ہو رہا تھا۔ میں دو تین بار آواز سے روچکا تھا۔

گھپ اندھیرا ہو گیا تھا کہ سامنے سے کسی نے آواز ماری۔ ”ارے سنتے ہو رہے...“

اوگاڑی والے!“ کسی نے ہمیں متوجہ کیا تھا۔

ہم دونوں بھائی الاؤ کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ آنے والے نے پھر آواز لگائی

اور لائٹ بجاتا قریب آ گیا۔ اسی علاقے کا دیہاتی تھا۔ لائٹ کے سوا اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔

اس نے آتے ہی پوچھا، ”چھو کرے! تمہارا کوئی ساتھ والا ابھی ادھر کھیت میں گیا ہے؟“

”ہاں ہاں! بھائی ہے ہمارا،“ سیارام جلدی سے بولا۔

میں سوچنے لگا کسم بھیا کو چوکی دار نے دھریا ہے، اب یہ ہم سے ہر جانے کے دام

لے گا، پھر چھوڑے گا۔ مگر آنے والے دیہاتی نے پیچ پیچ کر کے افسوس میں سر ہلا دیا۔ بولا،

”اسے کیڑے نے کاٹ لیا ہے۔ ادھر پڑا ہے تیرا بھائی۔ آمیرے ساتھ... اسے کوئی بید حکیم

کے پاس لے جانا ہوئے گا... آ۔“

دیوانوں کی طرح دیہاتی کے ساتھ اندھیرے میں چل پڑے۔ ہم نے یہ بھی نہ دیکھا کہ کدھر جا رہے ہیں، آگے گڑھا، کھائی، ٹیلا تو نہیں۔

اندھیرے میں ہانپتے کانپتے دونوں بھائی کبھی دیہاتی کے ساتھ ہو لیتے، کبھی اس کے پیچھے اور بے تابی میں کبھی آگے دوڑنے لگتے۔

جب بہت دیر تک ہم کھیتوں، ٹیلوں اور نالیوں میں چلتے رہے اور کوئی جگہ نہ آئی تو سیارام کو گھبراہٹ ہوئی۔ اس نے پوچھا، ”اور کتنی دور جانا ہے؟ وہ ادھر کیسے آیا؟ ادھر تو نہیں آیا تھا۔“

دیہاتی نے اندھیرے میں کچھ کہا جو ہماری سمجھ میں نہ آیا۔ وہ شاید سمجھنا بھی نہیں چاہتا تھا کیوں کہ سیارام کے شک ظاہر کرنے اور دیہاتی کے بڑبڑانے کے ساتھ ہی ہمارے دائیں بائیں اور پیچھے کھڑ بڑسی ہوئی تھی اور دو تین آدمیوں کی للکار سنائی دی تھی۔ اندھیرے میں سے دو چار چھ ہاتھ نکلے۔ انھوں نے مجھے دبوچ کر گرا لیا۔

پکڑنے والوں نے گھونسوں سے اور لکڑی سے مارنا شروع کیا۔ میں رونے لگا۔ کسی نے کہا، ”ارے مارومت... ویسے ہی باندھ لو۔“ تو مارنے والے ہاتھ رک گئے۔

میرے برابر ہی انھوں نے سیارام بھیا کو گرا دیا تھا۔ وہ ایک بار زور سے چیخا، مدد کے لیے پکارنا چاہتا ہوگا، تو ان میں سے ایک کہنے لگا کہ منہ پہ کپڑا باندھ دو۔

آوازوں سے لگتا تھا کہ وہ پانچ چھ آدمی ہیں۔ ایک نے کھر درے ہاتھوں سے میرے ہاتھ پاؤں باندھے اور مجھے بکری کے بچے کی طرح کندھے پر ڈال لیا۔ پھر وہ ہم دونوں کو اٹھائے ہوئے دوڑنے لگے۔

یہ کھیت کے چوکے دار نہیں، اور ہی لوگ تھے۔ کوئی بڑی مصیبت تھی جس میں ہم گرفتار ہو گئے تھے۔ معلوم نہیں کتنی دیر تک اور کتنی دور تک ہمیں لے جایا گیا۔ پھر میں نے اپنی طرف روشنی آتے دیکھی۔ ہم کسی ٹوٹی پھوٹی حویلی میں پہنچے تھے جہاں آدھے ٹوٹے سائبان کے نیچے چھ سات مشعلیں جل رہی تھیں۔

ہمارے ساتھ چھ آدمی آئے تھے اور سائبان کے نیچے اتنے ہی آدمی پہلے سے

موجود تھے۔

سائبان کے نیچے ٹوٹے ہوئے لکڑی کے شے نشین پر پیال بچھی تھی اور پیال پر دوسروں کے ساتھ وہ بانیا بھی بیٹھا تھا جس کی گاڑی میں مالوے سے گجرات تک ہم تینوں آئے تھے۔ پہلے تو میں سمجھا ڈاکوؤں نے اسے بھی دھر لیا ہے، لیکن وہ ان سے اور دوسروں سے ہنس کے باتیں کر رہا تھا۔ سیارام سب کچھ سمجھ چکا تھا۔ اس نے زور زور سے بانیے کو گالیاں دینا شروع کر دی تھیں۔ مگر اس کی گالیوں کو یا میرے رونے پلانے کو کوئی نہیں سن رہا تھا۔

آخر بانیے کے اشارے پر پیال پر بیٹھے آدمیوں میں سے ایک نے بڑھ کر سیارام کے سر پر تھکی دی، چمکارا۔ اس کے پیر کھول دیے مگر ہاتھ بندھے رہنے دیے۔ سہارا دے کر اسے اٹھایا اور بانہہ پکڑے پکڑے اسے ادھر ادھر چلانے ٹھلانے لگا۔

ایک اور آدمی میرے پاس چلا آیا۔ اس نے لمبی لمبی سخت انگلیاں گڑاتے ہوئے میرے بازوؤں، پنڈلیوں، رانوں کو ٹولا، منہ کھلوا کے دانت دیکھے اور جب میری خراب آنکھ پر اس کی نظر پڑی اور مشعل والے کو پاس بلا کر اس نے روشنی میں دیکھا کہ میری ایک پتلی گھومی ہوئی ہے تو وہ بانیے کے پاس جا بیٹھا اور میری طرف انکار میں سر ہلاتے ہوئے بار بار سیارام بھیا کی طرف اشارہ کرنے لگا۔

جو لوگ ہمیں پکڑ کر لائے تھے وہ بانیے اور اس کے ساتھ بیٹھے آدمیوں سے دہلی آوازوں میں جھٹ کرنے لگے۔

میں بعد میں سوچتا رہا کہ ہم دونوں کی پڑتال وہ اس طرح کر رہے تھے جیسے منڈی میں مال مویشی کو دیکھا پرکھا جاتا ہے۔ سیارام نے پیر چلانا اور چیخنا چلانا شروع کر دیا تو انھوں نے دوبارہ اس کے پیر اور منہ باندھ دیے۔

ڈاکوؤں سے خریداروں کی جھٹ کا کوئی نتیجہ نکلا ہوگا جب ہی وہ سیارام کو لے کر سائبان سے چلے گئے۔ پھر میں نے اسے نہیں دیکھا۔

دو تین مشعل والے اور بانیا بیٹھا رہ گیا تھا۔ میں نے رونا خوشامد کرنا شروع کر دیا، بانیے سے کہا کہ ”لالہ جی، ہم انا تھ ہیں، برہمنوں کے بچے ہیں، ہمیں چھوڑ دو!“ تو وہ ہنسنے لگا۔ بولا، ”بیٹا جی، مجھے بدھو نہیں بنا سکتا کوئی۔ سب پتا کر لیا ہے میں نے۔ تم لوگ لکھیرے ہو... جات کے برادھو ہو تم۔ ارے بامن پنڈت ہوتے تو رستے میں کسی آشرم میں چھوڑتا ہوا آتا، پنیہ کماتا۔ میرے ساتھ دھوکا کرنے چلے تھے سو رے!“ وہ بکلتا جھکتا سائبان سے چلا گیا۔ اب

صرف مشعل والے تھے اور میں تھا۔

میں نے مشعل والوں سے گھگھیا کے کہا کہ بھائی رسیاں کھول دو، مجھے چھوڑ دو، مگر ایسا لگتا تھا کہ وہ گونگے بہرے ہیں۔ وہ تو میری طرف دیکھ بھی نہیں رہے تھے۔

ساری رات اور اگلا آدھا دن میں اسی سائبان کے نیچے پڑا رہا، کتنی دیر تک روتا گھگھیا تا خوشامدیں کرتا رہا۔ ان مشعل والوں میں سے ایک صبح ہوتے ہوتے آیا، مجھے دو چار تھپڑ لاتیں مار کر سمجھا گیا کہ اب اگر رویا میں نے شور مچایا، بکواس کی تو وہ میرا گلا کاٹ دے گا۔ اس نے ایک چمک دار چھری بھی دکھائی۔

بھوک اور تھکن سے تو اب رونے شور مچانے کی بھی سکت نہیں تھی۔ میں چپ ہو گیا اور دن نکلتے وہیں پڑے پڑے سو گیا۔

دوسرے دن شام کو جب بھوک سے مرنے کو تھا تو اسی چھری دکھانے والے نے مجھے ابلی ہوئی شکر قندی کھانے کو دی۔ دن میں کئی بار وہ مجھے پانی پلا چکا تھا۔ خود میرے سامنے اپنی پوٹلی میں ہاتھ ڈال ڈال کے روٹی اور گڑ نکال کے کھاتا رہتا تھا، مجھے نہیں دیتا تھا، مرا مردار۔ مجھے ماں یاد آرہی تھی۔ ماں اور ساتھ کی دوسری عورتیں لشکریوں سے بہت ڈرتی تھیں اور ہر وقت انھیں برا بھلا کہتی رہتی تھیں۔ وہ کہتی تھیں خلجی لشکر کے سپاہی تو راکھشس ہیں۔ لیکن مجھے اس وقت اچنبھا ہوا جب میں نے سنا اس چھری والے نے پانی پی کے ڈکار لی تھی اور کہا تھا، ”ہرے رام!“

رام کا نام لیتا ہے اور آدھر متا کے کام کرتا ہے؟
میں سمجھ گیا اگر یہ راکھشس ہے تو خلجی کا راکھشس نہیں ہے، ادھر ہی کا راکھشس ہے۔ اس بانیے کی طرح ہے جس نے کسم بھیا کا اور سیارام بھیا کا سودا کر لیا تھا۔ یہ اب مجھے مار کے ادھر ہی گاڑ دینے کو کہتا ہے۔ میں دبلا پتلا تھا، میری آنکھ خراب تھی، میں بک نہیں سکتا تھا، اس لیے وہ لوگ مجھے مار کے گاڑ داب ہی دیں گے... اور کیا کریں گے؟
مگر کافی رات ہو گئی تو کچھ لوگ تیز رفتار گھوڑا گاڑیوں میں آئے اور انھوں نے میرا سودا کر لیا۔

آدھی رات کا گجر بننے سے پہلے ہم کسی حویلی میں داخل ہو رہے تھے۔
مجھے خریدنے والا کوئی مغل بیوپاری تھا۔ یہ بات مجھے حویلی میں پہنچ کر ہی معلوم

ہو گئی تھی۔ میں نے دروازے کے ساتھ رکھا ہوا ان کا دیول دیکھ لیا تھا۔ کچھ مغل ایسے بھی تھے جو مسلمان نہیں ہوئے تھے، اپنے پرکھوں کے دین دھرم پر قائم تھے۔ مجھے جو مغل بیوپاری خرید کر لایا تھا یہ انھی میں سے تھا۔

یہ بڑا دولت مند گھر تھا۔ حویلی کے دالان میں اتنی روشنی تھی کہ ایک بار تو میں چندھیا گیا۔ میرے پہنچتے ہی ایک بھاری بھر کم مغل عورت آئی۔ اس نے نوکروں کو، جو مجھے رسی سے باندھے ہوئے تھے، ڈانٹ ڈپٹ کر بھگا دیا اور افسوس کی آواز کرتے ہوئے میری رسیاں کھول دیں۔ وہ میرا سر اور گال تھپکتی رہی اور اپنی بولی میں نرمی اور مٹھاس سے کچھ کہتی رہی۔ وہ مجھ سے کچھ پوچھ رہی تھی۔ میں سر جھکائے بیٹھا رہا۔ اس کی بات ہی نہیں سمجھتا تھا جو جواب دیتا۔ عورت ہاتھ پکڑ کر مجھے ایک چھوٹے سے کمرے میں لے گئی جہاں ایک بڑے برتن میں پانی بھرا تھا۔ اس نے میرے کپڑے اتارے اور برتن میں کھڑا کر دیا۔ پانی گرم تھا۔ عورت نے خوش بودار بیسن سے خوب مل مل کر مجھے نہلایا، بدن خشک کیا، کپڑے پہنائے۔ وہ عجیب وضع کے کپڑے لائی تھی جنہیں پہن کر میں اسی جیسا مغل نظر آنے لگا۔ بعد میں پتا چلا حویلی کی کسی چھوٹی لڑکی کے کپڑے تھے جو اس نے مجھے پہنائے تھے۔

میں لڑکی کے کپڑے پہن کر ذرا خوش نہ ہوا کیوں کہ جو بھی آ کر مجھے دیکھتا پہلے مسکراتا، پھر ہنستے ہوئے میرے گال پر چٹکی لیتا تھا جیسا کہ ان لوگوں میں چھوٹی لڑکیوں سے لاڈ کرنے کا طریقہ ہے۔

عورت نے اس روز جو کھانے کھلائے میں نے زندگی میں کبھی نہیں دیکھے تھے۔ ساری چیزیں خوش بودار، گرم اور مزے دار تھیں۔

میری ماں کہتی تھی ہم برادھو لوگ دوسرے ناگرکوں کی طرح چھوت چھات نہیں کرتے، مرد ہمارے یہاں گوشت مچھلی بھی کھا لیتے ہیں۔ مگر وہ خود یہ چیزیں گھر میں نہیں آنے دیتی تھی۔ حویلی میں پہلی بار مجھے مچھلی کھانے کو ملی۔

مغل عورت مجھے کھانا کھلا کے کہیں اوپر لے گئی۔ ایک چھوٹے کمرے میں چھوٹا سا بستر لگا تھا۔ اس نے اشارہ کیا کہ لیٹ جا۔ میں پہلے ہی نیند میں جھوم رہا تھا، بستر پر پڑا اور سو گیا۔ بھلے ہی حویلی کی درجن بھر عورتیں آس پاس شور کرتی رہیں۔

مجھے تغہ مغل کی حویلی میں اپنا پہنچنا خوب یاد ہے... ساری زندگی یاد رہے گا۔ تغہ

مغل پشیمین، عطر اور مسالوں کی تجارت کرتا تھا۔ وہ میرا پہلا آقا تھا۔ یہاں پہلی بار مجھے وہ عورت ملی جس نے میری زبان نہ جانتے ہوئے مجھے بتایا کہ کسی لاگ لالچ کے بغیر محبت کیسے کی جاتی ہے، جو میری ماں، دادی، نانی کچھ نہیں تھی لیکن سب کچھ تھی۔ پینسٹھ ستر برس سے میں جس کی مغفرت کی دعا کر رہا ہوں... چاہتا ہوں کہ اگر میرا کوئی عمل میرے پالنے والے کے آگے مقبول ہو تو وہ اس عورت کے نام کر دوں جس کا دین دھرم مجھے تو نہیں معلوم مگر میرا مالک انتریامی خوب جانتا ہے۔

تغہ مغل کی حویلی کی چھوٹی سی اپنی ایک دنیا تھی۔ یہ دنیا مالک اور مالکن کے دو تین کمروں کو چھوڑ کر پوری طرح مجھ پر کھلی ہوئی تھی۔ مگر شروع کے چھ مہینے تک میں صدر دروازے سے باہر نہیں جاسکا تھا۔ خادموں دربانوں کو معلوم تھا کہ کسے باہر جانے دینا ہے اور کسے نہیں۔

چھ مہینے کے بعد میں امتے کے ساتھ باہر جانے لگا۔ امتے وہی مغلانی تھی جس نے حویلی میں آتے ہی جیسے مجھے گود لے لیا تھا۔ وہ خادموں کی سردارنی تھی۔ بہت سوں کے لیے سخت گیر اور کڑوی، مگر جیسا کہ بتایا، میرے لیے رحمت تھی وہ۔

امتے کے ساتھ باہر جانا مجھے اچھا بھی لگتا تھا اور نہیں بھی... اچھا اس لیے کہ گدے بچھی سواری میں خادموں کے ساتھ شہر کے دولت مند علاقوں، بارونق بازاروں، باغیچوں میں گھومنا، سیریں کرنا کسے اچھا نہیں لگے گا؟ مگر اس طرح باہر نکلنے میں یہ الجھن تھی کہ امتے باہر سیر کو جاتے ہوئے مجھے ہمیشہ لڑکی کا لباس پہنا کے لے جاتی تھی۔ وہ میرے بالوں کی بہت دیکھ بھال کرتی تھی جو اب کندھوں تک آنے لگے تھے۔ گڑھ مندو میں تو مہینے کے مہینے میرے سر پہ استرا پھیرا جاتا تھا۔

اس ایک الجھن کے سوا تغہ مغل کی حویلی میں مجھے ہر طرح کا آرام تھا۔ کئی استاد اور امتے مجھے سارا سارا دن پڑھاتے رہتے تھے۔ فارسی، سنسکرت، گجراتی پڑھنا اور حساب سیکھنا مجھے اچھا لگتا تھا۔ امتے اٹھنا بیٹھنا، چلنا پھرنا، کھانا پینا، نہانا، لباس پہننا، سارے روزمرہ کے کام سکھلاتی تھی۔ وہ اپنی زبان بھی مجھے سکھا رہی تھی۔ ایک استاد مجھے ہتھیاروں کا استعمال، گھڑ سواری اور پہلوانی سکھانے آتا تھا۔ امتے اور اس استاد کے ساتھ کبھی ہفتے میں ایک بار میں دریا پر بھی جاتا۔ یہاں ہم پیرا کی کرتے یا گھڑ سواری کا استاد اپنے دوسروں شاگردوں کے

ساتھ مجھے اکھاڑے میں زور کراتا تھا۔ بس یہی ایک موقع ہوتا جو باہر جاتے ہوئے میں لڑکی کا لباس نہیں پہنتا تھا۔

ایک دن گھڑ سواری کی مشق کرتے میں اپنے جانور سے گرا تو پتھر پہ سر لگا، کھال پھٹ گئی، بہت خون بہا۔ امّے اور استاد مجھے قریب کے کسی جراح کے گھر میں لے گئے۔ اس نے خون بند کرنے کو سوزن لگائی، زخم کی صفائی کر مرہم باندھ دیا۔ جراح کے گھر میں ایک عورت ہمیں ایسی ملی جو کہتی تھی اس نے مجھے کہیں دیکھا ہے۔ سارے وقت امّے بے حد پریشان اور خوف زدہ رہی۔ جراح کے مکان سے ہم روانہ ہوئے تب اس کے چہرے پہ ذرا رونق آئی۔

جراح نے اگلے روز حال دیکھنے کو حویلی آنے کا ارادہ ظاہر کیا تو امّے نے منع کر دیا کہ حویلی مہمانوں سے بھری ہوگی، کل خود وہ کسی کو بھیج کر مریض کا حال کہلا دے گی۔ حویلی میں پہنچی تو امّے تھکی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اپنے کمرے میں جالیٹی۔ میں جراح کی دوا دارو سے کچھ بحال ہوا تھا۔ امّے نے بہت کہا کہ تو آرام کر، مگر میں اس کے پیچھے پیچھے چلا آیا، میں اس نڈر مغلائی کے خوف کی وجہ سمجھنا چاہتا تھا۔

کوئی اور اس طرح بے بلائے امّے کے کمرے میں نہیں جاتا تھا۔ آج تو میں نے امّے کے حکم کی کھلی خلاف ورزی کی تھی۔ مجھے پیچھے آتے دیکھ کر اس کی تیوری پر بل پڑ گئے تھے مگر ڈھٹائی کے ساتھ جا کر میں اس کے گدے سے ٹیک لگا کر بیٹھ ہی گیا تو وہ ہلکے سے مسکرائی۔ کہنے لگی، ”جا اٹھ، دروازہ بھیڑ دے، کوئی اور نہ گھس آئے۔ کچھ دیر سکون سے لیٹوں گی۔“

میں نے دروازہ بھیڑ دیا۔ امّے آنکھیں بند کیے خاموش لیٹی تھی۔ میں ایک دم پوچھ بیٹھا، ”جراح کے گھر جا کے تو ڈر کیوں گئی تھی؟“

اس نے آنکھیں کھول دیں، دیر تک مجھے دیکھتی رہی۔ پھر بولی، ”جراح کی عورت اور لڑکی جانتی ہیں کہ تو لڑکا ہے۔“

”اس سے کیا ہوا؟ جاننے دے۔“

امّے بولی، ”جراح شاہی مخبر ہے... بس خاموش بیٹھ۔ بہت بک بک کر لی۔“

مگر میں نے ایک دم پوچھ لیا، ”امّے! شاہی مخبر کیا ہوتا ہے؟“

بوڑھی عورت نے بے زاری سے مجھے دیکھا۔ بولی، ”یہ خبر نہیں تھی کہ تو جیسے جیسے بڑا

ہوتا جائے گا نافرمان بھی ہوتا جائے گا۔“

میں سمجھ گیا کہ امتے زیادہ خفا نہیں ہے، تھوڑی اور ضد کروں گا تو بتا دے گی۔
میں نے اسے سکون سے لیٹنے نہ دیا۔ اس کے پیردبا تارہا۔ مہندی لگے گھنے بالوں
میں انگلیاں الجھا کر سردبانے کی کوشش کی اور اس کے بال الجھا کے رکھ دیے۔ امتے کو یہ سب
لاڈ اچھا لگتا تھا۔ وہ کچھ دیر جھڑکتی، دُر دُر کرتی رہی، پھر مجھے اپنے پاس لٹا لیا۔ ٹھیک ہے، اب
جو بھی میں پوچھوں گا امتے بتا دے گی۔

امتے نے پہلے وعدہ لیا کہ میں اور کچھ نہیں پوچھوں گا اور کسی کو بتاؤں گا بھی نہیں۔
پھر کہنے لگی، ”تیری عمر کے بچوں کو شاہوں اور مخبروں کی زیادہ کھوج نہیں کرنی چاہیے۔ تم لوگ تو
کھاؤ، پیو، کھیلو اور بس۔“

میں نے اس سے جھوٹا وعدہ کر لیا کہ اچھا اب اور نہیں پوچھوں گا اور کسی کو نہیں
بتاؤں گا۔

کہنے لگی، ”تو نے دیکھا نہیں... میں اور تیرا استاد تجھے جراح کے پاس لے گئے تھے
تو میں نے تیرے بال کھول دیے تھے، سواری کی ٹوپي دستار سر سے اتار لی تھی اور تیرے لڑکوں
والے لباس پر شوخ رنگوں کی ریشمی چادر اوڑھادی تھی؟ یاد ہے تجھے؟“

غور کیا تو مجھے یاد آیا کہ ہاں امتے نے ایسا ہی کیا تھا اور یاد آیا کہ جراح کے مکان
میں وہ عورت اور اس کی بیٹی ملی تھیں تو میرے لمبے بالوں کو حیران ہو کے دیکھتی تھیں اور یہ بھی
یاد آیا کہ یہ عورت اور لڑکی وہ تھیں جو مندو سے نکلتے ہم بھائیوں کو رستے میں ملی تھیں۔

امتے کہنے لگی، ”حویلی کے لوگوں کے علاوہ صرف سات آدمی اصل بات جانتے
ہیں کہ تو لڑکا ہے۔ باقی سب کے لیے تو لڑکی ہے، تنغہ مغل کی بیٹی۔ اگر وہ منحوس جراح اس
عورت اور لڑکی کی باتوں سے، یا تیری حماقت سے جان لیتا کہ تو لڑکی نہیں ہے تو ہفتے دس روز
میں شاہی پرچہ نویس یہ خبر خلجی سلطان کو پہنچا دیتے۔ پھر کسی کی خیر نہیں تھی۔“

میں بوڑھی عورت کے اس دور دراز کے اندیشے پر ہنسنے لگا۔ لو بھلا دلی میں بیٹھے خلجی
سلطان کو اس خبر سے کیا دلچسپی ہوگی کہ مندو کا بھاگا ہوا ایک ہندو بچہ رگھوبا لڑکی نہیں لڑکا ہے!
امتے نے جھنجھلا کر سر جھٹکا۔ بولی، ”رگھوبا سے... یا جو بھی تیرا نام ہے... تجھ سے
سلطان کو دلچسپی نہیں ہوگی، تنغہ مغل سے ہے... تنغہ مغل دراصل...“

اور امتے ایک دم خاموش ہو گئی۔ کہنے لگی، ”جا، مجھے کچھ دیر سونے دے۔“
میں نے بہت ضد کی، بہت سر مارا، لاڈ کیا، مگر امتے سیپ کی طرح بند ہو گئی تھی۔
میں نے ضد کے ساتھ سوچا کہ میں تغہ مغل اور سلطان خلجی والی بات کا کھوج لگا کے
رہوں گا۔

تیسرے دن جراح مجھے دیکھنے حویلی میں آیا تو وہ گوری چٹی عورت چمڑے کے تسیلے
میں جراح کے مرتبان اور پٹیاں اٹھائے ساتھ آئی۔

امتے میری جاننے والی عورت کو جراح کے ساتھ دیکھ کر بہت برہم ہوئی، مگر وہ خادم
خاص ایسے ہی تو نہیں تھی، اس نے اپنی مغولی زبان میں کسی بات پر جھنجھلا کر بکنا جھلکنا شروع
کر دیا۔ پھر عورت کا ہاتھ پکڑ وہ اسے حویلی کی بیرونی چوکی سے اندر لے آئی، اسے جریب
برداروں کی کوٹھری میں لے گئی اور تھوڑی دیر بعد سکھا پڑھا کے باہر لائی تو خاصی مطمئن تھی۔

جراح کو امتے کا یہ سب کرنا عجیب لگا۔ وہ شک میں پڑ گیا، پوچھنے لگا تو امتے کی منہ
چڑھی ایک خادمہ نے کہا کہ یہ عورت حویلی میں بدشگونی کے کپڑے پہن کے آئی تھی۔ امتے
نے اتروا کے الٹوا کے اسے دوبارہ کپڑے پہنوائے ہیں۔ آئندہ خیال رکھنا۔ یا تو اسے یہاں
لے کر نہ آنا اور جولاؤ تو کہنا بدشگونی نہ کرے، منحوس!

میں لڑکی کے لباس میں تیار تھا۔ امتے نے مجھے خوب پھولوں اور ریشمی ڈوریوں
والے کپڑے پہنائے تھے، بالوں کو خوش بودار پھیل سے گوندھا تھا، ان پر ریشم کی تتلیاں بنا کر
بٹھائی تھیں، آنکھوں میں کحل اور ہاتھوں پر مہندی لگا کر ایسے تیار کیا تھا کہ جان پہچان والی
عورت تک بار بار اچنبھے سے دیکھ رہی تھی۔ امتے نے جراح کو پلک جھپکنے کی مہلت نہ دی۔
جلدی کرنے کو کہے جاتی تھی اور بڑبڑاتی تھی کہ مالک کسی اور دن جراح کو بلاتے۔ آج نیکی کی
تقریب ہے اور آج ہی یہ اپنا تھان تو بڑا اٹھوا کے چلا آیا۔

جراح نے میری گردن کی مالش کی، ہاتھ پیر موڑ کر دیکھے اور پھر کچھ دوا دے کر،
امتے کو اطمینان دلا کر چلا گیا۔ میں دیکھ رہا تھا کہ بہت سے عطر اور خوش بودار مسالوں سے، جن
میں لپیٹ کر امتے نے مجھے بھیجا تھا، جراح کی کھوپڑی چکرا رہی تھی۔ وہ جلد سے جلد مجھے فارغ
کر دینا چاہتا تھا۔

عورت اور جراح کے جانے کے بعد اکیلے میں امتے اپنی چالاکی پر خوب ہنسی، ہنستے

ہنتے تھک گئی اور کرسی پر بیٹھ کر ہانپنے لگی۔ میں نے اس کی گود میں چڑھنے کی کوشش کی تو اس نے مجھے دھکا دے کر ہٹا دیا۔ بولی، ”لڑکے، یہ کپڑے اتار، اپنے بال اور بدن پونچھ لے تو آدمی کا بچہ لگے گا۔ اس وقت تو آقا مغل کے عطر کا گودام بنا ہوا ہے۔ جب ہی تو وہ حرام صورت منجر جیسے تیسرے تیرے کام نمٹا کے دم رو کے ہوئے باہر کی طرف بھاگا تھا۔“

میں نے امتے کی چالاکی کی تعریف کی۔ پھر پوچھا کہ اندر لے جا کر اس نے عورت سے کیا کہا تھا، تو کہنے لگی، ”اسے زیادہ کچھ نہیں بتایا۔ الٹا اس سے پوچھ لیا کہ وہ اور اس کی بیٹی اس ملعون کے پاس کس طرح پہنچیں؟ عورت نے بتایا کہ جس آدمی کے ساتھ وہ مندو سے چلی تھی اس نے گجرات آتے آتے عورت کو اور اس کی بیٹیوں کو عیاری سے کسی کے ہاتھ بیچ دیا۔ شہر میں داخل ہونے سے پہلے قافلے پر رہزن آپڑے، انھیں لوٹا۔ ایک بیٹی سواروں کی چھیٹ میں آ کے زخمی ہو گئی۔ جراح تک لے جانے سے پہلے بے چاری مر گئی۔ انھیں خریدنے والا بھی مارا گیا۔ جراح نے ہمدردی میں اپنے پاس رکھ لیا۔ مگر برابر اس کوشش میں ہے کہ عورت اس سے شادی کر لے یا ویسے ہی رہ پڑے۔“

امتے بولی، ”میں نے اس سے کہہ دیا کہ جراح ہرگز ہرگز اعتبار کے قابل نہیں ہے۔ اگر وہ چاہتی ہے کہ وہ اور اس کی بیٹی کسی اور بلا میں گرفتار نہ ہوں تو ہمارا ساتھ دے۔ جو کچھ یہاں دیکھ رہی ہے جراح کو معلوم نہ ہونے پائے۔ بیٹی کو بھی سمجھا دے کہ رستے میں لڑکے سے ملاقات کی بات بالکل بھول جائے اور یاد رکھے کہ وہ لڑکا نہیں لڑکی ہے۔“

امتے کا باتیں کرنے کو جی چاہ رہا تھا تو میں نے اس سے پوچھ لیا کہ مجھے تغہ مغل کی بیٹی کیوں بتایا جا رہا ہے؟

امتے اداس ہو گئی۔ کہنے لگی، ”وہ بالکل تیری طرح خوب صورت تھی اور عجیب بات کہ اس کی ایک آنکھ بھی اسی طرح تھی جیسی تیری ہے۔ کسی اور چہرے پر یہ بدنمائی ہوتی مگر اس کا چہرہ معصوم لگتا تھا... تیری طرح۔“ یہ کہہ کر امتے پیار سے میرے بالوں میں انگلیاں پھیرنے لگی۔

میں پہلی بار کسی سے ایسی بات سن رہا تھا۔ جسے عیب سمجھا جاتا تھا اسے یہ نیک دل عورتیں حسن سمجھتی تھیں۔

حویلی میں لوگ کہتے تھے کہ جتنے دام تغہ مغل نے مجھے خریدنے پر خرچ کیے اتنے

میں دو غلام خریدے جاسکتے تھے۔

میں اپنے ستاروں کو دعا دے رہا تھا... مگر شاید یہ قبل از وقت تھا۔

جراح کے حویلی میں آنے کے دوسرے ہی روز کچھ ایسا ہو گیا کہ غروبِ آفتاب کے بعد امتے مجھے لڑکی کے لباس میں دوسری عورتوں کے ساتھ کشتی کی سیر کے بہانے پردے دار سواری میں حویلی سے نکال لے گئی۔

سواری پہلے دریا کی طرف گئی ہوگی کیوں کہ پردے پڑے ہونے پر بھی دریا کی طرف سے آتی مہکتی، بھیگی ہوانے اندر بیٹھی عورتوں کو بے چین کر دیا اور انھوں نے تالیاں بجا بجا کر موسم کے گیت گانے شروع کر دیے۔ مجھے ان کا اس طرح گانا اچھا لگ رہا تھا، مگر امتے کا دل پریشان تھا، حویلی کی باتوں میں اٹکا ہوا تھا۔ اس نے عورتوں کو جھڑکی دے کر خاموش کرا دیا۔

آدھی رات کا گجر بجنے سے پہلے سواری کسی احاطے میں داخل ہوئی۔ خادموں نے دالان کے کندوں میں مشعلیں لگا دیں اور سواری کے پردے اٹھا کر وہ سامنے سے ہٹ گئے۔ چادروں میں لپٹی عورتوں کے درمیان میں خود بھی چادر لیے صحن اور دالان سے گزر کر اندرون میں پہنچا۔ یہاں شاید ہمارا انتظار ہو رہا تھا۔

قیمتی کپڑے پہنے بہت سی عورتیں کمروں سے نکل کر ہماری پیشوائی کو بڑھیں۔ وہ مجھے اور امتے کو ایک طرف اور باقی عورتوں کو دوسری طرف لے چلیں۔ امتے حکم دینے کی عادی تھی۔ اس نے ڈپٹ کر کہا، ”ٹھہرو! انھیں کہاں لیے جاتی ہو۔ یہ ہمارے ساتھ آئی ہیں، ساتھ ہی رہیں گی۔“

مگر امتے کی بات پر قیمتی لباس والی عورتوں نے توجہ نہ دی۔ ان میں سے کچھ ہماری ساتھ کی عورتوں کو لے کر چلی گئیں۔ ہمیں لے جانے والی عورتیں منہ تھتھائے، بہت مصروف دکھائی دیتی، آگے آگے چلتی رہیں۔ پھر عمارت میں اندر کہیں ایک روشن کمرے میں ایک بہت سرخ و سفید بوڑھے آدمی کے سامنے ہمیں بٹھا کر وہ چلی گئیں۔

”تھک گئی ہوگی؟ میں چاہتا ہوں میرے ساتھ بیٹھ کے شربت پی لیتیں۔“ سرخ و

سفید آدمی امتے کی اپنی زبان مغولی میں بات کر رہا تھا۔

امتے نے بگڑے تیوروں سے کہا، ”میں آدھی رات کو شربت نہیں پیا کرتی۔“

بوڑھے آدمی نے میری طرف دیکھا، ”لڑکا شاید ایک پیالہ پی لے۔ پوچھ لو۔“
 امتے نے اسے جھڑک دیا، ”یہ لڑکا نہیں لڑکی ہے... دیکھ رہے ہو، پھر بھی۔“
 بوڑھا ہنسنے لگا۔ بولا، ”میں شاہی مخبروں کی طرح آدھا نابینا نہیں ہوں۔ دیکھ رہا ہوں یہ لڑکا ہے اور لڑکا خوب صورت ہے، ماشاء اللہ...“

امتے بگڑ کر کہنے لگی، ”میں نے آقا کا خط اُن...“ اور یہاں امتے نے دانت پیستے ہوئے ایک طرف کو اشارہ کیا۔ ”ان پری تمثال بی بیوں کے سپرد کر دیا تھا۔ خط میں سب کچھ درج ہے۔ میرا اور اپنا وقت خراب مت کرو، ہمیں رات میں کچھ دیر سونا بھی ہوتا ہے۔“
 بوڑھا پھر ہنسا۔ دھیرے سے بولا، ”پرانی خادمائیں... یا تم خادمہ نہیں تغہ مغل کی زر خرید ہو؟... تو پرانی خواصیں مالکوں کی منہ چڑھی ہوتی ہیں۔ کڑوی زبان سے بات کرنے لگتی ہیں۔ اسی لیے میں احتیاط کرتا ہوں، پرانی عورتیں نہیں رکھتا۔ خیر... مجھے خط پڑھنے کا وقت ملے گا، پڑھ لوں گا... ویسے ضرورت نہیں ہے۔ جانتا ہوں تغہ مغل کو کچھ دنوں سے شاہی مخبروں نے گھیرنا شروع کیا ہے۔ وہ چاہتا ہے میں اس لڑکی... ہا ہا ہا... اب تو خوش ہے عورت؟ وہ چاہتا ہے اس لڑکی کو میں اپنے گھر مہمان رکھ لوں۔ تو ٹھیک ہے... تم جاؤ۔ یہ رستہ تمہارے کمرے کو جاتا ہے... میں کچھ دیر اس سے باتیں کروں گا۔“

امتے اپنی کرسی چھوڑ میرے پیچھے آکھڑی ہوئی۔ ”بڑے میاں! میں اسے اپنے ساتھ لائی ہوں، ساتھ رکھوں گی اور ساتھ لے کر جاؤں گی... اس سے جو باتیں ہوں گی میرے سامنے ہوں گی... سمجھے؟“

”سمجھا۔“ بوڑھے نے پہلی بار پلکیں جھپکی تھیں۔ مجھے یوں لگا تھا جیسے اس نے پلک نہ ماری ہو بلکہ اس کی پتلیوں پر سفیدی جھلی آکر ہٹ گئی ہو، جیسے وہ آدمی کی نہیں سانپ کی آنکھیں ہوں۔

یا شاید یہ میرا وہم ہوگا۔

بوڑھے نے اب کے ذرا نرمی سے کہا، ”سمجھا... تو لے جاؤ اسے اپنے ساتھ... اس طرف دائیں ہاتھ پر پہلا کمرہ ہے اور ہاں... کیا تمہیں کچھ لیے بغیر ہی نیند آ جاتی ہے؟ تھوڑا سا کچھ... کوئی نیچنی؟ شربت؟ کچھ بھی؟ اچھا اچھا... ضرورت ہو تو قریب کوئی پری تمثال بی بی سورہی ہوگی... جگا لینا۔“

وہ اٹھ کھڑا ہوا اور کرسی چھوڑ کرے کے ایک تاریک گوشے کی طرف بڑھ گیا۔ مگر اس کمرے میں تو لمحے بھر پہلے بہت تیز روشنی تھی۔ بڑے میاں کے اٹھتے ہی پہلے کمرے کے گوشے تاریک ہو گئے تھے، پھر آہستہ آہستہ یہ اندھیرا کمرے میں ہر طرف پھیلنے لگا تھا۔ صرف وہ رستہ روشن تھا جس پر ہمیں جانا تھا۔ میرا ہاتھ تھام کر میزبان کی بتائی ہوئی سمت میں بڑھتے ہوئے امتے کو ٹھوکر لگی۔ اس نے بہت غصے سے کہا، ”تف ہے!“

کمرے کے تاریک گوشے سے بوڑھے کی ہنسی کی آواز آئی، ”اب اتنی بوڑھی بھی نہیں ہو، دیکھ کر چلو۔“

منہ ہی منہ میں بڑبڑاتی ہوئی، میرا ہاتھ تھامے امتے اس کمرے میں داخل ہو گئی جو میزبان نے بتایا تھا۔ کمرے میں جانے سے پہلے میں نے مڑ کے دیکھا۔ ہمارے پیچھے بالکل اندھیرا ہو چکا تھا۔ روشنی کا یہ عجیب انتظام تھا۔

اندر دو بستر تیار تھے۔ قالین پر جا بہ جا گدے تکیے پڑے تھے۔ امتے نے جائزہ لیا۔ ایک بستر پر مجھے لیٹنے کو کہا اور میرے قریب ہی قالین پر گدے اور تکیے رکھ کر خود دراز ہو گئی۔ اسے مجھ سے کچھ دور بستر پر جانا گوارا نہیں تھا۔ میں نے لیٹتے ہوئے امتے کی طرف ایک فقرہ پھینکا، کہا، ”خوش مزاج آدمی ہیں... یہ بڑے میاں۔“

امتے غرا کے بولی، ”یہ فروتوت بھیڑیے جتنا خوش مزاج ہے... میں ابھی تک سمجھ نہ پائی کہ آقا مغل نے اس منحوس کے پاس ہمیں کیوں بھیج دیا۔ یہ تو جراح سے بھی زیادہ عیار ہے... وہ سپنولیا تھا، یہ افعی ہے۔“

میں نے سوچ لیا کہ اس وقت امتے کو سونے نہیں دینا ہے، اس نے خلجی سلطان اور آقا تغہ مغل کی جو بات مجھ سے چھپالی تھی آج اسے اگلوانے کا اچھا موقع ہے۔

میں نے کہا، ”یہ سفید بوڑھا بھی شاہی مخبروں کو اچھا نہیں سمجھتا... انھیں آدھا نابینا کہہ رہا تھا۔“

”بکواس کرتا ہے!“ امتے نے جماہی لی اور گدوں پر خود کو آسودہ کیا۔ میں نے سوچا، اگر میں نے فوری نہ روکا تو لمحے بھر میں امتے خراٹے لینے لگے گی۔

میں نے کہا، ”یہ بوڑھا بھی شاید مغل ہے۔ مغل لوگ سلطان خلجی کو اچھا نہیں سمجھتے۔“ مگر اب جو کہا وہ ضائع ہوا تھا۔ امتے نے پھر جماہی لی تھی۔ وہ شاید نیند میں بولی

تھی، ”ارے تو کیا جانے مغلوں کو...“

میرے ذہن میں اچانک گڑھ مندو کے راستے میں ملنے والے تین شاہی سواروں کی تصویر بنی، میں نے بڑی بی سے جیسے جت کرتے ہوئے کہا، ”واہ! میں کیوں نہیں جانتا؟ میرا بابا خلجی لشکر کے سواروں میں تھا۔ بہت سے مغل مارے ہیں اس نے۔“

”کیا؟“ کوڑے کی طرح امتے کی آواز چٹنی۔ اس نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ وہ اب تکیوں کے سہارے اٹھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ غصے سے بولی، ”کیوں رے، تو نے یہ کبھی نہیں بتایا؟ کیوں؟“

”کیا نہیں بتایا؟ مغل مارنے کا؟“ میں نے بستر پر اٹھتے ہوئے معصومیت سے پوچھا۔

امتے کی آنکھیں غصے سے سلگ رہی تھیں۔ کہنے لگی، ”برا دھو بچوں نے کیا مغل مارے ہوں گے... ادھر کم ہی تو میں مغلوں سے لوہا لینے لائق ہوں گی... جھوٹ بولتا تھا تیرا بابا۔“

میرا کام ہو گیا تھا۔ امتے پوری طرح بیدار ہو چکی تھی۔ میں نے مسمی آواز میں کہا، ”ہاں سچ کہتی ہو، جھوٹ ہی بولتا ہوگا... جو بابا اپنے بچوں کو اس طرح چھوڑ کے بھاگ جائے وہ بھلا کیا...“

امتے اٹھی، اس نے صراحی سے پانی پیا۔ گدے تکیے چھوڑ کر بستر پر آ بیٹھی۔ میں نے اس کے شانے اور بازو دبانا شروع کیے۔ امتے ایک دم جیسے باتوں سے بھر گئی تھی۔

کہنے لگی، ”خلجی علاء الدین کے دیکھتے دیکھتے پانچ حملے کیے ہیں مغلوں نے ہند پر... پہلا حملہ منجھور پر ہوا تو خلجی نے اپنے بھائی الغ خان اور ادھر دیپال پور کے امیر اس غازی کو بھیجا۔ جنگ ہوئی تو ادھر لشکر زیادہ تھا، مغل موقع پا کر نکل گئے۔ دوسری بار شاہ ترکستان، قتلغ خواجہ خود آیا... دو لاکھ کا لشکر لے کر۔ سندھ دریا عبور کر کے سمجھو دئی تک پہنچ گیا۔ رستے کے قصبوں، دیہاتوں پر حملہ نہیں کیا۔ خواجہ نے کہا اب یہ میری ملکیت ہے، اپنی چیز کیوں تباہ کروں... کیلی کے میدان میں علاء الدین تین لاکھ کی نفری لے کے اترا۔ اس کا بھائی الغ خان اور ملک ہربز الدین ظفر خان بڑھے جنگ ہوئی۔ تجھے خبر ہے یہ الغ خان بڑا حاسد ہے۔ ظفر خان مغلوں کا پیچھا کرتا دور نکل گیا۔ یہ اس کی مدد کو نہیں پہنچا، حالاں کہ طے کر کے چلے تھے۔ ظفر خان کا جنگی گھوڑا مارا گیا۔ وہ زمین پر کھڑا تیر برساتا رہا۔ ترکستان کے تاجدار نے کہا، ”سردار! اپنے تیروں کو ترکش میں رہنے دے۔ تو بے شک دلیر ہے۔ حاسدوں کی صفوں

سے نکل آ۔ میرے پاس آجا۔ اس سے بڑا عہدہ دوں گا... ظفر خان کی قضا آگئی تھی۔ نہیں مانا۔ وہ مارا گیا مگر دلی لشکر فتح یاب ہوا۔ خواجہ ترکستان لوٹ گیا۔ تیسرا حملہ ترغی کا ہوا...”

میں جانتا تھا مغلوں کا یہ تیسرا حملہ بھی پسپا ہونے والا ہے، مگر امتے کی ہمت بڑھانے کو میں نے آہستہ سے پوچھا، ”یہ ترغی کون تھا؟“

امتے نے تلوار بازوں کی طرح ہاتھ لہرا کر کہا، ”ترغی ترکستان، ماوراء النہر کے دلاوروں میں سے تھا۔ ایک لاکھ بیس ہزار مغل دلیر ناداروں کا جزا لشکر لے کر آیا تھا۔ یہ دامن کوہ کو فتح کرتا ہوا برن تک پہنچ گیا۔ وہاں کا حاکم قلعہ بند ہو کے بیٹھ گیا تو سلطان خلجی نے اسی غازی امیر کو لشکر دے کے بھیجا۔ حاکم برن اور غازی دونوں کی جمعیت نے مل کر ترغی کے لشکر پر شب خون مارا۔ ترغی بہادری سے لڑتا ہوا گرفتار ہو گیا۔“

میں نے دھیرے سے پوچھا، ”بھاگا نہیں؟“

امتے بولی، ”کیا بک رہا ہے؟“ میں چپ رہا۔ وہ اپنے زورِ بیان میں رکی نہیں۔ کہنے لگی، ”ترغی کو گرفتار کر کے غازی دلی لے آیا۔ رستے میں اس سے اچھا سلوک کیا۔ کہتا تھا ترغی نے تلوار زمین پر نہیں گرائی۔ لڑتے ہوئے اسیر ہوا ہے۔ مغلوں کا چوتھا حملہ خراسان کے شہزادگان علی بیگ اور محمد ترق کا تھا۔ انھوں نے دو طرف سے حملہ کیا۔ کوہ سرمور کے دامن میں دریائے بیاس تک پہنچے اور دوسری طرف ناگور تک۔ خلجی سلطان نے اپنے غلام ملک کافور کو اور دیپال پور کے حاکم اس غازی امیر کو امروہہ طلب کیا۔ جب تک یہ وہاں پہنچے خبر ملی کہ مغل لشکر مالِ غنیمت سے لدا پھندا دریائے رہب کے کنارے کنارے بڑھا چلا آ رہا ہے۔ ملک کافور بڑھا، جنگ ہوئی۔ غازی بھی پہنچا۔ بہت بڑی تعداد میں مغل مارے گئے۔ باقی واپس ہو گئے۔“

امتے نے پانچ حملوں کا کہا تھا۔ میں نے پوچھا، ”اور پانچواں حملہ؟“

تو بولی، ”اقبال مند اور کیک مغل اپنے خراسانی شاہزادوں کا انتقام لینے آئے تھے۔ یہ پانچواں حملہ تھا۔ ملتان کے قریب جنگ ہوئی تھی۔ پھر وہی امیر جسے اب سارے ہند میں غازی کہا جانے لگا ہے، اس معرکے کے لیے منتخب ہوا۔ ملک کافور نے اور اس غازی نے حملہ کر کے کیک مغل کو زندہ گرفتار کیا اور مالِ غنیمت واپس لے لیا۔“

میں نے کہا، ”امتے، یہ مغل لشکروں کی بہادری کیسے ہوئی؟ مجھے تو لگتا ہے تو نے خلجی

لشکروں کی بہادری اور غازی امیر کی دلاوری کا قصہ سنایا ہے۔ وہی ہر جگہ فتح مند آیا۔ مغل سب کہاں گئے؟“

”مغل یہاں ہیں۔ یہ ہیں۔ میں ہوں مغل، میرا آقا ہے مغل... لڑ کے! آخر کار ہم فتح یاب ہوں گے۔“

بوڑھی عورت کا چہرہ جوشِ خطابت سے انگارے کی طرح دکھتا تھا۔ میں نے اس کے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔ آہستہ سے پوچھا، ”کس پر فتح یاب ہوں گے؟ میری ماں! اس وقت کون جنگ کر رہا ہے مغلوں سے؟“

کہنے لگی، ”خلجی علاء الدین اور اس کے بھائی بند... وہ جنگ کر رہے ہیں ہم سے۔ امیر الماس بیگ الغ خان اور ملک نصرت... ہم سے یہ دونوں جنگ کر رہے ہیں... یہاں... ہند میں۔“

امتے عجیب بات کہتی تھی۔ میں نے اسی طرح دھیرے سے کہا، ”مغل تو یہاں سلطان کی رعایا ہیں۔ خلجی لشکر میں شامل ہیں۔ تو ہی تو کہہ رہی تھی مسلمان ہو گئے ہیں بہت سے۔“

امتے بولی، ”ہاں نو مسلم کہلاتے ہیں۔“

”اچھا... تو؟“

امتے کا چہرہ کسی اندرونی صدمے نے جیسے پگھلا دیا تھا۔ اس کی آنکھیں پیازی ہو چلی تھیں، ڈبڈبا آئی تھیں۔ میں نے رومال اٹھا کر اس کے آنسو پونچھے۔ بچے کی طرح تھکی دے کر اسے پرسکون کونا چاہا۔ امتے، بوڑھی عورت، سر جھکا کے رونے لگی۔

یہ کیا کر دیا؟ اس محبت بھری عورت کو میں دکھ دینا نہیں چاہتا تھا۔

آخر وہ کچھ پرسکون ہوئی۔ اس نے میرے رخسار تھپکے، آنسو پونچھے۔ بہت ہلکی آواز میں بولی، ”خلجی علاء الدین مغلوں کا، ان نو مسلموں کا شاید بیج ختم کر دینا چاہتا تھا۔ کیوں کہ انھوں نے اس کے خلاف سازش کی تھی۔ مغل لشکریوں میں سے کچھ نے سوچا تھا کہ شکار گاہ میں جب علاء الدین شکار اڑاتا ہوگا اور سب شکرے کو دیکھنے میں لگے ہوں گے اس وقت سوار ہو کر اس پر ٹوٹ پڑیں گے۔ اس کے قریبی لوگوں کو بھی قتل کر دیں گے۔ جاسوسوں نے سلطان کے کان تک یہ خبر پہنچا دی۔ اس پر سلطان نے تمام جاگیرداروں کو خفیہ فرمان بھیجا اور ایک وقت مقرر کر دیا کہ تمام شہروں میں بسنے والے سب مغلوں کو ایک ہی دن، ایک ہی

وقت اور ایک ساتھ تیرتے کر دو... حرف بہ حرف تعمیل ہوئی۔ مملکت ہند میں مغولی بولنے والے باقی نہ رہے... وائے افسوس... ہائے ہزار افسوس!“

اس نوعمری میں بھی میں نے امتے کے دل ہلا دینے والے غم کو اپنی جان پر محسوس کیا۔ میں شاید پھر آب دیدہ ہو گیا تھا۔

”گنتی کے گناہ گاروں کی سزا سب قوم والوں کو کیوں دی؟“

امتے نے آہستہ سے سر ہلایا، ”ہاں سب کو کیوں دی؟ مگر خلیجیوں نے ایسا ایک بار سے زیادہ کیا... علاء الدین کے بھائی الماس بیگ الغ خان نے گجرات اور راجستھان کے حملوں میں ہاتھ آنے والے مال کی تقسیم پر ناراض ہو کر کیا کیا تھا؟ تجھے خبر ہے؟“

میں امتے کی صورت دیکھتا رہ گیا۔

اس نے صراحی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میں نے اٹھ کر پانی پلایا۔ دم لے کے بولی، ”غنیمت کا پانچواں حصہ لے لیا تھا مغل لشکریوں نے۔ واپس نہیں کرتے تھے۔ نہ قبولتے تھے۔ الغ خاں انھیں لٹکا کے دھونی دیتا، نمکین پانی پلاتا تھا۔ تنگ آ کے مغل محمد شہ، کسری تمغان، شادی بغد نے، سب سرغنوں نے، الغ خان اور ملک نصرت کو مار ڈالنے کا ارادہ کیا... یہ دونوں تو بچ گئے۔ الغ خان کا ایک بھائی اور علاء الدین کا بھانجا مارا گیا۔ بغاوت ناکام ہوئی۔ باغی فرار ہو گئے۔ بعد میں علاء الدین نے انھیں گرفتار کیا اور سزا دینے کے لیے ملک نصرت کے حوالے کر دیا اور ملک نصرت نے...“

امتے بستر سے اتر کر قالین پر آ بیٹھی تھی۔ اس نے ڈبڈبائی آنکھوں سے میری طرف دیکھا اور فرش پر اور اپنی چھاتی پر دو ہنڑ مار کر بین کرتے ہوئے بولی، ”ملک نصرت نے قاتلوں سے یوں بدلہ لیا کہ ان کے بچوں، عورتوں کو خاک و روہوں کے سپرد کر کے حکم دیا... کہ دودھ پیتے بچوں کو ان کی ماؤں اور بہنوں کے سروں پر اس طرح مارا جائے کہ بچے ختم ہو جائیں... اور اس حکم پر عمل ہوا۔ بچے دھنکی ہوئی روئی کی طرح چیتھڑے چیتھڑے... پھر ان بدنصیب عورتوں کو رسوا اور ذلیل کر کے بے دینوں کے سپرد کر دیا... ہائے زمانے... ملامت ہو زمانے... تجھ پہ ملامت... واویلا ہو زمانے، واویلا ہو واویلا۔“ وہ ہچکیاں لے لے کر رو رہی تھی۔

میں امتے کے ساتھ ہی فرش پر بیٹھا روتا رہا۔ پوچھ بھی نہ سکا کہ کیا امتے ان بدنصیب عورتوں میں سے کسی کو جانتی ہے؟ کیا ان میں کی کوئی عورت، کوئی مغلانی ابھی زندہ

ہے؟ مگر اس لڑکپن اور کم شعوری میں بھی میں یہ پوچھنے کی ہمت نہ کر سکا۔ خدا جانے امتے میرے اس چھوٹے سے سوال کا کیسا بھیانک جواب دیتی...

وقت گزر گیا۔ میں یہ نہ پوچھ سکا۔ اب سوچتا ہوں کہ بلک بلک کے روتی ہوئی اس بوڑھی عورت نے شاید بنا پوچھے میرے سوال کا جواب دے دیا تھا۔

پتا نہیں ایک ساعت، کہ اس سے زیادہ ہم فرش پر بیٹھے رہے۔ نہ معلوم کب میری آنکھ لگ گئی۔ حفاظت کے اس دو طرفہ احساس کے ساتھ کہ میں اکیلا نہیں، امتے میرے پاس ہے... اور وہ اکیلی نہیں، میں اس کے پاس ہوں، میں سوتا رہا۔

شاید ڈھلتی دوپہر کا وقت تھا جو کسی آہٹ سے میری آنکھ کھل گئی۔ میں کمرے میں اکیلا تھا۔ ایک پری پیکر بی بی تپائی لگا کر اس پر کھانے کا خوان رکھتی تھی۔ میں نے دروازے سے نظر آتے برآمدے کی طرف آواز لگائی، ”امتے! امتے، کہاں ہے تو؟“

بی بی تپائی پر ناشتے کا سامان لگاتی رہی۔ میں نے آواز لگائی، ”امتے! امتے مغل!“ پھر میں نے اس قیمتی لباس والی عورت سے پوچھا، ”میرے ساتھ ایک بڑی بی تھی؟“ اس نے مصروفیت اور بے تعلقی سے بس ایک لفظ کہا، ”گئی۔“

”گئی؟ کیا مطلب؟“ میں اٹھ کر برآمدے میں نکل آیا، ”امتے!“

مصروف عورت میرے برابر سے نکل گئی۔ وہ ناشتا لگا چکی تھی۔ اس کا کام ختم ہو گیا تھا۔ کسی بات کا جواب دینے کی پابند نہیں تھی وہ۔ میں برآمدے میں ایک طرف پکارتا ہوا بھاگتا گیا۔ آگے چھت تک پہنچا ہوا لوہے کا ایک جنگلا تھا جس کے پار جنگل کی طرح کا ایک بے ترتیب باغ دور تک چلا گیا تھا۔ دور تک کوئی نظر نہیں آتا تھا۔ برآمدے میں، کمرے میں، کہیں کوئی نہیں تھا۔

خوب صورت عورت جس طرف گئی تھی ادھر اب ایک دروازہ تھا جو بند تھا۔

میں نے بستر کے نیچے اور گدوں کے ڈھیر کو الٹ پلٹ کر دیکھا۔ شاید کوئی خط، کوئی پیغام امتے میرے لیے چھوڑ گئی ہو۔

قالین پر جہاں امتے لیٹی ہوگی، کتھے کا سا سوکھا نشان پڑا تھا۔

خون! مجھے بے تابی اور خوف نے دیوانہ کر دیا۔ کیا انھوں نے امتے کو مار ڈالا؟ مجھے وہیں کہیں سے گلابی مروارید کے دو دانے بھی پڑے ملے۔ امتے کے گلے میں گلابی مروارید کا

یہ ہار پڑا رہتا تھا۔ کسی غیر معمولی بات سے ہار ٹوٹا، دانے بکھر گئے۔ انھوں نے ایک ایک دانہ چن لیا۔ یہ دو دانے چھوڑ دیے، یا شاید یہ رہ گئے... غلطی سے۔

وہ امتے کو بہ زور لے گئے یا انھوں نے اسے قتل کر دیا... اور میں یہاں پڑا سوتا رہا۔
تف ہے!

دو شب و روز انھوں نے میری خبر نہ لی۔ کوئی نہیں آیا۔ وہ بی بی تپائی پر اتنا پانی، خوراک چھوڑ گئی تھی کہ میں بھوک پیاس سے نڈھال نہ ہو جاؤں... مرنے جاؤں۔

میں پابندی سے غذا اور پانی لیتا رہا۔ کمرے، برآمدے میں ورزش کرتا، ہاتھ پاؤں سے چوکس ان کا انتظار کرتا رہا۔ تیرہ چودہ سال کا تھا تو کیا ہوا، اپنے سے دُگنے کوزیر کر سکتا تھا۔ میں نے شیشے کی صراحی اور تپائی کے ایک پائے سے اپنی ضرورت کا ایک بھالا تیار کر لیا تھا۔ کوئی بھی آئے... عورت، مرد یا خود وہ سفید فام بوڑھا... میرے پاس اچانک حملہ کر کے پیٹ چاک کرنے کی ایک حکمت تیار تھی۔

دو شب و روز بعد دن کے وقت وہ آئے۔ میں نے تپائی کو کپڑے سے ڈھک دیا تھا اور دہلیز پر اس طرح بنا پڑا تھا کہ وہ سمجھیں بھوک اور پیاس سے جاں بہ لب ہوں۔ بچکانہ سی بات تھی۔ انھیں معلوم تھا کہ کھانے پینے کو موجود ہے، مگر وہ آئے تو نہ معلوم کیوں دھوکا کھا گئے۔ وہ تین تھے۔ دروازے کا تالا پر شور انداز میں کھول کر بھاری جوتوں سے برآمدے کے فرش پر آوازیں کرتے وہ آئے۔ ان کا کوئی نا تجربہ کار ساتھی مجھے اس طرح پڑا دیکھ کر، ”ارے!“ کہتا ہوا بڑھا۔ دوسرے دو، ”ہاں! ہاں!“ کہہ کر اسے روکتے ہی رہے، پر وہ میری زد پر آچکا تھا۔

”ہا آ!“ کی چیخ کے ساتھ میں نے اپنا تیار کیا شیشے لکڑی کا بھالا اس زد پر آئے جسم

پر مارا۔

تکلیف کی چیخ مارتا میرا شکار الٹ گیا۔ میں نے اس کی آواز کے سوا بھی دوسری آوازیں سنی تھیں۔ کپڑا چیر کر زندہ گوشت میں اترنے کی ”کھچ“ آواز۔

مگر اس کے ساتھ ہی اس کے دونوں تجربے کار ساتھیوں نے بہ یک وقت اپنی کپڑا لپٹی لٹھیوں سے میرے سر کے پچھلے حصے پر وار کیا۔ میں دہلیز پر جھکتا چلا گیا۔

نہ معلوم کتنی دیر بعد ہوش آیا تو میں نے خود کو برآمدے کے فرش پر پڑا پایا۔ میرے

ہاتھ ریشمی ڈوری سے بندھے تھے۔ پیروں پر اپنی لاٹھیاں ٹکائے وہ دونوں مجھے بیدار ہوتے دیکھ رہے تھے۔ ان کا ساتھی، جسے میں نے زخمی کیا تھا، موجود نہیں تھا۔

وہ دونوں عمر میں مجھ سے تین چار برس بڑے ہوں گے۔ مجھے بیدار دیکھ کر ان میں سے ذمے دار نظر آتے لڑکے نے کہا، ”اپنے لیے مشکل کیوں پیدا کرتے ہو؟ تم نے اسے بہت زخمی کر دیا ہے۔ چار چھ روز بستر پر رہے گا۔“

”امتے کہاں ہے؟ میری ماں ساتھ آئی تھی، وہ کہاں ہے؟“

وہی لڑکا بولا، ”وہ تمھاری ماں نہیں تھی... اور وہ یہاں سے چلی گئی۔ ٹھیک ہوگی۔“

”یہ کیا جگہ ہے؟ یہاں کیوں لائے ہیں مجھے؟“

لڑکا کہنے لگا، ”کوئی لایا نہیں ہے تمھیں۔ تم خود آئے ہو، بھیجے گئے ہو۔ تمھارے آقا نے رقم خرچ کرنا منظور کیا ہے، اس لیے تم یہاں ہو۔“

دوسرا اب تک چپ بیٹھا تھا۔ کہنے لگا، ”خوش نصیبوں کو ہی موقع ملتا ہے یہاں آنے کا۔ شکر کرو اور سب تماشا بند کرو۔“

میں نے الجھ کر پوچھا، ”مگر یہ کیا جگہ ہے؟“

اس سے پہلے کہ چھوٹا والا بول پڑتا، زیادہ تجربے کا لڑکے نے کہا، ”جاننا چاہتے ہو تو الجھن پیدا نہ کرو۔ آرام سے سب کچھ ہونے دو، اور دیکھتے رہو۔“

میں نے اشارہ کیا کہ میرے ہاتھ کھول دو تو چھوٹے نے ہاتھ کھولنا شروع کیے۔ بڑا اپنی لاٹھی تو لے میرے سر پر کھڑا رہا۔

سر میرا پھوڑے کی طرح درد کرتا تھا۔ اٹھ کے کھڑا ہوا تو چکرا گیا۔ چھوٹے نے سہارا دیا۔ میں کمرے کی طرف بڑھنے لگا تو اس نے بانہہ پکڑ کر مجھے دروازے کی طرف گھما دیا۔ وہ مجھے سفید فام بوڑھے کی پیشی میں لے گئے۔ مجھے سامنے کرسی پر بٹھا کر دائیں بائیں اپنی لاٹھیاں تو لے کھڑے رہے۔

بوڑھا اپنی روشن ہنستی ہوئی آنکھوں کے ساتھ کچھ دیر مجھے دل چسپی سے دیکھتا رہا۔ پھر اس نے کھنکھار کر گلا صاف کیا۔ بولا، ”ذہین اور چالاک ہو۔ صحت اچھی ہے۔ کشتی اور ہتھیاروں کا استعمال جانتے ہو... کچھ ہم سکھا دیں گے۔ مگر آئندہ ایک بات کا خیال رکھنا، میرے کسی لڑکے کو نقصان مت پہنچانا... پہلا قصور معاف کرتا ہوں۔ دوسری بار ایسا کرو گے تو

مع سود کے وصول کرلوں گا۔ سود سمجھتے ہو؟“

میں نے بوڑھے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھا، ”امتے مغل... میری ماں کہاں ہے؟“

وہ بولا، ”شاگردوں کو چھوڑنے جو بھی لوگ آتے ہیں، یا تو اسی وقت یا رات گزار کر چلے جاتے ہیں۔ وہ عورت سویرے چلی گئی تھی۔ اس وقت نہیں معلوم کہاں ہے۔“

”تم جھوٹ بولتے ہو۔“

سفید فام نے سیدھے ہاتھ کی انگلی اٹھائی اور اس طرف کھڑے لڑکے نے میرے شانے پر اپنی لٹھی سے وار کیا۔ میں ہل کر رہ گیا۔

میں نے فارسی زبان کا ایک لفظ کہا جس سے بوڑھے کی توہین مقصود تھی۔

سفید فام نے اس بار بائیں ہاتھ کی انگلی اٹھائی اور اس رخ پر کھڑے لڑکے نے دوسرے شانے پر لٹھی کا زبردست وار کیا۔ میں تکلیف سے چیخا۔

بوڑھے نے بہت نرم لہجے میں کہا، ”اگر اب اپنی زبان کو بے قابو ہونے دیا تو میں اشارہ کروں گا اور یہ دونوں تمہیں اس وقت تک لٹھیاں مارتے رہیں گے جب تک تم بے ہوش ہو کر گر نہ جاؤ۔“

میں خاموش رہا۔ بوڑھے نے اثبات میں سر ہلایا۔ کہنے لگا، ”یہ بہتر ہے۔ کچھ بولنے سے زیادہ کچھ سننے اور سیکھنے کی ضرورت ہے۔ تمہارے آقا نے تم پر بڑی رقم خرچ کی ہے... اور... شاید، بلکہ یقیناً، وہ رقم جو ہم نے تمہاری تربیت کے لیے وصول کی ہے تمہاری قیمت سے کہیں زیادہ ہے۔ احسان فراموشی نہ کرو۔ یہاں سے کچھ بن کے نکلو گے۔ آقا کو تو صرف منافع ملے گا۔ تمہاری زندگی سنور جائے گی۔“

میں نے شانوں اور سر کی تکلیف کے باوجود خود کو سنبھال کر، ایک ایک لفظ رک رک کر ادا کیا۔ پوچھا، ”یہاں تم کس بات کی تربیت دو گے؟“

”ہم شاہی خبر رساں کی تربیت دیں گے۔ اب یہ تمہاری لیاقت ہے کہ اس کو سیڑھی بنا کر اوپر چڑھتے جاؤ... یہ سمجھو، سلطان کے سیدھے ہاتھ پر کچھی مسندوں تک تمہاری رسائی ہوگی۔ نائب السلطنت کے عہدے تک جاسکتے ہو... ملک کا فور کا نام سنا ہے؟“

میں نے ہاں میں سر ہلایا۔

”وہ اس وقت ملک نائب ہے۔ نائب السلطنت۔ یہاں آیا تھا تو کافور ہزار دیناری کے نام سے جانا جاتا تھا۔ وہ جو کچھ ہے، جہاں بیٹھا ہے، اس تربیت کی وجہ سے ہے جو اس نے یہاں حاصل کی۔“

میں نے بے اعتباری میں سر کو ایک بار ہلکی گردش دی۔

بوڑھا ہنسنے لگا، ”ابھی سمجھ میں نہیں آیا۔ جاؤ آرام کرو۔ شام سے مصروف ہو جاؤ گے۔“ میرے دائیں بائیں موجود عذاب کے فرشتوں نے مجھے اٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ مجھے واپس کمرے میں لے آئے۔ کمرے میں آیا تو میں بستر پر بے سدھ لیٹ گیا۔

تغہ مغل نے مجھے یہاں مخبری کا کام سیکھنے بھیجا ہے؟ شاہی مخبر؟ مگر کیوں؟ امتے تو اس جراح منخوس کو ہی شاہی مخبر کہتی تھی! کیا اسے معلوم ہے کہ آقا مغل خود شاہی کارندہ ہے، ورنہ وہ مجھے کیوں بھیجتا؟ وہ تو کہتی تھی میں اس کی بیٹی سے مشابہ ہوں۔ سب نے اس سے بھی جھوٹ بولا ہوگا۔ امتے اس وقت کہاں ہوگی؟ ان کم ظرفوں نے کہیں اسے زخمی نہ کر دیا ہو! مگر میں نو عمری میں ہی زندہ رہنے کا ہنر سیکھ چکا تھا۔

میں نے کمرے میں آرام کرنے سے پہلے ایک گوشے میں بیٹھ کر خود سے عہد کیا کہ میں ان کی سکھائی ہوئی ہر چیز اچھی طرح سیکھوں گا... اور ان کے بھروسے کا شاگرد بنوں گا اور میں کسی جابر سلطان کا، کسی خلجی کا کارندہ نہیں بنوں گا اور مجھے قسم ہے کہ جیسے ہی موقع ملے گا اس شیطانی پنجرے سے میں نکل بھاگوں گا... امتے کو تلاش کروں گا۔

شام کو مجھے نہلا کر سب شاگردوں جیسا لباس پہنایا گیا۔ مجھے عمارت کے زنانہ حصے میں لے جایا گیا جسے یہاں ’حرم سرا‘ کہا جاتا تھا۔ انھوں نے بتایا اور مجھے حیران کر دیا کہ یہاں صرف چار عورتیں ہیں جو خادماؤں کے فرائض ادا کرتی ہیں۔ وہ چاروں بوڑھی ہیں۔ میں نے اب تک جتنی ”پری جمال بی بیاں“ دیکھی ہیں وہ سب لڑکے ہیں، شاگرد ہیں۔ تربیت کا ایک بڑا حصہ یہ ہے کہ وقتِ ضرورت جب چاہے شاگرد مرد یا عورت بن سکتا ہے۔ آواز، چال ڈھال، تیور، ادائیں سب مردانہ، زنانہ اختیار کرنا ہوتی ہیں۔

سفید فام نے، جو کسی ملک فراں سیس کا رہنے والا تھا، بتایا کہ امتے کی تیز نظروں سے یہ بات پوشیدہ نہ رہ سکی کہ رات میں پیشوائی کو آنے والے سب لڑکے تھے۔ اسی لیے وہ طنز کرتی تھی کہ اس نے آقا کا خط پری پیکر ”بی بیوں“ کو دے دیا ہے۔ سفید فام بوڑھے نے

کہا کہ ان سب لڑکوں کو جنھیں پہچان لیا گیا تھا کوتاہی کی سزا دی گئی ہے۔ ان کی تربیت کی مدت ایک مہینے بڑھادی گئی۔

ہمیں سیکھنا تھا سلطنتِ ہند اور ہمسایہ سلطنتوں، راج گدیوں کی تواریخ، تمام بڑی بڑی زبانیں، تاج داروں کے اوصاف، کم زوریاں، لیاقتیں، تخت کے ممکنہ دعوے داروں کے نام، ان کی کم زوریاں، لیاقتیں۔ یہ سب اور اس سے آگے کی باتیں۔

یہ پہلے دو برسوں میں سیکھ لینا ہوگا۔ تیسرا برس تربیت کا سخت ترین سال ہوگا۔ کسی واقعے کی تفصیلی خبر لکھ کر اسے حافظے میں محفوظ رکھنا۔ بدن کی اذیتیں برداشت کرنے کی غیر معمولی لیاقت حاصل کرنا۔ کامیابی سے بھوک پیاس اور موسموں کی سختیاں جھیلنے والے شاگردوں کو آسائش اور مرغن غذائیں اور نشہ لانے والے مشروب دے کر دوسری حد پر امتحان لیا جاتا تھا کہ جو سختی سے ٹوٹ نہ پائے کہیں وہ آسائش اور از خود رفتگی سے قابو میں نہ آجائیں۔ شمشیر زنی، تیراگنی، شہسواری، پیراکی، یہ تو اول دن سے جاری تھیں۔ سب طرح کے قاتل زہر اور ان کے تریاق تیار کرنا چوتھے برس سکھایا گیا۔ لائق شاگردوں کے لیے یہ تربیت کا آخری سال سمجھا جاتا تھا۔

کم رفتار، کند ذہن شاگرد کو چھوٹا موٹا مخبر بنا کر فارغ کر دیا جاتا تھا۔ اس کے آقا کی رقم کا ایک حصہ اس کے ساتھ لوٹا دیا جاتا تھا اور یہ بات شرمندگی کی ہوتی تھی۔
خفت کی دوسری بات یہ تھی کہ تربیت کے تین برس پورے ہونے سے پہلے شاگرد کے ڈاڑھی مونچھ آنے لگے۔ ایسے شاگرد کے آقا اور والی اضافی رقم دے کر اسے مناسب کار گزاریاں سکھواتے تھے۔

مجھے یہ سب باتیں سیکھنے میں دقت نہ ہوئی۔

اور اب سفید فام استاد کی تربیت گاہ میں یہ میرا آخری سال تھا۔ میرا عہدہ معتبر شاگرد کا تھا۔ مجھے خادماؤں کے ساتھ بستی میں جا کر توشے خانے کا سامان لانا اور اسلحہ سازوں، صیقل گروں سے مل کر ہتھیاروں کی مرمت اور صیقل کا فن حاصل کرنا ہوتا تھا۔ معتبر شاگرد رات کے وقت عمارتوں کا پہرہ بھی دیتے تھے۔

پہرے کی میری اٹھارہویں رات تھی جب میں نے اس قفس سے نکل کر بھاگنے کی تیاری مکمل کر لی۔ میں پندرہویں، سولہویں، سترہویں راتوں میں اپنی ضرورت کا سامان پہلے ہی

مناسب جگہ پہنچا چکا تھا۔

یہ اماؤس کی ابر آلود رات تھی۔ عمارت کی مشرقی فصیل پر جو دیوار گیر روشن کیے گئے تھے ان میں جلنے والے روغن کو میں نے خالص نہیں رہنے دیا تھا۔ مجھے یقین تھا کہ رات کے آخری پہر میں وہ آپ ہی آپ بجھ جائیں گے۔ فصیل کے پاس اگی خوش بودار پتوں کی جھاڑی میں، میں نے ایک کمند چھپا دی تھی۔ وہیں نصب ایک آرائشی برتن کے کھوکھلے ڈھکن میں، میں نے حکمت سے ایک چابی پھنسا رکھی تھی۔ یہ خفیہ دروازے کی چابی تھی اور دوسری کوششوں میں ناکامی کی صورت میں اسے استعمال کیا جانا تھا۔ ایک اور چیز زیت نار تھا جسے گندھک کا تیل کہا جاتا ہے۔ وہ حوض کے رخنے میں دفن تھا۔ یہ طے تھا کہ اگر فرار کے سب طریقے ناکام ہو گئے تو میں عمارت کے مغربی سائبان کو آگ لگا دوں گا۔ پھر جو ہوگا دیکھا جائے گا۔

مگر سب ٹھیک لگتا تھا۔ دیوار گیر روشنیاں بھڑک کر بجھنے والی تھیں۔ میں نے مہکتی جھاڑی میں ہاتھ پہنچا کر کمند کھینچ لی۔ خوشی خوشی اسے پھیلا کر اپنا اطمینان کرنا چاہا۔ لعنت! کسی نے اسے کاٹ کر ناقابل استعمال بنا دیا تھا۔ میں آرائشی طاق کی طرف مڑا کہ اچانک اسی وقت تیز کا فوری روشنی سے باغ کا یہ حصہ جگمگا اٹھا۔

فرار کا پہلا، دوسرا، تیسرا منصوبہ ناکام ہو چکا تھا۔ سامنے برہنہ تلوار سنبھالے خاصے کے شاگردوں کے لباس میں ایک شخص کھڑا مسکرا رہا تھا۔

وہ بولا، ”رگھوبا ہے تیرا نام؟... تو گڑھ مندو کے برادھوؤں میں سے ہے؟“
یہ عجیب سوال تھا۔ میں اس کی صورت تنکے لگا۔ میں نے کہا، ”چہ خوب!“ اور کیا کہتا؟
اب کے اس نے سرگوشی میں کہا، ”اگر رگھوبا ہے تو پہچان... میں تیرا بھائی کسم چند ہوں... کسوما۔“

وہ کسم چند ہی تھا، میرا بڑا بھائی۔ جوان، تنومند، خوب صورت۔ مگر اس کے ہاتھ میں برہنہ شمشیر تھی اور وہ حملے کا پینترا بنائے کھڑا تھا... اور وہ پوچھ رہا تھا کیا میں رگھوبا برادھو ہوں؟
میں نے ہاں کے اشارے میں سر ہلایا۔ بہ مشکل کہا، ”ہاں رے بھیا کسو! میں رگھوبا ہوں... ہاں۔“

میں ایک قدم بڑھا۔ کسم چند نے بایاں ہاتھ بڑا کر میرا رخسار چھو لیا۔ بہت آہستہ سے بولا، ”کتنا بڑا ہو گیا ہے رے... اور کیسا خوب صورت بھی... اور سیارام کہاں ہے؟“

میں کسم بھیا کو ٹٹکی باندھے دیکھے جارہا تھا۔ میں نے اس کی آخری بات نہیں سنی تھی۔ اس نے پھر پوچھا، ”ہاں؟ بول نا؟ سیا کدھر ہے؟“

”ایں؟ سیارام؟... اسے اور مجھے ایک ساتھ پکڑ لیا تھا۔ خبر نہیں وہ لوگ اسے کہاں لے گئے۔ پھر نہیں دیکھا۔“

”اوہ!“

جگمگاتی ہوئی کافوری مشعل جس طرح اچانک روشن ہوگئی تھی ویسے ہی یک لخت بجھ گئی۔ اب جو اندھیرے میں وہ بولا تو کسم چند کی آواز بالکل بدلی ہوئی تھی۔ اس نے کہا، ”تم فرار ہو رہے تھے!“

میں بہت خوش ہو کر بولا، ”ہاں نا۔“ پھر میں نے پوچھا، ”کسو... بھیا، میری کمند تم نے کاٹی ہے؟“

کسم کے لہجے میں ٹھنڈک اور بے مروتی تھی۔ میری بات کا اس نے جواب نہیں دیا، بلکہ سوال کیا، ”تمہارے پاس کوئی ہتھیار ہے؟“

”ہاں... میرا اپنا خنجر ہے۔“

”خنجر میرے حوالے کر دوڑ کے!“ آواز کسم ہی کی تھی مگر جس طرح یہ حکم دیا گیا تھا اس طرح کوئی بھائی حکم نہیں دیتا۔

میں نے گھگھیا کے کہا، ”کسم مجھے یہاں سے نکلنا ہے۔ مینا قسم چار برس انتظار کیا ہے... جانے دے!“

سامنے کے اندھیرے سے کسم چند برادھو نے بلند آواز میں اور قطعی حکم دیا، ”ہتھیار حوالے کر دو!“ اس کے ہیولے نے ماہر تلوار بازوں کا اگلا پینترا بنایا تھا۔ اب اگر میں ہلا بھی تو کسم بھیا وار کر کے میرا دایاں شانہ کاٹ دے گا۔

میں نے اپنا خالی دایاں ہاتھ کھلا کر کے دکھاتے ہوئے بائیں سے کمر میں اڑسا ہوا خنجر نکالا اور چٹکی سے پکڑے پکڑے اسے بھی اچھی طرح دکھا کر اپنے اور کسم کے بیچ گھاس پر گرا دیا۔

”ہوں۔“ گھسم نے پسندیدگی کا ہنکارا بھرا۔

مگر اس نے اپنا تلوار والا ہاتھ جھکایا ہی تھا کہ بجلی کی سی تیزی سے میرا بایاں پیر اس

کے پہلو پر بغل کے پاس جا کر لگا۔ سواری کے جوتے کا نوکیلا پہنچا جنگلی بھینسے کے گھر کی طرح پڑا تھا۔ اگر کسم کا کشتی میں سدھایا ہوا بدن ضرب کے ساتھ خود ہی نہ گھوم گیا ہوتا تو اس کا شانہ اتر گیا تھا۔ تلوار پر کسم کی گرفت زبردست تھی۔ وہ گھوما مگر اپنا توازن قائم نہ کر سکا۔ تلوار تھامے ہوئے صنوبر کے مصنوعی درخت سے جا ٹکرایا۔

اتنی مہلت میرے لیے کافی تھی۔ میں زقند بھر کر صنوبر کے دوسرے رخ پر آچکا تھا۔ مصنوعی درخت کے ناکافی گھیرے کے پیچھے سے ہاتھ پہنچا کر میں نے کسم بھیا کی گردن اپنے بازو کے گھیرے میں جکڑ لی، اسے بے بس کر دیا اور میں نے سرگوشی میں کہا، ”کسم چند بھیا! مجھے آزاد ہو جانے دے... رستہ مت روک میرا۔“

جواب میں وہ کچھ کہنا چاہتا تھا۔ میں نے گرفت نرم کی۔ وہ کہنے لگا، ”تیرے چار سال پورے ہو گئے... وردی کے رنگ سے پتا چل رہا ہے۔ اب تو سلطان کی نوکری میں جائے گا۔ گھر، نوکر، سواری، مال، دولت۔ تو کہے گا تو یہیں خاصے کے شاگردوں میں رکھ لیں گے... حکومت کرنا... اور کیا چیتے تجھے؟“

”آزادی۔ مجھے خلجی سلطان کی، اپنے آقا مغل کی، اس سفید شکل لنگور کی... کسی کی غلامی نہیں چاہیے۔ میں آزاد رہنا چاہتا ہوں۔“

وہ ہنسا، ”آزادی کیا ہوتی ہے رے؟ بھوکے رہنے کی؟ بٹ ماروں، ڈکیتوں کے خوف سے کانپتے رہنے کی آزادی؟ کوئی سردھرا نہیں ہو تو رگھو! دن گھگھیاتے اور راتیں لرزتے ہوئے گزرتی ہیں۔“

میں نے کہا، ”تو سردھرے کو کہتا ہے؟ میرے لیے امتے کافی ہے۔ اسے لے کر ترکستان نکل جاؤں گا۔“

”امتے؟“ کسم نے چمک دار آواز میں پوچھا، ”امتے تیری محبوبہ ہے؟... ہاں رے؟ بڑا تیز نکلا رے!“

میں نے بازو کی گرفت سخت کی۔ کسم کی آواز رک گئی۔ میں نے کہا، ”امتے میری ماں ہے۔“

حیرت سے وہ بولا، ”پر ہماری ماں تو...“

”امتے نے مجھے پالا ہے۔ وہ آقا مغل کی خادمہ ہے۔ وہی لے کر آئی تھی یہاں۔“

لنگور کے آدمی اسے میرے پاس سے اٹھالے گئے۔ شاید اسے زخمی کر دیا تھا۔“
”اچھا... وہ!“

”کیا مطلب؟“ میں نے بے تاب ہو کر پوچھا، ”تجھے کیسے معلوم؟ یہ چار برس پہلے کی بات ہے۔“

کسم چند نے دھیرے سے پوچھا، ”تو اس سے بہت پیار کرتا تھا؟ ہاں رے؟“
میں نے کہا، ”میں؟ نہیں بھیا، وہ مجھ سے بہت پیار کرتی ہے۔ ہماری ماں اپنی اچھنوں میں رہتی تھی۔ کیسا ایک دم چھوڑ کے ڈوب مری۔ امتے نے ماں سے، باپ سے بڑھ کے پیار کیا ہے۔ تو بھی کبھی اسے ملنا۔“

کسم کی آواز بڑے بھائی کی آواز تھی، ”رگھو! ٹھہر... بات سن۔ کیا ہمیشہ بچہ بنا رہے گا؟ اب چھوڑ... بہت پرانی بات ہو گئی۔ ہاتھ ہاتھ بھر لمبی گھاس اگی ہوئی ہے قبر پہ۔ مطبخ کے پیچھے ٹیلا سا ہے، وہی ہے تیری امتے... تغہ مغل کی خادمہ۔“

”ایں؟“ میرا جیسے دم نکل گیا، ”تو جھوٹ بول رہا ہے کسم!“ میں نے اپنے بھائی کے حلق پر سے بازو کی گرفت ہٹالی۔ صنوبر کا یہ درخت جیسے ماں امتے تھی جو مجھے سہارا دیے ہوئے تھی۔ میں صنوبر کے گھیرے پر پھسلتا ہوا گھاس پر آگرا۔ ”ماں! میری میا! ماں! ماں!“
مجھے نہیں معلوم کب کسم چند نے اپنی تلوار نیام کی، کب میری گردن میں بانہیں ڈال کر وہ گھاس پر میرے برابر آ بیٹھا۔ اس کا ہاتھ میرے گھنے بالوں میں کبھی کنگھی کرتا، کبھی وہ میرا چہرہ اپنی طرف گھما کر مجھ سے کچھ کہتا، کبھی بچے کو جیسے چکارا جاتا ہے اس طرح چکارتا۔
وہ کس طرح مجھے باغ کے کھلے، غیر محفوظ احاطے سے بارہ دری میں لے گیا، اپنی وردی کی فرغل اوڑھا کر مجھے پتھر کی جالی سے نکا دیا، مجھے کچھ یاد نہیں۔

کچھ دیر بعد میں نے خود کو قابو کیا تو دیکھا، کسم چند میرے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لیے گم صم بیٹھا میری شکل دیکھ رہا ہے۔

آہستہ سے اس نے میرا شانہ تھپک دیا۔ ”رگھو! تجھے اس چار دیواری یا کسی بھی چار دیواری میں نہیں رکھا جاسکتا، یہ میں سمجھ گیا ہوں۔ میں تجھے جانے دیتا ہوں۔ تو چلا جا۔ مگر ان کے لیے یہ سمجھ لینا بہت آسان ہوگا کہ میں نے تجھے فرار ہونے میں مدد دی ہے اور یہ کہ ہم دونوں سکے بھائی ہیں... وہ اذیتیں دے کر مجھ سے کچھ نہیں پوچھ سکتے۔ بے وقوف نہیں ہیں۔

انہوں نے تربیت دی ہے۔ جانتے ہیں میں کبھی کچھ نہیں قبولوں گا۔ وہ یہ کریں گے کہ شہادتیں جمع کریں گے، سراغ اٹھائیں گے۔ معلومات حاصل کریں گے... اور چاہے دو سال لگ جائیں یا چار سال، آخر کار وہ معلوم کر لیں گے... اس وقت تک مجھے قید میں رکھیں گے... اچھی دیکھ بھال کریں گے میری... اور ثبوت مل جانے پر کسی منگل کی صبح... اس کے لیے منگل کا دن مقرر ہے... تو منگل کی صبح سب شاگردوں کے سامنے وہ بے بجھے چونے میں مجھے گردن تک دفن کر کے خاصے کے شاگردوں، معتبر شاگردوں اور عام درجہ بندی شاگردوں سے سوکھے چونے کے اس گڑھے میں وقفے وقفے سے پانی کا ایک ایک مشکیزہ ڈلاتے رہیں گے۔ نہیں، رگھوبا! میرے بھائی! مجھے ایسی موت منظور نہیں۔“

میں نے کہا، ”تو بھی میرے ساتھ چل۔“

”کہاں؟ ترکستان؟ ناں رگھو! میری پرورش محل سرا میں ہوئی ہے۔ ایک خلجی سردار نے مجھے بیٹوں کی طرح رکھا۔ میری عادتیں بگاڑ دیں۔ میں اب کسم چند، مندو کا لکھیرا، چوڑی ساز نہیں رہا، حسن خان ہوں، ملک شادی خان کا پروردہ۔ میرے کپڑے لتے، دگلے اور سواری کے جوتے بخارا سے آتے ہیں۔ ہر پارچے کی کور پر بڑی حکمت سے لکھا ہوتا ہے، خاص برائے ملک حسن خان پسر ملک شادی خان عماد الملک ہندی۔ وہ مجھے خوشامد میں ملک لکھتے ہیں جو میں نہیں ہوں اور مجھے عماد الملک کا بیٹا بتاتے ہیں جو نہیں ہوں، مگر یہ مجھے اچھا لگتا ہے اور مجھے بہترین فراں سیسی مشروب اور خوب صورت عورتوں کے جھرمٹ میں گل گشت اچھی لگتی ہے۔ میں اپنے لیے ملک نائب کی مسند پسند کر چکا ہوں جہاں اس وقت کا فور ہزار دیناری بیٹھا ہے۔ رگھوبا، میرے بھائی، تیرے ساتھ جانے اور ٹھو کریں کھانے سے تو بہتر ہے کہ میں گرم حوض میں بیٹھ کر جراح سے اپنی دونوں کلائیوں کی وریدیں کھلوادوں اور خوش الحان گویوں کا راگ سنتے ہوئے ہمیشگی کی نیند سو جاؤں۔ نا، نا، میرے بھائی! میں ایسی کسی بھی موت، کسی بھی زندگی کے لیے تیار نہیں ہوں جو میرے شایان نہیں۔“

”بھیا... تو نہ میرے ساتھ چل سکتا ہے، نہ ٹھہر سکتا ہے۔ پھر کس طرح ہو؟“

کسم چند بولا، ”سن، جسے تو سفید چہرہ لنگور کہتا ہے اس کے بڑے احسانات ہیں مجھ پر۔ مگر آقا ملک شادی خان نے اس کو سونے میں دفن کر دیا تھا۔ میرے مالک کا ایک یہی احسان اس پر بہت بھاری ہے، کہاں تک اتارے گا وہ... تو اس نے... میرے اس دوسرے

محسن لنگور نے مجھے کچھ رعایتیں دے رکھی ہیں۔ ان میں ایک یہ بھی ہے کہ دن اور رات کے اوقات میں کسی بھی وقت میں، حسن خان، اس کی خواب گاہ، کتب خانے یا طعام گاہ میں، جہاں کوئی اور نہیں جاسکتا، داخل ہو سکتا ہوں۔“

”اچھا... پھر؟“

کسم بھیا کا چہرہ ایک عجیب نیلی ٹھنڈی روشنی سے دکنے لگا۔ وہ بولا، ”تو اب میں اس کی خواب گاہ میں جا رہا ہوں۔ تیرے پاس رکھو، بس اتنا وقت ہے کہ تو احاطے سے باہر چلا جا... اگر تو جاسکے تو... باہر دن نکلنے سے پہلے وہ کچھ نہیں کر سکتے... بتا تو باہر جاسکتا ہے؟“

میں نے کہا، ”ہاں۔“

”تو ٹھیک ہے۔ شور شرابا سننے تک اگر تو رکا تو پھر مارا جائے گا۔ میں کچھ نہیں کر سکوں گا۔ مجھے اپنی حکمت سے صرف اپنی جان بچانی ہوگی۔“

میں نے پوچھا، ”شور شرابا؟ کسم تو اس کی خواب گاہ میں کس لیے جا رہا ہے؟“ میں پریشان ہو گیا تھا۔

”اسے قتل کرنے۔ میں اپنے محسن کو قتل کرنے جا رہا ہوں۔ تجھے نکالنے کی اور کوئی صورت نہیں۔“ اور یہ کہہ کر کسم لمبے لمبے قدم لیتا بارہ دری سے باہر اندھیرے میں گھل گیا۔

باغ کے طاق میں رکھے آرائشی برتن کے سرپوش سے خفیہ دروازے کی چابی حاصل کرنا اور اس منحوس احاطے سے نکلنا، کچھ مشکل نہ تھا۔ احاطے سے کچھ دور ایک کسا ہوا گھوڑا موجود تھا جو صحیح لوگوں نے مناسب رقم لے کر پہلے ہی فراہم کر دیا تھا۔ صبح ہوتے ہوتے میں اپنے قید خانے سے بیسیوں فرسنگ دور تھا۔

امتے کی موت کا معلوم کرنے کے بعد میں نے آگے کے منصوبے بدل دیے تھے۔ امتے کے بعد میرا کوئی نہیں تھا۔ اگر کہیں کوئی جاننے والا موجود تھا تو اس منجر، اس نحوست آثار جراح کے گھر ٹھہری ہوئی وہ دو ماں بیٹیاں تھیں جو مجھے مندو کے راستے میں ملی تھیں۔ وہ پچھلے چار برس میں کتنی بار یاد آئی تھیں۔ میں نے سوچا، وہ مجھے بھولی تو نہیں ہوں گی۔

میں نے جراح کے گھر جانے کا فیصلہ کر لیا۔

سوچا رات میں کسی وقت اس کے گھر میں داخل ہو جاؤں گا اور تلوار دکھا کر اسے مجبور کروں گا کہ وہ عورت اور اس کی بیٹی سے مجھے ملا دے۔ ایک آدھی ساعت، انھیں دیکھ کر، بات

کر کے میں چل پڑوں گا۔ ملک خدا بہت وسیع ہے اور فقیر کے پیروں میں اب کوئی زنجیر نہیں۔
مخبر جراح کے گھر میں داخل ہونا کچھ مشکل نہ تھا۔ اس نے اب تک مجھے لڑکی کے لباس میں دیکھا تھا۔ اس وقت نو جوان لشکری کی وردی میں گھوڑے کی راسیں تھامے ہوئے جب میں دروازے پر پہنچا اور دستک دی تو اس نے دروازہ کھلوا کر مجھے بلند ڈیوڑھی میں بلا لیا۔
ظاہر ہے میں سر اور بازو پر پٹیاں لپیٹے زخمی لشکری بن کر داخل ہوا تھا۔ جو آنکھ ہر جگہ میری پہچان کر ادیتی تھی اسے بھی میں نے پٹی سے ڈھک لیا تھا۔

ڈیوڑھی میں پہنچ کر میں نے کنڈی لگا دی اور بازو کی پٹیاں پھینک جراح کے حلق پر تلوار رکھ دی۔ اس کے خادم کو اشارہ کیا کہ وہ دور اس گوشے میں خاموشی سے منہ پر ہاتھ رکھے کھڑا رہے۔

مخبر جراح سے میں نے کہا، ”آٹھ برس پہلے میرے چچا کی عورت اور اس کی بیٹیاں گڑھ مندو سے چل کر اس شہر میں آئی تھیں۔ ایک لڑکی زخمی ہو کر چل بسی۔ کسی نے بتایا ہے کہ میرے چچا کی عورت اور اس کی بیٹی تیرے گھر ٹھہری تھیں... کہاں ہیں وہ؟“
جراح سکون سے میری بات سنتا رہا۔ جب میں کہہ چکا تو مسکراتے ہوئے بولا،
”دونوں گھر میں ہیں اور عافیت سے ہیں... نو جوان! ایک بات بتاؤ، کیا یہ تمہارے شہر کا دستور ہے کہ رشتے دار کے گھر پہلی بار آتے ہیں تو اس کے گلے پر تلوار رکھتے ہیں؟“
”رشتے دار؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں، تمہاری چچی اب میرے نکاح میں ہے۔ اس حساب سے اگر قریب کا نہیں تو میں تمہارا دور کا چچا تو ہر حال میں ہوا۔“
”تو نے بہ زور اسے اپنے گھر میں رکھ لیا ہے؟“

جراح مسکرایا، ”میرے مسلک میں جبر نہیں ہے لڑکے! اس نے خوشی سے دین بدلا اور اپنی خواہش سے میرے نکاح میں آئی... بلاتا ہوں، پوچھ لو۔“ مالک نے اپنے خادم کو اندر جانے کا اشارہ کیا تھا۔

میں نے جراح کے حلق سے تلوار ہٹالی مگر ابھی نیا م نہیں کی۔

جراح مجھ سے میرا نام، خلجی لشکر میں میرے جیش کا حوالہ، امیر عسکر کا نام، یہ سب پوچھتا رہا۔ میں خاموش بیٹھا اس کی صورت نکا کیا۔ کچھ ہی دیر میں گجراتی مسلمانوں کے لمبے

لباس میں سر ڈھکے اور اپنے بازو اور آدھا چہرہ چادر میں چھپائے، نیند کے خمار میں آہستہ آہستہ چلتی ایک گوری چٹی عورت، اور اس کے عقب میں گہری نیلی چادر میں لپٹا ایک کشیدہ قامت سایہ کمرے میں داخل ہوا۔

میں نے پہچانا یہ وہی عورت تھی۔ مگر اس نے مجھے نہیں پہچانا تھا۔ بولی، ”تو کون ہے؟ مندو میں تو میرا کوئی بھتیجا اس عمر کا نہیں تھا۔“

میں نے سر اور چہرے پر بندھی پٹی ہٹالی اور عورت سے مسکرا کر کہا، ”تو نے پہلے بھی میرا دیا ہوا شہد لوٹا دیا تھا اور اب میری کہی ہوئی بات جھٹلاتی ہے۔ تو کیسی چچی ہے؟“

پہچان کی ایک زبردست لہر آئی اور اس نے اپنے چہرے اور سر پر گرایا ہوا کپڑا کھینچ لیا۔ وہ مسکرا رہی تھی، ”ارے تو ہے؟ تو بہ، کتنے برس بعد دیکھا ہے تجھے۔“

نیلی چادر میں لپٹے کشیدہ قامت سائے نے ایک قدم آگے لیا تھا۔ میں نے چاندی بنجنے کی ہلکی آواز سنی۔ وہی لڑکی ہنسی تھی۔

عورت نے مڑ کر اپنی بیٹی کی طرف دیکھا۔ بولی، ”بڑوں کو دیکھ کر سلام کرتے ہیں... ہنستے نہیں۔“

اس نے شرمائی لجائی آواز میں کہا، ”سلام!“

”سلامتی ہو۔“ میری سمجھ میں نہ آیا کہ اس لڑکی کو کس طرح جواب دوں۔

حیرت اور ایک عجیب طرح کی مسرت نے مجھے گنگ کر دیا تھا۔ میری منہ بولی چچی مجھ سے کچھ پوچھ رہی تھی۔ مگر میں اس چھوٹی لڑکی میں جو گڑھ مندو کے راستے میں ملی تھی اور اس کشیدہ قامت بی بی میں، جس کی ہنسی چاندی بنجنے جیسی تھی، کوئی ربط نہ قائم کر سکا تھا۔ یہ وہ چھوٹی لڑکی کیسے ہو سکتی ہے جسے میں نے اپنے شہد کے چھتے میں سے حصہ دیا تھا!

”اور تمھاری وہ مغلانی امی کہاں ہے؟“ یہ میری منہ بولی چچی نے پوچھا تھا۔ میں اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔

میرے منہ بولے چچا نے جس کے خلاف میرے دل میں ابھی بے حساب غبار باقی تھا، مجھے خبر دی کہ ملازم نے گھوڑا تھان پر باندھ دیا ہے، اس کو چار پانی دیا جا رہا ہے۔ میں بھی کمر کھول کر آرام سے بیٹھوں، اپنی رشتے داروں سے باتیں کروں۔

میں دن بھر کا بھوکا پیاسا تھا، ایک آدھی ساعت کے لیے ان لوگوں سے ملنے کا

سوچ کر آیا تھا اور اب دسترخوان پر بیٹھا ان کی میزبانی سے فیض یاب ہو رہا تھا۔ ہم لوگ صبح کی اذان ہونے تک بیٹھے باتیں کرتے رہے؛ جس کے بعد دونوں ماں بیٹی اور جراح چلے گئے۔ ایک آدھی ساعت بعد وہ لوٹ کر آئے اور میرے دائیں بائیں بیٹھ گئے۔ جراح بہت سنجیدہ بلکہ پریشان دکھائی دیتا تھا۔ اس نے آتے ہی تغہ مغل کا ذکر چھیڑ دیا۔ کہنے لگا، ”تمھاری چچی نے مجھے ابھی یاد دلایا کہ تم وہی شاگرد ہو جسے تغہ مغل کی حویلی میں لڑکی بنا کر رکھا جاتا تھا۔“

جراح نے ”غلام“ کی جگہ میرے لیے ”شاگرد“ کا لفظ استعمال کیا تھا، یہ تہذیب کی بات تھی۔ پھر اس نے تغہ مغل کے بارے میں وہی کچھ بتایا کہ جواب مجھ پر کھل چکا تھا۔ اس نے بتایا کہ تغہ مغل شاہی خبر رساں تیار کرنے کے لیے ہوشیار، دلیر اور خوب صورت بچے نہ صرف بازارِ غلاماں سے خریدتا ہے بلکہ بٹ ماروں، ڈکیتوں اور ایسے تمام مجرموں کی مدد سے کم زور بے سہارا قافلوں اور اکیلے اکیلے نکلنے والوں پر حملے کراتا ہے اور ملک فراں سیس کا ایک جادوگر ہے اس سے انھیں تربیت کراتا ہے۔ اس فتنہ پرور کے خفیہ مدرسے میں مخبر اور خبر رساں تیار کیے جاتے ہیں جنھیں سلطانِ دہلی کو، اس کے امیروں اور حد یہ کہ دشمنوں کو بھی منہ مانگی قیمت پر فروخت کر دیا جاتا ہے۔

کتنی بار تغہ مغل نے اپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے جراح قاسم علی کو شہر بدر کرانا چاہا، کیوں کہ وہ اسے اپنے لیے بہت بڑی رکاوٹ سمجھتا ہے۔ اس پر بارہا حملے کرائے گئے مگر کچھ تو اس وجہ سے کہ اس پائے کا دوسرا جزِ اح ملک گجرات میں نہیں ہے اور مقامی امرا اور تاجر اس کی پشت پناہی کرتے ہیں اور دوسری وجہ یہ کہ قاسم علی ایک بہت بڑی بارگاہ سے وابستہ ہے، تو تغہ مغل کے حمایتیوں کی ہمت نہیں پڑتی کہ وہ اس پر بھونڈے پن سے ہاتھ ڈال دیں۔ میں نے پوچھا، ”قاسم علی! کس بارگاہ سے وابستگی ہے تمھاری؟“

تو جراح دو زانو ہو بیٹھا، اس نے سر پر اپنی کلاہ درست کی اور بڑے جذبے سے بولا، ”میں خواجہ جہاں، شیخ زماں، سلطان جی حضرت نظام الدین اولیا مدظلہ کا غلام ہوں۔ بظاہر دار الخلافہ دلی ان کا پایہ تخت ہے مگر حضرت کی حکمرانی دلوں پر ہے۔“ میں نے اس بزرگ کا نام سن رکھا تھا۔ کہتے ہیں خلجی علاء الدین بھی بہت احترام کرتا ہے۔

قاسم علی جراح کو یہ خوف تھا کہ تغہ مغل اور اس کے حامیوں کے جاسوس کیوں کہ دن رات اس کے گھر کی نگرانی کرتے ہیں۔ آدھی رات کو آنے والے مجھ 'زخمی لشکری' کے صبح تک رکنے کی خبر ان مخالفوں تک ضرور پہنچ گئی ہوگی۔ میرے فرار کی خبر اور قاسم علی کی نگرانی کرنے والوں کی اطلاع یہ دونوں خبریں مل کر تغہ مغل کے سامنے پوری تصویر بنا دیں گے۔ تغہ ملعون تربیت گاہ سے بھاگے ہوئے اپنے اس زر خرید غلام کو جراح کے گھر سے گرفتار کر کے گویا ایک تیر سے دو شکار کر لے گا۔

میں نے اپنی چار سالہ تربیت، اپنے بھائی حسن خان سے ملاقات اور بھائی کے ہاتھوں ملک فراں سیس کے شیطان کے قتل کی تمام روداد قاسم جراح اور اپنی منہ بولی چچی کو سنا دی۔

قاسم علی نے کہا، ”گجرات ہمارا مدفن بن جائے گا، دلی چلو۔“ اور ایک ساعت کی مختصر مدت میں قاسم جراح، اس کی بیوی، بیٹی، جراح کا گھر چھوڑ دلی کی طرف چل پڑے۔ ہم نے نربدا کی وادی سے نہ گزرنے کا فیصلہ کیا تھا؛ حالاں کہ وہاں تیز رفتار سڑک تھی جو اور آباد علاقوں سے گزرتی تھی۔ ہمیں معلوم تھا کہ اس راستے پر ایک دن رات بھی عافیت سے سفر نہ کر سکیں گے کہ شاہی کارندوں کے ساتھ تغہ مغل ہم پر آ پڑے گا۔ اس لیے ہم نے راجپوت علاقوں سے گزرتے ہوئے دارالخلافہ پہنچنے کا فیصلہ کیا۔

برسات کے دن تھے مگر علاقہ کہیں پتھر یلا کہیں ریگستانی تھا اور ہرا ہور ہا تھا، اس لیے ہماری نیل گاڑیوں، گھوڑوں کو رستہ طے کرنا آسان ہو گیا۔ بارش نے سوئی ہوئی مٹی کو ایسا جگا دیا تھا کہ زمین زاد کسان خوب نہال ہو رہے تھے۔ میں خلجی لشکری کے لباس میں دلی سلطنت کی مطیع راج گدیوں سے اس مختصر قافلے کے لیے سہولتیں حاصل کرتا، کبھی آگے آگے اور کبھی قافلے کے عقب میں، چلتا رہا۔

چچی کی بیٹی گائتری، جو اب گل زادے کہلاتی تھی، گئے دنوں کی طرح چنچل تو نہیں رہی تھی، پر کبھی ایک آدھا فقرہ کہہ کر وہ اپنے مزاج کی اگلی شوخی ضرور یاد دلادیتی تھی۔ میرا اس کا سامنا ہو جاتا تو گل زادے سر پر پلو لے کر سنجیدہ ہو جاتی، بات کرتے کرتے چپ ہو جاتی یا آواز ہلکی کر لیتی، مگر مجھے ایک چورسی مسکراہٹ اس کے خوب صورت چہرے پر یا آنکھوں میں ضرور دکھائی دے جاتی تھی۔ تو یہ کیا تھا؟ میری سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

مجھے لڑاکوں کی طرح تربیت کیا گیا تھا۔ اپنے ہی جیسے مردوں کے درمیان میری

شعور کی عمر گزری تھی۔ گھر، عورت، کنبہ اور لڑکیاں کیسے سمجھ میں آتیں؟ میں پریشان ہو گیا۔
دلی دو منزل دور رہ گئی تو میں نے جراح قاسم علی سے اچانک یہ بات کہہ دی کہ اگر وہ اپنی اس زیر کفالت لڑکی کو، جو اب اس کی بیٹی ہے، مجھ سے بیاہ دے گا تو یہ بات بہت اچھی ہوگی کیوں کہ گل زادے شاید مجھے پسند کرنے لگی ہے۔

قاسم علی پہلے تو حیران ہوا، پھر پوچھنے لگا کہ تجھے یہ کیسے معلوم ہوا کہ گل زادے تجھے پسند کرتی ہے؟ میں نے بے ڈھنگے پن سے کہہ دیا کہ وہ مجھے دیکھ کر مسکراتی رہتی ہے۔ قاسم علی نے قہقہہ لگایا۔ بولا، ”بھتیجے! وہ ہمیشہ کی چنچل، فقرے باز ہے۔ یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ تیرا لشکری حلیہ دیکھ کر، تیری فرغل کے بے ہنگم تکے دیکھ کر اسے کوئی پھبتی سوچتی ہو مگر لحاظ میں کہہ نہ پاتی ہو؛ دل مسوس کے، مسکرا کے رہ جاتی ہو؟“

قاسم علی تجربہ کار آدمی تھا۔ میں نے سوچا شاید ایسا ہی ہوگا، اس لیے میں نے کہا، ”اچھا اگر ایسا ہے تو پھر رہنے دے۔“

قاسم جراح مسکرائے جا رہا تھا۔ کہنے لگا، ”نہیں، اس کی ماں سے بات کر کے دیکھ لے۔ شاید فرغل کے تکموں کا شوشہ نہ ہو، کوئی اور بات ہو۔“

میں چپ ہو گیا؛ اور بات کیا ہو سکتی تھی؟ شاید یہی کہ گل زادے کو میری آنکھ کا عیب دکھائی دیتا ہے اور وہ ہنس پڑتی ہے۔ میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس بات کو یہیں ختم کر دوں گا۔
دار الخلافہ دلی عجیب ہنگامہ خیز شہر تھا۔ ہم پرانی بستی ہستنا پور نہ رکے، سیدھے سلطان جی نظام الدین اولیا کے دربار پہنچے۔

قاسم کی حالت دیکھنے کے لائق تھی۔ قافلے کا ساتھ بیچ رستے میں چھوڑنے پر تلا ہوا تھا۔ بار بار اپنی بیوی سے کہتا تھا کہ حضرت محبوب الہی کی زیارت کر لوں گا، قدم چوم لوں گا، تب چین نصیب ہوگا۔

تو قاسم علی، گل زادے، اس کی ماں، خادم اور خادمہ، یہ پانچوں دربار نظام الدین کی طرف جاتے تھے۔ مجھ سے بہت کہا مگر میں نے کہا، ”ابھی مجھے کچھ نہیں معلوم۔ برادھو کے گھر پیدا ہوا، سمجھو ابھی بھی وہیں ہوں۔ حضرت فرمائیں گے کہ اپنوں میں شامل ہو کر یہ کوئی غیر کیوں چلا آیا؟ بس آپ لوگ ہاتھ جوڑ کے میری طرف سے سلام کر لینا۔“

قاسم علی رونے لگا۔ بولا، ”لڑکے! یہ اپنوں پر ایوں والی بات تو نے کیا کہی! میرے

حضرت تو مولا کے پیاروں، اس کے عاشقوں میں سے ہیں۔ خالق کے ساتھ ساری خلقت مخلوق کو دل میں بسائے ہوئے ہیں۔ ان کے گھر پر ایا کون ہوگا؟ سب اپنے ہیں۔ تو چل تو، کیا خبر ہم سب سے بڑھ کر تیری پذیرائی ہو۔“

مگر میں نے ہاتھ باندھ کر کہا، ”ایسے اللہ ولی کی سرکار میں نہا دھو کر جانا اچھا ہوتا ہے۔ میں ابھی خود کو میل کچیل میں اٹا لگتا ہوں۔ کیا کروں؟ آپ لوگ ہو آؤ۔“

نصیبوں کی بات ہوتی ہے۔ وہاں جانا اس وقت میرے نصیب میں نہ تھا۔

میں قافلے کے جیو جانوروں کو دانہ پانی دینے میں لگا رہا۔ ایک پہر گزر گیا۔

آخر بڑے شور شرابے کے ساتھ ایک زبردست ہجوم کو سڑک پر نکلتے دیکھا۔ ہجوم کے درمیان آگے آگے چاندی کا دو سینگوں والا نیزہ، دور باش چلا آتا تھا۔ دور باش کے بعد دس قدم تک خالی جگہ تھی پھر چتر لعل اٹھائے چار وردی پوش خادم آتے تھے۔ یہ لال رنگ کے جھلمل کپڑے کا چھوٹا شامیانہ سا تھا۔ اس چتر لعل کے نیچے سر جھکائے پیدل چلتا ہوا ایک بلند قامت، خوب صورت جوان، میا لے رنگ کے فقیری کپڑے پہنے درویشوں والی کلاہ سر پر رکھے چلا آ رہا تھا۔

”اے مالک! راج دھانی میں پہلے ہی دن یہ کیسے بادشاہی سلطانی جلوس کا سامنا ہو گیا؟ یہ دور باش اور چتر لعل تو دلی سلطان کی نشانیاں ہیں۔ تو کیا خود خلجی علاء الدین حضرت محبوب الہی کے سلام کو آیا ہے؟“

پاس کھڑے دلی والے نے بتایا کہ خلجی علاء الدین کا بڑا بیٹا نیاز مندی ظاہر کرنے آتا ہے تو فقیری جامہ پہن لیتا ہے۔ میں نے پوچھا، ”یہ دور باش اور چتر لعل؟ یہ کون سی درویشی، نیاز مندی ہے؟“

وہ کہنے لگا، ”باپ نے ولی عہدی کی نشانیاں دی ہیں، ساتھ کیوں نہ رکھے؟ ہاں اتنا ہے کہ حضرت محبوب الہی کے دربار کی حدود سے سو قدم دور اپنے خدم و حشم کو چھوڑ کے، پاپوشیں اتار، بھیڑ میں دھکے کھاتا ہوا جاتا ہے، سلام کر کے آ جاتا ہے۔“

میں نے دل میں کہا، چلو کسی خلجی کی طرف سے اتنا بھی بہت ہے۔

یہ شاہی جلوس سڑک پر چلتے رہنے کی بجائے پیپل کے اس چھتھار کے سامنے ٹھہر گیا جس کے سائے میں ہم نے اپنی گاڑیاں کھولی تھیں، گھوڑے باندھے تھے۔ عجیب بات!

پھر میں نے اس سے زیادہ عجیب منظر یہ دیکھا کہ چتر لعل کے بعد جہاں ولی عہد سلطنت کے مصاحبین اور سردار ہاتھ باندھے چلتے ہیں، قاسم علی بھی سمجھوں کے درمیان کھڑا ہے اور دونوں ہاتھوں سے اشارے کرتا مجھے بلا رہا ہے۔ اے مالک! چچا قاسم علی وہاں کیسے پہنچ گیا اور یہ مجھے کس بات کے اشارے کرتا ہے؟

ابھی کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا اور میں گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتا تھا کہ پاس کھڑے دلی والے نے بازو سے پکڑ کر مجھے آگے کر دیا اور ملک خضر خان ولی عہد کے دو خادموں نے مجھے دونوں طرف سے پکڑ کر اپنے آقا کے روبرو پہنچا دیا۔

ولی عہد سلطنت نظریں جھکائے ہوئے تھے۔ مجھے پیشی میں کرنے والے خادموں نے سرگوشی میں کہا، ”عالی قدر، حضرت والا!“ تو خضر خان نے نگاہ اٹھائی، مجھے دیکھا اور مڑے بغیر چچا قاسم کو مخاطب کیا، ”قاسم علی! تو یہ ہے تمہارا بھتیجا؟“

چچا قاسم علی کی موڈب آواز آئی، ”جی بندہ نواز، عالی قدر، حضرت والا!“

”کیوں بھئی،“ ولی عہد سلطنت نے براہ راست مجھے مخاطب کیا تھا، ”ہماری ملازمت کرو گے؟“

چچا نے پیچھے سے میری طرف دیکھ کر ہاں کے اشارے میں سر ہلانا شروع کر دیا تھا۔ فوری جواب نہ دینا بے ادبی ہوتی۔ میری سمجھ میں زیادہ تو کچھ نہیں آرہا تھا، میں نے ہاتھ باندھ کر، جیسا کہ دستور ہے، عرض کیا:

”بندگانِ عالی! اس غلام کی خوش نصیبی۔“

ولی عہد خضر خان نے بائیں ہاتھ سے یوں اشارہ کیا جیسے چہرے سے مکھی اڑائی جاتی ہے اور شہزادے کے ساتھ چتر لعل چل پڑا۔ میں منہ کھولے کھڑا تھا کہ چتر کے پیچھے ہاتھ باندھے چلنے والوں میں سے کسی نے بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے مجھے مصاحبوں، حاضر باشوں کی صف میں شامل کر لیا۔

گرد سے اٹا، بے حال لشکری کی ملگجی وردی میں، میں بھی ہاتھ باندھے ولی عہد کے جلوس کے ساتھ چلنے لگا۔ نہ معلوم کس طرح جراح قاسم علی میرے برابر آ گیا تھا۔ سرگوشی میں کہنے لگا، ”شاباش! اسی طرح عرض کیا جاتا ہے۔ دیکھا؟ میرے مرشد، حضرت محبوب الہی نے کیسی پذیرائی کی! عالی قدر کو خود حکم دیا کہ قاسم کا بھتیجا باہر رہ گیا ہے۔ ساتھ لے جاؤ، کوئی کام بتاؤ۔“

کسی صاحبِ چتر و دور باش کی ملازمت میرے لیے کون سی مشکل بات تھی۔ سمجھو آٹھ برس سے زیادہ مدت تک مجھے یہی سکھایا گیا تھا۔

مگر جن دنوں میں یہ غلامِ ملازمت میں آیا، میرا صاحب، آقائے ولی نعمت، خضر خان اپنی شہزادگی کے مشکل دور سے گزر رہا تھا۔

سلطانِ خلجی علاء الدین نے، کہتے ہیں، تیز و تند، بے توازن، غیر محتاط زندگی گزاری تھی۔ جام و مینا اور زلف و کاکل کی ہم سفری میں اس نے اپنی جوانی اور اس کے بعد کی عمر بسر کی تھی۔ پھر کہتے ہیں اس نے بادہ نوشی سے توبہ کر لی تھی اور رعایا کو تنبیہ کی تھی، سزائیں سنائی تھیں۔ مگر بیٹوں کو اور امیروں کو اس سے دور نہ رکھ سکا۔

کتنے سلاطین اور صاحبانِ حشم ایسے ہو گزرے ہیں جن کے شاہی مشاغل کا فطرت نے کوئی سخت محاسبہ نہ کیا ہوگا، شاید درگزر سے کام لیا ہو؛ مگر علاء الدین فطرت کی گرفت سے بچ نہ سکا، ایسا بیمار پڑا کہ جسم اور روح دونوں ٹڈھال ہو گئے۔

اس کے علاوہ سلطان کا ایک مستقل عارضہ ملک کا فور کی ذامت تھی۔ ملک نائب کا رتبہ دے کر اس ہزار دیناری غلام کو علاء الدین نے اس کے مالک سے بہ زور چھینا تھا۔ اسے عملاً سلطنت کا نائب بنادیا تھا۔ خلجی علاء الدین اس کا فور کی الفت میں ایسا گرفتار ہوا کہ ملکہ جہاں، اپنی بیگم اور ولی عہد خضر خان تک سے شاکی ہو گیا کہ وہ اس کی اتنی پروا نہیں کرتے جتنی کا فور کرتا ہے۔ خضر خان کو اپنی محفل آرائی، مے نوشی، مطرب نوازی سے اور چوگان بازی سے اور ہاتھیوں کی لڑائی سے کم ہی فرصت ملتی تھی۔ ادھر ملکہ جہاں کو شہزادوں کی شادیوں، پوتوں کے عقیتوں، ختنوں، آمینوں اور دوسری سب رسموں سے فراغت نہ ملتی ہوگی جو وہ سلطان کی ذات پر توجہ کرتی۔

سلطان کہتا تھا، اور شاید سچ کہتا تھا، کہ میری بیماری ان دونوں کی غفلت کا نتیجہ ہے۔ وہ روز بہ روز ان سے بدگمان ہوتا گیا۔ اس نے دکن سے ملک نائب، اپنے منظورِ نظر ملک کا فور کو، اور گجرات سے بھائی الماس بیگ الغ خان کو بلا بھیجا۔

ملک نائب کو تنہائی میں بلا کر سلطان نے اپنی بیوی اور ولی عہد کی لاپرواہی کی شکایت کی۔ اس وقت تک ملک نائب نے بادشاہت کے خواب دیکھنا شروع کر دیے تھے۔ موقع کو غنیمت جان کر اس نے اپنے آقائے ولی نعمت کو باور کرا دیا کہ کیوں کہ شہزادہ، اس کی

ماں ملکہ جہاں اور آپ کا بھائی الغ خان، تینوں شاہی خانوادے سے ہیں، اس لیے تخت کی خواہش رکھتے ہیں اور آپ کو مراہوادیکھنا چاہتے ہیں۔

بادشاہ بیمار تھا۔ جس وقت ملک نائب سے یہ مکالمہ ہوتا تھا اس وقت ملکہ جہاں نے ایک نئے جشن مسرت کے لیے اپنے شوہر علاء الدین خسرو ہند سے بہت بے موقع اجازت طلب کی، کہ آپ کا حکم ہو تو شہزادہ شادی خان کو الغ خان کی بیٹی سے بیاہ دیا جائے، بہترین جوڑی ہے۔ ملک نائب کو تو ایک نادر موقع ہاتھ آیا تھا، وہ کیوں فائدہ نہ اٹھاتا؟ سن کر کہنے لگا، ”ملاحظہ کیجیے! برادر الغ خان اور ملکہ جہاں اب دوسرے بیٹے شادی خان کو بھی اپنی سازش میں شریک کرنا چاہتے ہیں۔“

علاء الدین اور زیادہ بدگمان ہو گیا۔ مگر، بہر حال، وہ فاتح لشکروں کا سالار اور ہند کا سلطان تھا۔ اس نے سوچ سمجھ کر خضر خان کو شکار کے بہانے سے امر وہہ روانہ کر دیا اور چلتے وقت اس سے کہا کہ جب ہم صحت یاب ہو جائیں گے تو تجھے بلوائیں گے۔

ولی عہد خضر خان نے اس وقت یہ منت مانی کہ بابا سلطان صحت یاب ہوں گے تو وہ امر وہہ سے دہلی تک مشائخ کی زیارت کے لیے پیادہ آئے گا۔

گویا جب قاسم علی جراح کا قافلہ راج دھانی کی طرف بڑھ رہا تھا تو خبریں ملی تھیں کہ سلطان رو بہ صحت ہو رہے ہیں۔ میرے نصیب دیکھیے کہ جس روز قاسم جراح کا کنبہ اور میں حضرت محبوب الہی کے دربار کے سامنے پہنچے تھے اسی وقت خضر خان ولی عہد فقیری جاے میں حضرت کے دربار کی طرف چل پڑا تھا۔ وہ امر وہہ سے پیادہ پا آیا تھا اور اپنی منت پوری کرنے سب سے پہلے حضرت نظام الدین کے سلام کو حاضر ہوا تھا۔

یہ تو میں بتا چکا ہوں کہ دربار سے نکل کر ولی عہد عالی قدر نے مجھ سے پوچھا تھا کہ کیوں بھی ہماری ملازمت کرو گے اور ہاں کہہ کر، میں، بلا سبب، علاء الدین کے معتبوں اور ملک نائب کا فور ہزار دیناری کے دشمنوں کی صف میں شامل ہو گیا تھا۔

مگر مجھ ایسے بے حیثیت خادم کے لیے عتاب اور دشمنی اور مہر و عنایت کے وہ معنی کہاں ہوتے ہیں جو رایتوں، پرچموں والے امیرانِ ذی جاہ کے لیے ہوتے ہوں گے۔ غلاموں کو تو خوش ہو کر بھی ہاتھی کے پاؤں تلے ڈلویا جاسکتا ہے۔

خضر خان امر وہہ سے خاصے کے لشکر کے ساتھ چتر و دور باش لہراتا آیا تھا... اور

سلطان ہند علاء الدین خلجی کی اجازت کے بغیر آیا تھا۔ یہ اس کے بے شمار گناہوں میں سے ایک بڑا گناہ تھا۔

ملک نائب کا فور نے خلجی سلطان سے کہا، ”شہزادہ بلا اجازت دارالحکومت میں آیا ہے اور یہ بات ایک تاج دار کے لیے فکر اور تشویش کی ہونی چاہیے کہ اس کے بڑے بیٹے نے حکم عدولی کی ہے۔“

مگر علاء الدین شاید کچھ حواسوں میں تھا۔ اپنے منظورِ نظر کا فور کی بات کو درخورِ اعتنا نہ سمجھا اور بیٹے کو بلا اس کا سر اور آنکھیں چو میں اور اجازت دی کہ وہ حرمِ سرا میں جا کر اپنی ماں اور بہنوں سے مل لے۔

مگر کچھ دنوں بعد یہ حکم بھی دیا کہ چتر لعل اور دور باش، جو بادشاہی کی علامتیں ہیں، خضر خان، اپنے بابا سلطان کو لوٹا دے۔

تو مجھ خادم کو دار الخلافہ دلی میں کچھ روز فرصت اور عافیت کے مل گئے تھے۔ میں نے کچھ وقت چچا قاسم کے کنبے کے ساتھ گزارا اور چچا سے ایک بار خود خواہش کی، کہا کہ میں حضرت سلطان جی کے دربار میں حاضر ہو کر سلام کی سعادت حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ چچا بہت خوشی سے مجھے دربار میں لے گئے مگر میرے نصیب کی محرومی دیکھیے کہ حضرت مراقبے میں تھے اور اس طرح میں دیدار سے اس بار بھی مشرف نہ ہو سکا۔ حضرت کی پاپوشیں جہاں رکھی جاتی ہیں، تو اسی جگہ کو غلام نے دونوں ہاتھوں سے مس کیا، ہاتھ اپنی چھاتی سے لگا کر دل کو ٹھنڈک پہنچائی اور حضرت محبوبِ الہی کے تخت کو سلام کرتا لوٹ آیا۔

چچا قاسم نے گل زادے کے مسکرانے اور میری شادی کی خواہش کی بات چچی کو بتا دی تھی۔ اب جب کہ میں دربار سے بے نیلِ مرام لوٹا تھا اور قاسم جراح کے گھر میں منہ لٹکائے بیٹھا تھا تو چچی نے وہ بات یاد کی اور مجھ سے کہا کہ اگر تم گل زادے سے بیاہ کرنا چاہتے ہو تو ایک شرط ہے کہ اس کے دین میں آ جاؤ۔

میں عمر کے اسی موسم بدلتے دیکھ چکا ہوں، ہر نماز میں اپنے بالخیر خاتمے کی دعا کرتا ہوں، جھوٹ نہیں بولوں گا۔ میں نے دینِ مبین اختیار کرتے ہوئے اس وقت ان فضائل اور برکات پر زیادہ غور نہیں کیا تھا کہ جن سے میرے مولا نے مجھے بہر حال بہرہ مند فرمایا۔ یوں سمجھو کہ بس مجھے تو اپنی شادی کی جلدی تھی۔

مگر کیا خیر کی طرف آنے کے ایک سے زیادہ راستے نہیں ہیں؟
میرا نام منیر قاسم علی رکھا گیا۔ گل زادے میری بیوی بن گئی۔ مگر ابھی تو اس نیک
بخت کو میری مصیبتوں کا شریک ہونا تھا۔

میری شادی کو آٹھ دن ہوئے ہوں گے کہ آقائے ولی نعمت خضر خان کو گرفتار کر لیا
گیا۔ میں چچا کے گھر آیا ہوا تھا، ورنہ معتب و لی عہد کے جملہ خدمت گاروں کے ساتھ مجھے بھی
بندی خانے میں ڈال دیا جاتا۔ جب تک قصر ہزار ستون سے خاصے کے لشکری دوسروں کی اور
میری تلاش میں شہر کا رخ کرتے، میں چچا کا گھر اور گل زادے کو چھوڑ کر روپوش ہو چکا تھا۔

ملک نائب کا فور ہزار دیناری نے سلطان کے سامنے چند گردن زدنی، حرام خور
غلاموں کی جھوٹی گواہیاں گزاری تھیں اور بیمار ذہن بادشاہ کو یقین دلایا تھا کہ دونوں شہزادے،
ان کی ماں، سلطان کا بھائی اور دوسرے اقربا سلطان کو ختم کرنا چاہتے ہیں۔

خضر خان کے ساتھ چھوٹے شہزادے شادی خان کو گوالیار کے قلعے میں قید کیا گیا۔
ان کی ماں ملکہ جہاں، محل سے نکلوا کر پرانی دلی میں نظر بند کر دی گئیں۔ سلطان کا بھائی الغ
خان، جو ولی عہد کا خالو بھی تھا، گجرات سے آیا ہوا تھا۔ کافور نے بادشاہ سے اس کی موت کا فرمان
حاصل کیا اور اس بے دریغ سالار، بے مثل شمشیر زن کو، جو اس کے ارادوں میں مزاحم ہو سکتا تھا،
ختم کر دیا۔ الغ خان کا ایک بھائی جالور کا حاکم تھا۔ کافور نے سید کمال الدین کرک کو بادشاہ کے حکم
کے ساتھ جالور روانہ کیا اور الغ خان کا بھائی، نظام الدین اپنی مسند پر ہی قتل کر دیا گیا۔

ملک میں انتشار پھیل گیا تھا۔ بہت سے سوئے ہوئے ہنگامے جاگ اٹھے۔ گجرات
کی فوج نے علم بغاوت بلند کر دیا۔ کافور نے سلطان کو مشورہ دیا کہ سید کمال الدین کرک کو
بغاوت فرو کرنے گجرات بھیجا جائے۔ کرک کے گجرات پہنچنے پر الغ خان کے طرفداروں
نے اسے پکڑ کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔

جیت پور کے حاکم نے بغاوت کی۔ شاہی ملازموں کے ہاتھ پاؤں باندھ کر انھیں
قلعے کے حصار سے نیچے پھینک دیا۔ دکن میں ہر پال دیو نے ہنگامہ کھڑا کر دیا۔ شاہی تھانوں کی
عمارتیں ڈھا دیں۔

ادھر مرکز میں ملک نائب کافور ہزار دیناری کے تحت دہلی تک پہنچنے کی راہ ہموار
ہوتی جا رہی تھی۔

اور میں، رگھوپانچ دیناری، اپنی آٹھ سالہ تربیت کے بل پر، کافور ملک نائب کی طرف قدم قدم بڑھ رہا تھا۔ میرے سفید فام استاد نے کہا تھا، ”اپنے شکار کی طرف ایسے بڑھو جیسے چیتا بڑھتا ہے کہ اس کے پاؤں تلے سوکھا پتہ بھی آواز نہیں کرتا۔“

میں دارالحکومت دہلی ہی میں تھا جو خبر ملی کہ سلطان خلجی علاء الدین اللہ کو پیارا ہو گیا۔ کہنے والوں نے دکانوں، سراپوں، نان بائی کے ٹھیوں اور بیٹھکوں، ڈیوڑھیوں تک میں کہنا شروع کر دیا تھا کہ اس منظورِ نظر دینار زادے، اجلی چمڑی سبز آنکھوں والے غلام، کافور سپنویلیے نے بادشاہ کو اپنے ہاتھ سے زہر دیا ہے۔

بادشاہ کے انتقال کے دوسرے روز ملک نائب نے امرا اور اراکینِ سلطنت کو جمع کیا اور بادشاہ کا وصیت نامہ پڑھ کر سنایا جو کچھ اس طرح تھا کہ میں بڑے بیٹے ملک خضر خان کو اپنی ولی عہدی سے معزول کرتا ہوں اور اس کی جگہ اپنے چھوٹے بیٹے شہاب الدین عمر کو جانشین مقرر کرتا ہوں۔

شہاب الدین عمر، نیا سلطان، اس وقت سات برس کا تھا۔ ملک نائب کافور نے شہاب الدین عمر کو تختِ دہلی پر بٹھایا اور خود نائب السلطنت بن کر برابر کے تخت پر جا بیٹھا۔ جلوس کے پہلے ہی دن کافور نے ملک اختیار الدین سنبل کو گوالیار بھیجا تا کہ وہ خضر خان اور شادی خان کی آنکھوں میں گرم سلائیاں پھیر دے۔ کہتے ہیں کہ میرا آقا خضر خان یہ حکم سن کر آنکھوں میں آنسو بھر لایا اور مرنے کے لیے تیار ہو گیا۔

ملک نائب کے حکم سے ملکہ جہاں کو قید میں ڈال دیا گیا۔ پھر ملک نائب کافور نے کم سن بادشاہ کی ماں سے نکاح کر لیا۔ تاہم اس کا مقدر اس کے گرد ریشم کا جال بن رہا تھا۔

علاء الدین کا ایک بیٹا شہزادہ مبارک خان ملک نائب کے لیے آخری رکاوٹ رہ گیا تھا۔ وہ اسے ختم کرنا یا اندھا کر دینا چاہتا تھا۔

میں نے قصرِ دربار میں داخل ہونے سے پہلے ملک کافور کے روز کے معمولات معلوم کر لیے؛ پتا چلا کہ وہ ہر روز تھوڑی دیر کے لیے کم سن بادشاہ کو محل سے قصرِ ہزارستون کے بام پر لاتا اور تختِ شاہی پر بٹھاتا ہے اور امرا اور ارکانِ دولت کو حکم دیتا ہے کہ صف در صف ہاتھ

باندھے ہوئے سلطان کے سامنے کھڑے رہیں۔ دربار ختم ہو جاتا ہے تو ملک نائب ننھے سلطان کو اندر محل میں اس کی ماں کے پاس بھجوا دیتا ہے اور خود اپنے خیمے میں، جو قصر ہزارستون کے بام پر نصب کیا گیا تھا، خواجہ سراؤں کے ساتھ چوسر کھیلنے میں لگ جاتا ہے۔ مجھے، منیر قاسم علی رگھوبا کو اپنے شکار تک پہنچنے کے لیے خواجہ سراؤں تک پہنچنا، ان میں گھل مل جانا ضروری تھا۔

اُس کے نصیب کھوٹے تھے جو ملک نائب کا فور سے چوک ہو گئی۔ وہ مرحوم سلطان کے لیے بے حیثیت لوگوں کی محبت کو اعتنا کے قابل نہیں سمجھتا تھا۔ اس نے ہزارستون کی حفاظت پر متعین خواجہ سراؤں کو شہزادہ مبارک خان کی مجلس میں بھیجا تا کہ وہ شہزادے کو قتل کر دیں۔ شہزادے نے جب اپنے گلے سے جڑاؤ گلوبند اتار کر انھیں دیا اور اپنے مرحوم باپ کی مہربانیاں انھیں یاد دلائیں تو خواجہ سرا نادام ہوئے اور اپنے ارادے سے باز آ گئے؛ جیسے گئے تھے ویسے ہی لوٹ آئے۔ واپس آ کر انھوں نے اپنے سرداروں بشیر اور مبشر سے سارا قصہ کہا اور مبارک خان کا گلوبند حوالے کر دیا۔

اور یہاں بشیر خواجہ سرا سے میرے ایک دوست، صالح زرگر کی ملاقاتیں کام آ گئیں۔ خواجہ سراؤں کے سردار بشیر اور مبشر نے خفت اور شراب کے نشے میں صالح زرگر سے شہزادے مبارک خان کی ابتلا بیان کی، اس کا گلوبند دکھایا۔ کہنے لگے، ”کاش اس کافور کو کوئی ختم کر دے...“ اس کے بعد صالح کی چرب زبانی نے ناممکن کو ممکن بنا دیا۔

خواجہ سراؤں نے مجھے اور صالح کو چوری چھپے قصر ہزارستون میں پہنچانے کا انتظام کر دیا۔ صالح زیورات کا پشتارہ لے کر اور میں زرگر کی عورت بن کر حرم سرا میں پہنچے اور وہاں سے قصر ہزارستون میں آچھپے۔

رات گہری ہو گئی اور نیا دن نکلنے میں چند ساعتیں رہ گئیں تو بشیر، مبشر، صالح اور میں قصر ہزارستون کے بام پر نصب ملک نائب کا فور ہزار دیناری کے خیمے میں گھس گئے۔ صالح نے اسے جگا کر فرد جرم سنائی اور میں نے اُس نازنین گلے پر ایک ہی بار میں اپنا خنجر پھیر دیا۔

ایک بادشاہ کو دیوانہ بنانے والی کافور غلام کی سبز آنکھیں، دہشت اور بے اعتباری میں پھیل کر زمرہ کے دائرے بن گئی تھیں۔

مجھے اپنے آقا کی سیاہ عقاب آنکھیں یاد آئیں جنہیں اس ہزار دیناری کے حکم سے

بے نور کر دیا گیا تھا۔

جس دن ملک کا فورنائب ہند میرے ہاتھوں مارا گیا خلجی علاء الدین سلطان کو گزرے پینتیس روز ہوئے تھے۔ فجر کی اذان سے پہلے صالح نے اور میں نے دلی چھوڑ دی۔ ملتان ہماری منزل تھی اور یہاں میں نے دلی کے دوبارہ حواسوں میں آنے تک قیام کا ارادہ کیا تھا۔

میں غازی شہید کے بیٹے، ملک خیر الدین جو نا خان کا خادم خاص مقرر ہوا۔ وہاں سے پھر میرا نکلنا نہ ہو سکا۔ خیر خواہوں نے گل زادے کو بھی ملتان بھیج دیا تھا۔

دلی سے مدتوں بعد جو خبریں ملیں وہ بڑی عبرت آثاں اور دل ہلا دینے والی تھیں۔

شہزادہ مبارک خان کو آزادی ملی۔ اس نے دو ماہ تک تو اپنے چھوٹے بھائی شہاب الدین عمر کی نیابت کی، پھر اس کی آنکھوں میں گرم سلاخیاں پھروا کر اسے بھی قلعہ گوالیار میں قید کر دیا۔ وہ خود سلطان قطب الدین مبارک شاہ کے نام سے تختِ دہلی پر بیٹھا۔ حکم دیا کہ ستر ہزار قیدیوں کو رہا کیا جائے۔ پھر سنا کہ مبارک شاہ سلطانِ دہلی نے برادھو قوم کے کسی نو مسلم حسن خان کو خسرو خان کا خطاب دے کر بڑے اعزازات سے نوازا ہے۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ یہ کہیں اپنا کسم چند حسن خان تو نہیں ہے؟ میرا اپنا بھائی؟! پتا چلا یہ شخص کبھی عورتوں کے لباس میں اور زیور پہن کر دربار میں آجاتا ہے اور بڑی عمر کے آزمودہ سالاروں اور عالموں سے ٹھٹھول کرتا ہے اور اس طرح سلطان مبارک شاہ کا دل بہلاتا ہے۔ سلطان خود بھی عورتوں کا زیور پہنے دربار میں چلا آتا ہے۔ مے نوشی درباری مشاغل میں سے ایک مشغلہ ہے۔ خسرو خان، وہ نو مسلم برادھو، سلطان کے مزاج میں اتنا دخیل ہو گیا ہے کہ اس کے ہم قوم جب چاہتے ہیں سلطان وقت کی روبکاری میں منہ اٹھائے چلے آتے ہیں۔ شاہی محل میں اربابِ نشاط اور بازاری عورتیں آنے جانے لگی ہیں جو برسرِ دربار چوڑ کھول کے تھرکتی ہیں۔ پھر خبر ملی کہ سلطان نے قلعہ گوالیار میں اسیر اپنے تینوں اندھے بھائیوں؛ شہاب الدین عمر، شہزادہ شادی خان اور میرے آقا خضر خان کو قتل کر دیا ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔

پھر خسرو خان کے بھائی حسام الدین کے گجرات کا حکم بننے کی خبریں ملیں۔ شاہی خبر رساں ملتان اور دیپال پور تک آئے۔ وہ برادھو قوم کے ایک یتیم لڑکے رگھوبا کو تلاش کرتے آئے تھے کہ یہ رگھوبا اب مسلمان ہو گیا ہے اور ملک خسرو خان عماد الملک اور ملک حسام الدین امیر گجرات کا سگا چھوٹا بھائی ہے۔

میں نے اپنے مرشد حضرات خواجہ ابوالفتح رکن الدین مدظلہ سے رجوع کیا۔ پوچھا کہ مرشدی و مولائی! کیا کروں؟ میرے وہ بھائی مجھے تلاش کرتے ہیں۔ ارشاد ہوا کہ تو دین دار ہے، وہ برادرانِ یوسف ہیں اور وہ فاسق ہیں۔ تو غازی شہید کی مسجد کے مخفی حجرے میں رہا کر۔ کبھی کبھار اپنے عیال سے ملنے باہر آ جایا کرنا۔

سو مرشد کے حکم کی تعمیل میں آج پچپن برس سے یہیں رہتا ہوں۔ گل زادے کھانا پانی پہنچا دیتی ہے۔ مرشد میرے وصال کر گئے۔ اگر حکم کر دیتے کہ انسانوں میں چل پھروں، سب سے معاملت رکھوں، تو اسی طرح تعمیل کرتا۔ تاہم ہفتے میں ایک دو روز گل زادے اور اس کے بچوں اور بچوں کے بچوں سے ملنے کو صحنِ مسجد میں نکلتا ہوں۔ مگر باہر مجھے سکون نہیں۔ پہلے بھی جب نکلتا تھا بری خبریں سننے کو ملتی تھیں۔ خبر ملی کہ برادھو بچے خسرو خان نے اپنے محسن اور آقا قطب الدین مبارک شاہ خلجی کو بالوں سے پکڑ کر گرایا اور اس کا سر قلم کر دیا اور خبر ملی کہ اب وہ خود سلطان ناصر الدین خسرو کے لقب سے تخت پر بیٹھا ہے اور اس نے اپنے بھائی حسام الدین سیارام برادھو کو خانِ خاناں کا خطاب، چتر لعل اور دور باش عطا کیا ہے۔

انھی دنوں میں ملتان اور دیپال پور میں شاہی مخبروں کی ریل پیل ہو گئی۔ وہ نو مسلم منیر قاسم علی کو تلاش کر کے اسے عزت و احترام سے اس کے بھائی ناصر الدین خسرو سلطان دہلی کے پاس لے جانے آئے تھے۔ وہ منیر کی تعریف میں رطب اللسان تھے۔ کہتے تھے منیر تو سلطان خسرو کا اپنا بھائی اور محسن ہے، اس نے ملک کا فور کو ہلاک کر کے بھائی کے لیے تختِ دہلی تک پہنچنے کی راہ ہموار کی ہے۔

اے سبحان اللہ! کیا محسن اور کیسا احسان!

صد شکر کہ میرے ہادی میرے مرشد نے بروقت مجھے صلاح دی تھی۔ فرمایا تھا کہ اپنی اصل سے تو چوڑی ساز ہے اور آہن گروں، نجاروں، چوڑی سازوں کے ہاتھ جو بھی بناتے ہیں اپنی زیبائی میں وہ سلطنتوں سے بڑھ کر ہیں۔ اس طرح میرے مرشد نے اس آزار سے کہ جسے جاہ و حشمت طلبی کہا جاتا ہے، مجھے دور رکھا تھا۔

تو اب میں، پنج دیناری غلام، اپنا بلاوا آنے تک اس مخفی حجرے میں بیٹھا ہوں اور بے مثل و نگیاں، چوڑیاں، لاکھ کے کڑے بنائے جاتا ہوں، بنائے جاتا ہوں، اور جانے کو تیار ہوں۔



اک میٹھے دن کا انت

وقت لوگوں کو بدل سکتا ہے... بدل دیتا ہے۔
اس نے میری کہانی کے لوگوں کو، جنہیں میں سن ساٹھ سے جانتا ہوں، ویسا نہ رہنے
دیا جیسا میں انہیں جانتا تھا... بدل کے رکھ دیا، یا انہیں مار دیا، یا ختم کر دیا۔
اور جنہیں مار دیا گیا پھر ان کا بدلنا کیسا؟
وقت جنہیں مار دیتا ہے انہیں بالکل ویسے ہی، جیسے کہ وہ تھے، ایک ہمیشگی میں لٹکائے
رکھتا ہے... کسی بھی طرح بدلے بغیر، ایک ٹھس کہانی کار کی طرح انہیں لکھ کے بھول جاتا ہے۔
بالکل ایسا ہی کرتا ہے وقت۔
اور وہ مارنے کے علاوہ ختم بھی کر دیتا ہے۔ سمجھو متروک کر دیتا ہے سسرا۔ جیسے اس
نے مصباح الدین اشک لائل پوری، سابق ہیڈ کو پیسٹ ریڈیو پاکستان کو متروک کر دیا۔ یعنی
وہ اشک لائل پوری زندہ تو ہے مگر رواں زندگی سے (اور میری کہانی سے بھی) وہ ختم ہو چکا۔
اس کا بیٹا، جسے گانے بجانے والیاں اپنے کوٹھوں پر اردو فارسی ٹیوشن دینے بلایا کرتی تھیں اور
جسے وہ ”مرا مردار ماشٹر“ کر کے یاد کرتی تھیں، بے شک زندہ ہے۔ وہ ان دنوں پرچون کی
دکان پر بھی بیٹھتا ہے مگر ختم ہو چکا وہ۔
جانی خاں سارنگی نواز بھی گیا۔ اتنا رعبہ ہے اس کے ہاتھوں میں کہ سارنگی کو تو جیسے

تیسے اپنی چھاتی کی ٹیک دے کے تھام سکتا ہے جانی خاں، لیکن اس سے گز نہیں سنبھالا جاتا، وہ ہاتھ مسلسل کانپتا رہتا ہے۔ کہ راراراروں راراری ری راراری ری ری روں۔ اسی لیے جب اکادمی والوں نے اس کی سارنگی پانچ ہزار میں خریدنے کی آفر کی تو جانی خاں کے بیٹے نے ہاں کر دی۔ جانی خاں دو دن تک روتا رہا۔ مگر کیا ہو سکتا تھا۔ انھوں نے اکادمی کے ہال میں شیشے کے ایک بڑے شوکیس میں وہ سارنگی رکھوا دی ہے (شیشے والے کو شوکیس کے دس ہزار روپے دیے گئے)۔

اب جانی خاں اپنے پوتے سے کہتا رہتا ہے، خوشامد کرتا ہے کہ کسی روز مجھے ویگن میں بٹھا کے لے چلنا بیٹا! مجھے صدر لے کے چل۔ دیکھ کے تو آؤں ان سالوں نے کیا کیا ہے میری سارنگی کا۔

مگر ان سالوں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ تو وقت تھا جو اس عرض البلد طول البلد سے سنسناتا ہوا گزرا اور جس نے جانی خاں سارنگی نواز کی سارنگی کو وہاں پہنچا دیا جہاں وہ اب ہے۔ اور بے بی نگی نا کو اس نے بیگم دُر شہوار نصیر بنا دیا۔۔۔ وقت نے۔ وہ اب نصیر اللہ طرے وال کی بیگم ہے۔ ڈیفنس ہاؤسنگ اتھارٹی میں اس کی ڈیوڑھی پر دو دو پاجیر و کھڑی جھومتی ہیں۔

وقت نے رانی کو بدل دیا۔ اس کا نام تک بدل دیا۔ وہ اب ماریہ ڈی سوزا ہے۔ امریکی ریاست اوہائیو میں رہتی ہے رانی اور اس نے خانم مالیر کو ٹلے والی کو، کہ جس کے ڈیرے پر بے بی نگی نا نے آنکھ کھولی تھی، معدوم اور فراموش کر دیا۔

اور اس نے کام والے لمڈے رفیق (فی کے) کورنی جرمن بنا دیا جو کہیں کا سیکٹر انچارج تھا اور پولیس مقابلے میں مارا گیا۔ اس کی لاش کے پاس سے ایک ٹی ٹی ملی۔

میری کہانی میں سکٹا رفیق کام والا، خانم مالیر کو ٹلے والی کے فلیٹ پر سویرے ہی سویرے آ جایا کرتا تھا۔ گیارہ بارہ برس کا فتنہ گر لمڈا، چپڑ چپڑ باتیں بناتا ہوا۔ سارے دن دوڑ دوڑ کے سب رنڈیوں کے اورنگی نا بے بی کے کام کرتا ہوا۔ سچا گورکن کا فرزندِ ارجمند، اس کی آنکھ کا تارا، رنی جرمن، سابق سیکٹر انچارج۔

تو وقت نے... جنھیں میں جانتا ہوں انھیں بدل کے رکھ دیا، وقت نے... یا مار دیا... یا ختم کر دیا۔

اب بس یہ ہے کہ میں انھیں ری کال کر سکتا ہوں۔ اپنی کہانی میں کہیں سے تلاش کر کے لاسکتا ہوں۔ لمڈے رفیق فی کے کو، بے بی نگنی نا کو، خانم مالیر کو ٹلے والی کو، جسے سب دڈی کہتے تھے، جس کے بالا خانے پہ وہ سب جماؤ رہتا تھا۔

سواب میں اس وقت کوری کال کرتا ہوں، اپنی کہانی میں:
اور میں آواز سے شروع کرتا ہوں... پانی گرنے کی آواز سے۔
کہیں نل کھلا ہوا ہے۔

پانی گرنے کی مسلسل آواز سے نگنی کی نیند میں دراڑیں پڑنے لگیں۔ وہ ابھی اور سونا چاہتی ہے۔ شاید کوئی اچھا خواب دیکھ رہی ہے نگینہ۔

اس نے خواب سے چمٹے رہنے کی ایک آخری کوشش میں چادر کھینچ لی۔ کانوں کو اچھی طرح ڈھکنے کے لیے ہاتھ چلایا تو ہاتھ میز سے ٹکرا گیا۔ ٹائم پیس لڑھک گئی اور الارم بے وقت بجنے لگا۔

نگنی کو لگا اس کا خواب جیسے بالکل ہی ٹوٹ پھوٹ گیا ہے اور کھلے ہوئے نل کے قریب کہیں جا پڑا ہے۔

”دھت تیری تو!“ یہ کام والے لڑکے کی آواز تھی۔ شاید صابن اس کے ہاتھ سے پھسل کے پھر نالی میں بہہ گیا تھا۔

نگنی کو صبح ہی صبح اس لڑکے کی آواز بری لگتی تھی۔ لیکن اکثر صبح ہی صبح اسے یہ آواز سننی پڑتی تھی۔

لڑکا دڈی کے سنانے کو اونچی آواز میں بڑبڑانے لگا۔ وہ اپنی صفائی پیش کر رہا تھا۔ کہنے لگا، ”کتی دفعے بولا ہے کہ جالی لغوالو، جالی لغوالو... کوئی سنتا ہی نہیں ہے۔“

”ارے کیا پھر صابن سٹ دیا نالی میں؟“ یہ دڈی کی آواز تھی۔

”کیا کروں چھوٹ گیا نا... کتے دن سے کہہ ریاؤں نالی میں جالی لغوالو۔ کوئی سنتا ہی نہیں ہے۔“

”اے کم بختا! ہاتھوں میں جان ہی نہیں ہے۔ نکان پہ نکان کیے جاتا ہے۔ میں کہتی ہوں بندہ بن جا، نہیں میں ٹھڈے مار کے نکلوا دینا ہے کسی دن۔“

دڈی شروع ہی سے ٹھڈے مار کے نکلوا دینے کی دھمکی دے رہی تھی مگر نہ تو لمڈا

بندہ بنتا تھا اور نہ ہی دڈی ٹھڈے مار کے نکلوا دینے کا اپنا وعدہ پورا کرتی تھی... سب کچھ اسی طرح چل رہا تھا، بلکہ اب تو وہ کچھ ڈھیٹ بھی ہوتا جا رہا تھا۔ ٹھڈوں کا سن کے منہ سے ٹخ کی آواز نکالتا تھا۔

اس وقت بھی لڑکے نے ٹخ کی آواز نکالی۔

نگی نے آخر کار ان بھڈی آوازوں سے سمجھوتا کر لیا۔ چادر پھینک، وہ بستر پہ اٹھ کے بیٹھ گئی۔ ایسی چیخ چیخ میں بھلا کون سو سکتا تھا۔

دڈی نے بستر پہ سایہ سا ابھرتا دیکھا تو اپنا چشمہ ٹھیک سے فوکس کیا۔ دیکھا کہ نگی جاگ اٹھی ہے اور نیند میں بیٹھی جھوم رہی ہے۔ دڈی نے ایک ہی سانس میں پھٹکارنا اور چپکارنا شروع کر دیا۔

”بدبختا نہیں تو! اٹھا دیا نا چیخ چیخ کر کے... خبرے کس دخت سوئی تھی میری نگی نا...“

سوں جا جان! سوں جا میرے نگی نے۔ ہے بھلا، سوں جا!“

نگی نیند بھری آواز میں بولی، ”اب کیا سونا؟ گیارہ بج گئے۔ ساڑھے گیارہ کا تو ویسے ہی الارم لگا ہے۔“

لمڈا غسل خانے سے پکارا، ”دینخا؟ میری اداج سے نہیں اٹھی ہے نغینہ بے بی۔“

ایلا رم سے اٹھی ہے۔ آپ بلا وجہ میرے کو الجام دے رہی ہو، دڈی جی صاب!“

لمڈے نے بڑی خوشامد سے لہرا کے دڈی جی صاب کہا تھا اور اس بات سے دڈی اور تپ گئی تھی۔

”رحامد! بک بک کیے جاتا ہے بدبختا!... سوں جا نگی نے، الارم شلارم چھوڑ۔“

میں آپی اٹھا دیاں گی کھانے کے دخت۔“

نگی ٹانگیں لٹکائے بیٹھی ذرا سا جھک کے پلنگ کے پائنتی اپنے سلپر تلاش کر رہی

تھی۔ بولی، ”بارہ بجے ماسٹر آجائیں گے۔“

دڈی نے، جو بالکنی میں آرام کرسی پہ ڈھیر ہوئی پڑی تھی، ذرا سا اٹھتے ہوئے

کمرے میں جھانکا۔ چشمہ سنبھالتے ہوئے وہ نظروں ہی نظروں میں نگی کے سلپر تلاش کرنے

لگی تھی۔ اتنے میں نگی کو سلپر مل گئے۔ وہ ڈھیلے پن سے آدھے پورے پیر ڈالے فرش کے

ٹانگوں کو اپنے سلپروں سے تھپکتی کمرے سے نکل گئی۔

”جی تو اٹھ ہی گئی ہے۔ اب لمڈے سے منہ ماری کرنے کا فائدہ؟ ددی نے اپنی آواز میں صلح کا سفید جھنڈا لہراتے ہوئے کہا، ”نل کا پیچھا چھوڑ دے پتر۔ ادھر، آ، چار آنے کی جلیبی لا دے نیچے سے۔ وہ تھوڑا کچھ کھالے گی۔ نہیں اس نے خالی پیٹ ہی اس مرے ماسٹر کے ساتھ گٹ پٹ کرنے بیٹھ جانا ہے۔“

”کوئی فائدہ نہیں،“ لمڈا غسل خانے سے پکارا، ”کوئی بھی فائدہ نہیں۔ نغینہ بے بی زلے بی کو ہاتھ بھی نہیں لغائے گی۔ ددی جی! مزبور ہو کے، آئی سمر میں، مزبور ہو کے مجھے ہی کھانا پڑے گی سب زلے بی۔“

ددی کبھی کبھی لمڈے کی شرارتی باتوں سے لطف بھی لیتی تھی۔ بولی، ”رحامدا! باتیں تو دیکھو کیسی بناتا ہے... اچھا سن۔ جلیبی رہنے دے۔ دو آنے کے پاپے، ایک چھوٹی ٹکیا مکھن کی لے کے آ... جا میرا بچہ! شاباش!“

”ابھی لایا ددی جی صاب!... ابھی لایا۔“ لمڈا آخر غسل خانے سے نکل آیا۔

کالا سا مرگھلا چپک روٹ کا اپنی چلت پھرت سے آگ کا بجھا لگتا تھا۔ سوکھا سڑا ضرور تھا، پر کسی طرف سے بھی بیمار نہیں دکھتا تھا۔ لیکن اس کا باپ کہتا تھا اسے دے کا مرض ہے اس لیے، ”مغرب کے ٹیم اس کی چھٹی جروری ہے۔“ آندھی آئے یا طوفان، وہ مغرب سے کچھ پہلے ہی فلیٹ کے نیچے آ کے آواز لگا دیتا تھا کہ، ”چل بے لمڈے۔“ لمڈا جواب میں بہت آہستہ سے ”آیا ابا“ کہہ کے ہاتھ کا کام سمیٹنے لگتا تھا۔ سب نے اسے کہہ رکھا تھا کہ اوپر فلیٹ سے چیننے پکارنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ددی جانتی تھی کہ لمڈے کے باوانے دے کا خاندانی مرض صرف اس لیے ایجاد کیا ہے کہ وہ کسی بھی حالت میں مغرب کے بعد لڑکے کو فلیٹ پہ چھوڑنا نہیں چاہتا۔ بات ٹھیک بھی تھی۔ گیارہ بارہ برس کے لڑکے کورات میں یہاں چھوڑنا صحیح نہیں تھا۔

ددی اورنگی کے سوا سبھی کو اس کا جلدی چلے جانا کھلتا تھا، لیکن مجبوری تھی۔ لمڈا کام کا ہشیار تھا۔ ہشیار نہ بھی ہوتا تو یہی بہت تھا کہ ٹکا ہوا تھا۔ اس کے ساتھ گزارا تو کرنا ہی پڑتا۔ کوئی کام والی ماسی، بوا، ملازمہ ادھر آنے پہ راضی نہیں ہوتی تھی۔ پہلے جو کئی خانسامے رکھے گئے تھے وہ چور، بدتمیز، بکواسی یا نظر باز قسم کے تھے، ان کے ساتھ گزارہ نہیں ہو سکتا تھا۔ رات میں کام دھام کے لیے... اور ظاہر ہے رات ہی میں کام والے کی زیادہ

ضرورت پڑتی تھی... مالا باری ہوٹل کا ایک باہر والا آ جایا کرتا تھا۔ روز کے چار پانچ روپے کوئی کم نہیں ہوتے۔ باہر والا بڑی خوشی سے بارہ ایک بجے تک سیڑھیاں چڑھتا اترتا رہتا تھا۔ ہوٹل میں بھی یہی رش کا اصل وقت ہوتا لیکن مالا باری ددئی کو خوش رکھنا چاہتا تھا اس لیے اس ایک باہر والے کے بغیر کام چلا لیتا تھا۔

لمڈا اب بازار سے لوٹے ہوئے پر شور انداز میں کوئی فلمی گیت گاتا ہوا سیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ نگی اس وقت تک غسل خانے میں گھس کے دروازہ بند کر چکی تھی۔

لمڈے نے غسل خانے سے پانی گرنے اور نگی کے گنگنانے کی آواز آتی سنی تو فلمی گیت بند کر دیا۔ مکھن پاپے ددئی کے حوالے کر کے مصنوعی کاہلی کے ساتھ دیوار سے ٹیک لگا کے کھڑا ہو گیا اور نگی کے بول سنتا ہوا سر ہلانے اور تال دینے لگا۔

”باٹ چلت نئی چنری رنگ ڈاری رے، کیسورے بنواری... بنے واری۔“

اب وہ بھی ساتھ ساتھ منہ ہی منہ میں بول رہا تھا:

”کیسورے برج واسی، لالت بنواری، کے سورے... کیسورے بانے واری،

بانے وا... کیسورے... کے سورے... بنواری۔“

ددئی نے اسے گھور کے دیکھا اور چپ ہونے کا اشارہ کیا۔ لمڈا چپ ہو گیا مگر وہ بائیں ہتھیلی سامنے کیے اس پر دائیں ہاتھ سے برابر بے آواز تال دیے جارہا تھا۔ ددئی نے دیکھا سم پر اس کا ہاتھ ٹھیک پڑ رہا تھا... ایک الٹا ایک سیدھا... الٹا سیدھا، الٹا سیدھا... ”خدا کی شان ہے،“ ددئی نے سوچا۔ ”گورکن کا بیٹا اور سرتال کا ایسا رسیا۔“

”کیسورے بنواری...“ سر پہ پانی ڈالتے ہوئے بھی نگی نے یہ جگہ اچھی طرح کہی

تھی۔ ددئی لمڈے کے بارے میں سوچنا چھوڑ اپنے ’نگی نے‘ کی آواز سنتی رہی۔

”کیسورے... کے اے سورے... کیسورے بنواری... بانے واری۔“ ڈھائی

مینے پہلے جب نیا راگ سیکھنے بیٹھی تھی تو یہ جگہ کہتے ہوئے کیسے گھبراتی تھی نگینہ، مگر خان صاحب نے بڑے پیار سے، ددئی نے بہت لاڈ سے سمجھایا تھا کہ بیٹا جی، محنت کی لیلا ہے سب۔ محنت نہیں کروگی، جان نہیں ماروگی تو کچھ بھی نہیں ہو پائے گا۔

”کیسورے بنواری...“ اب کتنا صاف سبج کہنے لگی ہے۔ استاد نے پہلے ہی دن

کہہ دیا تھا کہ مولا اپنا کرم رکھے، آواز کی کوالٹی بہت بہتر ہے۔ اب سارا کچھ ٹے کا محنت اور

ریاض اور جان ماری پہ ہے۔ جان مارے گی، دل لگا کے یاد کرے گی، گھوٹے گی تو کچھ بن جائے گی۔ نہیں تو ایسی ہزار پڑی ہیں، مولا اپنا کرم رکھے، جو چوکی سے گریں تو بستر پہ اور بستر سے خوار ہو در یوں چٹائیوں پہ جا پڑیں۔ مولا اپنا کرم ہی رکھے۔

دڈی نے بھی ٹھنڈی سانس بھری تھی، ”ہا آج ہے! کنجری کی شوبھا اور ساون کی دھوپ۔ ادھر آئی ادھر گئی۔ ڈیرے دارنی کو گشتی نکلیائی بنتے کوئی دیر نہیں لگتی۔ ہاں کلا کر تو یہ کی بات دکھری ہے۔“

دڈی یہیں تک سوچ پائی تھی کہ دھڑ سے کسی کمرے کا دروازہ کھلا اور جمیلہ شور شرابا کرتی لاؤنج میں آگئی۔ پھر اس نے جماہی لی اور گانے لگی، ”انھیں تم جگانے کی کوشش نہ کرنا... کو... شش نہ کرنا۔“

نگی کے لیے آواز کی ایک چہزی جیسے ایک ہی جھٹکے میں تارتار ہوگئی۔
دڈی کو بھی جمیلہ کا اس طرح شور مچاتے چلے آنا اچھا نہ لگا، وہ اسے گھورنے لگی۔
جمیلہ نے برا سا منہ بنا کے غسل خانے کے بند دروازے کو دیکھا اور بولی، ”ہاں دڈی جی! ہاتھ روم میں تمھاری اختری بائی فیضا بادی گھسی ہوگی؟ آں دڈی!“
دڈی بھنا کے رہ گئی، لیکن مصلحت میں پیار سے بولی، ”دیکھ جمیلہ! سویرے ہی سویرے چکس کیوں کرتی ہے؟... اور جان! بڑے لوگوں کے نام اس طرح مخول میں نہیں لیتے ہوتے... سنا؟“

”کون بڑے لوگ؟“ جمیلہ قد آدم آئینے کے سامنے آکھڑی ہوئی اور بن بن کے پوچھنے لگی کہ، ”بڑے لوگ کون، دڈی جی؟“

”دُر فٹے منہ! کیسا کیسا سمجھایا ہے کہ ایسے نہیں بولا کرتے۔ بڑے بوڑھوں، گنی نایکوں کی عزت نہیں کرے گی تو گلے میں سر کی جگہ ٹھیکرے بجیں گے۔ وہ کیا کہتے ہیں بے ادب بے نصیب... ادھر آ، یہ لے گلاس... ابھی کلی کر لے، چھینٹا مار لے۔ آرام سے نہا لینے دے اسے۔ ایویں میرے سے منہ ماری نہیں کر۔“

جمیلہ آئینے کے سامنے سے ہٹ کے دھپ سے نگی کے بستر پر آ بیٹھی اور ٹانگیں ہلانے لگی۔ پھر اس نے ایک اور جماہی لی، اشارے سے لمڈے کو پاس بلایا۔
جمیلہ سے لمڈا زیادہ خوش نہیں تھا۔ بے وجہ وہ اسے ستاتی رہتی تھی۔ پھر نگینہ سے

بات بات پہ پزنگا لیتی تھی، تو لمڈے کی خفگی کی ایک وجہ یہ بھی تھی۔ لیکن اسے دوائی چوٹی کا آسرا رہتا تھا... اور آنے چار آنے کی قیمت وہ خوب جانتا تھا... اس لیے جمیلہ کے کام دوڑ دوڑ کے کر دیتا تھا۔

جمیلہ نے گریبان میں ہاتھ ڈال کے پانچ کا ایک نوٹ نکالا اور لمڈے کی طرف بڑھا دیا، ”لے بے! ایک پاکٹ قینچی کا، ایک مسکہ بن، دواپسی شل چائے... کیوں ددی؟ چائے چلے گی نا؟... نہیں؟ چلو خیر ہے۔ بس ایک اپسی شل لے آ بے... اور ہاں، اوئے رفیکے شفیکے! آسپرو کی دو ٹکیہ بھی۔ سمجھا؟ چل جھپاٹے سے جا، جھپاٹے سے آ... آگیا؟... اے تو تو ادھری کھڑا ہے ابھی تک؟“

لمڈا جمیلہ کی اے بے تے پسند نہیں کرتا تھا۔ کبھی کبھی تو وہ بالکل بے قابو ہو جاتی اور مردوں والی گالیاں نکالتی تھی۔ اس کی یہ بات اور سگریٹیں ددی کو بھی بری لگتی تھیں۔ جب بھی موقع ملتا وہ جمیلہ کی سگریٹیں جھپٹ لیتی اور جھاڑو والی بڑھیا کو پکڑا دیتی تھی۔ بڑھیا اپنے پوپلے منہ سے ددی کو دعائیں دینے لگتی تو ہر بار وہ اس سے یہی فرمائش کرتی، ”میری جمیلی کے لیے دعا کر کہ اس کا ریاض کرنے میں جی لگے اور بس یہ منحوس سگریٹیں چھوٹ جائیں۔ خبرے کس مردار لو فر نے یہ لت لگا دی ہے۔“

جمیلہ بولی، ”تم بھی پیا کرو... یا حقہ پیو مائی فروزہ کی طرح۔ قسم سے مزہ آ جائے گا۔“

”چپ کر، نہیں چٹیا پکڑ کے دو لگا دوں گی... ہا آں۔ ایویں چلتی، منا حوس۔“

لمڈا جاتے جاتے رک گیا۔ وہ سننا چاہتا تھا کہ ددی کی ڈانٹ کا جمیلہ کس طرح جواب دیتی ہے۔ کبھی تو وہ ایسا پھلکا اڑاتی کہ لمڈا سن کے چکر گھنٹی ہو جاتا تھا۔ پھر وہ اپنے محلے میں جا کے دوستوں کو پورا قصہ سناتا تھا، اداکاری کر کے بتاتا تھا۔ وہ آگے دوسروں کو جا سناتے تھے۔ ہر کوئی تو کوٹھے تک رسائی نہیں رکھتا۔ لمڈے کو محلے کے دوسرے لڑکوں پہ یہی برتری حاصل تھی کہ وہ روز کوٹھے پہ جاتا تھا۔ جمیلہ، روزی، چمپا اور رانی کی باتیں سنتا تھا۔ نگینہ بے بی کو اور دوسرے انوکھے لوگوں کو دیکھتا تھا۔ بڑے بڑے دہشت والے ڈینجر لوگ شانے پر ریوالتور پیٹی لٹکائے، پتلون کی چوڑی بیلٹوں میں سگریٹ کی موٹی والی ڈبیاں اڑ سے، سیڑھیاں چڑھتے چلے آتے تھے۔ دن میں پولیس والے بھی آتے تھے جن کی بڑی خاطریں ہوتی تھیں۔ ہوٹل والا خود بوتلیں چابی لے کے آتا تھا اور سوڈے کھول کھول کر صوبے دار

صاحبوں کے آگے رکھتا جاتا تھا۔

جمیلہ نے لمڈے کو جانے میں ٹال مٹول کرتے، ادھر ادھر بے وجہ منڈلاتے دیکھا تو سمجھ گئی کہ وہ جانے سے پہلے اس کا فقرہ سننا چاہتا ہے۔ جمیلہ اسے کبھی مایوس نہیں کرتی تھی۔ جان جان کے اس کے سامنے تڑاقتے دار فقرے بولتی تھی، چاہے سامنے والا کوئی بھی ہو۔ دڈی تک کو نہیں بخشتی تھی۔ پروا نہیں چاہے دھنائی ہو جائے۔

اس وقت دڈی اسے ڈانٹ کے آرام کرسی سے اٹھی تھی اورنگی کے ناشتے کا سامان باورچی خانے تک پہنچانے کے لیے سب سب بڑھ رہی تھی۔ وہ اپنا بھاری بدن ڈگمگاتے قدموں پہ سہارتی، گھٹیا کے مارے جوڑوں سے لڑتی جھگڑتی، دیوار کا سہارا لیے دو چار قدم چلی ہوگی کہ جمیلہ نے بہت ہی لوفر تماش بینوں کی طرح چھاتی پہ ہاتھ مار کے کہا، ”ہائے گلغام! ناجک بدن! پھولوں کے لچکتے ڈالے! کدھر چلے متوالے؟ میرے کو حکم کرو دڈی ماشوک! تمہارا جمیلا موزود ہے خدمت کرنے کو... ہائے جانی!“

دڈی نے پہلے تو اسے گھور کے دیکھا۔ لگتا تھا مار بیٹھے گی۔ پھر وہ ایک دم ہنس پڑی، ”رحمدی! کتیا نہیں تو۔ کہیہ جی بکو اس کیے جاتی ہے بے شرم، چلبلی... لے یہ اندر رکھ دے۔“ لمڈا کھی کھی کرتا، جمیلہ کے فقرے کا مزہ لیتا سیڑھیاں اترنے لگا۔

وہ چوڑی چکلی گھسی گھسائی پتھر کی سیڑھیوں پر اچھلتا کودتا اتر رہا تھا کہ اچانک اسے اشک لائل پوری کے بیٹے مرے مردے ماسٹر کا ہیولا نظر آیا۔ دبلا پتلا سا آدمی یہ ماسٹر، ریلنگ کے سہارے کھڑا ہو جاتا تو لگتا تھا اسی سو پچاس سال پرانی تڑخی ہوئی لکڑی کا حصہ ہے۔ لمڈے کو یاد آیا کہ ماسٹر سیڑھیاں چڑھنے سے پہلے اہتمام کے ساتھ پتلون کی بیلٹ، کالر ٹھیک کرتا تھا۔ کالر کے نیچے تہ کر کے لگایا ہوا رومال نکال کے منہ پونچھتا تھا۔ اب ایک دم لمڈے کو آتے دیکھ کے وہ سب کچھ بھول گیا۔ بے وجہ گلا صاف کر کے پھنسی ہوئی آواز میں بولا، ”رفیق میاں! کیا کہیں جارہے ہو؟... کہاں جارہے ہو؟“

اتنی بڑی پھیلی ہوئی دنیا میں صرف یہ ماسٹر ہی تھا جو لمڈے کو رفیق میاں کہتا تھا۔ تو رفیق میاں خوش مزاجی سے بولا، ”جمیلہ بے بی کا ناشتہ لینے جا رہی ہیں۔“

ایسا لگا جیسے کسی نے ماسٹر کے بیئر سینے پہ گھونسا مار کے اسے گرا دیا ہو۔ وہ ہکلا کے اور بھی پھنسی ہوئی آواز میں بولا، ”جمی لا بے بی؟“

لمڈا ماسٹر کی پریشانی دیکھ کے مسکرا رہا تھا، اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہنے لگا، ”ہاں آپ چلے جاؤ اوپر۔ نغینہ بے بی بھی جاگ گئی ہے، غسل کر چکی ہوگی۔ جب تک آپ جاؤ۔ دڈی جی کے پاس بیٹھو۔“

”ہاں آں، وہ تو ہے ہی، مگر... آج جمیلہ، آج کیا جلدی اٹھ گئی، جمیلہ بے بی؟ جلدی کیوں اٹھ گئی؟“

”رات کدری گانے وانے میں نہیں گئی ہوگی۔ جلدی سو گئی ہوگی... اسی مارے اٹھ گئی۔“

”ہاں، وہ تو ہے ہی... اچھا، ایسا کرو... تم جا رہے ہو؟ ناشتا لینے جا رہے ہونا؟... اچھا ہے، جاؤ۔ ابھی تو سب ناشتا کریں گے۔ میں پھر آ جاؤں گا۔“

لمڈا ماسٹر کی گھبراہٹ سمجھتا تھا۔ لا پرواہی سے بولا، ”مر جی آپ کی۔“ لمڈا جان گیا کہ اب وہ پندرہ بیس منٹ میونسپلٹی کے بچے میں ٹہل لگائے گا، پھر آئے گا۔ جمیلہ نے دو تین بار اسے ایسا دہلا دیا تھا کہ وہ اس کے ہوتے اکیلے فلیٹ میں آنے کی ہمت نہیں کرتا تھا۔ آج، ابھی جس طرح اس نے دڈی سے سینے پہ ہاتھ مار مار کے نوٹنکی کی تھی اسی طرح، بلکہ اور بھی لوفر پن سے، ایک بار ماسٹر پہ چڑھ دوڑی تھی۔ وہ بے چارہ ”ارے ارے!“ کہہ کے پیچھے ہٹتا جاتا تھا اور جمیلہ وہی سب کہ ”جانی مار ڈالو، نا جک بدن، آشکے نامراد، چھڑ کی اولاد“ اور خبر نہیں کیا کیا۔ ماسٹر ایسا بھاگا کہ اس نے دو دن پلٹ کے نہ دیکھا۔

ماسٹر نے بے بتائے دو دن کی چھٹی کر لی تھی۔ نگینہ کو فکر ہوئی تو لمڈے نے بتایا کہ وہ شاید برا مان گیا ہے۔ تبھی جمیلہ کی حرکت کا سب کو علم ہوا۔ دڈی نے پہلے تو جمیلہ کو سمجھایا کہ، ”نہیں جمیلہ! وہ لکھنے پڑھنے والا بندہ ہے۔ استاد نوازش علی کی جان پہچان کا آدمی ہے۔ اسے اب نہیں ستانا، جان!“ لیکن جب ایک بار پھر یہی قصہ ہوا اور خود ماسٹر نے اور نگینہ نے شکایت کی تو دڈی نے جمیلہ کے دو تین دھول جڑ دیے کہ ”مردی مسخری! وہ کام والا آدمی ہے، ادھر سے پیسے ملتے ہیں اسے۔ وہ تیرے محول کا نہیں لگتا۔ آج اس ماسٹر کو ستاتی ہے، کل تو ہوٹل کے باہر والے سے ہنسی ٹھٹھا کرے گی۔ بھلا کوئی بات ہے؟ چبلی! بد بخت نہیں تو!“

دڈی سے مار کھا کے جمیلہ اتنی ضرور سدھر گئی تھی کہ پھر اس نے ماسٹر کو گھیر کے پریشان نہیں کیا، بس کبھی کبھی دور سے ایک آدھ فقرہ کھینچ مارتی تھی۔ مگر ماسٹر کے دل کا خوف

اپنی جگہ رہا۔

وہ فلیٹ کی دوسری کسی بھی لڑکی سے نہیں ڈرتا تھا۔ ڈرنا کیسا، نگینہ کے سوا وہ کسی سے کوئی سروکار ہی نہیں رکھتا تھا۔ اسے ریڈیو اسٹیشن آنے والی سنگر عورتوں لڑکیوں سے بھی کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ ویسے بھی وہ نقل نویس تھا، آرٹسٹ، میوزیشن یا پروڈیوسر تو تھا نہیں جو لڑکیوں عورتوں میں گھس گھس کے بیٹھتا یا انھیں چائیں پلاتا۔ کاپی سیکشن میں اس جیسے کئی کو پیسٹ تھے۔ دوسرے سبھی بوڑھے ریٹائرڈ لوگ تھے، بالکل پرانی مسلوں فائلوں جیسے، کونے مڑے، دھول چڑھے پرانے کاغذوں کے سوکھے مڑے بندل۔ کسی نے ایک بار ماسٹر سے کہا بھی تھا کہ، میاں جی!، ریڈیو اسٹیشن کے نقل نویسوں میں تم کہاں آن پھنسے؟ یہ تو ازکار رفتہ منشیوں، غزل گو یوں کا سیکشن ہے۔ آدھے دن تو یہ لوگ ایک دوسرے کو اپنی اپنی غزلیں سناتے رہتے ہیں اور سہل ممتنع سے متعلق اور مصرعوں کے وزن سے گرنے نہ گرنے کے بارے میں اور شعروں کے دلخت ہونے نہ ہونے پر ایک دوسرے کو طعنے دیتے اور بوئگیاں مارتے ہیں۔ تم یہاں کہاں آ گئے؟

نوجوان ماسٹر کو اس سیکشن میں دیکھ کے حیران ہونے والوں کو اندازہ نہیں تھا کہ اشک صاحب کا بیٹا یہاں مجبوری میں آیا اور مجبوری میں بیٹھا ہوا ہے۔ مصباح الدین اشک لائل پوری جب بالآخر ریٹائرڈ تسلیم کر لیے گئے تو فکرِ خن سے زیادہ انھیں گھر کا چولہا جلتے رہنے کی فکر ہوئی۔ ڈی جی سے مشاعروں والی یاد اللہ تھی۔ اسے کسی سے کہلوا یا اور ایک عریضہ بھی بحضور فیض گنجور ٹائپ کا داغ دیا۔ ان کے بیٹے کو باپ کے سابق سیکشن میں ایک کرسی کا پیسٹ کی مل گئی اور اشک صاحب کی فوری پریشانی دور ہو گئی۔ ریڈیو کے پیسوں میں مشکل سے گزارا ہوتا تھا، اس لیے اشک صاحب کے بیٹے نے دو چار ٹیوشن پہلے سے پکڑ رکھے تھے۔ ادھر کچھ برسوں سے ماں نے شادی کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کر دیا تھا تو یوں بھی آمدنی میں اضافہ کرنا ضروری تھا۔ جب جانی خاں سارنگی نواز نے استاد نوازش علی کی ایک شاگرد بے بی نگینہ کے ٹیوشن کی بات کی اور کہا کہ فلاں محلے میں پانچویں چھٹی کلاس کی اردو فارسی پڑھانی ہوگی، پیسے اچھے ملیں گے، تو ماسٹر پہلے ٹپٹایا پھر رقم سن کے سونج میں پڑ گیا۔ آخر خود کو سمجھانے میں کامیاب ہوا کہ، میاں! محلہ محلہ کیا! پانچویں چھٹی کلاس کی بچی ہی تو ہے، جھپاٹے سے پڑھا کے آجایا کریں گے۔ بس اس نے ہاں کر دی۔ پر جب جانی خاں کے ساتھ کوٹھے پر آ کے بے

بی نگینہ کو دیکھا تو ماسٹر کی، یوں سمجھو کہ، گھگھی بندھ گئی۔ یہ بے بی تو پوری بائی جی تھی۔ اوں ہوں! یہ ٹیوشن نہیں چلے گا۔ وہ بھلے لوگوں کے بچوں کو پڑھاتا ہے، کسی کو پتا چل گیا کہ وہ اس محلے میں کسی بائی جی کی ٹیوشن لیتا ہے تو سب چوپٹ ہو جائے گا اور جہاں شادی کی بات چل رہی ہے اگر انھیں معلوم ہو گیا تو وہ صاف انکار کر دیں گے کہ لڑکا کوٹھوں پر آتا جاتا ہے۔

ماسٹر نے جانی خاں سارنگی نواز کو اپنا مسئلہ بتایا تو وہ ہنسنے لگے۔ ”میاں معاف کرنا! نام ور شاعر کے بیٹے ہو، مگر ایک دم ہولو ہو۔ او بھائی! کوئی ڈاکٹر، وکیل، پلمبر، الیکٹریشن، کوٹھے پہ اپنے کام کے سلسلے میں آئے جائے تو کیا اسے تماش بینوں، رنڈی بازوں میں گنا جائے گا؟ میرے بھائی! اب ہم بھی تو ٹیوشن کرتے ہیں۔ جاتے ہیں، سبق وبق یاد کراتے ہیں۔ یا جہاں کہیں مجرا ہوتا ہے تو جاتے ہیں، اپنا کام بجا کے آ جاتے ہیں۔ عزت دار، بال بچے والے آدمی ہیں۔ کس وہم میں پڑے ہو میاں! استاد نوازش علی بھی کہتے ہیں اور ہم نے بھی سنا ہے کہ بڑے رکھ رکھاؤ کی لڑکی ہے یہ۔ دیکھا نہیں، گھریلو بچیوں جیسے سر پہ پلو لیے ہوئے تھی؟ ہزار و عورتوں کی طرح پیشانی تک ڈھک کے، کانوں کے پیچھے ڈوپٹہ اڑس کے، ڈراما بنا کے نہیں آئی تھی۔ تم بسم اللہ تو کرو۔ یہ ٹیوشن برا نہیں رہے گا۔ آگے بھی کام ملے گا۔ کتنی مجرے والیوں کے شین قاف درست نہیں ہیں۔ میں سمجھاتا رہتا ہوں کہ نیک بختو! غزل گانے بیٹھ جاتی ہو، اپنے شین قاف نہیں سنواریں۔“

سارنگی نواز نے ٹھیک کہا تھا۔ یہ ٹیوشن بہت اچھا رہا۔ نگینہ بڑے رکھ رکھاؤ کی شاگرد نکلی۔ ماسٹر کا جی کرتا تھا دن بھر ٹیوشن پڑھاتا رہے، ریڈیو اسٹیشن بھی نہ جائے۔ بس ایک جمیلہ سے الجھن ہوتی تھی اسے۔ بڑی بے شرم لڑکی تھی۔ لڑکی کیا جی، عورت... پر عورت بھی کیوں، عجیب ہی چیز تھی وہ... سالی ٹکیائی۔ جانی خاں کہتا ہے بس ذرا چلبلی ہے جمیلہ، ویسے لڑکی بری نہیں۔ واہ بے واہ! لڑکی کہتا ہے، سالا خوشامدی!

ماسٹر نے ان لوگوں کے پیشہ ورانہ معاملات کے متعلق نہ ان سے، نہ کسی اور سے کبھی بات کی کہ کون کس کی نوکری میں ہے، کسے کس کے لیے تیار کیا جا رہا ہے، کون کسے چھوڑ کے اب کس کی نوکری میں آگئی ہے اور وہی پرانی بدنام زمانہ بات، کہ کس کی نتھ بڑھائی کے لیے کہاں کہاں سے کتنی آفر ہے۔

اسے تو بس ایک ہی بات یاد رکھنی تھی جس کے علم کی ٹھنڈی چھاؤں میں ماسٹر کو

بہت میٹھا میٹھا لگتا تھا کہ نگینہ کو کلاسیکی گانے کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ ددی شیر کی طرح اس کی حفاظت کرتی ہے اور جب اس کی انتہ بڑھائی یا ملازمت کی کوئی بات چھیڑتا ہے تو ددی ٹال جاتی ہے، زیادہ کوئی پوچھ گچھ کرے تو کاٹنے کو دوڑتی ہے۔ بہت زیادہ تیزی دکھانے والے شوقین مزاجوں اور سکہ بند تماش بینوں کے سامنے نگی کو نہیں آنے دیتی۔ ہاں موسیقی کی کھری محفلوں میں سادے سودے کپڑوں میں کبھی کبھی لے جاتی ہے کہ لڑکی کی حاضری لگتی رہے۔

کنجروں کی زبان تو زہر میں بجھی کٹار ہوتی ہے۔ کہتے تھے نگینہ بائی کو چھ راگ چھتیس راگنیاں سکھوا کے ددی خانم اسے کسی اونچے گھر کی بہو بنائے گی۔ پھر نگینہ بائی اپنے میاں اور سرے اور جیٹھوں اور دیوروں کے آگے مجرا کیا کرے گی کہ اکیلی مت جی ہو رادھے، جمونا کے تیر۔

لمڈے کا اندازہ صحیح تھا۔ ماسٹر کوئی پندرہ منٹ بعد میونسپلٹی کے بچے سے ٹہل لگا کے فلیٹ پہ آیا تو نگی ناشتا کر چکی تھی۔ جمیلہ بالکونی میں بیٹھی بیٹری کا ریڈیو لگائے سیلون سے فلمی گانے سن رہی تھی۔ یہ ریڈیو نئے نئے چلے تھے۔ لوگ انھیں ٹرانزسٹر ریڈیو کہتے تھے۔ جمیلہ کے ٹھیکے دار دوست نے ٹھیک ٹھاک رقم خرچ کر کے کسی باہر سے آنے والے سے خریدا تھا۔ اس ریڈیو کو جب چاہو تار لگا کے بجلی سے چلاؤ، جب چاہو ہاتھ میں اٹھا کے بجاتے ہوئے باہر نکل جاؤ۔ نئی چیز تھی۔ ددی کے منع کرنے پر بھی جمیلہ فلیٹ سے اترتی تو اسے بجاتی ہوئی اترتی تھی، چاہے گانا ہو یا چاہے بات چیت یا خبریں۔ سڑک کے لوگ مڑ مڑ کے دیکھنے لگتے تھے کہ یہ کیا بغیر بجلی کے ریڈیو سیلون بجنا ہوا چلا جا رہا ہے۔

ددی اس وقت لاؤنج میں پڑی چوکی پر آ بیٹھی تھی۔ یہاں سے وہ میز کرسیاں صاف دکھائی دیتی تھیں جن پہ بیٹھ کے نگینہ پڑھتی اور ماسٹر پڑھاتا تھا۔ سفید پوش لوگ بھی اپنی بیٹیوں کو اس اہتمام سے نہ پڑھواتے ہوں گے جس اہتمام سے ددی نگینہ کو پڑھواتی تھی۔ پہلی احتیاط تو اس نے یہ کی تھی کہ مجبوراً کسی جوان ماسٹر سے پڑھوانا پڑا تھا تو استاد سے کہہ کے ایسا سکھا، مرگھلا نو جوان منگوا یا تھا کہ جس کی طرف بھک مرے گدھ بھی منڈیا گھما کے نہ دیکھیں۔ پھر یہ بھی تھا کہ جیسے ہی ماسٹر فلیٹ میں گھستا تھا، ددی لاؤنج کی چوکی پہ ڈھیر ہو جاتی... سمجھو قطب کی طرح جم جاتی تھی۔ انتہائی ضرورت میں بھی وہاں سے نہ ملتی۔ ددی کے کان ان دونوں کی باتوں پر لگے رہتے تھے۔ انگریزی تو رحامی اس کے پلے نہیں پڑتی تھی لیکن اردو

غزلیں، قصے کہانیاں جو نگینہ پڑھنے بیٹھتی تھی، ددی انھیں ہاتھ کے ہاتھ سنسرتی جاتی تھی۔ غزل میں عشق عاشقی کی باتوں کا بہت ذکر ہوتا ہے، تو ددی غصہ ہو ہو کے سوچتی اور سوچ سوچ کے غصہ کرتی تھی کہ ان بد نصیبوں کے پاس پڑھانے لکھانے کو یہی عاشقی معشوقی رہ گئی ہے۔ وہ ماسٹر کو عشق و شوق پر زیادہ بک بک نہیں کرنے دیتی تھی۔ جم جم کے کھانا شروع کر دیتی اور نگینہ کو اپنی دوالا نے بھیج دیتی۔ پھر اس کے جاتے ہی ماسٹر کو آنکھیں دکھاتی تھی کہ ”اے میاں جی! یہ اپنے ہجر اور وصال کا پھیلاؤ ادھر نہیں کرو۔ اس لڑکی نے آگے شعر و شاعری، استاد کی نہیں کرنی، نہ کدرے آنکھ مٹکا کرنا ہے۔ ہم گانے بجانے والے لوگ ہیں۔ ان سب چکروں سے نگلی نے کامغز خالی رکھنے کا ہے... کچھ سمجھے جی آپ؟“

پہلے پہل تو ماسٹر کی سمجھ میں نہ آیا کہ ہجر و وصال اور عاشق و معشوق کو ہٹا کے وہ غزلیں وزلیں کیسے پڑھائے۔ آخر جانی خاں سارنگی نواز کے مشورے سے اس نے ایک راہ نکال لی۔ وہ عاشق معشوق کو محبوب، دوست، حُب، رفیق، ہمد کہہ کے اور عشق کو وارداتِ قلبی، الفت اور تعلقِ خاطر جیسی مشکل باتوں میں لپیٹ کے سمجھانے لگا۔ ددی پھر بھی چوکی پہ بیٹھی بڑی آگہی سے سر ہلاتی رہتی تھی کہ ”مرے! میں سمجھ رہی آں، توں کیا چکر چلا رائے۔“

استاد نوازش علی کا اور ان سے زیادہ ددی کا خیال تھا کہ بس غزلوں کی اردو یا بہت ہو تو تھوڑی سی فارسی اس ماسٹر سے پڑھوالی جائے گی جس سے ادائیگی اور شین قاف ٹھیک ہو جائے گا۔ اس سے زیادہ کیا کرنا ہے۔ مگر نگینہ کے پاس پہلے ایک انگریزی کتاب نظر آنے لگی پھر ایک رنگین نقشہ بھی کہ جس میں دنیا جہان کے شہر بنے تھے، نام لکھے تھے۔ مرگھلا ماسٹر اپنے پیسوں سے یہ سب خرید کے لایا تھا۔ ددی کو ان چیزوں کا نہ کوئی فائدہ نظر آتا تھا نہ نقصان۔ بس اس نے دیکھا کہ نگینہ ان سے خوش ہوتی ہے تو اس نے اصرار کر کے ماسٹر کو نقشے کتاب کے پیسے دے دیے۔

کچھ دن بعد ماسٹر مردہ ایک اور کتاب لانے لگا... اکبر بادشاہ، ملکہ نور جہاں اور تاج محل آگرے والی کتاب۔ لوجی، نگینے نے تو پھر جان کو ہی آجانا تھا۔ ددی نے بڑی گالی گفتار کی۔ سمجھو ماسٹر کا حساب نہیں کیا اور سب کر دیا کہ ”لے کم بختا! کوٹھے پر سکول کھولنے چلا ہے۔“ پر نگینے کے رونے دھونے کے آگے کچھ نہ چلی۔ یہ اکبر بادشاہ، ملکہ نور جہاں والی اور دوسری بھی کون کون سی کتابیں سبھی لینا پڑیں۔ اب یہ ہونے لگا کہ نگینہ پڑھنے بیٹھتی تو کتابوں

کاپیوں سے پوری میز بھر جاتی۔

دڈی نے یہ سب کچھ آسانی سے قبول نہیں کیا تھا۔ نگلی سے کہہ دیا تھا کہ اگر ریاض میں ذرا بھی کچھ فرق آیا، ”جے تو نے نوازش علی خاں صاحب کی تعلیم سے جی چرایا تو سمجھ لے یہ سب نقشے اور اکبر باشے اور اس مرے مردے ماسٹر کو میں ٹھڈے مار کے نکال دینا ہے۔“

کسی کو بھی ٹھڈے مار کے نکالنے کی ضرورت نہ پڑی۔ مجرے والیاں، دوسری شاگردیں نوچیاں دوپہروں تک پڑی سوتی رہتیں اور نگینہ دڈی سے بھی پہلے اٹھ کے بیٹھ جاتی اور تان پورہ سنبھال خاں صاحب کا دیا ہوا سبق گھونٹا شروع کر دیتی۔ موقع ملتا تو دڈی کو سامنے بٹھا، کوئی آروہی امروہی پکی کر لیتی۔ طبلے پہ سنگت کرنے رمضان میاں رجوا جمیری آتا تھا۔ ہولو سا آدمی تھا مگر اپنے کام میں ہشیار۔ جب تک وہ سگریٹ کی طلب سے بے تاب ہو کے پہلو نہ بدلنے لگتا، نگلی اپنا سبق دہرائے جاتی، دہرائے جاتی۔ یعنی خاں صاحب استاد نوازش علی کی تعلیم کا کسی طرح بھی حرج نہیں ہونے دیتی تھی نگینہ۔

سوا ڈیڑھ گھنٹا ہو گیا تھا، ماسٹر پڑھائے جا رہا تھا کہ اچانک نیچے سے ٹیہو ٹیہو کر کے موٹر کا ہارن بجنے لگا۔ اس آواز کے ساتھ ہی جیسے فلیٹ کا سب نظام درہم برہم ہو گیا۔

دڈی نے پڑھنے پڑھانے والوں کی طرف سے دھیان ہٹا کے بالکونی کے رخ آواز لگائی، ”جمیلے! پتر جا دیکھ تو کیا روزی اٹھ گئی؟ ذرا جھپاٹے سے جا کے دیکھ لے، میری جان!... جے نہیں اٹھی ہو تو اٹھا دینا۔ شابش... بولنا، وہ آگیا۔“

”آگیا ٹیہو ٹیہو والا، سال!“ جمیلہ بڑبڑائی۔

دڈی نے نگلی کو اشارہ کیا کہ یہ پڑھنا لکھنا اب ختم کر۔

دکان کھل چکی تھی۔ نیچے ایک گاہک کھڑا تھا۔

ماسٹر نے ابھی تک اس ٹیہو ٹیہو والے کو دیکھا نہیں تھا۔ کوئی بتا رہا تھا کہ بسوں کے ایک بہت بڑے بیڑے کا مالک ابھی ابھی مرا ہے۔ یہ اس کا ہونہار بیٹا ہے جو نیچے اپنی نئی اسپورٹس کار میں بیٹھاروزی کے لیے ہارن بجا رہا ہے۔ وہ اگر تیار ہو کے دس منٹ میں گاڑی میں نہ جا بیٹھی تو ٹیہو ٹیہو والا، جو خیر سے دن کے وقت بھی وہسکی لگا کے آیا ہوگا، پُرشور انداز میں سیڑھیاں چڑھتا فلیٹ میں آجائے گا۔ اسے کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ تماشائی بنی کرنی ہوتی تھی۔

نگی نے ہڑ بڑا کے کتابیں سمیٹنی شروع کر دیں اور ماسٹر جلدی جلدی دوسرے دن کا کام بتانے لگا۔

دڈی نے بیزاری سے کہا، ”جاو جا... بس ہے اب۔ ہو گیا تیرا سکول۔ جا مہمان آرہے ہیں۔“

ماسٹر اٹھ کھڑا ہوا۔ نگی نے اسے رخصتی سلام کیا اور کتابیں سمیٹ باورچی خانے میں جا بیٹھی۔ ٹیہو ٹیہو والے کے دس منٹ پورے ہو چکے تھے۔ وہ کسی بھی وقت سیڑھیاں چڑھ کے آسکتا تھا۔

دڈی نے لمڈے کو آواز دی مگر فوراً ہی اسے یاد آ گیا کہ لمڈا کسی ’مہمان‘ کے پاس نہیں جائے گا۔ اس کے باپ نے سختی سے منع کر دیا ہے۔ اس لیے جب لمڈا ”جی دڈی جی“ کہہ کے سامنے آیا تو دڈی نے دھیرے سے کہا، ”کچھ نہیں پتر! پانی پلا دے۔“

چاہتی تو وہ یہ تھی کہ لڑکا ہارن والے کے پاس جائے، اسے انتظار کرنے کو کہے، کچھ باتوں میں الجھائے تاکہ وہ فلیٹ میں آنے کا خیال دل سے نکال کے گاڑی ہی میں بیٹھا رہے... وہیں انتظار کرے روزی کا۔ کتنا اچھا ہوتا اگر یہ مردار نیچے جا کے اسے باتوں میں الجھا سکتا مگر اس کا باوا صاف لفظوں میں کہہ گیا تھا کہ دیخو بائی جی! ہم مردے گاڑنے والے، کدالی پھوڑا چلانے والے لوغ ہیں۔ ہاتھ پاؤں کی مجوری ہمارے لمڈے سے جتنی مرجی آئے لے لو، پر اگر ہم نے کسی آتے جاتے سے بات کرتے دتخ لیا اسے تو ایمان سے ایک ملٹ ادھر نہیں چھوڑیں گے۔ لے جائیں گے بالکل... برا مت منانا۔ بھلے سے کفن چور بن جائے سسر، دلال نہیں بننے دیں گے، ہاں۔ بس خیال رکھنا۔ گھر والوں کے سوا کسی سے بات نہیں کرے لمڈا۔ نہیں ایمان سے... ہم لے جائیں گے۔

”رحامد انہیں تو!“ دڈی نے غصے سے چوکی پہ پہلو بدلا۔ یہ غصہ لمڈے کے باوا گورکن کے لیے بھی تھا اور ٹیہو ٹیہو والے تماش بین کے لیے بھی جو توقع کے عین مطابق دھپ دھپ پاؤں مارتا سیڑھیاں چڑھتا چلا آرہا تھا۔

وہ سونے کی زنجیر میں لگی گاڑی کی چابی ہلاتا، ہلکے نشے میں لہراتا ہوا فلیٹ میں آیا تھا، پھول دار ریشمی بش شرٹ، کریم کلر کی ریشمی پتلون اور سفید کڈ لیدر کے نرم ربرسول والے جوتے پہنے۔

”ہے لو! ہے لو خانم جی! کیسی ہو؟“

”پتر، بس چل رہی ہے گاڑی... لے، ادھر نکل آ۔ آ بیٹھ جا میرے کول۔“

”صیٰ ہے۔ گاڑی ٹاپ کنڈی شن میں چلتی رہنا چیتے خانم جی!... اور؟ دوسرے

لوگ سب فٹ فاٹ؟ یہ روزی؟... روزی سو تو نہیں رہی ابھی تک؟“

”نہیں نہیں... آتی ہے،“ اس نے لمڈے کو آواز دی، ”اوفیکے! جا ٹھنڈا لے کے آ

نیچے سے۔“

ٹیہو ٹیہو والا ہنسا۔ ”نانا نا۔ ٹھنڈا گرم کچھ نہیں خانم جی!... بس وہ آ جائے روزی تو

چلوں گا۔“ وہ چوکی سے اٹھ کے روزی کی تلاش میں جانا چاہتا تھا کہ ددی نے اس کے ہاتھ پہ

اپنا بھاری پنچہ رکھ دیا۔ ”سن تو سیٹھ! رات بڑا یاد کر رہی تھی تجھے۔“

ددی نے اپنی روانی میں ٹیہو ٹیہو والے کو روک تو لیا تھا مگر جو منہ میں آیا تھا کہہ

دینے کے بعد وہ اب تیزی سے سوچ سوچ کے پوری کہانی بنا رہی تھی... جو کچھ اس طرح بن

رہی تھی کہ رات محفل میں کسی نے روزی سے اس گانے کی فرمائش کی تھی جو ٹیہو ٹیہو والے کو

پسند ہے تو روزی نے صاف انکار کر دیا تھا کہ معافی چاہتی ہوں سرکار! کوئی اور سنا دوں گی، وہ

گانا نہیں۔ وہ میرے صاحب جی کو پسند ہے اور میرا صاحب جی یہاں اس محفل میں نہیں ہے۔

صاحب جی سالا ”ہا ہا ہا“ کر کے بے وقوفی سے ہنسا۔ اسے بالکل یاد نہیں تھا کہ وہ

کیا چیز ہے جو اسے پسند ہے اور جو روزی ہمیشہ اس کی فرمائش پہ سناتی ہے۔ ددی ابھی طے

نہیں کر پائی تھی کہ اس مردے بے ذوقی کے نام پہ کون سا گانا ٹانگے کہ اسی وقت ددی کا

مسئلہ سمجھ کے بالکونی سے جمیلہ نے چمکتی ہوئی آواز میں کہا، ”سیٹھ کو تو وہی پسند ہے، ٹیہو ٹیہو

بول پیپیہ، ٹیہو ٹیہو بول... سیٹھ نے گاڑی کے ہارن میں بھی یہی گانا فٹ کرایا ہے۔“

بسوں کا مالک دوبارہ اتنی ہی بے وقوفی سے ہنسا۔

ددی نے جمیلہ کو ”دُر فٹے منہ“ کہنے کو منہ کھولا ہی تھا کہ اسے اپنا ہمیشوں ہمیش کا

اصول یاد آ گیا کہ کبھی آنے جانے والے کے سامنے لڑکیوں کو گالی نہیں دینا ہے۔ بعد میں

چاہے چھتر مار مار کے ملیدہ کر دو کنجریوں کا، اس وقت نہیں۔ وہ اپنے چار سونا چڑھے دانتوں

کے ساتھ شفقت سے مسکرائی۔ ”باتیں تو دیکھو میری مینا کی۔ اس نے کبھی چپکا نہیں بیٹھنا ہے۔

بڑوں کے بیچ میں بولے گی ضرور... فتنی۔“

جمیلہ کی آواز سن کے بسوں والے کے سب ہارن بجنے لگے تھے۔ وہ بھی چہکتی آواز میں بولا، ”جمیلہ! کہاں بیٹھی ہے۔ ادھر تو آ... بہت روز سے نظر نہیں آئی۔“

جمیلہ نے ٹرانزسٹر ریڈیو کی آواز ہلکی کر لی تھی۔ وہیں سے ٹھنڈی سانس بھر کے بولی، ”جمیلہ تمہارے کو کیسے نظر آئے گی سیٹھ! آنکھوں کے آگے تو روز کلر کے گلابی پردے لہرا رہے ہیں۔ امان سے!“ اس نے ایمان سے، بالکل مردوں فروں کی طرح کہا تھا۔

بسوں والے کو یہ اسٹائل اتنا پسند آیا کہ طبیعت پھڑک اٹھی۔ اس نے جواب میں کچھ کہنا چاہا مگر حلق سے ”قینق“ کی آواز نکال کے رہ گیا۔ پھر وہ لہرا کے اٹھا۔ اس نے بالکونی کی طرف جانا چاہا۔ دڈی نے پھر اس کے ہاتھ پہ ہاتھ رکھ دیا۔ وہ ڈر رہی تھی کہ یہ ادھر گیا تو باورچی خانے میں بیٹھی نگي اسے نظر آجائے گی۔ خواہ مخواہ یہ مردہ اس کی جان کو آئے گا۔ سب کی عافیت اسی میں تھی کہ ٹیہو ٹیہو والا چوکی پر ہی بیٹھا لہراتا رہے۔ اس لیے دڈی آواز میں تھوڑی سرزنش ڈال کے جمیلہ سے بولی، ”نیک بختے! تجھے چھوٹے بڑے کی کوئی تمیز، کوئی لحاظ ہے کہ نہیں؟ ادھری سے بیٹھی بولے جارہی ہے۔ ادھر سامنے آ کے بات کر بے وکوف!“

جمیلہ ٹرانزسٹر اٹھا کے چوکی کے سامنے پڑی کرسی پہ آ بیٹھی۔ آتے ہوئے اس نے سیدھے ہاتھ کی چار انگلیاں چھوڑ کے انگوٹھا چھپاتے ہوئے اپنی پیشانی کو چھوا تھا اور بہت ہی مصنوعی آواز میں کہا تھا، ”آداب!“

”ابے لے!“ بسوں والا قہقہہ مار کے ضرورت سے زیادہ پُر جوش انداز میں بولا، ”سچ کہہ رئی ہو جمیلہ! کتنے دن بعد دیکھا ہے تمہیں... ایک دم بدل گئی ہو، کمال ہو گیا!“

اس ”کمال ہو گیا!“ میں دریافت کی حیرت، مسرت اور خود اپنے گھامڑپن کا نوحہ تھا کہ آنکھوں کے سامنے چاند چڑھا تھا اور نظر نہیں آتا تھا۔ اب وہ تفصیل سے اس منصوبے پر غور کرے گا۔ مہینے پندرہ روز میں روزی کو انڈی کیٹر لائٹ دکھا کے برابر سے نکل جانے دے گا پھر اس نئے ماڈل کی ٹیوننگ کرے گا۔ وہ بار بار ”کمال ہو گیا!“ کہہ کہہ کے اس نئے منصوبے کو دھندلے پار سے اوور ٹیک کرتا ہوا اپنے قریب آنے دے رہا تھا۔

اندر کسی کمرے سے روزی کی آواز آئی، ”کمنگ صاحب جی!... سوری، دیر ہو گئی۔“

بسوں والے نے کہا، ”بھلے ہی آرام سے آؤ روزی! میں دڈی جی کے پاس بیٹھا ہوں۔“

ابھی تک تو سب ٹھیک ہی تھا، مگر روزی کو جو بات سب سے زیادہ کھلنے لگی تھی، وہ

ٹیہو ٹیہو والے کی دوپہر کی شفٹ تھی۔ وہ ایک بجے دن سے چھ سات بجے شام کے سوا اپنی تماش بینی کو اور کوئی وقت دے نہیں سکتا تھا۔ شام تک روزی کو مصروف رکھنے کے بعد وہ آٹھ بجے گھر اور بال بچوں میں چلا جاتا تھا۔ گیارہ ساڑھے گیارہ بجے رات سے اس کی بسیں گھر لوٹنا، کیش لانا شروع کرتی تھیں جس کے بعد ان کے انجنوں باڈیوں پہ کام شروع ہو جاتا تھا تو تین چار بجے سے پہلے خود اس کا جی بسوں کے پاس سے اٹھنے کو نہیں کرتا تھا۔ ڈیزل، دھوئیں اور لبری کیٹنگ آئل کی بو اس نے بچپن سے سونگھی تھی۔ ننگے کھلے مذاق کرتے ہوئے مکینک، پانے اٹھانے، شیشے گھسنے، جھاڑو لگانے والے اسٹنٹ جو ”چھوٹے“ کہلاتے تھے۔ سارے کے سارے بڑے چھوٹے مرد۔ رات کے ان گھنٹوں میں بیویوں، بچوں، داشتاؤں... کسی کی جگہ نہیں تھی۔

روزی تیار ہو کے نگلی تو ٹیہو ٹیہو جمیلہ کو یا اس کے ٹرانزسٹر ریڈیو کو الٹ پلٹ کے دیکھ رہا تھا۔ چوکی پر وہ اس سے اتنا بھڑکے بیٹھی تھی اور بنا بجلی چلنے والے اس ریڈیو کے رموز اس طرح سمجھا رہی تھی کہ روزی سب کچھ سمجھ گئی۔ دڈی کا یا کسی کا بھی دور دور پتا نہیں تھا۔ صورت حال پوری طرح جمیلہ کے کنٹرول میں تھی۔

روزی نے خود سے کہا، ”یہ صحیح ہے۔ دڈی ایک بجے سے شام چھ بجے کی شفٹ اب جمیلہ کے حوالے کر رہی ہے۔ جان چھوٹی۔“ اس نے بسوں والے سے کہا، ”آؤنا چلیں۔“

بسوں والا روزی کا ہاتھ پکڑ، ”اچھا چلتے ہیں جمیلہ جی!“ کہتا ہوا سیڑھیوں سے اپنے پُرشور انداز میں اتر گیا۔ پر جانے سے پہلے وہ دڈی کی دواؤں کے لیے چوکی پر سو روپے کا ایک نوٹ چھوڑ گیا تھا۔ اس نے کام والے لڑکے کے لیے بھی روپے کا نوٹ چھوڑا تھا جو اس کے جاتے ہی لمڈے نے جھپٹ کے اٹھا لیا اور پتلون کی جیب میں ڈال لیا۔ فلیٹ سے روانہ ہوتے وقت وہ اس نوٹ کو، اور اگر قسمت نے یاوری کی تو کسی اور مہمان سے ملنے والے کسی دوسرے نوٹ کو، پتلون کی چور جیب میں چھپا لے گا۔ یہ بات بہت ضروری تھی ورنہ باوانے کہہ دیا تھا، ”تو نے اگر کسی سے پیسے لیے تو کھال ادھیڑ دوں گا۔“ لمڈا کچی گولیاں نہیں کھیلا تھا۔ یہ پیسے وہ اپنے دوستوں کے ساتھ فلم دیکھنے اور ہوٹل کا کھانا کھانے میں اڑاتا تھا... باوا کو ان کی ہوا بھی نہیں لگنے دیتا تھا۔

جیب میں نوٹ ڈالنے کے بعد لمڈا سیدھا باورچی خانے پہنچا۔ نگلی نا بے بی پڑے

پہ بیٹھی بے دھیانی میں کسی کتاب کے ورق پلٹ رہی تھی۔ لمڈے کو خبر تھی کہ نگینہ کو اس ٹیہو ٹیہو والے سے دور رکھا جا رہا ہے۔ اس نے راز داری سے کہا، ”وہ چلا گیا بسوں والا سیٹھ... آجاؤ۔“ پھر اس نے اپنی جیب تھپکی۔ ”مجھے آج بھی پورا ایک روپیا دیا ہے اس نے۔“

نگینہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ بیزاری سے بولی، ”معلوم ہے، ایک تمھارا ایک ددی کا نوٹ تو بندھا ہوا ہے۔“

یہ بات سوچ میں ڈالنے والی تھی۔ لمڈے کا تیز طرار ذہن دونوں نوٹوں کے آپس کے تعلق کو سمجھ گیا تھا۔ ددی کے نوٹ کے ساتھ جڑ کے اس کا اپنا نوٹ اب اتنا صاف ستھرا نہیں رہا تھا جتنا وہ سمجھ رہا تھا۔ خیر وہ پریشان بالکل نہ ہوا۔ اس نے خود سے کہا، ”یہ نگینہ بے بی کبھی کبھی ایسی ہی تپانے والی بات کرتی ہے۔“

دن اب اُتری ہوئی کمان کی طرح فلیٹ کی ملگجی دیواروں پر ٹنگ گیا تھا۔

نگینہ کے سر میں نہ معلوم کیوں دھمک سی تھی۔ وہ روزی کے کمرے میں جا لیٹی۔

رانی نے اسے ناوقت لیٹے دیکھا تو آگئی۔ بولی، ”کیا بات ہے؟ کیوں پڑی ہے؟“

نگی نے بتایا ایسے ہی سر میں درد ہے، تو رانی کہنے لگی، ”تصویریں دیکھے گی؟... ایمان سے ایسی تصویریں آئی ہیں کہ سر کا درد ایک منٹ میں غائب ہو جائے گا۔“

نگی انکار بھی کرتی تو جان نہیں چھوٹی، رانی تصویریں دکھا کے ہی رہتی، باز نہیں آتی۔

چار دن کے لیے وہ زمیں داروں کے وہاں شادی کی محفلیں کرنے گئی تھی۔ پورا طائفہ تھا... جانی خاں، رمجو اجمیری، سراجا پیٹی ماسٹر۔ لدھیانے والی نیلم بائی اپنی تین چار شاگردوں کو لے گئی تھی۔ اب جو طائفہ لوٹا تھا تو رانی مہمان داریوں، محفلوں کی تصویریں لائی تھی۔ ددی نے اپنی بیٹھک سے صرف رانی کو بھیجا تھا۔ نیلم بائی بہت سر ہوئی تھی، ددی کی جان کو آگئی تھی کہ ”نگینہ کو بھیج دو۔ یہ پرانے قدردان جاگیردار لوگ ہیں۔ اچھا سننے والوں میں سے ہیں۔ ہمارے ساتھ بھیج دو تو وڈیروں، زمین داروں میں بے بی کا نام چل پڑے گا۔“

سازندوں نے بھی سمجھایا تھا کہ ”ددی جی! گانے کی اصل کمائی تو اب جاگیروں اور بڑی بڑی زمین داریوں پر ہی ہوتی ہے۔ شہروں میں تو لوگ شادی بیاہ میں ریکارڈنگ کر کے شوق پورا کر لیتے ہیں۔ نگی سے مجرے کروانا ہے تو بسم اللہ کر کے نیلم بائی کے ساتھ ایک بار بھیج دو۔ پاؤں کھلا ہو جائے گا۔“ مگر ددی ان لُقوں سازندوں کو خوب سمجھتی تھی۔ سب کے سب نیلم کی خوشامد

میں بک بک کر رہے تھے۔

ویسے ددی کا جی تو بہت کرتا تھا کہ نگینہ کو شہر سے باہر ایک دو محفل گوا کے دیکھے آخر بنتا کیا ہے۔ لکھشن گیت سے نکل گئی تھی بچی، اب ٹھمری غزل ایسی ضرور گا لیتی تھی کہ گاؤں قصوں والوں کی تسلی ہو جائے۔ نیلم نے بھی کہا تھا، ”جانکار گلی گلی تو ہوتے نہیں۔ بھیج دے گی تو پتا بھی نہیں چلے گا کہ کتنی پکی ہے۔ شادی میں نام ہو جائے گا کہ نگینہ بھی کوئی آرٹسٹ ہے جو غزل ٹھمری گا سکتی ہے۔ یہ شہرت آگے بہت کام آئے گی۔“ مگر وہ جو کہتے ہیں نا کہ کوری نوچی کوناک میں نتھ ڈال کے گاؤں گاؤں نہیں پھراتے۔ بڑے بوڑھوں کی بھی کوئی مصلحتیں ہوں گی جب ہی روکا ہے ان باتوں سے۔ پھر ددی خود جا رہی ہوتی تو کوئی بات بھی تھی۔ کسی دوسری کے ساتھ، خاص طور پہ نیلم بائی کی ہزدنگیوں کے ساتھ ددی نے اپنے نگینے کو بھیجنا مصلحت کے خلاف سمجھا۔ کچھ نہیں کچھ نہیں تو بیس تیس ہزار کی نتھ بڑھائی تھی اور بیس تیس ہزار، بیس تیس ہزار ہوتے ہیں۔ اتنی رقم میں تو ایک سو بیس بیس گز پہ بنے دو مکان آجائیں۔ نیلم جیسوں نے تو خواب میں بھی تیس ہزار کی نتھ بڑھائی نہیں سنی ہوگی۔ کیا خبر دل میں بے ایمانی آجائے۔ کسی جاگیردار، خان، ملک، وڈیرے سے چوری چوری معاملہ کر لے۔ واپس آ کے ہمیں جھوٹی پتھی سنا دے کہ جی طمنچہ دکھا کے، بندوق سیدھی کر کے اٹھالے گئے تھے لڑکی کو، ہم کیا کرتے۔

”ناجی نا!“ ددی نے صاف کہہ دیا نیلم سے کہ ”ہم خود جائیں گے تو لے جائیں گے بے بی کو اور کیا؟ جب صحیح ٹائم آئے گا تو کوئی اچھی بات، کوئی برکت والی سوچ، سوچ لیں گے... ابھی عمر ہی کیا ہے بچی کی۔ ناجی نا!... تم رانی کو لے جاؤ۔ بھلے ہی مان جائے تو جمیلہ کو لے جاؤ۔ شوق سے لے جاؤ، بسم اللہ۔ گانا تو جمیلہ بھی گا ہی لیتی ہے۔ غزل ٹھمری نہیں، ناسہی۔“

تو خیر سے رانی شادی کی محفلیں ناچ کے آئی تھی اور اپنے دو قدر دانوں کے ہاتھ کی کھینچی ہوئی ڈھائی تین درجن تصویریں لائی تھی۔ دو تصویریں تو اتنی بڑی بڑی تھیں، بالشت بالشت بھر کی۔ ان میں رانی باری باری اپنے ایک اور دوسرے قدر دان کے گلے میں ہاتھ ڈالے بیٹھی تھی۔ قصبے کے فوٹو گرافر نے ان تصویروں کو شوخ رنگوں میں رنگ دیا تھا۔ رانی کے گالوں پہ بھی لالی لگانے کی کوشش کی تھی۔ تماش بین جاگیرداروں کے شوقین مزاج بیٹوں نے ان تصویروں کو راتوں رات دھلوا کے کاپیاں نکلوائی تھیں اور صبح جب نیلم بائی، سب سازندے

اور نیلم کی پھوریاں ریل گاڑیاں پہ سوار ہونے اسٹیشن پہنچے تھے تو دونوں قدر دان پچھیرے تصویروں کا لفافہ لیے پہلے سے پلیٹ فارم پر ٹہل رہے تھے۔

رانی قہقہہ مار کے بتانے لگی کہ جب گاڑی چلی تو دونوں گھونچو سالے، گلے میں لال پیلے مفلر ڈالے چلتی گاڑی کے ساتھ ساتھ دوڑتے تھے اور پتا پوچھتے جاتے تھے کہ ”بتاؤ، ہم تمہیں خط لکھیں گے، شہر آئے تو ملاقات کریں گے، آم لائیں گے شہداد پور کے۔“

رانی جس طرح اکیٹنگ کر کر کے بتا رہی تھی وہ اتنا مزے کا تھا کہ واقعی نگ کی سر کا درد ختم ہو گیا۔

رانی نے ان تصویروں میں گھانس کے گٹھے جیسی اور ہینڈل مار کہ مونچھوں والے دو ساٹھے پاٹھے جاگیر داروں کو دکھایا جنہوں نے طائفے کی میزبانی کی تھی۔ وہ بتانے لگی کہ محفل کے بعد جب فن کی قدر شناسی کے لیے انہوں نے نیلم بائی اور اس کی شاگردوں اور رانی کو تنہائی میں شراب کی خاص محفل میں بلایا تو اس وقت تک ہینڈل چھاپ مونچھوں والا بھول چکا تھا کہ رانی صرف ناچتی ہے، گاتی نہیں۔ میز پہ گلاس رکھتے اور ڈکار لیتے ہوئے وہ بار بار اپنی گنگنی آواز میں کہتا تھا، ”واں جی واں! کیا گانتی ہو تم... ہائیں ہائیں۔“ پھر وہ رانی کی پیٹھ سہلانے لگتا تھا کہ ”واں جی واں! کتل کر چھوڑا۔“

شراب کی محفل کے بعد کی مجلس کے بارے میں رانی نے بک بک کرنی شروع کی تھی کہ لمڈا چائے لے کے آگیا۔ وہ چپ ہو گئی۔ دڈی کے طے شدہ احکامات تھے کہ لمڈے کے آگے ڈھکے کھلے کی بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ”خدا خونی کرو کم بختو! منڈے نے اپنی عمر کو پہنچنا ہے۔ ایویں بک بک کر کے اسے برباد تو نہیں نہ کرو۔“ فلیٹ میں شام اترنے کو تھی۔

رات کی تیاری میں چمپا غسل خانے میں گھس گئی تھی اور نمک کے غر غرے کر رہی تھی۔ خبر نہیں کس نے اسے روز غر غرے کرنے کو کہا تھا!

تیسرے پہر کے سو فتنے میں چمپا کی غزا ہٹوں سے پورا فلیٹ جیسے گونج رہا تھا۔ نگ کی اس شور سے ہمیشہ الجھن ہوتی تھی، مگر کیا کرتی۔ کانوں پر ہاتھ رکھ کے بیٹھی رہتی تھی۔ اس وقت بھی اس نے یہی کیا۔

اسے ایک بار کا یاد آیا جب خاں صاحب استاد نوازش علی کسی کام سے نا وقت فلیٹ

پر آئے ہوئے تھے۔ چمپا اور جمیلہ کو خاں صاحب کے آنے کی خبر نہ تھی۔ چمپا نصیبوں ماری غسل خانے میں گھس کے اسی طرح غُرا نے لگی۔ جمیلہ لٹھی کمرہ بند کیے کافی دیر سے اپنے کپڑوں کی فننگ جانچ رہی تھی۔ اس نے جو چمپا کے غرغروں کا شور سنا تو وہیں سے چیخ کر بولی، ”نگے او نگے! یہ چمپا جو ریاض کر رہی ہے پتا ہے کون سا راگ ہے؟ یہ راگ بھیرو بھونچال ہے!“ پھر وہ خود ہی زور سے ہنسی۔

ادھر لاؤنج میں استاد کے سامنے دو زانو بیٹھی ہوئی نوچیوں اور ددی جی کی جیسے سانسیں رک گئیں۔ اس سے پہلے کہ نگینہ یا کوئی اور اٹھ کے بھاگتی، جمیلہ کو چپ کراتی، بند کمرے سے اس کا قہقہہ سنائی دیا۔ پھر آواز آئی، ”سنا نگینہ؟ یاد کر لے تو بھی راگ بھونچال... یہ کتے مارنے کے کام آتا ہے... ہا ہا ہا!“

خاں صاحب استاد نوازش علی نے ددی کو گھور کے دیکھا۔ زیر لب بولے:

”واہ! ماشا اللہ! مولا اپنا کرم رکھے۔“ اور اٹھ کھڑے ہوئے۔ ددی گناہ گاروں کی طرح کہنیوں تک ہاتھ جوڑے، کھڑی خاں صاحب کا منہ تکتی رہی۔ مگر وہ رکے نہیں، جوتے پہن کے سیڑھیاں اتر گئے۔

نگینہ نے یہ سب یاد کر کے دل میں کہا، ”بے چاری جمیلہ۔“

ددی جی نے اس روز جمیلہ کا جو حال کیا تھا خدا دشمن کا بھی نہ کرے۔

نگینہ کی ٹیوشن کا وقت ہو رہا تھا۔ طبلیا رمضان میاں رجبو اجمیری سورج ڈوبتے وقت فلیٹ پہ اکیلا ہی آیا۔ کہنے لگا، ”خاں صاحب آرٹس کونسل میں استاد حبیب خاں بین کار کے سولو پروگرام میں چلے گئے ہیں۔ آج ٹیوشن پہ نہیں آئیں گے۔“

گانے بجانے کی بہت سی باتیں لمڈے کی سمجھ میں آنے لگی تھیں۔ اس نے جیسے بڑی آگہی میں سر ہلایا۔ اسے پتا تھا کہ ”سولو“ کا مطلب تھا کہ بس ایک اکیلا آدمی جو کچھ جانتا ہے وہ گاتا بجاتا رہے۔ سولو میں دوسرے کسی کو آگے نہیں لایا جاتا۔ نگی خود حیران ہوئی کہ استاد حبیب خاں صاحب وچتر وینا بجاتے ہیں، وہ سولو پروگرام دے رہے ہیں تو وہاں خاں صاحب نوازش علی کا کیا کام؟ وہ تو گویئے ہیں۔ لوگ حبیب خاں صاحب کی وینا سنیں گے یا ہمارے استاد کی لے کاری؟ رجبو سکتیے کے سننے میں ضرور کوئی گڑبڑ ہے۔ مگر ددی نے سن کے کہا کہ ”استاد ہمارے، حبیب خاں صاحب کی بانج سننے گئے ہیں۔ کوئی بڑا بجا رہا ہو تو پتر،

بڑے سننے والے نے ہی تو سامنے بیٹھنا ہوتا ہے۔“ طیلیے کو پاس بلا کے پھر کہنے لگی، ”سن او رمضان نے! تو بے بی کو پچھلا سبق ایک ویری دہر وادے۔ پھر تو بھی چلا جانا۔“ رمضان سنگتیا خوش ہو گیا۔ نگي تان پورہ لے کے آ بیٹھی تو آہستہ سے کہنے لگا، ”پچھلا سبق ایک بارد ہرا لے۔ دیکھ آج گھسائی مت کرنا میری۔ مجھے بھی آرٹس کونسل جانا ہے۔“

نگي اس سنگتے سے خاصی بے تکلف تھی۔ کہنے لگی، ”تم وہاں کیا کرو گے، استاد حبیب خاں صاحب کے ساتھ کیا تمہیں سنگت کرنی ہے؟“

رمجو شرم سے اور بھی کالا ہو گیا۔ کانوں کو ہاتھ لگا کے بولا، ”استاد اللہ رکھا سنگت کر رہے ہیں باؤلی! ہم جیسے چھٹ بھیئے تو ان گن دانوں کو بجاتے، سنگت کرتے بھی دیکھ سن لیں نا تو سمجھو پار لگ جائیں۔“ پھر سبق سن کے وہ جلدی جلدی اپنی جوڑی، ہتھوڑی، چوٹی، کینوس کے ایئر بیگ میں رکھ، زپ چڑھا فلیٹ سے نکلنے کے لیے بھاگا۔ ددی نے آواز دی، ”سن رے!“

رمجونے جوتے پہن لیے تھے، ٹھنک کے بولا، ”ایمان سے خانم جی! اس ٹیم رو کوٹو کو مت۔ بس جانے دو۔“

عام طور پر ددی اس کے ٹھکنے، جت کرنے کا جواب گالی سے دیتی تھی مگر اس وقت بہت نرمی سے کہنے لگی، ”للا! تجھے روکتی ٹوکتی نہیں۔ ادھر ہی کا ایک کام بتاتی ہوں۔ یہ لے، تین روپے رکھ لے۔ نیلے کی گلیوں کے دو ہار بنوا لینا خوب موٹے موٹے۔ ایک خاں صاحب، حبیب خاں کی وینا کو پلیٹ دینا۔ ایک اللہ رکھا استاد کی جوڑی کو پہنا دینا۔ دونوں سے کہنا... میرا کہنا، وہ آپ کو ریڈیو پہ سنتی ہے۔ آپ کی جوتیاں صاف کرنے لائک نہیں ہے، پر سنتی ہے۔ مالک بنائے رکھے... جادو نوں سے سلام کہہ دینا میرا۔“

رمجونے پیسے لے لیے۔ دیدے گھما کے بولا، ”سلام کائے کو کہلواری ہو۔ دعا دو۔ دونوں عمر میں چھوٹے ہوں گے تم سے۔“

ددی پلو سے آنکھیں پونچھ رہی تھی۔ سراٹھا کے بولی، ”ہوں گے کیا پاگلا! دونوں ہی عمر میں چھوٹے ہیں۔ پر گن وان اور کلاؤنت اپنے کاموں سے بڑے ہوتے ہیں۔ حبیب خاں جس ویلے دینا پہ ہاتھ رکھ دیں یا اللہ رکھا خاں صاحب طبلے کو انگلیاں چھو دیں تو سمجھو اس ویلے سب کے بزرگ بن جاتے ہیں۔ سمجھا کچھ؟... بس اب جادفع ہو۔“

رمضان طبلیا فلیٹ سے اتر گیا۔

اور کوٹھوں پہ رات اُتر آئی۔

پھر کسی وقت رات کی جڑواں بہن موت اس فلیٹ کی دہلیز پار کر کے اندر آئی اور خانم مالیر کو ٹلے والی کو لے گئی۔

نیا دن اُگ آیا تھا۔ گورکن کا لمڈا کتنی ہی دیر تک گرل بجاتا رہا۔ آخر نگینہ دروازہ کھولنے کو اٹھی تب ہی پتا چلا کہ کیا ہو چکا ہے۔
یہ ان سب کے میٹھے دنوں کا انت تھا۔

لمڈے کا باوا ابھی نیچے ہی کھڑا تھا۔ وہ آیا، فلیٹ کی ہا ہا کار میں اپنے بیٹے کا ہاتھ پکڑ کے اسے لے چلا۔ لمڈے نے کہا، ”میں نہیں جاتا، ادھر سب کام پڑے ہیں۔“
گورکن بولا، ”بس ہو گئے کام۔ گھر چل۔“

لمڈا اڑ گیا تو اس کا باوا کہنے لگا، ”ابے جس کے کام کو تو آیا کرتا تھا، وہ گئی... مر گئی۔
اب کیا دھرا ہے؟“

یہ بات لمڈے کی سمجھ میں نہ آئی، کہنے لگا، ”کائے کو؟ ابھی سب ہیں، نغینہ بے بی ہے۔“

باوا بولا، ”چل چل۔ جندگی بھر تو تجھے ان سارے کنجروں کی خذمتیں کرنی نہیں ہیں۔
چل گھر۔“

لمڈے نے کہا، ”جب تک نغینہ بے بی کی نتھ بڑھائی نہیں ہو جاتی میں ادھر ہی کام کروں گا۔“

یہ سن کے لمڈے کا باوا پیلا پڑ گیا... یعنی ایک بہت کالا آدمی جتنا بھی پیلا پڑ سکتا تھا۔ اس نے کہا، ”ابے تیری تو!“ اور اس نے لمڈے کو ایک زناٹے کا جھانپڑ رسید کیا۔ اندر ہی اندر اسے ہنسی بھی آتی تھی کہ دیکھو سالا پاغل! نتھ بڑھائی کو بھی کوئی شادی بیاہ سمزتا ہے۔ نتھ اترنے کے بعد وہ جیسے کوٹھے سے چلی ہی تو جائے گی، سالی کنجری!

وہ لمڈے کو کھینچتا ہوا نیچے لایا، پھر اسے رکشا میں پنک کے گھر لے گیا۔

اور وقت... جو اس دوران بھی سنناتا ہوا گزر رہا تھا اور اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی گزرا اور گزرے گا... دڈی جی کی سب نوچیوں کو اور اس کہانی میں دیکھتے چھوٹے بڑے

سب لوگوں کو سیڑھیوں پر سے اتارتا کہاں کہاں لے گیا۔

کہیں آگے چل کے جمیلہ کو وی ڈی یا ٹی بی ہو گئی۔ بس وہ اپنے انتیس برس پورے کر کے چلی گئی۔ اشک صاحب کے بیٹے، مرے مردے ماسٹر نے شادی کر لی، پھر ریڈیو کی نوکری چھوڑ پرچون کی دکان لگا لی۔ جانی خاں اور اس کی سارنگی کا میں بتا ہی چکا ہوں۔ بیگم در شہوار نصیر... جو نگینہ بے بی تھی... روزی اور جمیلہ کو کبھی یاد کرتی ہے اور رانی کو، جواب رانی نہیں کچھ اور ہے اور کہیں اور رہتی ہے، اسے بھی یاد کرتی ہے اور وہ اس چمپا کو بھی یاد کرتی ہے جس کے بارے میں مجھے کچھ نہیں معلوم۔

پر بیگم در شہوار کورنی جرمن، سابق سیکٹر انچارج کی کوئی خبر نہیں ہو پائے گی۔ اس کے علاوہ دوسرے بہت سوں کے، مثلاً رمجوا جمیری وغیرہ کے عدم وجود کا بھی اسے کوئی پتا نہیں ہوگا۔

تو ایسا ہی ایک فضول سا بے توقیر انجام کہانی کے بیشتر لوگوں کو نصیب ہوگا کہ آں قدح بشکست و آں ساقی نماند...

مسئلہ یہ ہے کہ میں ان عام سے مگر غیر معمولی اور من موہنے لوگوں کو کوئی گرینڈ فٹالے (Grand Finale) دینا چاہتا تھا، پر میں جانتا ہوں کہ وقت، جو اس کہانی کا (اور ہر کہانی کا) ایک حاوی کردار ہے، اس قدر بے بس جل کلڑا ہے کہ اپنے سوا کسی کو کچھ سمجھتا ہی نہیں۔ تو وہی سب کی اسپاٹ لائٹ چھینتا، سب ہی پر اپ اسٹے جٹک (up-staging) کرتا، رنگ منچ پہ دندنا تارہتا ہے... بس وہی دندنا تارہتا ہے گا۔



نصیبوں والیاں

صحت کے سلسلے میں بہت سوں کے اپنے اصول ہوتے ہیں... کچھ کے نہیں بھی ہوتے۔

مند ریاض کا یہ تھا کہ سویرے جلدی اٹھنے والا بندہ تھا۔ وہ روز میونسپل پارک میں شبنم سے بھیگی گھاس پہ ننگے پاؤں ٹہل ضرور لگاتا تھا۔ کہتا تھا اس سے آنکھوں کی 'روشنیائی' بہتر ہوتی ہے۔ خبر نہیں اس بہتر روشنی کو وہ گاہکوں کو پہچانے، اُن پہ کڑی نظر رکھنے کے لیے استعمال کرتا تھا یا اس کا مقصد اتنا سادہ اور روزمرہ جیسا نہیں، کوئی باقاعدہ گہرا وجودی مقصد تھا مند ریاض کا۔

جو بھی ہو۔

مند ریاض شبنم پہ ٹہل لگا کے اپنے ٹھکانے پہ پہنچنے کے لیے ددی بائی کے چو بارے کے سایہ نکل رہا تھا کہ اس نے رونے کی آوازیں سنیں۔
رات میں کسی وقت سوتے میں مگھیانے والی ددی بائی گزر گئی تھی۔

مند ریاض نے بات سنی، سمجھی، پھر بعد میں موقعے موقعے سے کہنے کو ذہن میں ایک اچھا سا فقرہ بنا کے اسے اپنے اندر فائل کر لیا۔ وہ برادری والوں میں بیٹھے گا تو ددی کو اچھے لفظوں سے یاد کرتے ہوئے یہ ضرور کہے گا کہ دیکھو جی، آرام سے گجرجی ددی جی۔ ناں

نزع کا آلم ہوانہ جان کندنی ہوئی، آرام سے سونتے سونتے گجر گئی۔ ہاہہ!... نیک روحوں نے ایسے ہی چلے جانا ہوتا ہے۔ مالک سبھوں کی شرم رکھے... آال لے!... اول لے!... یہ آخری آواز ممند ریاض کی ڈکاروں کی تھی۔

پیٹ خالی ہو یا بھرا، وہ اونچی آواز میں بولتا ہو یا کچھ سوچ رہا ہو، ممند ریاض ہر لمبے فقرے، ہر لمبی سوچ کے آخر میں آال لے! اول لے! کر کے نقلی ڈکاریں ضرور لیتا تھا۔

خیر، وہ رونے کی آوازیں سن کے ٹھٹھکا۔ دڈی بائی کا فلیٹ لڑکیوں کا گھر تھا، کوئی مرد ذات بڑا بوڑھا تھا نہیں۔ پڑوس کی نیلم بائی اور اس کے گماشتے، اسی ڈکاروں والے ممند ریاض نے فوراً آ کے چارج سنبھال لیا۔ دروغوں، پہلوانوں کو خبر کر دی گئی۔ کسی نے جا کے تھانے میں بھی بتا دیا۔ ضابطے کی پابندی نہیں تھی، ایسے ہی پڑوس پچھواڑے کی مروت ہوگی کہ بھی ہو سکتا ہے بیٹی اتار کے کروشیے کی ٹوپي سر پہ مڑھ کے فاتحہ کے دو لفظ پڑھنے ہیڈ کانشیبل میاں گل بھی پہنچ جائے۔ دڈی بائی کی اس کی برسوں کی آشنائی تھی۔

ان فلیٹوں چوباروں کا مالک حاجی قاسم نور و تھوڑی دور پہ اپنی دکان میں بیٹھا پرانے کپڑوں کی گانٹھوں کا حساب کر رہا تھا... جو وہ ہر وقت کرتا رہتا تھا۔ اس نے ایک دور دراز طمانیت کے احساس سے یہ خبر سنی اور اپنی چندیا کھجائی۔ ”اب جب کہ دڈی بائی مر گئی ہے تو یہ فلیٹ اس کے چنگل سے سمجھو آ جا دے۔ تو اب اس کا بھی کچھ کریں گے، ان شاء اللہ۔“

مگر وہ دین دار اور عملی آدمی بھی تھا۔ اس فلیٹ میں ایک میت پڑی تھی اور فلیٹ خالی کرانے سے پہلے میت کو اس کے سفر پر روانہ کرانا ضروری تھا۔ اس نے خبر دینے والے سے کہا، ”دیکھو بھائی جان! ادھر جو کوئی بھی ہووے اس کو میرا بولو کہ کاسم نور و سیٹھ میت گاڑی کا، انے گسل والی کا سب انتی جام کر دیں گا۔ ابی پھون کرتاؤں۔ تم لوگ کسی کو ادھر میوے شا بھجا کے بس گور کند کو بول دیو۔ کیا؟“

گوجرے والی خدمتی میت گاڑی کے اٹنگے پیچاے اور گجگجائی ہوئی گھنی ڈاڑھی والے جوان والنٹیئر کو بتا دیا گیا کہ کس بلڈنگ سے کنجری کی میت اٹھانے کی ہے۔ اسی نے غسال بڑھیا کو رکشے میں بٹھا کے مکرانی پاڑے سے بلڈنگ تک لانا تھا۔ قاسم نور و نے رکشا کے پیسے دیے تھے۔ اور بھی پیسے دیتے ہوئے والنٹیئر سے کہا تھا، ”ابا ثواب کا کام ہوئیں گا۔ یہ روکڑا سنبال، گسل والی کو کپڑا کا پھور دے دلا کے برابر سیٹ کر دے۔ فلیٹ دکھا دے۔ کیا؟“

پچھے چھوٹا میت گاڑی لے کے پونچ جانا۔ چھوڑ آنا ددی بچاری کو۔“
 حاجی قاسم نورو نے چھوٹی میت گاڑی کا اس لیے کہا تھا کہ اسے معلوم تھا گنتی کے
 چھ آٹھ دروغے، پہلوان، کبیوں کے بھائی بند ساتھ جائیں گے۔ باقی تو بلڈنگ میں عورتیں
 ہی عورتیں ہیں۔ انھیں قبرستان تو نہیں جانا ہوگا۔ چھوٹی گاڑی صحیح رہے گی۔ ”اس کا پھیڑ بھی
 کمتی لگیں گا۔ کیا؟“

جب گاڑی بلڈنگ سے چلی تو کالے ڈوپٹے اوڑھے، گھر کے ملگجے کپڑوں میں ملبوس
 کوٹھے والیاں اور پچھواڑے کی کم حیثیت پاڑے والیاں رورو کے بین کرنے لگیں کہ ہارے ری
 ددی بائی تو کیوں چلی گئی؟ اور کچھ دیر کو دن کے سونے میں بھی بڑی سڑک اور ساتھ کی گلیاں اور
 گلیارے آدمیوں اور آوازوں سے ایسے بھر گئے جیسے چراغ جلے پہ بھر جاتے ہوں گے۔

میت گاڑی بھی ٹھنسا ٹھنسا بھر گئی تھی۔ کچھ لوگ کھڑے تھے اور دو چار لنک بھی رہے
 تھے۔ اندریٹ پہ خیالی ڈکاریں لینے والے مند ریاض کے برابر بیٹھی ایک عورت یا لڑکی... بے
 بی لگی نا... روئے جاتی تھی۔ دوسری عورتوں کے برخلاف اس کا ڈوپٹہ زعفرانی رنگ کا تھا۔ تو کیا
 ہوا؟ آدمی کو واقعی دکھ ہو تو زعفرانی رنگ بھی ماتمی بن جاتا ہے۔ پر وہ جس کا نام بے بی لگی نا
 تھا، خبر نہیں کیوں رورہی تھی؟ حالاں کہ کسی کی ایسی کوئی رشتہ ناتے دار بھی نہیں تھی۔

میت گاڑی کے گھنی ڈاڑھی والے والنٹیر نے گاڑی میں بیٹھی اس اکیلی بائی جی کو
 دیکھا تو دل میں کہا، ”لاحول ولا... ان لوگ کو یہ کھبر نہیں کہ عورت کا کبرستان میں جانا مکروہ...
 یا کیا ہے۔ لاحول ولا... کوئی دین دھرم تو ان کنجروں کا... خیر جی ہم کون... بھئی ہمیں کیا۔“

ایک مردہ اور ایک زندہ بائی جی کو لیے، بہت سے دالوں، سازندوں، تماش بینوں
 اور ایک پولیس والے کے ساتھ، اس نے میوے شا کی سڑک پکڑ لی۔

ددی بائی مکھیا نے والی کے بغیر فلیٹ ایسا ہو گیا جیسے کسی دیہاتی فلیگ اسٹیشن پر
 مسافروں کا چھپرا۔ لڑکیاں تین روز تک چھلکوں، ردی کاغذوں، ٹوٹے ہوئے کوزوں کی طرح
 زلتی، ٹھوکروں میں لڑھکتی چیزیں بنی رہیں۔ بہت لوگ آئے، بیٹھے، ددی بائی کو یاد کیا اور
 افسوس کی شکل بنائے چلے گئے۔

آنے والوں میں دنداناتی ہوئی آنے والی ایک ہوا تھی۔ وہ اپنے ساتھ بے چینی اور

خوف اور دھول مٹی لائی۔ اس دھول مٹی اور خوف نے چیزوں کو ڈھک لیا۔ لڑکیوں کو معلوم تھا کہ دھول مٹی سے ڈھک دیا جانا، دفن ہونا ہے۔

وہ کسی کے ساتھ دفن ہونا نہیں چاہتی تھیں۔

دڈی کے گزر جانے کے چوتھے دن کام والا لڑکا فلیٹ میں آیا تو اس کا منہ سو جا ہوا تھا۔ لڑکیوں میں ایک... جیلہ... غسل خانے سے ہاتھ منہ دھو کر نکل رہی تھی۔ اس نے لڑکے کو دیکھا، حیران ہو کے بولی، ”ابے او! تیرے منہ کو کیا ہو گیا؟“

لڑکے کا جی چاہا جیلہ کی بات کا کوئی جواب نہ دے۔ مگر وہ رکی کھڑی تھی، اس نے منہ بنا کے اوں ہوں جیسا کچھ کہہ دیا۔

وہ بولی، ”کیا قوں قوں کرتا ہے، مرغی کے؟ ابے بتاتا نہیں کیا ہوا؟“

لڑکا جھنجھلا کے بولا، ”شید کی تچی نے کاٹ لیا نا۔“

جیلہ نے دانت نکال دیے، ”اوائے سائے مٹھڑے دلدار! شہد کی مکھی بھی کاٹتی ہے تیرے کو؟“

ایک اور لڑکی نے اس ناوقت مسخرے پن پہ منہ بنایا۔ تیسری، جو باہر جانے کی تیاری کر رہی تھی، مسکرا نے لگی۔ کوئی ایک، جو پردے کے پیچھے سب سن رہی تھی، کھی کھی کر کے ہنس دی۔

فلیٹ چل پڑا۔

جس کا جی چاہا کام کاج میں لڑکے کا ہاتھ بٹانے لگی۔

لڑکے نے دڈی بائی کے طریق پر گھر چلانا شروع کر دیا۔ مگر گھر چلانے کے لیے پیسے کی ضرورت ہوتی ہے اور پیسا سب دڈی بائی کے ہاتھ میں رہتا تھا۔ لڑکیوں کی رقمیں، گہنے پاتے بھی سب وہی سنبھال کے رکھتی تھی... تجوری میں۔

اور تجوری کا ایسا تھا کہ برادری کے کہے پہ، کفن دفن سے پہلے ہی اس کی چابی مینا دروغے کے پاس امانت رکھا دی گئی تھی۔ مینا سمیت سب کا کہنا تھا کہ تار دے دیا ہے، دڈی کے بھائی بشیر کو آ لینے دو، تب ہی سب مل کے کوئی فیصلہ کریں گے اور تجوری کھولیں گے۔

مگر اب یہ مسئلہ بھی تھا کہ جب تک تجوری نہیں کھلتی، روز کے خرچ کے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ تین دن تک تو کھانے کا انتظام آپی آپ ہوتا رہا؛ کبھی نیلم بائی نے، ناجونے

اور سی بے پہلوان نے، کبھی مینا دروغے نے یا کشمیری ہوٹل والے سیٹھ نے فلیٹ پر کھانا پہنچوا دیا۔ ٹھیک بھی تھا۔ موت میت کے گھر میں چولہا کیسے جلتا؟

گلابو زنائہ، جو کبھی مہینے پندرہ دن میں تالی پھٹکارتا آ جایا کرتا تھا، ایک دن وہ بھی مسافر خانے والے ہوٹل سے آلو پڑی بریانی کی چھوٹی دیگ اٹھوا لایا۔ دو وقت وہ بریانی چل گئی۔ پر اب غنی کے کھانے آنا بند ہو گئے تھے۔ فلیٹ کو واپس اپنے روٹین پہ آنا تھا۔

ایک لڑکی بالو کے پاس سوسا سو روپے پڑے تھے۔ پڑے کیا تھے، چھپا رکھے تھے اس نے۔ جب دوپہر کے کھانے کی بات چلی تو اس نے سوکانوٹ ادھار کے نام سے لڑکے کو پکڑا دیا۔ وہ قیمہ، سبزی، تیل، پیاز سب لے آیا۔

پیسے دیتے ہوئے لڑکی بالو نے سوچا تھا کہ رانی، روزی، چمپا اور نگنی نا کو بھی پیسے ڈھیلے کرنا چاہیے اور یہ جیلہ اب تک نجی کیوں بنی ہوئی ہے؟ اس کے پاس خود اپنے پیسے بھی تو ہوں گے۔

دن بھر میں کچھ نہیں کچھ نہیں تو بیس روپے کی تو صرف روٹیاں آئیں گی۔ پھر اس نے رانی کے بارے میں سوچا جو کسی کو بتائے بغیر سویرے ہی نکل گئی تھی۔ بالو نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا نیچے سلیٹی رنگ کی اوپل رکارڈ میں بیٹھ رہی تھی رانی۔ ساتھ میں وہ تھا ڈکاروں والا بے غیرت، ممند ریاض، چکن کا گلابی کرتا پہنے۔ شرم تو آتی نہیں ان بے پیروں کو۔ دڈی جی کو گزرے ابھی چوتھا دن ہے کہ انھوں نے بڑھیا کے کوٹھے پر ہاتھ ڈال دیا۔ تھک ہے! ایک دو دن تو رک جاتے بے صبرے۔ پھر جیسی سب کی صلاح ہوتی۔ مگر ان بے غیرتوں کو کس بات کی شرم مروت۔

ایک بالو ہی کیا سب جھنجھلانے لگے تھے۔ چمپا نے ناشتے کے بعد تیار ہونا شروع کر دیا تھا۔ اس نے سب کے ساتھ مسکہ بن کھایا تھا، چائے پی تھی۔ کسی کو شک بھی نہیں تھا کہ اب یہ باہر جائے گی۔ کپڑے بدل کے اس نے جیلہ سے آرٹنج کے کسی شیڈ کی لپ اسٹک مانگی، کیوں کہ یہ جوڑا اس کا آرٹنج کے شیڈ میں تھا۔ روزی بولی، ”یہ تو دڈی جی کو وزٹ کرنے میوے شا جا رہی ہوگی جو آرٹنج لپ اسٹک مانگتی ہے، کتیا!؟“ اس پر گالیاں بکتی چمپا نیچے کھول کے جھپٹ پڑی۔ بالو نے کولی ڈال کے بڑی مشکل سے اسے الگ کیا۔ اونچی آواز میں گالیاں نکالتی چمپا فلیٹ کی سیڑھیاں اتر گئی۔

لڑکے نے سوچا، ”لو جی۔ فلیٹ اب صئی سے چل پڑا۔“

باورچی خانے کی پیڑھی پر بیٹھ کے سبزی کاٹتے ہوئے لڑکی بالواس کڑوے پن کا حساب کرنے لگی جو ددی کی موت کے چوتھے دن دھیرے دھیرے فلیٹ میں ریلیز ہو رہا تھا۔ دن ڈوبنے سے پہلے ایک بڑے بھاری ٹرانسپورٹر کا بیٹا ٹھی، جو ہر دوسرے تیسرے دن آیا کرتا تھا، ددی جی کی موت کے احترام میں وہسکی لگائے بغیر خاموشی سے فلیٹ میں آیا اور سر جھکا کے بیٹھ گیا۔ وہ ددی جی کی یاد کو ایک طرح کا خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے ٹی شرٹ جینز کی بجائے آج کڑھے ہوئے گلے کا کرتا اور چوڑی دار پاجامہ پہن کے آیا تھا۔ کڑھائی ہوئی بوتلی کا اور پاجامہ پانچ پھلی مار کے لٹھے کا تھا۔ بھاری ٹرانسپورٹر کے بیٹے ٹھی نے آج اپنی چابی والے سونے کی زنجیر بھی نہیں گھمائی تھی، جیسی کہ اس کی عادت تھی، بلکہ وہ مصنوعی، احمقانہ اداسی میں پہلے دس پانچ منٹ خاموش بیٹھا، پھر اپنے چھوٹے چھوٹے جاہلانہ فقروں میں دھیرے دھیرے سمجھانے لگا کہ زندگی کا یہی ہے۔ پھر اس نے اس بات پر زور دیا کہ لڑکی روزی کو اور سب کو اپنا دل بہلانے کی ضرورت ہے۔ آخر میں وہ روزی کو اس پر آمادہ کرنے میں کامیاب ہو گیا کہ وہ کھلی ہوا میں ذرا نکلے، ایسی بند گھٹی ہوئی جگہ میں مستقل بیٹھی رہی تو خدا نہ کرے بیمار پڑ جائے گی۔ روزی نے بالوں میں جھپا جھپ کنگھا پھرایا، پھر وہ گرے کلر کی ریشمی شال لپیٹ کے ہوا میں آہستہ سے بولی، ”جمیلہ! میں ابھی آتی ہوں، پریشان نہ ہونا“ اور بھاری ٹرانسپورٹر کے بیٹے ٹھی کے ساتھ فلیٹ کی سیڑھیاں اتر گئی۔

بالو نے اندر ہی اندر دانت پیستے ہوئے ٹھی کو کھلی مردانہ گالیوں سے یاد کیا مگر پھر اس نے سوچا کہ وہ سب سے اس طرح کیوں بھڑے جا رہی ہے۔ اس نے کون سا ددی کی یاد کا اور غمی ماتمی کا یا فلیٹ کا ٹھیکا لے رکھا ہے۔ تایا بشیر آجائے، ددی نے اس کا جتنا جو تجوری میں سنبھال کے رکھا ہے، لے گی اور نکل جائے گی۔ وہ کیا کہتے ہیں کہ: ملکِ خدا تنگ تو نہیں ہے۔ بالواس ٹھی، لڑکے سے کہہ کے باہر چلی گئی کہ وہ ناجو کی بیٹھک سے ابھی ہو کے آتی ہے۔ لڑکے نے بالو کے جواب میں سر ہلا کے ”ہاں“ کہا اور لاؤنج میں نکھی چوکی کے پاس آکھڑا ہوا۔ چوکی پر بے بی نگنی نا جیسے سناٹے میں بیٹھی تھی۔ آنسوؤں نے بہہ بہہ کے اس کے گالوں پہ لکیریں سی بنادی تھیں۔

ددی جی کے گزرنے کے بعد وہ اب نگنی نا بے بی کو روتے ہوئے دیکھ رہا تھا۔ لڑکا

خاموشی سے چوکی پر بیٹھ گیا۔ پھر اس نے اپنا کالا اور محنت کے کام سے کٹا پھٹا بد صورت ہاتھ
نگی نا بے بی کے شانے پہ رکھ دیا۔
”رونا نہیں چئے!“ اس نے کہا اور خود بھی رونا شروع کر دیا۔

اگلے دن ابھی سب سو ہی رہے تھے کہ دو ٹیکسیوں میں بشیر دروغا کا سامان، وہ خود،
اس کی شاگردیں اور نوکر پہنچ گئے۔

لڑکیوں نے بشیر دروغے کو تایا کہنا سیکھا تھا۔ کیا کرتیں؛ ڈھیلے ڈھالے کپڑے
پہنے، خوب گھٹ کے ٹنڈ کرائے ہوئے سوا چھ فٹ کے اس چمکتے ہوئے کالے آدمی کو، جو کسی کا
چچا تایا کچھ بھی نہیں لگتا تھا، لڑکیاں اس وقت بھی تایا کہتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔

دروغا اونچی آواز میں بات کرنے کا عادی تھا، ٹیکسی والوں سے جھگڑتے اسے حتما
دولا کے تنور تک سنا جاسکتا تھا۔ جب تک ایک ایک صندوق اور ڈبا، ایک ایک شاگرد اور پر نہ پہنچا
دی گئی دروغا اپنا ریشمی تہبند کو لھوں تک سمیٹے، نوکروں کو اور ساتھ آئی لڑکیوں کو اونچی آواز میں
ہدایتیں اور دھمکیاں دیتا رہا کہ اوئے گرانا نہیں، توڑنا نہیں! میں مار کے سٹ دیاں گا۔

دروغے کے شور شرابے کے دوران سڑک کے بائیں رخ کی پرانی بلڈنگ کے پہلے
مالے پہ ایک کھڑکی کھلی، کھڑکی سے مہندی لگا ایک سر برآمد ہوا۔ سروالے نے آواز لگائی، ”ہاں
دروغا! آگیا ہی؟“ بشیر دروغے نے اپنا شور شرابا روک کے مہندی سروالے کو دیکھا، ٹھٹھا مار کے
جواب دیا، ”ہاں ہی مینا دروغا!... آگئے۔“ یہ کہتے ہوئے اس کے لہجے میں بڑی مسرت تھی۔

مینا نے جواب میں کہا، ”بسم اللہ او بسم اللہ!“ اور سر اندر کر لیا۔

بشیر نے رخ بدل کے اسی پہلے والے زور شور سے نوکروں اور شاگردوں کو ڈانٹنا
شروع کر دیا۔

بعد میں فلیٹ میں ایک ہی قدم جو رکھا تو بشیر پر جیسے غم کا پہاڑ ٹوٹ پڑا۔ اس کا قد
چھ فٹ کا رہ گیا اور آواز کو جیسے سیندور لگ گیا۔ فلیٹ کے دروازے پر اسے جیلہ کھڑی مل گئی تو
اس نے اس کے سر پہ اپنا بھاری سیاہ پنجا رکھا اور کم زور آواز میں بین کرنا شروع کر دیا کہ
آپاں جی کیوں چلی گئی۔ اب اس مصوم کا کیا ہوگا؟

بالو دروازے کی اوٹ میں آکھڑی ہوئی تھی۔ اس نے رانی کی طرف دیکھ کے

آہستہ سے فقرہ لگایا، ”ہوگا کیا! تایا بھینسا آگیا ہے، پھرنتھ اتروائی کرائے گا دھوم سے۔“
 دروغے سے رانی ملا کے رکھنا چاہتی تھی۔ اس نے بالو کو گھور کے دیکھا اور ڈوپیٹہ سر پہ لے کر غم میں ڈوبے ہوئے دروغے کو آداب کیا، ہاتھ تھام کے اسے چوکی تک پہنچایا۔
 دروغے نے شفقت ظاہر کرتے ہوئے بالو کے سر پر بھی ہاتھ رکھا، بولا، ”جیتی رہ
 بچی جیتی رہ۔ اوتھ سب نکی نکی چڑیوں نے کیسے جھیلا ہوگا یہ غم کا پہاڑ؟... ہائے!“
 سب چوکی کے سامنے آگئی تھیں۔ لڑکی روزی کو آتے دیر ہوگئی۔ تائے نے دیکھا
 کہ ایک رہ گئی تھی وہ اب آرہی ہے۔ اس نے کندھے پر پڑا تولیہ منھ پہ ڈال لیا۔ تولیے میں
 سے بولا، ”روزیے! اوپتر! اوئے کیا کریں؟ کدر جائیں؟ کیا کریں نی؟“
 بالو نے رانی کے کان میں کہا، ”موج بہاراں!“ اور بالکنی کی طرف نکل گئی۔
 بشیرے نے اب کام والے لڑکے کو دیکھا، ”توں کون ہے بی؟“
 رانی نے بتایا کہ یہ کام والا لڑکا رفیق ہے۔ ددی جی اس سے بڑا لاڈ کرتی تھیں۔
 بھینسے نے لڑکے کو چمکارا، اپنے پاس بلایا۔ وہ نئی جگہ پہنچ کر اپنے ہم نوا بنانے کی
 اہمیت سمجھتا تھا۔ کہنے لگا، ”جو آپاں جی کالا ڈلا وہ اپنا لا ڈلا۔ کیا نام بتایا تھا پتر؟“
 ”رفیق۔“

”اچھا تو رفیک پتر! بزار سے سودا سلف توں لاتا ہے؟“
 ”ہاں صاب۔“

”ہوں۔“ دروغے نے پُر خیال انداز میں اپنے کُرتے کے نیچے پہنے شلو کے کی
 جیبیں ٹولنی شروع کیں۔ سوکا ایک نوٹ نکالا، لڑکے کی طرف بڑھاتے ہوئے بولا، ”لے پتر! یہ
 سنبھال۔ یہ نوٹ ہے سوں کا۔ گھر میں اس وکت بندے ہیں چھتے چھہ باراں اور ایک توں۔
 بی جا، تیراں بن لے کے آ۔ فافٹ... کاغذ کی تھیلی میں ملتے ہیں وہ موٹے والے بن اور بی
 ایک... ناں، ڈیڑھ سیر لے کے آدئی... جاہاں، لے آ... پھر جھپٹ کے ناشتا کر لیاں گے۔“
 لڑکا، ”اچھا صاب!“ کہہ کے برتن لانے کچن کی طرف جاتا تھا کہ دروغا نے
 پوچھا، ”او کیوں بی کا کے! کنی ایک دکاناں ہوں گی ادھر ددھ دئی کی؟“
 لڑکا بولا، ”پتا نہیں تین چار دینچی ہیں میں نے۔“
 اس جواب سے دروغے کی تشفی نہیں ہوئی تو وہ بڑبڑانے لگا کہ بھئی شہر کے دودھ

دہی پہ اعتبار کوئی نہیں کیا جاسکتا... بھاویں شہر کوئی بھی ہو۔ پھر بولا کہ چل پتر، میں دیکھوں کیسا دودھ دہی دیتے ہیں، کیا کرتے ہیں ادھر کے دکان دار!

لڑکا دہی کے لیے برتن اور بنوں کے لیے تھیلی لے کے چلا تو دروغا بھی جوتیاں پہن کے ساتھ ہولیا۔

باہر آیا تو وہ بڑی سڑک پر لڑکے کے پیچھے کچھ دور چلا۔ لڑکے نے اسے اشارے سے دودھ دہی کی دکانیں دکھا دیں۔ دروغے نے پسندیدگی میں سر ہلایا۔ پھر اچانک یاد آ گیا کہ اسے نہانے کا صابن لینا ہے۔ وہ بولا، ”لے بی پتر دکانیں تو ٹھیک ہی ہیں۔ تو دئی لے، بن لے۔ میں ادھر سے صابن پکڑ لوں... چنگا؟“

لڑکا دہی لینے چلا اور دروغا تیزی سے قدم بڑھا کے سڑک پار کر گیا۔ پہلے اس نے ادھر ادھر، پھر ددی کی بالکنی پر نظر ڈالی۔ بالکنی خالی تھی۔ لڑکا بھی نیچے کہیں نہیں تھا۔ دروغا تیزی سے اس پرانی بلڈنگ میں داخل ہو گیا جس کے پہلے مالے کی کھڑکی سے مینے نے اپنا لال سر نکال کے اسے بسم اللہ کہی تھی۔ بشیر دروغا مینا کی بیٹھک پر زیادہ سے زیادہ پانچ منٹ رکا ہوگا۔ پرانی بلڈنگ سے نکلتے ہوئے اس نے پھر دائیں بائیں دیکھا اور سڑک پر آ گیا۔ سڑک پار کرتے ہوئے اس نے دودھ دہی کی دکانوں کی طرف تাকা۔ لڑکا اب بھی سامنے نہیں تھا۔ دروغا فلیٹ کی طرف چلنے لگا تو اسے لڑکا دکھائی دیا۔ وہ انتظار کرنے لگا۔ یہ صحیح ہے! دروغا بشیر نے اطمینان میں سر ہلایا۔ وہ دونوں ساتھ نکلے تھے، ساتھ لوٹ رہے ہیں۔

ناشتے سے پہلے دروغے نے تولیہ اٹھا، غسل خانے کی راہ لی۔ اسے یاد تھا کہ اس نے لڑکے سے صابن خریدنے کی بات کہی تھی تو اب اس نے اسے اور سب کو سنا کے کہا کہ بھی یہ بازار بھی خوب ہے۔ ”ادھر کام کی چیز بھاویں ناں نہ ہو، فیشن کی چیزاں بہت نظر آتی ہیں۔ او پتر بالو! بے کوئی لال صابن، کوئی سلیٹ پڑا ہووے تو دے دئیں۔ شاباش!“

نہانے کے بعد بشیر دروغا کالے بدن پر لمبا تولیہ لپیٹے غسل خانے سے نکلا اور اپنے کسی نوکر جیوے کو زور زور سے پکارتا ددی کے کمرے میں گھس گیا۔ اندر پہنچ کے بھی وہ برابر آوازیں دیتا رہا، ”اولا اوئے جیوے! میرے کپڑے لکال دے۔“

جیوا تیز تیز چلتا ہوا آیا۔ کچھ دیر دروغے کے اندر پڑے ٹرکوں، سوٹ کیسوں میں کھڑ بڑ کرتا رہا، کمرے سے باہر آ گیا، کہ بشیر دروغا کی آواز سنائی دی۔ ”بوہا بند کر کے جائیں

اویں... میں کپڑے پانا آں!“ جیوا دروازہ بند کر گیا۔

دڈی کی لڑکیاں اور تایا بشر کی شاگردیں پلاسٹک بچھا کے پلیٹوں میں چچے بھر بھر کے دہی ڈالنے اور کاغذ کی تھیلیاں پھاڑ پھاڑ کے فروٹ بن نکالنے لگیں۔

دروغا کسی بھی طرف سے موسیقی کا رسیا نہیں لگتا تھا مگر اس وقت وہ دڈی کے کمرے میں رکھا بڑا ریڈیو خوب زور شور سے بجا رہا تھا۔

دیر ہوگئی، بشر دروغا کپڑے بدل کے نہیں آیا تو لڑکے نے دڈی والے کمرے کا دروازہ بجایا۔ ”استاد چاء بناؤں؟ کہ بعد میں چاء پیو گے؟“

اندر سے دروغے کی جھنجھلائی ہوئی آواز آئی، ”نہیں اویں چاشا کوئی نہیں۔ بس دئی لکال لے... میں آیا۔“

اور کوئی پانچ سات منٹ بعد کتھی رنگ کے کڑھے ہوئے گرتے اور بوسکی کلر کے تہبند میں عطر میں بھسکتا ہوا بشر تایا کمرہ کھول کے، ”آؤ بی آجاؤ بسم اللہ“ کہتا ہوا نکلا اور پلاسٹک کے دسترخوان پر اس نے اپنی جگہ سنبھالی۔

ناشتے پہ لڑکیاں بالکل خاموش رہیں۔ ہاں دروغا فروٹ بنوں کی تعریف کرتا اور میل محبت اور آپس کے بھائی چارے کے فضائل بیان کرتا رہا اور چپ چپ کر کے منہ چلاتا رہا۔ دہی کے بارے میں اس کی رائے محفوظ تھی۔ دکانیں تو بڑی شوشا والی تھیں پر کہنے لگا کہ ایسی دکانوں پر دہی کیسی ہونی چاہیے، یہ سمجھنے میں کچھ ٹائم تو لگے گا ہی۔

ناشتے کے بعد دروغا خلال کرتا، ڈکار لیتا بالکنی تک ہی پہنچا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ چھوٹا موٹا ایک جلوس فلیٹ میں داخل ہونے کو زینے پر کھڑا تھا۔ مینا دروغا، ناجو بائی، نیلم لدھیانے والی اور دوسری بایاں، ممند ریاض اور اس جیسی دو تین شکلیں، کشمیر ہوٹل والا اور فینسی حمام اینڈ ہیئر کٹنگ سے لون کا مالک نواز دین اندر آ گئے۔

اتنے بہت سے لوگ، یہ سارے پڑوسی اور برادری کے سربراہ آوردہ افراد، دڈی کی موت پر اس کے غم زدہ بھائی بشر کو پُر سادینے آئے تھے۔

دروغے نے لڑکیوں کو اشارہ کیا۔ مجرے کا کمرہ... روزی روزگار کی جگہ... ایسے سوگوار اجتماع کے لیے مناسب تو نہ تھی، مگر کیا ہو سکتا تھا۔ مجرے والا ہال کھول دیا گیا۔ وہاں لڑکیوں نے ہال کے آئینوں پر میلی ملگجی چادریں، کمبل ٹانگ دیے تھے اور بروکیڈ کے غلاف

کھینچ کے ننگے سوغوار تکیے بے ترتیبی سے ادھر ادھر ڈال دیے تھے۔ دروغا نے پسندیدگی میں سر ہلایا۔ اجلی چاندنی پر سب آنے والے بیٹھ گئے۔ انھوں نے دونوں دروغوں، بشیر اور مہندی سروالے مینا کو اصرار کر کے صدر میں بڑے گاؤ تکیے کے ساتھ بٹھایا تھا۔ حالاں کہ بشیر اور مینے دونوں انکسار سے کام لیتے ہوئے ہاتھ جوڑتے اور اصرار کرنے والوں کے پیروں کی طرف ہاتھ بڑھا کر اپنی عاجزی ظاہر کرتے تھے۔ پھر بھی وہ اس ایک ہی تکیے سے ٹیک لگا کے ایک دوسرے سے بھڑکے بیٹھ گئے اور آپس میں اس آخری ملاقات کو یاد کرنے لگے جب ”آپاں، اللہ بخشے زندگی تھی۔“

مینا دروغا بولا، ”یار بشیر بھائی! آپ دبل گئے، اب ڈیڑھ برس پیچھے دیکھتا ہوں آپ کو تو بہت ہی کچھ فرق لگتا ہے۔“

بشیر بولا کہ، ”ٹیم سب ہی کو خراب کرتا ہے دروغا۔ میں جو ابھی فٹ پیری پہ کھڑا سامان سیٹا تھا اور آپ نے اپنی کھڑکی سے جھانک کے سلام دعا کی تھی تو سچی بات ہے فوری میں تو مینا بھائی! میں آپ کو پہچان نہیں پایا۔“

مینا کہنے لگا، ”کیسے بھلا؟“

بشیر مینے کی طرف گھوما، یعنی اپنی گینڈا گردن کے ساتھ جتنا بھی گھوم سکتا تھا، اور بولا، ”بئی یہ لال سر تو کبھی نہیں دیکھا تھا آپ کا۔“

مینا مروت میں ہاہا کر کے تھوڑا ہنسا۔ ”کیا کریں بھائی بشیر! ہم تو اب بوڑھی گھوڑیوں میں گئے جانے لگے... تو بس، لگام کو تو پھر لال رنگنا ہی رنگنا تھا۔ ہاہاہا!“

حمام والا نواز دین اپنی دکان پہ گاہک چھوڑ کے آیا تھا، اس نے دروغوں کی وقت گزاری بات چیت بچ سے اچک لی۔ بولا، ”بڑا افسوس ہوا جی ددی بائی کے فوت ہونے کا سن کے۔ اللہ مغفرت کرے۔ میں اس روز دکان پہ نہیں آیا تھا ورنہ جاتا مٹی دینے۔“

نواز دین نے پہل کی تو سب آنے والوں نے فردا فردا بشیر دروغے کو ددی کا پُرسا دیا۔ سڑک کی عورتوں نے جو سر ڈھکتے ہوئے ڈوپٹوں کو کانوں کے پیچھے اتناڑس کے آئی تھیں کہ پیشانیوں کا بھی کچھ حصہ ڈھک گیا تھا، ہلکی آواز میں تھوڑا رو کر دکھایا، پھر چپ ہو گئیں۔ پُرسا دیتے ہوئے پڑوسی اور سب برادری والے بڑے فکر مند اور نیک دکھائی دینے لگے اور پُرسا لیتے ہوئے دروغا بشیر ایسا مظلوم اور ستایا ہوا بن گیا جیسے موت اسی کو ستانے کے لیے ایجاد

کی گئی تھی۔ اس کا قد اور بھی تین انچ گھٹ گیا اور آواز میں پھر سیندور بیٹھ گیا۔

پُر سے کا سلسلہ ختم ہوا تو مینا دروغے نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور ددی والی لڑکیوں کے عمومی جتھے کی طرف دیکھ کر کہا، ”بھئی برادری کے لوگوں اور پڑوسیوں پنچوں نے میرے پہ ذمہ واری ڈالی تھی تجوری کی چابی کی، تو میں نے یہ بول دیا تھا کہ اصل تو دروغا بشیر نے ہی سب دیکھنا بھالنا ہے... تو جی میں نے ادھر تار دلوایا دیا تھا بشیر بھائی کو اور ختی طور پر... سمجھو جی تک اصل وارث نہیں آوے... یہ چابی اپنے پاس رکھ چھوڑی تھی۔ اگر نہیں رکھتا تو دس طرے کے جھگڑے مٹنے ہوتے۔ ادھر ددی جی کے پاس امانتیں بھی ہوں گی... اور بھی سب کچھ ہے۔ اس لیے بھیا! چابی سمبال کے میں جو ادھر سے گیا تھا تو فلیٹ کی طرف اب آیا ہوں۔ میں نے اپنے کو بولا تھا کہ مینے باشا، بہتری تیری اسی میں ہے کہ ابھی جب تک ددی کا اصل وارث نہیں آجاوے تو فلیٹ کی سیڑھی مت چڑھنا، کس لیے کہ تیرے پاس تجوری کی چابی ہے۔ کدھر سے کوئی الزام بہتان نہیں بن جاوے... تو اب سب برادری والوں، پڑوسیوں کی ساکشی میں... بھیا! یہ لو... میں نے ذمہ واری اپنی پوری کردی... لو بھئی سمبالو ددی جی کی چابی۔“

مینا نے بشیرے کی طرف چابی بڑھائی۔ اس نے چابی کو ہاتھ نہ لگایا۔ وہ آنکھیں پٹیٹانے لگا، مانو اب رونے ہی والا ہے۔ مینا دروغے نے شانے پہ اس کے ہاتھ رکھ دیا۔ بولا، ”یہ سبج لے بشیر چودھری کہ دنیا کا دستور یہی ہے۔ اب یہ پگ تیرے سر پہ آئی ہے۔“

فلیٹ والیوں کے ہجوم میں کھڑی جمیلہ نے سب کی طرف دیکھا، جھک کے روزی کے کان میں کہا، ”ددی جی پگ تو نہیں باندھتی تھی!“

روزی نے اسے سرگوشی میں جھڑکا، ”بکو اس نہیں کر۔“

اس وقت تک بشیر دروغا سب کے بے حد اصرار پر ددی جی کی چابی سنبھال چکا تھا۔ تقریر کی باری اب اس کی تھی۔ مگر وہ دیکھ رہا تھا کہ حمام کا پروپرائٹر نواز دین بے چین ہے، جانا چاہتا ہے۔ اس نے سوچا نواز دین کو فارغ کر دوں۔ بولا، ”بھائی نواز دین! آپ نے بڑی شفقت، بڑی بھائی بندی و خائی جو آپ آگئے۔“

”بھائی بندی“ کے لفظ پر نواز دین کا منہ بن گیا۔ وہ خدا سے چاہتا تھا کہ کسی اور بازار میں ٹھیک سی جگہ مل جائے تو وہ اس کنجر پاڑے سے دکان سمیٹ کے بس چلا جائے۔ مگر خیر، کیوں کہ بھائی کہتے ہوئے دروغے کی نیت نیک تھی اس لیے اس نے خود کو تسلی دی اور نیم

قد اٹھ کے ہاتھ بڑھا دیے، ”اب اجازت دو دروغا! دکان پر گاہک چھوڑ کے آیا ہوں۔“

کشمیر ہوٹل والے نے بھی ہاتھ بڑھا دیے، ”میں بھی چلوں گا دروغے جی!“

”بسم اللہ... خیر ہووے۔“ کشمیر ہوٹل والا اور نواز دین چلے گئے تو لڑکے نے ان

کے پیچھے فلیٹ کا دروازہ بند کر دیا۔ اب صرف برادری کے عورت مرد رہ گئے تھے، سو بشر نے آواز کو حلق ہی میں گھونٹ کے اس میں آنسوؤں کی ملاوٹ کی اور روتے ہوئے سروں میں کہا کہ رب جانتا ہے آپاں جی کی چابیاں سنبھالنے کا میں نے کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ ”میں تو سمجھتا تھا کہ میری چابیاں... مطلب میری خبر سنیں گی آپاں جی کہ تو بنی بشار گجر گیا... خیر، تار بھیجا تھا بھائی مینا دروغے نے، میں چل پڑا۔ برادری کا حکم تھا، کیسے نہیں آتا۔ رب جانتا ہے مجھے نہیں پتا ادھر کرایہ بجلی پانی گیس... اس میں مجھے پورا بھی پڑے گا یا ان مصوموں کے ساتھ، جھانوں ریل چڑھا کے لایا ہوں، بھک مرنا پئے گا۔ تو جو برادری کا حکم۔ پر ایک بات ابھی صاف کر دوں میں۔ سارے ای بھائی بند بیٹھے ہیں... بشار بھوکوں مر جائے گا پر جو کچھ آپاں جی نے ادھر میل جول، گھر گھستی، پیسا کوڑی بنایا ہے اس میں ایک ٹیڈی پیسے کا حق نہیں مانگے گا بشار۔ یہ پکی بات ہے۔“

جیلہ نے کسی کو مخاطب کیے بغیر آہستہ سے خود سے کہا، ”کیا بات ہے! یہ دروغا نہیں

درویش ہے، ادھو ہو ہو۔“

دروغے کی تقریر جاری تھی۔ وہ کہہ رہا تھا:

”تھوڑا بہت جمع پونجی جو بھی ہے وہ ساتھ لے آیا ہوں۔ کس لیے کہ واپس نہیں

جانا۔ اب تو اسی ٹھکانے پہ بچیوں کے لیے کام تلاش کرنا ہے اور بچیاں دڈی جی کی یہ نہیں نہ سمجھیں کہ ہم ان کی روزی روٹی میں رب نہ کرے کوئی کھنڈت ڈالیں گے۔ ناں ناں بنی ناں۔ بشار دروغے نے اپنی شگردوں کو سکھلایا ہے کہ پتر دو بے لوک کے روٹی رزک پہ نجر نہیں ڈالنی۔ سب کو اپنی پشانی کا لکھا کمانے کھانے دو۔ جو جس کا اسی کو مبارک... جتنا کچھ کام، جو کلا بشار نے اپنی بچیوں کو سکھلائی ہے ان کے لیے وہ ہی بس ہے... مالک کے کرم سے۔“

بشار دروغے کی تقریر کا جو اثر برادری پہ پڑا ہو وہ برادری جانے، دڈی کی اکثر ’بچیوں‘ نے اطمینان کا سانس لیا کہ دیکھنے میں تایا بشار بھلے ہی ایسا درشتی نہ ہو پرورتا دے میں ٹھیک ٹھاک لگتا ہے۔ ایسی کھری باتیں وہی کرتا ہے جس کے دل میں کھوٹ نہ ہو، اندر جس

کے کوئی گھات لگائے نہ بیٹھا ہو۔ ددّی جی نے ان کا جو کچھ جمع جڑا سنبھال رکھا تھا یہ بھلا مانس نیک نیتی سے دے چھوڑے گا... مسئلہ ہی کوئی نہیں۔ کچھ لڑکیوں نے تو اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ تائے بشر کی شاگردوں کو یہاں پاؤں جمانے میں مدد دیں گی۔ یہ بھلا آدمی اپنا ٹھہکا چھوڑ کے ادھر آیا ہے، صرف ہماری خاطر۔ ہم ایسے بھی گئے گزرے نہیں کہ اس کی شاگردوں کی تھوڑی بہت مدد بھی نہ کریں۔

اپنی تقریر ادھوری چھوڑ کے بشیر دروغا اب آپاں جی کی اور اپنی محبتوں کا کوئی قصّے سنا رہا تھا کہ آپاں جی ایچ خیال رکھتی تھیں، ایچ کرتی تھیں، کہ اس نے دیکھا لڑکیاں پہلو بدلنے لگی ہیں اور مہمانوں میں سے کوئی کوئی جماہیاں لیتا ہے۔ تو اس نے قصّے لپیٹ لیے اور بولا، ”میں اپنے حواسوں میں نہیں آں... ابھی ایک عرض برادری سے کرنا ہے کہ بئی دس منٹی کو ہور رک جاو۔ میں تجوری کھول کے جس کسی کا جووی ہے برادری کے سامنے حوالے کر دینا چاہنا۔“ اس نے لڑکیوں سے پوچھا، ”ہیں نی بچیو! یہ چابی تجوری کی ہے؟... ہاں بھلا؟“

دو تین زنانی آوازوں نے جواب دیا، ”ہاں جی... تجوری کی ہے۔“
 ”تو فیر آئیے... یہ کام بھی نمڑ جاوے... بی بی ناجو! نیلم بائی!... توں ممند ریاض! مینا دروغے!... آؤ جی... چلو... آبیٹی بالو، نگی نا، چمپا بیٹے... لکل آؤ ادھر۔“

بشیر دروغا اٹھا تو مینے دروغا نے بھی تکیہ چھوڑ دیا۔ بحرے والے ہال سے پوری برادری پنچایت کرتی ددّی بائی کے کمرے میں آگئی۔

بشیر دروغا، عطر میں بسا، نہایا دھویا، کالا پہاڑ سا، تجوری کے قریب پہنچا۔ اس نے دیکھا کہ برادری کے اہم لوگ کمرے میں آگئے ہیں تو اونچی آواز میں بسم اللہ کہہ کے اس نے چابی لگائی اور بڑی عقیدت سے، جیسے اپنی بخشش نجات کا کوئی فریضہ انجام دے رہا ہو، چابی گھمائی۔ پھر زور لگا کے تجوری کا ہینڈل گرایا اور لوہے کا بھاری پٹ کھول دیا۔

جیسی سب تجوریاں ہوتی ہیں اندر سے یہ تجوری بھی ویسی ہی تھی، غیر اہم سی۔ کیوں کہ اصل میں تو تجوری کا ڈراما اس کے باہر ہوتا ہے۔ اندر تو کاغذات یا اجلے میلے نوٹوں کی گڈیاں، کپڑے میں لپیٹے گئے زیورات، ان کے نئے پرانے ڈبے یا ایک آدھ کوئی فضول چیز پڑی ہوتی ہے جس کی مارکیٹ ویلیو صفر ہو... مثلاً کسی پیارے کے سر سے اتاری ہوئی بالوں کی لٹ، صندل کی ڈبیاں رکھی کسی بہت عزیز، بہت پیاری جگہ کی مٹی...

اس تجوری میں بھی ایسا ہی کچھ رکھا تھا۔ یہ نائک نوٹنگی میں استعمال ہونے والا گتے اور پتی اور گوٹے کے ٹکڑوں سے بنا ملکہ کا تاج تھا، جو عام بازار میں ایک آنے کا بھی نہ بکتا۔ بشیر دروغے نے تاج شاہی کو تجوری سے نکال دڈی کے بستر پہ رکھ دیا۔ تاج کے نیچے پوسٹر تھے، لال پیلے نیلے رنگوں میں چھپے ہوئے۔ کسی پرانی گراموفون کمپنی کا نشان تھا جس پر کالے دھبوں والا سفید ڈب کھڑا کتا بھونپو میں منہ دیے بیٹھا بڑے سکون سے کچھ سن رہا تھا۔ تجوری کے اندر کے خانے سے ایک تھیلی نکلی جس میں سکے بختے تھے۔ کمرے کے لوگوں میں سنسنی دوڑ گئی، ہونہ ہوا شریفوں کی تھیلی ہے۔ تھیلی کو بستر پر الٹا گیا تو کھلا کہ جگہ جگہ کے تانبے اور چاندی کے سکے تھے، چاندی کے کم، تانبے کے زیادہ۔

تھیلی کے ساتھ کاغذوں میں لپٹے کچھ نوٹ ملے۔ تانبے نے کاغذ الگ کیا تو دس دس کے نوٹوں کی ایک گڈی تھی، ایک سو سو کے نوٹوں کی۔ بہت ہوئے تو پندرہ نوٹ ہوں گے یا بیس۔ موٹے کپڑے کی ایک اور تھیلی بھی ملی جس میں چاندی کی پرانی جھانجریں، دیہاتی قسم کے بازو بند، پازیب اور پچھوے بھرے تھے... چاندی کے۔ اس کے سوا دڈی کی تجوری میں کچھ نہیں تھا۔

بشیر دروغے نے تجوری کے سب خانے، پھاٹک، ڈھکن، پٹ سب بھاٹم بھاٹ کھول دیے تھے۔ پھر اپنا اطمینان کرنے اور کمرے کے عورتوں مردوں کی تسلی کے لیے اس نے اپنا کالا ہاتھ تجوری میں ہر طرف پھرایا۔ اندر جھانکتے ہوئے اس نے اپنی موٹی سیاہ گردن اتنی جھکا دی کہ گردن کے پیچھے گوشت کے دو چھوٹے ٹائر سے بن گئے۔

تجوری میں نظریں اور ہاتھ پھرانے سے فارغ ہو کے بشیر دروغے نے نوشیرواں عادل کے سے انصاف اور کلبی کی سی بے نیازی سے دنیا کا سامنا کیا۔ سب کو اپنا تاریک چہرہ دکھاتے ہوں بولا، ”کوئی یہ پیسے، زیور ہیں سب۔ جس جس کا جتا ہے بتا دو، تے چک لو... ہاں... اٹھالو۔“

دروغے کی بھدی آواز کمرے میں موجود ہر مرد، ہر عورت نے سن لی، مگر اس آواز میں جو کچھ کہا گیا تھا لڑکیوں میں سے کسی کی سمجھ میں نہ آیا۔ نگلی نا کے سوا وہ سب ہی ذرا سا آگے جھک آئی تھیں تاکہ جو کچھ سننے، سمجھنے، دیکھنے سے رہ گیا ہے، وہ سن، سمجھ، دیکھ لیں۔ مگر دروغے بشیر نے پوری بات کہہ دی تھی۔ آگے سنا تھا۔

آخر دانہ چگتی چڑیا کی طرح آگے کوچھکی ہوئی بالو نے ضرورت سے زیادہ بلند آواز میں دروغے کو مخاطب کیا، حالاں کہ وہ اس کے قریب ہی کھڑی تھی۔ کہنے لگی، ”تایا بشیر! آپ کیا کہہ رہے ہیں؟... بات سمج نہیں آئی۔“

شاید بالو بھی دروغے کی لاڈلی جیسی ہوگی، اس نے بڑی شفقت سے کہا، ”نکی! میں یہ بولتا ہوں کہ بئی جس کا جتاوی ہووے، چک لو۔ ایک دو بے کو پتا تو ہے نا کہ کتنا کس کا ہے۔ تو فیر لے لو۔ سب لو اپنی اپنی چیزاں۔“

روزی ہجوم میں رستہ بناتی ہوئی دروغے بشیر تک پہنچ گئی تھی۔ اس کی آواز انتہائی تشویش میں دھیمی ہو گئی، ”کون سی چیزیں؟ دروغا! ادھر کیا ہے؟ ادھر تو کوئی رقم، کوئی زیور نہیں دروغے جی! سمجھ نہیں آئی۔“

دروغے کو روزی کی بات سے بڑا اچنبھا ہوا۔ یہ روزی کا کی کو کیا ہو گیا ہے؟... کیا کہہ رئی ہے یہ میری بچی؟ اس نے بلند آواز میں کہا، ”پتر یہ رقم ہے، خبرے ڈیڑھ کہ دو ہزار سے زیادہ۔ پھر یہ بازو بند، پازیب، بچھوے، جھانجر... یہ سب ہے نا میری جان!“

روزی کو صبر کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ چیخ کے بولی، ”او یہ ہمارا نہیں ہے۔ اکیلے میرے ہی چار سیٹ ہیں... سونے کے... بھاری بھاری اور دس باراں ہزار سے زیادہ کی رقم ہے میری۔ سب لکھی ہے میرے پاس... کیا بات کرتے ہو دروغا!... سنا؟... یہ نہیں ہے ہمارا۔“

بشیر دروغے نے رسان سے ہاتھ اٹھا کر سب کو جیسے تسلی دی۔ مگر وہ بولا تو اس کے لہجے میں قیامت خیز سردی تھی۔ ”ارام سے آرام سے بیٹا! توں کہتی ہے تیرا نہیں ہے، تو جس کا بھی ہے لے لو بئی اور توں شور نہیں کر۔ کھپ نہیں پا۔ دوسروں کو بھی سمجھنے دے۔ اپنی بات ضرور سمجھا... مگر آرام سے۔“

روزی کے برابر رانی آکھڑی ہوئی۔ دروغے کے چہرے کے آگے ہاتھ نچا کے اس نے چیختی آواز میں کہا، ”او آرام گیا تیل لینے، یہ ہوا کیا ہے؟ ہمارا سامان کدھر ہے اوئے؟... پیسے کہاں ہیں؟“

”پے سے؟... سمان؟“ دروغا چیخا۔ ”اوئے پے سے کلا.. سمان کا میرے سے کیوں پوچھتی ہے؟“

خبر نہیں پانچ کہ چھ زنانی آوازوں نے قیامت کے تپے میں سوال کیا، ”تجھ سے

نہیں تو کس سے پوچھیں؟“

بھینے نے بارہ دھونکنیوں کی پھنکار میں کہا، ”دڈی سے پوچھ، دڈی سے!“
 سب سناٹے میں رہ گئے۔ ممد ریاض نے سوچا، ”افسوس! بھین کے پیٹھ پیشے
 ایہو جی بکو اس؟“

چینتی ہوئی غوغائیاں ایسے چپ ہو گئیں تھیں جیسے انھوں نے شاخ پر سرکتا ہوا سانپ
 دیکھ لیا ہو۔

ممد ریاض نے چھوٹی سی نقلی ڈکار لی، ”آلے!... لہو جی، تجوری خالی پئی ہے...
 تے دڈی وی ایدر کوئی نہیں۔ اولے!... پر دڈی نے وی، اللہ یا نتا ہے، ایہوئی ٹھے ٹر کرنا سی!“
 پھر اس نے کچھ کڑوے پن، کچھ ہم دردی میں سوچا، ”ساری یندگی اناں گشتیوں، نصیباں
 والیوں نے اپنی وہ کرا کرا کے پے ہا کٹھا کیتا سی۔ تے ہن، لہو جی، تجوری خالی پئی ہے۔
 بھاگاں والی، بل کل خالی... آل لے... اول لے!“
 پے در پے جعلی ڈکاریں سن کے، اس ہا ہا کار میں بھی، سب اسے گھور کے دیکھنے لگے۔



جانی میاں

یہ کہانی تین آدمی سنا رہے ہیں۔ ایک تو میں ہوں راوی، الگ تھلگ رہ کے قصہ سنانے والا۔ میں کہانی میں چلتا پھرتا نظر نہیں آؤں گا۔ دوسرا زوار ہے۔ یہ سلطان بھائی کی گول پیٹھے والی دکان، گوالیار سائیکل مارٹ پر نوکر ہے۔ ان کا اسٹنٹ سمجھ لو۔ تیسرا جانی میاں کا چمپا وحید ہے۔ یہ ان کا رکھوالا ہے۔ اسے جاننے کے لیے جانی میاں کو سمجھنا ضروری ہے۔ جانی میاں رام پور کے زمیں دار ہیں۔ چالیس کے قریب ان کی عمر ہوگی، مگر ہاتھ پیر بے چارے کے قابو میں نہیں اور دماغ ایسا ہے جیسے چھوٹے بچے کا۔ وحید چچے کے ساتھ وہ کئی برس سے گول پیٹھے آرہے ہیں کیوں کہ یہیں کہیں آگے پیلا ہاؤس کے پاس یا فارس روڈ کی کسی بلڈنگ میں ریٹا بائی کا کوٹھا ہے۔ جانی میاں اس ریٹا بائی پہ عاشق ہیں۔ سال میں تین چار بار اپنی اماں جانی سے سیکڑوں بلکہ شاید ہزاروں روپے لے کر بمبئی آتے ہیں اور ریٹا پہ نچھاور کر کے اپنے رکھوالے کا ہاتھ پکڑ گاڑی چڑھ جاتے ہیں۔ دوبارہ آنے کے لیے رام پور چلے جاتے ہیں۔ سلطان بھائی سے کہیں ان لوگوں کی جان پہچان ہوگئی تھی۔ اس لیے بمبئی میں یہ دکان، گوالیار سائیکل مارٹ، جانی میاں اور وحید چچے کا پہلا اڈا بنتی ہے۔

راوی:

تو ایک روز گول پیٹھے کے مین بازار میں، گوالیار سائیکل مارٹ کے آگے پھر ٹیکسی رکی اور دونوں ایک ایک تھیلہ اٹھائے اتر پڑے۔ وحید نے ٹیکسی والے کو پیسے تھمائے اور جانی میاں کا ہاتھ پکڑ دکان کی طرف چلا۔ دکان کو پہچان کے جانی میاں کلاکاریاں مارنے لگے۔ نئے رم پرتانیں کستے ہوئے ایک فضول سے لونڈے نے انھیں دیکھا اور ٹھٹھا مار کے دوسرے فضول سے لونڈے سے کہا، ”لے بے! پھر آگئے دونوں۔“

دوسرے نے کام سے سراٹھا کے دیکھا اور پیٹ پکڑ کے ہنسنا شروع کر دیا۔ ”ابے شوق! ابے او شوق! ابے آ کے دیکھ... یہ سلطان بھائی کے رنڈی باز پھر آگئے۔“

دکان منٹ بھر میں جیسے تلپٹ ہو گئی۔ اندراستور سے اور برابر کی گلی سے تھڑے کے ساتھ قطار در قطار بجی کرائے کی چمچاتی سائیکلوں کے درمیان سے اٹھ اٹھ کے، اپنے کام روک کے، طرح طرح کے مددگار لڑکے اور مستری اور پنچر جوڑنے والے، مسکراتے، دانت دکھا دکھا کے ہنستے ہوئے، ٹھٹھے لگاتے ہوئے آئے اور انھیں گھیر کے کھڑے ہو گئے۔

ایک پرانا مستری بہت سے نئے ٹائروں کو دونوں بازوؤں میں پہنے برابر والی دکان سے نکلا۔ اس نے لڑکوں کو بھیڑ لگاتے دیکھ کے ڈانٹا، ”چلو بے، کیا بھیڑ لگا رکھی ہے؟ کام کے ٹیم کائے کو اودھم کر رہے ہو؟“ پھر جب لڑکے منتشر ہوئے اور پرانے مستری نے جانی میاں اور ان کے چچے کو سائیکل مارٹ کے بیچوں بیچ اسٹولوں پر ٹکے، اپنے تھیلے گودوں میں رکھے چپ چاپ دیدے گھماتے دیکھا تو لڑکوں کے جوش و خروش کی اصل وجہ سمجھ کے اس کی جھو جھل ختم ہو گئی۔ وہ مسکرا دیا اور جانی میاں کی طرف دیکھ کے بولا، ”اچھا! یہ آیا ہے۔ تو پھر آ گیا بے گھونچو؟... جب ہی تو کہوں یہ لمڈے کائے کو بھیڑ لگائے کھڑے ہیں۔“ پھر وہ خوش دلی سے ہنستا ہوا استور میں چلا گیا۔

لڑکوں میں سے وہ جس نے سب سے پہلے انھیں دیکھا تھا اور دوسروں کو ان کے آنے کی خبر دی تھی، اٹھا اور مسکراتا ہوا پاس آ کھڑا ہوا۔ وہ بھی اصل توجہ جانی میاں کو دے رہا تھا۔ اس نے ان کی گود میں رکھے بیگ کا تسمہ پکڑ کے کھینچا، ”ہئے ہئے! آشق جانی! کیا کیا لے آئے اپنے ماشوق کے لیے، ہمیں تو دھاؤ۔“

جانی میاں نے بیگ اپنی طرف کھینچا اور چھوٹے بچے کی جھنجھلائی ہوئی چیخنی آواز میں کہا، ”ازے بے... نہیں کرو...“ ان کے چہرے پر ستائے جانے کی الجھن اور بے بسی تھی۔ وحید تجھے نے لڑکے کا ہاتھ تسمے سے ہٹا دیا اور کہا، ”مت ستاؤ انھیں۔ میں سلطان بھائی سے شکایت کر دوں گا۔“

دھمکی کارگر ہوئی، پھر بھی لڑکے نے لوفر پن سے کہا، ”چل بے... سلطان بھائی سے شکایت کرے گا۔ سالے بونگے! کہہ کے تو دیکھ۔ بھول گیا کچھلی دے فے کا؟“ دوسرے لڑکے اور مستری کچھلی بار کا قصہ یاد کر کے ہنسنے لگے۔

زوآر جو ہمیشہ کا بھلا مانس تھا اور ہنس نہیں رہا تھا، سب کو گھور کے دیکھنے لگا۔ وحید تجھے نے اسی سے پوچھا، ”کاں گئے ہیں سلطان بھائی؟ کچھ پتا ہے؟“ زوآر سنجیدگی سے بولا، ”بلٹی چھڑانے گئے ہیں۔ دیر سے آئیں گے۔“ ”کتنی دیر سے؟“

دوسرے سب کام میں مصروف ہو چکے تھے۔ زوآر مستری نے کنکھیوں سے قریب کے لڑکوں کو پڑتالا، انھیں متوجہ نہ پا کر دھیرے سے بولا، ”دیر لگ جائے گی... کھانا کھا لیا تم لوگ نے؟“

جانی میاں جو بڑی توجہ سے زوآر کی باتیں سن رہے تھے اور اس کی صورت تکے جارہے تھے، کند ذہنی سے مسکرائے اور اونچی آواز میں خوش ہو کے بولے، ”نہیں کھایا کھانا... بوہوت بھونک لگ زئی ہے۔“

زوآر نے ہاتھ کا کام چھوڑ دیا۔ اٹھا اور اپنی پتلون کی سیٹ پہ دونوں ہاتھ صاف کیے۔ اسی طرح سنجیدگی سے بولا، ”جوزف کے اسٹال پر چلو تم دونوں۔ میں ادھر ہی آتا ہوں۔“ جانی میاں نے حلق سے خوشی کی آواز نکالی اور بیگ فرش پر رکھ کے اٹھ کھڑے ہوئے، ڈگمگاتے ہوئے چلے دکان کے باہر۔ زوآر جواب پھر اسی طرح پتلون پر ہاتھوں کا گریس صاف کر رہا تھا، آہستہ سے کہنے لگا، ”تھیلا چھوڑ کے مت جاؤ... واپس آؤ گے تو اس میں کچھ نہیں ملے گا۔“

وحید تجھے نے جانی میاں کا بیگ بھی اٹھا لیا۔ دونوں سائیکل مارٹ سے نکل کر جوزف کے اسٹال کی طرف چل پڑے۔ جانی میاں وحید کی بانہہ پکڑے ناہموار قدموں سے

جار ہے تھے، زوڑا دھیرے دھیرے چلتا ہوا ان سے پہلے پہنچ گیا۔

جوزف کا اسٹال سڑک کے کنارے ریل کی پرانی پٹریوں پر ٹکا ہوا لکڑی کی کیبن میں تھا۔ کیبن میں ایک آدمی کے کھڑے ہونے کی جگہ تھی اور وہ ایک آدمی اندر موجود تھا۔ اس نے سب سودا سلف تین رخوں پہ لگے تختوں پر سجا رکھا تھا۔ کیبن میں دو طرف سمووار اور بسکٹوں، پیسٹریوں، کریم رولوں سے بھرا، شیشے لگا نعمت خانہ تھا۔ دس بارہ آدمی چینی کی موٹی اٹھلی پیالیوں میں خوب گہری چائے پی رہے تھے۔ جانی میاں کو دیکھ کے اندر کھڑا آدمی ”ویل ویل“ کہہ کے ہنسا۔ اس کے سامنے کے دونوں ٹکیلے دانتوں پر سونے کا خول چڑھا تھا۔ کسی بھی طرح سے توہین نہ کرتے ہوئے وہ جانی میاں کو ”ڈیم بلا ڈی“ کر کر کے خوش آمدید کہہ رہا تھا۔ وحید یا زوڑا کو دیکھے بغیر وہ جانی میاں میں مصروف ہو گیا۔ ”کم آن جونی! پرنس ریپوری! سالا اتنا دن کدر ریاتم؟ آشکی کرنے اپنا گریٹا گار بو کے پاس کائیکو نہیں آیا؟“

جانی میاں پھول کی طرح کھل اٹھے۔ ”جوسف بھائی! بوہوت بھونک لگ زئی ہے۔“
جوزف ٹھٹھا مار کے بولا، ”آئی نو، آئی نو... او کے، سالا جونی پرنس! میں تیرے کو ابی مسکا پاؤں دیتا ہے۔ صبر کرو۔“

جانی میاں نے تالیاں بجاتے ہوئے وحید اور زوڑا کو باری باری مشورہ دیا، ”صبر کرو... صبر کرو۔“ پھر وہ ندیدے پن سے جوزف کے دوسرے گاہکوں کو بسکٹ پیسٹری کھاتے چائے پیتے دیکھنے لگے۔

جوزف نے بن برابر چھوٹی ڈبل روٹیوں پر اپنی چوڑی پترے جیسی چھری سے نمکین پیلے مکھن کی ایک ٹکیہ لگائی۔ بمبئی کی زباں میں یہ مسکا پاؤں تھا جسے اس نے دو نصف دائروں میں کاٹ کے ایک ایک پیسٹری کے ساتھ تام چینی کی پلیٹوں میں رکھ کے ان دو کی طرف سرکا دیا اور مشینی انداز میں کہا، ”دو فل مسکا پاؤں، دو پیسٹری، دو ڈبل چائے، پاؤلی کم دو روپیہ...“
یعنی ایک روپے بارہ آنے۔ وحید نے پیسے نکالنے کو جیب میں ہاتھ ڈالا تو زوڑا بولا، ”رک جاؤ، رہنے دو۔ پیسے میں دوں گا۔“

جانی میاں نے اپنا مسکا پاؤں منہ کی طرف بڑھایا اور زوڑا کی آواز سن کے رک گئے۔ طوطے کی طرح اس کی بات دہرانے لگے، ”زک جاؤ، زینے دو، پیسے میں دوں گا... زک جاؤ، زینے دو، پیسے... زک جاؤ زینے دو...“ پھر جب وحید نے ان کا کندھا تھپک دیا تو

مسکا پاؤں منہ میں ٹھونس کے انہوں نے بے ترتیبی سے منہ چلانا شروع کر دیا۔

ناشتا کر کے دونوں سائیکل مارٹ میں واپس آ گئے۔ زیادہ تر مستری اور لڑکے ادھر ادھر بیٹھے کھاپی رہے تھے۔ دونوں پھر درمیان میں پڑے اسٹولوں پر جائے اور گودوں میں بیگ رکھ کے ہونٹوں کی طرح ان مسکراتے ہوئے لڑکوں مستریوں کو دیکھنے لگے۔ لڑکے خاموشی سے آپس میں اشارے کر رہے تھے اور بے آواز ہنس رہے تھے۔ کچھ ہی دیر بعد ان کی خاموشی کی وجہ سمجھ میں آ گئی۔ سلطان بھائی آ گئے تھے۔ وہ اسٹور میں تھے۔ باہر آئے تو ان دونوں کو دکان میں دیکھ کے بولے، ”ارے شہزادے! کب آئے؟“

جانی میاں سلطان بھائی کو دیکھ، کلکاری مار کے بولے، ”ہووں اوں!... ابھی آئے... بوہوت بھونک لگ زئی تھی۔ جوسف بھائی نے پیسٹی خلائی چا پلائی۔“

سلطان بھائی جانی میاں کی طرف لاڈ سے دیکھ رہے تھے۔ دھیرے سے بولے،

”اچھا؟ واوا!“ وحید سے پوچھنے لگے، ”سیدھے اسٹیشن سے آرہے ہو؟“

وحید چمچے نے کہا، ”ہاں۔“

”گھر کیوں نہیں چلے گئے؟ کھانا کھا کے شام تک وہیں لیٹے بیٹھے۔“

جانی میاں بول پڑے، ”گھر نہیں گئے۔ بوہوت بھونک لگ زئی تھی۔ پیسٹی خانی چا پی۔“

سلطان بھائی پیار سے بولے، ”ہاں؟ اور کچھ کھاؤ گے؟“

”ہاں آں...“ جانی نے حلق سے خوشی کی کوئی آواز نکالی جس سے سامنے کام کرتا بیٹھا ایک لڑکا جو دیر سے ہنسی روکنے کی کوشش کر رہا تھا، ”پھپھ پھو!“ کر کے ہنسی میں پھٹ پڑا۔

سلطان بھائی کے چہرے کی نرمی پلک جھپکتے میں غائب ہو گئی۔ انہوں نے ہاتھ میں اٹھایا ہوا اسکرود رائیور کھینچ کے لڑکے کو مارا تو ٹھک کی آواز کے ساتھ اس کا ہینڈل لڑکے کے گھٹنے پر لگا۔ لڑکا چیخا۔ سلطان بھائی نے اسے بہت بھاری گالی دی۔ لڑکا بسورتا، لنگڑاتا ہوا دکان سے باہر چلا گیا۔

جانی میاں لڑکے کی چیخ اور گالی سن کے خود بسور نے لگے تھے۔ وحید نے تسلی دیتے ہوئے ان کے شانے پہ ہاتھ رکھ دیا۔ جانی میاں ٹھیک ہو گئے۔

سلطان بھائی چور سے بن گئے۔ ان کا موڈ بگڑا ہوا دیکھ کے سب مستری مددگار اپنا

اپنا کام سنبھال دکان سے نکل گئے۔ کچھ کرائے والی سائیکلوں کے پاس جا کھڑے ہوئے اور بلا ضرورت کپڑا مارنے لگے۔ کچھ نے بیڑی سلگائی۔ لہج کا وقت ابھی ختم نہیں ہوا تھا۔

سلطان بھائی نے جیب سے چابیوں کا گچھا نکالا، تجوری کھولی، پانچ پانچ روپے کے نوٹ نکال کے چمچے کی طرف بڑھا دیے۔ ”لو وحید! جانی میاں کو گھر لے جاؤ۔ ٹیکسی پکڑ لینا۔ رستے میں کریم سورتی کے ہوٹل سے چکن روس لے لینا۔ بولنا سلا د بھی دے۔ وہی بھی لیتے جانا۔“

وحید پیسے نہیں لے رہا تھا۔ بولا، ”ہیں میرے پاس۔ جانی میاں کی والدہ نے بارہ سو روپے دیے ہیں اس دفعے۔“ بارہ سو اس زمانے میں بہت بڑی رقم تھی۔ سلطان بھائی نے وحید کا کندھا تھپکا۔ ”وہ سنبھال کے رکھو۔ جاؤ... انھیں ہاتھ پکڑ کے سڑک پار کرانا۔“

وحید نے کہا، ”اچھا“ اور سلطان بھائی کے دیے ہوئے پیسے جیب میں ڈال، جانی میاں کے پنجے میں پنجا پھنسا، دکان سے اتر گیا۔

زوار:

سلطان بھائی کو پورے علاقے میں ان کے نرم اور سخت مزاج کی وجہ سے اور کاروبار میں ایمان داری اور پیسے کی وجہ سے پسند کیا جاتا تھا۔ انھیں اس وجہ سے بھی پسند کیا جاتا تھا کہ وہ شراب، سگریٹ اور فارس روڈ کی عورتوں سے دور رہتے تھے۔ سلطان بھائی جمعرات کی جمعرات قوالی سننے سونا پور کے قبرستان ضرور جاتے تھے اور وہ بھاری بھاری گالیاں دے کر، مار دھاڑ کر کے، اپنے سب مستریوں اور لڑکوں کو ٹائٹ رکھتے تھے۔ انھیں فارس روڈ اور اس سے نکلنے والی گلیوں کی طرف دیکھنے بھی نہیں دیتے تھے۔ کہتے تھے ان باتوں سے بیماریاں ہوں گی اور روزگار میں نحوست پھیلے گی اور کہتے تھے، ”روزی، بھیا، سب سے بڑی چیز ہے۔“ خلاف ورزی کرنے والے کو سلطان بھائی دوبار دھمکی دیتے تھے۔ تیسری بار کی رپورٹ پہ بیدلے کے جم کے اس کی ٹھکانی کرتے اور حساب صاف کر کے سامان اس کا سڑک پہ پھنکوا

دیتے اور بس، ہاتھ جھاڑ لیتے۔

مگر یہ جانی میاں تو رامپور سے آتے ہی تھے گانا انا سننے کو۔ وہ اور ان کا چمچا ریٹا بائی کے کوٹھے پہ ایک دو روز پڑے رہتے، پھر جانے سے پہلے سلطان بھائی کسی جمعرات کو سوناپور میں ان کے ساتھ قوالی سنتے اور بابے وی ٹی کے اسٹیشن پر لے جا کے رامپور کا ٹکٹ دلا دیتے اور انھیں گاڑی چڑھا دیتے۔

تین چار برس سے ایسا ہی چل رہا تھا۔

اس دفعے جو جانی میاں آئے تو سلطان بھائی کی چالی کے نئے فلیٹوں میں پانی کا کوئی مسئلہ تھا، اس لیے انھوں نے مجھے بھیجا کہ جاؤ کچھ کرو۔ میں نے ان کے نوکر اور فلیٹوں کے چوکی دار کو بالٹیاں دے کر برابر والی بلڈنگ میں بھیجا، پانی منگایا، کس لیے کہ شام کو جانی میاں نہائیں گے دھوئیں گے، گانا سننے جائیں گے۔ کھانے کے بعد سلطان بھائی نے پھر مجھے بھیجا کہ ٹیکسی لا دوں۔ ٹیکسی آگئی تو جانی میاں کو سوار کراتے ہوئے وحید کو سمجھانے لگے کہ رات میں جب بھی میاں گھر آنے کو کہیں ٹیکسی کر لینا۔ پیدل مت لانا۔ تمھیں پتا ہے، فارس روڈ کے فلاں نکڑ پر رات بھر ٹیکسی ملتی ہے۔ ٹیکسی والے کو چار آنے زیادہ دینا، وہ آگے بڑھ کے بلڈنگ کے چوکی دار کو اٹھا دے گا۔ جب تک تم لوگ گاڑی میں ہی بیٹھنا۔ اترنا مت اور بھی پتا نہیں کیا کیا... حالاں کہ سلطان بھائی جانتے تھے کہ جانی میاں صبح سے پہلے ریٹا کا ٹھکانا نہیں چھوڑیں گے۔

راوی:

ریٹا بائی والی بلڈنگ کے سامنے دونوں ٹیکسی سے اتر گئے۔ وحید چچے نے ٹیکسی کو فارغ کر دیا۔ ان گلیوں میں سلاخوں والے شوکیس یا ”پنجرے“ نہیں تھے جو اس پاڑے کی پہچان ہیں۔ فلیٹوں پر ٹکی ہوئی بیسوائیں یہاں ذرا رکھ رکھاؤ سے کاروبار کرتی تھیں۔ پنجرہوں میں کھڑی مرغیوں، بطخوں کی طرح وہ خود کٹکٹاتی چیختی نہیں تھیں۔ ان کی جگہ اونچی آواز میں یہاں ریڈیو سیلون بجایا جاتا تھا۔ چابی والے گراموفون باجوں پر سوجو بائی بڑودکر، کالوقوال میرٹھ والے اور بملا جھریا کے رکارڈ لگائے جاتے تھے۔ کہیں ”روزنداری“ سازندے اپنے سازوں

کوٹھونک بجا کے گاہکوں کو متوجہ کرتے اور اس طرح اپنی دہاڑی پکی کرتے تھے۔

ریٹا بائی والی بلڈنگ کے نیچے پہنچے تو وحید نے سنا پہلے مالے کے فلیٹ میں گت بج رہی تھی۔ وہاں مجرا شروع تھا۔ شاید شوشو ناچ رہی تھی۔ ریٹا بھی ناچ کے شائقین کے لیے روزنداری پر شوشو ہی کو بلواتی تھی۔ ناچنے کے نام پر وہ جو کچھ کرتی تھی اس سے گاہکوں کی تسلی ہو جاتی ہوگی، جب ہی تو وہ ڈیڑھ دو سال سے ایمر جنسی ڈانسر کے طور پر کوٹھوں پہ بلوائی جاتی اور سارے سال مصروف رہتی تھی۔ کوٹھوں پر شوشو ڈانسر کی طرح روزنداری میوزی شیٹن بھی بلائے جاتے تھے جو اپنا ”کام بجا کے“ پیسے لے کے چلے جاتے تھے۔ یہ بڑے فتنہ انگیز، فقرے باز قسم کے لوگ ہوتے تھے۔ خود کو یہ مراٹھی یا میراٹھی کہتے تھے۔ ساز بجانا چاہے جانتے نہ ہوں، پھلکا اڑانا خوب جانتے تھے۔ ریٹا بائی کا کوٹھان سازندوں کے لیے جیسے گھر آنگن تھا۔ کہیں کام نہ ملتا تو ویسے ہی آکے ریٹا کی بیٹھک میں پڑے سازوں کی سروسنگ کر کے چلے جاتے۔

اگر ریٹا بائی یا کوئی مہمان آرٹسٹ گانے کا اشارہ دیتی تو یہ سازندے واکمن سارنگی کے تار ملا کے طلبوں کے لنگر لنگوٹ کس کے، ہارمونیموں کی سانسیں سنوار کے اپنی اپنی جگہ سنبھال لیتے، ورنہ گاہکوں کے انتظار میں بیڑیاں پیتے، غیبت کرتے اور اس وقت تک آپس میں چھیڑ چھاڑ کرتے رہتے کہ جب تک سیڑھیوں پہ تماش بینوں کے قدموں کی چاپ نہ سنائی دے۔ گاہک کے آتے ہی وہ سارنگیوں پر گز پھیرنے لگتے، طبلے کھڑکانا شروع کر دیتے اور دھونکیاں دھونک دھونک کے ہارمونیموں کی چابیوں پر انگلیاں دوڑاتے جیسے بس ریٹا بائی کے اشارے کی دیر ہے۔

ریٹا بائی کی طرح یہ سازندے بھی سیڑھیاں چڑھ کے آنے والے نئے ملاقاتیوں کو پہلے تین چار منٹ میں جان لیتے تھے کہ کیا ہیں۔ گانے کی سمجھ رکھنے والا تو خیر یہاں کیا آتا ہوگا۔ زیادہ تر تو فلمی گانوں کے رسیا آتے تھے۔ سازندے فوراً سمجھ لیتے تھے کہ فلمی گانے چلیں گے، غزل سنی جائے گی، راگ راگنیوں کی فرمائش ہوگی یا کچھ نہیں چلے گا کیوں کہ یہ گاہک ایک دم اوپر کے مالے کا ہے۔ کچھ دیر یہاں جھک مار کے اوپر والے مالے کی سیڑھیاں چڑھ جائے گا اور وہاں جھک مارے گا۔

روزنداری سازندے بیٹھک میں ہوتے تو اپنی کوڈ زبان میں بات کرتے تھے۔ جیسے ہی کوئی نیا پنچھی بیٹھک میں داخل ہوتا یہ ایک دوسرے کو سگنل دے کے دھیمی آواز میں

کے اس تمام چھپھورے بازاری گرد و پیش میں یوں لگتا تھا جیسے بلبے اٹھاتی کچھڑ پہ زرِ خالص کی چھوٹ پڑتی ہو۔

جانی میاں نے اپنی ریشمی کُرتے کی جیب میں ہاتھ ڈالا، او بڑ کھا بڑ پنچے میں دبوچے ہوئے پانچ روپے والے چھ آٹھ نوٹ نکالے اور جب ریٹا بائی تنوکر کا شمشاد قد، میاں کے آگے سلام کو جھکا تو انہوں نے حلق سے بے انتہا مسرت کی آوازیں نکالتے اور اپنے کُرتے پہ تقریباً رال گراتے ہوئے مٹھی کو چار چھ بار ریٹا کے سر کے گرد گھمایا، پھر سارے نوٹ برابر میں بیٹھے جگن ہارمونیم والے کو پکڑا دیے۔

ریٹا نے کنکھیوں سے دیکھا اور ”حرام کے!“ کہتے ہوئے جگن ہارمونیم والے کے پنچے میں آئے مُرتے مُرتے نوٹوں پہ جھپٹا مارا، پھر ہنستے اور جانی میاں کو آداب کرتے ہوئے وہ سب اس نے اپنے بلاؤز کے گریبان میں ٹھونس لیے۔ جگن کے سوا تمام سازندوں اور پڑوس کی آئی ہوئی نانکہ نے مسرت کا نعرہ بلند کیا، ”ہے اے شاباس!“

بلوچن طیلیے نے سلامی بجائی۔ جانی میاں اس تال پر اپنے بے ڈول سراپے کو گردش دیتے ہوئے اٹھے ہی تھے کہ ریٹا نے شانوں پہ ہاتھ رکھ کے وزن ڈالتے ہوئے انھیں بٹھا دیا۔ پھر اس نے برابر میں اداس بیٹھے اپنے بوڑھے سارنگیے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ ”دڈا فے جو! ایک کئی دینا۔“ فے جو نے اسی اداسی سے اپنی قمیص کی جیب میں ہاتھ ڈالا، ریزگاری نکالی، ایک کئی منتخب کی اور ریٹا کو پکڑا دی۔

ریٹا جانی میاں پہ جھکی تو پھولوں میں گندھی اس کی چوٹی میاں کے چہرے سے آگئی۔ انہوں نے بڑی پرشور چھینک ماری اور نانکہ ہنس کے بولی، ”ہے شاباس!“

ریٹا نے ہنستے ہنستے مانگے کی وہ کئی میاں کے سر کے گرد تین بار گھمائی اور جگن ہارمونیم والے کی گود میں ڈال دی۔ جگن نے برا سا منہ بنا کے چٹکی سے وہ کئی اٹھائی، جیسے سکھ نہ ہو مردہ کیڑا ہو اور ”آ آ آ آ آ“ کے ساتھ لے کاری کرتے اور پیٹی کے ’اوپر لے‘ نوٹ پہ انگلی ٹکا کے، گایکوں کی طرح ہاتھ چلاتے ہوئے اسے کھڑکی سے باہر اچھال دیا۔

بوڑھی نانکہ نے ایک بار اور ”ہے شاباس!“ کہا۔

جانی میاں تالی بجانے لگے۔ اب سیڑھیوں پہ لوگوں کے چڑھنے کی آہٹ سنائی دی۔ سب سنجیدہ ہو گئے۔ ریٹا کے اشارے پر جگن ہارمونیم والا اٹھا۔ اس نے اپنا بھدّا ہاتھ

بڑھا کے جانی میاں کو بانہہ سے پکڑ کے اٹھانا چاہا۔ میاں نے احتجاج کی تیز آواز نکالی ”نا اااں! نہیں کرو!“ جگن نے مضبوط گرفت میں ان کی بانہہ کو جھٹکا دیا۔ ریٹا نے سمجھانے کی آواز میں مگر غصے سے آنکھیں دکھا کے کہا، ”جاؤ۔ اُدھر جا کے بیٹھو۔ چلو۔“

جانی میاں مان گئے۔ وحید چچے نے جگن کے ہاتھ سے میاں کی بانہہ چھڑائی اور جہاں دیوار کے ساتھ بیٹھنے کو کہا گیا تھا، میاں کو اُدھر لے چلا۔ وہ ابھی تک جوتے پہنے ہوئے تھے۔ ریٹا نے کھر دری، بے مروت آواز میں وحید سے کہا، ”جوتے اتار اس کے اور اسے سمجھا کے رکھ۔ بول کھاموش بیٹھنے کا ہے... میمان آئے ہیں۔“

جانی میاں نے ہاں میں سر ہلایا اور دھیرے سے ریٹا کی بات دہرائی، ”میمان آئے ہیں... میمان آئے ہیں۔“

بیٹھک پہ تماش بین چڑھ آئے تھے۔ جگن نے ہارمونیم کھینچ کے گت بجانی شروع کر دی۔ بلوچن طبلیا، جو کوئی طبلچی میراثی نہیں ذات کا دھوبی تھا اور اسی لیے بلوچن (بلیچنگ پاؤڈر) کے نام سے مشہور تھا، ایک دم جوش و خروش سے سنگت کرنے لگا۔ کام کا وقت شروع ہو گیا تھا۔

ریٹا کا گانا شروع ہوا تو جانی میاں نے وہی سب کیا جو دوسرے تماش بین کر رہے تھے۔ وہ خوش ہو ہو کے تالی بجاتے، جب جی چاہتا جیب سے نوٹ نکال کے ریٹا بانی کو پیش کر دیتے۔ پھر وہ دیوار سے ٹیک لگا کے بیٹھے بیٹھے سو گئے تو کسی چھپھوری نوچی نے، جو انھیں پہلی بار دیکھ رہی تھی، کھونٹی پہ ٹنگی گوٹا لگی پشتواز اتار میاں پر ٹانگ دی۔ ان کا چھوٹا سا گھونگھٹ بھی نکال دیا۔ تماش بینوں میں سے ایک، جو نوچی کو برابر گھورے جا رہا تھا، زور سے قہقہہ مار کے ہنسا۔ وحید نے جانی میاں کے اوپر سے پشتواز ہٹالی۔ اس وقت وہ نیند میں آسودہ بچے کی طرح مسکرائے تھے۔ یہ دیکھ کے باقی کے تین تماش بین بھی ہنس پڑے۔ دڈا نے جو نے اداسی سے اور ریٹا نے خنجر آنکھوں سے بے ڈھب ٹھٹھول کرنے والی نوچی کو دیکھا۔ وہ سمجھ گئی کہ اس بے ضابطگی پر بعد میں ریٹا اسے گالیاں سنائے گی۔ ہو سکتا ہے دو ایک ہاتھ بھی جڑ دے۔

بارہ بجے تک... جو تماش بینی کا سرکاری وقت تھا... یہ آون جاون لگی رہی۔ بارہ کے بعد علاقے کے تھانے والوں نے کچھ دیر اور، صرف ایمر جنسی کیسوں کو، کچھ لے لوا کے کوٹھوں کی سیڑھیاں چڑھنے دیں۔ پھر یہ سلسلہ بھی ختم ہوا۔ ایک ایک دو دو کر کے کوٹھوں کی روشنیاں

بجھنے لگیں۔ سازوں کی آوازیں ختم ہوئیں۔ اوپر لے مالے تک انتہائی ہنگامی ضرورت میں جانے والے بھی اکا دکا رہ گئے۔ پھر پولیسوں نے خواہ مخواہ منڈلانے والوں کو گالیاں دینا، بید مارنا اور سیٹیاں بجا بجا کے علاقے سے نکالنا شروع کر دیا۔ ایک بجے تک سب جا چکے تھے۔ ریٹا تنوکر نے سیڑھیوں پر جا کے قفل ڈال دیا۔ اس نے بیٹھک کے قالین پر لائڈری کی تازہ دھلی چادر پھیلا دی۔ تب کہیں آبکاری محکمے کے انوسٹی گیٹنگ ایجنٹ کو، جس کا اصل نام آئی بی جھاتھا، اس نے اپنی سہ ماہی رپورٹ لکھانی شروع کی۔ وہ جو جانی میاں بنا ہوا تھا، اب اپنا سوانگ بھلا کے گاؤ تیکے پہ سر رکھے کے بے آرامی میں بھی بے خبر سو گیا۔

جانی میاں کا چمچا وحید:

آپ کو ابھی ابھی معلوم ہوا ہوگا کہ میرا نام آئی بی جھاتھا ہے اور میں سرکاری آدمی ہوں۔ قصہ یہ تھا کہ راجستھان اور سینٹرل انڈیا کی سرحدی بیلٹ پر بہت سی جگہ چوری چھپے افیم کی پیداوار شروع ہو گئی تھی۔ وہ سیدھی بمبئی لائی جاتی تھی، آگے پہنچانے کے لیے۔ یوپی کے طے شدہ اوپیم کلٹی ویشن کے بہترین علاقوں سے بھی کسی قسم کی اینٹری، اندراج کے بنا چوری کی افیم ادھر بامبے آنے لگی تب سینٹرل گورنمنٹ کو فکر ہوئی۔ آبکاری پولیس کی ناکامی کے بعد معاملہ اوپر تک پہنچ گیا تو سینٹر سے مجھے انوسٹی گیٹنگ ایجنٹ مقرر کیا گیا۔ ریٹا تنوکر کو چار برس پہلے اوپر والوں نے بھرتی کیا تھا۔ بڑی ایفی شینٹ اور دلیر عورت تھی۔ ویسے مجھے اس کی بیگ گراؤنڈ نہیں معلوم۔ مجھ سے تو بس یہ کہا گیا تھا کہ اس طرح کر کے میں گول پیٹھا بمبئی کے علاقے میں سلطان بھائی کی دکان کو اپنا لانچنگ پیڈ بناؤں اور ہر تین چار مہینے پیچھے ریٹا سے رپورٹ لے لے کے اڈوائس کرتا رہوں۔ میں خود حیران ہوا تھا کہ جانی میاں کیریکٹر کا اور ایک پروفیشنل ایکٹر کو ہائر کرنے کا خیال سینٹرل گورنمنٹ کو آیا کیسے، مگر اس وقت ایک گورا (آر لینڈ والا) ہمارا باس تھا۔ سنا ہے آئرش لوگوں کو ڈراما اور اداکاری کا بڑا شوق ہوتا ہے۔ خیر، اس نوٹنکی ٹائپ کام سے آخر آخر میں نے سمجھوتا کر لیا۔ پھر سلطان بھائی نے (جسے

خبر نہیں اس پلان کی کتنی جانکاری تھی، یا بالکل نہیں تھی) بہت کو آپریٹ کیا اور میرا کام چل پڑا۔
اس دوران میں بہت سے لوگ پکڑے گئے۔ سمجھو تو ہم نے پورا نیٹ ورک ایفون
ٹریفک کا توڑ کے رکھ دیا۔

بمبئی کی یہ میری آخری وزٹ تھی۔ مجھے تین مہینے کی رپورٹ لینا تھی کہ کتنے
”گدھے“ پکڑے گئے (اپنے سامان میں یا بدن پر چھپا کے افیم لے جانے والے گدھے
کہلاتے ہیں)۔ تو کتنے گدھے، ریٹا اور سلطان بھائی اسٹریٹیجی سے اس مدت میں اریسٹ
ہوئے یہ رپورٹ لے کے مجھے بابے کو گڈ بائی کہنا تھا۔

ایک رات اور جانی میاں کو ریٹا بائی کے کوٹھے پہ گزارنی تھی۔ پھر اپنا تان طنبورہ
لپیٹ کے ہمیں بمبئی چھوڑ دینی تھی۔ ان دوستوں، ریٹا، جوزف، سلطان بھائی اور زوار سے یہ
ہماری آخری ملاقات تھی۔

گوالیار سائیکل مارٹ سے سلطان بھائی کے گھر پہنچے تھے تو ہم نے ٹیلی فون
گھمانے شروع کیے تھے۔ ریٹا بائی کو فون کیا تھا۔ سب سے پہلے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ
جانی میاں اور ان کا چمچا بمبئی آگئے ہیں۔

ریٹا سو رہی تھی۔ اس کی گجراتی نوکرانی سے میں نے کہہ دیا کہ، ”اے سنو! بائی سو
کے اٹھے تو اسے جرور جرور بول دینا کی بھولا بھائی جوہری کا پھون آیا تھا۔ بائی جرور جرور
میرے کو دکان پر پھون کر لیوے۔“

نوجوانی میں اے آئی آر پہ یہ سب ڈرامے بہت کیے تھے میں نے، تو وہ چسکا تو تھا
ہی۔ ریٹا کی نوکرانی کو بھولا بھائی جوہری کی طرف سے چھوٹے موٹے گفٹ، لونگ، چھلا،
لاکٹ ملتے رہتے تھے۔ وہ جوہری نام سن کے، ”ہا ہا بھائی!... ہے بھلا، ہے بھلا“ کرتی رہی۔
ریٹا کے اٹھتے ہی پہلی خبر وہ یہی سنائے گی کہ بھولا بھائی کا پھون آیا تھا۔ یہ اس بات کا سگنل تھا
کہ جانی میاں بمبئی آگئے ہیں، آج رات میں کسی وقت ریٹا کی بیٹھک پہ پہنچ جائیں گے۔

پرستلی میں اس عورت سے بڑا امپریس ہوا ہوں۔ کبھی وقت ملا تو اسے، ریٹا بائی تنوکر
کو، اس کی لائف کو انویسٹی گیٹ ضرور کروں گا۔

کسی انوکھے سسٹم کے حساب سے ریٹا بائی ناکام ایکٹروں، جوار یوں اور اسمگلروں
کے گدھوں میں بہت پاپولر تھی۔ تماش بینوں کی یہ تین قسمیں سارے سال ریٹا کے فلیٹ کی

سیڑھیاں چڑھتی اترتی رہتی تھیں۔ ناکام ایکٹروں والی بات سمجھ میں آتی تھی، کیوں کہ مشہور تھا کہ ریٹا خود اپنے وقت کی بڑی مشہور ناکام ایکٹریس تھی۔ فلموں میں چانس، شہرت اور بڑی بڑی رقموں کے خواب دیکھنے والے ایکٹروں کو کہیں سے پیسے ہاتھ آ جاتے تو وہ اس مشہور ناکام ایکٹریس ریٹا کے پاس ضرور آتے تھے۔ ایسے کیسوں کو یہ بہت مہارت سے ہینڈل کرتی تھی۔ ان سے کہتی تھی کہ خود اسے فلموں میں ناکام ہونا ہی تھا کیوں کہ اس میں وہ بات نہیں ہے جو کسی اٹھنے والی ایکٹریس یا ایکٹر میں ہونی چاہیے۔ ریٹا اس تماش بین ناکام ایکٹر میں وہ بات ڈھونڈ کے بتا دیتی کہ یہ دیکھو، تم کو تو جیتنا ہی جیتنا ہے، زیادہ دن مار نہیں کھا سکتے۔ پھر وہ ایکٹر ریٹا کی سیڑھیاں اتر کے نئے ولولے سے فلم اسٹوڈیوز کے رستوں پر جوتیاں چٹخانے، خوار ہونے کو چل پڑتا اور بعد میں بھی بار بار آتا۔

جوار یوں کے ساتھ ریٹا اپنا گڈلک والا کھیل کھیلتی تھی۔ کہتی تھی میں اس پاڑے کی سب سے لکی لڑکی ہوں۔ پرسوں تمبولے میں سوا سو روپے جیتے۔ دو مہینے پہلے میرے نام پانچ ہزار کی لاٹری کھلی تھی۔ اس سے میں نے اندھیری میں ایک پلاٹ خرید لیا ہے۔ اب سنڈے کو ریس کھیلوں گی۔ دیکھنا جیتوں گی ضرور۔

اسمگلروں کے گدھوں کو ریٹا شک بھی نہیں ہونے دیتی تھی کہ وہ انھیں پہچان گئی ہے۔ انھیں وہ بمبئی گمے بڑے شان دار دھندے بازوں، اسمگلروں کے کڑکی کے دنوں کا حال سناتی تھی۔ پھر ان کا مقابلہ اپنے اس فرضی ٹھیکے دار سے کرتی تھی جس نے اسے یہ فلیٹ خرید کے دیا تھا اور جو ”حرام کا جنا“ ریٹا کی آمدنی کا اسٹی پرسنٹ کھینچ کے لے جاتا ہے۔ ”میں تو ادھر کی ادھر ہی ہوں۔ اس نے دیکھو، وری میں پھر ایک بلڈنگ خرید لی ہے، میری کمائی سے۔“ اسمگلر کے گدھے میں خود اسی کے لیے رحم جگانے کے بعد ریٹا اسے اور نہیں چھیڑتی تھی۔ وہ دوسرے تیسرے پھر آتا اور شراب کے نشے میں، یا ویسے ہی اپنے دل کی کڑواہٹ میں، بیچ کے بڑے آدمی کو، جس کا صرف نام گدھے نے سن رکھا ہوتا، خوب گالیاں دیتا۔ ریٹا بھی اپنے فرضی ٹھیکے دار کو گالیاں دیتی، کوستی اور اس طرح یہ بات پکی ہو جاتی کہ یہ آدمی فلاں اسمگلر کا گدھا ہے۔ ذرا ٹائم دے کے پہلے بیچ کے بڑے آدمی کو، پھر گدھے کو پکے ثبوت شہادتوں کے ساتھ اٹھایا جاتا۔ اکثر تو گدھے کو شبہ بھی نہ ہوتا کہ جو دو چار سال کے لیے وہ اندر ہو گیا ہے تو یہ خود اس کی اپنی بک بک کی وجہ سے ہوا ہے۔

اس طرح بیچ کے آدمیوں اور گدھوں کی سپلائی قریب قریب بند ہو گئی۔

اس کا کریڈٹ ریٹا، سائیکل مارٹ، جانی میاں پراجیکٹ کو جاتا تھا۔

خیر، ہم نے پراجیکٹ وائنڈ اپ کیا۔ وہ ایکٹر جو جانی میاں کا رول کرتا رہا تھا، بابے چھوڑتے ہوئے ایک دم سینٹی مینٹل ہو گیا۔ کہنے لگا، ”میں سلطان بھائی سے ملے بنا بمبئی نہیں چھوڑوں گا۔ وہ گریٹ آدمی ہے۔ اس کو تھینکس ضرور بولنے کا ہے۔“ پھر بولا کہ جوزف اور زوار کو بھی ملوں گا۔ میں نے سمجھایا بھی کہ مسٹر! چیپٹر کلوز کرو، رات گئی بات گئی۔ مگر وہ سر ہو گیا کہ نہیں جھا صاحب! پلیز! فرگاڈز سیک۔ تو ہم نے سلطان بھائی کے گھر سے اپنے بیگ اٹھائے اور نارمل کپڑوں میں ہم گوالیار سائیکل مارٹ پہنچ گئے۔ ایکٹر نے رام پوری زمین داروں کے گرتے واسکٹ کی بجائے سفید شرٹ اور سرج کی کالی پینٹ پہنی ہوئی تھی، ٹائی بھی کھینچ لی تھی اس نے۔ میں نے بھی وحید چچے کا گرتا پیجامہ لپیٹ کے بیگ میں ڈال دیا تھا۔ میں بش کوٹ پینٹ میں تھا۔

ہم ٹیکسی سے اترے تو جانی میاں کھیلنے والے ایکٹر کے ہاتھ میں دونوں بیگ تھے۔ اس نے جیب سے والٹ نکال کے ٹیکسی کا کرایہ دیا اور جمے ہوئے قدموں سے سائیکل مارٹ کی سیڑھیاں چڑھ کے وہ میرے پیچھے آکھڑا ہوا۔ تازہ شیو بنائے، کلون لگائے، وہ وہی نظر آ رہا تھا جو وہ تھا، پروفیشنل ایکٹر اور مزے کا آدمی۔

سلطان بھائی، زوار اور دولڑ کے اس وقت دکان میں موجود تھے۔ وہ سب ہی ایکٹر کو آنکھیں پھاڑے دیکھ رہے تھے۔

حیرت ان کی نیچرل تھی۔ وہ جانی میاں کے ہم شکل ایک دنیا دار کو دیکھ رہے تھے جو وکیل، ڈاکٹر، انجینئر... کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ لڑکھڑاتا، رال گراتا، کم زور دماغ بچے کی طرح ایک ہی بات دہراتا وہ قابلِ رحم مڈل ایجڈ آدمی کہیں نہیں تھا جسے اتنے برس سے وہ جانتے تھے۔

میں نے اور اس نے... جانی میاں نے... ہاتھ بڑھا کے سلطان بھائی سے شیک ہینڈ کیا۔ ہم ہلکے سے ہنسے بھی۔

سلطان بھائی کی سمجھ میں ابھی تک کچھ نہیں آیا تھا، وہ ہکلا رہے تھے، ”آپ؟ تم لوگ؟... مطلب تم وحید ہونا؟ اور یہ...“

میں نے کہا، ”ہاں سلطان بھائی! میں وحید تھا... اب نہیں ہوں۔ آئی بی جھا میرا نام

ہے۔ آئیے... اندر چلتے ہیں۔ یہاں لڑکے بھیڑ لگا رہے ہیں۔“
 ”نہیں ٹھیک ہے،“ سلطان بھائی الجھ کے بولے، ”بات سمجھاؤ مجھے۔“

میں سمجھ گیا، انھیں اور یجنل پلان کی جانکاری نہیں تھی۔

اس لیے ڈی ٹیل میں جائے بنائیں نے انھیں بتایا کہ ہم ریٹا کے ساتھ کس مشن پہ تھے۔ ”اور سلطان بھائی، آپ نے نہ جانتے ہوئے بھی اپنے دل کی نیکی میں ساتھ دیا ہے ہمارا۔ گورنمنٹ کا ہاتھ بٹایا ہے۔ یہ ایک طرح سے بہت بڑی پبلک سروس ہے آپ کی۔ سلطان بھائی! یو آر گریٹ۔“

وہ اسٹول پہ ٹک گئے۔ ایک ایک بار ہم دونوں کو دیکھا۔ مسکرائے، بولے، ”تو تم گدھے پکڑنے آئے تھے؟“

میں نے ہاں میں سر ہلایا۔ وہ بولے، ”بھیا! سب سے پہلا گدھا تو تم نے یہی پکڑا، سلطان بھائی!“

وہ جو جانی میاں بنتا تھا، ہنسا۔ سلطان بھائی نے اس کی طرف دیکھا بھی نہیں، مجھے گھورتے رہے۔ میں نے سمجھنا شروع کیا کہ ریٹا کی جان کو خطرہ تھا اس لیے کہ وہ افیم والے لوگ بڑے پاورفل ہیں۔ وہ کوٹھوں پہ آتے جاتوں پر برابر نظر رکھے ہوئے تھے۔ ہمارے باس کا اڈوائس یہ تھا کہ ایجنٹ کو ریٹا کے پاس بھیجو تو وہ چوری چھپے نہیں جائے۔ جلوس بنا کے گھسے، اجاگر میں، کیوں کہ جلوس کا کوئی نوٹس نہیں لیتا۔ ہہہ ہا ہا!! جیسے ٹرائے شہر کے لوگ لکڑی کے جاسوسی گھوڑے کا جلوس باجے گا جے کے سنگ خود اپنے شہر میں لے گئے تھے... تو اس طرح...“

جو جانی میاں بنتا تھا برابر سلطان بھائی کو تنکے جارہا تھا۔ خبر نہیں اس نے کیا دیکھا کہ جو لایا تھا جلدی سے وہ گفٹ پیک اس نے بڑھا دیا۔ بولا، ”سلطان بھائی! سر! یہ ہاتھی دانت کا گھوڑا لایا ہوں... ان دنوں کی یاد میں کی جب...“

سلطان بھائی نے اس کے ہاتھ پہ ہاتھ مارا۔ پیکٹ گر گیا۔ وہ پھنسی ہوئی آواز میں بولے، ”مادر کھودو! یہ گھوڑا اٹھاؤ اور دو منٹ میں گول پیٹھے سے نکل جاؤ اور اگر دیری کی تو الٹ کے ہم یہ گھوڑا تمھاری پتلون میں ڈال دیں گے۔ چلو... تمھاری!“ اور یہ کہتے ہوئے وہ اسٹور میں چلے گئے۔

ہم نے زوڑا کی طرف دیکھا۔ اس نے سامنے پڑا پاپ پانا اٹھا لیا تھا۔

ہم دونوں جلدی میں سائیکل مارٹ کی سیڑھیاں اتر گئے۔
پتا نہیں کیسے لوگ ہیں بمبئی کے!

زوار:

وہ دونوں دکان سے اتر گئے، نہیں تو ضرور کوئی رپھڑا بن جاتا۔ اللہ جانتا ہے سلطان بھائی تو پھر ٹائم لیتے، میرا دل یہ کرتا تھا کہ ان حرامی سرکاری آدمیوں پر پانا لے کے پل پڑوں۔ ان سالوں کو کچھ پتا ہی نہیں... معلوم ہے؟ سلطان بھائی اشنور میں گھسے تھے تو روتے ہوئے گھسے تھے۔ آج تک، اللہ جانتا ہے، کسی نے انھیں ایسی پوجی شن میں نہیں دیکھا۔ میرے کو پچھلا سب پتا ہے۔

سلطان بھائی سے پانچ چھ برس چھوٹا ایک بھائی تھا، کم زور دماغ کا... جان محمد... سب جانو جانو کہتے تھے۔ یہی سلطان بھائی اس کو لیے لیے پھرتے تھے سب جگے۔ اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاتے تھے۔ نو دس برس کا ہو کے وہ جان محمد مر گیا تو باپ کو، سوتیلی ماں کو چھوڑ چھاڑ یہ بمبئی آ گئے۔ پھر نہیں گئے۔ چوری چھپے یاد بھی کرتے تھے اس جان محمد کو۔ جب سے یہ حرامی لوگ نے آنا جانا شروع کیا تھا، خوش رہنے لگے تھے سلطان بھائی۔ انھیں سرکاری آدمیوں کو تو کچھ پتا ہی نہیں سالوں کو۔ اچھا ہے ٹائم سے نکل گئے، نہیں رپھڑا بن جاتا۔



داستان سرائے

کلرکہار یا ایسی ہی کسی خوب صورت جگہ ایک پرانی حویلی جیسی عمارت کو ہوٹل بنا دیا گیا اور اسے بڑی لیاقت سے، بہت سے نئے مارکیٹنگ گیمکس کے ساتھ مقبول بنانے کی کوشش کی گئی۔

ایک روز اس رینو وے ٹڈ حویلی/ ہوٹل میں بڑی عمر کا ایک آدمی اپنی عجیب و گارڈی پہ سوار ہو کر کافی سامان اور ایک نو عمر لڑکی کے ساتھ وارد ہوا۔

اس نے ای میل کے ذریعے پہلے ہی برائڈیل سوٹ بک کرایا ہوا تھا۔ تاہم اس نے ایک بار فون کر کے ہوٹل والوں کی ممکنہ کوتاہیوں پر احتیاطاً انھیں گالیاں بھی نکالیں۔ اس لیے جب وہ ہوٹل میں واقعی پہنچا تو ہوٹل والے بچہ بچہ گئے کہ آئیے 'سر جی' آئیے، قدم رنجہ فرمائیے، جی آیاں نوں، بسم اللہ۔

ساتھ آنے والی لڑکی تھکی ہوئی تھی۔ دلہن کے کپڑوں میں لپٹی، کچھ دیر وہ لاؤنج کے سوئے پر بیٹھی جماہیاں لیتی رہی۔ پھر استقبالیے کا بوٹائی، سفید شرٹ اور مرون کوٹ والا آدمی آگے آیا۔ اس نے بڑی عمر کے مرد کو، جو شلووار سوٹ واسکٹ میں تھا (اور اس لڑکی کو) سامان کے ساتھ برائڈل سوٹ میں پہنچا دیا۔

مرد اپنا شوخ رنگ پھول پتیوں والا ریشمی سلپنگ سوٹ لے کر واش روم میں چلا

گیا۔ اسی وقت دروازے پہ دستک ہوئی۔ دلہن کے کپڑوں والی نے پوچھا، ”کون؟“
 باہر سے ایک عورت کی آواز آئی، ”آپ کی میزبان۔“
 لڑکی نے کہا، ”آئیے۔“

عمر سے ہار نہ مانتی ایک پرکشش عورت اندر آئی، پروفیشنل انداز میں کہنے لگی،
 ”داستان سرائے میں خوش آمدید!“
 لڑکی نے کہا، ”شکریہ۔“

عورت بولی، ”نئے بیاہے جوڑوں کو ہم سرائے کے سب سے اچھے حصے میں
 ٹھیراتے ہیں۔ اس کا نام برانڈل سوٹ یوں ہی تو نہیں رکھا... کمال کی جگہ ہے یہ، سب
 کمروں کی دلہن۔“

لڑکی نے اسے گھور کے دیکھا، منہ بگاڑ کے بولی، ”اس میں کمال کی کیا بات ہے؟“
 عورت مسکرائی، ”ایک کمال کی بات تو یہ ہے کہ یہاں میں آپ کی میزبان ہوں۔“
 ”خوب!“

عورت کہنے لگی، ”یقین کیجیے، اچھی میزبان ہوں میں اور تجربہ کار بھی۔ نئے بیاہے
 جوڑوں کو تو...“

لڑکی نے بات کاٹ دی، پوچھا، ”کتنی تجربہ کار؟“
 عورت بولی، ”بہت... یہاں میں نے ہی سب کو میزبانی کے آداب سکھائے ہیں۔“
 ”تو ایک طرح سے استانی ہیں آپ سب کی؟“

عورت نے ہاں میں سر ہلایا۔

لڑکی نے کہا، ”میں بھی ٹیچر تھی۔“

عورت کو شاید لوگوں کے ذاتی معاملات سے دلچسپی نہ ہوگی، وہ بے نیازی سے
 بولی، ”خوب! مگر یہ سرائے بھی میری ہے۔“

اس بات سے لڑکی مرعوب نہ ہوئی۔ پھر بھی عورت بتانے لگی کہ حویلی اس کے کسی پر
 دادے کی تھی، ٹوٹ پھوٹ گئی تو مرمت، رنگ روغن کرا کے عورت نے یہاں سرائے بنا دی۔
 کہنے لگی، ”ہم سب زیادہ تر باہر رہے ہیں۔ مجھے یہ جگہ اچھی لگتی تھی، یہیں آبسی۔ باہر رہ کے
 مہمان خانے چلانے کا کچھ ڈھنگ سا آ گیا ہے، اس لیے حویلی کو یہ سب کر دیا میں نے۔“

لڑکی نے اخلاقاً کہا، ”آتے ہی جگہ مجھے اچھی لگی تھی۔“
 جواب میں عورت بولی، ”آپ بھی مجھے اچھی لگیں۔“
 لڑکی نے شکریہ ادا کیا تو عورت نے ہنس کے کہا، ”شکریہ آپ کا کہ آپ نے
 داستان سرائے کونوازا۔“ لہجے میں تاجرانہ مستعدی تھی۔

مگر لڑکی کو باتیں کرنا اچھا لگ رہا تھا، پوچھنے لگی، ”داستان سرا؟... کیا نغمہ سرا کی
 طرح داستان سرا کہا ہے آپ نے؟... کیا حویلی کوئی داستان سناتی ہے؟“
 ”داستان سرا نہیں داستان سرائے کہیے۔ یہ وہ سرائے ہے جہاں داستانیں سنائی
 جاتی ہیں۔ حویلی داستان نہیں سناتی... میں سناتی ہوں۔“ پھر وہ ہنسی۔ کہنے لگی، ”بس... ایک
 پروموشنل گیمک ہے۔“

لڑکی نہیں سمجھی حالاں کہ ٹھیک ٹھاک سوجھ بوجھ والی تھی، پچھلے ہفتے تک پرائمری
 اسکول میں پڑھاتی رہی تھی۔

خیر، تو اس نے پوچھا، ”آپ کیا داستان سناتی ہیں؟“
 عورت بولی، ”بتاؤں گی... انتظار کیجیے۔“ پھر وہ تیزی سے چلی گئی۔
 بڑی عمر کا مرد بنیان پہنے پھول پھول کپڑوں میں جگمگاتا واش روم سے نکل آیا،
 ”واوا... لو جی، ہم تو تازہ دم ہو گئے۔ تم بھی شاور لے لو، پھر دیکھتے ہیں کیا کچھ کرنا ہے۔“
 لڑکی نے جیسے اُن سنی کردی، وہ کہیں نہ گئی۔ بڑی عمر کے مرد کو حیرت ہوئی، وہ سمجھ
 رہا تھا کہ اس نے کہا ہے تو لڑکی واش روم ضرور جائے گی۔ وہ کچھ کہنے کو ہوا تھا کہ کسی نے
 ادب سے دروازہ بجا دیا۔ بڑی عمر کے مرد نے تیکھے پن سے کہا، ”کیا ہے؟“
 آواز آئی، ”معافی چاہتے ہیں سر! ٹیلی فون کال ہے آپ کی۔“
 ”اچھا۔“

پھر آواز آئی، ”سر! فرنٹ آفس تک زحمت کرنی پڑے گی۔“
 ”اچھا اچھا،“ کہہ کے اس نے سنجیدہ تراش کا ایک دھیمے رنگ والا ڈریسنگ گاؤن
 پہنا اور ڈوری کستا ہوا باہر نکل گیا۔

اس کے جانے کے پانچ دس سیکنڈ بعد کمرے کی بجلی چلی گئی۔ اندھیرا ہوا تو لڑکی نے
 دبی سی چیخ ماری، فوراً ہی عورت کی دلاسا دیتی ہوئی نرم آواز آئی، ”ناں ناناں! گھبراتی کیوں

ہیں؟ میں لے آئی ناروشنی۔“

عورت نے دو موم بتیوں والا شمع دان اٹھا رکھا تھا جس کی روشنی میں لڑکی کا گھبرایا ہوا چہرہ دھیرے دھیرے اُجلنے لگا۔ عورت بولی، ”ایک شمع آپ کے نام کی، ایک ان کے نام کی۔“ اس نے ”ان“ ایسے کہا تھا جیسے مسلم سوشل کہانیوں میں نیک بیبیوں کے منہ سے شوہروں کے لیے کہلایا جاتا ہے۔

لڑکی نے منہ بگاڑ کے پوچھا، ”یہاں بھی لوڈ شیڈنگ ہوتی ہے؟“ عورت ہلکی ہنسی کے ساتھ بولی، ”لوڈ شیڈنگ کیسی؟ شمعوں کی روشنی میں داستان سنانے کا وقت ہو گیا تو میں آگئی... آپ سنیں گی داستان؟“ نروس ہنسی کے ساتھ لڑکی نے کہا، ”خوب! ادھر بجلی گئی ادھر آپ موم بتیاں اور کہانیاں لے کے آگئیں۔“

وہ بولی، ”عرض کیا تھا نا کہ پروموشنل گیمک ہے۔ سرائے جو چلائی ہے۔“

لڑکی نے جھوٹے اشتیاق سے کہا، ”ہاں تو سنائیے کہانیاں۔“

”کہانیاں نہیں، کہانی سناؤں گی۔ وہ بھی ادھوری۔“

”اچھا؟... چلیے ادھوری ہی سہی۔“

”تو سنئے،“ عورت نے کہنا شروع کیا، ”یہ حویلی کئی بار بگڑی، کئی بار بنی ہے۔ اس

کمرے میں، جو ابھی آپ کے لیے ہے، جاٹوں کے ایک شہزادے نے پناہ لی تھی۔“

لڑکی بولی، ”واہ! شہزادوں کی کہانیاں مجھے اچھی لگتی ہیں۔“

عورت نے بتایا کہ شہزادہ اور اس کا گھوڑا دونوں بہت زخمی تھے۔ مینہ برس رہا تھا

اور کڑک اور چمک اتنی تھی کہ لگتا تھا روشنی کے اور آواز کے سبھی دروازے بھاٹم بھاٹ کھل گئے

ہیں۔ بہت گھائل تھا وہ لڑکا... مطلب شہزادہ۔ سینے پر کتنے ہی زخم تھے اور بازوؤں پر بھی اور

آٹھ پہر سے اس نے کچھ کھایا پیا بھی نہیں تھا۔ تلوار بھی ٹوٹ گئی تھی اس کی۔ بس ایک خنجر تھا

اس کے پاس۔ مُرّص... مُرّص اس لیے کہ جہاں سے وہ آ رہا تھا ادھر کانوں سے یا قوت نکلتے

تھے اور وہاں یا قوت تراشنے، اجالنے والے باکمال کاری گر موجود تھے۔“

لڑکی اب کہانی میں واقعی دل چسپی لینے لگی، ”کہاں سے آ رہا تھا وہ؟“

عورت بولی، ”چھوڑیے، کسی بھی جگہ کا کچھ بھی نام ہو سکتا ہے۔“ وہ درپچے کے

سامنے کھڑی تھی۔ شروع رات کے اجلے آسمان کی جھللاہٹ سے کھڑکی کا فریم سمجھ میں آرہا تھا۔ عورت نے دور اندھیرے میں اشارہ کیا، بولی، ”درتچے سے وہ سامنے جو بُرج دکھاتی دیتا ہے... وہاں... بُرج میں ایک لڑکی نے موسم سے پناہ لی ہوئی تھی۔“

”واہوا!“ مہمان لڑکی پہلے ہی سمجھ رہی تھی کہ اب کہانی میں لڑکی آنے والی ہے۔
”آگئی نالڑکی۔ کہانیوں میں کسی نہ کسی طرح آجاتی ہے۔“

عورت کہنے لگی، ”ہاں، آگئی۔ لڑکی تو آگئی مگر اس نے اپنے ایک بھائی کی دستار باندھ رکھی تھی اور دوسرے کا شلوکہ، تیسرے کی نیم آستین پہنے تھی۔ پاؤں میں اس نے کھیڑیاں نہیں مردوں کے طرے وال کھسے ڈال رکھے تھے۔ دیکھنے میں وہ لڑکا لگتی تھی اور یہ کہ وہ چار پانچ بھائیوں کی اکیلی بہن تھی۔“

مہمان لڑکی نے بتایا، ”میرے بھی تین بھائی ہیں۔“ پھر اس نے پوچھا، ”وہ وہاں لڑکا بنی کیا کر رہی تھی؟“

”کیا خبر کیا کر رہی تھی! بس طوفان میں گھر گئی ہوگی۔ خیر، ایک ذرا بادل چپ ہوئے اور کڑکے کے بغیر بجلی چمکی تو اس لڑکی نے جاٹوں کے شہزادے کا آوازہ سنا اور درتچے پر جھکا ہوا اس کا وجود دیکھا۔ وہ تکلیف میں اور اکیلے پن میں پکارتا تھا کہ مینوں مار چھڈ یا کلتے اوں کلا... مار چھڈ یا... وے مار چھڈ یا مینوں کلا۔“

مہمان لڑکی دھیان سے سن رہی تھی۔ اس نے جھرجھری لی، پھر وہ ہولے ہولے لرزنے لگی۔

عورت بولی، ”بس تو وہ برستے پانی میں اور اندھیرے میں یہاں چلی آئی، جہاں اس وقت ہم ہیں... اس کمرے میں اور اس نے شہزادے کو تسلی دی اور پانی دیا اور کچھ کھانے کو بھی دیا۔ بارش رکنے پہ وہ چوری چھپے اپنے گھر سے اپنے بھائیوں کے کپڑے اور بسترالائی اور اس نے گھائل شہزادے کے چھاتی اور بازوؤں کے زخموں پہ مرہم لگائے۔ نو دن جم کے اس کی دیکھ بھال کی۔“

لڑکی نے دھیرے سے پوچھا، ”اسے اپنے گھر نہیں لے گئی؟“

”گھر؟... دیکھ لیتے تو مار نہیں دیتے اس کے بھائی؟... دونوں ہی کو مار دیتے۔“

”پھر؟“

عورت بولی، ”دسویں دن وہ نکل گیا حویلی سے۔ مگر جاتے ہوئے اس نے لڑکی کو...“
 ”جو لڑکا بنی ہوئی تھی؟“ اس نے یاد دلایا۔

”ہاں، جو لڑکا بنی ہوئی تھی، اس لڑکی کو جاٹ شہزادے نے اپنا مرصع خنجر دیا۔“
 ”شکر گزاری میں؟“

”ہاں... اور اس لیے بھی کہ خنجر ایک مسیحائی کی کہانی کو تازہ رکھے۔ بارہویں دن جب وہ سفر میں تھا، اس نے خواب دیکھا... تو یہ دیکھا کہ لڑکا جس نے اس مرتے کو اٹھا کے بٹھا دیا تھا، اصل میں لڑکا نہیں لڑکی ہے۔“

”خوب! تو یہ خواب دیکھ لیا اس نے؟ پھر؟... آگے؟“

عورت بولی، ”بس۔ کہانی یہیں تک ہے۔“

”کیا مطلب؟... واہ! نہیں نہیں۔“ لڑکی کو الجھن سی ہوئی ہوگی، تو وہ بولی، ”آگے

سنائیے نا۔“

عورت ہنسی۔ کہنے لگی، ”آگے کی کہانی خود آپ کو سوچنی ہوگی... یہی تو مزہ ہے۔ ہماری درخواست بھی یہی ہے۔ پوری کیجیے کہانی۔ میں چلتی ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے شمع دان چھوڑ وہ کمرے سے نکل گئی۔

عورت کے جاتے ہی بجلی آگئی۔ پھر بڑی عمر کا مرد اونچی آواز میں باتیں کرتا آگیا۔
 بولا، ”لوکل کال تھی۔ چکوال کا کوئی کارخانے دار کاروبار کی بات کرنا چاہتا تھا۔ میں نے کہا بی کام کی بات یہاں نہیں ہوگی۔ شہر پہنچ جاؤں تو فون کرنا۔ سنتا ہی نہیں تھا۔ اتنا ٹائم لگا دیا... تم بور تو نہیں ہوئیں؟“

”بور ہو جاتی۔ بجلی نہ ہو تو میں بہت الجھتی ہوں۔“

وہ پوچھنے لگا، ”بجلی؟ کیا مطلب؟... کیا بجلی چلی گئی تھی یہاں کی؟“
 لڑکی نے کہا، ”ہاں۔“

وہ اور زیادہ حیران ہو کے بولا، ”یہاں کمرے میں بجلی نہیں تھی؟“
 لڑکی نے بتایا کہ ابھی آئی ہے۔

شمع دان کو دیکھ کر وہ بولا، ”جیسی تم نے موم بتیاں جلا لیں؟“

”موم بتیاں میں نے نہیں جلا لیں۔ میزبان خاتون لائی تھی... خوب عورت تھی۔“

”اچھا؟... تو کوئی عورت آئی تھی یہاں؟“

لڑکی خوش ہو کے بولی، ”ہاں... وہ ایک ادھوری کہانی سنا کے گئی ہے۔ ایک شہزادے کی جو کسی لڑکی کو یہاں ملا تھا... اسی کمرے میں۔“

بڑی عمر کے مرد نے لڑکی کو گھور کے دیکھا۔ اسے نہ معلوم کیا بات بری لگی تھی، تاہم اس نے زیادہ کچھ نہیں کہا۔ لڑکی کے ساتھ سونے کی تیاری کرتے ہوئے بڑی عمر کے مرد نے اسے ہدایت کی اور یاد دلایا کہ اب وہ ایک ذمے دار عورت ہے، بچوں کی طرح شہزادوں وغیرہ کی کہانیوں میں دلچسپی لینا اسے زیب نہیں دیتا وغیرہ۔ پھر وہ ہم بستر ہوا۔ بعد ازاں اس نے روم سروس کو کھانے لانے کی ہدایت کی۔

لڑکی اپنے پورے بدن کے ساتھ اداس ہو گئی تھی۔ اسے بڑی عمر کے مرد کی یہ بات... یا کوئی بھی بات اچھی نہیں لگی تھی۔

ساتھ بیٹھ کے کھانا کھاتے ہوئے، مرد کو بہ ہر حال اندازہ ہو گیا کہ لڑکی بہت اداس ہے اور اس کا دل بہلانے کی ضرورت ہے ورنہ تو expensive بنی مون برباد ہو جائے گا۔ تو دل بہلانے کو اس نے مسکراتے ہوئے اس ادھوری کہانی کے بارے میں پوچھا جو میزبان عورت سنا کے گئی تھی۔

لڑکی نے وہ ادھوری کہانی سنا دی۔

بڑی عمر کا مرد کہانی سن کے ہنسا، ”وائی وا! ٹھیک ہے اب کرو کہانی پوری۔ جب یہ دستور ہے تو یہی سہی۔“

لڑکی پوچھنے لگی، ”کیا میں کہانی پوری کروں؟“

وہ بولا، ”ہاں۔“

”نہیں تم کرو۔“

مرد نے کہا، ”نہیں، تمہیں کرنی چاہیے۔ وہ تمہیں سنا کے گئی ہے۔“

”اچھا میں بھی کہانی پوری کرتی ہوں، تم بھی پوری کرو... الگ الگ۔“

مرد نے کہا، ”چلو شروع ہو جاؤ۔ بناؤ آگے کی کہانی۔“

”پہلے تم بناؤ۔“

وہ سوچنے لگا۔ ”ہو دوں، ٹھیک ہے۔ تو لو... سنو۔“ پھر خود ہی رک گیا، بولا، ”ایک

منٹ! یہ بتاؤ، اس نے وہ خواب رستے میں دیکھا تھا؟“

لڑکی نے کہا، ”ہاں، وہ خواب شہزادے نے رستے میں دیکھا تھا۔“ لڑکی نے خواب اور شہزادہ دونوں بہت لہک کے کہے تھے۔

یہ بات بھی بڑی عمر کے مرد کو اچھی نہ لگی۔ پیشانی پہ بل ڈال کے بولا، ”شہزادے خواب نہیں دیکھتے۔ تاجر خواب دیکھتے ہیں۔ اس کہانی والے آدمی کو شہزادہ نہیں ملک التجار بناؤ۔ ہاں... اچھا پختہ عمر، پکے ارادوں کا ایک ٹائیکون... سمجھیں؟ کوئی لونڈا لپاڑی نہیں۔ تجربہ کار، ملک التجار۔“

لڑکی نے دل میں کہا، جیسا تو ہے... پختہ ارادوں کا، ساٹھا پاٹھا، ملک اُت پتا نہیں کیا... لیکن مرد کی طرف دیکھ کے اس نے صرف ہاں میں سر ہلایا۔

مرد کہنے لگا، ”تو لو بئی۔ آگے کہانی بناتا ہوں... سنو۔ حویلی سے نکل کے وہ پہنچتا ہے اپنی پراپرٹی پہ، یا جو بھی اس کی سیٹ تھی۔ ہاں جی، تو وہ ادھر اپنی sprawling estate پہ آ کے سفر کی تکان بھی نہیں اترنے دیتا کہ مینیجر کو اپنے بلا لیتا ہے... وہ جو بھی ہو، دیوان، کمدار، مینیجر، جو بھی... اسے بلا کے کہتا ہے جی کہ جتنے بھی بھائی تھے اس لڑکی کے، بئی ان میں سے ہر ایک کے لیے ڈاڈے زبردست مشکی، سرنگ، ابلق، چٹے ہنس راج نسلی گھوڑے لے جاؤ... چار کہ پانچ، مطلب جتنے بھائی اتنے گھوڑے... اور جی لڑکی کے لیے وہ سب کان، ناک، ہاتھ گلے کے زیور ہنسی ٹیکے شیکے سارے یاقوت کے لے جاؤ... صحیح ہے؟ یاقوت نکلتا تھا نا علاقے میں؟... یہی بتایا ہے؟“

لڑکی نے ہاں میں سر ہلایا مگر اس کا چہرہ پیلا پڑ گیا تھا۔ پھنستی آواز میں بولی، ”ہاں، یاقوت... مگر اس نے مرصع خنجر دیا تھا، اس شہزادے... مطلب اس آدمی نے... یہ تاجر تو نہیں دے گا... خنجر؟“

مرد جلد سے بولا، ”نہ۔ اس نے ست لڑی مالا دی تھی... یاقوت کی، ملک التجار نے... تو بس جی۔ تحفے تحائف کے ساتھ اس نے ایک خریطہ پیغام کا، سونے چاندی میں لاشکتا ہوا مینیجر کے ہاتھ بھیجا۔“

یہاں وہ رکا۔ خود ہی ہنس کے بولا، ”جیسے میں نے اپنے مینیجر کو بھیجا تھا، تمہارے بھائیوں کے پاس... نظیر کو۔“

لڑکی نے دل میں کہا، ہاں جیسے اُس دے کو بھیجا تھا، نظیر کو۔
وہ بولا، ”بس، مینیجر نے خریطہ پہنچایا کہ جی تھوڑے لکھے کو بہت جانو۔ ایسے رشتے
روز روز نہیں آتے۔ بھائیوں سے عرض ہے کہ اس لڑکی کو ہم سے... مطلب ملک التجار سے بیاہ
دو۔ تو بس بی بارشیں ختم ہونے سے پہلے ہی رشتہ منظور۔“
لڑکی نے ہاتھ اٹھا کے ٹوکا۔ کم زور آواز میں پوچھا، ”کیوں جی، بارشوں سے
پہلے کیوں؟“

بڑی عمر کا مرد بولا، ”بی بارشوں ہی میں ویلے بیٹھتے ہوں گے ملک التجار لوگ، اپنے
جشن جوش ہنی مون مناتے ہوں گے۔ مانسون سیزن میں تجارتی قافلے نہیں نکلتے۔ بس، لے
آئے estate پہ شہزادی کو۔ ختم کہانی۔ کیسی رہی؟ اب تم اپنی کہانی بناؤ۔“
وہ بولی، ”رکو۔ تم نے کہا لے آئے شہزادی کو۔ اُوں ہنک! وہ شہزادی نہیں، عام لڑکی
تھی۔“

”چلو عام ہی سہی... پرائمری میں بچے پڑھانے والی، عام سی لڑکی... بہا ہا۔“
لڑکی نے اسے گھور کے دیکھا۔ ”ہاں عام سی۔ چار پانچ غصیلے بھائیوں کی اکیلی بہن۔“
بڑی عمر کے مرد کو اعتراض ہوا۔ وہ پوچھنے لگا، ”غصیلے کیوں؟“
مگر اب لڑکی اٹھ کے بیٹھ گئی تھی۔ اس کا چہرہ ستا ہوا تھا اور نتھنے پھڑک رہے تھے۔
مرد کے جواب میں وہ بولی، ”میں کیا بتاؤں کہ غصیلے کیوں تھے؟ میزبان عورت ہی کہہ گئی ہے
کہ غصے والے تھے۔“

مرد بولا، ”چلو غصہ ور ہی سہی۔ مگر وہ تو دیکھو... ادھر کیسے کیسے مشکلی، سرنگ، ابلق،
چٹے... ایک سے ایک نسلی جانور۔“

لڑکی نے سرسری سا کہا، ”ہاں، وہ تحفے تحائف۔“ وہ کمرے میں ٹہلنے لگی تھی۔

مرد بڑی اہمیت کے ساتھ بولا، ”تو پھر؟ کوئی محول تو نہیں۔“

اب لڑکی درتچے کے پاس کھڑی تھی۔ اس نے سامنے کے اندھیرے میں اشارہ
کیا۔ حقارت سے بولی، ”وہ تحفے تحائف؟... وہ نسلی جانور انھوں نے ذبح کر کے وہاں کھائی
میں پھینک دیے... جہاں اس وقت اندھیرے میں مور گھومتے پھر رہے ہیں۔“

بڑی عمر کے مرد کی جیسے چیخ نکل گئی۔ ”واہ! ایسا کب ہوتا ہے۔ نہ نہ نہ بی۔“

وہ کڑوے پن سے مسکرائی۔ بولی، ”نہ نہ کیوں؟ کہانی اب میری ہے، میں جیسی چاہوں گی بناؤں گی۔ تم بیچ میں مت بولو۔“

بڑی عمر کا مرد سوچ میں پڑ گیا۔ پھر اس نے سر جھٹکا اور ایک طرح کی کشادہ دلی سے کہنے لگا، ”چلو جی... نہیں بولتے۔ آگے؟“

لڑکی نے ایک ایک لفظ صاف ادا کرتے ہوئے دھیمے دھیمے کہنا شروع کیا۔ ”آگے یہ کہ وہ سب زیور زوور اور یا قوت کی ست لڑی مالا اور لڑکی کا ہاتھ جو ملک التجار نے مانگا تھا، بھائیوں نے وہ سب چادر میں باندھ کے رشتہ لانے والے نظیر دتے کے حوالے کر دیا کہ لو، لے جاؤ، اپنے ٹائیکون کو دے دینا۔“

بڑی عمر والے مرد نے خوف سے پھنستی، لرزتی ہوئی آواز میں کہا، ”اسے گالی کیوں نکالتی ہو؟ اور... یہ... یہ تم نے کیا کر دیا؟“

لڑکی مڑی۔ سادگی اور فتح مندی سے بولی، ”خدا کی قسم! میں نے نہیں یہ ان چار پانچ بھائیوں نے کیا ہے... سوڑوں نے۔“

وہ کچھ سمجھا، کچھ نہیں سمجھا۔ جعلی خوش مزاجی سے ہنسنے لگا۔ بعد میں اس نے اپنی منکوحہ سے ہم بستری کی اور کیوں کہ مقامی بیوپاریوں سے جلد میٹنگ کرنی ضروری تھی، اس لیے صبح ہوتے ہی ہنی مون مختصر کر کے چکوال چلا گیا۔



موتبر کی باڑی

باڑھ آتی تو سمندر کا پانی سلائیہ گاؤں کے ٹخنوں تک آ جاتا۔ گھونگھے، سپیاں، آبی گھاسوں کے الجھے ہوئے لچھے، بے گنتی کیکڑے، پچاسوں قسم کے جیو جانور اور مچھلیاں... اور بھی بڑے کام کی چیزیں جوار میں چلی آتیں۔ پھر بھاٹے کے ساتھ ہی چننے والوں کے مزے آ جاتے... یعنی اگر چننے والے کہیں ہوتے تو ان کے مزے آ جاتے۔

سمندر ان سب کام کی چیزوں کو سلائیہ گاؤں کے پیروں میں ڈال کے ہٹ جاتا۔ پھر جو کچھ بھی جس کو بھلا لگتا، اٹھا لیتا... مگر وہی بات ہے کہ کوئی ہوتا تب نا۔ سلائیہ میں تو بہت ہی کم آدمی تھے اور انھیں سمندر کی لائی ہوئی چیزوں کی زیادہ پروا بھی نہیں تھی۔

ہاں آبی پرندوں کو تھی۔ آبی پرندے سلائیہ میں گھر والوں کی طرح آتے جاتے رہتے۔ جوار کے وقت اگر وہ کہیں دور ہوتے تو پانی کے اترتے ہی پیچنتے، کلکاریاں مارتے، سیٹیاں بجاتے سلائیہ گاؤں میں آ جاتے اور صرف یہیں کیوں؟ دور دور تک، میلوں تک، رن کے پورے پھیلاؤ میں سنسناتی پھرتیں یہ سی گلز اور مٹی پانی کی سب چڑیاں۔ دوسرے ملک کی سرحدوں میں گھس جاتیں، پھر ادھر آ جاتیں، پھر ادھر چلی جاتیں۔

تو پرندے برابر آتے جاتے رہتے تھے۔ انھیں روکنا نہ اس طرف کے رینجروں، ٹپک برداروں کے بس میں تھا، نہ اس طرف والوں کے۔

پرندوں کے ساتھ یہی رہتا ہے۔

اور آدمی کا یہ ہے کہ وہ پرندہ نہیں ہوتا۔

پانی کے اندر اور پانی کے باہر چوکیاں بنائے بیٹھے ہوؤں کے اور طرح طرح کی ایمنی بین گاڑیوں، اسپید بوٹوں میں بیٹھے ہوؤں کے، نہ تو بس میں تھا چڑیوں کو روکنا اور نہ انھیں کوئی ضرورت تھی کہ وہ روکتے۔

اور ضرورت کا یہ ہے کہ آدمی سے آدمی تک ضرورتیں بدلتی رہتی ہیں۔

ادھر کے رینجروں، ٹپک برداروں کو ادھر والوں سے کوئی لینا دینا نہیں تھا، سوا اس کے کہ وہ اپنی دور بینوں سے اندھیرے میں یا پانی کی چمک میں دوسری گاڑیوں کو جاتے آتے دیکھتے تو فائر کھول دیتے۔ پھر ادھر سے جواب آتا اور یہ جواب کا جواب دیتے رہتے... جب تک جی کرتا۔ کبھی بھی، دن میں، رات میں، جوار میں، اُتار میں یہ سب ہوتا تھا، ہوتا رہتا تھا۔ ہاں کبھی جو اسمگلر بیچ میں پڑتے تو کچھ طے جیسا ہو جاتا اور ادھر ادھر کے فائدے کی کوئی بات چل نکلتی اور دھیرج سے سوچ بچار کر کے وہ لوگ اسمگلروں کو آنے جانے دیتے اور ادھر ادھر دونوں طرف کے مزے آجاتے۔ مگر یہ سب بہت ہوشیاری سے کیا جاتا تھا۔ کبھی کبھی ایسا بالکل بھی نہ ہو پاتا۔ اس میں سلائیہ گاؤں والوں کا زیادہ کچھ بیچ نہیں تھا۔ ان کے ہاتھ میں کچھ تھا ہی نہیں۔ مطلب رینجروں، ٹپک برداروں، معتبروں، پولیس والوں کے چاہے سے جتنا انھیں ملنا ہوتا مل جاتا اور نہ وہ سب تو یہ گاؤں چھوڑ کے برسوں پہلے نکل گئے ہوتے۔ کاہے کو پڑے رہتے یہاں؟ گھونگھوں، سیپیوں، آبی گھاسوں، فضول مچھلیوں اور جیو جانوروں پر ہمیشہ کون گزرا کر سکتا ہے؟

اس بات سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ سلائیہ کوئی اسمگلروں کا گاؤں تھا۔ نہ۔ یہ سبھی کا تھا۔
'ٹیلر ماسٹر' کا بھی۔

دراصل 'ٹیلر ماسٹر' سلائیہ کے پہلے معتبروں میں سے تھا۔ اُس نے دوسری جنگ عظیم میں انگریزوں سے فوجی وردیوں کے بہت بڑے بڑے ٹھیکے لیے تھے اور سلائیہ میں (خبر نہیں یہیں کیوں) لاکھوں روپے کے خرچ سے سرخ گرینائٹ کی بڑی شان دار حویلی بنائی تھی جو باڑی کہلاتی تھی۔ 'ٹیلر ماسٹر' کا نام جب علاقے کے معتبروں کی فہرست میں ٹانک لیا گیا اور باڑی میں رینجر اور پولیس کے افسر آ آ کے ٹھہرنے اور مرغ کٹوا کٹوا کے کھانے لگے تو اندازے سے کہیں زیادہ مال دار ٹیلر ماسٹروں کی اس حویلی کو پولیس والوں نے معتبر (یا موتبر)

کی باڑی کہنا اور لکھنا شروع کر دیا۔

اصل 'ٹیلر ماشٹر' انگریزوں کے چلے جانے سے پہلے ہی مر گیا تھا۔ اس کا بیٹا کسی بڑے جنگی شہر میں اب سلعے سلائے کپڑوں کا کارخانہ کھولے بیٹھا تھا اور کیوں کہ وہ بھی بہت بوڑھا ہو گیا تھا اس لیے اس نے اپنے دو بیٹوں کو بھی سلائیہ سے بلا لیا تھا اور آرام سے کارخانہ چلا رہا تھا۔ افریقا میں کسی جگہ اس کا تیسرا بیٹا موجود تھا جو کارخانے کا مال اور بھی دور دور بھیجتا تھا۔ سلائیہ گاؤں کی اس سنگین تین منزلہ باڑی کو کارخانے والے 'ماشٹر' کا بھانجا چلا رہا تھا۔ بھانجے نے مشہور کر رکھا تھا کہ وہ (جنگِ عظیم دوم والے) اصل 'ماشٹر' کا پوتا ہے، حالاں کہ وہ صرف اس کا نواسہ تھا۔ سلائیہ سے بڑھے 'ماشٹر' اور اس کے بیٹوں کے دور دور رہنے کی وجہ سے اسی بھانجے کو 'موتبر' لکھا اور پکارا جاتا تھا۔ رینجروں، ٹپک برداروں، پولیس والوں کے سب اُجلے گندے کام یہی کرتا کرواتا تھا۔ وہ حویلی کی تیسری منزل سے بھی اوپر لک آؤٹ کی طرح بنے ایک کمرے میں رہتا تھا۔ شاید اسے وہاں سے سمندر کا پانی چڑھتا اُترتا دکھائی دے جاتا ہوگا۔ گندھی کے بیٹے اور اس کی معشوقہ آلی کو سلائیہ گاؤں کی طرف چوری چھپے آتے ہوئے سب سے پہلے اسی نے دیکھا تھا۔

لیکن گندھی کے بیٹے اور اس کی معشوقہ کے بارے میں تو ابھی آپ کچھ نہیں جانتے۔ بتاتا ہوں۔

گندھی کا بیٹا دکان دار تھا، کوئی راج پوت، بامن نہیں تھا، مگر اپنے حسابوں اس نے بڑا دلیری کا کام کیا تھا، یعنی لڑکی کو بھگالایا تھا۔ اس لیے جب سلائیہ میں اسے دھر لیا گیا تو اس نے پریئنڈ کیا کہ وہ کھتری ہے اور اس کا نام ساون سنگھ راٹھوڑ ہے (جو اس کا اصل نام نہیں تھا)۔ جہاں سے وہ بھاگ کے آیا تھا وہاں وہ عطر کی دکان پر بیٹھتا تھا۔ دکان اس کے باپ کی تھی اور یہ لڑکی آلی دکان کے سامنے والے چوبارے پر وقت بے وقت ٹنگی رہتی تھی، جیسی گندھی کے لڑکے کو اسے بھگالے جانے کا خیال آیا۔ اس نے اپنے باپ کی تجوری سے حاصل کیے گئے سونے کے بسکٹ کمر سے باندھے اور لڑکی کو، جولال دو سالہ اوڑھے تھی، ساتھ لے کے شہر سے منہ اندھیرے نکلنے والی بس میں سوار ہو گیا اور پھرتا پھرتا سلائیہ آ گیا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ دونوں یہاں سے، کچھ دے دلا کے، نگر چلے جائیں گے جو اس کے خیال میں سرحد پار کوئی محفوظ جگہ ہے جہاں بال و دھوا سے شادی کرنے کا برا نہیں مناتے، اس لیے کہ وہ دوسرا

ہی کوئی ملک ہے۔

جب رینجروں، تپک برداروں، پولیسوں، مخبروں نے انھیں ترکیب سے گھیر لیا اور لڑکے سے اس کا نام پوچھا تو اس نے کہہ دیا کہ ساون سنگھ راٹھوڑ میرا نام ہے اور میں بی اے، ایل ایل بی کیا ہوا وکیل ہوں اور یہ لڑکی (جس کے ساتھ وہ برابر سوتا ہوا آ رہا تھا) میری عورت ہے۔

سلائیہ کے موتبر: اس جھوٹے پوتے/نواسے/بھانجے، کو لڑکے کی یہ باتیں سن کے اور لڑکی کا لال دوشالہ دیکھ کے بہت مزہ آیا۔ اس نے رینجروں، پولیس والوں سے کہہ کے اپنی (موتبر والی) باڑی میں دونوں کو بند کر لیا اس لیے کہ یہاں تھا نہ حوالات جیسا تو کچھ تھا نہیں اور علاقے کے ڈی ایس پی کو، جس کا وہ خاص آدمی بنا ہوا تھا، اس نے دائرِ لیس دلوا دیا کہ دو سی گلز ایسے ایسے پکڑی گئی ہیں۔ ایک نر ہے اور ایک مادہ۔ آپ آ جاؤ۔ سلائیہ میں موجود ڈی ایس پی کے ایک اور خاص آدمی، تین فیتوں والے ہیڈ کانسٹیبل نے لڑکے کا بیان لے کر باڑی کے کسی باہری اندھیرے کمرے میں ان دونوں سی گلز کو ہنکا کے دروازے پہ ایک کلو کا تالا ڈال دیا۔ پھر وہ کرسی کھینچ کے موتبر کی پرانی شاٹ گن سنبھالے پھرہ دینے لگا۔

باڑی کے کمرے میں بند کر دیے جانے کے بعد لڑکی بہت دیر تک پچھتاتی اور روتی رہی۔ لڑکے نے اسے دلاسا دیا اور دلاسا دیتے ہوئے وہ اس کے ساتھ سویا بھی۔ لڑکی نے رونا بند کر دیا اور وقتی طور پر اسے حوصلہ ہوا اور اس کا خوف جیسے دور ہو گیا۔

رات میں لڑکے کو (جس نے زیادہ کچھ سوچے بنا اپنا نام ساون سنگھ راٹھوڑ اور پتا راٹھوڑ کوٹ، گڑھ کلاں اور اپنا پیشہ وکالت بتا دیا تھا) ٹکڑوں ٹکڑوں میں نیند آئی اور اسے کچھ ڈر بھی لگا مگر کیوں کہ اس کے پاس کچھ کیش اور وہ سونے کے بسکٹ تھے اس لیے زیادہ تر اسے حوصلہ رہا۔ پھر یہ بھی تھا کہ بھگائی ہوئی لڑکی ساتھ تھی، اس کا مورال بھی ہائی رکھنا تھا، اس لیے گندھی کے لڑکے نے ہمت باندھے رکھی۔ رات میں نیند اچٹ اچٹ جاتی تو اسے خیال ہوتا کہ لڑکی کو جگالے، اس سے باتیں ہی کرے۔ مگر وہ جانتا تھا کہ وہ دونوں صرف باتیں نہیں کریں گے، انھیں اور بھی مصروفیت لگ جائے گی۔ اسے باہر اتنے قریب بیٹھے ہیڈ کانسٹیبل کی جھبک تھی جو ان کی ذرا سی بھی آہٹ سن کے کھانسنے لگتا تھا۔

رات میں ایک بار لڑکے نے یہ بھی سوچا کہ یہ لڑکی کیوں کہ بال ودھوا ہے، اس کی شادی وغیرہ یہاں نہیں ہو پائے گی، تو ممکن ہے مجھے انسانی ہمدردی میں اسے بھگالے جانے کا

خیال آیا ہو، جو اس صورت میں ہرگز کوئی بری بات نہیں ہے۔

پھر اس نے سوچا برایا بھلا جیسا بھی ہے، اب تو جو ہونا تھا ہو چکا۔

ابھی اندھیرا ہی تھا جو ہیڈ کانسٹیبل نے بھاری دروازے پر پڑا وزنی تالا کھولا اور

کمرے کے اندھیرے میں پکار پکار کے انھیں پوری طرح سے بیدار کر دیا۔ ”بکیل صاب! راٹھوڑ جی... اے ٹھا کر! بکیل صاب!“

لڑکا تو یہی سمجھا کہ کہیں کسی وکیل صاحب راٹھوڑ جی ٹھا کر کو بلایا جا رہا ہے اور اس پکار سے اسے کوئی سروکار نہیں، مگر پھر یاد آیا اور وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ وکیل ساون سنگھ راٹھوڑ، گڑھ کلاں کا ٹھا کر بچہ کہیں آس پاس میں، اس پورے گاؤں سلا یہ میں کوئی نہیں تھا۔ یہ سب خود وہی ہے اور اسے ہیڈ کانسٹیبل پکارتا ہے۔

”کہو دیوان جی! بولو؟“ بستر سے اٹھ کے آنکھیں ملتا وہ دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ ہیڈ کانسٹیبل دو نالی شاٹ گن اٹھائے بالکل سامنے کھڑا تھا۔ اس کی سرکاری قمیص وردی کی پتلون سے نکلی ہوئی تھی اور چہرے پر نیند پوری نہ کر پانے کی جھونجھل تھی۔

لڑکے کو دیکھ کے وہ بولا، ”جنگل جانے کا ہے؟“

لڑکا کچھ نہ سمجھا۔ صورت تکتے لگا۔ ہیڈ کانسٹیبل نے پھر اپنی بھرائی ہوئی آواز میں پوچھا، ”ارے کا جنگل نہیں جانا؟“ تب لڑکے کی سمجھ میں آیا کہ وہ ٹوائلٹ جانے کا پوچھ رہا ہے۔ اس نے دھیرے سے کہا، ”ادھر باڑی میں ہی کوئی بندوبست ہو جاتا تو اچھا تھا۔“

پولیس والا بولا، ”ہاں ہاں۔ باڑی ماں ہی سبھی کچھ ہے... یا ہی پوچھتے ہیں تمار سے۔ جانا ہو تو ایس طرح سے، اس باجو لکل جاؤ... سدھے۔“

جس طرف اس نے اشارہ کیا تھا لڑکا ادھر چل پڑا۔ پولیس والا کھلے دروازے کی طرف پشت کر کے شاٹ گن کو لاٹھی کی طرح ٹیک اپنی ڈیوٹی بجانے لگا۔

لڑکا ’جنگل‘ ہو آیا تو دیکھا ہیڈ کانسٹیبل شاٹ گن گود میں رکھے دروازے سے دور کرسی پر بیٹھا چائے پیتا ہے اور ان کے قید خانے کے دروازے پر میلہ سا لگا ہے۔ دو تین بچے اور تین جوان عورتیں یا لڑکیاں کھلکھلاتی، شور مچاتی کچر کچر باتیں کر رہی ہیں۔

لڑکے نے یہ بھی دیکھا کہ لڑکی آلی اس کی طرف متوجہ ہے اور مسکرا رہی ہے... مطلب ان کے لیے اسیری میں دن کی شروعات بری نہیں ہوئی تھی۔

ہیڈ کانسٹیبل نے وضاحت کی۔ بولا، ”یہ سبکی باڑی کی عورتیں ہیں۔ بائی کا سنا، اپنی جے داری پہ بائی کو بھیتر باڑی ماں لئی گئیں۔ آؤ نا۔ یہ کرسی کھینچ لو... چا پی لوتم بھی۔“

پولیس والے سے اتنی اونچی آواز میں اپنا ذکر سن کے تین میں سے دو عورتیں انھیں دیکھنے لگیں۔ ان میں سے وہ جس کے گال پہ چھوٹا سا تل تھا، لڑکے کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے دیکھتی تھی اور ایک بار پینترے سے مسکرائی بھی تھی۔ پینترہ بہت واضح تھا۔

باپ رے باپ۔ یہ سویرے ہی سویرے کیا شروع ہو گیا؟ لڑکے نے گدگدی کے ساتھ سوچا۔ مگر اس نے خود ہی آنکھیں چرائیں اور مجرموں کی طرح اپنی آلی کی طرف دیکھا۔ آلی اور مسکرانے لگی۔ گندھی کے لڑکے نے چائے پینی شروع کر دی۔

یہ عورتیں ہی پولیس والے کے لیے اور اس کے لیے چائے لے کر آئی تھیں اور اب اجازت ملنے کا انتظار کر رہی تھیں۔ اجازت اس بات کی کہ اگر ’ٹھا کر صاحب‘ کہیں تو بائی ’ٹھکرائن‘ کو عورتیں اندر لے جائیں۔ ”اب کی کچھ کھلائی پلائی دیں۔“

نقلی ٹھا کر صاحب کے لیے اندر کمرے میں ناشتا رکھ دیا گیا تھا۔ اس نے سوچا چائے ختم کر لوں، پھر آرام سے اندر جا کے ناشتا کروں گا۔

جنگِ عظیم والے ماسٹر کے گھر کی عورتیں... شاید اس کی پوتیاں، پڑپوتیاں، پت بہویں... اتنی تمیز دار تو ضرور تھیں کہ ان چھوٹی چھوٹی مگر اہم باتوں کا خیال رکھ سکیں۔ لڑکے کے ہاں کہنے پر وہ اپنے ہنستے کھلکھلاتے مختصر جلوس میں لڑکی آلی کو پھر اندر لے گئیں۔

ہیڈ کانسٹیبل اپنا ناشتا لے کر بیٹھ گیا۔ گندھی کا لڑکا کمرے میں آ گیا۔

ناشتے سے بھی باڑی والوں کی خوش حالی، تمیز داری کا اندازہ ہوتا تھا۔

لڑکا بعد میں اندر ہی لیٹ گیا اور اپنی حالت پر غور کرنے لگا۔ مگر ہیڈ کانسٹیبل کرسی کھینچ کے دروازے کے عین سامنے آ بیٹھا تھا اور اپنے پولیس ڈیپارٹمنٹ کے اچھے برے پوائنٹس پر کھلے دل سے بک بک کر رہا تھا۔ کہنے لگا کہ ادھر کا ڈی ایس پی اچھا آدمی ہے۔ وہ ہے تو موسلمان، پر خوش مزاج بہت ہے اور چھوٹے بڑے عہدے کا، اونچ نیچ کا بھید بھاؤ نہیں کرتا۔ سبھی سے مزے سے ہنستے ہنساتے بات کرتا ہے۔ یہ ساری باتیں اپنی جگہ مگر بھیا! جب کھوپڑی گھوم جائے ڈی ایس پی صاحب کی تو اچھے اچھے اے ایس آئی لوگ تک کی ایسی تیس

کر دیتا ہے اور بھیتا! ایک اے ایس آئی کو تو 'پھری صاب' نے بید سے مار بھی لگا دی تھی۔
باپ رے باپ!

'پھری صاب' عجیب سا نام تھا مگر علاقے کا ڈی ایس پی وہی تھا۔ لڑکے نے سوچا یہ 'پھری' کہیں سپرنٹنڈنٹ کی بگڑی ہوئی شکل نہ ہو۔

پھری صاب، مسلمان، خوش مزاج اور موڈی... شاید غصہ ور اور طے شدہ طور پر رشوت خور۔ اس لیے کہ جو پولیس والا رشوت نہیں لے گا وہ بدتمیز تو ضرور ہوگا، خوش مزاج ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یعنی اپنے دیانت دار، لاکھوں میں ایک ہونے پر اترائے گا ضرور اور اسی لیے دوسروں کا جینا ضرور دو بھر کرے گا۔

ہیڈ کانسٹیبل نے بتایا کہ میسج آیا تھا، کہیں شام تک پھری صاب پولیس کی نفری لے کے پہنچے گا۔ لڑکے نے حیرت ظاہر کی اور کہا کہ اتنی چھوٹی سی بات پر ڈی ایس پی عہدے کا افسر تو نہیں آتا اور تم کہہ رہے ہو ادھر ڈی ایس پی آئے گا۔

ہیڈ کانسٹیبل نے ایک آنکھ دبائی۔ ”سلا یہ میں تو پھری صاب جروری آئیں گا۔ ویسے ہی چوکی معائنے کو مہینا میں دو دفعے آتا ہے۔ پھر یہ تو اس کی پسند کا کیس ہے۔ کچھ نہیں کچھ نہیں تو ادھر دو رات جروری رکیں گا۔“

لڑکے نے پوچھا، ”پر دیوان جی! کیس کیا ہے کچھ پتا تو چلے۔ آکھر کون جلم کیا ہم پتی پتی نے؟“

وہ بولا، ”کیس تو پھری صاب ہی بتائیں گا کی کیا ہے۔ ہم تو اتنا جانتے ہیں کہ سلا یہ باڈر کا گاؤں ہے اور تم دوئی کا ایسا ہے کہ پتی پتی نہیں لگتے۔“

لڑکا برا مان گیا۔ ”واہ! یہ کھوب بولے کی پتی پتی نہیں لگتے۔ پتی پتی لگنے کو کا تمھار آگے ناچ کے دکھائیں... کی، وہ سب کریں؟ آں؟... اچرج کی بات ہے دیوان جی!“

پولیس والے نے بے نیازی سے کہا، ”ہاں... ہوئے گی۔“
”ہمو۔ اور یہ کا بول رہے تھے کی ادھر دو رات رکے گا تمھار صاحب؟ ایسی کون

بات ہے؟“

پولیس والے نے گول مول جواب دیا، ”ہو سکتا ہے تمھار باسٹے رکے... ہو سکتا ہے کسی اور کارن رکے۔“

”اُورن کارن کیا ہوئے گا؟“

ہیڈ نے آنکھ دبائی اور ہنسا، ”سمر! کروٹھا کر! اپنا سپھری صاب دل فینک آدمی ہے۔ کا کھبر ادھر سلا یہ ماں کونوں کھینچ کھینچ کے بلاتا ہوئے اسے۔ ہاں؟ ہاہا۔“
پولیس والا اور وہ بھی ہیڈ کانٹیل درجے کا، ملزموں سے زیادہ بے تکلف نہیں ہوتا، شاید اُس وقت تک بے تکلف نہیں ہوتا جب تک کچھ ملنے ملانے کی امید نہ ہو۔ اس ہیڈ کانٹیل نے جو اپنے باس کے قصے سنانے شروع کیے تو گندھی کے لڑکے نے سوچا، کہیں ایسا تو نہیں کہ اس نے سویرے سویرے لائن ملانی شروع کر دی ہو۔

ٹھیک ہے، اسے اپنی اور لڑکی کی جان چھڑانے کے لیے رشوت خور پولیس والوں کی ضرورت تھی۔ تو بس، رشوت کے سلسلے میں حوصلہ افزائی کرتے ہوئے اس نے باتوں کا رخ سپھری صاب کی پیسے بٹورنے کی خداداد صلاحیت کی طرف موڑ دیا۔

ہیڈ بولا، ”باپ رے باپ! سپھری صاب جیسا پھلکیت تو ادھر سبرے باڈر ایریے ماں دوسرا کوئی ہے ہی نہیں۔“ پھر اس نے بڑی بڑی رقموں کے درجنوں کیس گنادیے جو سپھری صاب کامیابی سے کر گزرے تھے۔ رقیں ہیڈ کانٹیل کے حساب سے، بلکہ اس کے سپھری صاب کے حساب سے بھی، بڑی ہوں گی مگر موجودہ حالات میں گندھی کے لڑکے کو مونگ پھلی کے دانوں جیسی دکھائی دیں۔ تاہم ہیڈ صاحب کی تسلی کے لیے اس نے رقیں سن سن کے ”باپ رے باپ!“ اور ”ارے مار دیا!“ اور ”او ہو ہو ہو!“ کہنا شروع کر دیا۔ پہلی بار اسے اطمینان ہوا کہ صورتِ حال ہرگز اس کے قابو سے باہر نہیں ہے۔ اس کے بسکٹ ضرور اپنا جادو دکھائیں گے اور چند گھنٹوں میں دونوں صاف نکل جائیں گے۔

آدمی کے ساتھ یہ سب اگر نہ ہو تو ایسے ہی دہل دہل کے وہ مر جائے۔

لڑکی آلی باڑی میں گئی تو جیسے وہیں کی ہو رہی۔ پولیس والوں کو ملزمہ کے اندر مفقود الخبر ہو جانے پر کوئی تشویش نہیں تھی۔ انھیں معلوم تھا کہ موتبر کی باڑی کا ایک ہی دروازہ ہے جس کے سامنے چار پائی ڈالے اور دو پولیس والے بیٹھے ہیں۔ ملزمہ چڑیا تو ہے نہیں جو باڑی کے آنگن سے پر مارتی اڑ جائے گی۔ اس کا عاشق یہ ملزم چھیلا تو یہاں بیٹھا ہی ہے، ہیڈ صاحب کے سامنے۔ کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

دوپہر کا کھانا بھی اندر سے آگیا۔ وہی مسکرانے والی قیامت لڑکی رخسار پر تل

دھرے، نوکرانی کے ہاتھوں پہ تھال اٹھوائے، پہلے ہیڈ صاحب کے پاس پہنچی، ایک نظر کمرے کی نیم روشن فضا پر ڈالتی تیزی سے گھوم کے چلی گئی۔ لوٹی تو نوکرانی کے ہاتھ سے لڑکے کا تھال لیے کمرے میں آگئی۔ دھیرے سے، جیسے نوکرانی کو بھی نہ سنانا چاہ رہی ہو، بولی، ”ٹھا کر صاب! کہو تو کوٹھڑی ماں دیوا جلوائی دیں؟“ لڑکے کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔

خواہ مخواہ آواز اونچی کر کے اس نے کہا، ”نہیں نہیں، ٹھیک ہے۔ چراگ دیوار ہنے دو۔ سب نجر آ رہا ہے۔“

تل والی اسی طرح دھیمی رازدارانہ آواز میں ہنسی۔ بولی، ”اچھا بتاؤ تو ای کتنی انگل یاں ہیں؟“

اس نے انگلیاں لفظ کو ٹکڑے کر کے ادا کیا تھا اور وہ شرارت سے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے مسکرا رہی تھی۔ نیا پینترا یہ تھا کہ انگلیاں دکھانے کو اس نے ہاتھ تک نہیں اٹھایا تھا۔

ساتھ آئی نوکرانی کمرے کی چوکھٹ پہ ان کی طرف پشت کیے بیٹھی تھی۔ ہیڈ کانٹیل اپنا تھال اٹھا کے چلا گیا تھا اور ادھر ماتحتوں کے پاس بیٹھ کے روٹی کھانے لگا تھا... لڑکے کے ساتھ بھاگی ہوئی لڑکی ابھی اندر باڑی میں تھی۔ مطلب، سب ٹھیک ٹھاک تھا۔

گندھی کے لڑکے نے دل ہی دل میں جیسے بانہیں لہرا کر خوشی کا بے آواز نعرہ سر کیا اور بہت دھیمی آواز میں پوچھا، ”نام... کا ہے تمہارا؟“

لڑکے کو گپ چپ کے کھیل میں شامل ہوتے دیکھ کے وہ تل والی کھل کے ہنسی۔ اس ہنسی کی آواز بہ مشکل دہلیز پار کر سکی ہوگی۔ ”نام ہے جی نیلما۔“

”نیل ما!“ لڑکے نے نام کو مزے دار میٹھی گولی کی طرح منہ میں پھرایا۔ کھیل کو اور آگے بڑھایا، پوچھا، ”نیلما! تم ہمار عورت کو کاں گائب کر دیا؟“

وہ میز پر تھالیاں، کٹورے جماتی جا رہی تھی؛ ہاتھ روکے، نظر اٹھائے بغیر بہت دانش مندی سے کہنے لگی، ”ٹھا کر کی جنانی گائب نہیں ہوتی... حاجر رہتی ہے... چننا مت کرو ٹھا کر!“

”چننا کیسے نہیں کریں... اسے سیرے سے نہیں دیکھا۔“ اس نے اپنا ہاتھ اپنے سینے پر رکھا، بولی، ”ادھر سینے ماں تھیں بیر تو بنی ہوگی ٹھکرائن کی... ابھی اوہی کا دھیان کر لو... لو، روٹی جیم لو۔“

لڑکے کی چھاتی میں جیسے نقارے پر چوب پڑی۔ مگر نیلما سر پہ پلو لیے کھڑی ہو گئی تھی۔

وہ جانے کو ہوئی، اور اب وہ مسکرا نہیں رہی تھی۔

ایسے مزے کی بات کہہ کے اس کا سنجیدہ ہو جانا بھی کھیل کا حصہ تھا۔ اس وقت مسکرا کے، فقرے لگا کے، اُلجھا کے، وہ بس چلی جانا چاہتی تھی تاکہ ’ٹھا کر‘ اس کے دھیان میں... اسی کے دھیان میں رہے اور نہ دکھائی دینے والے جال میں اچھی طرح لپٹ جائے؛ پھر دوبارہ جب وہ، تل والی، آئے تو یہاں اسے ایک بے بس بندھا ہوا ٹھا کر ملے... پوری طرح شکار کیا ہوا۔ مگر گندھی کا لڑکا یہ کھیل اس طرح نہیں کھیلنا چاہتا تھا۔

بھک مرے، ندیدے مرد کی طرح ہاتھ ملتے ہوئے اس نے تھالیوں، کٹوریوں پہ آنکھیں گڑا دیں۔ ”اوہو ہوہو! بڑی کوئی بچے کی ہانڈیاں بنوالیں بھئی۔ کھش بو ایسی چل رنی ہے تو سواد بھی گجب کا ہوئے گا۔ بچے آگئے ٹھا کر کے... لے ری نیلما کماری! ماہتاری کو اپنی بولنا کی ٹھا کر تمھار پائنا بڑا ہی کھش ہے۔ واواوا!“

وہ اس انداز کو سمجھنے کی کوشش میں پہلے کچھ دیر گپ چپ کھڑی رہی، پھر کھلکھلا کے ہنس پڑی۔ حسبِ معمول آواز اس کی کمرے کی دہلیز سے نہ نکل پائی ہوگی۔ ”لے بھلا... کماری کون بات کی؟... ٹھا کر جی کی سنو! ماہتاری ہماری ادھر کاں بیٹھی ہیں... ارے ای باڑی ہمارا میکا نہیں، سسرال ہے۔“

لڑکا حیرت سے بولا، ”ہاں؟ بہو ہو تم باڑی کی؟... سچ بولوں، دیکھے سے تو نہیں لگتیں۔“ یہ بہت پرانا، بڑا آزمودہ پینترا تھا۔ کسی شادی شدہ عورت سے یہ کہہ دینا کہ وہ لڑکی لگتی ہے، بہت آسان فریب کاری اور بڑی زود اثر خوشامد ہے۔

لڑکا جو بھی کرنے جا رہا تھا... اور معلوم نہیں کیا کرنے جا رہا تھا... اس میں بہر صورت اس قید خانے کے آس پاس اپنے ہم نوا، ہمدرد پیدا کرنا ضروری تھا۔ اگر صرف چاپلوسی کی رشوت سے یہ عورت بھی مددگاروں کی جماعت میں شامل کر لی جائے تو کیا برا ہے۔ وہ ہوا سے جھکائے گئے پھول کی طرح آگے آئی اور اس بار بھی دھیرے، بہت ہی دھیرے سے بولی، ”دیکھے سے بھلے ہی ناں لگیں ٹھا کر جی!... پر اصل ماں تو ہم باڑی کی بہو ہیں نا... بڑی بہو۔“

”ہم نہیں مانتے... اوں ہنک! بہو بھلے ہی ہوگی، پر بڑی بہو کون بات کی؟... اتنی

جرا سی بڑی بہو؟“

وہ اور آگے جھک آئی۔ اس کی سانس ملیٹھی کی میٹھی تازہ خوش بو میں بسی ہوئی لڑکے کے چہرے سے ٹکرائی اور لوٹ گئی۔ اس کے نرم کلیوں جیسے گلابی نتھنوں نے شاید خود اپنی ہی سانس کی سگندھ واپس لی تھی... تازہ ملیٹھی کی سگندھ... اور وہ اس بات پہ ہولے سے مسکرائی بھی تھی۔

لڑکے نے گہری سانس بھری۔ اس کے لیے یہ سب بہت زیادہ تھا۔ اس نے ابھی کھانا شروع نہیں کیا تھا۔ وہ جانتا تھا یہ نیلما بڑی بہو اُس وقت تک یہاں رہ سکتی ہے جب تک وہ روٹی نہیں توڑ لیتا۔ ایک بار کھانا شروع ہو گیا تو عورت کو جانا ہوگا۔ طریقہ یہی ہے۔ کوئی بھی عورت بس اپنے گھر کے مرد کے آگے رک سکتی ہے... پنکھا جھلنے کو۔ اس کے سوا، مرد عورت کوئی بھی کھانا کھاتا ہو، آداب یہی ہیں کہ سامنے سے ہٹ جاتے ہیں۔

گندھی کے لڑکے نے سوچ لیا کہ بہت دیر تک کھانا شروع نہیں کرے گا۔ باڑی کی اس عورت کو سمجھنا، ہمدرد بنانا ضروری تھا۔ اس وقت پولیس والا بھی پیٹ پوجا میں لگا ہے۔ تو پھر صحیح ہے۔

”اتی جراسی بڑی بہو؟“ کے جواب میں اپنا چہرہ لڑکے کے قریب کیے تل والی نے انکار میں سر ہلایا، ”ناں جی۔ اب اتے جراسے بھی نہیں ہیں۔ کنور صاب! تم گلط بات کا ہے بولتے ہو؟ ہمار کھش کرنے کو؟“

لڑکے نے ہاں میں سر ہلایا۔ ”کیوں نہیں۔ تمھار کھش کرنے کو تو ہم جون کسم کہو اٹھائی لیں۔ جھوٹھی، سچی۔ جو بولو تو جہر کھائی لیں... بولو گردن کٹائی دیں تمھار کھش کرنے کو۔“ اس کی اداکاری کامیاب جا رہی تھی۔ باڑی کی عورت کو جیسے سن کے ہی نشہ ہو گیا تھا۔

مگر وہی کچی، بچی بچو نگڑی بھی نہیں تھی۔ ہولے سے ٹھٹھا مار کے بولی، ”یا ہی سب آلی ٹھکرائن کو سنائے کے رجھالیا ہوئے گا۔ ہاں؟ بڑے کھلاڑی دکھائی پڑتے ہو کنور جی!“

گندھی کا لڑکا ایک دم سیریس ہو گیا۔ ”بھگون کی لیلہ ہے نیلما کماری، کی کھبر نہیں مایا جال ہے، جو آلی ٹھکرائن میں ہمار کو مانو آردھ چندر ماد کھائی دیا تھا... آدھا چاند۔ سو ہم چل پڑے مالک کا نام لے کے۔“

بڑی بہو نیلما کی سانس اب ہموار نہیں رہی تھیں۔ اس نے اور بھی آہستہ سے

پوچھا، ”اور ہمارا ماں؟... ہمارا ماں کا دیکھا تھا کرتو نے؟“
 ”تیرے میں ست پور نما ہے... سوں بھگوان کی! پورا جگر جگر کرتا چاند ہے تیرے
 میں... جوٹھ بولوں تو دونوں ای آنکھیں چلی جائیں۔“

پریشان ہو کے وہ ایک دم بول پڑی، ”دھت! ایسا نہیں بولوٹھا کر مہودے! ایسا
 نہیں بولو، نہیں ہم تو کہیں کے ناں رہ جان گے... ہا آں۔ ایسا متی بول رے۔“ آخری ٹکڑا اس
 نے جیسے بڑی بے بسی میں کہا تھا۔

لڑکے نے کہا، ”ہم تو اور بھی کچھ بولنے کو بیٹھے ہیں۔ تم سننے والی جم کے سنو تب
 نا... پون جھکولے سی آئی ہو... چلی جاؤ گی۔“ اس نے دہلیز پر بیٹھی نوکرانی کی طرف اشارہ کیا۔
 ”پھر کھبر ہے کب آتی ہو، کی نہیں آتیں اور جو آتی ہو تو کیا کھبر ایسی ایسی اور دوئی چار جنائیاں
 ساتھ لے ای آؤ... کی کوئی بات ہی ناں کرنی ملے۔“

وہ ہنس پڑی، یعنی بہت دھیمی آواز میں اور بولی، ”ایسی کون بات کرنی ہے ہمار
 سے؟ ہاں رے کنور جی؟ اور ای بے چاری نائن؟... کا کر لے گی بے چاری؟... کوئی روکتی
 ہے بات کرنے کو؟... ارے ای تو بہری ہے، نیٹ بہری۔ سن ہی نہ پائے گی، بھلے کو جتنی
 باتیں مٹھا رو۔“

”تو پھر سن نیلما کماری! سانجھ پڑے سے پہلے تیرے سے بات ہونی چیے... گھنی
 لمبی بات... اور جی ہماری ٹھکرائن نہیں ہووے، اس دکھت... اور ای وردی والا ناں ہوئے تب
 بات ہونی چیے... لم بی۔ ہاں۔“

”بردی والے اب ناں جائیں... انھوں نے جانا ہے تو پھر تمھار کو، ٹھکرائن کو لئی کے
 جانا ہے... اور جی چلے ای جاؤ گے تو ٹھا کر جی! پھر کیسی بات؟ کاں کی بات؟... سبرا کصہ ہی
 کھتم... ہا آہ!“ اس نے ٹھنڈی سانس بھری، سر جھکا لیا جیسے اس خیال ہی سے اداس ہو گئی
 ہے کہ ٹھا کر غریب چلا جائے گا۔

سچ بات ہے، گندھی کے لڑکے نے سوچا، اگر یہ اداکاری ہے تو بڑی بہو نیلما جی کی
 اداکاری مجھ سے کہیں اچھی جارہی ہے۔

مگر سب سے ضروری بات یہ جاننا تھی کہ بڑی بہو کا آدمی، یعنی باڑی کا بڑا بیٹا یا
 پوتا، جو بھی ہے، کہاں ہے؟ یہاں باڑی میں تو ہوگا ہی، وہ سبرا کب سامنے آئے گا؟ اور اگر

اس وقت تاڑی مہوالگا کے سویا پڑا ہے تو؛ پہر دن گئے سہی، اپنی کوٹھریا سے نکل کے تو آئے گا۔ پھر یہ سرگوشیاں کرتی نیلما بہو جہاں کی تہاں نہ رہ جائے گی؟ یہ راز دارانہ پینترے، یہ کھلوڑ، ہنسی ٹھٹھا، سب دھرا کا دھرا رہ جائے گا۔ لائن ہی کٹ جائے گی اپنی۔ اس لیے لڑکے نے جیسے گھبرا کے پوچھا، ”تمہارا آدمی؟... سویا پڑا ہے کا؟“

تل والی نے ٹھنڈی سانس بھری۔ ”کا کھبر، سویا ہے کی جاگتا ہے اور جو سویا ہے تو اکلا سویا ہے کی ساتھ ماں تکیہ پر کوئی بال چھٹکائے لیٹی سانسیں بھرتی ہے، ڈائن۔“

”ارے باپ رے باپ! ای کا بولتی، نیلما کماری؟ جرا پھر سے تو بول۔ ادھر باڑی ماں تمہارا کوئی سوتن چنڈالنی ہے کی تمہارا آدمی کے برابر لیٹی گھمر گھمر سانس بھرتی ہے؟... ہاہ! رام رام کرو۔ ای کس ڈھنگ کی بات بولی؟... پھر سے تو بولو۔“

وہ بے اختیار ہنس پڑی اور اب کے مزے میں، گویا بے سوچے سمجھے، لڑکے کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ ہاتھ پھا ہے سائرم اور جیسے بخار میں بھن رہا تھا۔ کاجل بھری آنکھیں گلابی ہوئی جاتی تھیں۔ چمک کے بولی، ”ادھر کی بات ناں کرو۔ باڑی ماں ہمار چھاتی پر کون سوتن چنڈالنی لئی کے بیٹھے گا؟ ٹانگ پر ٹانگ رکھ کے چیر نہیں ڈالیں گے سری کو۔“ پھر وہ اداس ہو گئی۔ گندھی کے لڑکے کے شانے کو چھوا۔ پھر اس کی انگلیاں قمیص کے کالر پر آ گئیں۔ انگوٹھا اور شہادت کی انگلی گدڑی کے بالوں پر جائے تھے اور... لڑکے کو وہم سا ہوا کہ وہ شاید اس کے بالوں کو سہلاتی یا سنوارتی تھی۔ اس نے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا اور پیچ پیچ کہتے ہوئے اس کا غصہ ٹھنڈا کرنا چاہا۔ لڑکے کا خیال تھا کہ وہ اپنے آدمی کی دوسری عورت، اس سوکن، کے ذکر سے برہم ہو گئی ہے اور اسے چھو کر منالینا چاہیے۔ مگر وہ راز داری سے ہنس پڑی۔ ”ارے باڑی ماں کدھر بیٹھا ہے ہمارا آدمی... او سہر ماں ہے سہر ماں۔ پٹیم کی اور، ادھر بڑا جنگی سہر ہے نہیں، ادھر کار کھانہ ہے ہمارا آدمی کا۔ کپڑا سینے کا۔ جبر جنگی کا رکھانہ۔ ادھری رہتا بستا ہے لے لڑ ماشٹر، ہمارا آدمی۔ سال پیچھے ایک مہینا کو آتا ہے ہمارا کلیجا ٹھنڈا کرنے کو... ڈاڑی جارا!“

عورت نے یہ سب بہت جھلس کے کہا تھا، خاص طور پر کلیجا اور ٹھنڈا کے لفظ اور آخر میں اس نے اپنی کوئی گالی ڈاڑی جار بھی ڈال دی تھی، جس کا مطلب کیا خبر نوچی ہوئی ڈاڑھی والا تھا یا صفا چٹ ڈاڑھی والا یا کچھ اور۔ جو بھی ہو، عورت کو غصہ بہت تھا۔

گندھی کے لڑکے نے ذرا گردن جھکائی اور تسلی کے لیے اس کی سہاگ چوڑیوں کو

اپنے بند ہونٹوں سے چھولیا۔

اسی وقت دروازے کی طرف سے ہیڈ کانسٹیبل کی آواز آئی، ”ہے بانی! ای تھالی بھانڈا لے ای لو۔“

دھت تیری پولیس والے کی! لڑکے نے دل میں کہا اور سامنے رکھی تھالی میں ہاتھ پہنچا کر روٹی توڑ لی۔

اور اب بڑی بہو نیلما کماری نے پہلی بار خاصی اونچی آواز میں اسے مشورہ دیا، ”کوئی چیز کی جرورت ہوئے تو بتائی دینا ٹھا کر!“ اور ٹیٹھی کی ٹیٹھی سگندھ لیے وہ کمرے سے چلی گئی۔ دہلیز پر بیٹھی نائن ہیڈ صاحب منحوس کے ہاتھ سے تھالی برتن لے کر مالکن کے پیچھے پیچھے چل پڑی تھی۔

’ٹھا کر جی‘ کھانا کھا کے فارغ ہوئے تو اندر باڑی سے آلی ٹھکرائن آگئی۔ وہ آئی تو لڑکے نے دروازہ بند کر لیا۔ لڑکی جھپٹ کے پاس آ بیٹھی اور سہیلیوں آلیوں کی طرح سے سر جوڑ کے دونوں نے ایک دوسرے کو اپنی اپنی رپورٹ دی۔

پہلے تو لڑکی آلی نے شرارت سے گندھی کے لڑکے کو پیٹ میں کہنی مار کے بتایا کہ ہاں رے، تجھے نین لڑانے، راج دھاری، ہنسی ٹھٹھول کرنے کو گورے گال کے کالے تل والی ماشوک مل گئی ہے۔ ”تیرے تو ٹھا کر، آگئے ہیں مجھے!“

لڑکے نے کہا، ”تو کیوں جلتی ہے! تو بھی نین لڑانے کو ڈھونڈ ڈھانڈ لے کوئی ٹھا کر پھیلا۔“

پھر دونوں میں ہلکی جھک جھک ہوئی۔ ذرا سی دیر میں کسی نے کسی کو منا لیا اور لڑکے نے اپنی حکمت عملی بتائی کہ تل والی کے ساتھ کیا، کیوں اور کس طرح کوئی کھیل کھیلا جاسکتا ہے تاکہ دونوں کی گردن ادھر سے چھوٹ جائے۔

لڑکی آلی کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے لڑکے کو تل والی کے بارے میں اور بتایا۔ بڑی بہو نیلما سے متعلق اس کی معلومات بہت کچھ مکمل تھی۔ ایسی باتیں جو صرف عورتوں کے مشاہدے میں آسکتی تھیں، لڑکی آلی نے دیکھی، سنی اور سمجھی تھیں۔

ویسے تو نیلما بڑی خوش مزاج اور سب کا خیال کرنے والی عورت دکھائی پڑتی تھی، لیکن موتبر کی باڑی میں اگر کسی سے ڈرا، خوف کھایا جاتا تھا تو وہ یہی نیلما بڑی بہو تھی۔ اصل

ماشٹر، جس نے باڑی تعمیر کرائی تھی، نیلما کا دادا سر تھا۔ ماشٹر کا ایک ہی بیٹا تھا جو اب بہت بوڑھا ہو چکا تھا مگر ریڈی میڈ کارخانہ ابھی تک وہی سنبھالے ہوئے تھا۔ اس کے تین بیٹے تھے۔ تینوں کو اس نے خاندانی کاروبار میں لگا دیا تھا۔ یہ خاندانی کاروبار اس کے جادوگر ہاتھوں میں پھل پھول رہا تھا۔ کارخانے کا تیار کیا مال اندرون اور بیرون ملک بھیجا جاتا تھا۔ ویسے تو بڑے میاں کی مدد اس کا بڑا بیٹا، یعنی نیلما کا آدمی اور سب سے چھوٹا بیٹا کرتا تھا، مگر حقیقت میں لڑکوں کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ سال میں گیارہ مہینے وہ گدھ باپ کی عقابی نظروں تلے رہتے تھے اور جیسا جیسا وہ کہتا جاتا تھا کرتے جاتے تھے۔ بڑے والے کو سڑی گرمیوں میں اور چھوٹے بیٹے کو کڑکڑاتے جاڑوں میں بڑے میاں ایک ایک مہینے کے لیے سلا یہ گاؤں بھیجتے تھے۔ اس کے سوا دونوں ہل نہیں سکتے تھے۔ یا پھر موت میت میں گھر آنے کو ملتا تھا۔ ویسے موت میت کی اس خاندان میں کوئی زیادہ چرچا نہیں تھی۔ خود بڑے میاں آٹھ برس پہلے پندرہ روز کے لیے گاؤں آئے تھے جب ان کی گھر والی فوت ہوئی تھی۔ ظاہر ہے کہ گھر والی ایک ہی تھی، وہ اب نہیں آئیں گے۔ بڈھے ماشٹر کا تیسرا بیٹا ناروی، ایفریکا، میں خاندانی ایکسپورٹ امپورٹ کا کام دیکھتا تھا۔ اس نے وہاں ایک رنگی ہوئی عورت گھر ڈال لی تھی۔ چھوٹی بڑی دونوں بہوئیں اور بڈھے کی ایک بیوہ بہن، اس کے بچے بچوگٹڑے اور نوکر، خانہ زاد... باڑی کی کل آبادی یہ تھی۔ نیلما کے کوئی اولاد نہیں تھی۔ چھوٹی بہو کے دو بچے تھے۔ بڑا لڑکا تھا اور چھوٹی لڑکی۔ یہ چھوٹی بہو بالکل چپ رہنے یا بہت کم بولنے والی دیو، جل کٹڑی قسم کی عورت تھی۔ موسیٰ تک سے خار کھاتی تھی، پر کہتی کچھ نہیں تھی۔ اس بیوہ موسیٰ کو بڑے میاں نے یہاں سب کی نگرانی دیکھ رکھ کے لیے ذمے دار بزرگ بنا کے چھوڑا تھا، مگر نیلما بڑی بہو نے پہلے چند مہینوں میں بڑھیا کو قابو کر کے بھیگی بلی بنا دیا تھا اور جب ہی سے پندرہ اٹھارہ انسانوں کے اس آسودہ حال گھر پر اس کا بلا شراکت راج چل رہا تھا۔ وہ نو جوان جو خود کو ماشٹر کا پوتا کہہ کے متعارف کراتا تھا، فی الاصل نواسہ یعنی موسیٰ کا بیٹا تھا۔ اسے نشے کی لت تھی اور کہا جاتا تھا کہ نشے کی یہ لت اسے رخسار کے تل والی نیلما کماری نے لگائی تھی۔ لڑکی آلی کو یہ نہ معلوم ہو سکا کہ کن حالات میں یہ لت موسیٰ کے اس موثر بیٹے کو لگی یا لگائی گئی۔ باڑی میں گزارے گئے چند گھنٹوں میں لڑکی آلی نے یہ ضرور دیکھ لیا تھا کہ نیلما اگر کسی سے مکمل حقارت کا برتاؤ کرتی ہے تو اسی موثر سے۔ نیلما کی آواز سن کے، وہ اگر بات کر رہا ہوتا تو روک دیتا، اور اوٹ میں ہو جاتا

تھا۔ باڑی کے اندر صرف نیلما بڑی بہو کا حکم چلتا تھا؛ اور اگرچہ کہا جاتا ہے کہ وہ زیادہ کچھ چڑچڑاتی غصہ نہیں کرتی، لیکن مشہور تھا کہ جب بڑی بہو غصے میں ہو تو باڑی والوں کے لیے سامنے سے ہٹ جانا ہی اچھا ہوتا ہے۔ اس وقت نیلما کا سامنا کرنے سے تو بہتر ہے کہ آدمی زخمی شیرنی کے آگے جا کھڑا ہو... وہاں پھر عافیت ہوتی ہوگی۔

آلی کی فراہم کردہ معلومات کے بل پر پورے یقین سے یہ کہا جاسکتا تھا کہ جعلی ٹھا کر ساون سنگھ راٹھوڑ وکیل نے بالکل ٹھیک کہا مارا ہے۔ پھر بھی، اندر جال میں کون ہے اور جال سے باہر کون، یہ ابھی دیکھنا باقی تھا۔

لڑکے نے لڑکی کو بتا دیا کہ نیلما کماری سہ پہر میں کسی وقت اس سے ملنے آئے گی، کیوں کہ پولیس والا سپہری صاب اور اس کی نفری شام تک سلائیہ پہنچ رہی ہے اور یہ کہ جب نیلما آئے تو آلی ٹھکرائن کو بے خبر سوتا بن جانا چاہیے، اس لیے کہ لڑکے اور بڑی بہو کی اس ڈھلتی دوپہری کی ملاقات پر بہت سی چیزوں کا دار و مدار ہے۔ وہ پوچھنے لگی، کیسی چیزیں؟ تو لڑکے نے کہا، ابھی کیا پتا! لڑکی کہنے لگی، ٹھیک ہے۔ پھر مسکرا کے بولی کہ جو بھی کرے ٹھیک سے کرنا، ٹھا کر ٹھکرائن کی جان اسی میں ہے۔ لڑکا بولا کہ چتا مت کر، تو نے دیکھا ہی کیا ہے، ہم شیرنی عورتوں کو کیسے قابو کرتے ہیں تجھے کچھ پتا ہی نہیں ہے۔

تو لڑکا لڑکی دونوں سو گئے۔ نہ معلوم کس طرح، کس وقت، آکس بھری سہ پہر میں جب عادتاً خوب پیٹ بھر کے لوگ سو جاتے ہیں اور جانور تک کاہلی، بے کاری میں پڑے رہتے ہیں، لڑکے کی گردن پر رینگتا ہوا کوئی کیڑا کان میں داخل ہونے لگا تو وہ ہڑبڑا کے اٹھ گیا۔ دن کے مصروف گھنٹوں میں پہنے گئے کپڑوں کے باسی عطر اور پسینا ملی خوشبو کے ساتھ اور منگیٹھی کے میٹھے ترل جھونکے کے ساتھ، اس پر جھکے ہوئے سائے نے بالکل کان سے منہ بھڑا کے کہا، ”ہم ہیں رے... نیلما۔“ وہ تنکا اس کے موتی دانتوں میں دبا تھا جسے گردن اور کان پہ پھرا کے اس نے لڑکے کو اٹھا دیا تھا۔

وعدے کے مطابق وہ آگئی تھی اور آتے ہوئے رس بھری کے کپے پھل اٹھالائی تھی۔ تاکہ آنے کا جواز بن جائے۔ اس نے چالاکی سے چمکتی اپنی آنکھوں کو آلی کے رخ گھمایا جو لڑکے کی طرف پشت کیے بہ ظاہر سو رہی تھی اور سر سے اشارہ کیا کہ سب ٹھیک ہے۔ پھر وہ لڑکے کے تکیے سے ٹیک لگا کے نیم دراز ہو گئی اور اس کے کان کے پاس منہ لے جا کر بولی،

”ہاں جی ٹھا کر! ابی ہمارے بولو کا بولنے کو ہے؟“

گندھی کے بیٹے نے ڈرے ہوئے شوہر کی کامیاب اداکاری کی۔ اشاروں اشاروں میں اسے سمجھایا کہ یہاں آلی کے اتنے پاس بیٹھ کے کیسے کچھ کہا سنا جاسکتا ہے، چل باہر چل... کسی اور جگہ۔ اس نے انگوٹھا دکھایا اور سرگوشی کی ”اور جگہ کوئی نہیں رہے ٹھا کر! لے دے کے اے ہی تیرا، تیری عورت کا بچھونا ہے۔ ادھری بات کر لے، جیسی جو کرنی ہو۔“ اور وہ ہونٹوں کو دانتوں سے دبا کر اپنی ہنسی روکتی تھی اور اس وقت لڑکے کا خیال تھا کہ اس کے کنے سے مست مادہ کی خوش بو اٹھتی ہے۔

لرزتے ہوئے اس نے کان کے پاس منہ لے جا کے کہا، ”ناں باؤلی! ادھر نہیں۔ آلی اٹھ بیٹھی تو سبرائی کچھ گڑبڑی ہو جائے گا۔“

اسے پریشان دیکھ کر وہ منہ پر ہاتھ رکھ کے خوب ہنسی۔ پھر بڑھ کے اپنا پنچہ اس کے پنچے میں پھنسا لیا جیسے جتا رہی ہو کہ تو اب میرے قابو میں ہے۔ پھر اسے لے کے وہ بستر سے اٹھی اور بے آواز دروازہ کھولتی دالان کی روشنی میں آگئی۔

ہیڈ کانسٹیبل گود میں شاٹ گن رکھے، ٹانگیں پھیلائے، منہ کھولے بیٹھا ہی بیٹھا سو رہا تھا جیسے کئی راتوں کا جاگا ہوا ہو۔

وہ لڑکے کو باڑی میں لیے جا رہی تھی... پہلے سے اس نے کوئی جگہ سوچ رکھی ہوگی۔ حیرت اور خوف کی جو اداکاری لڑکے کو کرنی تھی، وہ کرتا رہا۔ ڈیوڑھی سے گزر کے دونوں ایک بڑے کمرے کے سامنے ر کے جس کے رنگین شیشوں والے درپچوں کو دیکھ کے لڑکا سمجھ گیا کہ یہ باڑی کی بیٹھک یا دیوان خانہ ہے۔ بیٹھک میں سستے... دوسری عالمی جنگ کے زمانے میں سستے... فانوس اور شیشے کی دیوار گیر ہانڈیاں لگی تھیں۔ اس نے سوچا کہ کبھی اچھے دنوں میں وہ یہاں آیا ہوتا تو اس بیٹھک میں گدوں پر، گاؤتکیوں سے ٹیک لگا کے آلی ٹھکرائن سے دھیمے دھیمے باتیں کرتے اور چہلیں کرتے پوری پوری دوپہر کا دیتا، برسوں کی سنگدھ لیے یہ ڈھنڈا دیوان خانہ اسے اتنا اچھا لگا تھا۔

بیٹھک سے ملا ہوا گنجینہ یا گنجی خانہ تھا جسے وہ کنجی کھانا کہہ رہی تھی۔ لڑکا سمجھ گیا یہ

باڑی کا بھنڈا ریا اسٹور ہوگا۔

گندھی کے لڑکے کے پنچے میں پنچہ پھنسائے وہ جھپاک سے کنجی خانے میں تیر گئی۔

کنجی خانہ ان کے قید خانے سے بھی زیادہ تاریک تھا۔ تل والی تو خیر اس کا چپہ چپہ جانتی ہوگی، لڑکا چیزوں سے اور اس رازدارانہ کھلکھلاتی عورت سے ہر قدم پر بار بار ٹکرا رہا تھا۔ بہت کھڑ پڑ ہو رہی تھی۔ اس نے سرگوشی کی، ”سور نہیں کروٹھا کر! بروبر میں موسیٰ کی کوٹھریا ہے۔ وہ نہیں سوتی دن ماں۔ لے میرے سنگ سنگ لگا لگا چلا آ، تجھے دیوان سنگھاسن تک پہنچائے دوں گی۔“ پھر اس نے جیسے شانے سے جھولتے ہوئے اس کی رہ نمائی شروع کر دی۔ اس کے بکھرے بال، جو اس نے لڑکے کے جیب و گریباں پر ڈھیر کر دیے تھے، جیسے پختہ آملے سے لدے ہوئے کنج تھے، ہزار برس پرانے سنگھار لگن کی مست کن خوش بو سے بو جھل۔ لڑکے نے دل میں کہا، ”یہ سب ترکیبیں تجھے تیری محرومی نے سکھا دی ہیں بی بی!“

اسی طرح جھولتی لڑکھڑاتی، اس کے ہاتھ اور بازو اور شانے اپنی گرفت میں لیے، آخر وہ اس فرنیچر پیس تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئی جسے اس نے دیوان سنگھاسن کہا تھا۔ یہ پہلی عالمی جنگ سے بھی پہلے دیسی راجوں نوابوں کے محل و محلوں میں شوق سے رکھی جاتی لو سیٹ یا دو کو بٹھانے لائق چھوٹا سوفہ تھا۔ لڑکے نے سو برس پرانے مخمل کی مہک کا احساس کیا، اس پر ہاتھ پھیر کے دیکھا۔ اس نے اپنے دل کی اُمنگ میں سوچا کہ کبھی اچھے دنوں میں اس کی ٹھکرائن اور وہ یہاں آتے... نیلما اسے لے کر لو سیٹ پر بیٹھ گئی۔ ”ہاں رے ٹھا کر جی! ابھی بولو کا بولنے کو ہے؟“ اس نے گمبھرتا سے بات کہی تھی۔ لڑکا جان گیا کہ ابھی اس نے کھیل تماشا روک دیا ہے۔ کام کی بات ہونی چاہیے۔ سو کنجی خانے کے اندھیرے میں لڑکے نے بتایا کہ وہ دونوں کون ہیں، کہاں سے آئے ہیں، کہاں جاتے تھے۔ پہلے تو وہ سنتی رہی، پھر اس نے لڑکے کے گال پہ چٹکی بھری۔ ”سبئی مالم ہے میرے کو... آگے بول۔“ آگے اس نے کہنا شروع کیا کہ بے قصور ہیں ہم... دور اُدھر نگر میں گھر بسانے نکلے تھے۔ اُدھر کا موتبر خبر نہیں کیوں دشمنی پر تلا ہوا ہے... ہم نے کسی کا کیا بگاڑا ہے... کہ بڑی بہو نے اپنی کہنی سے اس کی پسلیوں میں کچوکا دیا۔ ”یہ سب کا ہے بولتا ہے۔ ٹھکرائن کی تیری جگہ ہم ہوتے تو موتبر مونڈی کاٹے ڈاڑی جار کے ڈنڈا پیرا دیتے، حرامی کے۔“ پھر اس نے اس منصوبے کی تفصیل بتانی شروع کی کہ وہ کہاں، کس طرح اور کب ڈنڈا پیراتی تو لڑکے نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

نیلما ہنسنے لگی۔ پھر سنجیدہ ہو گئی اور بولی، ”تجھے، ٹھا کر، ٹھکرائن سے گھنا پیار، آشکی ہے نا؟ ہاں؟ بتا رے سکھا! ہے نہیں؟“ لڑکے نے کہا کہ ہوں، ہے۔ تو بولی، ”ایسے ئی ہونا چیتے

عورت سرد کے بیچ۔“

یہ بات اس نے بڑے یقین سے اور بہت اداسی میں کہی تھی۔
پھر اس نے اسے تسلی دی۔ کہنے لگی، ”تو چھوٹ جائیں گا، تیری آلی چھوٹ جائیں گی۔ پھل نہیں کر۔“

لڑکے نے فریاد کی، ”سن تو، اے نیلما! کوئی بھی بیچ کا ٹھیک نہیں۔ ہم کو ابئی نکال دے چار چھ گھنٹا میں... جنگی بھرتیا آدر کریں گے... گلام بن جائیں گے۔“
وہ ہنسی، ”پر میرے کو گلام نہیں چیتے۔“
”پھر؟“

اسی سرگوشی میں بولی، ”دوس چیتے، دوس... سکھا۔ توں دوس بنے گا ٹھا کر؟ جنگی بھر کا سکھا، دوس، آشک؟“

لڑکے نے سوچا مناسب بکواس کرنے کا صحیح وقت یہی ہے۔ منستی کی اداکاری میں بولا، ”آشک تو آج بھی ہیں ہم تیرے۔ جنگی داؤں پہ لگائی دیں گے... اور بول؟“ مگر کچھ بھی بولنے کی کیا ضرورت تھی۔

بے چاری عورت! لڑکے کے شانے پر سر رکھ کے اس نے سسکیاں لیں اور بے اختیاری میں ہنسی بھی۔ لڑکا ڈرا کہ یہ اونچی آوازیں کوئی سن نہ لے۔ اس نے عورت کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا، سرگوشی کی، ”اری چپ! موسیٰ سنتی ہوگی۔“ تس پہ ہنستے ہوئے اس نے گندھی کے لڑکے کی ہتھیلی چوم لی اور موسیٰ کے لیے وہ کچھ کہا جسے بھلے لوگوں کے آگے دہرایا نہیں جاسکتا۔
وہ دونوں گنجی خانے میں تھوڑی دیر اور رکے۔ باہر سے ہیڈ کانسٹیبل کے خوشیانے کی آوازیں آنے لگیں تو لڑکے نے پریشانی ظاہر کی۔ وہ بولی کہ اسے، ڈاڑی جار کو، بکنے دو۔
پھری اس کا باپ آنے والا ہوگا تو اسے یہ ہڑبڑی ہے۔ پھری کا سن کے لڑکے نے ڈر جانے کی اداکاری کی۔ بڑی بہو نے تسلی دی اور نکل جانے کی جن مختلف ترکیبوں پر بات کر رہی تھی ان کے علاوہ کہنے لگی کہ ایک یہ پھری بھی اس کی ”جان پچان“ کا ہے جو تم لوگ کے کام آسکتا ہے۔

اس ”جان پچان“ کا مطلب لڑکے کی سمجھ میں آ گیا تھا... آتا جار ہا تھا۔ اس نے چھیڑنے کو کہہ دیا کہ کیا وہ بھی ”دوس“ ہے تیرا؟ تو بھڑگئی۔ پولیس والے کو گالی دے کے غصے

میں بولی، ”وہ سؤر سری سا کون کسی کا دوس ہوئیں گا رے! بس ایک ہی دھیان ماں رہتا ہے کوکری کا پلا۔“

پھر اس کا غصہ دھیمہ ہوا تو کہنے لگی کہ سپہری صاب سے اس نے کوئی چھوٹے موٹے کام تو کرائے ہیں۔ پیسے لے کے اور جان پہچان میں ضرور وہ کچھ کر دے گا نہیں تو نیلما تیری تو ہے ہی سہی۔ بولی، ”ٹھا کر! تو چنتا نہیں کر جرا بھی... ہم جندہ ہیں نا ابھی۔“ اور وہ گنجی خانے سے اسے نکال خود باڑی میں تحلیل ہو گئی۔

لڑکا، یہ ظاہر کرتے ہوئے کہ جیسے غسل خانے کی طرف اپنی ضرورت سے گیا تھا، واپس کمرے میں آ گیا۔

لڑکی آلی جاگ رہی تھی۔ اسے اس نے بتایا کہ نیلما سے امیدیں باندھی جاسکتی ہیں۔ آلی کو سپہری صاب کا زیادہ کچھ پتا نہیں تھا۔ جب اسے معلوم ہوا کہ یہ پولیس افسر کس ڈھب کا ہے اور نیلما اس سے ان کا کام کرائے لگی تو کہنے لگی، ”چل رے تیری اجت کھراب نہیں ہوئے گی، صئی کی صئی رہ جائے گی۔ بڑی بہو نے جو بھی اپنا شوق پورا کرنا ہے اس کا بے اس کا پولیس والا سپہری آجو باجو بیٹھا ہے۔“ لڑکی کو پریشانی میں بھی فقرے بازی سو جھی تھی۔ یہ اچھی بات تھی۔ لڑکا کیوں پیچھے رہتا، بولا، ”اری پولیس والا ناں بھی ہوتا تو ہم پریمی ہیں تیرے۔ تیری کھا تر نیلما بڑی بہو سے ناں نہیں کریں گے۔ اجت، جان سبئی کھراب کرا لیں گے۔ دیکھنا، لٹائی دیں گے سب۔“ لڑکی دیر تک ”بڑا ہشیار ہے توں! بڑا ہشیار ہے!“ کہتی رہی اور ہنستی رہی۔ اسے، باؤلی کو، کچھ پتا ہی نہیں تھا۔

بہر حال دونوں کو اطمینان ہو گیا تھا کہ ان کی رہائی میں اب کوئی اڑچن نہیں ہے۔ اسی لیے خوش تھے۔ گھنٹے ڈیڑھ گھنٹے میں سپہری صاب ایک جیپ، ایک ٹرک، ایک اردلی اور چھ کانٹیلوں کے ساتھ شور شرابا کرتا آن وارد ہوا۔

اسے دیکھ کے کسی پرانے دھا کڑ میں دار، شکاری، مجرے باز کا خیال آتا تھا۔ جیپ سے اترتے ہی اس نے باڑی کے موتبر، اس پھوپھی زاد کو آواز دی۔ ”اماں کہاں ہو بھئی ماسٹر؟“

ہیڈ کانٹیل اور اس کے ماتحتوں نے مستعدی سے گارڈ سلامی دی تو سپہری صاب نے ”ہیلو ہائی!“ کے انداز میں ہاتھ لہراتے ہوئے ہنس کے ہیڈ سے کہا، ”کیوں بیٹے ڈھیں

دس! تو نے سارے، پھری گلز پکڑ لیں؟ ... ہہ ہا... بڑا شوق ہے بے شکار کا؟ ہوں؟“ ہیڈ صاحب نے ہاتھ باندھ کے کھیسیں نکال دیں۔ باس کا انداز ایسا تھا جیسے کوئی برابر کا حوالدار ساتھیوں پہ فقرے مارتا گزر رہا ہو۔

پھری صاب کچھ نہیں تو پچاس پچپن برس کا ہوگا۔ منہ میں اس کے نقلی دانتوں کی قیمتی پلیٹیں لگی تھیں اور بال اچھے خضاب سے رنگے ہوئے تھے۔ آنکھوں کے نیچے پرانے شرایبوں والی گلابی تھیلیاں بن گئی تھیں۔ لگتا تھا اس کا بدن بے دردی سے استعمال کیے جانے پر اب گھلنے سا لگا ہے۔ ویسے وہ ہر طرح خوش مزاج دکھائی پڑتا تھا۔ خیال ہوتا تھا کہ دم درود ہونہ ہو، اپنی چنگ مٹک سے پھری صاب ساری کمیاں پوری کر لیتا ہوگا۔

جتنی دیر میں موٹر بھاگا بھاگا آتا اور ہاتھ پاؤں جوڑ کے سلامی گزارتا اور ادلی اپنے صاحب کا سامان باڑی میں کہیں منتقل کرتا، پھری صاب اپنی وردی کی پتلون پر چاندی کی موٹھ والا بید مارتا ’ملزم معائنے‘ کو ٹہلتا ہوا قیدیوں والے کمرے کی طرف چلا گیا اور ”اچھا اچھا“ کہتا، ان کا سلام لیتا، نظروں ہی نظروں میں ملزمہ کو پڑتالنے لگا۔ لڑکی آلی نے لمبا سا گھونگھٹ کھینچ لیا تھا، اس لیے پھری کو پڑتالنے میں کوئی زیادہ کامیابی نہیں ہوئی تو وہ لڑکے کی طرف متوجہ ہوا، ”ہاں بھئی، تمہارا بیان ہے کہ تم اس کے شوہر ہو؟ ہاں؟ ٹھا کر ساون صاحب وکیل!“

لڑکے نے کہا، ”ہاں سر! آپ کا داس۔ ساون سنگھ راٹھوڑ، وکیل۔“

”اوں؟ گویا مسئلہ ہی کوئی نہیں؟ ایں؟ وکیل ہو؟ تو بیٹے وکیل! دیوانی کیس لیتے ہو

یا فوجداری؟“

لڑکا ہنسا، ”سر! آدمی چھوٹا ہوں پر گو تر جنگی ہے۔ راٹھوڑوں کا تو کھیل ہی فوجداری کا ہے۔ آپ جانو، دیوانی کصوں میں ٹائم کھراب ہوتا ہے۔ ہم راٹھوڑ بے صبرے، بے چین لوگ ہیں، کھان صاحبوں کی طرح۔ دیوانی کیسوں میں مجاہد نہیں آتا۔“

پھری صاب جما ہی لیتے ہوئے بولا، ”سچ کہتے ہو وکیل!... اچھا... بات ہوگی۔ ویسے... ادھر کوئی تکلیف تو نہیں ہے؟“

لڑکے نے ہنستے ہوئے ہاتھ جوڑ دیے، ”فایو اشٹار ہوٹل کے بجے آرہے ہیں سر!“

پھری صاب بھی ہنسا، ”یار تو آدمی بال برابر ہے مگر لگتا ہے پھلکتا ہے! ہا ہا ہا۔“ اور

اپنی پتلون کو بید سے مارتا ہوا وہ اندر چلا گیا۔

رات کا کھانا وقت سے پہلے مل گیا۔ کھانا دینے نیلما نہیں آئی۔ لڑکی آلی کو ایک بار باڑی میں جانا ملا۔ واپس آ کے اس نے لڑکے کو بتایا کہ نیلما کے سوا سب نظر آرہے ہیں۔ وہ باڑی میں اندر باہر کہیں مصروف ہوگی۔ چھوٹی بہو سے پوچھا تھا تو اس نے جھلسن میں بس اتنا کہا کہ پھری صاب سے پوچھو کہاں ہے نیلما... ہم سے کا پوچھتی ہو؟

لڑکا آلی سے بولا کہ ہاں وہ مصروف ہوگی، پھری سے ہمارے لیے بات کرتی ہوگی۔ سناٹے میں بیٹھی سوچتی ہوئی لڑکی آلی کے چہرے پر ایک لہری آگئی۔ لڑکے سے مسکرا کے بولی، ”ہاں رے، صی ہے نا... اچھی طرح بات کر لے پھری سے، کوئی کسر بٹہ نہیں چھوڑے۔ نہیں تو ہم دوئی نے رُل جانا ہے۔“

دونوں پھر امید کی خوش مزاجی میں ہنسنے لگے۔

رات میں اکیلے لڑکے کی طلبی ہوئی۔ باڑی کی ڈھنڈار بیٹھک میں چنی ہوئی آستینوں والے ململ کے گرتے اور چوڑی دار پیجامے پر مخمل کی مسٹرڈ کلر نیم آستین پہنے پھری صاب بوتل شیشوں سے کھیل رہا تھا۔ اس نے سیدھے ہاتھ کی کلائی سے مولسری کے پھولوں کا دُہرا کنٹھا لپیٹ رکھا تھا جسے وہ کبھی کبھی بے خیالی میں پھرانے لگتا۔

گندھی کے لڑکے نے پہنچتے ہی بندگی گزاری، ”آداب عرض ہے سر، پھری صاب!“ پھری نے کنٹھے والا ہاتھ ہوا میں لہرایا، ”اے ٹھا کر! یہ کیا طوطیوں کی طرح پھری صاحب پھری صاحب بکے جارہے ہو؟ میاں نام ہمارا نعمت اللہ خاں شکری ہے۔ عوام الناس سالے شکری کو پھری کہتے ہیں۔ آپ تو مت کہو بیٹے! پڑھے لکھے آدمی ہو... پیگ بناؤں تمہارے لیے؟“

لڑکے نے کہا، ”سر! کسم کھائی ہے، جب تک اہلیہ کی، میری گلو کھلاسی نہیں ہوگی، شراب نہیں چکھوں گا۔“

وہ سرسری سا ہاتھ لہرا کے بولا، ”ہو جائے گی، ہو جائے گی گلو خلاسی۔ ایسی کیا قباحت ہے۔“

اس کے بعد ایک ڈیڑھ منٹ میں وہ سیدھی سادی کاروباری گفتگو پر آ گیا۔ نعمت اللہ خاں شکری اپنے ہیڈ کانسٹیبل کی ابتدائی رپورٹ پر کام کر کے چلا تھا؛ چھوٹے ہی بولا کہ دوار کا کے تیرتھ کو جیپ نمبری اتنے اتنے میں آپ اپنی اہلیہ کے ساتھ جا

رہے تھے کہ گاڑی خراب ہوگئی۔ آپ پیدل سلائیہ کی طرف چل پڑے۔ لڑکے نے ”ہاں“ میں سر ہلایا تو پوچھنے لگا، ”جیپ ابھی تک وہیں کھڑی ہوگی؟ ہاں وکیل؟“

لڑکے نے کہا کہ ہاں جی، تو بولا، ”رکے رکے... پہلے سن تو لیجیے۔ جو جگہ آپ نے جیپ خراب ہونے کی بیان کی ہے بھیا! وہاں کچھ نہیں ہے... ٹائروں کے نشانات تک نہیں ہیں۔ میں خود ہو کر کے آیا ہوں... سمجھے بیٹے؟“

لڑکے نے ہنس کے آزمائشی بے خوفی سے کہا، ”سر! آپ لوگ صی جگہ نہیں جا پائے ہوں گے۔ میرے ساتھ چلو۔“

وہ بھی ہنسا۔ ”چلیں گے پیارے! ضرور چلیں گے۔ پہلے ایک اور بات صاف ہو جائے۔“

”کیا؟“

”گڑھ کلاں میں اپنا ایک شاگرد ہے، سب انسپکٹر ہاڑا... جگل سنگھ سمیر دیو ہاڑا... بڑا ہونہار بچہ ہے۔ اس نے کل سارا دن وہ جگہ راٹھوڑ کوٹ، گڑھ کلاں میں تلاش کی ہوگی۔ ٹیلی فون پر تو راٹھوڑ کوٹ کا نام سن کے ہنس رہا تھا۔ کہتا تھا: شکری سر! یہاں ڈھائی تین مہینے میں کوٹ نہیں کھڑے ہو جاتے... سائنس کا زمانہ ہے۔ ویسے اگر کوئی ارب پتی سوچ لے تو گڑھی کوٹ بنوا بھی سکتا ہے... مگر پھر بھی کوٹ کا حصار، گڑھی، نو اس بنتے بنتے تین چار برس تو لگتے ہی ہوں گے۔ سمجھے بھیا؟ اپنا یہ ایس آئی ڈھائی تین مہینے کے لیے باہر ٹریننگ کو گیا تھا۔ اب آیا ہے تو کہتا ہے، سر! یہ نیا کوٹ تلاش کروں گا۔ اگر اس نام کا کوئی قلعہ، گڑھی، حصار، گھر، محلہ کچھ بھی بن گیا ہوگا تو ضرور عرض کروں گا۔ میرا خیال ہے بیٹے! دو تین روز میں وہ یہاں بھیجے گا کسی کو یا ہاڑا خود ہی آجائے گا... تو یہ ہے۔“

لڑکا اپنے پیسے اور تل والی کی دی ہوئی تسلی میں تھوڑا دیر ہو رہا تھا، بولا، ”آپ کو سر! میرے بیان پر شک ہے؟“

شکری ہنسا، ”لاحول ولا قوۃ! ارے بیٹے! شک کس گنہگار کو ہوگا۔ میں تو ٹھا کر، پورے یقین سے کہہ رہا ہوں کہ آپ نے ہمارے ہیڈ صاحب کو اور معتبر کو بیان نہیں لکھوایا، جھک ماری ہے، اور جناب بکواس کی ہے اعلیٰ درجے کی! ہہہ ہا ہا ہا... تو یہ ہے۔“

لڑکا اس کی ہنسی میں شامل ہو گیا۔ یہ بات شکری کو پسند آئی۔ ہاتھ پر ہاتھ مار کے

بولاً، ”بناؤں ایک چھوٹا پیگ؟ ارے کون دیکھتا ہے یار! تیری ٹھکرائن تو اب تک سو بھی گئی ہوگی؟ ہاں؟“ مگر اس کی آنکھوں میں کینے کی چمک تھی۔

تو اب ایک خوف نے لڑکے کے دل میں جگہ بنانی شروع کر دی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے شراب سے انکار کر دیا۔

شکری نے تلے ہوئے باداموں سے مونہا منہ بھری بلور کی طشتری اس کی طرف سرکائی۔ ”لو، بادام کھاؤ، ساون سنگھ ٹھا کر! بادام دماغ کے لیے بہت مفید ہوتے ہیں۔“ پھر اس نے بادام کا ایک اور فائدہ بتایا، مگر وہ محض بدمعاشی کی ذیل میں آتا تھا اور لچر پن سے بتایا گیا تھا۔ لڑکے نے تھوک نکل کے خود کو ذرا سنبھلا ہوا، قابو پایا ہوا ظاہر کیا، پھر چمکتے لہجے میں کہا، ”سر! یہ جو دو چھوٹے پوائنٹ آپ نے نکالے ہیں، اصل میں اپنے کو زیادہ کوئی امپارٹینٹ نہیں لگ رہے۔ ہم دونوں ہی سر، دنیا دار پُرش ہیں۔ میرا اپنا چھوٹا سا پھیلاوا ہے جسے سنبھالتا سنبھلاتا ادھر تک لے آیا ہوں؛ بڑے لوگ ہو، آپ کا اپنا سٹاپ ہے۔ تو اب سمجھ میں یہ آ رہا ہے سر! کی ایسا کچھ آگے بھی چلے کی ہم بھی کھش کھش ادھر سے چل پڑیں، آپ بھی پرسن ہو کے اس چھوٹے آدمی کی دوستی، جان نثاری کو دو اچھے شبد بولتے نکل لو ادھر سے... تو یہ ہے سر!“

شکری ہنس پڑا، ”بیٹے، رشوت کی آفر کر رہے ہو؟“

لڑکا اس کی صورت تکنے لگا۔

شکری بولا، ”ٹھا کر! بھئی یار مسئلہ ہی کوئی نہیں۔ نعمت اللہ خاں صاحب شکری کے لیے اللہ تبارک تعالیٰ نے بڑی نعمتیں اتاری ہیں۔ آہا ہا ہا! ہم تو ٹھا کر بیٹے، شکری ہیں ہی اس لیے کہ نعمتوں کا شکر کرتے ہیں۔“ اسے ہچکی آئی تو لمحے بھر کو رکا، پھر کہنے لگا، ”بات اپنی کہہ دینے میں کوئی باک نہیں ہونا چاہیے... ویسے یہ باک کیا ہوتا ہے؟... یا کہ تو ایک چوپایہ ہے اپنے برفانی علاقوں کا، جس کے سارے بدن پر موئے زیر شکم جیسے یہ بڑے بڑے بال ہوتے ہیں... تو خیر... مختصر یہ کہ رشوت وغیرہ میاں وکیل، ہم نہیں لیتے۔ ایسے گدھے پن کی آفر وکیل، تم پھر کبھی مت کرنا، ورنہ ہم ٹنڈی کسوا دیں گے، قسم ایمان کی!... آپ نے دیکھا ہوگا، وہ جو ہمارا ڈھیس ڈس حوالدار ہے وہ سالا ٹنڈی کنے میں ماہر ہے۔ ایک دم حرام الدھر ایکسپریٹ ہے۔ اب آپ جاؤ، تیج! شاباش، ٹھکرائن کے پاس جاؤ، لیٹو، بیٹھو، ہم بستری کرو،

گپ مارو... چڑھ جاؤ سالو سولی پر، رام بھلی کرے گا۔“
یہ سب کہہ کے شکری نے آہستہ سے گلاس میز پر رکھا اور کشن کھینچ کر سونے پر دراز ہو گیا۔ لگتا تھا گرتے ہی سو گیا ہے۔

آگے اس سے بات نہیں کی جاسکتی تھی۔ لڑکا خوف زدہ، دھیرے سے اٹھا اور کمرے کی طرف چل پڑا۔ جو کہتے ہیں نا کہ ایک ایک پاؤں من من بھرکا ہو رہا تھا، تو وہ کیفیت تھی۔ اس لوفر پولیس افسر کی الٹا پلٹیوں نے اسے نڈھال کر دیتا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ ایک امید اس بدنصیب شکری پھری کے رشوت خور ہونے سے پیدا ہوئی تھی تو وہ اس ملاقات کے ساتھ ختم ہو گئی۔ خدا معلوم یہ سالاب کس چکر میں ہے؟ کیا چاہتا ہے؟

بہت مایوسی میں اور پراگندہ ذہن کے ساتھ گندھی کا لڑکا اندھیرے کے مختصر ٹکڑے سے روشنی اور پولیس گارڈ کے سامنے آنے والا تھا کہ جہازی گملے کی اوٹ سے ایک سایہ جھپٹ کے نکلا اور کمر میں ہاتھ ڈال کے اس نے لڑکے کو دوبارہ اندھیرے میں کھینچ لیا۔ اس کے چہرے سے اپنا مشکلی تل والا رخسار بھڑا دیا۔ ”ادھر کو نہیں، ادھر آٹھا کر! جاتا کدھر ہے دوس؟“ اس کی سانس میں تیز ملیٹھی کی مہک تھی۔ لڑکے نے جھنجھلا کے دھیرے سے پوچھا، ”تو بھی کچھ پی پا کے تو نہیں آئی؟“

بولی، ”ہاں رے! تیرے پریم کا پیالہ پیا ہے... اس کر کے دان دکشنا دینے آئی ہوں۔ اپنے سر کی دکشنا... وہ بولتے ہیں نا... پریم پیالہ جو پیے سیس دکشنا دے۔“
لڑکے نے کہا، ”شعر کچتا چھوڑ، میرے سے سیدھی بات کر۔ وہ تیرے پھری صاب نے کھوپڑی پھرادی ہے میری... ٹیڑھی ٹیڑھی باتیں کر رہا تھا، سوری کا۔“
”سن رئی تھی رے۔ تو پروا نہیں کر۔ لمبی رقم کھینچنے کو یا ہی سب نالک کرتا ہے بانر کی اولاد۔ چتا نہیں کر۔ ابھی صے سے پہلے پہلے... رات ماں... سبئی ٹھیک کر لوں گی۔ ایک دم پکا۔ یہ بتا کوئی پیسے کا پر بندھ کر سکتا ہے تو؟... ایک ئی دور وچ ماں؟“
لڑکے نے کہا، ”بول کتنا پیسا؟“ وہ پھر پُر امید ہو چلا، ”بتائی دے۔ کل سانجھ پڑنے سے پہلے سب ہوئی جائے گا۔“

عورت اس سے سٹ کے کھڑی تھی۔ سینے سے سرٹکا کے لمحے بھر کو ساکت ہوئی، جیسے گہری سوچ میں ہو، پھر دھیرے سے بولی، ”بہت میں بہت دوئی لاکھ کر لے۔“

اب کے لڑکے نے سوچ کی حالت بنائی، دھیرے دھیرے کچھ ہوں ہاں کیا، پھر کہنے لگا، ”نگد کانیں بول سکتا، پر کوئی دولاکھ کا آسرا ہوئی جائے گا۔ یہ سچ کی سانجھ پڑنے سے پہلے ادھر باڑی میں ہی بندوبست کر دے گا کوئی۔“

وہ حیران ہوئی۔ ”ادھر کیسے؟“

لڑکا ہلکی ہنسی کے ساتھ بولا، ”بس ہے کوئی۔“

”پر کیسا؟ کون؟... کوئی تیرا جان پہچان کا ہے؟“

”ہاں۔ تو ہے نا۔“

”مجاک نہیں کر... صبی بات بول۔“

لڑکے نے سوچا بتا دینا ہی اچھا ہے۔ بولا، ”دولاکھ کا سونے کا ٹکڑا اپنے کئے ہے...“

”اتنی ہے بس۔“

وہ خوش ہو گئی۔ ”چل ٹھیک ہے... پر اسے، پھری کو بولنا کچھ نہیں۔“ پھر سوچ میں بھی پڑ گئی۔ سر ہلا کے بولی، ”بنالوں کی کچھ... کرلوں گی کوئی الٹ پھیر۔ رات ماں ہی سؤر کے جنے کو دولاکھ پر پکا کروں گی۔“ اور اس نے لڑکے کے رخساروں، ہونٹوں، گردن پر انگلیاں دوڑائیں جیسے نابینا لوگ چہرہ پہچاننے کے لیے اپنی یاد تازہ کرنے کو کرتے ہیں۔ پھر وہ اس سے الگ ہو گئی اور جیسے دھکا دے کے اسے روشنی کی طرف ہٹا دیا۔ سرگوشی میں کہا، ”جا۔ ابھی سو جا۔“ اور خود اندھیرے میں گھل گئی۔

وہ کمرے میں آیا تو لڑکی آلی جاگتی اور انتظار کرتی تھی۔ پوچھنے لگی کیا ہوا؟ لڑکے نے بہت چمک دار لہجے میں، بڑی اُمنگ سے خبر دی کہ سب ہو گیا ہے۔ لیکن وہ سمجھ رہی تھی کہ ہمت دلاتا ہے، ہوا ہوا یا کچھ نہیں۔ شاید کوئی الجھن پڑ گئی ہے جو لڑکا اسے بتائے گا نہیں۔

یہ رات لڑکی آلی نے تکلیف میں گزاری۔ گندھی کا لڑکا پھر بھی کچھ سولیا ہوگا۔

اگلی صبح بھی ان کے لیے منہ اندھیرے شروع ہوئی۔

لڑکی آلی اندر سے لوٹی تو اس کے ماتھے پہ بل تھے۔ ناشتا چائے لانے والی عورتیں چلی گئیں تو کمرے کا دروازہ آدھا بند کر کے لڑکی سرک آئی اور لڑکے سے کہنے لگی، ”وہ پولیسا پھری بیٹھک میں سویا پڑا تھا۔ بڑی بہو مجھے دیکھ کے بیٹھک سے نکلی۔ اندر آگئی، آنگن کی طرف کو چلی، بس منٹ بھر رکی۔ ایک باری مجھ سے بولی، ٹھا کر کو بول دینا ادھر سلا یہ گاؤں کا

جو بھی آدمی جو چیخ بھی پہنچائے کھا موسیٰ سے لئی لینا، سہال لینا۔ منع نہیں کرنا۔“
لڑکے کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔ کون آدمی ہے؟ کیا پہنچائے گا؟ مگر اس نے ہاں میں سر ہلا دیا، یہ ظاہر کیا جیسے اسے سب معلوم ہے۔

باڑی کے لیے یہ دن دیر سے شروع ہونا تھا، کیوں کہ پولیس والے کو دیر تک سونا تھا۔ کوئی نو، ساڑھے نو بجے ہیڈ کانسٹیبل لڑکے کے پاس مستعدی سے آیا۔ بولا، ”ٹھا کر! تمہارا ملاکات آئی ہے۔“ لڑکے نے سوچا، اچھا، وہ آدمی آگیا۔ ہیڈ کانسٹیبل کے ساتھ تیز قدموں سے باہر آیا۔ ایک ہولو شکل کا آدمی موٹر سے کھڑا باتیں کر رہا تھا۔ وہ اس جعلی ٹھا کر کو دیکھ کے آگے بڑھا، اور ایکٹنگ میں اس کے پاؤں چھوئے، پھر اسٹینڈ پر کھڑی اپنی بائیسکل کے کیریر میں پھنسے دو پکے اناس نکال کے اس کی طرف بڑھا دیے۔ لڑکے کے اناس سنبھالتے ہی سلائیہ کے ہولو آدمی نے ہاتھ جوڑ سلام کیا اور موٹر اور کانسٹیبلوں سے رخصت ہوتا، بائیسکل چلاتا، باڑی کے صدر دروازے سے نکل گیا۔ ہیڈ نے گندھی کے لڑکے سے کہا، ”بس جی، اتنا ہی آڈر ملا تھا۔“ مطلب، اب آ جاؤ اپنے قید کے کمرے میں۔

لڑکے نے اناس آلی کے حوالے کر دیے۔ عام سے پھل تھے۔ وہ انھیں الٹ پلٹ کے دیکھتی رہی۔ پھر سونگھنے لگی۔ پھر کچھ نہ سمجھ میں آیا تو نوکرانی سے ہنسیا منگا کے اس نے ایک پھل کاٹا۔ دونوں نے کھایا۔ اس کے رس اور گودے اور مزے کی تعریف کی۔ ابھی تک لڑکے کی سمجھ میں کچھ نہیں آیا تھا۔ دوپہر کے کھانے کے وقت تک یہی حال رہا۔ اس کے بعد منٹ بھر کے لیے بہت ہڑبڑی میں جھپٹتی، گہرے گہرے سانس لیتی، بڑی بہو نیلما آئی۔ لڑکے کے سامنے پکی رس بھریوں کی تھالی رکھتی ہوئی سرگوشی میں بولی، ”دوئی لاکھ تیار کر لے... پھری آبی تیرے کو بلائیں گا۔“

تھوڑی دیر بعد لڑکے کو بیٹھک میں بلا لیا گیا۔

نعمت اللہ خاں شکری پتلون ٹی شرٹ پہنے، خوب نہایا دھویا، بالوں کو برل کریم سے سیٹ کیے، کلون لگائے، سامنے رکھی بلور کی تھالی میں بھدے پن سے انگلیاں پہنچاتے ہوئے رس بھریاں اٹھا اٹھا کے منہ میں اچھال رہا تھا۔ اس دکھاوے کی شگفتگی اور نمائشی لا ابالی پن کے باوجود رات کی جگہ، مے نوشی اور بے اعتدالی کا پیلا رنگ اس کے گورے چٹے زمیں دار چہرے پر خوب کھنڈا ہوا تھا۔ آنکھیں بھی سرخ ہو رہی تھیں۔ آواز معمول سے زیادہ بھاری تھی

اور چیزوں پر اس کا ہاتھ اوچھا پڑ رہا تھا۔

لڑکے سے کہنے لگا، ”رس بھری کھاؤ... اس موسم میں مقوی کا حکم رکھتی ہے رس بھری۔ کیا کوئی حکیم سالاماء اللحم... اور وہ کیا چونچلے ہوتے ہیں، سلاجیت ولاجیت کے وہ سب... کیا تیار کرے گا... آج کل ان دنوں میں رس بھری ایک دم مغلط اور مُسک ہے سالی۔“

گندھی کے لڑکے نے شکریہ ادا کرنے کو ہاتھ جوڑ دیے اور رس بھری کے دودانے سلام کر کے اٹھالیے۔

شکری بولا، ”بس، دو؟“ پھر ٹھٹھا مار کے ہنسا، ”چلو، رات ہم نے دو پہ ہاں کر دی تھی معشوق سے۔ تو دو ہی پہ معاملہ ختم کروٹھا کر ساون سنگھ جی... نکالو، کہاں ہے؟... کیا ہے؟“

وہ اس طرح ایک دم جست کر کے اپنے مطلب کے موضوع پر آجاتا تھا کہ حیرت ہوتی تھی۔ خیر، لڑکے نے جیب سے سونے کی ٹکیاں نکالیں اور دونوں ہاتھوں پہ رکھ کر پیش کر دیں۔ ان کی مالیت آٹھ نو ہزار روپے زیادہ ہی ہوگی۔ شکری انھیں ہاتھ میں لیتے، اچھالتے، میز پر بجاتے، کیرم کی گوٹوں کی طرح کھیلتے ہوئے پہلے ہنسا، پھر انھیں کاروباری انداز میں سمیٹ کر اٹھا، پتلون کی جیب میں ڈال کے دھپ سے بیٹھ گیا اور دوبارہ رس بھریوں کا کھیل کرنے لگا۔

گندھی کا لڑکا خاموش بیٹھا اس کی صورت تک رہا تھا۔

پولیس والا ایک دم بولا، ”لڑکے! تمہارے بارے میں کچھ نہیں معلوم مجھے اور جب مجھے لا علم رکھا جاتا ہے تو میں اس کے الگ پیسے چارج کرتا ہوں۔ ہاں... جب خود لا علم رہنا چاہتا ہوں تو الگ سے پیسے نہیں لگاتا۔ بالکل نہیں... مروت بھی آخر کوئی چیز ہے۔ یہ دو لاکھ مروت کا ریٹ ہے۔ اگر نیلما جانی نہیں ہوتی بیچ میں تو پورے چار لیتا۔ اس لیے کہ مجھے تو کچھ بھی نہیں معلوم۔ کہاں سے آئے ہو، کہاں جاتے ہو، کون ہو؟ مگر مجھے پروا نہیں ہے۔ زبان دے دی۔ نہیں دی ہوتی تو پورے چار لیتا، ایک پیسہ کم نہیں... کس لیے کہ بھی اُس چار میں سے ایک تو عطا اور بخشش میں نکل جاتا۔ اب اس دو میں سے پچاس ہزار کا دان پن کروں گا۔ یہ بھی نہ دوں تو کوئی سالا کیا کر لے گا؟... یہ سب آلو کی دُم، محکمہ جاتی خنجر اور بکریاں وغیرہ پان پان سو کی اسامی ہیں... خوش ہو کے، دم ہلا کے لیں گے۔ کیوں کہ میں انھیں ان کی اوقات سے زیادہ، ڈبل دوں گا... گویا ہزار ہزار۔ حوالدار ڈھیس ڈس سالے کو دو

ہزار اور جو وہ میرا بچہ ایس آئی ہاڑا آرہا ہے اسے بیس ہزار۔ ہبہ ہا ہا ہا... ابھی وہ ٹریننگ کو گیا تھا تو سنا ہے ایک مسلمان داشتہ ساتھ لے آیا ہے... رکھیلوں، بندوڑ والیوں پر بڑا خرچ کرتے ہیں یہ جذباتی ٹائپ کے لونڈے۔ اتنا سمجھاتا ہوں کہ بیٹے! مفت میں قیام و طعام کا اصول اپنانا چاہیے۔ مطلب بھوجن وغیرہ اور وہ سب، اگر مفت میں نہیں کیا تو پھر کیا خاک پولیس افسری کی۔“

وہ اور بھی ڈینگیں ہانکتا، مگر گندھی کے لڑکے نے ہاتھ جوڑ کے عرض کی، ”سر! جہاں اتنی کرپا کی ہے وہاں یہ بھی پھر مادہ کو اب ہم پتی پتی کے بارے میں کیا حکم ہے؟“
ہنس کے بولا، ”بیٹے ساون سنگھ... اور وہ کیا؟... ہاں، راتھوڑ! ہمارا تمہارا معاملہ اب چلتا سمجھو۔ تم اب صرف باڑی کے، مطلب ہمارے معشوق کے، مہمان ہو۔ جب وہ اجازت دے، نکل جانا جدھر مرضی ہو اور اپنے معاملے کا یہ ہے کہ تم نے مال دے دیا، یہ سمجھو ہم نے گارڈ ہٹالی۔“

لڑکا گھکھکیا، ”وہ تو ٹھیک ہے سر! ایک دم درست۔ پر مہمانی مجوانی کا بھی آپ ہی حکم کرو گے... ادھر باڑی والوں سے... اور ایک بات عرج کروں۔ سرکاری باتوں میں بولنے جوگا تو نہیں ہے یہ کھا کسار، پر اتنا جرور ہے کہ نفری کو گھنٹا ایک کے لیے باڑی سے ہٹالو گے سر، تو ڈیپارٹمنٹ کی شرماتجوری بھی بنی رہے گی... ہم دوئی نکل جان گے باڑی سے۔“
کہنے لگا، ”صائب مشورہ ہے۔ ایک بندے کو باہر کسی کام سے بھیجا ہے۔ وہ آ لے تو ہٹاتا ہوں سب سالوں کو۔ پھر تم اور تمہاری وہ... ٹھکرائن... نیلما کو بتا کے نکل جانا... ویسے نام کیا ہے بائی کا؟“

اور کچھ دیر اس کی بک بک جاری رہی۔ اس اثنا میں باڑی کا موتر، پھوپھی زاد، چاندی کے چمچھاتے کٹوروں میں خوب کڑھے، گلابی ہو چکے دودھ میں بادام، پستے مغز گھونٹ پیس کے لے آیا اور بتانے لگا کہ اس میں کیا کیا ہے۔ شکری نے لڑکے کو اشارہ کیا کہ لو۔

لڑکے نے ہاتھ جوڑ کے پوچھ لیا، ”سر! اس میں بھانگ تو نہیں ہوگی؟“
تو پولیس والا بے اختیار ہنس پڑا۔ بولا، ”ٹھا کر! ہم آپ کو بھانگ کیوں پلانے لگے؟ آپ کو سفر درپیش ہے بیٹے! بھانگ پییں تو یہ سالے باڑی والے پییں۔ سورگیہ ماسٹر کا یہ پوتا پیے، جو سالا اصل میں نواسہ ہے لیکن خود کو پوتا مشہور کیے ہوئے ہے... کیوں بے؟... یہ

کیا بد معاشی ہے؟“

پھوپھی زاد نے ہاتھ جوڑ کے کھیسیں نکال دیں اور اسی وقت خبر نہیں دونوں کے بیچ کیا سنگل ادھر سے ادھر ہوا کہ شکری کھڑا ہو گیا، اس نے اپنی پشت پر ہاتھ پہنچایا، پتلون کی کچھلی جیب سے چھوٹا سا پستول نکالا اور لڑکے کی طرف سادھ لیا۔ بولا، ”ٹھا کر بیٹے! ضابطے کی ایک چھوٹی سی کارروائی رہتی ہے۔ آپ کی جامہ تلاشی لینی ہے۔ یہ سالا پوتا دروازہ بند کر دے گا۔ آپ بے فکر ہو کے ننگا جھاڑا دے دو... چلو... شابش! دیر نہیں کرو۔ دروازے بند ہیں سب۔ آپ کی بے عزتی ہونے کا بھی کوئی احتمال نہیں اور سردی بھی نہیں لگے گی... ہاں، چلو... سویٹر، قمیص، بنیان، پتلون، چڈی، سب گرا دو بیٹے فرش پر... کم آن!“

اب تو سب کھیل ہی ختم ہو گیا تھا۔

گندھی کے لڑکے نے بہت بے بسی اور مردنی سے شکری کی طرف دیکھا۔ دل میں کہا، ”حرام جادہ ہے سالا۔“

شکری ہنسا۔ بولا، ”ہماری نیلما جانی نے کہا تھا کہ کہیں سے تمہارے پاس دو لاکھ آجائیں گے... شام سے پہلے۔ ہم نے سوچا، بھئی کہاں سے آئیں گے؟ دور دور تک تمہارے کسی والی وارث سالے کا پتا نہیں ہے۔ ہائیں؟ بھئی کون لائے گا۔ ہمیں فکر ہو گئی۔ پھر ہمیں بتائے بغیر ہماری نیلما جانی نے سالے حوالدار ڈھیس ڈس سے ایک ذرا سی فے ور کی درخواست کر دی... کہ بھئی ٹھا کر کی ملاقات آئے گی تم ملنے دینا۔ وہ ایک حرامی۔ اس نے اس معتبر سالے کو میرے پاس بھیج دیا کہ سر، ایسا ایسا ہے۔ میں نے کہا آنے دو، ملنے دو، لانے دو، کیا لا رہا ہے... جو بھی لائے بسم اللہ۔ پھر اس بھان کے چمپو کا سراغ اٹھاؤ۔ معلوم کرو کون ہے۔ اگر مال لاتا ہے تو مال بھی کھاؤ... بندہ بھی گھیر لاؤ۔ ہا ہا ہا! تو بھئی مختصر یہ کہ تم دونوں مرد عورت ادھر انناس کھا رہے تھے، ادھر وہ بائیسکل والا جو انناس لایا تھا، سالا جوتے کھا رہا تھا۔ جب اس گھونچو کی کھوپڑی نرم ہوئی اور ناک کے رستے کچھ خون بہا تو وہ بولا... اور اونچے سر میں بولا۔ معلوم ہوا انناس اصلی تھے... مطلب سونا وونا نہیں بھرا تھا ان میں۔ ہماری جانم نے تمہاری بات بنائے رکھنے کو اس گدھے کے ہاتھ بھیجے تھے وہ۔ اچھا! ہم نے سوچا، بھئی انناس میں مال نہیں آیا، پھر کہاں سے آیا؟... سیدھی سی بات ہے۔ مال تو تمام عرصے اپنے ٹھا کر ساون سنگھ مہودے کی باڑی سے بندھا رہا تھا... اور بندھا ہے... یعنی کیا خراب بھی بندھا ہو۔

تو بیٹے چڈی بنیان رہ گئے ہیں جھانکنے کو... آ جاؤ ادھر کھلے میں... ہاتھ کنگن کو آرسی کیا ہے۔“
لڑکا کیا کرتا اور کیا کہتا، خاموشی سے سویرا تارنے لگا۔ اس نے پتلون کی بیلٹ
ڈھیلی کی، کھینچی۔

شکری زیادہ دیر چپ رہنے والا کب تھا۔ کہنے لگا، ”ایک بات بتاؤ یا ر! اتنا سونا وونا
کہاں لے جا رہے تھے؟... سمجھ رہے ہو؟ اب تو تفتیش کا رخ ہی بدل گیا ہے، یعنی اب یہ
معلوم کیا جائے گا کہ مال کہیں ادھر تو نہیں جا رہا؟... دوسری طرف؟... تسلی سے ننگے ہولو، پھر
دیکھتے ہیں۔“

گندھی کے لڑکے کو سب سونا... اور شاید لڑکی بھی جاتی دکھائی دی... اور لے جانے
والا کون؟ یہ مرا، نچڑا پولیسا سالا۔

اسی وقت پھوپھی زاد کے ہاتھ سے چمچا یا کچھ اور بہت آواز سے گرا۔ شکری چمک
گیا۔ اس کے ہتھیار کا رخ اک ذرا دیوار کی طرف ہوا تھا کہ لڑکے نے مایوسی میں بیلٹ کھینچ
کے بھاری بکل پولیسے کے ہاتھ پہ دے مارا۔ پستول چھوٹ گرا۔ وہ گالی بکتے ہوئے اٹھانے کو
جھکتا تھا کہ مہانگی کے بھاری اسکرین کے پیچھے سے کوئی اچھل کے اس پر آیا۔ لڑکے نے اس
عورت نیلما کے شوخ رنگ لباس کی جھلک اور ایک دھار دار ہتھیار کی چمک دیکھی اور یہ دیکھا
کہ کس تیزی سے گرے ہوئے آدمی پر سوار عورت کے دونوں ہاتھوں نے اپنا اپنا بھیانک لکشن
پورا کیا ہے۔ الٹے ہاتھ نے گرے ہوئے کا دہانہ جکڑ لیا اور سیدھے نے ہتھیار کا پھل اس کے
گلے پر ایک کان سے دوسرے کان تک چلا دیا۔ بس خرخر اٹھ سنائی دی۔ بڑی بہو نیلما تڑپتے
ہوئے الٹے آدمی کی گدی پر گھٹنا جما کے بیٹھ گئی اور فواروں، ٹلاریوں میں اس کی جان نکالنے کا
جتن کرنے لگی۔

لمحہ بھر کو لڑکے کی اس کی نظر ملی۔ ایسا لگتا تھا وہ نیند میں ہے یا کوئی ایسی سحر زدگی
ہے کہ نہ وہ اسے پہچان پا رہی ہے نہ خود کو پہچنوا سکتی ہے۔
لڑکے کے لیے وقت بے حدست رفتار ہو گیا۔

باڑی کے پھوپھی زاد کے لیے تو وقت کی رفتار جیسے ختم ہو گئی۔ وہ کھڑے کھڑے
کانپنے لگا پھر اس کا پیشاب خطا ہو گیا۔ مگر وہ اپنی بے خبری میں شکری کا تڑپنا دیکھ رہا تھا...
دیکھے جا رہا تھا۔

اچانک لڑکے کو نیلما کی آواز سنائی دی، ”اے، نامردے کو ادھر لے آٹھا کر! ادھر لے آ۔“ لڑکے نے سن لیا تھا۔ وہ بڑھا۔

موتبر پھوپھی زاد کے پیراب تک فرش نے پکڑ رکھے تھے۔ اس نے بھی عورت کی آواز سنی۔ بھاگنے کے لیے اس نے دروازے کے رخ سلوموشن میں چلنا شروع کیا۔ گندھی کے لڑکے نے پیشاب، پسینے اور جاں کاہ دہشت میں آب آب ہوتے اس جیلی آدمی کو گردن سے پکڑا اور باڑی کی عورت کے حوالے کر دیا۔ عورت نے پھوپھی زاد کو ہتھیار دکھا، ٹھنڈے ہوتے شکری پر گرا لیا۔ پھر وہ خود اٹھی اور لاتیں مار مار کے اس آدھے مردے کو پولیس والے کے جسد پر اٹھاتی گراتی رہی۔ فرش پر پھیلا ہوا اور مردے کے جسم سے رستا ہوا لہو موتبر کے ہاتھوں پر اور چہرے اور لباس پر چھپ گیا تھا۔ وہ اپنے مختل حواسوں کے ساتھ خوف زدگی میں ادھر ادھر دیکھتا خود بھی بھیاںک نظر آنے لگا۔ باڑی کی بڑی بہو نے اس کا کالر چھوڑ دیا اور ننداسی آواز میں بولی، ”پھری کے پاس سے اپنا سونا نکال لے ٹھا کر! اس کی جیب ماں گڈی کی چابی ہے... نکال لے میری جان! ٹھکرائن کو اپنی لے کے آرے جلدی۔ دیری نہیں کر۔ جانے کا ٹیم کمتی ہے!“

کچھ سنا، کچھ نہیں سنا، لڑکا بیٹھک کا دروازہ کھول کے نکل گیا۔ آلی کو بیٹھک تک لانا ہے۔ اس نے سوچا شاید یہ آخری آزمائش ہے۔ وہاں حوالدار موجود ہے اور باقی نفری بھی۔ ان تک شکری کے مرنے کی آوازیں تو نہیں پہنچی ہوں گی۔ اس نے خود کو تسلی دی، ”نہیں جی نہیں۔“ باہر ہیڈ کانسٹیبل اسے دیکھتا تھا۔ لڑکا کھسائی ہوئی مسکراہٹ چہرے پہ جمائے چلتا رہا۔ پہنچ گیا۔ سرسری سا ایک بار پولیس والوں کو دیکھ کے وہ لڑکی سے کہنے لگا، ”لے ری تیرا نمبر آگیا۔ ڈی ایس پی صاحب یاد کر رہے ہیں۔“ لڑکی آلی نے اس کے چہرے کی اڑی ہوئی رنگت دیکھی، کچھ نہیں سمجھی، اس کے پیچھے پیچھے چل پڑی۔

بیٹھک کے قریب پہنچتے ہوئے لڑکے نے پھنسی ہوئی سرگوشی میں کہا، ”تیار ہو جا آلی! پھری نمٹ گیا ہے۔“ لڑکی اب بھی نہیں سمجھی۔ دونوں بیٹھک میں داخل ہو گئے۔ وہاں لڑکی آلی نے خون دیکھا اور حلق کٹے آدمی کو فرش پر پڑا دیکھا۔ اسے موتبر کا چہرہ، کپڑے، ہاتھ پاؤں سب لہو میں سنے ہوئے دکھائی دیے۔ لڑکے کے سنبھالتے سنبھالتے بھی اس نے چیخوں پر چیخیں مارنی شروع کر دیں۔ موتبر جواب تک سکتے کی حالت میں کھڑا تھا، ایک دم گلا پھاڑ کے چیخنے لگا،

”بچاؤ، بچاؤ! پھری صاب کتل ہوئی گیا... کتل ہوئی گیا پھری... بچاؤ رے بچاؤ۔“

باڑی کی عورت جیسے اب نیند سے جاگتی جارہی تھی۔ گندھی کے لڑکے کو دیکھ پکار کے بولی، ”نکل جا رے ٹھاکر! باڑی کی کھڑکی سے کود کے نکل جا میری جان!“

مگر باہر سے دوڑے آتے پولیس والے بیٹھک میں بھرتے جارہے تھے۔ لڑکے نے حوالدار کے ہاتھ میں دونالی شاٹ گن دیکھ لی تھی۔

ستر طرح کی آوازوں کے اوپر سے باڑی کی عورت نے پھر چیخ کے کہا، ”نکل جا رے دوس! نکل جا میری جان!“

”کتیا سالی!“ لڑکے نے دل ہی دل میں گالی دی۔ ”مروادیا میرے کو... سالی کتیا نے مروادیا میرے کو۔“

لڑکی آلی بھی برابر چیخیں مار رہی تھی۔ لڑکے نے پھر دل ہی دل میں گالی دی۔

”دھت تیری تو!... دھت تیری ایسی کی تیری!“

باڑھ کا پانی سلائیہ گاؤں کے ٹخنوں سے اوپر تک چڑھ آیا تھا۔

سب چیزیں اور سب لوگ ڈوبتے جارہے تھے۔



اَلّی گجر کی آخری کہانی

اَلّی گجر ادھر اپنی کہانیوں کے ساتھ نہیں آیا تھا۔

کہانیاں تو اس نے بعد میں سوچیں، یہاں ہوش سنبھالنے کے بعد۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا گیا کہانیاں بناتا گیا۔ پہلے پہل اسے یہ سب کہانیاں بنانا ضروری لگتا تھا... لوگ پوچھتے جو تھے... بعد میں اس نے پروا کرنی چھوڑ دی۔ لوگوں کی خیر ہے، کبھی کبھی وہ دل ہی دل میں کہتا، اناں دی خیر ہے۔ انھیں تو کچھ بھی سنا کے چپ کرایا جاسکتا ہے۔ اناں دی پروا نہیں کرنی چاہی اے۔

اَلّی کی کہانیاں سن کے لوگ چپ ہو جاتے تھے مگر اسے پتا تھا کہ دل ہی دل میں ہنستے ہیں۔ اندرای اندر پئے ہسدے نیں، ماں یائے۔ ہنسا کریں، منوں پروائی کوئی نہیں۔ ایک عمر گزر گئی تھی لیکن لوگوں نے اس کے بارے میں پوچھنا نہیں چھوڑا تھا۔ شروع میں، جب اسے زیادہ کچھ سمجھ نہیں تھی، لوگ پوچھتے تھے تو وہ منہ دیکھتا رہ جاتا تھا۔ چوٹی صاب البتہ کہہ دیا کرتا تھا کہ بی اپن مزارے کا بیٹا ہے، یہاں آتے ہوئے ماں باپ دونوں مر گئے، ادھر ہی حویلی میں پل گیا۔

پر کچھ کہنے سے کیا ہوتا ہے۔ چوٹی صاب کہتا ہی تو تھا، پکے کاغذ پہ انگوٹھا تو نہیں نہ لگواتا تھا، جو بعد میں لوگ بولیں کہ ہاں بی یقین آ گیا، آپ ٹھیک کہہ رہے ہو، مزارے کا ہی

بیٹا ہے اُلی گجر۔

اصل میں سب جانتے تھے پندرہ گاؤں ادھر، پندرہ گاؤں ادھر، سب جانتے تھے کہ اُلی چوئی صاب کا بیٹا ہے، کسی رحمتی کے پیٹ سے۔ بس یہ ہے کہ وہ اسے بیٹا نہیں مانتا۔ ہجرت سے پہلے کے جاننے والے جانتے تھے کہ اُلی گجر کی ماں رحمتی خوب صورت تھی، پر وہ مزارع نہیں تھی۔ وہ چوئی صاب کی کچھ نہیں ہوتی تھی... یعنی بہت تھوڑے وقت کے علاوہ کہ جب بھوسے والے اُسارے کی بیٹھک میں اسے روک کے چوئی صاب اُس کے ساتھ سویا تھا، رحمتی اس کی کچھ نہیں ہوتی تھی۔

ہوتی کیسے؟ آدھی پاگل تو دیے ہی تھی۔ اوپر سے ٹھیک سے سن اور بول نہیں سکتی تھی رحمتی۔ ہاں آنکھیں اس کی بڑی بڑی تھیں۔ بچپن کی ایک یہی یاد اُلی گجر کے ساتھ بارڈر پار کر کے آئی تھی۔

رحمتی نہیں آ پائی تھی۔ رستے میں وہی گڑ بڑ ہو گئی تھی جو ہزاروں لاکھوں کے ساتھ ہوئی اور وہ نہیں آ پائے۔

چوئی صاب دو قسطوں میں آیا تھا۔ پہلے سامان... سامان کے ساتھ نوکر چاکر، رحمتی اور رحمتی کا بیٹا، یہ سب چلے تھے۔ رستے میں سامان لٹ گیا۔ آدمی نہیں رہے، اُلی گجر رہ گیا۔ دو ڈھائی سال کا تھا، کسی کی نظر نہیں پڑی ہوگی۔ جب دوسری قسط میں چوئی صاب پہنچا تو یہ گاڑی کے نیچے پڑا روتا ہوا ملا، وہ اسے اٹھا لایا۔

ادھر آ کے جوڑ توڑ کی، کچھ کلیم شلیم داخل کیے، سکھوں کی چھوڑی ہوئی یہ حویلی قابو کی اور چوئی صاب بیٹھ گیا۔ مال مویشی نوکر چاکر بھی کر لیے۔ اُنھیں میں سے کسی نے اُلی گجر کی دیکھ رکھ شروع کر دی ہوگی۔ لٹو جی، اُلی پل گیا، چھ سال کا ہو گیا۔

پر لوگ بڑے حاسد، کنجر کی اولاد ہوتے ہیں۔ ساتھ کے ہجرت کرنے والے کچھ ابھی تک ہاتھ پیر مار رہے تھے، ادھر حویلی میں ان کی آون جاو بھی تھی، اُنھیں میں سے کسی حاسد کتے نے سکھا سمجھا دیا۔ اب جب بھی اُلی چوئی صاب کو دیکھتا تو بابا، بابا پکارنے لگتا۔

چوئی صاب پہلے تو کھسیا، پریشان ہوا۔ بعد میں اس نے غصہ بھی کیا۔ پیار سے اکیلے میں سمجھایا بھی کہ پتر میں تیرا بابا نہیں، وہ کوئی اور تھا، گزر گیا۔

چھ برس کا اُلی گزرنا کیا سمجھتا۔ کسی سے پوچھا، اس نے گجر بتا دیا ہوگا، یا اُلی کو اُلی

گجر کہہ کے بلایا ہوگا۔ بس یہیں سے آلی کو کہانیاں بنانے اور سنانے کا خیال آیا۔ اس نے باپ کے نہ ہونے اور چوئی صاب کے برا منانے کے بیچ ایک رستہ نکالا اور پہلی کہانی یہ بنائی کہ اس کا باپ بخشا گجر تھا (جو بعد میں چوئی صاب کا بتایا ہوا مزارع اور رحمتی کا آدمی بنا)۔ پھر یہ بخشا گجر مزارع بھی ہجرت کے دوران سب کے ساتھ فوت ہو گیا۔

وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ رشتے اور چیزیں سمجھ میں آتی رہتی ہیں... آدمی کا یہی ہے۔ لوگوں کو اس کی ماں کا نام معلوم تھا۔ آلی نے آگے بتایا کہ ماں کی آنکھیں بہت خوب صورت تھیں... پکی بات۔ پھر اس نے بات اور آگے بڑھائی۔ کہنے لگا، ماں کی آواز بہت دردیلی تھی۔ ہیر گاتی تو رُلا دیا کر دیتی تھی ماں، کہ ڈولی چڑھ دیاں ماریاں ہیر چیرکاں۔ ماں کا ایک بھائی تھا، ہونا چاہیے تھا۔ تو اس نے اپنا ایک ماما سوچا... ڈکیت۔ آلی نے ماں کے اس بھائی کا نام بھی سوچ لیا تھا، ناصر... ناصر ڈکیت۔

بڑی دہشت تھی اس کی۔ آلی نے کہا، وہ عمر قید کاٹ رہا ہے... خبرے ابھی بھی کاٹ رہا ہے کہ مر گیا۔

اب وہ اپنی عمر کے لڑکوں کو ناصر ڈکیت کے کارنامے سنانے لگا کہ تھانے میں گھس کے اس اس طرح سرکاری گھوڑی کھول کے ہوا ہو گیا ناصر۔ ایسے براتیں لوٹیں ناصر ڈکیت نے۔ کہیں سے سن سنا کے آلی نے ایک گانا بھی بنا لیا تھا کہ ناصر ماریا ہشیار پور ڈاکا... اور خبرے کیا کیا۔ ہشیار پور چوئی صاب کی بے بے کا شہر تھا۔ آلی نے چوئی صاب کے خوش کرنے کو گانے میں ہشیار پور ڈال دیا تھا۔

برابر کی حویلی میں جالندھر سے آئے ہوئے ملک لوگ آجے تھے، تو ان لڑکوں کے خوش کرنے کو آلی، نے یہ کیا کہ ناصر ڈکیت کا نام بدل کر اس نے ملک ناصر کر دیا اور کہانی سنائی کہ ملک ناصر نے ایسے ایسے قتل کیے اور ڈاکے ڈالے۔ ملکوں کے لڑکے کچھ خوش ہوئے کچھ نے آلی کو گالی نکالی، اسے حرامی کہا۔ ڈکیت کا ملکوں میں سے ہونا انھیں بہت برا لگا تھا۔ آلی اب بڑا ہو گیا تھا، اس نے اسی دن شام کو لڑکوں کی دوسری ٹکڑی کو یہ کہانی سنائی کہ ناصر ڈکیت جالندھر کے ملکوں کی عورتوں کو خراب کر کے جیل گیا ہے، باہر آئے گا تو وہ لوگ اسے مار دیں گے۔ اس نے یہ بھی کہہ دیا کہ ناصر میرا ماما ہے، اس لیے ذات کا اصل نسل گجر ہے، ملک شلک کوئی نہیں۔ ملکوں کے لڑکوں نے اگلے دن پوری نفری اکٹھا کر کے پچھوڑاے سے حویلی پہ اتنے

پتھر برسائے کہ سکھوں کے جڑائے ہوئے اُدھر کے سب رنگین شیشے ٹوٹ گئے۔
 چوئی صاب کو ساری بات پتا چلی تو اس نے پہلی بار آئی کو جم کے مار لگائی۔ نیک
 دل ملکوں نے آ کے بچایا، نہیں تو بارہ برس کے آئی کا خبر نہیں کیا حشر ہوتا۔
 اس واقعے کے بعد آئی ہوشیار ہو گیا۔ اب وہ دو قسم کی کہانیاں بنانے لگا۔ ایک قسم تو
 وہ جس میں اس نے اپنا خاندان پھیلا یا تھا۔ یہ سب پکے مزارعے اور ٹہکے والے لوگ تھے جیسے
 اس کا باپ، بخشا گجر۔ پھر باپ کا باپ، بابا چٹے شاہ گجر، جو اللہ لوک آدمی تھا۔ پھر چھ آٹھ چاچے
 مامے، بڑیاں دہشتاں والے۔ ساتھ ہی چار پانچ موسیاں مامیاں، یہ عورتاں لسیاں رڑکتیاں تو
 ان کے سونے کے ٹھوس کنگن کند آوازوں میں ٹھک ٹھک کرتے تھے۔
 کہانیوں کی یہ قسم سب کو سنانے کے لیے تھی۔

دوسری کہانیاں وہ اپنے لیے بناتا تھا۔ وہ سنانے کے لیے نہیں ہوتی تھیں۔ کچھ
 کہانیاں تو بہت گندی ہوتی تھیں۔ باقی میں وہ اپنے دشمنوں کی ایسی تیزی کرتا تھا۔ تو یہ سب وہ
 اکیلے میں خود کو سنانے لگا اور خوش ہونے لگا۔

پندرہ سال کا ہو کے اس نے بارہ برس کی ایک لڑکی اپنی کہانیوں میں ڈالنی شروع
 کر دی تھی... ایک موسیٰ کی بیٹی ریشماں جو آئی کے لیے لسی، مکھن اور روٹی لاتی۔ ان کہانیوں
 میں ماما ناصر سمیت اس کے بڑے بوڑھوں کا یہ فیصلہ تھا کہ آئی سولہ برس کا ہو جائے اور
 ریشماں تیرہ کی تو دونوں کی شادی کر دی جائے گی۔ پر مصیبت پڑ گئی۔ وہ سننے والوں کو بیچ بیچ
 میں بتاتا کہ مصیبت یہ پڑ گئی کہ چوئی صاب بابا بخشے کو اور ماں رحمتی کو بہلا پھسلا کے ادھر نکال
 لایا۔ رستے میں وہ دونوں مارے گئے۔ جب ہی سے میں اس لعنتی چوئی صاب کی اردل میں
 پھنسا ہوا ہوں۔ لوگ بتاتے ہیں ریشماں ادھر ادھر رہتی ہے، جلدھر میں۔

سننے والوں کو آئی کی ان کہانیوں میں جھول نظر آتا تو وہ کہتے کہ ادے چبل! چوئی
 صاب ہوری ادھر بارہ تیرہ سال سے ہے۔ لوگ بولتے ہیں تو ادھر ڈھائی برس کا آیا تھا۔ پھر
 یہ پندرہ برس اور ریشماں... یہ سب کیا بکواس ہے؟ آئی کبھی ہنس کے اڑانے کی کوشش کرتا،
 کبھی کہتا، ”تم نہیں سمجھو گے، دل پہ چوٹ کھائی ہوتی تو سمجھ آتی، پاگلو!“

اور وہ کہتا تھا، ٹھیک ہے، کوئی پابندی تو نہیں، کیوں سمجھاؤں میں سب کو؟ نہیں سمجھتے
 ناں سمجھیں۔ جائیں اپنی بے بے کے اس میں۔ پر ان کہانیوں کی بھنک بھی چوئی صاب کو لگ

جاتی تو آلی کو بڑی مار پڑتی۔ چوئی صاب بکواس بھی کرتا جاتا، پٹائی بھی کرتا جاتا۔ کہتا، ”رامی! تو گناہ گار ہے، جھوٹ بول بول کے اپنی عاقبت خراب کرتا ہے۔ لہو دسو! اٹھاراں وی برسوں کا ہو کے ادھر آیا تھا! بولتا ہے ادھر کوئی گھر والی بھی تھی اس کی، باڈر کے اس پاسے۔ جھوٹا کذاب! منا حوس!“

آلی کی گھر والی کا نام، طاہر ہے، ریشماں تھا۔

لوگ کہتے ہیں ناموں میں کیا رکھا ہے پر اس نام ریشماں نے بڑی پسوڑی ڈال دی۔ چوئی صاب کے بیٹے... اصل بیٹے... کی دلہن حویلی میں آئی تو باہر سب کو پتا چلا کہ نام اس کا ریشماں ہے۔ سب سے مطلب، آلی کے سوا دوسرے سب کو پتا چلا۔ آلی کو کون بتاتا؟ کوئی بتا بھی دیتا تو اس نے کب پروا کرنی تھی! بہت کرتا تو بک دیتا کہ نام ریشماں ہے تو جائے اپنی بے بے کے اس میں۔ لہو جی، مہینے ڈیڑھ میں چوئی صاب کے اصل بیٹے کو کسی کتے نے جابٹایا کہ آلی، اپنی ماں دا پتر، گانے گاتا ہے کہ بئی ریشماں دالک چن ورگا اور خبرے کیا کیا اور بولتا ہے کہ ریشماں سے اس کا ایک بیٹا تھا، ڈھائی برس کا ہو کے مر گیا۔

چوئی لوگ بہت مال مویشوں، زمینوں والے ہوں تو، آپ کو پتا ہے، بڑا گرمائش والا ہو ہوتا ہے ان کا۔ تو بس سمجھو قیامت ٹوٹ پڑی۔

آلی کو گڈ میں ڈال کے ضلع ہسپتال لے جانا پڑا۔ ایک دن ایک رات بے ہوشی میں کٹے، پھر اسے ہوش آیا۔ چوئی صاب ڈی ایس پی حق نواز کو ملنے پہنچا تو اس نے بڑیاں گالیاں نکالیں کہ تجھے، تیرے بیٹے کو بہت ہی کوئی بد معاشیاں کرنے کا شوق ہے تو دونوں کو دن کے دن ضلع کی حدیں پار کرا دیتا ہوں، ادھر بیٹھ کے اپنے یہ شوق پورے کرتے رہنا، سمجھا؟ یہاں یہ سب نہیں چل سکتا۔

چوئی صاب نے پگ اتاری، مونچھ نیچی کی اور علاج معالجے کے لیے اور ضابطے کے ہر بے خرچے کو ہر طرح آمادہ ہوا تب جانے دیا ڈی ایس پی نے۔ بعد میں پولیس والے نے اسے نرمی سے یہ بھی سمجھایا کہ چوئی صاب! کوئی خدا خونی کرو۔ میں نے سنا ہے اس آدمی کو ادھر بہت ہی مار پیٹ کی جاتی ہے۔ بئی دماغی ہسپتال میں کیوں نہیں داخلہ کرا دیتے؟ فاتر العقل کو اس طرح زد و کوب کرنا تو ٹھیک نہیں ہے... قانوناً بھی اور ویسے بھی۔

چوئی صاب نے وعدہ کیا کہ ان شاء اللہ بہت جلدی آپ کے حکم کے مطابق کروں گا۔

خیر، چوئی صاب نے ہسپتال سے لا کے آئی کو بھوسا رکھنے والی کوٹھڑی میں بند کر دیا۔ اُدھر ہی اس کا کھانا پینا، حاجت ضرورت کا بندوبست ہو گیا۔ وہ وہیں سے اونچی آواز میں ماں بھین کرتا رہتا تھا۔ کسی نے چوئی صاب کو سمجھایا کہ تھوڑا سیندور دے دو، اس کی بک بک سے جان چھوٹ جائے گی۔ پر یہ کوئی ایسی پریشانی کی بات نہیں تھی۔ آواز اس کی کم ہی کم حویلی تک آ پاتی تھی۔

لو جی، کچھ دن تو سب کی جان چھٹکارے میں رہی۔ ایک دن کہیں سے اسے ماچس مل گئی تو اس نے بھوسے کو آگ دکھا دی اور مرتے مرتے بچا۔

مجبوری میں اب اسے دالان میں ٹاٹ کا پردہ ڈال کے رکھنا پڑا... ایک طرف سے اس کے پیر میں، دوسری طرف سے بھاری پلنگ کے پائے میں زنجیر ڈال کے... کیوں کہ روکنا ضروری تھا، ورنہ وہ حویلی بھر میں دھمال ڈالتا، کد کڑے لگاتا پھرتا۔ دوسرے سب اطمینان تو ہو گئے تھے لیکن سورے کی آواز سے آدھی حویلی جھنجھکتی رہتی تھی۔ وہی سب گالی گفتار کرتا رہتا تھا۔ یا پھر اپنی کہانیاں سناتا تھا، ماں رحمتی اور بخشنے گجری، ریشماں اور ناصر کی۔ سنانے میں ذرا سا فرق یہ ہوا تھا کہ ناصر گجرا ب اس کے ماموں کا نہیں، بیٹے کا نام تھا۔ مطلب ریشماں سے اس نے جو بیٹا سوچا تھا اس کا نام۔ کوئی پوچھ بیٹھتا کہ آئی! تیرا ناصر کتنے سال کا ہو گیا؟ تو کہتا ناصر ابھی جمیا نہیں، تھوڑا ٹیم باقی ہے۔

اسی سال چوئی صاب حج بیت اللہ کو گیا۔ واپس آیا تو اس نے بڑی دیگیں کھڑکائیں، جشن جوشن کیے، جس کے اگلے روز حویلی میں ڈاکا پڑ گیا۔ یہ سمجھو سب چلا گیا، بدن کے کپڑے رہ گئے۔ یا بینکوں میں رکھا پیسہ، مال مویشی، زمینیں اور بس۔ ڈکیت لوگ جیسے ننگا جھاڑالے کے گئے تھے۔

ساتھ میں ہجرت کر کے آنے والے حاسدوں مرداروں نے الگ شامتیں دکھائیں۔ پندرہ گاؤں، ادھر، پندرہ ادھراڑا دیا کہ چوئی صاب کو حجر اسود کی بددعا لگی ہے۔ اپنے صُلب کے بیٹے کو حرامی بنا کے ڈال رکھا ہے، یہ اسی کرنی کا پھل ہے۔

چوئی صاب تک بات پہنچی تو اس نے بڑا رولا ڈالا۔ اپنی صفائی میں رحمتی متوفیہ پر جم کے بہتان لگائے کہ اُسارے کی برابر والی بیٹھک میں اس کے ساتھ دسیوں مرد سو یا کرتے تھے، مجھ اکیلے کو کیوں ذمے دار ٹھہرا رہے ہو کو!

یہ سب آلی کے ارد گرد، اس کی لاعلمی میں ہو رہا تھا۔

یا شاید وہ اتنا لاعلم بھی نہیں تھا۔ پندرہ گاؤں ادھر، پندرہ ادھر کی بات اس کے کانوں میں پڑی تھی کہ چوٹی صاب اپنی صفائی میں رحمتی پر بہتان باندھ رہا ہے۔ باتیں پہنچانے والوں کو امید نہیں تھی کہ ان کی بک بک ایسی کڑوی فصل لائے گی۔ وہ سمجھتے تھے تھوڑی جی کھلبلی مچے گی، مزہ آئے گا۔ پر آلی گجر نے اس رات وہ طوفان اٹھایا کہ چوٹی صاب کا بیٹا... اصل بیٹا... اندر سے شاٹ گن نکال لایا، بولا، اس حرام کے کو آج ختم ہی کر دینا ہے۔

پر جی ختم کس نے کرنا تھا۔ ٹھڈی میں ہاتھ دے دے، واسطے دے دے دلا کے چوٹی صاب اپنے اصل بیٹے کو واپس اندر لے گیا۔

بہت دن پہلے سیندور کھلانے والی بات جس بندے نے سُجھائی تھی اب وہی بولا کہ چوٹی صاب کچھ کرنا ضروری ہو گیا ہے۔ چوٹی صاب نے ہاں میں سر ہلا دیا۔

اس دن کے بعد سے اس کے قصے کہانیاں اور گفتاریں بس اسی کے لیے رہ گئیں۔ سارے ہی وقت چھپر کھٹ پہ پڑا وہ اپنے لوگوں سے اندر ہی اندر باتیں کرتا، انھیں چلایا اور اٹھایا بٹھایا کرتا۔

اس کی ڈاڑھی مونچھوں اور سر کے بالوں میں اب سفیدی آچلی تھی۔ آنکھیں جو رحمتی کی طرح خوب روشن اور بڑی بڑی ہوں گی، لگتا تھا کچھ بجھ سی گئی ہیں یا کہیں دور دیکھنے لگی ہیں۔ ان ہی دنوں چوٹی صاب نے فاصلے ہی سے مگر آلی کے ساتھ ایک تعلق سا پیدا کر لیا۔ نماز کی چوکی وہ اسی دالان میں اٹھوا لایا۔ پھر کبھی آتے جاتے اس کے سرہانے وہ ٹھہرنے بھی لگا۔ کبھی پوچھ بھی لیتا کہ تو نے روٹی کھائی؟ پانی پیے گا آلی؟

یہ پریشانی کی بات تھی۔ چوٹی صاب یہ سب کیوں کر رہا ہے؟ آلی سمجھ گیا کہ ایسا کچھ ضرور ہے جو چوٹی صاب چھپ چھپا کے اس کے خلاف کر رہا ہے۔ پھر اس کا ثبوت بھی تین چار روز میں مل گیا۔

ڈاکے کی تفتیش کے لیے پولیس اہلکار آئے تھے۔ کچھ کاغذوں کے بندل اور ایک کڑیل جوان کو مشکلیں کس کے ساتھ لائے تھے۔ آلی اس وقت اپنے چھپر کھٹ پہ کھڑا پاؤں کی زنجیر بجاتا تھا جو یہ لوگ برابر سے گزرے۔

اور بتا! اوئے ربا میریا! آلی نے اندر ہی اندر چیخ ماری۔ اوئے دیکھو! وہ ناصر کو

باندھ کے لا رہے ہیں۔ آلی گجر کے بیٹے ناصر کو!

وہ پرانے خطوں، لفافوں کا بندل بھی لا رہے تھے۔ یہ وہی خط تھے جو ریشماں نے ادھر سے آلی کو لکھے تھے کہ آلیا! اب آ کے منوں لے جا۔ خط نہیں تھے ریشماں نے فراق میں چیکاں ماریاں سن، تے خوش خبریاں پے جیاں سن کہ اپنے گھر منڈا ہویا ہے، ناصر... ناصر اپنا۔ اور یہ ساریاں چیکاں، خوش خبریاں، سارے خط اس لعنتی کتے چوئی صاب نے اپنی تجوری میں چھپا کے رکھے ہوئے تھے۔ آلی گجر کو دکھائے تک نہیں تھے۔ اب یہ ڈاکے میں برآمد ہو رہے تھے۔

کیسے لوگ ہیں یہ؟ کس طرح کے لوگ ہیں جو ہیر کو اپنے دلبر، اپنے ماہی سے، باپ کو اپنے بیٹے، اپنے خون سے نہیں او ملنے دیتے؟
آلی گجر زنجیر بجا بجا کے روتا تھا، چھالاں پیا مارتا تھا۔

پھر اسی وقت عجیب بات ہوئی۔ ناصر، ڈاڈے جوان نے مولا علی کا نام لیا، ایک جھٹکا مارا کہ مشکلیں اس کی آزاد ہو گئیں۔ پولیس والے دوڑے۔ آلی نے دیکھا کہ وہ ناصر کو گھیرنے کی کرتے ہیں پر وہ جوان کا بچہ ہاتھ نہیں آتا۔

آلی گجر نے قہقہہ مارا۔ ناصر، اس کا بیٹا، چھپرکھٹ کی طرف آ رہا تھا۔ اس نے باپ کا ہاتھ پکڑا، پھول کی طرح اٹھالیا۔

دونوں حویلی سے باہر چلے۔ چوئی صاب پکارا، روکو انھیں روکو۔ جاوے کتے یا! جاوے ظالما! ادھر تو اب رکنا ہی نہیں۔ اور کیا! کدھر بھی رہ سکتے ہیں دونوں باپ بیٹے، کدھر بھی ٹیم پاس کر سکتے ہیں، داتا دربار میں، ریلوے ٹیشن پہ... کدھر بھی۔ تو بس آلی نے اپنے بیٹے ناصر ڈکیت کا ہاتھ پکڑا اور دونوں باپ بیٹے اونچی آواز میں ہنستے ہوئے ہولی ہولی پکٹی سڑک کی طرف چلنے لگے۔

ہنسی کی آواز سنی تو چوئی صاب، جو سامنے چھپرکھٹ میں پڑے آلی کو اچھل اچھل کے قہقہے مارتے دیکھ اور سن سکتا تھا، چیخنے لگا۔ گالی نکال کر بولا، ”او مر گئے سارے ای؟ دیکھ نہیں رے میں نماز پڑیاں؟ اس پاگل کے بچے کو چپ کیوں نہیں کراتے ہو... رامیو!“



ندی اور آدمی

پیرا کی سکھانے والے نے پہلے ہی دن ہمیں ایک عجیب بات سمجھائی تھی، کہتا تھا جس نندی میں تم اترنے والے ہو وہ اگر تم سے پہلے تمہارے اندر تیرنے لگے تو سمجھنا تم پیراک بن گئے۔

خوب!

پہلی بار جب اترے تو نندی میں ہم چار تھے۔ ایک یہ، شناور غلزنئی، دوسرا نارنگ دیو وکرم، تیسرا حسن بابا اور چوتھا میں، فرید خان سوری۔

اس سے پہلے کہ زقندیں بھرتے ہم چاروں وحشی بچھڑے نندی میں اترتے، اس نندی نے ہمارے اندر تیرنا شروع کر دیا۔ گویا ایک نندی میں ہم تھے اور ایک ایک نندی ہم میں سے ہر ایک میں بہہ رہی تھی۔

قربانت شوم!

اور سمجھو تو اس وقت بھی ہم نندی میں ہیں۔ ہم چاروں... شناور خان، نارنگ دیو، حسن بابا اور میں۔

اور پیرا کی کے استاد نے یہ بھی کہا تھا کہ نندی تمہارے بیچ بہتی رہے گی خواہ تم اس کے پٹن چھوڑ کے کہیں دور جا بیٹھو۔

واللہ، سچ ہے! وہ اس وقت بھی یہاں بہتی گزر رہی ہے۔
سہرام کی ندی کرم ناسا، میری ہمد ندی۔

اور وہ نارنگ دیو؟ وہ تو چھلانگ لگانے سے پہلے جیسے بھری ہوئی تفنگ کی طرح
چھوٹا تھا۔ اپنے تی ورسر میں ندی کی جے جے کار کرتا تھا وہ۔
”ہلا ہلا نارنگ!“ میں کہتا، ”ہلا نارنگ دیو! بلی تفنگی!“
اور وہ ہنستے ہوئے پکارتا تھا کہ سلام ہو! ندی ماں کو سلام! اور کود پڑتا تھا ٹھنڈے
پانی میں۔

اے نارنگ! اے تفنگی! کیا وہ ندی اب بھی تیری ماں ہے؟ کیا تو اب بھی سلام بھیجتا
ہے کہ جے کرمانا سا! جے جے کرما! سلام ہو ماں! سلام ہو ندی!؟

پھر سلطان ہند، شیرشاہ سوری نے کروٹ بدلی اور سر اٹھا کر کھلے درتچے سے دکھائی
دیتے نیم روشن آسمان کو دیکھا۔
انہوں نے دیکھا کہ بجلی کے زبردست لشکارے نے لمحے بھر کو سب کچھ جگمگا دیا ہے
اور سلطان نے دیکھا کہ بادل اٹھ چلے آ رہے ہیں۔
بجلی پھر ایک بار چمکی اور ایک مہیب کڑک کے ساتھ گہرے گھنے بادلوں میں دور
تک آنے لگی۔

”العظمت للہ!“ سلطان نے قدرے بلند آواز میں کہا اور دھواں دھواں ذہن کے
ساتھ سوچا کہ اب نیند کا انتظار بے سود ہے، مجھے اٹھ جانا چاہیے۔

شیرشاہ کو مغلوں کی طرح ’ہم‘ کہنے اور سوچنے کی عادت نہیں تھی۔ وہ انہتر سال کے
ہونے کو آئے تھے۔ اتنی عمر میں آدمی زندگی کے بڑے نشیب و فراز دیکھ لیتا ہے۔ شاید اسی لیے
وہ خود کو ’میں‘ کہتے اور اپنے لیے ’میں‘ سوچتے تھے۔

”العظمت للہ!“ اپنے بادشاہ کی آواز سنی تو خواب گاہ کے بھاری سنگی ستون کی اوٹ
میں قالین پر دو زانو بیٹھے خادم خاص شناور غلزئی نے آیت کریمہ پڑھنی بند کی اور فرش پر
بھاری پنچہ ٹیک کے جھٹکے سے اٹھ کھڑا ہوا۔ درتچے کھلے تھے تو خواب گاہ میں ٹھنڈک بڑھ گئی

تھی۔ شناور خان کاندھوں پر کشمیری اون کا نفیس فرغل ڈالے تھا جو اس کے گھٹنوں سے بالشت بھر نیچے تک آتا تھا۔ اس کے بادشاہ کو معلوم تھا کہ وہ اچھی خوراک اور اچھا لباس پسند کرتا ہے اسی لیے یہ فرغل ولایت پنجاب کے حاکم ہیبت خان نیازی کو رقعہ بھیج کر سلطان عادل نے روہ کے علاقے سے منگایا تھا۔ پھر خود سلطان نے اپنے دست مبارک سے اسے شناور کے کندھوں پر ڈال کر فرط مسرت سے اسے آبدیدہ ہوتے دیکھا تھا اور اس بات پر تبسم فرمایا تھا۔

شناور کے ہم رتبہ خادم ازراہ تمسخر اسے ہیبت خانی لبادہ کہتے تھے اور کہتے تھے کہ اس ڈھب کے فرغل دین دار مسلمان زادوں سے زیادہ بد عقیدہ تاتاریوں، اُجکوں پہ سجتے ہیں۔ بے وقوف کہیں کے! شناور کہتا تھا کہ سب میری طرح بوڑھے ہو گئے ہیں لیکن رشک و حسد نے اب تک ان کا پیچھا نہیں چھوڑا۔ مگر یہ رشک و حسد بے جا تھا۔ شناور اپنے بادشاہ کی عنایات خاص کا بجا طور پر حقدار تھا۔ کیوں نہ ہوتا، وہ ان کے ساتھ کا کھیلا ہوا تھا، انھیں فری خان کہہ کے بلایا تھا اس نے۔ جب فرید خان پیدا ہوا تو شناور سولہ مہینے کا تھا اور خان ابراہیم سوری کی حویلی میں جیسے فرید کے انتظار میں ڈولتا پھرتا تھا۔

تو اب ستون کی اوٹ سے نکل کر شناور اپنے فرغل کے تلمے باندھتا شاہی چھپر کھٹ کے پائنتی جا پہنچا۔ بنگالے کی اعلیٰ سوتی مچھردانی کے پارمومی شمعوں کی روشنی میں اس نے دیکھا کہ سلطان نے کہنی کے بل اٹھنے کی کوشش کی ہے؛ مگر یوں لگا کہ ان سے اٹھا نہیں جا رہا اور وہ تھک کر تکیوں پر دراز ہو گئے ہیں۔ شناور نے مچھردانی ہٹانے کے لیے بے اختیار ہاتھ بڑھایا، پھر کھینچ لیا۔

”ادب، شناور! یہ فرید خان نہیں سلطان ممالک ہیں۔“

سلطان گہرے سانس لیتے ہوئے کراہنے لگے۔ انھوں نے منہ ہی منہ میں کچھ کہا، شاید ایک لفظ ”ندی“۔ شناور کچھ سمجھ نہ پایا، مودب سرگوشی میں بولا:

”بادشاہا!“

سلطان خاموش رہے۔ انھوں نے اپنے خادم خاص کی آواز سن لی تھی، مگر ایک لا پرواہی کی کیفیت، ایک کاہلی سی جیسے ہر چیز کو اپنے گھیرے میں لیتی جا رہی تھی۔

شناور نے پھر عرض کیا، ”سلطان عادل!“

شیر شاہ نے جواب نہ دیا۔ بجھتے ہوئے ذہن کے ساتھ سوچا کہ یہ شناور غلزیٰ یہاں

کیوں کھڑا ہے؟ ابھی تو ہم ندی میں تھے۔ کرم ناسا میں۔

شناور نے قدرے بلند آواز میں کہا، ”شاہا!“ پھر وہ بے تابانہ پکارنے لگا، ”سلطان عادل! شاہا! شاہا! برائے خدا جواب دیجیے۔“

مگر اب شیر شاہ مکمل بے ہوشی میں تھے۔

خواب گاہ کے دروازے پر متعین دستہ خاص کا جوان چونکا، وہ خادم خاص کی آواز پہچان گیا، اس نے کچھ دور برچھی سے ٹیک لگائے کھڑے اپنی ساتھی کو دیکھا، کوئی اشارہ کیا اور بجلی کی سی تیزی سے خواب گاہ میں داخل ہو گیا۔

وہ نو جوان تھا، تاہم آداب شاہی میں تربیت یافتہ اور خوب تجربہ کار... خادم خاص کی آواز میں اتنی تشویش تھی کہ سپاہی کا ہاتھ بے اختیاری میں شمشیر کے قبضے پر جاٹکا مگر اس کی تربیت نے اسی لمحے اسے خبردار بھی کیا کہ ہشیار سلطان کی خواب گاہ میں شمشیر بہ دست داخل نہیں ہوا جاتا۔

جوان نے شناور کو سلطان کے سرہانے جھکے ہوئے دیکھا۔ وہ سلطان کے ہاتھ دونوں ہاتھوں میں لیے بے تابانہ ملے جا رہا تھا اور کچھ پڑھ پڑھ کے پھونکتا تھا۔

خاصے کے سپاہی کو سامنے دیکھ کر شناور نے پشتو، فارسی، ہندوی تینوں زبانوں میں بے ربط جملے ادا کرتے ہوئے حکم دیا کہ طبیب کو اور صدر جہاں حسن علی خان کو اور شہزادہ عادل سوری کو فوراً خبر کی جائے۔ سلطان کا مزاج موافق نہیں۔ وہ بے ہوش ہیں اور یہ کہ سب درتپے اور در بند کر دیے جائیں۔ جب تک صدر جہاں حسن بابا نہ آجائیں دالانوں کے رخ سے اور راس وچپ سے یا عقب سے کوئی عمارت میں داخل نہ ہونے پائے اور دستہ خاص کے کسی جوان کو اب خواب گاہ میں آنے کی ضرورت نہیں۔ جاؤ!

جوان خواب گاہ سے باہر آیا تو اس نے دیکھا کہ دستے کے سب جوان اب اس طور کھڑے تھے کہ خواب گاہ کی طرف آنے والا یا ادھر سے جانے والا کوئی بھی ان کے ہتھیاروں کی پہنچ سے باہر نہیں ہو سکتا تھا۔ یہ چڑھی ہوئی کمانوں کی طرح مستعد تھے اور اس قدر پرسکون اور بے حرکت بھی کہ اگر مشعلوں کی روشنی میں ان کی آنکھیں نہ چمک رہی ہوتیں تو ان پر سنگی مجسموں کا گمان ہوتا۔

”یہ سلطان عادل کے تربیت کیے ہوئے عسکری ہیں۔ یہ فخر جہاں ہیں، فخر زمانہ ہیں“ جوان نے سوچا، پھر اس نے اپنے ان ساتھیوں کو ہاتھوں کے اشارے سے ہدایات دیں

اور کمر سے بندھے پر تلے کو بازو میں اس طرح الجھا کر کہ تلوار بدن کی حرکت میں رکاوٹ نہ بنے، وہ قالینوں پر بے آواز دوڑتا ہوا دالانِ کبیر سے نکل گیا۔

مگر یہ کیسے ممکن ہوا؟ کیسے ممکن ہوا کہ بائیس تیس سالہ جوان کی طرح مشقت کرنے والا سلطان اور ایک ایک پہر شہ سوار، شمشیر زنی، نیزہ بازی اور چوگان میں پسینہ بہانے والا یہ جوان مرد بزرگ بیمار پڑ گیا؟ کسی نے کبھی بیماری اور شیر شاہ ان دو لفظوں کو زبان سے ایک ساتھ ادا ہوتے تو سنا نہیں۔

خدائے رحمت! یہ ملک بنگالہ بھی دنیا جہان کے آزار اور حشرات اور بلاؤں سے بھرا ہوا ہے۔ اب یہی دیکھو جو بارشیں شروع ہوئی ہیں تو خبر نہیں کب... اے خدا! سلطان کو سلامت رکھنا۔
نفاست سے تراشی ہوئی دو انگل اونچی گھاس میں چھپا کے مارتا، پانی بھرے اُتھلے گڑھوں اور پھولوں کے تختوں کو اُلانگتا خاصے کا جوان شیر بھون کی عمارت سے نکل، عسکری روشن چوکی کی طرف اڑا جا رہا تھا۔

سلطان علیل ہو گئے۔ سلطان بے ہوش ہیں۔ سلطانِ عادل ولایتِ بنگالہ میں صاحبِ فراش ہیں۔ سترہ سو ڈاک چوکیوں پر برق رفتار سوار، رکتے، ٹھہرتے، ہواؤں کا ہاتھ تھامے منزلیں مارتے یہ خبر سنار گاؤں سے بنارس اور آگرے اور لاہور اور لاہور سے انک تک، پھر اس طرف ملک مالوہ میں مندو کی آخری چوکی تک پہنچا دیں گے۔

”خدائے رحمت! شیر خان سوری دیارِ ہند کا باپ ہے۔ خدایا! ہمارے باپ کو خیر سے رکھنا۔“

بارش اور فکرِ مندی میں بھیگتا ہوا خاصے کا جوان روشن چوکی کے نزدیک پہنچ گیا تھا۔ وہ اب اصیل جانوروں کو کھڑنجے پر ٹاپیں مارتے سن سکتا تھا۔

اس نے میدان گیر آواز میں پکار کے کہا، ”ہلا ہلا سلاح دست! ہشیار باش! ہلا سلاح دست! ہشیار باش و بشنو! بشنو ز پیش گاہِ سلطانی!... ہوشیار!“

جواب میں روشن چوکی سے نقارے پر چوب پڑنے لگی۔

ممالکِ ہند کا دل فرید خان سوری کے دل کے ساتھ دھڑک رہا تھا۔



مرد، عورت، بچہ اور سلوتری

موقع ملنے پر بھی اس نے اوسط درجے کے مرد کی طرح عورت کو مباشرت پر آمادہ کرنے کی کوشش نہ کی اور سیدھے سبھاؤ سو گیا۔ اب بھی وہ بہت ڈرا ہوا تھا اور دونوں تھکے ہوئے بہت تھے۔ دنوں بعد انھیں ٹھیک سے سونے کو ملا تھا۔ مرد نے ریت پر چڑھی لانچ کے ڈھلواں ڈیک پر سوکھے ہوئے کپڑوں اور کینوس کے ٹکڑوں کی دو ڈھیریاں بنادی تھیں۔ ایک اس نے عورت اور اس کے بچے کے لیے چھوڑ دی، دوسری پر خود جالیٹا۔ لانچ کی گدے دار سیٹیں، جن پر اب تک وہ سونے کی کوشش کرتے رہے تھے اور یقینی موت کے خوف سے پڑے لرزتے رہے تھے، لانچ کے ساتھ برباد ہو گئی تھیں اور اوندھی پڑی تھیں۔

سات دن پہلے وہ آٹھ آدمی اور بچہ بہت سا کھانا پانی باندھ کر سمندر کی سیر کو نکلے تھے۔ دوسرے دن انھیں لوٹ جانا تھا مگر لانچ کا رڈر ٹوٹ جانے اور بعد میں انجن بیٹھ جانے کے سبب وہ بہتے بہتے کہاں سے کہاں نکل آئے تھے۔ یہ سب کچھ لانچ کے ریت میں دھنس جانے سے سات روز پہلے ہوا تھا۔ مختلف وقتوں میں آٹھ میں سے چھ آدمی جو تیرنا جانتے تھے اُتاؤ لے ہو ہو کے لانچ سے کود گئے۔ ان کا خیال تھا انھیں کنارہ نظر آ رہا ہے اور وہ تیرتے ہوئے پہنچ جائیں گے۔ مرد کو تیرنا نہیں آتا تھا، عورت شاید تیر سکتی ہوگی، مگر اس کا دو ڈھائی برس کا بچہ اس کے ساتھ تھا۔

بچے کا باپ بہت ہی کوئی کمینہ آدمی ہوگا۔ پانچ دن تک تو وہ بچے کا... یا شاید بچے اور بیوی کا... ساتھ دیتا رہا۔ اونچی آواز میں سب کو اطمینان دلاتا رہا کہ تیر کر جانے والوں میں سے کوئی ایک تو مدد لانے میں کامیاب ہوگا۔ چھٹے دن اپنی بیوی کو بتائے بغیر وہ چالاکی سے چھپائی گئی لالچ کی واحد لائف جیکٹ پہن کر منہ ہی منہ میں اپنی سلامتی کی دعا پڑھتا ہوا اندھیرے میں کود گیا۔

گھنٹے بھر بعد اس کی عورت اور باقی رہ جانے والے مرد کو شک ہوا، پھر یقین آ گیا کہ بچے کا باپ بھی کود گیا ہے۔ یہ کودنے والوں میں چھٹا اور آخری تھا۔ عورت اپنی ذلت اور مایوسی میں کچھ دیر روئی۔ پھر اسے صبر آ گیا۔

ساتویں دن جب سورج ڈوبے دو ڈھائی گھنٹے گزرے ہوں گے ان کی بے اختیار لالچ ریت کے ایک قدرتی پشتے سے جا ٹکرائی اور دھنس کر تر چھی ٹک گئی۔ کنارے لگ جانے پر مرد اور عورت نے خوشی کے نعرے لگائے، وہ دیوانوں کی طرح ہنسے اور ایک دوسرے سے لپٹ لپٹ کر خوب روئے۔ زندہ بچ جانے کی خوشی نے انہیں اور تھکا دیا۔ عورت کی تھکن خود اپنے لیے بھی تھی، اپنے بچے کے لیے بھی؛ اس لیے وہ مرد کے بنائے بے ڈھنگے بستر پر بچے کو چمٹا کر لیٹ گئی اور لیٹتے ہی سو گئی۔ اب اور جاگنا اس کے بس میں نہیں تھا۔

رات میں کسی وقت بارش شروع ہو گئی ہوگی، جو بند ہوئی تو مرد کی آنکھ کھل گئی، وہ دم سادھے پڑا رہا۔ لہروں کا دبا دبا شور، کیڑے مکوڑوں کی آوازیں اور لوہے لکڑی کی کراہیں سنائی دے رہی تھیں۔ ٹھیک ہے، ہم کنارے لگ گئے ہیں اور بارش بند ہو گئی ہے، اس نے سوچا، اس لیے تو دوسری سب آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ مرد نے بیداری کے ابتدائی عرصے میں غور نہیں کیا تھا مگر اب اس نے ڈھلواں عرشے پر ساکت کھڑے ایک سائے کو دیکھا جو اجلے آسمان کے مقابل اتنا قریب نظر آتا تھا کہ ذرا بڑھ کے اسے چھوا جاسکتا تھا۔ پریشان ہو کے اس نے سر گھمایا، عورت کے بستر کی طرف دیکھا۔ بستر خالی تھا۔ ارے، یہ عورت ہی تو کھڑی ہے۔ عورت وہاں کیوں کھڑی ہے؟

وہ جھٹکے سے اٹھ بیٹھا۔ اس کے منہ سے کوئی آواز نکلی ہوگی جو عورت نے مڑ کے کہا، ”شی ی ی۔“ وہ بچے کو گود میں لیے کمرل اوڑھے سامنے کے اندھیرے میں کچھ دیکھ رہی تھی۔ مرد اٹھا، کمرل اوڑھ کر وہ عورت کے برابر جا کھڑا ہوا۔ بالکل سامنے، نہ سمجھ میں آنے والے

ہیولوں کے درمیان، کچھ چمک رہا تھا۔ اس نے آنکھیں مل کر دیکھا۔ یہ چمک ایک بار خوب بڑھی پھر بند ہو گئی۔ لہروں کے اور کیڑوں کے شور کو کاٹتی ہوئی ایک کھر دری آواز آئی، ”دھت تیری تو!“ پھر کچھ روشنی ہوئی اور اس دفعہ بڑھ کے قائم ہو گئی۔ کھر دری آواز نے اس پر اطمینان ظاہر کیا، ”ہاں آں آں!“ روشنی بڑھ کر الاؤ بن گئی۔

مرد نے لپپاتے شعلوں کے اجالے میں بھاری بدن کے ایک آدمی کو، جو کسی قسم کا اور کوٹ پہنے تھا، آسب کی طرح روشنی پر حاوی ہوتے دیکھا۔ وہ بوتل کے جن کی طرح ابھرتا اور لہرا کر اٹھتا ہوا دونوں ہاتھ پھیلائے الاؤ کو جیسے اپنی نحوست منتقل کر رہا تھا۔ پھر اس نے ہاتھ سمیٹ لیے اور دوبارہ آسائش کی آواز نکالی، ”ہاں آں آں!“

ہماری طرح کا کوئی ہوگا، مرد نے سوچا، کڑا کے کی سردی اور بارش میں رات گزارنے کو آگ جلاتا ہے۔ اچھا ہے، دو سے تین بھلے۔ وہ اسے پکارنے کو آگے بڑھنا چاہتا تھا کہ عورت نے اس کا بازو چھوا، آہستہ سے کہا، ”سامنے نہیں جاؤ۔“

”کیوں؟“

”ابی دیکھ لو یہ کیا کرتا ہیں۔“

مرد نے دیکھا، اور کوٹ والے نے بچوں کی طرح کلکاریاں مارتے ہوئے الاؤ کے گرد چکر لگانا شروع کر دیے تھے۔ اس کی گردش میں رفتہ رفتہ تیزی آتی جا رہی تھی۔

”دیکھا تم نے؟“

”ہاں تو اس میں کیا ہے؟“

عورت پریشانی میں بولی، ”یہ میرے کو چریا لگتا ہیں... پاگل ہیں۔“

”اکیلا ہے، اکیلے میں آدمی کیا نہیں کرتا۔ پاگل نہیں ہوگا اور ہوا بھی تو کیا، رستہ تو بتا

ہی دے گا۔“

”دیکھ لو۔“ عورت بے یقینی سے بولی اور بچے کو جو نیند میں کسمسایا تھا کندھے سے لگا کر تھپکنے لگی۔ اس کے بیٹے نے آسائش کی آواز نکالی تھی۔ آواز بہت ہلکی تھی مگر پھر بھی الاؤ کا طواف کرتے ہوئے آدمی نے سن لی اور ٹھٹھک کے کھڑا ہو گیا۔ وہ لانچ کی طرف نہیں گھوما، ہاتھ جوڑ کر اپنی پیشانی سے لگاتا، ڈنڈوت کرتا آگ کی طرف جھک گیا، جیسے یہ آواز لانچ کی طرف سے نہیں الاؤ میں سے آئی ہو۔

”چریا ہیں بروبر۔“ کہہ کر عورت نے توجہ ہٹالی۔

مرد نے بڑھ کر آواز دی، ”اے بھائی!“

الاؤ کی تعظیم کرتا ہوا آدمی ہڑبڑا کر مڑا۔ لگتا تھا آواز سے ڈر گیا ہے۔

”کون؟ کون ہے ادھر؟“ اس نے ڈپٹ کر پوچھا۔ وہ اندھیرے میں لانچ پر قائم

ہوتے ہیولوں کو سمجھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”مسافر ہیں بھائی!“

”ادھر؟... یہاں کیا کر رہے ہو؟“

”ہماری کشتی بہتی ہوئی آئی ہے اور یہاں ریت میں رک گئی ہے۔“

”کشتی؟... کیسا کشتی؟... تم کتنا آدمی ہو؟“ وہ دھیرے دھیرے پیچھے ہٹا تھا۔ اس

نے زمین پر پڑی ایک لکڑی اٹھالی تھی۔

”گھبراؤ مت۔ میں ہوں اور ایک عورت ہے۔ بس، ایک گودکا بچہ ہے۔“

”بچہ؟ ہاں؟ تم کہہ رہے ہو بچہ ہے تمہارے ساتھ؟“ نہ معلوم کیوں اسے اس بات

پر حیرت ہو رہی تھی کہ ان کے ساتھ بچہ ہے۔

”ہاں بچہ ہے۔“

”اچھا؟ لڑکا ہے، لڑکی؟“

یہ عجیب سوال تھا۔ مگر وہ پوچھ رہا تھا تو مرد نے جواب دے دیا۔ عورت نے مرد کی

طرف دیکھ کر ایسے سر ہلایا تھا جیسے جتا رہی ہو کہ دیکھا، میں نہ کہتی تھی۔ موٹا آدمی یہ سن کر خوش

ہوا کہ ان کے ساتھ جو بچہ ہے وہ لڑکا ہے۔ اس نے ہاتھ کی لکڑی پھینک دی اور اندھیرے میں

ہوا کو ٹٹولتے ہوئے یوں ہاتھ پھیلا دیے جیسے سہارا دے کر یا بازوؤں میں لے کر انھیں اوپر

سے اتارنا چاہتا ہے۔

”آؤ۔ یہاں آگ کے پاس آؤ۔“

مرد نے ہاتھوں میں سامان اٹھایا اور سنبھل سنبھل کے ترچھی کھڑی ہوئی لانچ سے

اتر کچرے کے ڈھیروں میں راستہ بناتا الاؤ تک پہنچ گیا۔ عورت لانچ پر ہی رہی۔ نہ وہ سامان

اٹھانا چاہتی تھی نہ اوپر کوٹ والے کے پاس اکیلی ٹھہرنے کو تیار تھی۔ باقی سامان لے کر مرد

دوسرے پھیرے میں الاؤ کی طرف چلا تب کہیں عورت اس کے ساتھ آئی۔

”بیٹھ جاؤ۔ تم ادھر نکل آؤ میرے پاس... بچے کو گرم رکھنے کی جرورت ہے۔“

عورت اوٹ میں بیٹھی رہی، اس نے اوور کوٹ والے کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

مرد نے اسے آگے آنے کا اشارہ کیا تو اس نے انکار میں سر ہلا دیا۔

”کدھر کو جانے کا ہے؟“ اوور کوٹ والے نے پوچھا۔

”کہیں بھی۔“ مگر مرد کو اپنا یہ جواب احمقانہ لگا تو اس نے فوراً کہہ دیا، ”جانا تو آگے ہے پر جہاں ٹرین ملے... یا بس مل جائے۔ ایسی کوئی جگہ بتاؤ۔“

”ہاں آںںں“ اس نے اطمینان کی آواز نکالی۔ ”بتائیں گا، بتائیں گا۔“ یہ کہتے ہوئے وہ عورت کی طرف دیکھے جا رہا تھا۔ عورت پردے دار نہیں تھی۔ مرد کی کچھ نہیں لگتی تھی مگر اسے موٹے کا اس طرح گھورنا اچھا نہیں لگا۔ ایک بار یہ خیال ضرور آیا کہ وہ عورت کو ایسے نہیں گھورتا تھا جیسے مرد گھورتے ہیں۔ وہ شاید اسے دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔ اس کے بیٹے کو دیکھے جا رہا تھا۔

مرد نے پوچھا، ”تم یہاں کہاں رہتے ہو؟“ اس کے بارے میں جاننا بھی ضروری تھا۔

”ایس؟... ہاں آں... یہیں... ادھر ہی رہتا ہوں۔“ اس نے آس پاس کے ویرانے کو بازو کے اشارے سے بتایا۔

”یہاں؟ اس شمشان گھاٹ پر؟“

”سمسان؟“ اس نے دہرایا۔

”ہاں ہماری لانیچ کا خاتمہ... وشرام ہوا ہے نا یہاں،“ مرد ہنس کے سمجھانے لگا۔

اوور کوٹ والا سمجھ گیا کہ اس نے شمشان گھاٹ کیوں کہا ہے۔ وہ بھی ہنسنے لگا، پھر

بولاً، ”میں نگر کا ہوں۔“

”نگر؟ نگر؟“ مرد نے دہرایا۔

”ہاں... مہانگر۔“

مرد نے ہاں میں سر ہلایا، ”اچھا، مہانگر۔“ وہ ایسے کہہ رہا تھا جیسے سمجھ ہی تو گیا ہے کہ کون سا مہانگر۔

”پاس میں یہ دوسرے نا... نگر اور کوٹ۔“

”تم ادھر ہی کے ہو؟“

”سمجھو ہوں بھی اور نہیں بھی ہوں۔“

”اچھا؟“

”نگر سے گھر چھوڑ کے آ گیا۔ ادھر کام بہت تھا۔ ادھر گاؤں میں ابھی میرا کام جما نہیں ہے۔“

”وہ... گاؤں...؟ یہاں سے کیا قریب ہے؟“

”ہاں بہت میں بہت ساڑھے چار پانچ میل ہوئیں گا۔“

”کیا کام کرتے ہو؟“

”جانور کا ڈاکٹر ہوں۔ جس کو سلوتری بولتے ہیں سلوتری۔ وہ ہوں۔“

مرد جوتے موزے پہن کے سویا تھا جولانچ سے اترنے پر بھیگ گئے تھے۔ اب وہ ان سے پیچھا چھڑا کے پیرتا اپنے لگا۔ ”یہاں گاؤں میں تمہارا کام کیوں نہیں جما؟ ادھر تو زیادہ کام ہونا چاہیے۔ گاؤں میں جانور زیادہ ہوتے ہیں۔“ وہ کہنے لگا، ”بس نہیں جما۔“

عورت کا بیٹا جاگ اٹھا تھا اور الاؤ کی طرف ہمک رہا تھا۔

سلوتری عورت سے بولا، ”بچہ سندر ہے۔ کتنے سال کا ہوئے گا؟“

عورت نے کوئی جواب نہ دیا۔ مرد نے کہا، ”ہاں خوب صورت ہے۔“

سلوتری نے اچانک پوچھا، ”یہ دونوں اماں بچہ تمہارا کون ہے؟“

”پڑوسی۔“

”کیسا؟“ اسے ناکافی جواب ملا تھا، وہ اور جاننا چاہتا تھا۔

مرد اس سوال جواب کے دوران عورت کا چہرہ دیکھے جا رہا تھا۔ جسے بیٹے کے

بارے میں، اپنے بارے میں اس طرح پوچھا جانا برا لگ رہا تھا۔

سلوتری کے ”کیسا؟“ کے جواب میں مرد نے ہاں میں سر ہلایا اور مسکرا کے کہا،

”اچھا، بہت اچھا پڑوسی ہے۔“

سلوتری سمجھ گیا کہ آگے اسے کچھ نہیں پوچھنا چاہیے۔ مرد کی کلائی کی طرف اشارہ

کر کے بولا، ”دن نکلنے میں گھنٹا ایک سے زیادہ ہوئیں گا؟ کیا؟“

پانچ بجنے والے تھے، مرد نے کہا، ”سمجھو دو پونے دو گھنٹے باقی ہیں۔“
 ”تم لوگ ابی کچھ کھائیں گا؟ میں گاؤں سے بہت لے کے چلا تھا... ہاں؟ دیوے؟“
 ”دیوے؟“

مرد نے کہا کہ نہیں ہم کچھ نہیں کھائیں گے، تمہیں بھوک ہو تو ہمارے پاس انناس اور ناریل ہے، لو گے؟ اس نے ہاں میں سر ہلایا اور انناس کے ٹکڑے لے کر خوب آواز سے کھانا شروع کر دیے۔ ناریل اس نے اپنے اوور کوٹ کی جیب میں ڈال لیا کہنے لگا، ”یہ پھر کھاؤں گا۔“

عورت نے اسے کھاتے دیکھ اور سن کر برا منہ بنا لیا تھا۔ اوور کوٹ والا بھی سمجھ گیا ہوگا کہ عورت اسے گھاس نہیں ڈالے گی۔ اسے پروا بھی نہیں تھی۔ انناس کھاتے ہوئے بھی وہ اس کے بیٹے کو دل چسپی سے دیکھتا رہا۔

کھاپی کے اس نے اوور کوٹ کی آستینوں پر ہاتھ پونچھے اور ڈکار لی۔ عورت نے آخری بار اس کی طرف نفرت سے دیکھا اور اوڑھے ہوئے کمبل میں منہ دے کر خود بھی چھپ گئی، اپنے بیٹے کو بھی چھپا لیا۔ اس نے مرد کی پیٹھ سے ٹیک لگا کے کچھ دیر اونگھنے کا سوچا تھا۔
 موٹے سلوتری نے اوور کوٹ کی جیب سے بیڑی کا بندل نکالا، مرد کی طرف بڑھا دیا۔ جب اس نے سر ہلا کے انکار کیا تو خود ایک بیڑی سلگا کر آگ کے قریب ہو بیٹھا۔ دو تین لمبے کش لے کر اس نے مرد سے ایک دم سوال کیا، ”کوئی بیوی بچہ؟ کوئی کھاندان پر یوار تو تمہارا بھی ہوئیں گا؟... آں؟“

مرد نے کہا، ”نہیں کوئی خاندان پر یوار نہیں ہے۔“

”آج چھا... حیرانی کی بات ہے!“

”کیوں؟“

بولا ”ابی دیکھو نا۔ میرا بھی کوئی کھاندان پر یوار نہیں ہے۔ بیاہ میں نے کیا نہیں۔ ایک عورت ہوتی تھی پڑوس میں، جیسی یہ تمہارے ساتھ والی ہے۔ سندر، سویل، بس کچھ دن اس کا میرا ساتھ رہا۔ اس سے بچہ کوئی نہیں ہوا۔“

مرد نے گھبرا کر سر گھمایا۔ اگر عورت نے اس کی یہ بات سن لی تو سلوتری کی خیر نہیں، منہ نوچ لے گی موٹے کا۔ مگر وہ اپنے کمبل میں غائب تھی۔ مرد نے کہا، ”دیکھو سلوتری

صاحب! میرے ساتھ والی بائی گھریار والی، مان مریدا والی عورت ہے۔ اس کا آدمی، بچے کا باپ بھاری ویاپاری ہے۔ ہماری تمھاری بات میں عورت کا کوئی بیچ ناں ہی رکھو تو اچھا ہے۔“

سلوتری نے سنجیدگی سے ہاں میں سر ہلایا، ”ہاں یہ بات ابی میں نے صئی نہیں بولی تھی۔ تم کوئی کھیال نہیں کرنا۔ میرا کہنا کوئی ہو نہیں تھا۔ آپ لوگ جانو، آپ کا کام جانے، ہم کون۔“

مرد نے دعا کی کہ یہ ہمیں کسی ٹھور ٹھکانے پہنچا دے، اس وقت تک سب ٹھیک ہی رہے۔ یہ اسی طرح کچھ نہ کچھ کہتا رہا تو عورت کے ساتھ اس کی بات بگڑ جائے گی۔

اس کا اور اپنا دھیان بٹانے کو مرد نے پوچھا، ”گاؤں سے یہاں تک کیسے آئے؟“

کہنے لگا، ”آتا رہتا ہوں... میرے کو گھوڑوں کی دوائی کے لیے ایک فٹکس پیجے... لکرماتا سمجھتے ہو؟ فٹکس... وہ پیجے ہوتا ہے۔ رات میں توڑا جاتا ہے۔ وہ لینے آتا ہوں... ادھر بہت ہے۔“

وہ مرد کے سوال کو غلط سمجھا تھا۔ اس نے کیوں آئے ہو نہیں پوچھا تھا، کس ذریعے سے آئے ہو پوچھا تھا۔

مرد نے دوسری طرح سوال کیا تو بولا، ”میرے پاس موٹر سیکل ہے۔ پرانی، ولڈوار ٹو کے جمانے کی۔ پر چلتی بروبر ہے۔“ اشارے سے اس نے جھاڑیوں کی اوٹ میں اپنی موٹر سائیکل دکھائی۔

”گاؤں سے آگے کی کوئی بس ملتی ہے؟“

کہنے لگا، ”ہاں دیکھیں گا... ادھر پہنچ جاوے پھر دیکھیں گا۔“

یہ بھی عجیب جواب تھا۔ مرد نے کہا، ”تم سمجھے نہیں۔ نگر کو، کوٹ کو، کسی اور جگہ کو تمھارے گاؤں سے کوئی بس لاری تو جاتی ہوگی؟ میں نے اس کا پوچھا تھا۔“

بولا، ”اسی کو بولتا ہوں... پہنچ جاوے ہم لوگ پھر دیکھیں گا۔“

مرد چڑ گیا، ”اس میں دیکھنے کا کیا ہے؟... کوئی لاری بس اگر چلتی ہے تو چلے گی، نہیں چلتی تو نہیں چلے گی۔“

سلوتری نے دھیرے دھیرے انکار میں سر ہلانا شروع کیا، کہا کچھ نہیں۔ تھوڑی دیر اسی طرح مرد کی عقل کا ماتم کرنے کے بعد بولا، ”تم لوگ کوئی بڑے موٹے نگر سے آئے ہو... ہاں؟“

مرد نے کہا، ”ہاں۔“

”جی تو۔“

مرد نے اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ عورت شاید ٹھیک کہتی تھی، یہ آدمی تھوڑا سا کھسکا ہوا ہے۔

وہ اسی رو میں بولے جا رہا تھا، ”مہانگر میں سب چیچ اپنے ٹیم سے ہوتی ہے۔ مہانگروں کی کیا بات ہے۔ باپ رے باپ۔“ پھر کہنے لگا، ”ابھی میرے گاؤں کی سوچو۔ پھر وہ سب جگے کی سوچو تو میچ گھسن گھیری کھا جاتا ہے۔ کیا؟“

اسے چپ کرانے کو مرد نے بات ختم کر دی۔ کہا، ”ہاں آں... بسوں کے ٹائم میں گڑ بڑ ہو جاتی ہوگی۔ چھوٹی جگہ ہے۔“

وہ ہنسا، بولا، ”چھوٹی جگہ بروبر بولا۔ سات روج میں دو روج بس آتی ہے بھائی! ابی یہ کھبر نہیں کہ کون دو روج۔ بدھ دار اور ایت وار؟ یا سکروار اور منگل وار؟... دوئی روج نگر سے بس آتی ہے۔ اسی کر کے بولا ہے کی ہم لوگ ادھر پہنچ جاوے پھر دیکھیں گا۔“

مرد چپ رہا۔ سلوتری بھی تھوڑی دیر چپ رہا۔ پھر پوچھنے لگا، ”آج کون دن ہے؟“ مرد کیا کہہ سکتا تھا۔ دھیرے سے بولا، ”دن؟... پہلے کہیں پہنچ جائیں، پھر دیکھیں گے۔“

یہ بات مرد نے سلوتری کی طرح کہی تھی اور کہہ کے خود ہی ہنس دیا تھا۔ وہ کم زور دماغ کا بے شک ہوگا مگر مرد کو ہنستا دیکھ کے بات کی تہ تک پہنچ گیا اور ہو ہو کر کے خود بھی ہنسنے لگا۔

آدھے گھنٹے تک کوئی نہ بولا، سلوتری اپنے اوور کوٹ کی بکل میں لپٹا آگ کے پاس سرک آیا تھا۔ جب وہ کافی اونگھ چکا تو اس نے کھنکار کے مرد کو جگا دیا اور پوچھا، ”نام کیا ہے تمہارا؟“

مرد نے بات کا جواب دینا ضروری نہ سمجھا۔ کمبل میں سے جھانک کے اسے دیکھا، پوچھا، ”سوئے نہیں؟“

”نہیں۔“ سلوتری نے کہا اور اپنا سوال دہرایا، ”نام کیا ہے؟“

”مرد۔“

”انوکھا نام ہے... ہے کی نہیں؟“

”ہاں۔“

”تم کام کیا کرتے ہو؟“

”بس... رہتا ہوں گھر میں۔“

سلوتری نے شاید بنا نہیں ہوگا۔ اپنی رو میں بولا، ”یہ عورت... نہیں چھوڑ... عورت کا کوئی چکر نہیں ہوئیں گا۔ لڑکا یہ کتے ایک برس کا ہے؟“

اس پہ خفا ہونا بے کار تھا لیکن مرد جھنجھلا گیا، دھیرے سے کہنے لگا، ”بچے کا بھی کوئی ذکر نہ ہوتا تو اچھا تھا۔ خیر، اس سے اگر تمھاری تسلی ہوتی ہے تو سن لو... لڑکا دو ڈھائی سال کا ہوگا۔“

”ہاں آں آں!“ اس نے اطمینان کی آواز نکالی۔

صبح میں ابھی دیر تھی۔ مرد نے محسوس کیا عورت جتنی نیند لینا چاہتی تھی لے چکی ہے اور اٹھنے والی ہے۔ وہ اس سے ٹکی ہوئی اب اپنی بیٹھک بدل رہی تھی۔ مرد نے دھیرے سے اسے آواز دی۔

بولی، ”ہوں۔“

”نیند پوری کر لی تم نے؟“

”ہاں۔“

”تو ادھر الاؤ کے رخ بیٹھ جاؤ۔ بیٹے کو ذرا سینک لگنے دو۔ ہوا چل رہی ہے، سردی بڑھ گئی ہے۔“

کہنے لگی، ”سردی کی خیر ہے۔“

مرد نے کہا، ”نہیں بالکل خیر نہیں ہے۔ تم آ جاؤ ادھر۔ میں ہوا کے رخ بیٹھتا ہوں۔ تم میری جگہ سنبھال لینا۔ آ جاؤ۔“

دھیرے سے بولی، ”چریے کے آگے نہیں بیٹھنا میرے کو۔ میں ادری ٹھیک ہاں۔“

مرد نے دھیمی آواز میں سمجھایا۔ ”ضد نہ کرو اور یہ پاگل چریا نہیں ہے، تم سے کچھ نہیں کہے گا۔ میں نے ڈرا دیا ہے اسے۔ کہہ دیا ہے یہ بھاری دیا پار کی عورت ہے۔“

وہ رازداری سے ہنسی، ”تم نے الٹا ڈرایا ہیں، میرے کو تو کھد اس سے ڈر لگتا ہیں،

چریے سے۔“

خبر نہیں وہ مسخرا پن کر رہی تھی یا کیا تھا۔ مرد نے جیسے تیسے اسے، اس کے بیٹے کو ہوا کی زد سے ہٹا کر الاؤ کی گرمی میں پہنچا دیا۔ سلوتری کو بھی یہ بات پسند آئی۔ اس نے کہا، ”ہاں آں!“ پھر اس نے اور لکڑی ڈال کر الاؤ کی آگ اونچی کر دی اور عورت کو جگہ دے کر خود ہٹ کے بیٹھ گیا۔ مرد نے سوچا، آدمی برا نہیں ہے۔ عورت کو بے وجہ اس سے چڑھ گئی ہے۔ صبح ہوئی تو ہونے کا پتا بھی نہ چلا۔

اس اجاڑ نحوست بھری جگہ چڑیوں کا چھہانا اور بھونروں کی گنجن کیا سنائی دیتی، اس وقت تو لہروں کا شور بھی تھم گیا تھا۔ دھوپ بھی ڈرتے ڈرتے پھیل رہی تھی۔ ساحل پر اکٹھا ہو گئے کچرے میں موٹے سمندری چوہوں اور آبی کیڑوں نے خوراک کی تلاش میں اپنی دوڑ بھاگ اور لپک جھپک بند کر دی تھی۔

سلوتری اٹھ گیا تھا اور موٹر سائیکل میں گھس پڑ کر رہا تھا۔ سامان کا خاصا بڑا پتارہ اس نے پیٹرول کی ٹنکی پر تسمے سے کس دیا۔ مرد اٹھ کر پاس گیا تو بولا، ”یہ ٹینکی پر سیٹ جیسی بنا چھوڑی ہے۔ کیا؟“

مرد نے ہاں میں سر ہلا کر اس سیٹ جیسی کی تعریف کی۔

سلوتری نے کہا، ”لڑکے کو ادھر سامنے سیٹ پر بٹھا دیں گا۔ تم دوئی جنے پیچھو کی سیٹ پہ بیٹھ جانا۔“

مرد نے انکار میں سر ہلایا، ”ہم دو جنے پیچھے بیٹھ جائیں گے۔ بچے کو اس کی ماں سنبھالے گی۔“

اس نے غور سے مرد کی بات سنی، پھر آہستہ آہستہ سر ہلا کر جیسے بات کے ہر پہلو کو سمجھ لیا اور بولا، ”چلو یہ بھی ٹھیک ہے۔“

اس طرح کچھ سامان ساتھ لے کر کچھ وہیں پھینک کر، وہ دھیرے دھیرے موٹر سائیکل پر چل پڑے۔ کچے کا راستہ اس کا خوب دیکھا بھالا ہوگا، پھر بھی کتنی بار وہ کسی غلط پٹی پر مڑا اور آگے دلدلی کیچڑ سے یا چڑھ آنے والے سمندری پانی سے راہ بند پا کر واپس ہوا۔ ویسے وہ راستے پر پوری توجہ دیتا خاموشی سے اپنی موٹر سائیکل چلاتا رہا۔ عورت مرد ڈر رہے تھے کہ باتونی آدمی ہے، جیسا کہ کچھ کی عادت ہوتی ہے مڑ مڑ کر باتیں کرتا چلے گا تو مشکل ہو جائے گی۔

گاؤں میں وہ کوئی گھنٹے بھر بعد داخل ہوئے۔

صبح کی سرگرمی کب کی شروع ہو چکی ہوگی، کیوں کہ چال سے لگتا تھا کہ گاؤں کے لوگ کہیں جا کر لوٹ رہے ہیں۔ یا ہو سکتا ہے کہ بے فکری سے چلتے ہوئے گھروں سے نکلنا ان کے مزاج میں داخل ہو۔

ایک چوک ہی گاؤں کا کل بازار تھا؛ یہ چار سڑکوں، گنتی کے مکانوں اور تین دکانوں سے مل کر بنا تھا۔ گاؤں کی آبادی بہت کم ہوگی، کیوں کہ جتنے لوگ وہاں رہتے ہوں گے شاید وہ سبھی چوک میں آ بیٹھے تھے یا وہاں سے گزر رہے تھے۔ سلوتری کی موٹر سائیکل کا شور انھوں نے منٹوں پہلے سن لیا تھا۔ سب راغبگیر، دکانوں کے مالک اور گاہک آواز کے رخ گھوم گئے۔ چوک میں داخل ہوتی اس سڑک پر وہ سلوتری کی بانک کے برآمد ہونے کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ پُر شور مشین چوک میں آئی تو لوگوں نے جو دیکھا اسے سمجھنے میں انھیں کچھ وقت لگا۔ پھر کورس میں انھوں نے ”ہا آ“ جیسی کوئی آواز نکالی۔ وہ ان تین کو سلوتری کے ساتھ دیکھ کر حیران ہوئے ہوں گے اور یہ حیرت کی آواز ہوگی۔ کیوں کہ آواز کے تیز سے لگتا تھا کہ اس سے کسی کی توہین مقصود نہیں ہے۔ نہ ہی یہ خوشی کی آواز ہو سکتی تھی۔ سلوتری نے آواز سن کر بس ایک لفظ کہا، ”سالے!“ ظاہر ہے وہ گاؤں کی آبادی سے خوش نہیں تھا۔

چوک کے قریب ہی... کیوں کہ چوک سے دور کچھ نہیں تھا... تو قریب ہی ایک گودام تھا۔ گودام کے برابر سے ایک تنگ زینہ اوپر جاتا دکھائی دیا۔ سلوتری نے موٹر سائیکل روک دی مگر وہ لوگ فوراً ہی اوپر نہیں گئے۔ سلوتری نے پہلے مرد، عورت، بچے کو، پھر سامان کو بانک سے اتارا، اوور کوٹ سے چابیوں کا گچھا نکالا، گودام کا پھانک کھولا۔ سلوتری گیری کے اوزاروں اور لکڑی کے ایک چھوٹے ڈھیر کے سوا گودام خالی تھا۔ اس نے موٹر سائیکل گودام میں پہنچائی۔ پھانک بند کر کے تالا ڈالا۔ یہ سب کرنے کے بعد ہی اس نے زینے کا تالا کھول کر دونوں کو سیڑھیاں چڑھنے کو کہا۔ اوپر ایک کمرہ، غسل خانہ اور کھلی چھت تھی۔ چھت پر ایک طرف کونے کی انگیٹھی رکھی تھی، سمجھو وہ جگہ سلوتری کا کچن تھا۔ اوپر پہنچ کر اس نے دونوں کو چھت پر پڑی ٹوٹی کرسیوں پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود کمرے کے دروازے پر پڑا تالا کھول پوٹلیوں سمیت کمرے میں چلا گیا اور دروازہ بند کر لیا۔ مرد عورت کچھ دیر باہر رہے۔ اس دوران میں اندر سے گھڑ پٹر کرنے کی آوازیں آتی رہیں۔

عورت نے مرد کے کان کے پاس منہ لا کر ہنستی ہوئی آواز میں کہا، ”میرے کو تو یہ تمام پاگل لگتا ہیں۔ چریا ہیں... تیری کسم!“

دو تین منٹ بعد سلوتری نے دروازہ کھولا۔ دونوں سمجھ رہے تھے دروازہ بند کر کے وہ کمرے کی حالت ٹھیک کر رہا ہوگا مگر کمرہ ویسا ہی بے ترتیب اور میلّا تھا جیسا سلوتری سے متعلق کسی بھی چیز کو ہونا چاہیے تھا۔ بس اتنی دیر میں اس نے اپنی دونوں پوٹلیاں کہیں غائب کر دی تھیں اور اوور کوٹ اتار دیا تھا۔

کمرے میں دو گھڑی چار پائیاں پڑی تھیں۔ ایک دیوار کے ساتھ زنگیائے ہوئے اسٹیل کی الماری کھڑی تھی۔ الماری پر بھاری کنڈا لگا کر تالا ڈال دیا گیا تھا۔ دوسری دیوار کے ساتھ باکڑا پڑا تھا۔ سرکنڈوں سے بنا ایک موڑھا فرش پر لڑھک رہا تھا۔ سلوتری اسے سیدھا کر کے بیٹھ گیا اور بولا، ”ابھی تم لوگ کے ناستے کا کوئی پر بندھ کریں گا۔ پھر تم بھلے ہی آرام کرنا۔“

عورت نے زور سے انکار میں سر ہلایا۔ مرد سے بولی، ”نہیں اسے بول دو کھانا پینا کچھ نہیں کرے۔ گاڑی کا ٹیم پتا کر دے... بس...“ مرد نے سلوتری سے کہا کہ ہم کچھ نہیں کھائیں گے۔ تم تو بس کے آنے جانے کا معلوم کر دو۔ سلوتری منہ ہی منہ میں بد بداتا رہا کہ ہم نگر میں ہوتے تو صحیح سے مہمان داری کرتے۔ یہ گاؤں ویسے ہی سالی بے کار جگہ ہے۔ لوگ سالے اچھے نہیں... ”پر بھیا! کچھ نہ کچھ جل پان تو کرنا ہی ہوگا۔“ پھر اس نے خود تجویز دی کہ چائے، کافی کچھ پی لو۔ کافی کو اس نے جم کے کوئی کہا تھا۔ مرد نے چائے کافی پہ رضا مندی ظاہر کی۔ عورت کی طرف دیکھا، وہ اس کی کہی ہوئی بات کی مروّت میں خاموش رہی۔ ویسے لگتا تھا اسے سلوتری کا دیا ہوا پانی بھی قبول نہیں۔

مرد عورت دونوں نے ایک ایک چار پائی سنبھال لی تھی۔ عورت نے اپنے بیٹے کو آدھا گود میں آدھا پلنگ پر لٹا دیا۔ اس وقت بھی وہ بہت تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ مرد نے ایک کمبل اپنی والی چار پائی پر پھیلا دیا۔ کہا کہ اس پر بچے کو لٹا دو، اسے کچھ اوڑھا دو، خود بھی تھوڑی دیر پیر پھیلا لو۔ خود وہ اٹھ کر باکڑے پر جا بیٹھا۔

پندرہ بیس منٹ بعد سلوتری دو چمچماتی چمکتی پیالیوں میں خوب گہری کافی بنا لایا۔ مرد نے شوق سے اور عورت نے آزمائشی سا گھونٹ بھرا۔ بہت تیز اور گاڑھی کافی تھی۔ سلوتری خود بھی ایک فوجی ٹائپنگ لے کر آگیا اور اپنا موڑھا کھینچ، سامنے بیٹھ کے کافی پینے لگا۔ کافی

پیتے ہوئے وہ سمجھتا رہا کہ کس طرح ان دونوں کو تھوڑی دیر کے لیے یہاں آرام کرتا چھوڑ کر وہ کسی کھمبائے کے پاس بس کا معلوم کرنے جائے گا کیوں کہ اگر اس نے کھمبائے کے سوا کسی اور سے بس کا پوچھا تو ہو سکتا ہے وہ صحیح نہ بتائے، بھٹکا دے۔ کہنے لگا، یہاں بھٹکانے والے، جھوٹ بچ بکواس کرنے والے بہت ہیں۔ گاؤں بھر میں ایک کھمبائے ہی ایسا ہے جس سے سلوتری کی بات چیت ہے۔ وہ پارسی بھائی ہے اور کسی سے بھی ”کھار باجی“ نہیں کرتا، اپنے کام سے کام رکھتا ہے۔ کہنے لگا، یہاں کے لوگ سرے ایک دوسرے کو ستاتے رہتے ہیں۔

مرد نے سوچا یہ اگر مسلسل بولتا رہا تو میں کافی بھی ختم نہ کر پاؤں گا، اونگھنے لگوں گا۔ سلوتری کے ایک ہی رفتار سے، لہجہ تیز دھیمائی بنا بولتے رہنے سے مرد کو نیند کے جھونکے سے آ رہے تھے۔ ابھی کچھ کافی باقی تھی کہ اس نے کاہلی سے فرش کی طرف ہاتھ بڑھا کر پیالی رکھ دی اور بازو کو تکیہ بنا کے بیچ پر لیٹ گیا۔ نیند کا غلبہ ایک دم ہوا تھا۔ ایک دھندلا سا خیال یہ بھی موجود تھا کہ عورت چار پائی پر گٹھری بن کر لیٹ رہی ہے۔ اس نے اپنی پیالی شاید سلوتری کے حوالے کر دی ہے جو موڑھے پر سے جھک کر اپنا لگ فرش پر رکھ رہا تھا۔ ساتھ ہی وہ چکی کی گھمر گھمر جیسی یکساں آواز میں کچھ نہ کچھ برابر بکے جا رہا تھا۔

مرد گھٹنے دو گھٹنے بعد یا شاید پندرہ بیس منٹ بعد بیدار ہوا تو اور بھی تھکا ہوا تھا۔ لگتا تھا میلوں دوڑ کے آ رہا ہے۔ پیاس کے مارے حلق میں کانٹے پڑ رہے تھے، سر بھاری تھا اور متلی ہو رہی تھی۔

دیوار کے سہارے سے وہ باکڑے پر اٹھ کر بیٹھنے لائق ہوا۔ کچھ دیر پہلے سر میں جو بھاری پن تھا اب اس نے مغز میں چلتے ہتھوڑے کی شکل اختیار کر لی تھی۔ اس کی آنکھوں میں پانی بھر گیا۔ سامنے دیکھنا چاہا تو سب کچھ اسے دھندلا دھندلا لگا، کھاٹ پر بیٹھی عورت تک دکھائی نہ دی۔

مگر عورت سامنے نہیں تھی۔ وہ وہاں تھی ہی نہیں، نہ اس کا بیٹا تھا۔ ایک دھاردار آلے جیسا کاٹا ہوا خوف مرد نے اپنے سینے میں اترتا محسوس کیا۔ اس نے بیچ سے اٹھنا چاہا مگر ہاتھ پیروں کی دھن اور دماغ میں چلتے ہتھوڑوں نے بے بس کر کے اسے پھر بیچ پر گرا دیا۔ اس نے چیخنا چاہا، عورت کو پکارنا، خبردار کرنا چاہا مگر کانٹوں نے حلق سے اتنی آواز بھی نہ گزرنے دی جسے وہ خود ہی سن لیتا۔ یہ کیا ہو رہا ہے مجھے؟ عورت کہاں ہے؟ اور اس کا بیٹا؟

سلوتری۔ ایک لفظ ذہن میں بیدار ہوا پھر دوسرا لفظ۔ دشمن۔

مرد نے بیچ کو دونوں ہاتھوں سے تھام کر اٹھنے کی کوشش کی۔ وہ اٹھا اور دیوار پکڑے پکڑے دو قدم چلا۔ پکارنے کی کوشش کی۔ بدن کی دھن نے اسے پھر بیچ پر گرا دیا اور اسی وقت مرد نے وہ آواز سنی۔ وہ انسان کی آواز نہیں تھی۔ پھر بھی کوئی اس چیخ کو غیر انسانی نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ کسی مرد، کسی عورت، کسی بچے کی چیخ تھی اور ان تینوں میں سے کسی ایک کی نہیں۔ یا پھر بجلی سے چلتے کسی آرے کی دھار پتھر یا لوہے سے چھو دو تو شاید ویسی آواز پیدا ہوگی... دھات، انسان اور پتھر میں سے کسی ایک کی آواز۔

پھر کوئی بے حساب خوف سے مغلوب ہو کے پکارا، ”نیچے آرے!... نیچے آ!“ یہ عورت تھی، اسے کہیں نیچے بلا رہی تھی۔ مرد نے خود کو بیچ سے اٹھایا اور منہ کے بل فرش پر جا گرا۔ اگر دونوں بچے پھیلا کر قریب آتے فرش کو وہ ان پر روک نہ لیتا تو اس کا اپنا چہرہ مٹی کے برتن کی طرح ٹوٹ گیا ہوتا۔ عورت پھر پکاری، ”اورے آ جا۔ نیچے آ۔“ اب کے وہ اسے بہت بے بسی میں بلا رہی تھی۔ مرد خود کو سمیٹ کے ایک طیش کے ساتھ فرش پر سے اٹھا۔ وہ دو قدم چلا بھی۔ دیوار کے سہارے سہارے اس نے کمرے کی پوری لمبائی طے کی۔ شانوں پر ٹکا ہوا اس کا سر لگتا تھا پھٹ پڑے گا۔

سر کی ایسی تیزی! ہاتھ پیروں نے تو اس کا حکم ماننا شروع کر دیا ہے۔ وہ کمرے سے نکل کر کھلی چھت پر آ گیا۔ نیچے سے... کہیں نیچے سے عورت کے بلک بلک کے رونے کی آواز آرہی تھی۔ وہ حرام کی اولاد سلوتری اس کے ساتھ زور زبردستی کر رہا ہے، سال! کتے کا موت! مرد زینے پر جھپٹا اور لڑھکتا ہوا چھ آٹھ سیڑھیاں اپنی پشت اور پنڈلیوں پر سہتا گدی کے بل رک گیا۔

چوٹیں سہلانے کا وقت نہیں تھا۔ شکر کی بات یہ تھی کہ اس کی گردن نہیں ٹوٹی تھی۔ مگر عورت نیچے کہیں چیخے جا رہی تھی۔ مرد نے اب دیوار کے سہارے سے گن گن کے ایک ایک قدم اترنا شروع کیا۔ نیچے پہنچنا ضروری ہے۔ چوٹیں کھانے کی ضرورت نہیں۔ نیچے پہنچنا ایک دم ضروری ہے۔

وہ زینے سے اترا، سڑک پر آیا۔ مگر آواز گودام سے آرہی تھی جس کا دروازہ بند تھا۔ بند نہیں، بھڑا ہوا تھا۔ مرد کی ٹھوکر سے دروازہ کھل گیا اور دن کی اجلی دھوپ گودام میں داخل ہو گئی۔

عورت کی چیخ جیسے جست کر کے سڑک پر آئی، پھر پورے گاؤں میں پھیل گئی۔ سب کو خبر ہو گئی کہ کچھ ہوا ہے۔ مگر جو کچھ ہو چکا تھا وہ دیکھنے والا پہلا آدمی مرد ہی تھا۔ عورت اپنے بیٹے کو چھاتی سے لگائے دو زانو بیٹھی تھی۔ اس کے کپڑے سینے سے ٹخنوں تک چمکیلے تازہ لہو کے چھینٹوں سے داغ دار تھے۔ وہ ہل ہل کے بین کرتی اور چیخیں مارتی تھی۔ کیا اس کا بیٹا مار دیا گیا؟ جھپٹ کر مرد اس کے پاس پہنچا۔ دھوپ بھرے گودام میں عورت بہت سی چیزوں کو ایک دم پہچان نہ پائی ہوگی۔ وہ ڈر گئی، گھسٹی ہوئی مرد سے دور جانے لگی۔

وہ سامنے سے ہٹی تو مرد نے سلوتری کو دیکھا جو گودام کے فرش پر پڑا تھا۔ وہ پیٹھ کے بل پڑا گودام کی چھت تکے جا رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ سینے پر تھے جیسے ابھی ابھی اس نے کوئی بری خبر سنی ہے اور سن کے دل تھام لیا ہے۔

پہلی نظر میں اس کے دل کا علاقہ ٹھیک ٹھاک لگتا تھا۔ ہاں پیٹ پر کسی ہوئی تنگ بش شرٹ دیکھ کر شبہ ہوتا تھا کہ کچھ گڑبڑ ہے۔ آدمی کی کلائی جتنا موٹا ایک ڈنڈا بش شرٹ کے دو بٹنوں کے بیچ میں داخل ہوا تھا جو بش شرٹ کا کپڑا اور بنیان پھاڑتا ہوا سلوتری کی پسلیوں میں اتر گیا تھا۔ ڈنڈا، ہاتھ بھر باہر نکلا تھا اور سرتا سر سرخ ہو رہا تھا۔

عورت نے اب اسے پہچانا اور وہ ”آرے آرے آ“ کہتی گھسٹی ہوئی چلی اور اپنے بیٹے کو لیے ہوئے مرد کے گلے سے جھول گئی۔ بیٹا اور بھی ڈر گیا، چیخ چیخ کے رونے لگا۔ مگر اس کا بیٹا ٹھیک تھا۔ وہ ٹھیک تھی۔

پھر بھی مرد نے پوچھا، ”تو... تیرا بیٹا ٹھیک ہے؟“ عورت نے اس کی گردن کے گھماؤ میں منہ دیے دیے ہاں میں سر ہلایا۔ ”چل پھر باہر نکل۔“

وہ سسکی لے کر بولی، ”سن تو رہے۔ میں نے اسے مار دیا۔“

”ہاں مار دیا تو نے۔ دیکھ لیا ہے میں نے۔ آچل باہر آ۔“

اسے خود سے بھڑائے ہوئے مرد نے قدم قدم گودام کے دروازے کی طرف چلنا شروع کیا۔ عورت نے اس کے شانے پر سے سراٹھا کر فرش پر پڑی لاش دیکھنی چاہی۔ مرد نے خود گھوم کے اس کا رخ موڑ دیا۔

”وہ حرامی میرے راجن کو قتل کرنے لایا تھا۔“

راجن اس کے بیٹے کا نام ہوگا۔ مرد نے سوچا۔

عورت نے سرگھما کر پھر سلوتری کے رخ دیکھنا چاہا۔ مرد نے پنچہ پھیلا کر اس کا گھنے بالوں کا سر دوبارہ اپنے شانے پر ٹکا دیا۔ وہ کم زور آواز میں بولی، ”وہ راجن کو انگار میں ڈالتا تھا۔ بس میں نے مار دیا۔“

”اچھا کیا تو نے۔ چل آ جا میرے ساتھ۔“

عورت نے ”انگار“ کہا تو مرد نے غور کیا۔ گودام میں کپڑا اور گوشت جلنے کی بو پھیلی جارہی تھی۔ سرگھما کر اس نے دیکھا سلوتری آگ پر پڑا تھا۔ اس کی اوٹ سے دھواں اٹھ رہا تھا۔

دونوں ابھی گودام سے نکلے بھی نہ تھے کہ سڑک پر دوڑتے قدموں کی چاپ سنائی دی اور گاؤں کے دو آدمی گودام کے سامنے آکھڑے ہوئے۔

”باپ رے باپ!“ ان میں سے ایک نے کہا، پھر وہ مڑا اور دوڑتا ہوا واپس مکانوں کے پیچھے چلا گیا۔ جو کھڑا رہ گیا وہ دوڑ جانے والے سے عمر میں کافی بڑا تھا۔ مرد کو اپنی طرف متوجہ پا کر اس نے جیسے جاننے، صرف معلومات حاصل کرنے کے لیے سوال کیا۔ ”تو کیا بچے کو مار دیا سالے نے؟ بلی دے دی؟“

مرد نے انکار میں سر ہلایا، ”نہیں وہ آپ مارا گیا۔“

”ارے! کیسے؟“ اس کی ارے اور کیسے میں حیرت سے زیادہ مسرت تھی۔

”پتا نہیں۔“ مرد نے کہا۔

اب وہ آنے والا، لہولہان کپڑوں والی عورت کی اوٹ میں دیکھنے کو اپنی گردن سارس جیسی کرنے لگا۔ ادھر ادھر گھمانے لگا۔ اس نے رسماً پوچھا، ”بچہ صُئی ہے؟“

لہجے ہی سے پتا چل رہا تھا کہ بچے سے زیادہ اسے سلوتری کا جو کچھ بچا ہے اس سے دل چسپی ہے۔

عورت کو اپنے سے لگائے مرد ایسے ہی کھڑا رہا۔ وہ اب گودام میں نہیں دیکھنا چاہتا تھا۔ آنے والا انھیں سامنے سے ہٹانے کو یا شاید انسانی ہمدردی میں کہنے لگا، ”عورت کو ادھر سیڑھی پہ بٹھا دو، کانپ رہی ہے بے چاری۔“

اسے دھوکا ہوا تھا یا وہ جھوٹ بول رہا تھا، عورت بالکل نہیں کانپ رہی تھی۔
مرد اور عورت سامنے سے نہ ہٹے تو وہ بولا، ”ہم سمجھ رہے تھے ایک نہ ایک دن تو یہ
ہوئیں گا۔“

”کیا؟... کیا ہوگا ایک نہ ایک دن؟“ عورت اور اس کے بیٹے کو خود سے بھڑائے
کھڑا مرد گاؤں والے سے ایسے سوال جواب کرنے لگا جیسے عورت اور بچہ موجود نہیں ہیں اور نہ
اندر کوئی لاش پڑی ہے۔ بس دو ہمسائے فرصت میں گپ لگا رہے ہیں۔
اس نے پھر پوچھا، ”کیا سمجھ رہے تھے؟ کیا ہوگا ایک نہ ایک دن؟“
گاؤں والا بولا، ”ارے سبھی کو کھبر تھی یہ کالا جادو کرتا ہے۔ نگر سے بھاگ کے آیا
ہے سالا... بولتے ہیں ادھر پولیس پیچھے پڑ گئی تھی۔“

مرد کو غصہ آ گیا۔ اس بوڑھے آدمی پر خفا ہونے سے کیا ملتا؟ پھر بھی اس نے کہا،
”سب کو خبر تھی تو ادھر گاؤں میں پولیس کو اس کے پیچھے کیوں نہیں لگا دیا سب نے؟“
”پولیس ادھر کاں دھری ہے۔“ وہ مرد کی احمقانہ بات پر مسکرایا۔ کہنے لگا، ”پھر یہ
بھی ہے کہ ادھر کوئی چکر میں نہیں پڑنا چاہتا۔ بھیا! سب اس سالا سے دور ہی دور رہتے
ہیں۔“ وہ تھوڑا رکا۔ پھر اطمینان سے کہنے لگا، ”چلو اب تو یہ مر ہی گیا۔“

گاؤں والا اور مرد اتنی ہی باتیں کر پائے تھے کہ ہو ہوا او آں آں جیسی گڈڈ
آوازیں سنائیں دیں اور بک بک کرتے ہوئے بہت سے آدمی اسی دوڑ جانے والے جوان
کے پیچھے بھاگتے ہوئے مکانوں کے عقب سے نکل نکل کے آنے لگے اور گودام کے آگے اکٹھا
ہونے لگے۔ مرد نے عورت کو سیڑھیوں پر بٹھا دیا تھا، وہ خود اس کے شانے پر ہاتھ رکھے کھڑا
تھا۔ بھیڑ بڑھتی جا رہی تھی، بھانت بھانت کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ کس نے مارا؟
کیسے مارا؟ مرد نے مار دیا؟ کچھ کر رہا ہوگا۔ عورت نے مارا ہے، عورت نے نہیں، یہ جو ساتھ
ہے اس نے، نہیں نہیں عورت نے، کیسے؟ کیسے؟ اچھا کیا مار دیا۔ اسی لایک تھا سالا۔ پر اب
ہوگا کیا؟

بک بک کرتے ہوئے اس ہجوم سے، جس میں اب عورتیں اور بچے بھی شامل
ہوتے جا رہے تھے، سامنے کی گلی بھر گئی تھی۔ کسی کی کہی ہوئی بس ایک بات مرد کے ذہن سے
چپک کر رہ گئی۔ اب کیا ہوگا؟

ہوگا کیا؟ مرد نے سوچا، ہم تو اب سلوتری کے مکان کی سیڑھیاں نہیں چڑھ پائیں گے۔ تو کیا اوپر نہیں جاسکتے؟ کیوں نہیں جاسکتے؟ اوپر تو ان کا سامان تھا جس کی انھیں ضرورت ہوگی۔

مرد نے ہاتھ پکڑ کر عورت کو اٹھایا اور اسے لیے ہوئے سیڑھیاں چڑھنے کو بڑھا۔

ہجوم میں سے کسی نے پوچھا، ”تو اب کیا کریں بھیا جی؟“

دوسرا بولا، ”پولیس کو کھبر کرو۔“

”پولیس یاں کاں دھری ہے۔“ یہ شاید وہی بوڑھا تھا جس سے مرد نے باتیں کی تھیں۔

”کیوں؟ کیا بس کے ساتھ نہیں آتے پولیس والے؟“

”او بھیا! بس کے ساتھ تو آتے ہیں۔ پر آج بس کدھر آئے گی؟“

”کیوں؟ آج کیا جٹا نہیں ہے؟... ہاں بئی شکر وار ہے آج۔“

”ارے بس تو شنی وار کو... سنیچر کو...“

”نہیں ایت وار کو...“

”کیا بک بک کیے جا رہے ہو؟... جراسنو تو... آرئی ہے۔“

”ہاں صئی ہے۔ ٹیم تو ہے بس کا۔“

”آرئی ہے! آرئی ہے!“ ہجوم کی بک بک میں لمحے بھر کا وقفہ آیا تو مرد نے کسی

بڑی گاڑی کے انجن کی آواز سنی۔ اس نے پی پی پاں جیسا ہارن بھی بجایا تھا۔ کئی آدمی

ایک ساتھ چیخے، ”آگئی بس آگئی!“

ایک بولا، ”جاؤ پتا کرو پولیس والے آئے ہیں کی نہیں آئے۔“

شاید اب یہ بوڑھے کی آواز تھی، وہ کہہ رہا تھا۔ ”آئیں گے کیسے نہیں سالے، ہر بس

کے ساتھ آتے ہیں۔“

مرد اور عورت وہیں سیڑھیوں پہ رک گئے۔ عورت پولیس والوں کا سن کے جیسے

سنائے میں آگئی تھی۔ مرد نے سوچا آئیں گے، رپورٹ لکھیں گے، نام پوچھیں گے۔ بچے کا نام

تو اسے معلوم ہے۔ راجن۔ صرف یہی نام معلوم ہے۔ وہ کڑوے پن سے مسکرایا۔ دل ہی دل

میں ہنسا۔ بچے کا نام راجن ہے، اس کا باپ سالا سا جن ہوگا۔

عورت اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پوچھنے لگی، ”کیا بات ہیں؟“

مرد گڑ بڑا گیا، بولا، ”پولیس والے آرہے ہیں، بچے کا نام، باپ کا نام پوچھیں گے۔“
”بچہ راجن ہیں راجن۔“

”اور باپ؟“

”چھوڑ... باپ کی جگہ میرا نام لکھا دینا۔“

”تیرا نام؟“

”ہاں میرا نام ہیں... ”عورت“... تو لکھا دینا... بس۔“

”نہیں اس طرح نہیں ہوتا۔ وہ باپ کا نام لکھیں گے۔“

”ارے اس کا کیا نام؟ کود گئے کا کوئی نام نہیں۔ چل باپ کی جگہ تو اپنا نام لکھا دینا۔“

پھر ٹھہر کے بولی، ”کیا نام ہے تیرا؟“

”مرد۔“

عورت نے دھیرے سے کہا، ”مرد، اچھا نام ہیں۔“

پھر وہ سکون سے سر جھکا کر پولیس کار روائی کا انتظار کرنے لگی۔



ایک دشت سے گزرتے ہوئے

(عبدالغفور بلوچ کے لیے)

جب کوئی امنگوں بھرا جوان مرتا ہے تو ایک دوست اُس کا اور ایک داشتہ اُسی کے ساتھ
مر جاتے ہیں۔ (طبع زاد کہاوت)

سیڑھیاں گھنٹیوں کی آواز کے ساتھ اوپر نیچے ہو رہی تھیں اور یہ نو جوان لڑکا.....
جاوے پتھر کی اُن سیڑھیوں پہ پڑا تھا۔
سگاں ابھی نہیں آئی تھی۔ اسی لیے جاوے باہر انتظار میں سیڑھیوں پر ہی سو گیا۔ مگر
سیڑھیاں ہلے جا رہی تھیں اور گھنٹیوں کی آواز رکتی نہیں تھی۔ اس آواز کے ساتھ شاید سیڑھیوں
کی ڈوریاں بندھی ہوں گی تو وہی ڈوریاں کھینچ کے انھیں اوپر اٹھا لیتی اور پھر ڈھیل دے کے گرا
دیتی تھی۔ اچھلتے گرتے جاوے کا سر درد کرنے لگا، پسلیاں ٹوٹنے کو ہوئیں۔ پتھر کی کاٹتی ہوئی
سیڑھیوں پر دہرا ہو کے وہ آواز کے رخ منہ کر کے پکارا، ”سگاں!“ مگر یہ پکار اتنی بھی نہ اٹھی
کہ وہ خود سن لیتا۔ اس نے پھر آواز دی، ”سگ گاںں!“

ایک مرد کی بھاری آواز سنائی دی، ”جاوے! ہاں ٹے دوس! پروانیں
بچہ..... بولو۔ ابی ہم آ گیاؤں۔“

ایک دشت سے گزرتے ہوئے ۶۰۳

اُس نے آواز سن لی۔ یہ اُسی شیدی کی آواز تھی جسے وہ سوچتا رہا تھا مگر شیدی ابھی نظر نہیں آیا تھا۔ جاوے نے کوشش کر کے آنکھیں کھول دیں۔

اس وقت رات تھی یا شاید دور دور تک بادل گھرے ہوئے تھے یا شاخیں ہوں گی پتوں سے ڈھکی، جو جاوے پہ جھک آئی تھیں۔ ان شاخوں یا گھرے ہوئے بادلوں یا رات کی طرف یہ لڑکا جاوے اٹھتا تھا پر اُن تک پہنچ نہیں پاتا تھا۔ اُس نے سنا گھنٹیوں کی آواز برابر آ رہی تھی لیکن جیسا پہلے تھا کہ سیڑھیاں تھیں تو اب سیڑھیاں کہیں نہیں تھیں۔ جاوے ایک تکلیف دہ بستر پر مڑا تڑا پڑا تھا اور بستر ہلتا تھا، حرکت میں تھا جیسے کوئی سواری ہو۔ کیا یہ کوئی سواری ہے؟ اور گھنٹیوں کے ساتھ کیا کوئی اور بھی آواز آتی ہے؟

مرد کی وہی بھاری آواز سنائی دی، ”روکو۔ اوٹھ رکو۔ روکوڑے اوٹھ، گوارکش! تمہارا اوقات میں چاکو مارے!“ سواری رک گئی۔ گھنٹی کی آواز بھی رک گئی پر دور کہیں یہ آواز چلتی رہی۔

اندھیرے میں سے کسی بہت ہی گھٹیا آدمی نے غصے سے پوچھا، ”کیا بات ہے سالہ شیدی! کیوں شور کرتا ہے؟“

”اڑے لڑکا مر جائیں گا۔ اوٹھ رکو۔ تمہارا ماں..... گر جائیں گا لڑکا اوپر سے۔“

”چوپ تیری..... کالا! سالہ!“

”ابی کچھ ہو گیا لڑکے کو تو ہم تم کو چوڑیں گانیں۔ شاہ جبل کا کسم ہے۔ کبر سے بی کیچ کے لے آئیں گا تیرے کو مادرکش!..... چوڑیں گانیں۔“

”جا جا تیری..... سالہ! شیدی! تڑی دیتا ہے خالی خولی۔“ کوئی بڑبڑاتا اونٹ کے قریب آیا۔ بالکل پاس۔ نکیل تھام کے اُس نے جھکا دیا تو اونٹ بیٹھ گیا۔ آنے والے نے ادھر ادھر کی رسیاں ڈھیلی کر دیں۔ جاوے کو یاد آیا کہ وہ اسے رستے سے باندھ کے لے جا رہے تھے۔ کسی نے ہاتھ بڑھا کے رستہ کھولا اور اُسے کھینچ کے زنجیروں کی آواز میں گرا دیا..... ٹھنڈی ریت پہ ڈال دیا۔

لب پہ آتی ہے دعا بن کے تمن نامے ری..... زندگی شم ما کی صورت ہو.....

”ہا بچہ جاوے!..... ابی تم صُی ہے؟“

جاوے نے سراٹھا کے آواز کے رخ دیکھنا چاہا۔ کم زور آواز میں پوچھا، ”کون ہے؟“

”تم اپنے دوس کو بول گیا ہے؟ اڑے کالا ناگ ہے نہیں۔“ وہ ہنسا، ”ہا جوان، ہم ہوں شیدی الہ بکش۔ تم صیٰ ہے جوان؟ آں؟“

”اچھا؟ اللہ بخش!..... یہ..... ہم یہ کہاں ہیں؟..... بھائی!“

”دشت میں۔“

دور دنیا کا مرے دم سے اندھیرا ہو جائے..... ہر جگہ میرے چمک..... نے سے.....

”بس ابی ریٹ کرو..... کے سا ہے؟ صیٰ ہے نہیں؟ ہا جاوے! گنٹا، آدھا گنٹا اداری سو جاؤ بچہ۔“

ہر جگہ میرے چمکنے سے اجالا ہو جائے۔

”برو بر ریٹ کرو۔ ہاں اڑے۔ دشت بی ابی ٹھنڈائے۔ ہم لوگ ان کو آگے نہیں جانے دوں گا۔ حرام کھور کو۔ تم سو جاؤ۔ ہا جاوے! تم اوٹھ پہ بیٹھا بیٹھا سو گیا تھا بچہ۔ ابی ادر سو جاؤ۔ آسرا نہیں کرو۔“

جاوے نے ریت پہ سر ڈال دیا۔ درد سے پھٹا جاتا تھا سر مگر نیند بھی آ رہی تھی۔

زندگی شم ما کی صورت ہو.....

ٹن۔ ٹن۔ ٹن..... ٹن۔

”کہاں چلا گیا تھا توں، جاوے!؟“

”کہیں بھی نہیں۔ ادھر ہی تھا..... سیڑھیوں پہ۔“

”تو نے آواز دی تھی میرے کو؟..... ہاں دل دار؟“

”ہاں۔“

”آواز ہی تو سن کے آئی تھی میں۔ دیکھا ادر کوئی نہیں تھا۔ صاف پڑی تھیں سیڑھیاں دور تک۔ مجھے بلا کے کدر چلا گیا تھا توں؟“

”شیدی اللہ بخش آیا تھا۔“

”الہ بکش؟..... وہ کون؟“

”کالا ناگ۔ اللہ بخش شیدی۔ میرا پاڑے والا..... بھائی میرا۔“

”بھائی؟“

”ہاں بھائی جیسا ہے۔“

”کھبر نہیں کیا بولتائے۔ تیرا کنیں کوئی بھائی ہے؟“

”اللہ بخش ہے میرا بھائی۔“

”یہ دیکھ تیرے لیے کیا لائی؟“ وہ ہاتھ کے ایک پیالے پر دوسرا پیالہ دھرے

بھیدوں بھرا ایک شکنہ سا بنا لائی تھی۔

”کیا ہے؟ دکھا۔“

”دیکھ کمل کے پھول سے وری ہاتھ کی مٹھی جیسا پھل بن جاتا ہے۔ یہ کیچڑ پانی

میں اگتا ہے پراو پراو پر ہوا میں ای لہراتا ہے۔“

”ہاں۔ کمل گٹا لائی ہے؟“

”ہاں نا۔ لے۔“ اُس نے ہاتھوں کے پیالے جاوے کی آنکھوں کے سامنے کھول

دیے۔

کچھ بھی نہیں تھا۔ اُس کی ہتھیلیاں خوب گہری مہندی میں رچی ہوئی تھیں۔

”تو جھوٹ بھی بولتی ہے؟“

”ہاں رے دل دار! توں بھی جھوٹا، میں بھی۔ تو بولتائے بھائی آیا تھا۔ لے بھلا۔

ناگ کوئی بھائی ہوتا ہے!“

”ارے ناگ نہیں آدمی ہے۔ شیدی ہے..... بلوچی اللہ بخش۔ دوست ہے میرا۔

پاڑے والا۔“

”ابی بی نیند میں ہے توں۔ سیڑھیوں پہ بیٹھے بیٹھے سوں جو گیا تھا۔“

”دیکھو نا۔ ابھی تک سیڑھیاں اوپر نیچے ہو رہی ہیں۔“

”دھت!..... پھر بکنے لگا..... ارے باپ رے باپ!“ اُس کا ہاتھ جاوے کے

ماتھے کو چھو گیا، ”بکھار ہے تجھے..... ایے ماں! تاپ چڑھی ہے برابر۔ چل گھر جا، اٹھ، دل دار!“

”اٹھ! چل اٹھ..... بھینی یے! نشئی سالے..... ادھر سوں گیا ماں یا!“ پھر اُس نے

جھک کے لڑکے کا شانہ ہلایا۔

برابر کے دوسرے اونٹ کے کجاوے سے بادل کی گرج سنائی دی، ”اُسے سونے

دیوڑے، تمارے ایمان کا کھوٹ نکالے! خرنسیب! گوارکش! لڑکے کو کس واسطے حی ران کرتے او..... پیرکش!“

”چوپ۔ رانی، کالے!“

اللہ بخش کی آواز آئی۔ ”میرا ہی ہاتھ سے موت لکھا ہے تیری۔ پروردگار کا کسم ہے! میں نے تیرا شکل آنکھی میں اتار لی ہے۔ گوارکش! ہم کالا ناگ ہوں۔ شکل اتار لی ہے صی سے۔ ابی پیچا نہیں چوڑیں گا۔“

یہ سنا تو وہ جس نے جاوے کو ریت کے فرش سے جھنجھوڑ کے اٹھا دیا تھا بے ہودگی سے ہنسا۔ اس نے اللہ بخش کالا ناگ کو گالی دی۔

کالا ناگ نے اُس کے لیے اندھیرے پر چلائے گئے خدنگ سی ایک گالی پھینکی، ”دئی یوٹ!“

”ہے ایے!“ اس آواز کے ساتھ ہی جیپ کا ہارن سنائی دیا، ”ایے زیب! کیوں ستارہا ہے اُسے! سونے دے ابھی۔ ادھر سے گھنٹے بھر بعد چلیں گے۔“

”جی سر!“

لڑکے جاوے کو یہ نام زیب عجیب لگا، ”زیب!“ وہ ریت پہ پھیل کے لیٹ گیا۔ ”زیب!“ کالا ناگ نے ٹھنڈے لہجے میں نام دہرایا۔ ”زیب!“ وہ شاید نام یاد کر رہا تھا۔

بے ہودگی سے ہنسنے والا اندھیرے میں سے پھر بولا، ”ہاں۔ زیب ہے ہم۔ یاد کر لے سالے! شاہ زیب ہے نام اور تھانہ میرا یہی لگتا ہے۔“

جیپ کی طرف سے آواز آئی، ”زیب! چل ادھر سے۔ پیچھا چھوڑ اُس کا۔“

”جی سر!“

”زیب!“ اُس نے دہرایا۔

”ہاں ہاں مجھ! زندہ تو بچنا نہیں ہے۔ سب فیصلہ ہو گیا ہے تیرا۔ سالے!“

کسی نے اللہ بخش کا اونٹ بٹھا دیا تھا۔ تاروں کی روشنی میں جاوے نے اُسے رسوں کے ساتھ کجاوے سے بندھا دیکھا، اللہ بخش کو۔ مگر دیکھنے سے زیادہ وہ اُس کی زنجیروں کو سن سکتا تھا۔ انہوں نے اُسے بھی ہتھ کڑیاں بیڑیاں پہنا رکھی تھیں۔

اب وہ جاوے کے اور قریب سرک آیا۔ لڑکا اُس کی آنکھوں کی چمک دیکھ سکتا تھا۔ کہنے لگا، ”اتنے حرام کھور دیوٹوں میں ایک مردم کا بچہ بروبر ہے دوس! وہ بولتاے گنٹا ڈیڑھ ابی پڑا رہنے دو۔ صئی ہے بچہ تم سو جاؤ جاوے! ہاں ڈے؟ آسرا نہیں کرو سو جاؤ۔“

جاوے نے سوچا کالا بھائی سے کہہ دینا چاہیے، اس نے آواز دی۔ ”اللہ بخش بھائی!“

”ہاڑے، بول۔“

”بھائی! میں نے سگاں کو دیکھا تھا۔“

”سگاں؟“

”ہاں نا۔ سگاں۔ وہ لڑکی۔“

کالے نے سوچا، ہوگی کوئی، بولا۔ ”اچھا اچھا۔ صئی ہے۔“

”دو مرتبہ سیڑھیوں پہ آئی تھی۔“

”سیڑھیا؟..... کیسا سیڑھیا؟“

”میں انتظار کر رہا تھا اُس کا، سیڑھیوں پہ بیٹھا..... رستہ دیکھ رہا تھا۔ پوچھنے لگی کہاں

چلا گیا تھا تو؟ میں نے کہا ادھر ہی تھا..... ادھر اللہ بخش بھائی آیا تھا، تو بولی اللہ بخش کون؟ اُسے پتا ہی نہیں ہے بے وقوف کو۔“

”جاوے!“

”ہاں۔“

”طبییت تیرا صئی ہے نا بچہ! بکار تو نہیں ہے؟“

”بخار؟..... پتا نہیں..... ہاں..... سگاں کہہ رہی تھی بخار ہے۔“

کالا چکار کے بولا، ”ابی تم بات نہیں کرو جوان! سونے کا کوشش کرو۔ ہا جاوے۔“

جاوے سمجھ گیا۔ اسے..... اللہ بخش کو بھی سگاں کی طرح اس کی باتیں سمجھ نہیں آ

رہیں۔ شیدی نے پھر کہا، ”ابی ایک کلاک ہے۔ آسرا نہیں کر بچہ، سو جا۔“

دیوار پہ بڑی گھڑی لگی تھی۔ ہاف فرائیڈ انڈے کی زردی جیسی چمک دار پیتل کی نکیا، ایک راڈ سے جڑی ہوئی، ٹک ٹک کرتی ہوئی۔ ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر آتی ہوئی۔ کلاک ہر گھنٹے بعد آواز کرتی تھی..... نہ نہ۔ ہر آدھے گھنٹے بعد کچھ نہ کچھ ضرور کہتی تھی، کلاک۔

سگاں کمرے میں آگئی۔ دس بجنے والے تھے۔ اسے دیکھ کے بولی، ”تو سو یا نہیں؟ دل دار! جو ایک گھنٹا بھی سوں لیا تو بکھارا تر جائیں گا..... سنتا کیوں نہیں توں..... جاوے!؟ آں؟“

لڑکا مسہری کے سرہانے سے ٹیک لگا کے بیٹھ گیا، اُس کی صورت دیکھنے لگا۔

”کیا دیکھ رہا ہے؟“

”تیری صورت۔“

”صورت کیا دیکھتا ہے؟ ابھی کوئی پہلی واری دیکھی ہے؟ سوں جا۔“

”ادھر تو کہہ رہی ہے سو جا۔ ادھر وہ بولتا ہے سو جا..... ایک ہی بات کہہ رہے ہیں

دونوں۔“

”کدر؟ کون کہہ رہا ہے؟“

”کالاناگ۔ ابھی کہتا تھا سونے کی کوشش کر بچہ، پورا ایک گھنٹا ہے۔“

”اچھا؟ واہ رے دل دار!“ وہ مسکرا رہی تھی، ”ناگ بات کرتا ہے تجھ سے؟“

”جق! بتایا نا، دوست ہے میرا..... شیدی اللہ بخش۔ پاڑے والا ہے۔ سب

کالاناگ بولتے ہیں۔“

اُسے یاد آ گیا۔ ”ہاں بتایا تھا۔“ وہ مسہری کے سرہانے سے ٹیک لگا کے پاس بیٹھ

گئی۔ اُس کے کپڑوں میں وہی سگندہ بسی تھی، صحرائی پھولوں کی، جسے شہر والے نہیں جان سکتے۔ مگر یہ جاوے جانتا تھا۔

اُس نے جاوے کے بالوں میں انگلیاں پھرائیں، پوچھا، ”اور کون کون ہے تیرا

دوس؟ ہاں دل دار!؟..... ایک تو یہ کالاناگ ہے..... اور دوسرا؟“

”اُن حرامیوں پولیس والوں کی طرح تو کیوں پوچھ رہی ہے، سگاں!؟ کون کون

ہے تیرا دوست..... کون کون ہے تیرا دوست،..... سب میرے دوست ہیں۔ سمجھی؟“

”اچھا؟ سب ہیں؟..... پولیس والے بھی؟“

”وہ کرائے کے ٹٹو ہیں..... میں تو انھیں بھی دوست بنا لوں۔ غریب ہیں۔ وردی

اتار دیں تو وہ بھی سمجھو بے آسرا ہیں..... سب کی طرح۔ لیکن وہ روٹی پہ بہت لپکتے ہیں

سالے۔ وہی جو اُن کو حرامیوں نے پھینکی ہے، اُس کی طرف بہت لپکتے ہیں۔ اسی لیے دوست

نہیں بنا سکتا۔ ہاں شیدی کو بنا سکتا تھا، بنا لیا۔ وہ مٹی میں پڑی روٹی نہیں اٹھاتا۔ اصل نسل شیدی ہے۔ آزاد۔ چلتا ہے تو سراٹھا کے۔“

”کرتا کیا ہے وہ؟“ سگاں کو شیدی کے بارے میں بات کرنا اچھا لگنے لگا تھا۔ ”ہاں رے؟ کیا کرتا ہے یہ تیرا دوسرا اللہ بخش ناگ؟“

”کالا ناگ!“

”ہاں..... کالا ناگ کیا کرتا ہے؟“

”حرامیوں کے حلق میں ہاتھ ڈال کے اپنے حصے کی روٹی نکالتا ہے..... بس یہی کام ہے اس کا۔“

”یہ کیا بولتا ہے؟..... دھاڑیل ہے؟ ڈاکو ہے وہ؟“

”ڈاکو وا کو کیوں ہوگا..... وہ چیتا ہے۔“ جاوے ہنسا۔ ”کالا چیتا..... شراب پیتا ہے، خوش رہتا ہے۔ کسی سے بلا وجہ اڑی نہیں کرتا۔ نہ ہی ڈرتا ہے کسی سے..... یہ اللہ بخش شیدی۔“

”واہ رے!..... اور وہ..... دوسرا؟“

”دوسرا کون؟“

”کالا ناگ کے ساتھ کوئی اور بھی تو ہوئے گا؟..... بھلا وہ اکیلا ہے؟“

”اکیلا ہے..... ایسا آدمی اکیلا ہوتا ہے۔ لیکن..... ہاں، اُدھر وہ ہے اُس کے ساتھ لگا چلا آ رہا ہے..... وہی دوسرا۔ پولیس والا۔ زیب۔“

”زیب؟“

”شاہ زیب۔“

”اچھا؟..... یہ شاہ زیب کیا کرتا ہے؟“

”پولیس والے کیا کرتے ہیں؟ وہی کر رہا ہے یہ۔ گالی دے رہا ہے..... اور مٹی میں روٹی ڈھونڈ رہا ہے۔ یہ زیب۔“

”ہوں۔ اور کہتا کیا ہے؟..... کالا ناگ سے کیا بول رہا ہے؟“

”کہہ رہا ہے کالا زندہ نہیں بچے گا..... مرجائے گا۔“

”آررے!..... یہ کہہ رہا ہے؟“

”ہوں“ جاوے لڑکے کی آواز گلے میں پھنسنے لگی۔ سگاں سمجھ گئی وہ دکھی ہو گیا

ہے۔ غصے سے بولی، ”بکو اس کرتا ہے۔ کالا ناگ نہیں مرے گا۔ دوس تیرا کائے کو مرنے لگا؟“

”اچھا؟ اور زیب؟..... کیا زیب مر جائے گا؟“ جاوے نے عجیب سوال کیا تھا۔

”کیا کھبر“

”نہیں نہیں بتا۔ بتا اُس کا کیا ہوگا، زیب کا؟“

”ہونا کیا ہے۔ توں بولتا ہے برا آدمی ہے تو برا ہی رہیں گا۔“

”نہیں۔ ختم ہو جائے گا وہ۔ وہ رہے گا ہی نہیں، سالا!“ جاوے جوش میں لرز نے

لگا تھا۔

سگاں کچھ نہ بولی، بس دیکھتی رہی۔

”بول۔ اری بول..... وہ ختم ہوگا نا زیب؟“

وہ سگاں ڈر گئی۔ ”ایسا کیوں کہہ رہا ہے دل دار؟..... بس چھوڑ۔“

”وہ کالا بھائی کو گالی دیتا تھا۔ کہتا تھا اُسے زندہ نہیں رہنا ہے۔ سالا یہ کہتا تھا۔“

”میں بول رہی نا۔ بکتا ہے، حرامی!“

”وہ سالا خود زندہ نہیں رہے گا۔ نہیں بچے گا زیب۔ مر جائے گا۔“

سگاں نے جماہی لی، بانہیں ڈال اس کی گردن سے جھول گئی، ”سو جا، دل دار! تھکا

ہوا ہے۔ ایک گھنٹے اور سو جا۔“

”لیکن وہ زیب؟“

”ارے مرے وہ! تیری بلا سے۔“ وہ جھنجھلا گئی۔

”ہاں، یہ ٹھیک ہے۔ وہ مرے گا۔“

سگاں پھر جماہی لے کر نیند بھری آواز میں بولی، ”مر جائے گا۔ توں کہتا ہے تو مر

جائے گا۔“

”کیسے؟“

”سانپ ڈس لے گا اُسے..... چل توں سوں جا..... دل دار!“

کلاک نے ایک بارٹن کیا۔ وہ بولی، ”لے۔ اب سوں جا..... ہاں رے جاوے؟“

لڑکے جاوے نے گہری سانس لی، ”ہاں! اب سوتا ہوں۔“

ٹک ٹک ٹک.... ٹھک

”اٹھ اوئے اٹھ۔ کالے! اٹھ بھینی یے! شیدی سالے! اٹھ تو بھی.... اوئے! اس چھوکرے کو پکڑو سالے کو سمبالو ادھر سے۔ ہاں، ایک باجو ایک ٹانگ ادھر ڈالو..... ایک ادھر۔ اوں ناں ناں۔ ارے ایسے نہیں۔“

کالے ناگ کی آواز آئی، ”آرام سے ڈے آرام سے۔ آدین کا بچہ ہے کوئی جانور نہیں جو تم ایسا پینکتاے.... خرکش!“

شاہ زیب نے اور دوسرے نے کھینچ کے اُسے کاٹھی پہ ڈالا، رستے سے باندھ دیا۔ ننگی لکڑی اُس کے پیٹ میں کبھی تو وہ چیخا شیدی بھی چیخا جیسے ساتھ ساتھ تکلیف میں ہو۔ ہتھ کڑی بیڑی بجی اور شیدی نے گالی دی، ”گوارکش! مادر اں.....“

شاں کی آواز کے ساتھ پولیس والے کے ہاتھ کا چابک کالا کے چہرے پر پڑا۔ وہ پھر چیخا۔ اندھیرے میں بھی جاوے نے اُس کے چمک دار آنسوں چہرے پر خون کی ایک لکیر بنتے، لشکتے دیکھ لی۔ ہتھ کڑیاں بیڑیاں طیش میں بجتی تھیں کہ برابر کھڑے آدمی نے ہوا میں گولی چلا دی، ”خبردار!“

شیدی کی تکلیف میں وہ دہرا ہو گیا، جاوے۔

پھر اُسے، جاوے کو، سگاں کی کہی ہوئی بات یاد آئی، وہ بولا، ”اللہ بخش! بھائی، پروا مت کر، سگاں کہہ رہی تھی اسے سانپ ڈس لے گا..... زیب سالے کو سانپ ڈسے گا۔“ اللہ بخش شیدی نے اُسی طرح جھکے جھکے ہاں، میں سر ہلایا۔

شاہ زیب ہنسا۔ اُس نے حسبِ معمول گالی دی اور مشعلوں والوں سے دور ریت کے ٹیلے پر چڑھنے لگا مگر چلتے چلتے وہ گرا، وہ شاہ زیب..... اور اُس نے چیخ ماری پھر کسی کو پکار کے بولا، ”اوئے روشنی وکھا!۔ یہ کیا تھا؟..... روشنی وکھا!۔“ پھر سانپ سانپ پکارتے ہوئے اُس نے سب کو ٹیلے پہ جمع کر لیا۔

”مارو مارو سانپ ہے۔ زیب کو سانپ لڑ گیا۔ سانپ ہے اوئے کالا کوڑیا لا۔“ لوگ چیخ پکار کرتے بھاگ بھاگ کے آتے رہے۔ مشعلیں، بیڑی ٹارچیں، ماچسیں جلا جلا کے آتے رہے۔ مسلسل بک بک ہوتی رہی۔ ایک رائفل والا اونٹوں کے پاس آ کھڑا ہوا۔ وہ ڈرا ہوا تھا، اپنے آس پاس ریت میں، جھاڑی میں ٹارچ کی روشنی پھینک رہا تھا۔

کسی کو بھی قیدیوں کی پروا نہیں تھی۔

کوئی اونچی آواز میں کہنے لگا کہ زیب تو اُسی وقت مر گیا تھا۔ سانپ کو بھی کسی نے

مار دیا۔

بیڑیاں ہتھ کڑیاں بجاتا اللہ بخش کالا ناگ اونٹ کے برابر آکھڑا ہوا۔ اُس کے چہرے کے زخم پر خون جمنے لگا تھا سو وہ اب چمکتا نہیں تھا۔ زخم چہرے میں گم ہوتا جا رہا تھا۔

جاوے نے پوچھا، ”کالا بھائی! زیادہ چوٹ تو نہیں آئی؟“

کالے نے جواب نہ دیا۔ وہ جاوے کے اور قریب ہو گیا۔

جاوے نے کہا، ”کالا بھائی!“

اُس نے ہاتھ اٹھا کے جاوے کو روک دیا، سرگوشی میں بولا، ”تم ابی کیا بولتا تھا۔ ہا

جاوے!“

”چوٹ کو پوچھتا ہوں..... زیادہ تو.....“

”نہیں نہیں جاوے! تم وہ کیا بولتا تھا بچہ!؟ ابی شاہ زیب کے مرنے سے یک دم

پہلے کیا بولا تھا؟“

”ہاں، وہ سگاں کہہ رہی تھی۔ شاہ زیب کا کہتی تھی کہ اُسے سانپ ڈس لے گا۔“

کالا آہستہ سے بولا، ”ہونا۔ سانپ اُسے بروبر ڈس گیا۔“

”مجھے پتا ہے۔ ابھی جو میں ریت پہ لیٹا تھا تو بتا رہی تھی سگاں..... میرے ساتھ

بیٹھی تھی مسہری پہ۔“

کالا ناگ نے ہاتھ بڑھا کے جاوے کی پیشانی چھولی۔

زنجیریں بجیں تو ہتھیار اٹھائے ایک سے زیادہ آدمی آکھڑے ہوئے۔ ایک بولا، ”چلو

اٹھو۔ چلو سالے اپنے اُوٹھ کے پاس۔“ وہ اُسے بندوق کے کندے سے ٹھیلے ہوئے لے گئے۔

صبح ہونے میں ابھی دیر تھی۔

سورج نکلنے سے پہلے اُس نے ایک نیند اور لینا چاہی۔

اس بار اُس نے خواب نہیں دیکھا۔ کجاوے سے بندھا ہوا وہ گہری بے خواب نیند

میں پسینے پسینے ہوتا رہا۔ سر کا درد کم ہوا تھا مگر جوڑ جوڑ دکھتا تھا۔

اجالے سے پہلے والے مکر اجالے میں قافلہ رک گیا۔ اونٹ بٹھا دیے گئے۔ جیپ

گاڑی اور گھوڑوں نے گردش شروع کر دی۔

جاوے نے دیکھا وہ ایک اونٹ کو بٹھا نہیں پارہے تھے۔ وہ بلبلا رہا تھا اور مستی کرتا تھا۔ چار چار ساربان لگے تھے مگر وہ قابو نہیں آ رہا تھا۔ قافلے میں ہلچل ڈالی ہوئی تھی اُس نے۔ جاوے نے دیکھا اونٹ پر کاٹھی نہیں تھی، جھول پڑی تھی اور سب مل کر سفید چادر میں بندھی کوئی چیز..... بڑا سا بھاری ایک بندل اُس پر لاد رہے تھے جس سے اونٹ بے چین ہو رہا تھا۔

جاوے کے برابر سے سرکاری بندوق اٹھائے ایک میلی وردی والا جماہی لیتا گزرا۔ جاوے نے اُس سے پوچھا، ”اونٹ کیوں شور کر رہا ہے؟ وہ کیا لاد رہے ہیں اس پہ؟“ میلی وردی والے نے بیزاری سے دیکھا، پہلے سوچا ٹال جائے مگر پھر جمائی لے کر بولا، ”اُوئے میت لاد رہے ہیں جس کی وجہ سے بدکتا ہے حرام خور۔ جانور پچھان جاتے ہیں کہ بئی اوپر زندگی چیز ہے کہ کوئی لاش ہے۔“

”لاش؟ کس کی؟“

”اُوئے سانپ لڑ گیا تھا حوال دار کو..... سانپ کے کاٹے سے مر گیا۔“

..... ارے!..... اچھا تو..... خواب نہیں تھا؟ کوئی مراضور۔ ”کون مرا ہے؟ کون حوال دار تھا؟“

”شاہ زیب۔ پر تو کیوں پوچھتا ہے بئی؟ تو تو گالیاں نکالتا تھا اُسے۔ رات بھر نشے میں بک بک کی ہے..... بھینی یے۔“

یعنی کچھ بھی خواب جیسا نہیں تھا۔ جاوے نے سوچا۔ وہ سب ہو چکا جو سگاں نے کہا تھا..... جاوے نے آگے سوچا، ارے میں نے خواب دیکھ کے حوال دار کو سانپ سے ڈسوا دیا۔ اوہو! حیرت!

دور درخت کے برابر کھڑے اونٹ پر سوار اللہ بخش کالاناگ ادھر ہی دیکھ رہا تھا۔ دھوپ چڑھ آئی۔ سرکاری آدمیوں نے درختوں کے سائے میں فیلڈ کچن بنا لیا۔ آدمی بالٹیوں میں گرم دودھ اور چادروں کی جھولیوں میں پاپے، سکٹ ڈال کے لے آئے اور لگوں، پیالیوں میں وردی والوں کو دودھ اور پاپے دے چلے۔ پھر وہ چائے بھی دے گئے۔ برابر کھڑے ہتھیار بند آدمیوں نے پیالیوں، طشتریوں میں چائے سڑپنی شروع کر دی۔

جاوے نے سوچا تھوڑی سی چائے مل جاتی تو اچھا تھا۔
کسی نے پروا نہیں کی۔

کالاناگ کے اونٹ کے پاس بھی سرکاری آدمی ناشتا کر رہے تھے۔ جاوے نے دیکھا کسی نے اُسے بھی چائے بسکٹ نہیں دیا تھا۔

کچھ دیر بعد جب ہارن بجاتی جیپ گاڑی جاوے کے اونٹ کے پاس سے گزری اور بھاری آواز اور اختیار والے نے پوچھا، ”کیوں بھئی، قیدی کو چائے بسکٹ کچھ دیا؟“ تو بھیڑ میں سے کوئی بولا، ”ہاں صاب! قیدی کو ناشتا دیا صاب بروبر۔“

”جھوٹا سالا!“ جاوے نے دل میں کہا مگر اُس آدمی پر جاوے نے زیادہ غصہ نہ کیا۔
گاڑی گزر چکی تو گھڑ سوار اپنے جانور دوڑاتے ہوئے شور مچانے لگے کہ چلو بھئی چلو
چلو..... ٹائم خراب نہیں کرو۔ چلو۔

گھڑ سواروں کے بعد ایک تیز رفتار سائڈنی گزری اور جاوے نے سوچا کہ اگر اس سائڈنی پر سگاں سوار ہوتی تو کیا ہی اچھا ہوتا۔

اس لیے جب سائڈنی اُس کے اونٹ کے برابر آئی تو جاوے نے دیکھا کہ اُس پر سگاں سوار ہے اور برابر سے نکلتے ہوئے پکار کے کہتی ہے، ”لے دل دار! میں بھی پکڑی گئی۔“
جاوے نے گرد و غبار کے بادل میں آنکھیں کڑا کے دیکھا، یہ سگاں ہی تھی۔ اُنہوں نے اُس کی مشکلیں کس دی تھیں۔ سر سے اس کے پٹی بندھی تھی اور چہرے پہ ورم تھا۔

جاوے نے سوچا لو یہ بھی آگئی۔ ہم تینوں ہی اکٹھا ہو گئے اور دھول سے اور اندر اترتے آنسوؤں سے قیدی جاوے کا گلہ رندھ گیا۔ اُسی وقت دھاوا کرتی سائڈنی پر سے سگاں نے چیخ کے کہا، ”اورے جاوے! تو نے کھواب دیکھا، بلا لیا مجھے۔ اب نکلنے کی بھی کر، دل دار!“
کالانا نے درخت کے پاس سے آواز لگائی، ”ہاں رے جوان! نکلنے کی کرو۔“

”کیسے؟“ جاوے نے پوچھا، ”کیا کروں؟“

”جاوے! خواب دیکھ رہائی کا..... خواب دیکھ۔“

”خواب؟“ اس وقت اُس کی سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

”جلدی۔“ اللہ بخش کالا کی آواز آئی، ”جیسا جی دیکھا تھا خواب سانپ کے کاٹنے

کا۔ ابی یہ دیکھ رہائی کا۔“

سگاں بولی، ”دل دار میرے! توں یہ کھواب دیکھ کہ سب اُوٹھ گھوڑا مٹی سے بندھ جاوے، گاڑی بیٹھ جاوے ریتی میں۔ جمین پاؤں پکڑ لے اُنوں کے۔“
”ہاں ہاں جوان!“

تو پھر لڑ کے جاوے نے یہی خواب دیکھا اور لے جانے والوں کے اونٹ گھوڑے مٹی سے بندھ گئے، گاڑی ریت میں بیٹھ گئی اور زمین نے اُن کے پاؤں پکڑ لیے۔
پھر جاوے اپنے اونٹ سے اترا اور کالا ناگ اپنے اونٹ سے اترا اور سگاں اپنی سائنڈنی سے اتری اور ٹیلوں کی اوٹ لیے یہ تینوں سامنے دکھائی دیتے کھجی کے درختوں کی طرف بڑھ گئے۔

شیدی نے کہا، ”ہاڑے جوان! شاباس!“
سگاں بولی، ”جاوے! جیتا رہ میرے دل دار!“
جاوے مسکراتا تھا۔

پولیس والے قیدی کے اونٹ کے پاس دوڑ کے پہنچے.....
دوڑ کے پہنچے تو وہ بھی جس کا نام شاہ زیب تھا، جسے لڑ کے جاوے نے ایک خواب سے دوسرے خواب تک جاتے ہوئے سانپ سے ڈسوا یا تھا، دوڑ کے آ گیا اور یہ شاہ زیب اس لڑ کے کی ڈھلکی ہوئی گردن اور جبرے کے اتصال پر اپنی دو انگلیاں گڑا کے شہ رگ تلاش کرنے لگا۔

کوئی حرکت نہیں تھی..... سناٹا تھا شہ رگ میں۔
اس لیے شاہ زیب نے قافلے کے ساتھ چلنے والے ملاں سے کہا، ”لو جی یہ تو مر گیا لڑکا، دعا پڑھو۔“

”اِنَاللہ..... صاحب کو بول دیو کہ بئی قیدی فوت ہو گیا..... اِنَاللہ۔“
شاہ زیب نے ملزم کی ہتھ کڑیوں کا تالا اور بیٹریوں کے رپٹ کھول دیے۔
”ضابطے کے تحت اُسے وقوے کی جگہ پر ادھر ہی دشت میں دفن کیا جاسکتا ہے۔
ویسے بھی حکم ہے کہ جلدی کرنی چاہیے..... پر آگے جو بھی آڈر ہو۔“ ملاں نے کہا۔

دور درختوں میں تین جھیننی پر چھائیاں رکی ہوئی تھیں۔ ان میں سے دو مردوں کی پر چھائیاں تھیں، تیسری ایک عورت کی۔ وہ اتنی دھندلی تھیں اور ایسے لرزتی تھیں کہ ان کے پار دشت کا سب کچھ نظر آتا تھا۔ بالکل اس طرح جیسے روہیں سچیسٹ کرتے ہوئے فلم کے ڈبل ایکسپوژر میں پر چھائیاں دکھلائی جاتی ہیں تو ان کے پار بھی سب کچھ نظر آتا ہے۔

نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ تین، جواب مل کے بھی ایک زندہ جاوے نہیں بن سکتے تھے، کیا کریں گے؟ آگے کہاں جائیں گے؟ بس، دشت کے آف سیٹ میں وہ وہیں رکے ہوئے تھے۔

اور تبھی یہ کھلا کہ جب کوئی امنگوں بھرا جوان مرتا ہے تو ایک دوست اس کا اور اس کی داشتہ اُسی کے ساتھ مرجاتے ہیں۔

پولیس والے، دشت کے عارضی کیمپ میں بیان کیے گئے قیدی کے اونٹ پر سفید کپڑے میں لپٹا ایک بھاری بندل چڑھانے کی کوشش کر رہے تھے، اونٹ مستی کرتا اور بلبلائے جاتا تھا۔ قابو میں نہیں آ رہا تھا۔



خفت میں پڑا ہوا مرد

آنکھ کھلی تو میں کسی بستر پر پڑا تھا اور سر کے سوا مجھے اپنے بدن کے کسی حصے کی خبر نہیں تھی۔ سر اس طرح دھڑک رہا تھا جیسے دل دھڑکتا ہے۔ اس دھڑکن میں کچی تکلیف تھی اور خالص درد۔

اب یہ دیکھنا ضروری تھا کہ میں کہاں ہوں۔ حالاں کہ نظر جما کے دیکھنے میں بھی تکلیف ہوتی تھی مگر میں نے دیکھا۔

دیکھا کہ چھت کے چھپانے کو ایک سفید چادر تھی جو درمیان میں اپنے بوجھ سے لٹک آئی تھی۔ چادر پہ ایک گوشے سے دوسرے گوشے تک چمکی کے ستارے اور رنگین کاغذ کے پھول ٹانک دیے گئے تھے۔ میں نے سوچا، یہ دیہاتی آرائش ہے، میں کسی گاؤں میں ہوں۔ میں نے تکلیف سے کروٹ بدلی اور کراہنے لگا۔

کمرے میں دائیں طرف ایک دروازہ، ایک کھڑکی تھی۔ دروازہ بند تھا اور کھڑکی میں لوہے کی سلاخیں جڑی تھیں، پردہ پڑا تھا۔ تین معمولی سی کرسیاں دیوار کے ساتھ لگی تھیں۔ چوتھی کرسی بستر کی پائنتی پڑی اس بے ڈھنگی سنگھار میز کے آگے رکھی تھی جس کا سٹا شیشہ بجلایا ہوا لگتا تھا۔ کمرے کی دیواروں پر بدرنگ گلابی چونا پھرا ہوا تھا اور نیلے آئل پینٹ کی ایک پٹی فرش سے تین فٹ اوپر آرائش کے لیے کھینچ دی گئی تھی۔ دیواروں کی طرف دیکھنے سے تو اور بھی

الجنھن ہوتی تھی۔ ہمت کر کے میں نے دوسری طرف کروٹ لی۔

اُدھر کچھ نہیں تھا... لیکن نہیں، اُدھر ایک تنگ سا لکڑی کا دروازہ تھا۔ میں نے سوچا، دروازے کے پیچھے کچھ ہوگا اور جب اُدھر سے بالٹی برتن بنجنے اور پانی گرنے کی آواز آئی تو میں سمجھ گیا کہ یہ غسل خانہ ہے۔ میں نے کراہ کے پھر سیدھا لیٹنا چاہا۔ سر کا پچھلا حصہ پھوڑے کی طرح دُکھتا تھا۔ دوبارہ کروٹ سے لیٹ گیا، غسل خانے کی طرف پھر میری پیٹھ ہو گئی۔

بالٹی بنجنے اور پانی گرنے کی آواز آنی بند ہو گئی تھی۔ جو بھی نہا رہا تھا اب کپڑے پہن رہا ہوگا۔ ایک کپڑا جھٹکا گیا۔ کچھ دیر خاموشی رہی پھر زنجیر بجی اور شور کے ساتھ غسل خانے کا دروازہ کھل گیا۔ تکلیف سے آنکھیں موندے میں نے کراہتے ہوئے فریاد کی، ”آ... ہستہ... آ... ہستہ...“

”تم اٹھ گئے؟“ کسی عورت کی آواز تھی۔ یہ آواز میں پہچان نہیں پایا۔ عورت نے بال جھٹکے ہوں گے، تو اس کی ننھی بوندیں میرے آدھے چہرے اور بازو پر آبرسیں۔ یہ ٹھنڈک مجھے اچھی نہ لگی۔ میں پھر کراہنے لگا۔

عورت بال جھٹکے جا رہی تھی اور اس مشقت سے اس کے لفظ ٹوٹ ٹوٹ جاتے تھے: ”گھب را... نہیں... دوائی دیں... گے تیرے کو... چا پلائیں گے۔... ہاں... پرے سان مت ہو۔“ وہ اپنی مصروفیت ختم کر کے بستر کی پائنتی سے سامنے آئی تو سستے صابن کی صاف ستھری خوش بو اس کے ساتھ آئی۔ خوب چمک دار سفید دانت لشکاتی، مسکراتی ہوئی ایک سانولی صحت مند جوان عورت میگوھاڑوں کا گھاگھرا شلوکا پہنے، تولیے سے بال رگڑتی سامنے کرسی پر آ بیٹھی، بولی، ”کیسا ہے ابی؟ صئی ہے؟“

میں نے آہستہ سے کہا، ”ہاں۔“

”بھوکھ لگی ہوئیں گی تیرے کو۔ روٹی مانی بھی کھلائیں گی... پھلکریں کر۔“

”یہ کیا جگہ ہے؟“ ہمت کر کے میں نے اپنی بیداری کے بعد کا سب سے لمبا فقرہ

ادا کیا تھا۔

”میرا گھر ہیں۔ پھلکریں کر۔ تیرے کوں ابی کوئی کج بی نہیں بولیں گا۔“

”یہ کوئی گوٹھ ہے؟ ایس؟... گاؤں کوئی؟“

سفید دانتوں والی عورت ہنسی، ”واڑے وا۔ گوٹھ گاؤں کے سا بولتا ہے؟... اڑے سہر

ہے سہر۔ یہ دیوار کے پی چھوریلوائی یارڈ ہے۔ ایک میل یہ باجو، ایک ڈیڑھ میل وہ باجو گدام پہ گدام چلے گئے ہیں۔ بیچ میں ہم لوگ کا کچا بستی ہے۔ ہا ہا ہاوری تو گوٹھ بولتا ہے... چریا!“

”تو میں شہر سے باہر نہیں نکلا؟ ابھی شہر میں ہوں؟“

”ہاں نا... بروبر سہر میں ہے۔ رات میں جی کوئی انجن گاڈی نہیں گجرتی ہووے... بس اداری ٹاور کا گھنٹا سن لے۔ جاستی دور نہیں ہے کج بی۔ بروبر بیچ میں ہے ہم لوگ۔“

”یہاں مجھے کون لایا تھا؟“

”ہم لوگ لایا۔“

”ہم لوگ کون؟“ میں تکلیف کے ہوتے بھی کہنی کے بل اٹھا تھا۔

”لیٹا رہ۔ لیٹا رہ... تم اٹھو نہیں ابی۔“ وہ اپنے بالوں کی مصروفیت چھوڑ میرے اوپر جھک آئی تھی... اور اس کے ساتھ ہی صابن اور لونگ کی ٹھنڈی گرم خوش بو بھی۔

اپنا ٹھنڈا گرم ہاتھ اس نے میری پیشانی پہ رکھا اور بولی، ”بکھار ہے... پہلے چا بسکٹ کھلائیں گی تیرے کو، پیچھو آس پرو کی ٹکیا دیں گی۔ ابی لیٹ جا... ہاں؟“

میں نے پھر سوال کیا، ”تم لوگ کون ہو؟ یہاں کیوں لائے ہو مجھے؟“

وہ ٹال رہی تھی، ”ابی جاستی نہیں بول۔ کم جوری ہے... تیرے کو سب کھبر لگ جائیں گی۔ ارام سے لیٹا رہ۔“

”کوئی مجھے پکڑنے آ رہا تھا۔“ میں نے سوچا، وہ کچھ نہیں بتا رہی تو میں ہی بتاؤں۔

”چپ رہ۔“ وہ پھر ہنسی۔ لونگ کے جھونکے نے میرے چہرے پہ جیسے چٹکی لی۔

”میرے کو کھبر ہے۔ پروانیں۔ ابی تجھے کوئی نہیں پکڑیں گا۔“

میں نے سوچا، پکڑا تو گیا ہوں، اب کیا کوئی پکڑے گا۔

وہ بستر پہ بیٹھ گئی، اپنا ہاتھ اُس نے میرے شانے پہ رکھا اور لجاتے، مسکراتے ہوئے، جیسے کسی ذاتی راز میں مجھے شریک کر رہی ہو، آہستہ سے کہا، ”سن۔ میں پورا کپڑا نہیں پیرا ہے، ابی اور بی کپڑا پیروں گی۔ تو جرا دیری کو وہ باجو منھ کر لے... سمجھا؟“

میں نے کراہتے ہوئے دوسری طرف منھ کر لیا۔

عورت نے بستر کے گدے کے نیچے ہاتھ پہنچا کے کچھ کھینچا ہوگا پھر وہ آپنی آپ ہنتے ہوئے، گنگناتے ہوئے کپڑے پہنے لگی۔ چوڑیاں اس کی بجتی رہیں۔ وہ ایک بار بستر سے

اٹھی پھر بیٹھی۔ میں چپ چاپ پڑا غسل خانے کا دروازہ اور سامنے کی گلابی چونا پھری دیوار دیکھتا رہا۔

میرے پیچھے عورت کی مصروفیت ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ اس کی چوڑیوں کے علاوہ بھی کوئی چیز بچی ہوگی پھر دروازے پہ کھٹکا سا ہوا، وہ کھلا اور بند ہو گیا۔ مجھے دور سے اُس کی ہلکی ہنسی کی آواز سنائی دی۔ کروٹ بدل کے میں نے دیکھا، وہ کمرے میں نہیں تھی۔ میں اکیلا تھا۔ باہر سے دروازہ بند کر دیا گیا تھا۔

میں نے گھبرا کے اٹھنا چاہا۔ چکرا گیا۔ پھر ہمت کر کے اٹھا، دروازے کے پاس پہنچا۔ دروازہ قفل دار تھا۔ چابی کے سوراخ سے میں نے باہر جھانکا۔ چٹائیوں سے بنی ایک چار دیواری نظر آرہی تھی۔ مضبوط لکڑی کے اس دروازے سے میں نے زور آزمائی کی۔ کچھ بھی نہ ہوا۔ وہ حرام زادی مجھے کمرے میں بند کر کے چلی گئی تھی۔

میں بستر اور دیوار کا سہارا لیتا کھڑکی تک پہنچا۔ پردہ سرکا کے میں نے دیکھا، دُور تک اونچی نیچی پتھریلی زمین یا تنگی بوچی پہاڑیاں نظر آتی تھیں جن پر کہیں کہیں کیکلٹس کی دھول چڑھی چھدری جھاڑیاں تھیں... اور کچھ نہیں تھا۔

ہم ویرانے میں تھے اور عورت کہہ کے گئی تھی کہ دیوار کے پیچھے شہر ہے اور ریلوے یارڈ ہے۔ ایک میل ادھر، ڈیڑھ میل ادھر گودام بنے ہیں اور یہاں سے ٹاور کا گھنٹا صاف سنائی دیتا ہے... کتیا!

میں تھک تھکا کے پڑ گیا۔ سر کے علاوہ ہاتھ پیر بھی درد کرتے تھے۔ سب کچھ یاد آ گیا تھا۔ میں چھلانگ مار کے بھاگا تھا اور بھاگا بھی اتنا تیز کہ کبھی زندگی میں ایسی دوڑ نہ لگائی ہوگی۔

میرے پیچھے وہ سالا بھینسا کتنا تیز دوڑ رہا تھا۔ دوسرا کوئی ہوتا تو مجھے پکڑ نہیں سکتا تھا۔ میں نے اپنے سر کا پچھلا حصہ چھو کے دیکھا۔ کھال نہیں پھٹی تھی، بڑا سا گومڑ بن گیا تھا جو درد کرتا تھا۔ پتا نہیں کیا کھینچ کے مارا تھا اُس سالے نے۔

میں تکلیف سے کراہنے لگا۔ مگر ادھر کوئی آ رہا تھا۔ میں نے کراہنا بند کر دیا۔ دروازہ ایک دم کھل گیا، آگے آگے وہ عورت تھی اور اُس کے پیچھے نو دس برس کا ایک لڑکا جو پرانی نیکر اور پھٹا ہوا میلا بنیان پہنے تھا۔ وہ تار کے چھینکے میں خوب گہری چائے

کے دو گلاس الجھائے، ایک رکابی میں سوڈے والی بیٹھے آٹے کی موہنی ٹکیاں لیے ہوئے کمرے میں چلا آیا۔ اُس نے چائے کے گلاس اور رکابی کرسی پہ رکھی اور خاموشی سے چلا گیا۔ اُس کے جاتے ہی عورت نے دروازے میں چابی پھرا دی اور ڈوری سے بندھی چابی اپنے لہنگے کے نیفے میں اڑس لی۔

میں جان گیا، وہ مجھے کھلانہیں چھوڑیں گے۔ یہ عورت مجھے بند کر کے جائے گی یا ساتھ بند ہو کے بیٹھے گی۔

”لے پہلے یہ بسکٹ کھالے، چا پی لے۔ پی چھو آس پرودیں گی تیرے کو۔ نہیں درد رہیں گا... نہیں بکھار... لے۔“

عورت نے پلیٹ میری طرف بڑھائی تھی مگر میں نے ادھر دیکھا بھی نہیں۔ سر جھکائے بیٹھا رہا۔

وہ ہنسی، ”کھفا ہو گیا ہے، میرے سے نزاج ہے؟ اڑے مسکھری کرتی تھیں۔ میرے کو پتا تھا تو آپ ہی دیکھ لیں گا کی یہ سہر نہیں ہے۔ بیلا ہے۔“ وہ چہک کے اور ایک بار ہنسی، ”میں بولی ریلواری یارڈ۔ اڑے تو سچ سچ گیا... بولی ناور ہے، تیرے کو یکین آ گیا ہا ہا... لے، کھالے... نزاج نہیں ہو۔“

خبر نہیں کب تک ان کی قید میں رہنا پڑے۔ عورت سے بنا کے ہی رکھنا اچھا ہے۔ میں نے ہاتھ بڑھا کے ایک موہنی اٹھالی اور دھیرے دھیرے کترنے لگا۔ اچھی تھی۔ اس نے چائے کا ایک گلاس اٹھا لیا۔ بستر کے پائنتی کرسی پر بیٹھ کے دونوں ٹانگیں بستر پہ ٹکائے وہ مزے سے چائے پینے لگی۔ میں نے ایک کے بعد اور موہنی نہ لی تو سمجھاتے ہوئے بولی، ”سن۔ ایدر کا یہ ہے کی آدمی کو جی جتنا ملے کھالیوے، کھبرے وری کھانے کو کبی ملے... ملے کی نہیں ملے... سمجھا؟ یہ سب کھالے... طاقت آئیں گی۔“

میں نے موہنی اٹھالی تو ہنس کے بولی، ”پر طاقت تیرے میں بہت ہیں۔ سگ گا بولتائے تو ایسے بھاگا تھاں، اُسے بی پرے سان کر دیا۔“

خوب! تو اُس بھینسے کا نام سگ گا ہے؟ یہ اُس سالے کی عورت ہوگی۔

میں نے پوچھ لیا، ”سگ گا تیرا کون ہے؟“

ہنس کے بولی، ”آسک ہے میرا۔ بالم۔“

”مزد ہے تمہارا؟“

تالی پھٹکار کے، ہنس کے بولی، ”جے مزد نہیں تے تیرے کو وہ کج ہو ر لگتا ہیں؟
گھسرا لگتا ہیں ہاں ڈے؟“

میں نے کہا، ”نہیں۔ پوچھتا ہوں... تیرا میاں ہے نا وہ؟“
چہرے کے سامنے سے گلاس ہٹا کے کہنے لگی، ”ایدر میاں بی بی کوئی نہیں ہوتا...
جنگل بیلا ہے یہ۔ میری چرپائی پہ جی جو بی آ کے بیٹھ گیا میرا آسک ہے۔ کھلاص! نہیں سمجھا؟“
میں نے کہا، ”ہاں ہاں، سمجھ گیا۔“

قہقہہ لگا کے بولی، ”ابی تم بی بیٹھا ہیں میری چرپائی پر۔ تم بی میرا آسک ہیں
... ہاں؟“ اور ہاں کہتے ہوئے اُس نے اپنا ایک پیر میری طرف بڑھایا، انگوٹھے سے میرے
پہلو میں گدگدی کی، بولی ”کیا کھیاں ہے؟ ہو جائے آسکی ماسوکی.. ابی تو تم ایک دم ٹچنگ لگتا
ہے۔ ہا ہا ہا... ہو جائے؟“

لو۔ ذرا منہ لگایا تو مجھ سے نگلی باتیں کرنے لگی۔ سالی!
اُس نے میرا چہرہ پڑھ لیا تھا اور بے ر کے ہنسنا شروع کر دیا تھا۔ اپنا گلاس فرش پر
رکھ کے وہ پہلو دبائے بس ہنسے جا رہی تھی۔

پھر مشکل سے ہنسی روک کے کہنے لگی، ”سگ گا بولتا تھاں تیرے کو چکلے سے اٹھایا
ہے۔ جھوٹ بولتا ہوئے گا بھینی۔ تم تو بالکل ہی کچا ہیں۔ چکلے کا ہوتا تو ایسا کورا نہیں، چالو ہوتا
... گھس کر دیتا میرے کو۔“

عجیب عورت تھی، بکے جا رہی تھی... میں نے سوچا موقع اچھا ہے کچھ ضرور کہنا
چاہیے۔ میں نے معصوم سی شکل بنا کے غصے سے کہا، ”جھوٹ بولتا ہے سگ گا۔ مجھے اُدھر سے
نہیں اٹھایا۔“

مجھے ایسا لگا جیسے وہ میرے چکر میں آگئی ہے۔ ہنسنا، ستانا چھوڑ کے کرسی پہ ذرا آگے
جھک کے بیٹھ گئی، بولی، ”جذر سے بی اٹھایا، اُدھر تو کیا کرتا ہیں؟“
میں نے کہا، ”کروں گا کیا؟ اُدھر رہتا ہوں۔“

”ا کے لا؟“

میں نے ہاں میں سر ہلایا۔

وہ بے اعتباری سے بولی، ”اتنا سا چھو کرا... ا کے لا کیسے رہتا ہوئیں گا؟“
مجھے چھو کرا کہہ رہی تھی، میں نے بڑھا کے بات کہہ دی، ”اٹھارہ سال کا ہوں...
اٹھارہ کا... اتنا سا نہیں ہوں۔“

وہ اپنے سفید دانتوں کی چمک میں ہنسی، ”ہاں اڑے جوان مرد ہیں۔ چھو کری موکری
کے چکر میں بھی ہوئیں گا۔“
”چھو کری؟... کیسی چھو کری؟“

”سگ گا بولتا ہے۔ تیراں برس کی ہک ملتان مٹی جیسا چکنی چھو کری اُس نے اُدری
آگے پی چھو دیکھی تھیں... وہ ای پھڑے میں ہوئیں گا تو۔“
”بکواس کرتا ہے۔ بکتا ہے سالا۔“ میں نے اور زیادہ غصہ کیا۔ خوب سمجھ رہا تھا وہ
کس لیے یہ سب کر رہی ہے۔ میں نے سوچ لیا تھا، کچھ نہیں بتاؤں گا۔ کچھ بھی نہیں بتاؤں گا۔
اُس کے عاشق کو میں نے پھر گالی دی، ”بکواس کرتا ہے وہ سالا جھوٹا ہے... بھینسا،
سالا جھوٹا!“

یہ بات اسے مزے کی لگی۔ ہنستے ہنستے وہ کرسی سے اٹھی بستر پر آ بیٹھی، اپنی ایک
بانہ پھیلا کے اُس نے میرے شانوں کو گرفت میں لے لیا۔ وہ بھینسا بھینسا کہتی ہوئی جھوم
رہی تھی اور بس ہنسے جاتی تھی۔
یہ اچھا شگون ہے۔ میں نے اس عورت سے اگر دوستی کر لی تو یہاں سے، اس چوہے
دان سے بچ نکلوں گا۔

کسی خوش مزاج دوست کی طرح میں ہنسی میں شامل ہو گیا۔
مگر اسی وقت باہر کوئی کھٹکا ہوا۔ وہ فوراً مجھے چھوڑ کے بستر سے اٹھی اور کرسی پہ جا
بیٹھی۔ اس کی ہنسی رک گئی تھی۔

اسی وقت دروازے کے دونوں پٹ جیسے اندر پھینکے گئے۔ باہر وہی بھینسا کھڑا تھا،
حرامی۔ چوکھٹے میں پھنسا ہوا، کچم شیم۔ وہ ایک قدم اندر آیا۔ اس نے کڑوے پن سے اپنی
عورت کو دیکھا، غصے سے پوچھا، ”کیا کر رہی ہے؟... تو گئی نہیں؟“

عورت نے تیوریاں چڑھا کر کہا، ”تو دیکھتا نہیں؟ چا دینے آئی ہاں۔ بس جارئی ہاں...“
جتنی دیر میں اُس نے گلاس چھینکے میں لگائے، پلیٹ اٹھائی، بھینسا کمر پہ ہاتھ رکھے

بستر کے پائنتی کھڑا رہا۔ پلیٹ میں دو میٹھی ٹکیاں بچی تھیں، اس نے رازداری سے مجھے دکھاتے ہوئے وہ ٹکیاں کرسی کے ہتھے پہ رکھ دیں اور جانے لگی۔ سگ گے نے بد مزاجی سے کہا، ”سن! ادھر نہیں رکنا۔ تو نکل جا سیدھی، اس چھو کرے کو بی لے جا۔“

میں نے دیکھا نو دس برس کا وہ لڑکا بھی ڈولتا ہوا آگیا تھا۔

عورت نے منہ بگاڑ کر کہا، ”ہاں رے، چلی جان گی۔ ہو ر کوئی حکم... لاٹ صاب!“
جواب میں سگ گے نے گالی دی اور اس کرسی پر بیٹھ گیا جس کے ہتھے پر عورت نے ٹکیاں رکھ دی تھیں۔ سگ گے کے ہاتھ کے جھپٹے سے ٹکیاں کمرے سے باہر صحن میں جا پڑی تھیں۔ لڑکا نکل گیا تو عورت نے دروازہ بند کرتے، چابی پھراتے دو تین بار کہا، ”واڑے وا۔ شاباشے! واڑے وا... حررامی!“

دروازہ بند ہوتے ہی سگ گے میری طرف متوجہ ہوا، گہری آواز میں بولا، ”میں گھسا مار کے آدمی کا ناک سے مگج ٹپکا دیتا ہوں۔ ہو ر میں جاستی بات نہیں کرتا۔ سمجھا اوئے!“
اس نے آتے ہی دروازہ کھولنے، عورت سے بات کرنے اور موہنی پھینکنے میں جو ڈراما کیا تھا اور اب گھونے اور ناک سے مغز ٹپکانے کا جو مکالمہ بول رہا تھا، یہ سب میرے لیے نیا نہیں تھا۔ دادا گیری کرنے والوں کا، سب کا یہی طریقہ، یہی زبان ہوتی ہے۔ مجھے اندر سے بڑا اطمینان سا ہو گیا۔ مطلب یہ کہ سگ گے سب جتنا ہی خطرناک ہوگا، نہ کم نہ زیادہ۔ میں نے اس طرح کے بانگی دکھانے والے ”ڈینجر“ لوگوں کو ایک خاص حد تک جاتے دیکھا ہے۔ اس کے بعد ان کا کچا پکا رنگ چھوٹنے لگتا ہے۔ جتنی بڑھک یہ مار رہا ہے اس سے تو دس حصے کم اوقات ہوگی اس کی۔ سالا نہیں تو! دیکھیے نا، اس طرح دھمکا کے کام نکالنے والے یہ ”ڈینجر“ لوگ قریب کے آدمی کے سامنے تو کھل ہی جاتے ہیں۔ اپنی اس رکھیل کے آگے یہ آدمی کھلی کتاب ہوگا، جہی وہ اس سے نہیں ڈرتی۔ یہ عورت اس کی کمینگی سے بچنے کو کچھ دھونس دھڑی سہ رہی ہوگی۔ اور کیا۔

میں نے بھی سگ گے کو چکر دینے، اسے نرم کرنے کے لیے اس وقت اُس کی دھونس سہ لینے کا فیصلہ کر لیا۔

جب اس نے چیخ کر کہا، ”کچھ سمجھا اوئے؟... بھینی یے!“

تو میں نے پھنسی ہوئی خوف زدہ آواز میں کہا، ”ہاں صاحب!“

”تو پھر بول۔ بتا؟ ... بول!“ وہ حلق پھاڑ کر چیخنے لگا، ”سن اوئے... بتا دے، نہیں مارا جائے گا۔ مجھے تیرے سے کچھ نہیں لینا دینا۔ ایویں تیری چڑیا جتنی جان ہے۔ تیری گچی دبا کے وی میرے کو کوئی سوا نہیں آنا۔ اوئے، بندے کو اسی کی کمر توڑ کے سوا ملتا ہے جو اس کی جوڑ کا ہووے۔ تیری تو جان ہی کچھ نہیں۔ مچھر ہے بھینی یا۔ ایک ہی ہاتھ میں الٹ جانا ہے، خون تھوک دینا ہے تو نے۔ بتا ہاں؟ بول!“

”صاحب! ایمان سے مجھے کچھ نہیں معلوم۔“

”تو ایسے نہیں مانے گا“ کہہ کے اُس نے کمر سے اپنی اسٹیل کے چھلوں والی بیلٹ کھولنا شروع کر دی۔

مگر وہ بیلٹ کھولنے میں وقت لگا رہا تھا۔ یہ مجھے ڈرانے، میرا خون خشک کرنے کی ترکیب تھی۔ وہ سمجھ رہا ہے اتنے عرصے میں کہ اُس نے بیلٹ کھولنے کو ہاتھ بڑھایا ہے اور آخر میں جب وہ بیلٹ کو سر سے اونچا کرے گا، میں گھبرا کے سب بتا دوں گا جو وہ پوچھ رہا ہے۔

بس یہاں میرا حساب تھوڑا غلط ہو گیا۔ وہ صرف دھمکا نہیں رہا تھا۔

چھلوں والی بیلٹ کی جم کے لگائی گئی پہلی چوٹ میں نے اپنے بازوؤں پہ جھیلی، اس کے بعد بھینسے نے مسلسل تین چار چوٹیں میرے سر اور پیٹھ پہ لگائیں۔ میں نے بار بار چیخیں ماریں۔ یہ نالک نہیں تھا۔ بیلٹ کے فولادی چھلوں نے میرا سر پھاڑ دیا ہوگا۔ مجھے لگا جیسے خون بہہ بہہ کے پیٹھ پر گر رہا ہے۔

ہاتھ بڑھا کے میں نے انگلیوں کے پوروں سے زخم کی جگہ کو چھوا۔ بہت جلن ہوئی، ایک دم آنسو بھر آئے۔ مگر پوروں پر دیکھنے سے کچھ نظر نہ آیا۔ ٹھیک سے کیا دکھائی دیتا، آنکھوں سے آنسو جو بہے جا رہے تھے۔ سگ گے حرام زادے نے پھر ایک بار اپنی بیلٹ گھمائی۔ مگر میں نے سر، ہاتھ بلکہ پورا بدن اچانک جھکا دیا۔

یہ چوٹ اگر چھبھتی ہوئی بھی پڑ جاتی تو میں مارا گیا تھا۔

سگ گے نے ہانپتے اور غصے سے جھاگ اڑاتے ہوئے کہا، ”چکمہ دیتا ہے،

سورے!؟ میرے کو پتا ہے... تو سب جانتائے... بول۔ آخری بار پوچھتاؤں۔ ہڈی سے گوش الگ کر دوں گا۔ یہ سمجھ لے، تیری تو...“

میں نے گڑگڑا کے کہا، ”استاد! ایمان سے مجھے نہیں پتا۔“

سگ گادھاڑنے لگا، ”بکتا ہے، بکو اس کرتا ہے... تیری تو!....“

”قسم آلا کی! کچھ نہیں پتا۔“

”جھوٹا ہے... سوری کے بھینی!“

”نہیں نہیں ایمان سے استاد! مجھے نہیں پتا... قسم سے...“ مصیبت کی اس گھڑی میں

مجھے جتنی قسمیں یاد تھیں، وہ دُہرا دیں۔ اس کی خوشامد کرتا ہاتھ پاؤں جوڑتا میں پلنگ سے نیچے آگرا تھا۔

سگ گے نے ”ہا آ“ کا نعرہ مارتے ہوئے سامنے پڑی کرسی کو لات ماری، کرسی جیسے اڑ کے میری پیٹھ پر آگری۔ مجھے کوئی خاص چوٹ نہ آئی مگر اس بار میں نے نائک کیا اور بڑی بھیانک چیخ ماری۔

اس کے ساتھ ہی باہر کا دروازہ تھوڑا سا کھلا۔ عورت نے تیز سرگوشی میں اُس سے کہا، ”اڑے او! ٹھیر جا۔ کھبرے کون آرہا ہے؟ جرا آ کے دیکھ۔“ کوئی آرہا تھا شاید، میری جان بچ گئی تھی۔

سگ گے نے اس مداخلت پر بھی عورت کو گالی دی پھر بولا، ”تو ادھری ہے؟ اُجن گئی نہیں؟“

عورت نے تشویش سے کہا، ”اڑے دیکھ نا! میرے کو ہوری کصہ لگتا ہیں۔“ سگ گے نے ایک بار میری طرف لال آنکھوں سا دیکھا پھر وہ باہر چلا گیا۔ عورت رستہ چھوڑ کے ہٹ گئی تھی۔ اس وقت مجھے وہم سے ہوا کہ جیسے اس بد معاش نے عورت سے آہستہ سے کچھ کہا ہے اور عورت نے دھیرے سے جواب بھی دیا ہے۔

وہ ذرا سا دروازہ کھول تیزی سے اندر آگئی۔ پہلے کی طرح اُس نے اپنی چابی سے دروازہ بند کیا، جھپٹ کے میری طرف آئی اور برابر ہی فرش پہ بیٹھ گئی۔ اپنے ہاتھوں میں میرے ہاتھ لے کر اُس نے مجھے فرش سے اٹھایا، بستر پر بٹھایا، منہ سے افسوس کی آوازیں نکالتے ہوئے کہنے لگی، ”بڑا کسائی ہیں سگ گے۔ تو کائے کو اپنی جان کھرا ب کرتا ہیں؟ سگ گے جو بھی پوچھتا ہیں، بتا دے۔ چریا نہیں بن۔“

میں نے دل میں کہا کہ دیکھا؟ وہی پرانی ترکیب ہے۔ وہ سالامار پیٹ کرے گا، یہ میری ہمدرد بن کے سمجھائے گی۔ میں اگر مار دھاڑ سے ٹوٹ گیا تو ٹھیک ہے، نہیں تو عورت

کی ہمدردی سے پکھل ہی جاؤں گا۔

وہ گیلاتولہ لے آئی، میرے برابر بستر پر بیٹھ گئی، بولی، ”اپنے ہاتھ اوپر اٹھا۔“
پھر ایک ہی جھٹکے سے میری قمیص اتار اس نے فرش پر گرا دی اور میرے سر، پیٹھ اور بازوؤں پر تولیے سے آہستہ آہستہ ٹکور کرنے لگی، کچھ ہمدردی میں بڑبڑاتی بھی جاتی تھی۔ سر اور پیٹھ کی کھال پھٹ کے خون جھلک آیا ہوگا، شاید اسی لیے بدن صاف کرتے وہ مجھ سے تولیہ چھپا رہی تھی۔ کچھ دیر بعد کہنے لگی کہ پھٹکری لاتی ہوں اس سے جلدی اچھا ہو جائے گا۔ جاتے جاتے وہ ایک بار اور مشورہ دے گئی کہ سگ گے کے ”جلم“ سے بچنے کی یہی صورت ہے کہ وہ حرام کا جو بھی پوچھ رہا ہے، میں بتا دوں۔

دروازے کو چابی سے بند کر کے وہ پھر چلی گئی، میں نڈھال ہو کے پڑ گیا۔
کافی دیر بعد آئی تو بہت سی چیزیں ساتھ لائی تھی، کھانے پینے کی، مرہم پٹی کی اور کپڑے، چادر تکیے بھی۔

وہ آئی تو بہت چونچال ہو رہی تھی، گنگنا رہی تھی، کہنے لگی، ”سگ گے کوں آدمی بلا لے گئے ہیں۔ ابی وہ رات سے پہلے نہیں آئیں گا۔“
میں کیا کہتا، اسے سامان لا لا کے رکھتے دیکھتا رہا۔ سب سامان لا کے اس نے دروازہ پھر چابی سے بند کر دیا تو مجھے خیال آیا کہ جتنی دیر میں عورت نے چوکھٹ پر رکھا سامان اندر پہنچایا اور دروازہ بند کیا اتنی دیر میں تو میں دو مرتبہ نکل کے بھاگ سکتا تھا... مگر میں بیٹھا اس کی شکل دیکھتا رہا۔ کیسی نادانی ہوئی مجھ سے۔ عورت نے بتایا تھا کہ بھینسا موجود نہیں ہے تو میں اسے دھکا دے کے نکل کیوں نہ گیا۔

وہ ایک برتن میں گرم پانی لائی تھی اور پھٹکری کا ایک ٹکڑا، پھر اس نے ہاتھ پکڑ کے مجھے غسل خانے کی چوکھٹ پر بٹھا دیا اور گرم تولیے سے میرا سر، پیٹھ بازو اور سینہ پونچھتی اور پھٹکری ملتی رہی۔ زخموں میں آگ سی لگی تو میں نے چیخا بکارنا شروع کر دیا۔ وہ لونگ کی خوش بو میں ہنستی، چمکارتی اور ڈانٹتی رہی۔ جتنی دیر اس نے غسل خانے کی چوکھٹ پہ بٹھائے رکھا، مجھے لگا میں گرم خواب میں دیکھے کسی بھاپ دیتے جنگل سے گزر رہا ہوں... یاد ہیں کہیں رکا ہوا ہوں۔ اور میں نے یہ بھی عجب سی بات سوچی کہ سستے صابن کی مہک میں بے اس مصروف بدن کی آگ میں اور ٹھیکرے پر پکائی باجرے کی تازہ روٹی میں شاید ایک سا ”مٹی پن“... ایک

سی حرارت ہوتی ہوگی... تو مجھے بھوک لگنے لگی پھر جب کام کی مصروفیت میں عورت کا چہرہ میرے بہت قریب آ کے ہٹنے والا تھا میں نے دھیرے سے کہا، ”سنو! بھوک لگ رہی ہے مجھے۔“ وہ بالکل میری پتلیوں سے پتلیاں ملا کے ہنسی یا شاید ایک جنگل سے ہنستے ہوئے گزری تو کہتی گئی، ”میرے کو کھبر ہیں تو بھوکھا ہیں... بھوکھے!“

وہ غسل خانے کی چوکھٹ سے بستر تک مجھے سہارا دیتی ہوئی لائی۔ میرے لیے اپنے پیروں چل کر آنا مشکل تھا۔ یہ شاید تکلیف کے بعد بدن کو پہنچنے والی راحت اور آسائش تھی یا کسی ادھ کچرے قرب کے تجربے نے مجھے ہلکان کر دیا تھا۔

عورت نے خشک کپڑے سے میرا بدن پونچھا۔ میں چیختا، حلق پھاڑ کے بنکارتا رہا مگر وہ روئی کے پھاہے آيوڈین میں تر کر کے میرے سر، پشت، بازوؤں اور سینے پر آگ لگاتی رہی اور باز نہ آئی۔ ایک بار میں نے اپنی تکلیف میں اسے گالی نکالی تو جواب میں اُس نے اس سے بھاری گالی دے کر میری کمر پہ دھول جمائی، بولی، ”بوہوت ہی اتر اگیا ہیں، سوری کے! تو سگ گانئیں ہے جے میں تیری گال سن لوں گی... ہاں!“

میں سمجھ گیا۔ سگ گے کی دھونس دھڑی، گالی گلوچ اور شاید مار پیٹ اور اس کے جواب میں عورت کی طرف سے ایک طرح کی حقارت کے ہوتے بھی وہ اس بھینسے کی گرفتار تھی۔ یہ بات اُس کے ایک فقرے ہی سے معلوم ہو گئی تھی۔

اُس نے کوئی مرہم اور پاؤڈر لگایا، مجھے دھلا ہوا کرتہ اور لنگی پہننے کو دی، بولی، ”ابی تو وری اندر جا... یہ پیر لے۔“

میں غسل خانے میں گیا۔ کچے فرش پر اونچے پایوں والی چوکی پڑی تھی۔ پیٹ اُتارنے، لنگی پہننے کے دوران میں چوکی پہ ڈگمگا گیا۔ دیر تک سوچتا رہا کیسے بدلوں؟ کھڑے ہو کے بدلا نہیں جا رہا، چوکی سے کہیں گر نہ جاؤں۔ یہاں بیٹھنے کی کوئی صورت ہی نہیں۔ مجھے دیر ہوئی تو عورت نے ہنستی ہوئی آواز میں پکار کے کہا، ”کیا سوں گیا؟ جے نہیں سبج آرئی تو ہم آ کے پیرا دیوے؟“

کھانے کی بہت سی چیزیں دے کر وہ میرے کپڑے دھونے غسل خانے میں گھس گئی۔ میں خود اپنے کام کیا کرتا تھا۔ اب کوئی دوسرا میرے کام کر رہا تھا۔ یہ میرے لیے نئی بات تھی۔ اس نے کپڑے دھو کے وہیں پھیلا دیے۔ میں کھانا ختم کر رہا تھا تو پوچھنے لگی کہ تو اتنا

کم کیوں کھاتا ہے؟ پھر بولی، ”کھانا کے ساں لگا تیرے کوں؟“
میں نے کہا، ”اچھا ہے۔“

ہنس کے بولی، ”سگ گے نے بنایا تھاں۔ راتی کھانا بنا کے، گھد کھا کے... میرے کو کھلا کے... اپنا ہاتھ سے کھلا کے، نیلے میں چلا گیا تھاں...“

یہ سن کے کہ وہ کھانا اس سالے وارداتی نے بنایا تھا، میرا جی متلا گیا۔

میرا منہ بن گیا ہوگا جس پہ عورت کھلکھلا کے ہنس پڑی۔

دن کا تیسرا پہر تھا۔ اس نے میری طرف ایک چادر اچھال دی، بولی، ”اب سوں

جا۔ رات کے ٹیم سگ گا آئیں گا، جی سونے نہیں ملیں گا تیرے کوں۔“

اپنی اتنی مہربانیوں کے بعد وہ مجھے اس حرام خور سے ڈرا رہی تھی۔

میں لیٹ گیا۔ وہ دروازہ بند کر کے چابی گھما کے چلی گئی۔ بہت دیر پڑا میں سوچتا رہا

کہ جنھوں نے مجھے اٹھایا ہے، یہاں رکھا ہے اور برابر پوچھے جا رہے ہیں، انھیں خوب پتا ہے

کہ وہ کیا کر رہے ہیں اور وقت بھی بہت ہے ان کے پاس... وہ بہت سے لوگ ہوں گے۔ سبھی

ایک دوسرے کو خوب سمجھتے ہوں گے۔ اک دوسرے کا ہاتھ بٹا رہے ہیں وہ... تجربہ کار بھی

ہوں گے۔ میرا یہ ہے کہ اکیلا ہوں۔ ہمدرد میرے اگر کہیں ہوں گے بھی تو انھیں میری حالت

کی خبر نہیں۔ اس خدائی خوار جگہ کا پتا بھی نہیں معلوم ہوگا کسی کو۔

نہ معلوم کب میں سو گیا۔

آنکھ کھلی تو احساس ہوا کہ میرے برابر کوئی لیٹا ہے۔ میں نے سر گھما کے دیکھا، وہ

میری طرف ہی دیکھ رہی تھی۔ ہنس پڑی، بولی، ”ڈر گیا تم؟“

میں نے کہا، ”نہیں تو۔“

بولی، ”ابھی نہیں... جی ہم لوگ آیا تھاں۔ تو سوتے میں ڈرتا تھاں۔“

”لوگ؟... کیا وہ حرامی بھی نہا بھی آ کے گیا ہے؟“

میں نے پوچھا تو کہنے لگی، ”سگ گانئیں۔ ہم آئی تھیں، چھو کرا آیا تھاں چالے

کے۔ تو سوتے میں ڈرتا تھاں۔ ہم اداری لیٹ گئیں“

وہ اسی طرح کچھ دیر دھیمے دھیمے باتیں کرتی رہی۔ کسی خاص معاملے میں نہیں، بس

ادھر ادھر کی باتیں کہ اس نے مرغیاں پالی ہوئی ہیں، ایک دو بکریاں بھی ہیں۔ اس طرف پانی

کا ٹوٹا رہتا ہے، ٹھیک سے بارشیں ہی نہیں ہوتیں... اسے بھوبھل میں دبائی شکر قندی اچھی لگتی ہے۔ کیا مجھے بھی اچھی لگتی ہے شکر قندی؟

لڑکا دوبارہ چائے کا چھینکا لے کے آگیا۔ اس نے باہر سے ”بھین“ کہہ کے آواز دی تھی۔ عورت نے اٹھ کے اپنی چابی سے دروازہ کھولا، لڑکا چائے رکھ کے چلا گیا۔ ہم دونوں نے چائے پی لی۔ جس کے بعد وہ چلی گئی۔ میں پھر سو گیا۔

رات میں کسی وقت سگ گآ آیا۔ مجھے کھڑا گھورتا رہا۔ صرف دھمکا کے چلا گیا۔ بہت رات میں عورت آئی۔ وہ میرے لیے پیتا اور باجرے کی میٹھی روٹیاں لائی تھی۔ میں نے تھوڑی تھوڑی دونوں چیزیں کھائیں۔ اس سے کوئی بات نہ کی۔ وہ چابی گھما کے چلی گئی۔

دوسرے دن سویرے ہی بھینسا آن مرا اور وہی سب باتیں پوچھتا رہا۔ میں نے ویسا ہی کہہ دیا کہ مجھے کچھ نہیں معلوم مگر اسے یقین نہیں آیا۔ آج وہ پتلا سا بید لایا تھا۔ مجھے کھڑے سے کولھوں پر مار مار کے بیسیوں گالیاں دے کے آخر کار وہ چلا گیا اور کہہ گیا کہ سورے! اس ٹیم جلدی میں ہوں۔ ابھی آ کے تیری کھال اتاروں گا۔ مگر وہ سارے دن نہ آیا۔ میں خوف اور انتظار میں ہر آہٹ پہ چونک چونک پڑتا تھا۔

اب ایک طرح کا ڈھراسا بن گیا تھا۔ اگر سگ گا دن میں پوچھ گچھ کر کے مار لگا کے جاتا تو رات میں اس کی عورت میری دیکھ بھال کو آ جاتی۔ وہ اگر رات میں آتا تو عورت دن میں میرے ساتھ رہتی۔ جب بھی آتی، کھانے کو ضرور کچھ نہ کچھ لاتی، چوٹوں پہ آیوڈین کا منکچر لگاتی، ایسپرین کی گولیاں دیتی۔ نم تو لیے سے بدن پونچھتی، پاؤڈر لگاتی۔ بستر پہ میرے برابر بیٹھی رہتی، لیٹ جاتی۔ میرا سر دبائے لگتی۔ کچھ بھی سمجھانا اس نے کم کر دیا تھا۔ وہ جان گئی ہوگی کہ یا تو میں سچ بول رہا ہوں اور پوچھے جانے والی باتیں مجھے نہیں معلوم یا میں بہت پکا ہوں۔ اس طرح قابو نہیں آؤں گا۔

ایک دن وہ نہیں آئی، رات میں بھی نہیں آئی۔ کافی رات گئے بھینسا خوب شراب پی کے آیا۔ اس نے چاقو نکال لیا، بولا، ”تو قبولے، نہیں قبولے آج میں تیری زبان کاٹ کے نیلے میں تجھے ننگا کر کے چھوڑ دوں گا۔ چار دن تک تیری جان نہیں نکلے گی بھینی یے!... تو مرے گا نہیں پر بچے گا بھی نہیں۔ جنگل کی بڑی کیڑیاں تیرے ساتھ ساتھ رہیں گے۔ چار دن

میں کاٹ کاٹ کے ختم کر دیں گی... سمجھا اوئے مادرِ بختہ!؟“

اس کی آنکھوں سے ہی لگ رہا تھا کہ یہ جنونی جو کہہ رہا ہے کر گزرے گا۔

اس نے کھٹکے والا چاقو کڑکڑا کے کھولا اور میری طرف جھپٹا۔ میں کود کے پلنگ کے دوسری طرف چلا گیا۔ وہ بکتا، غراتا، نشے میں براتا، لڑکھڑاتا بستر پہ چڑھ گیا۔ لمبا تڑنگا وہ تھا ہی، اس پر اوپر چڑھا ہوا تھا۔ لگتا تھا کوئی دیو مجھ پر حملہ کرتا ہے۔ میں سمجھ گیا اس وقت یہ دھمکا نہیں رہا، اپنے حواسوں میں نہیں ہے، بے دریغ مار دے گا۔ اس نے بستر پر کھڑے کھڑے ذرا جھک کے ایک بار چاقو کا ہاتھ چلایا۔ میں چیختا ہوا پلنگ کے نیچے گھس گیا۔ سگ گے نے جھانک کے دیکھا، چاقو کا ایک اور ہاتھ چلایا۔ اس کی پہنچ سے میں ابھی دُور تھا۔ وہ پھرے ہوئے کٹیلے کی طرح چاروں ہاتھ پیروں سے چلتا بہت مشکل سے پلنگ کے نیچے گھسا۔ پوری طرح آیا بھی نہ تھا کہ میں نے بچاؤ میں لات چلائی جو نہ معلوم کیسے اس کی ناک پہ جم کے لگی۔ بھینسا تکلیف میں ڈکراتا ہوا کھڑا ہونے لگا، اس کی ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ بس اب خاتمہ ہے میرا۔ جنونی غصے، شراب کے نشے اور ناک کی تازہ چوٹ سے بے قابو ہو کے اس نے بھاری دیہاتی پلنگ کو... اٹھالیا تھا اور اب وہ چاقو لہراتا، پلنگ کو اپنی گردن پر لیے اٹھ کے کھڑا ہو رہا تھا۔ پلنگ بھینسے کی پیٹھ سے پھسلتا بڑی آواز کے ساتھ کرسیوں پر گر... کرسیاں ٹوٹیں، اسے بھی چوٹ آئی پھر بھی وہ بڑھا۔ میں نے کہا لے بھئی گئے... ایک ذرا سی امید بچنے کی نکل سکتی تھی اگر وہ ہوش میں ہوتا، مجھ سے کچھ بھی پوچھ رہا ہوتا، میں اس انتہا کو پہنچ گیا تھا کہ بلاتاً مل بتا دیتا؛ مگر سگ کا کچھ بھی سننے سمجھنے کی سرحد پار کر چکا تھا اور وہ میری طرف برابر بڑھ رہا تھا۔

گھرے ہوئے جانور کی طرح میں نے ادھر ادھر دیکھا... کیا کروں؟ کہاں جاؤں؟ جب اُمید بالکل ہی ختم ہو چکی تو ایک روزن روشنی کا بیدار ہوا۔ غسل خانہ! اس کا دروازہ کچھ کم زور ہوگا مگر کچھ دیر کے لیے وہ جگہ میری پناہ گاہ بن سکتی تھی۔ میں جھپٹ کے اندر پہنچا اور کنڈی لگالی۔

سگ گے نے کسی کرسی کا یا پلنگ کا ٹوٹا ہوا حصہ غسل خانے کے دروازے پر جم جم کے مارنا شروع کر دیا۔ اس دیوانگی میں بھی وہ جانتا تھا کہ دروازہ کم زور ہے، آسانی سے ٹوٹ جائے گا۔ اس نے گالی دے کے کہا تھا کہ ایک منٹ کی بات ہے پھر میں تیرا قیمہ کر دوں گا۔ میں نے دہشت میں مسلسل چیخنا شروع کر دیا تھا۔ میں نے شاید عورت سے بھی فریاد کی ہوگی۔

جب دروازہ ٹوٹنے کو تھا سگ گے کی بکواس کچھ دھیمی ہوئی، پھر بند ہو گئی۔ جو لکڑی وہ دروازے پر برسائے جا رہا تھا اس نے پھینک دی اور چلا گیا۔

میں نے تختوں کی جھری سے ڈرتے ڈرتے کچھ دیکھنے کی کوشش کی۔ لالین کی دھندلی روشنی میں یوں لگا جیسے عورت کمرے میں آ گئی ہے۔ ادھر ادھر سناٹا رہا۔ میں اندر بیٹھا لرزتا رہا۔ وہ بھینسے کو نکال لے گئی تھی۔ کچھ دیر بعد لوٹ کے آئی تو دروازہ بجانے لگی اور نرمی سے سمجھانے لگی کہ آ جا کوئی خطرہ نہیں ہے، تبھی میں غسل خانے سے باہر آیا۔

عورت سچی فکر میں میری طرف بڑھی۔ میں شاید روتا ہوا غسل خانے سے نکلا تھا جو اس نے بڑھ کے کولی بھری۔ وہ مجھے بازوؤں میں لے کر ٹوٹے ہوئے پلنگ پہ ٹک گئی۔ نیند سے اٹھ کے آئی تھی تو اس کی آواز میں، لباس اور بدن کی مہک میں وہی خمار بسا ہوا تھا۔

عجیب سی بات ہے، میں نے سوچا، اگر میں... میرا بدن... اس کی موجودگی اس طرح محسوس کر رہا ہے تو میں رو کیوں رہا ہوں؟ شرم کی بات ہے۔ میں نے خود کو سنبھالا، حوصلے سے اس کی طرف دیکھا، وہ مسکرانے لگی۔ مجھے لگا وہ کسی برابر والے کی طرح... عورت کی طرح مسکرا رہی ہے پھر اس نے لونگ کے مہکتے ہوئے کنج سے مجھے پکارا، اور پوچھا، ”تو صبی ہے؟ چوٹ چھیڑتے نہیں کھائی تو نے؟“

”نہیں۔“

میرے بالوں میں انگلیاں دوڑائیں اس نے، ”ایسا کے ساں ہو گیاں؟ سگ گا کائے کوں اتا سور کرتا تھاں؟“

اس نے اتنی درد مندی، ایسی اپنائیت سے یہ بات پوچھی تھی کہ میں گڑ بڑا گیا، سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کروں۔ بس میں نے سگ گے کی دھمکی کو اپنے لفظوں میں دہرا دیا۔ میں نے کہا، ”سگ گا کہتا تھا، ”زبان کاٹ دوں گا... ننگا کرتا تھا... بولتا تھا جنگل میں...“

میں نے بے ڈھنگے پن سے جو بات کہی تھی نہ معلوم کیسے اس عورت تک وہ اور زیادہ نامعقول ہو کے پہنچی۔ اس نے جلدی میں میری کہی ہوئی بات دہرائی، ”تیرا کپڑا اتارتا تھاں سگ گاں؟ ننگا کرتا تھاں؟“

وہ غلط سمجھ رہی تھی اور میں اس کے پہلو سے لگا بیٹھا تھا۔ دھڑک رہا تھا اس کے ساتھ... اس کا نیند میں پگھلا ہوا بدن یک لخت کسی ساز کے کسے ہوئے تار کی طرح تن گیا اور

اب اس کی آواز میں مجھے ریگستانی کٹیوں کی جھلّا ہٹ سنائی دی... ”بول کپڑا اتارتا تھا؟“ میں نے سوچا یہ عجیب ہوا!... اور خوب ہوا... دماغ میں کہیں کوئی سرخ بتی جل اٹھی تھی۔ مگر یہ بات... میں نے خود سے پوچھا... یہ بات جو اس عورت نے غلط سمجھ لی ہے ایک مرد کے لیے... جو کہ میں ہوں... کیا بہت ہی شرم کی بات نہیں ہے؟... بالکل ہے... تو پھر؟ میں نے دل میں کہا، ایک عورت کو... نہیں، اس عورت کو... یوں نہیں سمجھنا چاہیے۔ میرے مرد نے اکسایا، اصرار کیا، شور مچایا کہ اس غلط بات کو ٹھیک کرو... میں انکار میں سر ہلاتے ہوئے ”نہ“ کہنے ہی والا تھا لیکن دماغ میں وہ سرخ بتی برابر جلے جا رہی تھی۔ بچنے کا کوئی بھھاؤ دے رہی تھی۔

عورت نے مادہ چیتے کی طرح اپنے پنجوں میں الجھا ہوا وہی سوال جیسے کہ وار کرتے ہوئے پھر میری طرف پھینکا، ”بتانا! ہاں؟ بول! کیا ایسے ساں بولتا تھا؟ کپڑے اتار بولتا تھاں سگ گا؟“

میں نے سر جھکا لیا۔ کہہ دے... یہ کٹ جائے گی اس سالے سے... ہٹ جائے گی... کہہ دے، کہہ دے، کہہ دے تو آہستہ سے میں نے کہا، ”ہاں۔ ایسا ہی بولتا تھا۔“ وہ مجھے چھوڑ کے ایسے اٹھی جیسے چڑھی ہوئی کمان سے تیر چھوٹا ہے۔ پوری طاقت لگا کے میں نے... ہاتھ کھینچ کے اسے بٹھالیا، ”وہ پاگل ہو رہا ہے، مت جا... مار دے گا تجھے۔“ وہ گہری گہری سانس لیتی ہوئی کچھ کہہ رہی تھی۔ میں نے گلے میں بانہہ ڈال کے اسے اور دھیمہ کیا۔ دانتوں پہ دانت جما کے کہنے لگی، ”میرے کوں پہلے ہی سک ہو یا تھاں...“ فوری چالاکی سے میں نے سمجھایا، ”سنو! ابھی اس کی کھوپڑی میں کچھ نہیں بیٹھے گا۔ سویرے نشہ اتر جائے گا پھر کہنا، اُس وقت بات سمجھے گا تیری۔“

کہنے لگی، ”میرے کوں بات نہیں سمجھانی... میں... میں تاپیٹ پھاڑ دیاں گی بھینی کا۔“ عورت کے بے قابو غصے کو میں اپنے فائدے کے لیے استعمال کر چکا تھا۔

اسے پہلے سے کچھ شک تھا اور وہ اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ یہاں رہتی تھی۔ اس بے پیر، منا حوس جانور اس لڑکے ستانے والے کو وہ کھلا کیسے چھوڑ سکتی تھی؟ ابھی دوڑا دے گی اسے... ہٹا دے گی اپنے گھر سے اس بیماری کو؟ اور جو وہ نہیں گیا؟ گڑ بڑی کی اس نے؟... تو وہ ٹوکا مار کے پیٹ پھاڑ دے گی بھینی کا... وہ میری طرف گھوم گئی، ”تو جا۔ اب بی نکل جا میں

تیرے کو رستہ بتاتی آں... اٹھ!

اور اس نے غصے میں لرزتے ہوئے کمرے کا تالا کھول دیا۔ رستہ سمجھانے لگی کہ آگے سے تو اس طرح نیلے میں چلا جانا۔ ”رستے میں ایک منٹی کو نہیں رکنا۔ لے دیر مت کر... جا۔“

میں وہاں سے نکل آیا اور اب میں اس کے نیلے میں نہیں، اپنے جنگل میں ہوں اور اسے یاد کرتا ہوں... کتنے ہی برس گزر گئے۔ اب بھی وہ مجھے اسی طرح یاد ہے۔ بالکل اسی طرح یاد ہے وہ مجھے۔

وہ پہلی عورت تھی جسے میں نے عورت کی طرح دیکھا اور اپنے خون میں دریافت کیا تھا اور جسے یاد کر کے میں رویا ہوں اور خود سے یہ عہد کیا ہے میں نے کہ ایک بار اس کے پاس جاؤں گا ضرور۔ چاہے کچھ ہو جائے جاؤں گا ضرور اور اس سے کہوں گا کہ نہیں ری، سگ گا میرے کپڑے نہیں اتارتا تھا۔ وہ سب جھوٹ تھا۔

یہ ذلت کی بات میں اس کے ذہن سے نکال دوں گا۔
آپ کو تو پتا ہے یہ جھوٹ ہے۔



تکڑوں میں کھی گئی کھانی

پہلی اشاعت: ۲۰۰۶ء

فہرست

۶۳۷	پہلا حصہ: ا کے بیان میں
۶۴۶	دوسرا حصہ: اکا زر
۶۵۵	تیسرا حصہ: بو پٹکی بی بی سکینہ سے شروع ہوتا ہے
۶۷۸	چوتھا حصہ: بارے کوٹھوں کا کچھ بیاں ہو جائے
۶۸۹	پانچواں حصہ: جس میں 'جینی رل' فرانکو آتا ہے
۷۰۵	چھٹا حصہ: کیوں کہ نورسی سے پیار کرتا ہے پیدرو
۷۳۰	ساتواں حصہ: تورے مالینوس

پہلا حصہ 'لا' کے بیان میں

برادرِ م! دعائیں۔

دو مصرعے سناتا ہوں تمہیں۔ بلکہ ڈیڑھ مصرع۔ ایک اردو کا، جو غالب نے کہا۔ دوسرا فارسی کا آدھا مصرع قرۃ العین طاہرہ کا کہا ہوا۔ یہاں ان دو بہت بڑے شاعروں نے آوازوں کو اتنا appropriate، اس قدر کھول کے، اتنا ڈوب کے بیان کیا ہے کہ خدا کی قسم لفظوں میں بتائی گئی آوازیں کانوں میں سنائی دینے لگتی ہیں۔ بالکل صاف۔ رونگٹے کھڑے کر دینے والی وضاحت کے ساتھ۔ اس اردو مصرعے اور اس فارسی ٹکڑے کو سنائے میں پندرہ پندرہ بیس بیس بار لگاتار دہرا کے دیکھا ہے میں نے۔ جس طرح وہ شاعر اور وہ شاعرہ سنانا چاہتے ہوں گے، سنائی دینے لگتا ہے۔

تم سوچتے ہو گے ابھی تک بھائی کی تمہید چل رہی ہے۔

لو سنو۔ غالب کا مصرع ہے آشیاں گم کردہ طائروں کی آواز پر کہ:

نوائے طائران آشیاں گم کردہ آتی ہے

اے بھائی! میں نے گم ہوئے ٹھکانوں اور رفیقوں کو تلاش کرتے پرندوں کی

پکار سنی ہے۔ اللہ جانتا ہے یہ آواز دل نکال لیتی ہے۔

ایک نسبتاً چھوٹے شہر میں ہوش سنبھالا مگر دیہات نے میری حیات کی تربیت

کی ہے۔ یہاں بھی، وہاں بھی۔

یہاں منگھوپیر روڈ پر حسرت موہانی کالونی میں ایک جھگی میں رہتا تھا میں، اپنی ایک خالہ کے ساتھ۔ وہ بارشوں کے برس تھے۔ سال ستاون کہ چھپن ہوگا۔ بارش سیدھی جھگی میں چلی آتی تھی اور کیوں کہ چٹائی کی چھت کے نیچے بھگنے میں کوئی مزہ نہیں تھا؛ اس لیے میں اپنے ہاتھ کی بنائی میز پر، اپنی کتابوں کو اچھی طرح ترپال ڈھک کے، خود بھگتا ہوا اور گاتا ہوا کالونی کے پیچھے والی marshy land میں نکل جاتا تھا۔ یہ دلدلی زمینیں؛ ویرانوں، ہرے میدانوں، کھائیوں، نالوں سے ہوتی اپنے سمندر تک پہنچ جاتی تھیں (جو بہت ہی قریب لگتا تھا کیوں کہ اس وقت تو اپنے پچھواڑے کا ذاتی pond تھا سمندر)۔

وہاں تک اس راستے سے کبھی گیا تو نہیں میں؛ لیکن نمکین پانیوں کی مہک مجھے برابر بلاتی رہتی تھی۔ میں دو تین میل جا کر لوٹ آتا تھا۔ اچھی طرح شرابور اور بہت خوش۔ اس طرف آبادی کم ہی تھی کہ شاید تھی ہی نہیں۔ رستہ بھولے ہوئے آوارہ کتے اور گیدڑ اور لومڑی اور چڑیاں، کبھی کبھی کوئی اکیلا خرگوش، میلا میلا سا، اور وہی بہت سی چڑیاں جن میں ٹیڑی، مینا، فاختہ، ہد ہد سبھی ہوتے۔ میں نے انھیں بارشوں سے پہلے اور اس کے بعد دھوپ نکلنے پر نہال ہوہو کے اپنے پر سکھاتے دیکھا ہے۔ یہاں اس mega-polis کے back waters میں۔

شہر کے وہ پرندے اور وہ بارشیں یاد ہیں مجھے۔ اپنی ڈاروں سے پچھڑی ہوئی مرغابیاں اور کونجیں جو آسمان میں سنسناتی ہوئی کڑلاتی اور کسی جاں کاہ جدائی میں چیخ مارتی تھیں۔ یہاں نیچے لگتا تھا کہ کوئی دل مٹھی میں لے کے مسل رہا ہے۔

اور لڑکپن میں، میں نے اپنے تال کے کنارے بے تابی میں پکارتا ایک اکیلا ہنس دیکھا تھا۔ دو دن تک وہ چیختا رہا۔ آبی گھاسوں میں سے گزرتا، پانی پر نیچے نیچے اڑتا، اتھلے جل میں ٹھیرتا، اڈیکتا، پھر پکارتا ہوا وہ اڑ جاتا۔ تیسرے دن وہ مر گیا۔ یا شاید مار دیا کسی نے۔ میں نے تال کے مچھروں سے پوچھا کہنے لگے کسی نے رحم کھا کے مار دیا ہوگا، نہیں تو سنا ہے، ہنس سات سات دن لگا دیتا ہے۔ اپنے جوڑے کو یاد کر کے چیختا اور انگل انگل ڈوبتا ہے پھر کہیں جا کے مرتا ہے۔ سارا جنگل بھر دیتا ہے اپنے دکھ سے۔

طائر آشیاں گم کردہ

اس طرح کی آشیاں گم شدگی کو میں نے پچاس کی دہائی میں خود بھی جھیلا ہے۔ تو شاید اسی لیے اس آواز کو، اس اڈیکے کو سمجھتا ہوں۔ اسی لیے اتنے برس اس پکھلتے پکھلاتے ہوئے مصرعے کو جان سے لگا کے رکھا ہے میں نے۔

اب وہ دوسرا مصرع... یا مصرعے کا جزو سنو۔ بڑی پر ہیبت فضا میں کہا گیا ہوگا وہ۔ غالب کا مصرع تو ایک گھلاوٹ کے ساتھ اپنی بات کہتا گزرا ہے۔ قرۃ العین طاہرہ کے لفظ ایک گہری اود بہت بھیا تک Nothingness کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ نہ، نہ، اشارہ نہیں کرتے، بلاتے ہیں۔ ایک بالکل خالی، چیزوں سے اور آوازوں سے اور روشنی اور خیال کی دسترس سے دور بالکل خالی کسی کائنات میں بلارہے ہیں وہ لفظ۔ ایک ایسی جگہ جو کہ فی الحقیقت کوئی جگہ نہیں۔

یعنی یہ لفظ ایک لامکانی، لازمانی، بے وجودی سے اور معدوم وقت اور عدم وجود سے ہمارا تعارف کراتے ہیں، قرۃ العین طاہرہ کے یہ گنتی کے لفظ۔

پہلے تم پورا شعر سنو پھر اس ٹکڑے تک آنا اچھا لگے گا:

تو کہ فلس ماہی حیرتی چہ زنی ز بحر وجود دم
بنشیں چو طوطی و دمبدم بشنو خروش نہنگ لا

وجود کے اس بے کنار سمندر میں کیا کوئی دم مار سکے گا جو تو اپنے ہونے پر اصرار کرتا ہے اور کہے جاتا ہے کہ ہوں، میں ہوں۔ یہ سمجھ لے کہ عالم حیرت کی ڈولتی پھرتی حقیر سی کوئی مچھلی ہے جس کا گویا بے حیثیت فلس ہے تو (یعنی پوست یا scale) اس لیے بے عقل طوطی کی طرح چپ کر کے (جتنا بیٹھنا ملا ہے) اپنے ٹھیسے پر بیٹھا رہ اور لحظہ لحظہ عدم کے (یعنی لا کے) monster کی دھاڑ سنتا جا۔ بھلا سن تو یہ دھاڑ ہر طرف سے سنائی دے رہی ہے (تو کیا ایسا نہیں ہے کہ یہ نہنگ تجھے اپنے شکم میں اتار بھی چکا...؟)

...دمبدم بشنو خروش نہنگ 'لا'۔ اس لیے بس یہ دھاڑ سنو جو عدم کی لازمانی، لامکانی، بے وجودی سے بے رکے چلی آرہی ہے۔ جو کسی کو کبھی کبھی اور بعضوں کو برابر سنائی دی ہے۔ تو یہ واقفان حال کے لیے کیسی بھیا تک بات ہے اور کیا بے آسرا پن ہے! (اپنے جون نے بھی تو کہا ہے کہ: بہت بے آسرا پن ہے، سو چپ رہ)

قرۃ العین زریں تاج شاید وجود کے جوہر (Essence) کو تلاش کرنے والوں اور منبع تک پہنچنے کی سعی کرنے والوں میں سے تھی۔ کیا خبر وہ کہیں تک پہنچ پائی یا نہیں۔ ہاں ”لا“ کی دہشت کو اس نے گنتی کے لفظوں میں ہم تک ضرور پہنچا دیا۔ کہ دم بہ دم بشنو خروش نہنگ لا۔

اس ٹکڑے کا ماحول خالص فکری ہے۔ یہ کسی مجرد مقصود (Abstract Quest) کی طرف اشارہ کرتا ہے (جسے ہرگز ہرگز میں سمجھنا نہیں چاہتا) یہ صوفیوں کا اور صاحبان حال کا مطلوب و مقصود ہے۔ میں تو حیات کے حوالے سے چیزوں کو جانتا ہوں اور اس پر خوش ہوں۔ انھیں اسی طرح جانتے رہنا چاہتا ہوں میں۔ تجرید میں اترنے سے جی اُچاٹ ہو گیا ہے۔ تاہم اپنی حیات کے حوالے سے ”لا“ کا ادراک میں نے کچھ دو مرتبہ کیا ہے۔ ایک بار جب میں پندرہ سولہ برس کا تھا اور دوسری بار ابھی دو ہفتے پہلے، سن دو ہزار کے جون مہینے میں۔

پہلی بار میں اپنے سے بڑے کزن کے ساتھ جنگل میں بھٹکتا ہوا پندرہ بیس منٹ کو بالکل تنہا ہو گیا تھا۔ وہ کسی طرح کی physical دہشت نہیں تھی۔ نہ۔ ہرگز نہیں۔ وہ کٹیلوں کا خوف بھی نہیں تھا۔ (میرے پاس جنگل کی جانکاری اور ایک بھری ہوئی بندوق تھی)۔ تو میں نے دیکھا کہ اچانک میرے آگے کچھ نہیں ہے۔ اس وقت Nothingness کے سامنے تھا میں۔ یہ ایسا تجربہ تھا کہ میں نے آگے کے درختوں کو اور آسمان کو اور جنگل کے بے رستہ فرش کو مٹتے معدوم ہوتے دیکھا اور سناٹے کی ہوٹک ایک گرج کی طرح سنی۔ جیسے کٹیلے بے وجہ (brood کرتے ہوئے) ایک ہی تچ پر گرجتے یا غراتے ہیں تو وہ کسی طرح کی مکمل بے آوازی کا آوازہ تھا۔ جتنی دیر تک میں اس Nothing کے روبہ رو رہا اس گرج کے سوا میں نے کوئی آواز نہیں سنی۔ اپنے کزن کا پکارنا بھی نہ سن پایا میں۔ حالاں کہ وہ کہیں قریب ہی مجھے میرا نام لے کے پکار رہے تھے۔ اس واقعے کے پچاس کہ باون برس بعد مجھے یہ دوسرا تجربہ ہوا:

دو ہفتے ہوئے کہ میں تین ملکوں اسپین، پرتگال، فرانس کے دس شہروں سے ہوتا ہوا گھر لوٹ رہا تھا۔ مجھے پیرس سے آنا تھا؛ جہاں ۱۲ جون کو صبح دس بجیں پر میری فلائٹ تھی؛ جس کے لیے حد سے حد 9:40 تک مجھے چارلس ڈیگال ایئر پورٹ ٹرمینل ۲ پر

پہنچ جانا تھا۔ مگر مجھے سات منٹ کی دیر ہوگئی۔ انھوں نے بورڈنگ کارڈ نہیں دیا اور مجھے رکنا پڑا۔ پھر ۱۳ جون کو یعنی چوبیس گھنٹے بعد ہی مجھے فلائٹ مل سکی۔ لیکن میں جہاز چھوٹ جانے کی بات نہیں سنا رہا۔ ... لو میں شروع سے سناتا ہوں۔

اسپین اور پرتگال کا دورہ ہمارے ”روزی رزگار“ کا حصہ تھا۔ فرانس صرف داخلے کا ملک تھا۔ یورپی ملکوں کا ایک اتحاد ہے (شین زین) کہ آپ کسی ایک ملک کا ویزا لے لو اور بارہ چودہ ملکوں میں بنا روک ٹوک، کسی سوال جواب کے بغیر، عافیت سے گھومتے اور آتے جاتے رہو۔ تو ہم نے فرانس والوں سے ویزا مانگا۔ وہ مل گیا۔ اسپین کے آٹھ شہر اور پرتگال کا شہر لزبن ہمارے کام کا حصہ تھے۔ پیرس مجھے محض اپنا ذاتی مسئلہ سمجھ کے دیکھنا تھا (ڈائریکٹر اور پروڈیوسر برسوں پہلے یہ شہر دیکھ چکے تھے) مجھے یہاں شارلیمان اعظم اور شمپولیوں (وہ جس نے عہد فراعنہ کی تحریریں پڑھی تھیں) اور نیولین صاحبان کو اور وکٹر ہیوگو کو اور ڈاؤنچی کو خراج پیش کرنا تھا اور A Tale of Two Cities کو بھی۔ عمارتوں میں آئفل ٹاور دیکھنا تھا اور ناترے دیم کا گر جا گھر اور محراب فتح سے شروع کر کے شانز ایلزے پہ ٹہل لگانی تھی اور ہمارے تمھارے ایک دوست کا اصرار تھا کہ جب جاہی رہے ہیں تو بسم اللہ، پگال کا بیسواؤں کا محلہ بھی دیکھتے آئیے گا۔ تو یہ سب کچھ دیکھا۔ ہاں مونا لیزا سے نہ مل پائے۔ اس روز نہ معلوم کیوں لوو میوزیم بند تھا (۱۱ جون سال دو ہزار! ہیہات! واویلا، واویلا، واویلا)

ڈائریکٹر اور میں تو اُس لیڈی کے احترام میں باقاعدہ سوٹ پہن کے گئے تھے (مزید واویلا)۔

خیر! پیرس کے مختصر قیام میں میٹرو کی زیر زمین بھول بھلیوں میں پہلے ہم دونوں مارے مارے پھرے۔ پھر ہمارے پروڈیوسر بھی آن ملے تو تینوں نے فیصل آباد کے ایک پھیری والے لڑکے کو جو برسوں سے یہاں روزی کماتا ہے اور میٹرو کا ماہر چوہا ہے، ساتھ لیا اور کم و بیش وہ سب دیکھ لیا جو بیان کیا گیا اور پھر تھکے ہارے ہم سوا دو ڈھائی بجے اپنے ہوٹل پر آئے اور پڑ کے سو گئے۔ کوتاہی ہم سے یہ ہوئی کہ ہوٹل والے کو ہم نے یہ نہ لکھوا دیا کہ ہمیں ساڑھے سات بجے جگا دینا۔ اگر لکھوا دیتے تو وہ نہ ہوتا جو ہوا۔

سوا آٹھ بجے پروڈیوسر نے ڈائریکٹر کو ہڑبڑا کے اٹھادیا اور وہ خود پھر سو گئے (یہ بندہ عاجزتس پر بھی نہ اٹھا)۔ آخر ڈائریکٹر نے واش روم سے نعرے مار مار کے اٹھایا تو میں نے بھاگم بھاگ اپنا سامان سمیٹا، شیو کیا، شاور لیا، نصیب میں جتنا ناشتا تھا وہ کیا اور ہوٹل کے دروازے تک جا کے انھیں خدا حافظ کہا۔ وہ ریل سے اپنے عزیزوں کے پاس فرینکفرٹ جا رہے تھے۔

ادھر پروڈیوسر نے اپنی محبت میں تقریباً کچھ بھی ناشتا نہ کرتے ہوئے مجھے ایئرپورٹ کی میٹرو پر سوار کرانے کی پیش کش کی۔ میں نے کچھ تکلف کیا پھر کہا کہ آئیے جزاک اللہ! ہم دونوں قریب ترین میٹرو اسٹیشن، گاردینارد کے (دو طبق نیچے) پلیٹ فارم ۴۳ تک اترے۔ میں نے ٹکٹ خریدا اور جذباتی ہوا۔ پروڈیوسر نے معافہ کرتے ہوئے خدا حافظ کہا (ہم ایشیائی مرد گھروں سے دُور ہوتے ہیں تو زیادہ تر اپنی خالوں، پھوپھوں کی طرح behave کرتے ہیں)۔

پروڈیوسر کو پون گھنٹے بعد وہ ریل پکڑنی تھی جو زیر زمین سنسناتی ہوئی انگلش چینل پار کرے گی اور انھیں لندن پہنچا دے گی۔

میں اپنے سامان کے تینوں ٹک دو پہیوں پر roll کرتا اور شانے پر لٹکائے خوش خوش میٹرو میں جا بیٹھا اور set ہو گیا۔ یہ گاڑی مجھے چارلس ڈیگال ہوائی اڈے پہنچانے والی تھی۔ آگے دبئی تھا پھر میرا شہر اور میرا گھر۔ بے شک یہ سب تھے مگر یہاں مجھ سے (یا میرے ساتھ میرے جہاں گرد میزبان سے) بڑی بھول ہو گئی تھی۔ یہ میٹرو بلاشبہ ہوائی اڈے جا رہی تھی (جو پورے چالیس میل دور ہے) مگر اس کی منزل ٹرمینل نمبر ایک تھی نہ کہ نمبر دو۔ ہمیں یہ علم نہیں تھا کہ one اور two جانے والی گاڑیاں alternately چلتی ہیں۔ اس لیے اب اگر مجھے two تک جانا ہے تو one پر بہر حال گاڑی بدلنی ہوگی اور مجھے کوئی چھ سات میل آگے جانا ہوگا۔ خیر! یہ سب لاعلمی کی برکتیں ہیں اور یہ کہ بندہ بشر ہر حال میں عاجز بلکہ جاہل ہے۔

تاہم اسی لاعلمی کے طفیل میں اس تجربے سے گزرا جو بیان کر رہا ہوں۔

زندگی میں دوسری بار میں نے Nothingness (یا Absolutely؟) کا حسی

تجربہ کیا۔ کوئی صوفی ہوتا تو کہتا کہ مجھے تجربہ کرایا گیا۔ مگر میں ایک عام سا Agnostic

ہوں اس لیے جو بھی کرتا ہوں خود اپنی ذمہ داری پر کرتا ہوں۔

تم سوچتے ہو گے یہ Absolute کہاں سے آگیا؟ مجھے نہیں معلوم۔ بہ خدا نہیں معلوم کہ میں عدم کو Absolute اور vice-versa کیوں سمجھتا ہوں۔ یہ یقیناً وہی لاعلمی (یا بے علمی؟) ہے جس کا ذکر بار بار کیا جا رہا ہے۔

پچاس باون برس پہلے جنگل میں جو مجھے 'ناموجود' کی ایک جھلک دکھائی دی تھی، اے عزیز! وہ میں نے ۱۲ جون کی صبح پھر دیکھی۔ اس بار میں زیر زمین، شاید دو تین طبقہ نیچے، میٹرو کے ایک اسٹیشن پر تھا۔ وہاں جس کیفیت سے میں گزرا وہ اس panic کی تقریباً بازگشت تھی جو برسوں پہلے جنگل میں کسی بھی میٹریل چیز کو رو بہ رو نہ پا کر میں نے محسوس کیا تھا۔ یہ کوئی روحانی واردات نہیں تھی۔ No Sir! خالص حسی تجربہ تھا یہ بھی۔ وہ غلط گاڑی جس پہ میں بیٹھ چکا تھا terminal-1 کے اسٹاپ پہ جا رہی اور خالی ہو گئی۔ آگے کہیں اسی level پر ایک کاؤنٹر تھا جہاں ایک مرد اور ایک عورت بیٹھے تھے۔ دوسروں کی طرح میں نے بھی انھیں اپنا air ticket دکھایا۔

عورت بولی، ”دبئی؟... اہ دبئی! یوگو تو ترمینل تو۔ واؤن اسٹے ریز فار نمبر تو... واؤن، واؤن اسٹے ریز... گد دے!“

”گڈ ڈے!“ میں نے بھی اسی تپاک سے کہا اور اس بی بی کی بتائی ہوئی سمت یعنی تحت الارٹی میں اتر گیا۔

یہ خود کار سیڑھی (ایسکے لیٹر) تھی جس نے مجھے اُتارا۔
میں نیچے پہنچا۔

جہاں میں اکیلا تھا۔ بالکل، ایک دم... قطعی اکیلا۔
ویسے وہاں ایک گاڑی کھڑی تھی۔ گاڑی بھی خالی تھی۔ کوئی انجن، اہلکار، مسافر، سامان... گاڑی میں کچھ نہیں تھا۔ بس خالی passenger carriages تھیں۔ ڈیڈ بوگیاں۔ اور سناٹا۔

”ہیلو!“ میں نے کہا۔

بازگشت آئی ہے لو۔

میں پلیٹ فارم پر چل پڑا۔ دائیں طرف دور تک tunnel روشن تھی اور بے

آواز تھی۔ بائیں طرف بھی اور زیادہ دور تک tunnel روشن اور بے آواز تھی۔
 'داؤن اسٹے ریز' کا یہ میٹر و اسٹیشن جہاں مجھے بھیجا گیا تھا بالکل خالی تھا۔ ایک
 دم dead۔

میں نے فیصلہ کیا کہ مجھے یہ جگہ چھوڑ دینی چاہیے۔ اپنا baggage رول کرتا
 میں ایسکے لیٹر تک آیا جو اب رُکا ہوا تھا۔ سامان کا بوجھ ہاتھوں پر سہارتا میں تیزی سے
 فولاد کی یہ سیڑھیاں چڑھ گیا۔ اوپر... چالیں پینتالیس سیڑھی اوپر، وہ عورت کاؤنٹر پر بیٹھی
 تھی۔ میں نے اسے King's English میں سمجھایا کہ وہاں ایک ٹرین بے شک ہے
 مگر وہ اصل میں ٹرین نہیں ہے۔ اور یہ کہ فی الحقیقت وہاں کچھ بھی نہیں ہے اس لیے کہ
 کوئی بھی نہیں ہے وہاں۔

عورت نے مسکرا کر کہا، "ٹرینل نمبر تو.. داؤن اسٹے ریز!.. گد دے!"
 میں نے اُلجھ کے کہا "گڈ ڈے! بٹ مے ام! وہاں کچھ نہیں ہے، نو ٹرین،
 نتھنگ۔"

عورت نے اپنی فرانسیسی میں کچھ کہا اور قطعیت کے ساتھ بولی، "داؤن اسٹے
 ریز ایند گد بائی"

میں نے سوچا یہ کہتی ہے تو پھر دیکھتا ہوں۔
 پھر اتر ا۔ ایسکے لیٹر اس وقت بھی بند تھا، چالیں پینتالیس سیڑھیاں نیچے وہی
 سب کچھ تھا جو بیان کیا جا چکا ہے۔

اب کے میں دہشت اور جھونجھل میں مڑا اور غلط سیڑھی چڑھ گیا۔
 یہ ایسکے لیٹر نہیں، عام marble سیڑھیاں تھیں اور مجھے زمین کے کسی اور طبق
 میں لیے جا رہی تھیں۔ میں مڑا اور سیڑھیاں اتر کے پھر اسی مردہ اسٹیشن پر آ گیا۔
 خالی بوگیاں اور دور تک روشن اور بے آواز tunnel۔ اُس رخ پر بھی، اس
 رخ پر بھی مطلق سکوت۔ سناٹا۔

تو یہاں لمحے بھر کو... بس ایک ثانے کو اپنے لڑکپن کے اُس سن سینتالیس
 اڑتالیس والے جنگل کی طرح میں نے ایک مردہ میٹر و اسٹیشن کو اور اُس کی تمام جزئیات
 کو اپنی آنکھوں کے سامنے معدوم ہوتے دیکھا اور وہ گرج سنی... 'لا' کے monster کا وہ

ہنکارا جو کانوں کے رستے ریڑھ کی ہڈی میں اتر جاتا ہے اور یہ دیکھا کہ اس دوران خالی ریل گاڑی، پٹریاں، روشنی، پلیٹ فارم۔ وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ مگر میرا یہ تجربہ بہت ہی مختصر تھا۔

میں نے تیسری بار سیڑھیاں چڑھیں۔ اس بار بہت غصے میں۔ یہ اسٹیل کی سیڑھیاں تھیں۔ اوپر کاؤنٹر کی عورت جا چکی تھی۔ اُس کی جگہ ایک مہربان دکھائی دیتا نو جوان موجود تھا۔ جو بہ ہر حال اس قدر انگریزی جانتا تھا کہ میں مطمئن ہو گیا۔ اس نے بتایا کہ نیچے جو گاڑی کھڑی ہے وہ کچھ نہیں ہے۔ دوسرے پلیٹ فارم پر تھوڑی تھوڑی دیر بعد گاڑیاں آتی ہیں، اور ادھر... اس سمت میں چلی جاتی ہیں جدھر ٹرمینل ۲ ہے۔ تم کسی بھی گاڑی پہ سوار ہو جاؤ، اگلا اسٹیشن ہر حال میں terminal two ہوگا۔ لو سنو! یہ تمھاری گاڑی کی آواز ہے۔ ہری اپ اور خدا حافظ!“

میں گھوما تو وہ ایسکے لیٹر اب پھر کام کر رہا تھا۔ اب گویا پلک جھپکتے، میں اس زندہ گاڑی میں تھا، جس نے مجھے ”ترمینل تو“ تک پہنچایا جہاں معلوم ہوا کہ مجھے سات منٹ کی دیر ہو چکی ہے اور بورڈنگ کارڈ نہیں مل سکتا۔ خیر، وہ ایک الگ تجربہ، ایک الگ کہانی ہے۔

خدا حافظ۔ گویا پھر ملاقات رہے گی۔ تمھارا...



دوسرا حصہ: الکازر

عزیزم! سلامت باش۔

ہمارے شہر کا موسم سارے سال ایک سا رہتا ہے۔ موسم میں کوئی ڈراما نہیں ہے۔ بالکل ناک کی سیدھ میں دیکھو تو دکھائی دیتی چیزوں میں بھی نیا، انوکھا کچھ نہیں۔ سینٹ کی بھیانک عمارتوں کے بیچ بیچ سے نظر آتا میلا میلا، بھورا آسمان، جسے شہر کی چند لاکھ گاڑیوں نے پہلے سے تباہ کر رکھا ہے ویسے ہی برا لگتا ہے۔ میں کہتا ہوں، شٹ (shit)! بلکہ bullshit!

یہ اپنے شہر کے لیے سب و شتم نہیں۔ شاید ہر شہر (اصفہان اور بنگلور تک...) جنہیں میں خوب صورت شہروں میں گنتا ہوں) جی ہاں ہر شہر سال کے کچھ حصوں میں اتنا ہی بے رنگ uneventful ہو جاتا ہوگا۔

میں بااصرار کہتا ہوں کہ میرا شہر بہت اچھا ہے۔ لیکن سال کے بیش تر حصے میں یہ visually یکساں اور بورنگ اور بے مایہ اور بے ماجرا نظر آتا ہے۔ اس بات سے میں کبھی کبھی بہت پریشان ہو جاتا ہوں۔ پھر دل کو سمجھاتا ہوں کہ یارا! شہر تو اپنا ہے۔ مانگے مانگے کا تو نہیں۔ شاید قصہ یہ ہے کہ بہت قریب سے اور بہ ہر حال اور مسلسل اپنی محبوبہ کا رخ تاباں بھی دیکھتے رہو تو چھوٹے چھوٹے مہاسے، داغ دھبے، blemishes

بے ضرورت رواں، اکا دکا تل جو approved جگہ نہیں، فضول جگہ بھی ہو سکتا ہے (مثلاً ناک کی tip پر) تو اس غیر ضروری familiarity سے بیزاری اور contempt پیدا ہو سکتی ہے۔ چاہت میں یہ خطرہ تو برابر ہے بھائی۔

پھر یہ ہے کہ باہر جاؤ تو یہ شہر یاد بھی آتا ہے۔ اس کا موسم تک یاد آتا ہے۔ مگر ایسا (باہر جانا) کم کم ہوتا ہے اس لیے اس کی یاد بھی کم کم آتی ہے۔ زیادہ تر تو ہم شہر کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے گویا پتلیوں سے پتلیاں بھڑائے اسے گھورتے رہتے ہیں۔ یہ ہمیں گھورتا رہتا ہے۔ تو کیا ہم شہر سے اور شہر ہم سے اُوبھنے لگا ہے؟

جو بھی ہو، میں یہاں کے موسم سے پریشان ہوں۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا۔ پچھلے خط میں، میں نے یہاں کی برساتوں کا کچھ حال لکھا تھا۔ مگر وہ ایک نوجوان آدمی کی یادیں تھیں جسے صرف اپنی کتابوں کو بھینگنے سے بچانے کی فکر ہوتی تھی۔ اب میں وہ آدمی تو نہیں رہا، سن چھپن والا۔ اب اور بھی فکریں جان کو لگی ہوئی ہیں۔ بارش مجھے اُلجھا دیتی ہے۔ رستوں میں پانی بھر جاتا ہے۔ پرانی عمارتیں گرنے لگتی ہیں۔ لوگ شہر کی ہر سڑک پہ خوار ہوتے ہیں۔ کھمبوں میں کرنٹ آ جاتا ہے۔ گرمی سارے سال پسینا پسینا رکھتی ہے اور سردی یہاں ہوتی نہیں۔

ویسے تم ان باتوں سے پریشان مت ہونا۔ کچھ خیال مت کرنا۔ یہ ایک پراگندہ ذہن آدمی کی worries ہیں (جو اب نوجوان بھی نہیں رہا)۔ جو شہر کا کچھ نہیں لگتا پھر بھی شہر کے اندیشے میں رہنے لگا ہے، خواہ مخواہ۔ یہ شاید چاہت ہے... اپنی زمین کے لیے۔

مگر دوستا! جیسا کہ ابھی کہا تھا میں نے، چاہت میں خطرے ہیں، مثلاً یہ کہ آدمی اپنے محبوب کی توصیف میں غلو کرتا ہے اور جھوٹا مشہور ہو جاتا ہے۔ یہ ایک پیانہ ہو سکتا ہے چاہت کا۔

تاہم ایمان داری سے اور پیار سے مبالغہ کیا جائے تو کبھی معاف کر دیتے ہیں (بڑے سے بڑا شقی القلب Shimr-type بھی) بتاؤ کبھی کسی نے اصفہان نصف جہان والی کہاوت کو challenge کیا؟ کبھی نہیں۔ بھائی یہ محبت ہے۔

میں نے ۶ جون سن ۲۰۰۰ء کو غرناطہ کے آخری حکمرانوں آل نصر کی seat

قصر الحمرا کو دیکھا۔ الحمرا کے بارے میں لکھتے ہوئے بیسویں صدی کے ایک اسپینی شاعر نے عجیب طرح کا کام کیا ہے۔ اس نے افسانوی فضا تیار کی ہے کہ جیسے الحمرا میں تین مختلف کردار ایک دوسرے کے رو بہ رو ہوئے ہیں۔ ایک جمال پرست دانش مند (جو شاعر خود ہے) ایک بہت حسین عورت جو کہیں کی ملکہ ہوگی اور ایک فقیر نابینا۔ کبھی تو خیال ہوتا ہے کہ شاعر خود فقیر ہے اور وہ الف لیلوی عورت اس کا مقصود ہے کہ الحمرا میں ہوتے ہوئے وہ ہشیار ہر طرف سے آنکھ بند کیے بس اسی کا چہرہ تکے جاتا ہے اور کہتا ہے:

اے عورت! اسے خیرات دے۔ اس کم نصیب کی ناداری دیکھ کہ یہ الحمرا میں ہے اور نابینا ہے۔

(”اسے خیرات دے، اسے بے نقاب ہو کے دیکھ...“ استاد! مصرعے کا یہ استحصال کیسا ہے؟)

جب تک میں نے الحمرا میں Bu-Abdel (ابوعبداللہ) کا chamber نہیں دیکھا میں ان لائنوں کو محض چاہت اور مبالغہ سمجھتا رہا تھا۔ مگر نہیں میرے عزیز! سچ یہ ہے کہ جس نے لاہور نہیں دیکھا وہ جمہیا ہی نہیں، الحمرا کی حد تک یہ امر واقعہ ہے۔ بھائی! الحمرا کو محض دیکھنا ہی بصارت دینے والے کو tribute پیش کرنا ہے۔ مجھے اگر اسپینی tourism والوں کی طرف سے Granada کا بروشر لکھنے کا کام سونپا جاتا تو میں لکھتا کہ:

"Just glancing at Al-Hamra is celebrating the gift of Sight."

اللہ اللہ! بلکہ اللہ اکبر! (ایسے موقعوں پر میں سخت مومن ہو جاتا ہوں)
مزے کی بات سنو۔ ایک فرینچ لیڈی نے، جس سے ہم الحمرا میں ملے تھے... جو پیشے کے اعتبار سے سائی کیا ٹرسٹ تھی، ہمیں بتایا کہ... مگر نہیں۔ نہیں نہیں، ایسے نہیں... میں اس خاتون سے تمہیں باقاعدہ ملاتا ہوں۔

یہ خاتون اپنے دولہا کے ساتھ الحمرا کے ٹکٹ کاؤنٹر پہ منڈلا رہی تھیں۔ ہم تینوں بھی اتنی ہی اداسی سے منڈلا رہے تھے کیوں کہ ٹکٹوں کی فروخت sale for the day دوپہر ایک بجے بند ہو چکی تھی جب کہ ہم تینوں بھائی بھاگ تین بجے کے بعد الحمرا پہنچے تھے (وہ فرینچ جوڑا وہاں سوا بجے سے چکر لگا رہا تھا)۔ ہم کیا کرتے، منہ لٹکا

کے سایہ دار بیچوں پر بیٹھ گئے۔ برابر کی بیچ اس جوڑے نے سنبھال لی۔ میاں، جو انگریزی بالکل نہیں جانتا تھا، عافیت سے اونگھنے لگا۔ خاتون نے خوش مزاجی سے پروڈیوسر سے ایک دو فقروں کا تبادلہ کیا پھر وہ اٹھ کے ٹہلنے لگیں۔

پروڈیوسر جلد مایوس ہونے والوں میں سے نہیں ہیں۔ وہ تو ہم بھی نہیں؛ مگر دنوں کی تھکن اور tickets sold out کی تختی نے دھڑن تختہ کر دیا ہوگا اس لیے ہم دونوں بیزاری سے آدھی آنکھیں کھولے دنیا کو ٹہلتے، اونگھتے اور منہ ہی منہ میں بڑبڑاتے دیکھنے لگے۔

منہ ہی منہ میں وہ تیسرے آدمی، یعنی پروڈیوسر، بڑبڑا رہے تھے۔ وہ اپنی رواں سرائیکی میں کچھ ایسا کہہ رہے ہوں گے جس کا ترجمہ کیا جانا ضروری یا مناسب نہیں ہوگا اسی لیے انھوں نے اپنی آواز دھیمی رکھی تھی۔ ہاں گا ہے گا ہے وہ ایفریکن امیریکن (New Yorker) لہجے میں شی ی اٹ (یعنی کھینچ کے shit) کہہ رہے تھے۔ جس سے ان کی برہمی کا بہ خوبی اندازہ ہو جاتا تھا۔

ہمارے منہ لٹکانے اور غصہ کرنے کا سبب اور ہدف خود ہم تینوں ہی تھے۔ ہم ہی نے اسپین، پرتگال اور شہر پیرس کا یہ دیوانہ وار دورہ کسی مشورت کے بغیر پلان کیا تھا اور ایک ناگہانی بات سے پلان کا flat tyre ہو گیا تھا۔ تو اب ہم خود ہی کو مطعون کر رہے تھے۔ اس پلان میں ہم نے سہ پہر تین بجے سے رات دس بجے تک کا وقت الحما کو دیا تھا (نسل آدم کس قدر نادان اور بے عقل ہے)۔

الحما ہماری انگلیوں کے درمیان سے پھسل گیا تھا اور پروڈیوسر نے نیگرو لہجہ بنا کر زبردست طریقے سے sheeit!... کہا تھا۔ اس لیے کہ:

نمبر ایک اسپین کی bullet train 'آوے' میں ہماری تین expensive سیلپر سیٹیں بک تھیں۔

نمبر دو اس آوے (AVE) کو آج ہی ساڑھے گیارہ بجے رات غرناطہ اسٹیشن چھوڑ دینا تھا۔ اسے ساری رات گولی کی رفتار سے چلتے ہوئے صبح آٹھ بجے دارالخلافہ Madrid پہنچنا تھا، جہاں ایک صبا رفتار اوٹنی (گویا Car جسے اپنے ایک ریٹارڈ جی ڈی Pilot چلانے والے تھے) ہماری منتظر تھی۔ یہ کار ہمیں اسپین کے دو شہروں سیگوویا

اور سلامانکا لے جائے گی (سلامانکا University Town ہے، دس نہیں تو پانچ علی گڑھوں کے برابر) یہ فلسفی اونا مونو کا شہر ہے۔ اے رفیق! میں اس شہر پر دس صفحے کا essay لکھ سکتا ہوں... جو بہ ہر حال تشنہ ہوگا۔

آگے سنو: سلامانکا سے وہ کارہمیں پرتگال کے دارالخلافے لزبن لے جائے گی جہاں ایک رات قیام کر کے اور لزبن پورٹ اتھارٹی سے ضروری معلومات حاصل کر کے اور حسب توفیق یہ شہر اور اس کا بندرگاہ کا علاقہ (جو ہماری کہانی کے رستے میں آئے گا) دیکھنے کے بعد؛ یعنی ایک دن، ایک رات اس شہر کو feel کرنے کے بعد، ہمیں اسی صبا رفتار اونٹنی پر سوار ہو کر تیسری بار میڈرڈ پہنچنا تھا پھر پورے trip کی سلوٹیں نکالنا اور خود کو واپسی کے اور پیرس شہر کے لیے تیار کرنا تھا... [واضح رہے کہ ہم Spain کے چار شہر قرطبہ، اشبیلیہ، مالقہ اور تورے مولینوس یعنی ٹاور آف دی مل کو پہلے ہی دیکھ چکے تھے]۔

مگر ہم نے الحمرا کو miss کر دیا تھا۔ یہ ہماری انگلیوں، اور Moors کی تاریخ کے بیچ سے صاف پھسل گیا تھا۔

ہمارے پروڈیوسر اٹھارہ برس سے نیویارک، LA، لاس ویگاس میں اور پیدا ہونے کے بعد سے یہاں اپنے ملتان شریف میں survive کر رہے ہیں۔ US کے تین مشکل شہروں اور اپنے پاکستان کے سب سے آسان شہر ملتان میں سروائیو کر جانے کے طفیل آدمی کو پکا ہو جانا چاہیے سو وہ بچے ہو چکے ہیں۔

چھ آٹھ بار shit کہنے کے بعد وہ اٹھے اور ٹکٹ کاؤنٹر پر ”ویلی“ بیٹھی لیڈی کے پاس پھر پہنچے۔ خوب صورتی سے مسکرا کے شاید چھٹی بار اس سے درخواست کی کہ ہم تینوں فنون لطیفہ اور ان سے متعلق مصروفیتوں کے لوگ ہیں، ہمارا حق عام tourists سے بڑھ کر ہے۔ زراہ کرم کہیں سے ٹکٹ پیدا کرو، مولاتمہارے من کی مراد پوری کرے گا۔ لیڈی نے کہا، I'm sorry۔

وہ بولے کہ میری ماں عرب تھی۔ یہ یادگاریں میرے آبا و اجداد نے Infact... (نانہال والوں نے) تعمیر کی ہیں۔ میرا حق ان سب سے افضل ہے جو اندر جا چکے۔ یہ قصر اور پورا اندالوسیا میری legacy ہے۔ مجھے اور میرے دوستوں کو اندر

جانے دو۔ پلیز مے ام! تین ٹکٹ میرے چیف نانہالی صدام حسین کے نام پر عطا کرو۔
لیڈی نے ہنس کے کہا، ”I am awfully sorry۔“

پروڈیو سرنے کہا، ”اگر تمہاری اور میری انگلیوں کی زینت یہ انگوٹھیاں نہ ہوتیں
تو میں ٹکٹوں کے عوض تمہیں نکاح کی پیش کش کر سکتا تھا۔“

عورت شیشے کے پیچھے ہتے ہتے دُہری ہو گئی۔ بہ مشکل بولی، ”اب مجھے یقین
آگیا کہ تم part Arab ہو۔“ پھر سنجیدہ ہو کے بڑی دردمندی سے کہنے لگی، سنو میں تمہیں
ایک مشورہ دیتی ہوں۔ تم اور تمہارے دوست اگر نو بجے رات تک انتظار کر سکتے ہو تو اس
اس طرح شہر پناہ کے ساٹھ ٹہل لگا کے فلاں دمے اور فلاں برجی اور وہ والے الکازر بہ
(القصبہ) اور فلاں الکازر (القصر) کو دیکھ آؤ۔ ان پر کوئی ٹکٹ نہیں ہے۔ شہر پناہ کے ساتھ
پڑ رہے یا ٹہل لگانے کی سنسنی کو ہم الف لیلہ کے اس کردار کے ساتھ share کر سکتے تھے
کہ جس نے نصف شب کو فصیل سے ایک صندوق اترتے دیکھا تھا اور صندوق میں
جھانکنے پر جسے ٹکڑے ٹکڑے کی گئی، یا بہت ہی گھائل ایک حسین عورت ملی تھی۔

شیشے کے پیچھے بیٹھی عورت نے یہ بھی کہا کہ موقع ملے تو gypsies کی بستی
(اُن میں سے بعض غاروں میں رہتے ہیں) میں بھی جانا، اُن کے رقص فلے مینکو
کا early show بھی دیکھ لینا اور حد سے حد سوا نو بجے تک لوٹ آنا۔ ہم ساڑھے نو
سے (شاید) گیارہ بجے تک گنتی کے لوگوں کو خاص خاص ایوان دکھاتے ہیں (کہ جو الحمر
کا دل اور اس کی وجہ شہرت ہیں) تم یہاں سوا نو تک ہر حال میں آجانا... وقت پر نہ آئے
تو پھر ہم ذمے دار نہیں ہوں گے۔ وما علینا الا البلاغ (معلوم ہوا دن میں روز آٹھ
ہزار visitors داخل کیے جاتے ہیں، رات میں صرف پانسو)۔

خیر؛ ہم تینوں پھر سایہ دار بیچوں پر آپسے اور ادھ کھلی آنکھوں سے زیتون کی
شاخوں کے بیچ سے نظر آتا آسمان دیکھنے لگے جسے (آسمان کو) الحمر کی ایک سرسبز پہاڑی
نے کاٹ چھانٹ کے کھڑکی جتنا کر دیا تھا۔

یہاں ہم ایک indolent کرب جمع (+) آسائش میں ٹانگیں پیارے
پڑے تھے کہ فرینچ خاتون، جو برابر ٹہلے جا رہی تھیں، سامنے آکھڑی ہوئیں، بولیں،
”تمہارے چہرے اس حقیقی مایوسی کو exaggerate کر رہے ہیں جو فی الاصل تم نے

محسوس کی ہوگی۔ چکی کا یہ پاٹ جو تم پہنے ہوئے ہو اتنا بھاری نہیں ہے... No Sir!“
 میں نے کہا، ”مے ام! ہم ایشیائی لمبے چہرے لے کر پیدا ہوتے ہیں یا شاید
 مایوسی کو show off کرنا بھی ہمارے قسم کے exhibitionism میں شامل ہوگا۔“
 بولیں، ”تم لفظ لکھتے ہو بھائی! سنو۔ نکتے وکتے نکال کے بات کو گھمانے کی
 کوشش مت کرو۔ خیال رہے، میں پیشہ ورسائی کیا ٹرسٹ ہوں۔ اوکے؟“

ڈائریکٹر اور پروڈیوسر ہنسنے لگے، خاتون بولیں، ”ہنسنے کیا ہو؟ اصل قصہ بتاؤ کہ
 اب اتنا پریشان ہونے کی کیا ضرورت ہے؟ جیسا کہ ابھی اس بے چین آدمی (اشارہ پ
 کی طرف) نے بتایا، الحرام سے چھین نہیں لیا گیا۔ رات میں آکے دیکھ لینا۔ ہاں؟“
 ڈائریکٹر نے پھر آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اب آدھی آنکھیں کھول کے بولے،
 ”اوں؟... ہاں! آپ ٹھیک کہہ رہی ہو۔ God bless you۔“

پروڈیوسر کہنے لگے، ”ہم tropics کے لوگ ہیں۔ ہماری محرومی کی نوعیت اور
 شدت کو سرد ملکوں میں رہنے والے پوری طرح نہیں سمجھ سکتے۔ اور ایک بات اور.. ہمارا یہ
 رائٹر دوست ابھی یہ جھوٹ کہہ رہا تھا کہ ہم اس وقت مایوسی کا نائک کر رہے ہیں۔ ناں
 ناں مے ام! ہم اپنی مایوسی میں گلے گلے ڈوبے ہوئے ہیں... یقین کرو۔“
 خاتون کہنے لگیں، ”وہ تو ٹھیک ہے لیکن تم یہ بات بہت خوش ہو کے کیوں کہہ
 رہے ہو؟“

پہ بولے، ”اپنے ان دوستوں کے برخلاف میں ہنسنے ہوئے چہرے کے ساتھ
 پیدا ہوا تھا۔ میری پیدائش کے وقت ایک صوفی نے جو میری ولادت bless کرنے اور
 کانوں میں اذان دینے آیا تھا، عجیب بات کہی تھی (اذان والی بات میں پھر explain
 کروں گا)۔ مجھے... (دو گھنٹے کے بچے کو) مسکراتا دیکھ کے وہ مستی میں نعرے پہ نعرے
 مارتا تھا اور کہتا تھا کہ ہنسنے کی کون سی بات ہے بچے یا؟! توں موج میلا کرنے ادھر نہیں
 آیا۔ جند جنجال میں گلے گلے پھنسنے آیا ہے، اوئے بھولے یا! یہ ہنسنے کی تھاں نہیں گریے کا
 مقام ہے۔“

سائی کیا ٹرسٹ خاتون بولیں، ”میں صوفی doctrines سے اور صوفیوں کے
 اس stance سے واقف ہوں۔ یا تو یہ window dressing ہے اور یہ گریہ وریہ

سب extra charm سمجھا کے مارکیٹ کیا جاتا ہے، یا ایسی بات ہے جو مخالفوں نے مشرق کے صوفی myth کو زیادہ gray پیٹ کرنے کے لیے پھیلا دی ہے۔ جو بھی ہو۔ میں نہیں اعتبار کرتی۔ تم لوگ رونے بسورنے کے اگر اتنے شوقین ہوتے تو ایسے ایسے قصر تعمیر نہ کرتے اور یوں شادیوں پہ شادیاں نہ کرتے۔“

میں نے کہا، ”خاتون! ہم نے الحمرا کے علاوہ تاج محل بھی تو بنایا ہے جو عمارت موت کو celebrate کرتی ہے۔“

بولیں، ”ناں ناناں big brother۔ موت کو پیراٹھ celebrate کرتے ہوں گے۔ اگرچہ پٹی پٹائی بات ہے، مگر تاج love کو سلے بریٹ کرتا ہے۔ جی ہاں کارنل love کو۔ کسی Platonc love کو نہیں۔ ناناں بھی ناناں۔ بڈ روم پارنٹر شپ کو۔ جی ہاں، سیدھی سچی love making کو جو فزیکل ہوتی ہے، اسے سلے بریٹ کرتا ہے، آئی سمجھ میں؟“

پروڈیوسر نے ہماری طرف دیکھ کے ماتھا پیٹ لیا۔ بولے، "Now Now" "Now. Here is a French Person for you." پھر بولے، ”ہور چوپو!“ (یہ پنجابی محاورہ ہے یعنی اور چوسو! گئے.. مطلب اب بھگتو)۔

لیڈی ہا ہا کر کے ہنسنے لگی۔ کچھ نہ سمجھتے ہوئے دولہا بھی نیند میں مسکرائے۔ بات کارنل لو سے شادی بیاہ تک پہنچی تو پ نے انکشاف کیا کہ ان کی شادی کو بیس بائیس برس ہوئے ہیں (ان کی looks مجھے ’عمر چور‘ لگتی ہیں یعنی خود وہ ۳۸ سے ۴۲ تک کے لگتے ہیں)۔

میں نے بتایا میری شادی کو تقریباً ۳۵ برس ہوئے ہیں۔ لیڈی نے پھر قہقہہ مارا اور بڑھ کے مجھ سے ہینڈ شیک کیا۔ بولیں، ”اور ہمیں ۳۳ برس، ہا ہا ہا“ پھر اونگھتے ہوئے دولھے سے انھوں نے فراموشی میں بہت کچھ کہا۔ دولھے نے ہنستے ہوئے ہم تینوں سے کچھ کہا جو ظاہر ہے ہم نہ سمجھ پائے۔

سائی کیا ٹرسٹ خاتون بولیں، ”یہ بات میں ان سے کہلوانا چاہتی تھی۔ حضرات! آج ہماری تینتیسویں anniversary ہے اور اسی حساب سے ہم الحمرا آئے ہیں۔“ ہم تینوں اٹھ کے کھڑے ہو گئے اور ہم نے اپنے دوست کا لکھا، کمپوز کیا یہ گیت گایا:

”مبارک تمہیں، خوشی کا یہ سماں، مبارک مبارک، تمہیں یہ (پتا نہیں کیا!)“
 دولہا صاحب بھی اٹھ کھڑے ہوئے تھے، انہوں نے اپنی کمر سے خم ہو کے ہمارا
 شکریہ ادا کیا۔ لیڈی اپنے دولھے پہ تصدق ہوئی جارہی تھیں۔ وہ شخص باقاعدہ handsome
 تھا، ماڈلوں، فلم ایکٹروں کی طرح (میں نے بیوی سے اس کے شوہر کے حسن جہاں سوز
 کی تعریف کی۔ تس پہ وہ ہنتے ہنتے بچ پر بیٹھ گئی)۔

بعد میں، میں نے الحمرا کے ایک الکازر کے back drop میں اس خوب
 صورت جوڑے کی تصویر کھینچی اور کہا، ”آپ دونوں کو عمر عزیز کے بہترین تینتیس برس
 مبارک ہوں۔“

دونوں شکرگزاری میں ہم سے بغل گیر ہوئے اور وہاں الحمرا کے Court of
 Lions کے complex کے باہر ہم ان سے رخصت ہو گئے۔

مگر آگے چل کر ایک حیران کر دینے والے ’ایوان سفارت‘ میں ہمیں اس
 جوڑے سے پھر ایک بار ملنا تھا اور دو کینے ڈینز سے (جن سے تین روز پہلے اشبیلیہ میں
 دریائے الکبیر کے کنارے ایک کمال ملاقات ہوئی تھی) خاص بو عبدل کے chamber
 میں ہمیں دوبارہ ملکرانا تھا اور ایک شعر.. ہم دم دیرینہ اور ملاقات مسیحا و خضر والا شعر..
 پڑھنا اور ترجمہ کر کے سنانا تھا۔

تو یہ سب ایوان سفارت کے بیان میں اگلے کسی رقعے میں آئے گا۔
 بھائی میرے! بو عبدل کا ”چیمبر آف ابے سے ڈرز“ جھنجھوڑ کے جگا دینے
 والے کسی خواب حیرت فزا کی طرح ابھی تک آنکھوں میں لشک رہا ہے، پتلیاں جلائے
 دیتا ہے۔ تو بس اب اللہ ہی اللہ ہے۔
 باقی باقی۔ تمہارا۔



تیسرا حصہ جو چھٹکی بی بی سکسینہ سے شروع ہوتا ہے

برادر م!

سفر کا حال کہیں سے بھی سنایا جاسکتا ہے۔

تو سنو، اسپین اور پرتگال کی روداد جہاں کی تہاں چھوڑتا ہوں اور پیرس کے شمالی دروازے گاردے نارد سے اس بے مثال شہر میں اپنا داخل ہونا بیان کرتا ہوں۔ انسانوں سے اُمگتے چھلکتے اس میٹرو اسٹیشن کے کجلائے ہوئے فرش پر دنیا جہاں کے لوگ کہیں نہ کہیں پہنچنے کو ہر سمت میں جھپٹ رہے تھے، آ جا رہے تھے یا ہماری طرح سامنے سامان کی ڈھیری بنائے کچھ دیر کو بچوں پر ستانے لگے تھے۔

گورے، کالے، سانولے چہرے اور تانبے جیسے متمتائے ہوئے بھی اور بعض باقاعدہ لال بھبھوکا، جیسے انار۔ تو انھی چہروں میں ہمیں ایک ہندی بی بی کی پریشاں حال صورت دکھائی دی۔ اپنی طرف کے سیاہ بھنورا بال، blunt ناک اور خاصا سانولا رنگ۔ وہ اپنا چہرہ اٹھائے repeat fire میں پکارے جا رہی تھی، ”اتل! اتل! اتل! اے اے اتل! اے سنو تو... اتل!“

جو آدمی ان آوازوں پر رُکا وہ اتنا ہی نوخیز تھا، جتنی یہ چھٹکی بی بی سکسینہ (سکسینہ کا لاحقہ میں نے خود لگا لیا ہے، اپنی آسانی کے لیے... کس لیے کہ وہ میاں بیوی مجھے سکسینوں

جیسے لگے تھے، یعنی جتنے سکینے میں نے زندگی بھر میں دیکھے ہوں گے، ان جیسے)۔
بہت ہوئی تو وہ بیس برس کی ہوگی یا بائیس تیس کی۔

بلیو جینز کے ساتھ اسی کپڑے کی جیکٹ اور جوگرز پہنے وہ کبھی اپنا سفید فلوپی ہیٹ ہاتھ میں لے کے ریلوے گارڈز کی طرح زور زور سے ہلاتی، کبھی اسے اپنے سر پر مڑھ لیتی۔ میاں کو ہدایات دیتے ہوئے فلوپی اس کے ہاتھ میں آجاتا تھا جسے وہ stress کے لیے کبھی آتے جاتے اتل کی طرف ہوا میں hit کرتی، کبھی تازیانے کی طرح اپنے گھٹنے پر مارتی تھی، جیسے محرم کے جلوس میں خود پر کوڑے برسانے والے قلندر کرتے ہیں۔ وہ ایوریسٹ چڑھنے والے نیپالی قلیوں کی طرح اپنی بساط سے کہیں بڑا پشتارہ خود پر لادے شمالی اسٹیشن کے اس کھلے ہال میں تیزی سے گردش کر رہی تھی (animated فلموں میں دکھائی گئی محنتی چیونٹی، چھٹکی بی بی سکینہ)۔

”ہری اپ اتل! ہے ہے ہے... نو ٹائم ٹو ویسٹ۔ ہے ہے اتل! پل لیز اتل!“
مجھے وہ مینا لگی۔ بہت پر شور اور چنٹ... بلکہ آتش زیرپا۔ باپ رے باپ!
لڑکیاں ایسی کب ہوتی ہیں۔ مگر وہ ایسی ہی تھی۔

پھر وہ بولی، ”O my!، کب بی ایسی مص صیبت بن جاتا ہے، this rushing around۔“ وہ ٹھیک ٹھاک جھنجھلاہٹ میں بڑبڑائی تھی اور جس بیچ پر میں بیٹھا تھا اس کے ہتھے سے اپنا پشتارہ ٹکانے کو دو قدم ریورس گیر میں چلی تھی۔ اس نے اچھے ڈرائیور کی طرح سرگھما کے دیکھا تو میری اس کی نظریں ملیں، اخلاقاً بولی، ”کیا کھیال ہے آپ کا؟ ... ہاں! sir؟“

میں نے جواب میں کہا، ”اوں ہو نک! کوئی مصیبت نہیں۔ اتل جیسے partner کے ساتھ It's always a pleasure“ مجھے اپنی جیسی زبان بولتے پا کر اسے زیادہ اچنبھا نہیں ہوا تھا۔ ہاں جس طرح میں نے اتل کا نام لیا اور اس کے لیے کلمہ خیر کہا، اس پر وہ ہنس پڑی، ”تھینک یو! sir!... thanks for the compliment... اتل میرا ہر بینڈ ہے۔“

میں نے کہا، ”ظاہر ہے... صاف نظر آ رہا ہے۔“
”آں؟“ لمحے بھر کو اس کی پتلیاں سکڑ گئیں مگر پھر وہ آنکھوں سمیت پورے

تیسرا حصہ جو چھٹکی بی بی سکینہ سے شروع ہوتا ہے ۶۵۷

چہرے سے ہنسی۔ ”یہ compliment جرور میرے لیے ہوگا، I'm sure؟“
میں نے کہا۔ ”بے شک، دیکھیے نا، ینگ لیڈیز کو کبھی کبھی اپنی اتھارٹی استعمال
بھی کرنی چاہیے... مطلب، استعمال کرتے نظر آنا چاہیے۔“
ہنستے ہوئے بولی، ”سچی بات... and sir! "istemal" is a good word... آپ
اردو والے ہیں نا؟“ وہ لفظ ”مسلم“ کہنا چاہتی ہوگی سو اس نے ”اردو والے“ کہا۔ مجھے
اس کی یہ احتیاط اچھی لگی۔

”جی ہاں، اردو والا ہوں۔“ میں نے اپنا نام بتایا۔
”میں نندتا ہوں... نندتا somebody“ اس نے اپنا last name بتایا تھا جو
اب مجھے یاد نہیں آرہا (اسی لیے میں نے یہ سکینہ لگا لیا)۔
لڑکی نے اپنے بارے میں اگلی جانکاری دی، کہنے لگی، ”ہم لوگ یوپی کے
ہیں... اور آپ؟“

میں نے لمحے بھر رک کر کہا، ”مجھے مالوہ بندیل کھنڈ سے سمجھ لیجیے۔“
ساتھی ڈائریکٹر میرے برابر آن بیٹھے تھے۔ وہ خوب صورت کاغذ میں لپٹے جیم
مکھن لگے گرما گرم ٹوسٹ لائے تھے۔

میں نے ان کا تعارف کرایا اور بتایا کہ یہ آگرے سے ہیں۔
بہت سرشاری میں بولی، ”Agra! what a place!“
اور ڈائریکٹر سے کہنے لگی، ”آپ لکی ہیں sir، کی آگرے میں جمے۔“
وہ بولے، ”yes indeed I am... آپ کا شکریہ lady۔ مگر مجھے آگرہ
چھوڑے پینتیس چھتیس برس ہو گئے۔“

وہ نہیں سمجھی۔ میں نے کہا، ”جی ہاں میں نے بھی سن پچاس میں اپنی جگہ چھوڑ
دی تھی... ویسے جاتا آتا رہتا ہوں۔ نو دس بار گیا ہوں۔“

اب بھی نہ سمجھی تو ڈائریکٹر نے بتایا کہ اصل میں ہم اپنے choice سے
پاکستانی ہیں۔ کراچی ہمارا شہر ہے، اس وقت ہم اپنے ملک سے یہاں ریکی کرنے آئے
ہیں، اپنے ٹی وی سیریل کے لیے۔

”Ah, Ha!“ خوش ہو گئی، کیوں کہ اس کا میاں مکٹیس اور نوٹ تھامے لمبے

لمبے ڈگ بھرتا چلا آ رہا تھا۔

اس نے ٹکٹ اور نوٹ سنبھالے، میاں کو بہت مسکرا کے دیکھا (جیسے لفافہ نکالنے پر طوطا قال والا خوش ہو کے طوطے کو دو دانے دال کے چگاتا ہے) پھر وہ ہمارا تعارف کراتے ہوئے میاں کو بتانے لگی، ”یہ ہمارے ادھر کے ’نے برز‘ ہیں... from Karachi... یہ صاب پہلے مالوے میں رہتے تھے اور یہ صاب آگرے میں۔ ابی ادھر ٹی وی سیریل بنانے کو آئے ہیں۔“

میاں سکینہ نے ہمیں، ہمارے پروجیکٹ کو good luck کہا اور بولا، "If you'll excuse us" پھر اس نے چھٹکی پر بندھے پشتارے کے بند کھول کر اسے آزاد کیا اور خود وہ پشتارہ اپنے اوپر لاد، ایک ان دیکھی ڈور میں بندھا، بی بی کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔ چھٹکی نے جاتے ہوئے لہک کے ہمیں، ہمارے پروجیکٹ کو دعا دی تھی۔ اب وہ آزاد پرندے کی طرح تھوڑا اڑتی، تھوڑا بھاگتی سامنے کے کھلے پلیٹ فارم پر چلی جا رہی تھی۔

یہاں سے آگے فرانس اور انگلستان کے ساحلوں کے بیچ میلوں تک پانی کی دسترس سے کہیں نیچے اسٹیل اور کانکریٹ کی وہ عظیم الشان سرنگ نکھی ہے جس میں سے ایک تیز رفتار گاڑی گزرے گی۔ یہ ریل گاڑی بہت کم وقت میں چھٹکی اور اس کے میاں کو، اور سیکڑوں مسافروں کو ایک چھوٹے سے پرشکوہ جزیرے میں پہنچا دے گی جس پر برطانیہ عظمیٰ بسا ہوگا۔

مگر سکینوں سے ہماری یہ ملاقات اسپین اور پرتگال سے لوٹنے پر ہوئی تھی۔ اس وقت تک ہم اور بہت سے دل چسپ لوگوں سے مل چکے تھے۔ اسپین کے دارالخلافہ مادرید میں ہوائی اڈے پر ہمیں ایک دانش مند سکھ سردار فلاں سنگھ مان نظر آیا تھا۔

ہمیں پہلی بار پیرس میں کچھ ٹھہرنا تھا۔ نہ ہم فرانسیسی زبان سے واقف تھے نہ کسی پارسی زبیاں سے یاد اللہ تھی۔ بہت پریشانی میں بیٹھے تھے کہ اعلان ہوا اور پیرس سے مادرید پہنچنے والی کسی پرواز کے مسافر سامنے سے گزرنے لگے۔ مسافروں میں ایک شریف صورت سکھ دکھائی دیا۔ دل نے کہا، ہو نہ ہو یہی فی الوقت ہمارے لیے خضر کا کام کر دکھائے گا۔ اٹھ

تیسرا حصہ جو چھٹی بی بی سکینہ سے شروع ہوتا ہے ۶۵۹

کے سلام کیا۔ پوچھا پیرس شہر سے واقف ہو؟ ہنسا، کہنے لگا، ”اٹھاراں، وی برس سے ادھر ہی روجی کھاتے ہیں۔ اس شہر کو خوب سمزتے ہیں، دسو کی گل اے؟“

ہم نے اپنا مسئلہ بیان کیا اور یہ کہ ہم اس شہر سے اپنے لیے کیا چاہتے ہیں۔ اور بتایا کہ فرانس کی حد تک ہم بالکل اجنبی ہیں۔ پیرس میں کوئی جان پہچان نہیں۔ اپنے جنوبی ایشیائیوں کی صورتیں دکھائی دے جائیں گی تو کچھ حوصلہ ہوگا۔ چھتیس یا اڑتالیس گھنٹے اچھے کٹ جائیں گے۔ کچھ رہنمائی فرماؤ۔

سردار فلاں سنگھ مان پھر ہنسا، کہنے لگا، ”پیرس شہر کے شمالی پھاٹک، یعنی گاردے نارد سے داخل ہو گے تو پہلی ہی نظر میں شہر کا چہرہ مانوس لگے گا، کس لیے کہ اس مضاف میں اپنی طرف کے بندے بہت ہیں۔ پھر بولا کہ میرا اپنا ہوٹل مان سرائے نامی بھی اسی طرف ہے۔ آپ جاؤ گے تو فرنٹ آفس پہ ایک لڑکا سبرامنی نام کا میری نیابت کرتا ملے گا۔ آپ نام ہی سے سمجھ گئے ہوں گے کہ کہاں کا اور کس طور کا ہوگا؟ یہ جنوبی ہند کا مدغ قسم کا پڑھا کو بچہ ہے۔ وہیں کہیں فرانس میں کسی بات پر پی ایچ ڈی کر رہا ہے۔ ان دنوں چھٹی پر ہے، ایکسٹرا فرانک کمانے کو ادھر گلے پہ بیٹھ گیا ہے۔“ تو پاپا جی! آپ سبرامنی سے ہماری اس ملاقات کا ذکر کرنا، وہ آپ لوگ کو اچھی طرح set کرادے گا۔ ایک بچے ملتان نامی کو تمہارے ساتھ کر دے گا۔ یہ ملتان آپ لوگ کو دو روج میں، دیکھنے جوگا پیرس، دکھا کے فارغ کرے گا۔ آرام سے جاؤ۔ پروائی کوئی نہیں۔“

تو خیر، اے عزیز! اس سبرامنی اور ملتان کا ذکر اذکار اتنا ہی ہو سکے گا۔ کس لیے کہ سردار فلاں سنگھ مان کا ہوٹل مان سرائے بہت ڈھونڈنے پر بھی ہمیں نہ مل سکا۔ ہاں اپنی طرف کا کوئی ضرور مل گیا۔ ایک ایرانی زرتشت بھائی سے فٹ پاتھ پر ملاقات ہو گئی۔ ہم نے انھی کے ”پان سیوں“ (Pension) میں ڈیرہ ڈال دیا۔

بھائی مبین مرزا! یہ پہلی کمک ہے جو مکالمے کے لیے روانہ کی جا رہی ہے۔

یار زندہ صحبت باقی ۲۳ جولائی ۲۰۰۱ء



شہروں سے مانوس ہوتے کچھ وقت لگتا ہے۔

سب کے ساتھ یہی ہے۔

میرے ساتھ، البتہ، ایک سہولت ہے... یہ کہ میرا یہ 'کچھ وقت' بہت مختصر ہوتا ہے۔ بس دو ہی تین گھنٹے۔

میں کرتا یہ ہوں کہ قلبِ شہر میں جو بھی راستہ، محلہ، عمارت، بازار مجھے اچھا لگے، بہت leisurely اس کا ایک چکر لگاتا ہوں۔ پھر دوسرا اور تیسرا اور چوتھا۔ کسی نکر پہ رک کے اس کی آوازیں، روشنی اور سائے، اس کی رفتار، اس کی مہک... مطلب پورا داتا ورن دیکھتا، سنتا، سونگھتا ہوں اور ہاتھ لگا کے چھوتا ہوں۔ پھر یہ کرتا ہوں کہ پہلے کبھی کے دیکھے، سنے اور چھوئے ہوئے کسی شہر، محلے، بازار اور جگہ سے اس ایک گوشے کو ملا کے، ساتھ رکھ کر دیکھتا اور اندر اتار لیتا ہوں۔ مگر خود کو یاد دلاتا رہتا ہوں کہ یہ جگہ جہاں میں اس وقت ہوں اس پہلے دیکھے اور برتے ہوئے شہر سے کچھ کچھ ملتی جلتی ضرور ہے، بالکل اس جیسی نہیں۔ اور یہ کہ میں نے خود اپنی سہولت کے لیے یہ موازنہ کیا ہے، شہر سے مانوس ہونے کو... اور یہ کہ میرا مقصد بس اتنا ہی ہے۔

کبھی دل ہی دل میں کہہ اٹھتا ہوں۔ اچھا، ندی کا یہ پل تو قصبے سیہور جیسا ہے۔ اوہو! ذرا دیکھنا کیا تھائی لینڈ کے کچنا بوری کا سا پھیلاوا نہیں لگتا؟ ندی میں پڑتا بھنور عین مین ویسا ہی ہے۔ وہی وحشی خوش بو کہ جیسے گیندے کے دس لاکھ پھول ایک ساتھ کھل اُٹھے ہوں۔

اُہ! بازار؟ یہ کوئی میلہ لگا ہے؟ میلہ چراغاں۔ شالیمار باغ، لاہور۔

سن انیس سو پچاس۔

تو یہ سب کرتے ہوئے میں اس کوچے، محلے، بازار ندی کو اپنے قریب لے آتا ہوں۔

اگلے ڈیڑھ دو گھنٹوں میں یہ جگہ خود اپنی شناخت کے نشانات بنا لے گی۔ میرے حواس پر اپنے فنکر پرنٹس چھوڑ دے گی۔ ڈھائی تین گھنٹے اس طرح گزر جائیں گے پھر یہ الگ اپنی فائل کھول لے گی... بہت دن کے لیے۔

(میں نے "بہت دن کے لیے" کہا، "ہمیشہ کے لیے" کہنا چاہتا تھا مگر نہیں کہا۔)

اب اس لفظ "ہمیشہ" سے خوف آنے لگا ہے۔ گرد و پیش کے اور اندر کے انہدام کو محسوس کرنے لگا ہوں، مثلاً یہ کہ یادداشت میں دراڑیں پڑتی جا رہی ہیں... اس

لیے۔ ڈرنے لگا ہوں۔

صوفیوں نے ’ہیشگی‘ کو بہت احتیاط سے استعمال کیا ہے۔ وہ بھی ہیشگی کو صرف اپنے ’صاحب‘ سے منسوب کرتے ہیں۔

مولوی بھی یہی سب کرتا ہے لیکن نہ معلوم کیوں وہ (مولوی) جب اپنے خدا کے بارے میں کہتا ہے کہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا تو اس کا لہجہ grudging سا ہو جاتا ہے۔ جیسے اسے (مولوی کو) یہ بات اچھی نہیں لگ رہی۔ بڑا صدمہ ہے اسے اس بات کا۔ وہ اسے قبول تو کر رہا ہے مگر مجبوری میں۔ جیسے حاکم کی حاکمیت کو کوئی دل پہ پتھر رکھ کے تسلیم کرے، بالکل اسی طرح۔

پر صوفی اپنے ’صاحب‘ کی ہیشگی کو اتنے چاؤ سے برتا ہے، ایسے لاڈ سے اس کا ذکر کرتا ہے جیسے ماں اپنے کڑیل جوان بیٹے کی چال ڈھال، اس کے تیوروں کا بکھان کرے۔

وہ ہیشگی کی کرسی پر ’صاحب‘ کے برابر جا بیٹھنے کا ہوس مند نہیں ہے۔ نہ، بالکل نہیں۔

مگر وہ دوسرا آدمی (وہ ملاں) برابر اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ Boss کو کرسی سے push کر دے۔ خود سنبھال لے یہ سارا کھٹ راگ۔

شاید اس کے بتختر نے... نہ جاننے والوں کے درمیان اس نے جو اپنا قامت نکالا ہے شاید اسی نے ملاں کو ایسا بنا دیا ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

تو ’ہمیشہ‘ کا لفظ اب میں بہت احتیاط سے برتنے لگا ہوں۔

جیسے میرا دوست جوآن ایلیا یقین کا لفظ برتنے میں محتاط ہے۔ وہ کہا کرتا ہے کہ بھائی سن! اس ایک لفظ ’شاید‘ کو تو کثرت سے استعمال کر۔ کس لیے کہ کوئی بھی چیز یقین سے کہے جانے کے لائق کب ہے؟ اور وہ کہتا ہے، بھائی سن! یہ لفظ ’شاید‘ جو ہے، یہ ایک مہذب لفظ ہے۔ اس میں یقین کی دھونس دھڑی اور تلنگاپن نہیں ہوتا۔ اشتباہ کا انکسار اور بھلمنسی ہوتی ہے۔

میں نے اپنی بہت سی تحریروں میں جوآن کا ذکر کیا ہے۔ شاید دو کہانیوں (”براوو! براوو!“ اور ”ڈزنگ“) میں تو وہ جیسے مرکزی کردار بن گیا ہے۔ پھر اور جگہ بھی۔

کسی رپورتاژ کسی جائزے میں، جہاں جی کرتا ہے میں اسے ڈال دیتا ہوں۔ جون ایلیا کو۔
 آج تیس پینتیس برس ہوتے ہیں، امروہے کے ایک سنی بھائی نے مجھے ٹوکا
 بھی تھا کہ یہ کیا کرتے ہو؟ کیا یہ کسی قسم کی مرعوبیت ہے؟ آں؟... یہ ناں کیا کرو۔ لوگ
 نہ معلوم کیا سمجھیں گے۔ میں نے کہا تھا سمجھا کریں۔ تم بتاؤ، تم کیا سمجھتے ہو؟ تس پہ وہ سنی
 امروہوی چپ ہو گیا تھا۔ آج جو ذکر نکلا ہے تو انب ہے کہ اصل بات بتا دی جائے۔
 اصل میں جون مجھے original لگتا ہے۔

ہوسکتا ہے اس نے اپنا کریکٹر، اپنا سارا ڈراما امراء القیس سے یا اس سے بھی
 دور کسی عرب شاعر یا فیلسوف سے اٹھایا ہو۔ اگر ایسا ہے بھی تو کیا حرج ہے؟ ہم میں
 سے کوئی ایک بھی اس کردار کو جسے جون اپنی اصل زندگی میں ری کری ایٹ کر رہا ہے، کبھی
 نہیں جان سکے گا۔ اس لیے اسے اور یجنل ماننے کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

دوسری بات یہ ہے کہ جون ایلیا جھوٹ بولتا ہے (جو وہ اکثر بولتا ہے) تو فوراً
 پکڑا جاتا ہے۔ دور سے نظر آ جاتا ہے کہ اس وقت یہ مکر کر رہا ہے۔ اور یہ اچھی بات ہے۔
 کوئی کیا کر لیتا اگر وہ کبھی کسی جھوٹ میں کامیاب ہونے کی کوشش کرتا یا وہ مکر
 کر جاتا اور ہمیں پتا بھی نہ چلتا۔ یہ ہے سارا قصہ۔

گویا پہلی بات یہ کہ جون مجھے original لگتا ہے اور آخری بات یہ کہ وہ
 ہپو کریسی نہیں کرتا۔ بس۔

اور یہ تو سب جانتے ہیں کہ وہ بہت اچھا شاعر اور اردو کے شاعروں کے
 درمیان زبردست سوچنے والی مخلوق ہے۔ عمرش دراز... (وہ اگرچہ عمر میں مجھ سے چھ ماہ
 سے دو سال تک بڑا ہوگا)۔

میں چاہتا ہوں کہ ہر اچھا لکھنے والا، کوہ قاف کے دانش مند بوڑھوں کی طرح،
 ایک سو سال چھ ماہ سے ایک سو دو سال تک کی عمر پائے۔ ہا ہا ہا (laughter)

خیر، تو آگے سینے! میٹرو اسٹیشن سے نکلتے ہی ہمیں ایک ادا مست درویش دکھائی
 دیا تھا۔ عمارت کی فراخ سیڑھیوں کے خاتمے پر ایک سروس lane تھی، جس سے آگے
 گرین بیلٹ، پھر شاہ راہ شروع ہوتی تھی، جہاں ٹارمیک paint سے لکیریں کھینچی تھیں
 اور ”رکو، چلو، آہستے“ جیسی ہدایات درج تھیں اور شہروں کے شہر پیرس کا اصلی تے وڈا

تیسرا حصہ جو چھٹکی بی بی سکینہ سے شروع ہوتا ہے ۶۶۳

ٹریفک چلتا تھا۔

ہمارا یہ درویش سروس لین کے خاتمے اور گرین بیلٹ کے آغاز پر خود اپنی بنائی ہوئی no man's land میں چت پڑا تھا (یاد کیجیے منٹو صاحب کا ”ٹوبہ ٹیک سنگھ“) اس ”ٹوبے“ نے جینز اور Plush کے گودڑ اور اصل چمڑے کے فل بوٹ پہن رکھے تھے۔ لیر لیر جینز اور موم کپڑ بن چکے پلش سے نظریں ہٹا کر ہم نے اس کے زردی کھنڈے چہرے کو دیکھا تو لگا یہ بزرگ فوت ہو چکا ہے... گویا صوفیوں کے لفظوں میں حقیقتِ اولیٰ سے جا ملا ہے اور کوئی دم میں بلدیہ کی گاڑیاں سائرن بجاتی پہنچنے والی ہیں۔ مگر ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے کسی قسم کے ٹریفک والنٹیئر نے (جس نے اپنی بیلٹ میں موبائل فون اڑس رکھا تھا) آگے بڑھ کے فوت ہوئے ”ٹوبے“ کے فل بوٹ پر بے دلی سے ٹھوکر ماری اور دھمکاتے ہوئے کچھ کہا۔ ”ٹوبے“ نے (یا اس کے جینز اور پلش اور ریل لیڈر نے) کروٹ لے لی، سو وہ جواب تک شرقاً غرباً پڑا تھا، شمالاً جنوباً ہو گیا۔ (درویش خدا مست نہ شرقی ہے نہ غربی)

سروس لین کو آتی جاتی گاڑیوں کے لیے اضافی چار فٹ مل گئے۔

گودڑ پوش کا زردی کھنڈا بے رونق چہرہ، اس کی سرخا سرخ ریش و زلف کے باوجود، اس تمام عرصے میں مردے کا چہرہ بنا رہا تھا۔ مجال ہے جو قسم کھانے کو بھی ذرا سا رنگ آیا ہو۔

ڈائریکٹر اور میں سامان اٹھائے گزر رہے تھے۔ لمحے بھر کو ہم ٹھٹکے۔ اس گورے سادھو کے درشن کو ہم نے اپنی گردنیں بڑھائی تھیں کہ اچانک ٹریفک والنٹیئر نے ہم سے پشتو میں کہا، ”زا، زا“ (یا یہ بات اس نے فرینچ میں کہی ہوگی)۔

ظاہر ہے، وہ نہیں چاہتا تھا کہ ہم سروس lane پر ٹھٹکیں اور چلتی ٹریفک میں خلل ڈالیں۔

ڈائریکٹر بولے، ”دیکھا آپ نے؟ یہ گھامڑا سے نہیں ہٹاتا ہمیں ’زا، زا‘ کرتا ہے۔ ہونہ ہو اس سے بھی بھتا لیتا ہوگا... سرا کہیں کا!“

فرض کیجیے آپ نے جناح ٹرمینل سے نکل کر کراچی کے محلے سنگھولین میں یا قائد آباد کے پچھواڑے کسی بھول بھلیاں چوک میں خود کو پایا اور وہیں کے کسی ’پان

سیوں' میں بستر اکھول کے بیٹھے اور بعد ایک ساعت کے شاور لے، نئے کپڑے پہن، ٹہلنے کو نکل گئے۔ تو آپ ہی انصاف کیجیے اور دل پر ہاتھ رکھ کے بتائیے کہ آپ کتنا پیدل چل سکیں گے اور اس تمام مدت میں کون سا کراچی دریافت کر پائیں گے؟

ہم پیرس کے قائد آباد مضاف میں کوئی ڈیڑھ گھنٹا گھومے۔ ایک جگہ سربراہ مناسب سا کیاسک (Kiosk یا گم ٹھی) دیکھ رک گئے۔ کسی قسم کا برگریا چکن بھرتا بنوایا، گرم گرم کھالیا اور وہی خدائی پسند کوک شوک پی کے اپنی دانست میں تازہ دم ہوئے۔ آگے چل پڑے۔

سڑکوں پہ چن نائی (پرانا مدراس) اور ٹمل دیشم کی بڑی بڑی دیسی شکلیں دکھائی دیں۔ ان کے نام کچھ بھی ہو سکتے تھے، ایم ایم، یس ماعیل۔ ایم، بی، چن ڈرن۔ یف، یے، نس ٹرن۔ کچھ بھی۔

ایک صاحب اشرف نامی ملے، اپنی طرف کے۔ انھوں نے ٹی وی کا سن کے دلچسپی ظاہر کی۔ تاہم میرا اور میرے دوست ہدایت کار کا نام انھیں سنا ہوا سا نہ لگا تو اخلاقاً سر ہلا کے رہ گئے۔ اپنے دو دوستوں اسلم اور بشارت کا ذکر کرنے لگے جو بالترتیب لاہور اور پشاور کے ٹی وی سینٹروں میں فلور مینجر اور چیف الیکٹریشن تھے۔ کہنے لگے، ملیں تو میرا سلام کہیے اور بتائیے کہ فی الحال میری رہائش ”چوئی میراج“ صاحب کے ساتھ ہے جلد ہی کوئی پتا ٹھکانا صحیح ہو جائے تو بہ ذریعہ ڈاک مطلع کروں گا۔ ہم نے کہا، درست۔

وہ ”have a good time پائی صاب!“ کہہ کے ایک طرف روانہ ہوئے۔ ہم دونوں سوچ میں پڑ گئے تھے۔ اس شہر کو اگر ہم اپنے ’جنوبی ایشیائی حوالے‘ سے دریافت کرتے رہے تو ایسے ہی اوپر تلے کے اینٹی کلامیکس کا سامنا ہوگا۔

اچھا ہوگا جو ’پان سیوں‘ کی لابی میں ایرانی بھائی کا طباق چہرہ دیکھتے ہوئے یا کمرے میں ٹی وی پر فرانسیزی سنتے ہوئے ہم یہ باقی وقت گزار دیں اور جب آواز پڑے کہ آپ کا دوست پروڈیوسر مادرد سے یہاں پہنچ گیا ہے اور نیچے لابی میں کرسیوں میزوں کے بیچ پھنسا بیٹھا ہے تو ایک اچھے کشادہ آرام دہ پنکوڑے جتنی ’وسیع و عریض‘ لفٹ میں بیٹھ کر ہم اسے لینے اتر جائیں۔

تیسرا حصہ جو چھٹکی بی بی سکینہ سے شروع ہوتا ہے ۶۶۵

سواپنے ٹھکانے پر آگئے۔ دونوں کافی دیر تک کمرے میں پڑے کروٹیں بدلتے اور ٹی وی پر فرانسیسی سنتے رہے، آخر تھک گئے تو ہدایت کار دوست نیچے پہنچے اور پروڈیوسر دوست کو ان کے موبائل فون پہ کھڑکھڑایا۔ واپس آ کے بتانے لگے کہ وہ ابھی وہیں مادرِ میں ہیں، تاہم اس وقت جہاز میں بیٹھے ہوئے ہیں اور انھوں نے فلائٹ نمبر بتا کر فون بند کر دیا ہے کیوں کہ کیبن کرو نے انھیں فون کھولے دیکھ کر گھورنا شروع کر دیا تھا۔

پروڈیوسر کے پہنچنے میں ابھی خاصا وقت تھا۔ ہم دونوں نے طے کیا کہ اس مدت میں آرٹ میوزیم لوو (یا لوغ) دیکھ آتے ہیں کیوں کہ پروڈیوسر دوست کا شروع سے یہی اصرار تھا۔ وہ اس وقت بھی جہاز میں بیٹھے کہہ رہے تھے کہ آپ لوگ آرٹ میوزیم وغیرہ دیکھ کے رکھ لو، باقی چیزیں ہم تینوں ساتھ دیکھیں گے۔

[وہ شاید جان دار کی شبیہ بنانے (اور دیکھنے) کو غیر شرعی سمجھتے ہوں گے۔ مگر یہ فقہی مسئلہ ہے سو یہ بات یہیں ختم کر دینی چاہیے۔]

لیجیے صاحب! طے ہوا کہ کیوں کہ کافی وقت ضائع ہو چکا ہے اس لیے فوراً لوو کی طرف رش کیا جائے۔

میں نے تیار ہوتے وہی پٹی پٹائی (کلیشے) بات دُہرائی اور ڈاونچی کے شاہ کار مونا لیزا کو دیکھنے کی خواہش کا اعادہ کیا۔ ہدایت کار بولے، ”ہاں بھائی جان! ضرور دیکھیں گے۔ دو بار پہلے بھی بیوی بچوں کے ساتھ ادھر آئے تھے۔ سبھی کچھ دیکھا، لوو نہ جاسکے۔ بال بچوں کو مصوری، بت تراشی سے اتنا کوئی خاص شغف نہیں، اس لیے خوفِ فسادِ خلق سے دل پہ پتھر رکھ لیا۔ آج ان شاء اللہ دیکھیں گے۔“ میں نے کہا، جیتے رہیے۔ پھر ہم نے وہ عظیم الشان فیصلہ کیا جس کا پہلے کہیں ذکر آچکا ہے کہ کیوں کہ آدمی فانی ہے اور دو دن کی زندگانی میں ایک دو بار سے زیادہ مونا لیزا کیا دیکھی جاسکتی ہے اس لیے ہم دونوں سلیقے سے جائیں گے؛ یعنی ایک مشہورِ زمانہ خاتون کی حاضری میں سوٹ پہن کے (اور نکلتائیاں جیب میں رکھ کے) جائیں گے۔

پان سیوں کے ایرانی مالک نے ایک چھپا ہوا کارڈ تھما دیا جس پر میٹرو کا نقشہ بنا تھا اور بہت سی ٹورسٹ جگہوں کی نشان دہی کی گئی تھی۔ ہماری آسانی کے لیے ایرانی بھائی نے لال پنسل سے ہمارا پورا route کھینچ دیا تھا۔

لوجی، اب تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔ ہم اس کے بتائے قریب ترین میٹر و اسٹیشن میں اترے... اور حسبِ توفیق چکرا کے رہ گئے۔

معلوم ہوا کارڈ کی مدد سے اگر کہیں پہنچا جاسکتا ہے تو ہم پہنچ چکے۔ میٹر و اسٹیشن صحیح تھا، پلیٹ فارم تک صحیح تھا مگر ہم اتنے disoriented تھے کہ سمتوں کو حتیٰ کہ ہندسوں اور حرفوں کو بھی ٹھیک ڈی سائفر نہیں کر پا رہے تھے۔ بے شمار گاڑیاں آئیں اور شمالاً جنوباً یا شرقاً غرباً چلی گئیں۔

ہم دونوں بھائی ایشیائی کنفیوژن کی تصویر بنے کھڑے رہے۔ ہماری سانولی شکلیں، بلنٹ ناکیں دیکھ کر ہمارے ہی جیسے لوگوں کو ترس آیا ہوگا۔ تو دس بارہ برس کی ایک ساؤتھ انڈین حلیے بشرے کی بچی، ساڑھی بلاؤز اور بیندی والی دو چار عورتوں کے درمیان سے نکل کے آئی اور اس نے مدد کی پیش کش کی۔ بچی نے جو کچھ کہا اس میں لفظ ”موسیو“ کے سوا اور کچھ سمجھ میں نہ آسکا۔

ہم نے اس نیک طینت کو انگریزی میں بتایا کہ ہم کیا ارادے لے کے نکلے ہیں، کہاں جانا چاہتے ہیں۔

یہ بات ہم یونانی زبان میں کہتے تو بھی وہی ہوتا جو ہوا۔ بچی ایک لفظ نہ سمجھی۔ وہ اور اس کے ساتھ والے ہندی، اردو، ہندوستانی کچھ نہیں سمجھتے تھے۔ تاہم دس منٹ کی بات چیت اور ایرانی بھائی کا کارڈ لہرانے کا ایک فائدہ ہوا۔ دوبارہ معلوم ہو گیا کہ ہم صحیح جگہ آئے ہیں اور یہ کہ نیک طینت بچی اور ساتھ والیاں اسی سمت میں جا رہی ہیں۔

اس بات نے بڑا حوصلہ دیا۔

ایک گاڑی آئی۔ وہ لوگ بیٹھنے لگے، ہم بھی بیٹھ گئے۔

گاڑی چلی تو ہم نے اپنی منزل کے بارے میں بتانا پھر ضروری سمجھا۔ اور پھر سے آرٹ میوزیم اور لوو اور مونا لیزا کی تکرار شروع کر دی۔ برابر کے لوگ بھی، جن میں گورے، کالے، سانولے سبھی تھے، دلچسپی لینے لگے۔ تاہم انگریزی زبان سے کبھی نابلد تھے۔

جب ہم دونوں آرٹ میوزیم ”لوو“ (اور احتیاطاً ”لوغ“) کہتے کہتے تھک گئے اور کوئی نہ سمجھا تو ڈائریکٹر دوست آگے بڑھے، بچی کے سامنے والی سیٹ پر بیٹھ گئے، دونوں ہاتھ اپنی گود میں رکھ لیے۔ پھر انھوں نے ایک (گزارے لائق) لافانی مسکراہٹ

تیسرا حصہ جو چھٹکی بی بی سکینہ سے شروع ہوتا ہے ۶۶۷

اپنے چہرے پر لاکر بچی کی طرف دیکھا۔

وہ performing arts کے آدمی ہیں۔ اپنے میڈیم سے مدد لیتے ہوئے مونا لیزا بن کے دکھا رہے تھے۔

مگر اب اور ہی تماشا ہوا۔ بچی سمجھی وہ اسے خوش کرنے کو کسی قسم کا مسخرا پن کر رہے ہیں۔ وہ ہنسنے لگی۔ دو تین مسافروں نے بھی ساتھ دیا۔ ڈائریکٹر بھی ہنسنے لگے۔ پر انھوں نے ہمت نہ ہاری۔ سب کو ٹھیکوٹھیکو کا اشارہ کیا۔ پھر mime کرتے ہوئے مصور ڈاونچی بنے، اشارے سے بدن پر موزے جیسا پھنسا ہوا پتلون، ڈھیلا شلوکا اور کان کی طرف جھکتی ہوئی بڑی سی بیرے کیپ پہنی (جس کے پیچوں بیچ پھندنا لگانے کی انگل بھر ڈنڈی بھی تھی) پھر انھوں نے دائیں ہاتھ میں ایک خیالی برش تھاما اور بائیں ہاتھ کے انگوٹھے میں رنگوں کا خیالی پے لیٹ پہن کر اپنے سامنے ہوا کے canvas پر مونا لیزا paint کرنے لگے۔ پینٹ کرتے کرتے انھوں نے حاضرین کی طرف دیکھا اور بہت پیار سے کہا، ”مونا لیزا۔“ وہ ایک بار پھر اپنے چہرے پر اس کی لافانی مسکراہٹ لانے میں کامیاب ہوئے تھے۔

ایک ایفریکن بھائی جو دیر سے منہ کھولے بیٹھا انھیں تنکے جا رہا تھا، بے اختیار چیخ پڑا۔ اس نے حاضرین سے کچھ کہا اور بچی کو بتا دیا کہ ہم کہاں جانا چاہتے ہیں۔ بچی کی آنکھیں روشن ہو گئیں۔ اس نے ”ایو“ سے ملتی جلتی کوئی آواز نکالی، پھر وہ سیٹ سے اٹھی اور زبردست کنسٹری اور ہاتھوں کے اشاروں سے بوگی کے کارنس پر بنے میٹرو کے نقشے پر کچھ سمجھانے لگی۔

بچے کہیں کے بھی ہوں eloquent ہوتے ہیں، اپنی بات سمجھانا جانتے ہیں۔ ہم سمجھ گئے کہ ابھی ایک اسٹیشن آئے گا جس پر ہم ہلیں گے تک نہیں، بیٹھے رہیں گے۔ اس کے بعد آرٹ میوزیم کا اسٹیشن ہے۔ ہمیں وہاں اتر جانا ہوگا (بچی اور اس کے لوگ اپنا سفر جاری رکھیں گے)۔

یہ سب کر کے وہ بیٹھ گئی اور پھر اس نے اپنی آنکھوں کی طرف اشارہ کیا، یعنی ہم سے کہا کہ دیکھو، پھر سامنے کی ہوا میں اس نے اپنا canvas کھینچا جس پر وہ بڑے وقار کے ساتھ گود میں ہاتھ رکھ لیڈی مونا لیزا بن بیٹھی اور پھر وہ... بہت ہی سانولی لڑکی...

خدا اسے سلامت رکھے، angelic smile میں مسکرانے لگی۔
ہم دونوں نے اور ساتھ کے مسافروں نے تالیاں بجا کر اس کا آدر کیا۔



ہمارے زمانہ طالب علمی میں آٹھویں کلاس سے فارسی، عربی، سنسکرت کی باقاعدہ پڑھائی شروع ہوتی تھی۔ یہ اختیاری مضامین تھے، کوئی ایک ضرور لینا ہوتا تھا۔ جنہیں یہ سب اچھا نہ لگتا ہوگا ان کے لیے ڈرائنگ تھی اور جو بہت ہی انوکھے تھے ان کو اڈوانسڈ انگلش پڑھائی جاتی تھی۔
میں انوکھا نہیں تھا مگر انگلش لینا چاہتا تھا۔

بے تکلف دوستوں اور بھائیوں میں سے ایک نے مذاق اڑایا، کہا، انگریز کو ہم گھر بھیجنے کی سوچ رہے ہیں، انگلش لینکوتج کی ہاٹ اٹھنے والی ہے تم اب اڈوانسڈ پڑھ رہے ہو۔ کیا قصہ ہے؟ میں نے کہا، پھیلی ہوئی زبان ہے دنیا سمجھ میں آنے لگے گی۔ بھائی بولا، فضول بات! تمہارا اصل مسئلہ یہ نہیں ہے، اصل مسئلہ یہ ہے کہ ”تم“ دنیا کی سمجھ میں آنے لگو، باہا با!
خیر!

سب نے ڈرائنگ کے سلسلے میں دلیل دی کہ ابا ڈرائنگ کے استاد ہیں، ٹھیک ٹھاک سکھا چکے ہیں اور بھی مفت میں سیکھ لو گے اور عربی کا یہ ہے کہ قرآن شریف تو پڑھتے ہی ہو، مارے پیٹے اور پڑھ لو گے۔ اس لیے بھائی! فارسی لو۔ فارسی شان دار زبان ہے۔ میں آزمائشی طور پر فارسی کی کلاس میں جا جا کے بیٹھنے لگا۔

فارسی کے استاد شعر کہتے تھے۔ سبق پڑھانے، گردانیں کرانے کے بعد ہمیں مزے مزے کے فارسی شعر سناتے اور تشریح کرتے، کبھی لڑکوں سے بھی تشریح کو کہتے تھے۔ ہر بار دس پندرہ منٹ کی یہ چٹکلے بازی ضرور ہوتی تھی۔ کبھی کوئی لفظ، کوئی ترکیب سمجھاتے اور سب کو انوالو کر لیتے۔ ایک بار ایک بہت بکی لڑکے کو ”پنبہ در دہاں“ کرنے کی دھمکی دے کر باقی کلاس سے کہنے لگے، ”یہ اگر باز نہ آیا تو آسان لفظوں میں بتاؤ کہ میں اس کے ساتھ کیا کروں گا؟“

بڑے بڑے تماشے کے جواب آئے۔

ایک بار شعر سنایا:

کشتہ عشقم و آں نیست کہ در شہر کے

نخلِ تابوتِ مرا بیندو شیون نکند

نخلِ تابوت پر سوالات کیے گئے۔ استاد نے کہا، لفظی معنی تم جانتے ہو، تفصیل میں ابھی نہیں بتاتا، خود معنی نکالنے کی کوشش کرو۔

ہمارا ایک ہم سبق دین دیال سکینہ (پھر سکینہ!) پولیس انسپکٹر کا بیٹا تھا۔ اپنے شوق سے اڈوانسڈ اردو پڑھتا تھا، وہ بھی میری طرح آزمائشی طور پر فارسی کی کلاسوں میں آنے لگا۔ بڑا 'قتین' تھا۔ غالب کے شعر، یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالب... کی تشریح اس طرح کرتا تھا کہ اے غالب تو جو تصوف کے مسائل حل کرتا رہتا ہے اور رمضان شریف میں "ترا بیاں" پڑھتا ہے تو... الخ۔

لطف کی بات یہ تھی کہ نہ صرف غیر مسلم class mates کو بلکہ مومنوں کو بھی ظالم اسی طرح پڑھت کر کے قائل کر لیا کرتا تھا، پھر جب بات کھلتی تو ہنستا اور پٹائی کے خوف سے چھپا چھپا پھرتا تھا۔

تو دین دیال سکینہ نے اور میں نے نخلِ تابوت والے شعر کی تشریح کی۔

وہ بتانے لگا کہ مسلمان بنکروں (بافندوں) کے محلے سے گزرتے ایک بار اس نے یہ دیکھا کہ تابوت کے آگے آگے ایک آدمی کھجور کا جھاڑ لے کے چل رہا ہے، یہی نخلِ تابوت ہوتا ہے۔ قبر پر لگانے یا مردے پر سایہ کرنے کو ہوتا ہوگا۔ شعر کا مطلب ہے کہ میں عشق کا مارا ہوں... وہ بنکر بھی ایسا ہی ہوگا ہا ہا ہا... تو بس لوگ دور سے کھجور پام دیکھ کے رونے لگتے ہیں کہ لو بے چارہ بنکر... مطلب عاشق مارا گیا۔

میں نے کہا تم کا ستھ اور لاعلم ہو۔ مسلمانوں کے مردے میں نے زیادہ دیکھے ہیں، تابوت کے آگے آج تک کوئی جھاڑ واڑ چلتا ہوا نہیں دیکھا۔ بکو اس ہے یہ! کہنے لگا، یہاں کے مسلمانوں میں عشق کے مارے کم ہوتے ہوں گے۔ کچھ دن صبر کرلو، کبھی دیکھ لو گے۔

خیر، میں نے اپنے حساب سے تشریح کی۔ کہا کہ آسان شعر ہے، بعض باتوں کی وضاحت کے لیے تاریخ و جغرافیہ سے مدد لینی پڑے گی۔ شاعر جانتا ہے کہ پرانے

ریڈ انڈین اپنے مردوں کو درخت پر دفن کرتے تھے، یعنی مردے کی ٹھٹھری کو خوب اونچے درخت پر، جو نخل تابوت کہلاتا تھا، باندھ کر چھوڑ آتے تھے۔ متوفی چار چھ مہینے میں سوکھ جاتا تھا۔ تو شاعر کہہ رہا ہے کہ شہر کے لوگوں میں کوئی ایک بھی ایسا نہیں جو مجھے نخل تابوت پر بندھا دیکھ کر نالہ و شیون نہ کرتا ہو۔ ہا ہا ہا ہا!

وہ عجیب دن اور عجیب جگہ تھی۔ ہم موت پر اور تابوتوں جیسے morbid objects پر بھی کھل کے ہنس سکتے تھے۔ مگر نہیں۔ یہ زمانہ بھی خوب ہے اور جون دو ہزار کا پیرس بھی خوب تھا۔ تابوتوں وغیرہ پر اب بھی ہنسا جاسکتا ہے۔

ہم دونوں، ہدایت کار دوست اور میں، پیرس کے لوو میوزیم سے ناکام و نامراد نکلے اور سڑک پار کر کے ایک پتھر جڑے وسیع و عریض میدان میں آکھڑے ہوئے۔ ابھی گرد و پیش کا جائزہ ہی لے رہے تھے کہ رولر اسکیٹنگ کرتے چھوٹے بڑے بچوں اور تماشا دیکھتے لوگوں کے درمیان ایک خلا پیدا ہوا جس میں سنہری کفن میں لپٹا خالص سونے کا مکوٹھا چڑھائے، اپنے پانچ ہزار برس پرانے تابوت میں کھڑا فرعون توتن خامن (عربوں کا طوطا عمون) ہماری طرف دیکھ کے ڈگمگایا اور تعظیماً جھکا۔ اتنا گہرا جھکا کہ لگتا تھا توازن کھو بیٹھے گا اور منہ کے بل آ رہے گا۔ مگر روباٹ کی طرح ڈگمگاتا وہ دوبارہ سرو قد ہوا، لمحے بھر کو لرزا پھر ساکت ہو گیا۔

لوگوں نے تالیاں بجائیں۔ اصل میں انھی میں سے کسی نے اس کے تابوت میں ایک نوٹ پھینکا تھا جس کی شکرگزاری توتن خامن پر لازم تھی۔ اسے دیکھ کے ہدایت کار دوست خوب ہنسے، بولے، ”سروسوں نے کیا مٹی پلید کی ہے فرعون کی۔ اچھا ہے، ہر فرعون نے را پیرس۔“

ہدایت کار میکنا لچی کے آدمی ہیں۔ توتن خامن کے اوپر تلے کا جائزہ لے کے بولے، ”خوب روباٹ بنایا ہے!“ پھر ٹھہر کے کہنے لگے، ”کمال ہے صاحب!“

میں نے کہا، جی نہیں، robot نہیں ہے، وہ تو بہت ایکسپنسیو مشین ہوتی ہے، اسے اس طرح سڑکوں پہ دو دو چار چار فرانک کمانے کے لیے نہیں بھیج سکتے۔ یہ پیرس کا کوئی بے روزگار (sorry برسرکار) موالی ہے جو کفنی کھوٹے میں لپٹا اپنی دہاڑی لگا رہا

تیسرا حصہ جو چھٹکی بی بی سکینہ سے شروع ہوتا ہے ۶۷۱

ہے۔ یہ تھک جائے گا یا مرجائے گا تو دوسرا آجائے گا۔

ہم یہ سب فن کاری اسپین کے شہر مالگا میں دیکھ کے آرہے تھے۔ انھیں یاد دلایا کہ فلاں پلازا ڈی سول یا اس جامع کیتھڈرل (جیسے جامع مسجد ہوتی ہے) کے بازارِ طلسم فروشاں (یعنی تعویذ فروشاں) میں انگوری روپہلی رنگ کے صندوق پہ موسم بہار کی بیلوں میں لپٹا ہوا جو خوب روشن یسوع مسیح کھڑا تھا، کیا وہ نہیں دیکھا آپ نے؟

وہ بولے، ”نہیں۔“ بھی کیسے دیکھتے... ہم تو آپ کا جیبی ’آئی وا‘ ٹیپ ریکارڈر اور واک مین بدلی کرنے اندر گلیوں میں گئے ہوئے تھے۔ سندھی ہندو کی دکان پہ۔“

میں نے کہا، ”ہاں یاد آیا۔ جیتے رہیے۔ وہ بڑا کام کیا ہے آپ نے۔“

موسم بہار کی بیلوں میں لپٹے اس خوب روشن یسوع کو میں نے ’یسوع بہار‘ کا

نام دیا ہے۔

مجھے نہیں معلوم وہ کسی مقامی سینٹ کا یا چہار اوتادِ زماں میں سے کسی کا impersonation تھا یا اس کے ذریعے انھوں نے جنابِ مسیح کے قلبِ مطمئنہ کو روشنی اور بہار کی علامتوں میں interpret کیا تھا۔ واللہ اعلم۔

مجھے تو اس impersonation نے حد درجے متاثر کیا۔ جی کرتا تھا، اس

ہرے بھرے پیا کے جبے کو بڑھ کے بوسہ دو، اس کی آرا دھنا کرو۔

دیکھا آپ نے، شبیہ بنانے اور تمثیل کرنے میں کیسے کیسے خطرات ہیں۔ مگر یہ

معتقدات اور ادیان سے متعلق مباحث ہیں... not my cup of tea۔

میں تو اس وقت اس بہت بڑے آدمی، یسوعِ ناصری کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

یسوع، کچے ارغوانی رنگ کے کھر درے ٹاٹ میں لپٹے ہوئے... ہتھیلیوں اور پیروں کے بیچوں میں زنگ آلود، کندہ میخیں ٹھکی ہوئی۔ شکم پر، جس طرف آدمی کی تلی ہوتی ہے، ادھر برچھی کا ایک گھاؤ جس سے ہرا بالکل اور خون اور پانی رستا ہوا۔ یہ ہیں یسوعِ ناصری... ریاضت سے دُبلائے ہوئے اس بدن کے ساتھ کہ جس بدن کو بہت مارا پیٹا، scourge کیا گیا، خوب ستایا گیا۔

یسوع، گہری گنبیھر مگر ریشم کی سی سوچ میں ڈوبے، سب سہتے، سب کچھ معاف

کرتے ہوئے۔ اپنے پیروکاروں کے بڑے بڑے بھیانک کرتوت (نوعِ آدم کے

سارے گناہ؟) اپنی جان پہ لیتے، مینے کی طرح معصوم، کانٹوں کا تاج پہنے، ”جی زز۔ نیزا رے نس۔ ریکس۔ جوڈیورم۔“

یہ عبارت ایک تختی پر خباثت اور استہزا کے ساتھ لکھی گئی کہ یہ ناصرہ گاؤں کا (نجار) یسوع، یہودیوں کا بادشاہ ہے۔

بھائی! یہ صبر و رضا کی شاید پرفیکٹ امیج ہو سکتی ہے۔ تاہم وہ آدمی تھے، آخر آخر آدمی۔ انھوں نے شکوے جیسی بس ایک بات کہہ ہی دی کہ الہا! تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا؟

دیکھا آپ نے، یہاں آدمی کلام کر رہا ہے:

...Man forsaken (or betrayed?) by his God

ارض و سما سنو سنو گرم ’فغاں‘ ہے آدمی۔

یہ... اور اس سے کہیں زیادہ ہیں یسوع ناصری... میرے ذہن میں تو یہی دو ہزار سال کی تصویر ہے۔ دیکھیے نا کتنے... کتنے بڑے آدمیوں کو کس برے سلوک میں رکھا ہے آدمی نے کبھی اکیلے میں لگتا ہے کہ رو پڑوں گا، یسوع اور حسین اور زریں تاج اور میٹر تاج کی میرا اور ہزاروں اچھوں کے لیے۔

اور مکے کے تاریک دنوں میں یا تیرہ بخت دانتے کے انفرنو حلقہ نہم میں محمدؐ کے لیے جو برا سوچا گیا، اس پر حد درجہ برہم ہو سکتا ہوں یا چیخ چیخ کے رو سکتا ہوں میں۔ مجھے کوئی شرم نہیں۔

۹ ستمبر ۲۰۰۱ء



باسمہ تعالیٰ

برادر م!

مجھے مصائب کے بیان میں تسکین نہیں ملتی۔

حاشا! یہ میں کسی کے معتقدات پر حرف زنی نہیں کر رہا، توبہ توبہ میں تو خود کو ہمہ وقت کسی بھی نشانے کی زد پر سمجھتا ہوں اور آئینے کے سوا کسی کو بتاتا نہیں کہ میرا کیش

تیسرا حصہ جو چھٹکی بی بی سکینہ سے شروع ہوتا ہے ۶۷۳

اور میرا مسلک کیا ہے۔ تو بھائی! میں کسی سے اس کے عقیدے پر کیا سوال کروں گا اور کیوں کروں گا؟ کس لیے کہ میں آدمی کو ایک بے پناہ عظیم المرتبت scheme of things کا حصہ مانتا ہوں اور مانتا ہوں کہ یہ جس رنگ روپ میں بھی ہے، من موہنا ہے۔ مجھے اس کا تیج اور تجمل اور اس کا آئند بھلا لگتا ہے۔ تو جو جہاں بھی ہے، خوش رہے... بس۔ اور اگلی بات وہی کہ مجھے مصائب کے بیان میں تسکین نہیں ملتی۔

وہ اس لیے بھی کہ میرے باپ کا دین شوکت و دبدبے کا دین تھا۔ حج سے لوٹے تو میرے والد بتانے لگے کہ کعبے کے طواف میں سینہ تان کے اور اکڑ اکڑ کے، گویا (اپنے اور) اپنے خدا کے شوکت و جلال کا اظہار کرتے ہوئے چلنا ہوتا ہے۔ تاکہ غیر دیکھیں اور مرعوب ہوں۔ correct!

اور وہ کہتے تھے کہ شاید یہ واحد موقع ہے جو زمین پر اکڑتے، اینڈتے ہوئے چلنے کو کہا گیا ہے۔ correct!

اور ابا کے خیال میں مصائب کا اور مظلومیت کا اظہار جس کا جی چاہے کرے، پر اور کم زنی لوگ ناں ہی کریں تو اچھا ہے۔ کیوں کہ اس سے نقصان یہ ہوگا کہ دشمن (?) ہمیں کم زور سمجھیں گے اور ہمارے مقابلے میں اپنی زور آوری کا بکھان کریں گے۔ اور یہ خفت کی بات ہوگی۔ correct!

اس لیے میں بھی کہتا ہوں کہ (وقت آئے تو) کھڑے قد سے زمین پر آ رہنا زیادہ glamorous ہے؛ بہ نسبت اس کے کہ پہلے زمین پر گھٹنے آئیں، پھر کہنیاں پھر جبیں بر سر خاک ہو۔

ابا جس طرح چاہتے تھے، اسی طرح گئے اور سید سلیم احمد بھی۔

گھر والے بتاتے ہیں کہ ابا کچھ وقت coma میں رہے، پھر ایک بار آنکھیں کھول کر انھوں نے گرد و پیش کو دیکھا۔ اشارے سے پوچھا کہ کیا پاکستان خبر کر دی گئی ہے؟ پھر کچھ پڑھتے رہے اور چلے گئے۔

کھڑے قد سے آ رہے زمین پر۔

اور اپنے سید صاحب نے بھی رات سونے کو تکیے پہ سر رکھا۔ سویرے معلوم ہوا کہ وہ جو صاحب تھے وہ گمان کا دریا پار کر گئے۔

تو اب کہنا یہ ہے کہ نام کا آوازہ پڑنے سے پہلے میں نے ایک نوع کی شوکت و صلابت اپنے باپ سے اور اپنے اس دوست سے سیکھنے کا جتن کیا ہے (اگر یہ اکتسابی ہے تو)۔

ورنہ دیکھیں گے کیا ہوتا ہے۔



پہلے کہیں میں نے اسپین کے ساحلی شہر مالگا کے Plaza de Sol کا نام لیا تھا۔ Sol یعنی سورج۔ جسے میرا دوست زلفی اپنے کتا بچے سے اُٹھائی ہوئی عبرانی میں ”شم مش“ کہے گا۔ تو اس کے لیے یہ پلازا ہوا ”چوک شم مش“۔

اسپینی ٹورزم والے مالگا (یا مالقہ) کے ساحل (لوکیشن بحیرہ روم) کو ساحل آفتاب کہتے ہیں۔ Costa del Sol۔ پھر ان کے وہاں کئی جگہ Puerta del Sol یعنی گیٹ وے اوف دی سن ہیں، یعنی باب الشمس یا درمہر۔ سورج پر گویا بڑا کام ہوا ہے۔ یہ ٹورزم انڈسٹری کی برکتیں ہیں۔

سارے یورپ ہی میں... خاص کر اوپر اسکیئنڈے نے ویا کے ملکوں میں پیسا بہت ہے، دھوپ نہیں ہے یا سمجھو کم کم ہے تو وہاں کے بندے دسمبر تک میں ڈھکے کھلے، کچھ پہنے کچھ ناں پہنے چلے آتے ہیں اسپین کے ساحل آفتاب پر۔ سردی ہوتی ہے تو مقامی باشندے سردی کا ٹھیک ٹھاک لطف لیتے ہیں، مگر ان کے یوروپین، بالخصوص اسکیئنڈے نے وین دوست آسٹریلیا نہ جا کر یہیں یورپ میں اپنے حسابوں Sunny Christmas منا لیتے ہیں... جیسی جس کے گمان میں آئی۔ بھائی! لاکھ بحیرہ روم کا معتدل ساحلی موسم ہو، ہمارے حساب سے تو اسپین میں سردیوں میں کلکڑ بنتی ہوگی۔ تس پہ بھی سیاحوں کے لیے تیار کیے گئے کتا بچے ”ساحل آفتاب“ اور ”چوک شم مش“ اور ”دروازہ خاور کھلا“ کا جاپ کرتے رہتے ہیں۔ سارے سال جہاز اور ریلیں بھر بھر کے ٹورسٹ چلا آتا ہے۔ خیر جی، ہمیں کیا۔ ان کا سورج ہے جیسے چاہیں استعمال کریں یا ناں کریں۔ آخر ہم بھی تو ہیں کہ اُپلے سکھانے کے سوا سورج سے کوئی کام ہی نہیں لیتے۔

دارالخلا فے مادرید میں بھی سب شہروں کی طرح ایک چوک شم مش ہے۔ مادرید کی بندر روڈ ”ویا گران“ (ترجمہ شاہ راہِ عظیم الشان) کی ایک گلی کے جس ہوٹل میں ہم

تیسرا حصہ جو چھٹکی بی بی سکینہ سے شروع ہوتا ہے ۶۷۵

ٹھیرے تھے، اس سے ملحق صاف ستھرے کھلے کھلے ’بوہری بازار‘ میں آپ سلیقے سے بھٹک جائیے تو کسی نہ کسی طرح اس چوک شمش میں پہنچ جائیں گے۔

ہم دیکھتے ہی سمجھ گئے کہ مادرِ شہر کے بابوں (بابے کی جمع) نے اس چوک کا نام بہت صحیح رکھا ہے۔

مادرِ میں قیام کے اس پہلے دن اگر بادل گھرے ہوئے نہ ہوتے تو سرتاسر خوش گوار دھوپ سے بھرا ہوتا یہ پلازا دی سول۔

ہم اور ہدایت کار دوست اس چوک تک خالص دنیاوی غرض سے گئے تھے، یعنی چھوٹا سا ایک آدھا سفری چیک بھنانا تھا تا کہ شہر میں set ہونے کے لیے ابتدائی funds مہیا ہو جائیں۔ مگر گئے اور پھنس گئے، وہاں پہنچ کر یوں لگا کہ جیسے ہم ماڈے سے بلند ہو گئے ہیں اور خود ایک لطیف (بلکہ ماورائی) گرد و پیش میں ہیں اور لوگوں کو... مادرِ والوں کو، دیواروں، دروازوں، ستونوں سے ٹیک لگائے، ان کے مصروف اوقات میں بھی، جاگتے میں خواب دیکھتے محسوس کر سکتے ہیں۔ ہمیں لگا کہ ہر کوئی دوسرے کے لیے مہر و مروت سے سوچ رہا ہے۔ وہ چہرے پر آدھی مسکراہٹ لیے سامنے دیکھتا ہے اور جو آپ سے نظر مل جائے تو ہلکی... بہت ہلکی nod سے آپ کو گویا approve کرتا ہے، لفظوں کا استعمال کیے بنا کہتا ہے کہ ”you're okay“۔ آپ جیسے بھی ہو ٹھیک ہو اور میں بھی صحیح ہوں۔“

اکیلے دو کیلے جوڑے (زیادہ تر pattern یہ بن رہا تھا کہ مقامی لڑکی اور ایفریکن لڑکا) جہاں تہاں سڑک پر چلتے یا دیوار سے ٹیک لگائے یا کونے میں کھڑے، ایک دوسرے میں لگن، انہماک کے ساتھ ماؤتھ ٹو ماؤتھ (شاید ڈوبے ہوؤں کے rescue operation) میں مصروف تھے۔ ان کی مستعدی دیکھنے لائق تھی، جیسے کسی برکت والی ساعت میں کارِ ثواب میں لگے ہوں۔

”سبحان اللہ!“ ہدایت کار بولے، ”کیا استغراق ہے!“ پھر پوچھنے لگے، ”ہاں برادر!؟... استغراق ہی کہا جائے گا نا؟“

میں نے کہا، بے شک۔

دوسری تیسری بار اس طلسمی چوک پر جانا ہوا تو میں نے لوگوں کے علاوہ بھی

بہت کچھ دیکھا۔

چوک کے وسط میں ایک یادگار سی بن رہی تھی... کوئی abstract مجسمہ جسے ریگزیں یا پلاسٹک کے برقعے میں چھپا دیا گیا تھا۔ مجھے جست کے shafts اس برقعے سے جھانکتے ہوئے دکھائی دیے۔ ہو سکتا ہے sun god یا دیوی ارونا یا بھاسکر دیوا جیسا کچھ بنایا جا رہا ہو اور یہ جستی shafts جنہیں ہم نے جھانکتے دیکھ لیا تھا، اس کے انوار کی تجلیاں ہوں۔ اللہ ہی جانے۔

ایک برس سے زیادہ ہو گیا، اب تک تو مجسمہ بن چکا اور unveil کیا جا چکا ہوگا۔ مادرِ د کا یہ چوک شمش، شہر میں قدم جماتے ہوئے اور قدم جما چکے ایفریقی الاصل نوجوانوں اور پاکستانی، ہندوستانی، جاپانی امی گرنٹس کا رمنہ ہے اور یہ کم دلاویز جیسی لڑکیوں کے غیر جیسی عاشقوں کی پسندیدہ haunt ہے۔ میں نے ”کم دلاویز“ جو کہا تو اس لیے کہ وہاں ایک وقت میں چار چھپیاں دیکھنے کو ملیں۔ ایک (عمداً یا مجبوراً) خود کو ریٹارڈ بنا کے پیش کر رہی تھی۔ دوسری تھوڑی سی بھینگئی تھی... یا بنی ہوئی تھی... اور باقی دو جو تھیں وہ ازکارِ رفتہ تھیں۔ یہاں کے برخلاف ہم نے الحمرا (غرناطہ) کے مضاف میں بعض ”قیامت خیز/توبہ شکن“ (دونوں اسمائے صفات میرے ڈالے ہوئے نہیں، بھائی پروڈیوسر کا عطیہ ہیں) خانہ بدوشیں دیکھی تھیں۔ ان کے بارے میں کیا عرض کر سکتا ہوں۔ مختصراً یہ کہ خدا اُن کی عمریں دراز کرے۔

چوک شمش کی وہ تھوڑی بھینگئی چمن (اور اس کا عاشق، دونوں ہی) حد درجہ استاد نکلے۔ تفصیل عرض کرتا ہوں۔

میں اور ہدایت کار دوست آدھے گھنٹے سے زیادہ اس چمن کو observe کرتے رہے تھے۔ وہ اپنے جیسی get up، مطلب گھاگھرا، منکوں کے زیورات، سر سے بندھے رومال اور قسمت کا حال بتانے والے ہارڈ ویئر کے ساتھ ضرور تھی، تاہم پتھر کی منقش دیوار سے ٹیک لگائے وہ اپنی زبان میں Harold Robbins کی The Carpet Baggers پڑھ رہی تھی اور قسموں کا حال بتاتی ہوئی اپنا کھا، مانگ رہی تھی۔ پاس ہی اس کا (دراصل اس کے عاشق کا) میلا، لانڈری کو بھیجے جانے لائق جھبرا سفید کتا پڑا سو رہا تھا۔

تیسرا حصہ جو چھٹکی بی بی سکینہ سے شروع ہوتا ہے ۶۷۷

دنیا بھر کے قدیم juveniles کے لیے روبنز کی کتابوں کا درجہ وہی ہے جو سخت اسلامی قارئین کے دلوں میں صادق حسین صدیقی سردھنوی یا نسیم حجازی ٹائپ کی ”فتح یرموک“ یا ”تلوار ٹوٹ گئی“ کا مرتبہ ہوگا۔

میں نے اپنے juvenile years میں روبنز کو اور اس سے پہلے کے زمانے میں سردھنوی کو پڑھا تھا، اس لیے دونوں مظاہر کو سمجھ اور انالائز کر سکتا ہوں۔

اس پاسٹ جووی نائل عمر کی بی بی کو اتنے انہماک سے روبنز پڑھتے دیکھ کر کوئی اچنبھا نہیں ہوا۔ حیرت اس وقت ہوئی جب اس کا (بہ ظاہر غیر چپسی اور بہ ظاہر نابینا) عاشق سیاہ چشمہ پہنے سفید چھڑی لہراتا آیا۔ آتے ہی اس نے چشمہ اتارا، بی بی کی کتاب ایک طرف سرکائی، اُس کے شلو کے میں ہاتھ ڈال، اب تک کے کمائے سب پیسے قابو کیے، انھیں احتیاط سے گن کر چھوٹے بڑے denominations کی ترتیب سے جمایا۔ جمانے کے بعد اپنی ہپ پاکٹ میں پہنچایا۔ ہمیں آنکھ ماری پھر کتے کا سر سہلایا، پانچ سات منٹ اس کے ساتھ کھیلا، زان بعد چپسی بی بی کو پہلو میں لے، اس پہ ہر طرف سے توجہ کی اور پھر وہی ڈوبتے ہوؤں کو rescue والی ماؤتھ ٹو ماؤتھ کی ایمرجنسی خدمات انجام دیں، شلو کے میں ہاتھ پہنچا کے اسے تھپکتا، تسلی دیتا رہا پھر جس تیزی سے آیا تھا، اسی تیزی سے کالا چشمہ پہنتے ہوئے چلا گیا۔

بی بی نے دوبارہ ہیرلڈ روبنز کھول لیا اور وقفے وقفے سے گاہکوں اور مخیر لوگوں کے نصیبوں کا حال بتانے لگی۔

ہدایت کار دوست، ادھر، جس گلی میں چپسن کا عاشق گیا تھا، دیکھتے ہوئے خاصے جھنجھلا کے بولے، ”وہ حرام الدہر، نابینا، سب پیسے کھینچ لے گا اس کے... دیکھ لینا، قلاش کر دے گا۔“

میں نے کہا، ”یہ بھی حرفوں کی بنی ہوئی ہے۔ اُس سالے سے، اُس کے جھبرے کتے تک سے بھیک نہ منگوادے تو کہنا۔“



چوتھا حصہ : بارے کوٹھوں کا کچھ بیاں ہو جائے

بھائی!

شہروں کا ایک بگاڑ یا شامت کہہ لیجیے، یہ ہے کہ وہ پھیلتے ہیں تو ایک یا ایک سے زیادہ ریڈ لائٹ ڈسٹرکٹ وجود میں آتے ہیں جہاں (انگریزی محاورے میں) قدیم ترین پیشہ کرنے والیاں اور کرانے والے آ بیٹھتے ہیں۔ کبھی اس کے برعکس بھی ہو جاتا ہے کہ پہلے ایک کوٹھا قائم ہوتا ہے، بعد کو عامۃ الناس پہنچنا شروع ہوتے ہیں اور دیکھتے دیکھتے شہر بس جاتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے غلام عباس صاحب کی کہانی ”آنندی۔“

میں نے ”کرانے والے آ بیٹھتے ہیں“ لکھ کر اُن قلم ساق دلالوں کو گفتگو میں شامل رکھا ہے جن کے بغیر یہ بازار مناسب رفتار سے چل نہیں سکتا۔ میسواؤں، ٹکیائیوں پر بات کرتے ہوئے ان صاحبان کے ذکر اذکار ضرور ہونے چاہئیں۔ ورنہ ہوتا یہ ہے کہ اپنا ”اچھا“ وقت گزار کر ٹکیائیاں غریب تو بڑھا پے سمیت بہت سے عوارض میں مبتلا ہوتی اور اپنی ذلت و خواری میں مٹ جاتی ہیں مگر یہ صاحبان موقع پاتے ہی لوکیشن بدل لیتے ہیں اور کلف لگے کپڑے پہن کر گھی چڑی روٹی کھانے اور نیک باتیں کرنے لگتے ہیں۔ جی کرتا ہے تو تیرتھوں زیارتوں پر نکل جاتے ہیں۔ اسی لیے منٹو صاحب نے ریڈ لائٹ ڈسٹرکٹ سے اٹھائی ہوئی اپنی (تقریباً) ہر کہانی میں انھیں، دلالوں کو، شامل رکھا ہے...

نکلنے نہیں دیا ہے سروں کو۔

میں نے اردو فکشن پڑھنا شروع کیا تھا تو وہ دور چل رہا تھا کہ میاں ایم اسلم اور دوسرے معتبر لکھنے والے ”حسن سوگوار“ یا اسی قبیل کی ناولیں لکھتے تھے، برسوں پہلے ”امراؤ جان ادا“ چھپ کر مقبول ہو چکی تھی۔ ہمارے بیش تر لکھنے والے سخت رومانی ماحول میں اداس ہو ہو کر کوٹھوں پر جاتے اور اسٹیریو ٹائپ کہانیوں میں ”مطرباؤں“ کے شب و روز کی اداسی بیان کرتے ہوئے آ جاتے تھے۔

خیر، ترقی پسند آئے، انھوں نے خاصی ڈانٹ ڈپٹ کی اور اردو کہانی کو کوٹھوں و وٹھوں سے اتار کر کھولیوں وغیرہ میں لائے۔

اور کچھ برس گزر گئے، ترقی پسند بھی قصہ پارینہ ہوئے، علامتی دور اور پھر سن پچھتر، سن اسی آ گیا۔ تو یہ اُس زمانے کی بات ہے جو میں اِس وقت سنانے جا رہا ہوں۔ ایک ہفتے وار اردو جریدے کے مدیر نے مالکِ جریدہ کی فرمائش پر... جو بہت سے مطرباؤں والے ناول پڑھ چکا تھا... مجھ سے رابطہ کیا اور مجھے آمادہ کیا کہ میں کوٹھے پر کوئی قسط وار کہانی لکھوں۔ میں نے کہا برادرِ م! اپنے اس جہل پر شرمندہ ہوں کہ میں نے کوٹھے نہیں دیکھے، کس لیے کہ پشتینی زمیں داری ختم ہو چکی تھی، والد اسکول پڑھانے لگے تھے اور ہم بچوں کی مصروفیات کو ٹھیک ٹھاک مونیٹر کرتے تھے پھر ہماری بلوغت کا زمانہ سینتالیس اور ہجرت کے آس پاس کا زمانہ تھا۔ گویا ہم وہ تھے جن کو عہدِ جوانی نہیں ملا۔

تاہم، میں نے بتایا کہ جب میں علامہ میکش اکبر آبادی کے ایک داماد کی وجہ سے دو روز کے لیے آگرے میں ان کا مہمان ہوا تھا اور ہوا کی تلاش میں چھت پر جا سویا تھا تو دوست سے معلوم ہوا تھا کہ یہ سامنے فلم ”برسات“ کی ممثلہ کا کسی زمانے کا کوٹھا ہے اور وہ دور تاج محل نظر آ رہا ہے۔ ممثلہ کے برابر کا بالا خانہ عین میرے پلنگ کے سامنے واقع تھا تو میں نے اُس کی ایک منزل پر مگرے ہوتے سنے اور دوسری منزل پر جھک مارنے کی غرض سے آنے والے گاہکوں کو آتے جاتے دیکھا۔

میری سماعت کی زد اور فیلڈ آف وژن سے ذرا بلندی پر اُس کوٹھے کی چھت تھی جہاں in-mates کی چار پائیاں بچھی تھیں اور کھلا آسمان تھا۔ ڈیڑھ دو بجے کے بعد مطربہ اور اس کی بوڑھی نانکہ آئیں۔ جھلنگا چار پائیوں پر بیٹھ کے انھوں نے آٹے دال

چاول کی mundane باتیں کیں، کھانا کھایا، جس کے دوران وہ ایک دوسرے کو اصرار کر کے اچار اور گھی ملا گڑ دیتی رہیں۔ پھر مطربہ نے اپنے بہت چھوٹے بھائی (یا بیٹے) کو جگایا، منایا اور خوشامد کر کے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلایا۔ بعد کو لڑکے نے اپنی اس ”آپا“ سے (وہ یقیناً اُس کی ماں ہوگی) کہانی سننے کی ضد کی تو اس نے بہت لاڈ سے کہانی سنائی جو ”گلِ صنب بر اور باشا جادے“ کی کہانی تھی۔

میں نے اپنے شہر کے مقبول جریدے کے مدیر کو یہ بھی بتایا کہ جب میں پندرہ سولہ برس کا تھا تو اپنے ایک کزن اور اُس کے زیرِ تربیت پولیس مین دوست کے اصرار پر سردیوں میں اور کوٹ میں چھپ کر اپنے پرانے شہر کے مضاف میں رنڈی بازار دیکھنے بھی گیا تھا۔

میں نے بتایا کہ یہ ایک نہایت غیر دلچسپ تجربہ تھا جس سے کچھ حاصل نہ ہوا۔ شہر کے پاور ہاؤس نظام کو ٹھنڈا رکھنے والے حوضوں کے ساتھ ہی جھونپڑیاں اور کچی باڑیاں سی بنی تھیں (اُن حوضوں کو مقامی بولی میں گرم گڈھے کہا جاتا تھا)۔ باڑیوں میں نیچے گودام جیسے تھے اور بہت سی سیڑھیوں کے اختتام پر بڑے درتچے یا چھوٹے دروازے تھے جن کے پیچوں نیچے ننگے بلب جل رہے تھے۔ بلبوں کی خیرہ کن موجودگی میں (شاید آٹے کی مدد سے) اپنے چہرے سفید کیے دو تین miserable دیہاتیں بیٹھی تھیں۔ ایک نے ہمیں گزرتے دیکھ کر آواز دے کے کہا تھا کہ آجا رے راجا! اوپر آجا، گرمی آجائے گی۔

تجسس ختم ہو چکا تھا اور ہم دونوں کزن اور وہ زیرِ تربیت پولیس والا خفت میں کھلکھلاتے اور سردی سے کانپتے بھاگ آئے تھے۔

میں نے مدیر سے کہا کہ بھائی! آپ ہی بتائیے اتنے puny تجربوں سے میں کہاں کا اور کتنا کوٹھاری کری ایٹ کر پاؤں گا؟

وہ بولے مشاہدہ بھی تو کوئی چیز ہے۔ صاحب! یہ پرانے قصے چھوڑیے آپ اب جائے کوٹھوں پہ۔ مشاہدہ کیجیے، کچھ مطالعے سے بھی کام لیجیے۔ شورش صاحب کی کتاب ”اس بازار میں“ بار بار پڑھیے۔ اور بھی کتابیں ہیں۔ ہو سکے تو imagination سے کام لیجیے۔ لکھنے والا تو وہ جن ہوتا ہے کہ جب چاہے اپنے دماغ میں اچھی خاصی ہیرا

منڈی آباد کر سکتا ہے۔

پھر یہ بھی تو ہے کہ ہم سب کو ہزار دیتے ہیں۔ آپ کو ایک قسط کے پندرہ سو روپے دیں گے۔

یہ آخری بات مناسب طور سے میری سمجھ میں آگئی۔

میں نے پرچے کے لیے سیریل لکھنا شروع کر دیا۔ دس بیس قسطوں کے بعد جریدے کے مالک نے چائے پر بلایا۔ کہنے لگا کہ محترم! کہانی میں کچھ مزہ نہیں آ رہا، نہ قتل ہوئے ہیں، نہ کوئی سنسنی خیز ٹن (turn) آیا ہے۔ آپ تو اپنے زنانہ کرداروں کے بیڈ روم تک میں نہیں جاتے۔ میں نے کہا، ”برادر! میرا وہاں کیا کام؟“ وہ ہنسے، پھر اداس ہو گئے، بولے کہ آپ نے اس طبقہ اناث کو exploited اور مظلوم بنا کے پیش کیا ہے۔ ”سر! معافی چاہتا ہوں یہ تو بڑی چھنالیں ہوتی ہیں اور حضرت! یہ کیا کر رہے ہیں آپ کہ دلالوں کو اتنا منافق اور بھیانک دکھا رہے ہیں۔ دیکھیے نا، برائی کی اصل جڑ تو یہی فاحشائیں ہیں۔“

میں نے کہا، ”فاحشاؤں کو چھوڑیے... اب چلتا ہوں، کل فون کروں گا۔“ اور میں چلا آیا۔ میرے رخصت ہونے کے بعد مدیر سے کہنے لگے کہ اگر خاں صاحب کو نہیں روکا گیا تو سیریل کے آخر ہوتے ہوتے وہ اس کوٹھے کی سیڑھیوں سے دو چار کرداروں کو سفلس یا گنوریا میں مبتلا کر کے اتاریں گے (اُس وقت تک Aids کا ذکر اتنا عام نہیں ہوا تھا) ان سے کہو سر! ویسے ہی کافی دہشت پھیلی ہوئی ہے۔ اپنے قاری کو اور ہلکان اور اداس ناں نہ کریں۔ خیر، میں نے فوری طور پر یہ سیریل بند کر دیا اور کہیں اور، کچھ اور کرنے لگا۔



میں نے ”کہیں اور، کچھ اور“ کرتے ہوئے عمر عزیز کا بڑا حصہ گزارا ہے۔ لکھنے والا بھی عام لوگوں کی طرح اپنا اصل دھندا... یعنی لکھائی... نمٹانے کے لیے روزی کمانے کے بہانے ڈھونڈ لیتا ہے۔ وہ بندرگاہ پر کام کرتا ہے، ٹریول ایجنسی میں یا ریلوے میں نوکری کرتا ہے۔ کچھ دنوں کے لیے کلرک، پبلشر، کمرشیل آرٹسٹ، انگریزی کا استاد یا ریڈیو نیوز ریڈر ہو جاتا ہے... ایسی کتنی ہی مصروفیات ہیں۔ اور لکھنے والا کیوں کہ لکھنے پڑھنے کے سوا کم ہی کوئی اور کام اتنی لیاقت اور مہارت سے کر سکتا ہوگا، اس لیے وہ جھٹ

کمرشیل رائٹر بن جاتا ہے۔ ریڈیو ٹیلی وژن کے لیے گیت اور ڈرامے یا فلموں کے لیے مکالمے لکھتا ہے اور نظیر اکبر آبادی کی طرح ٹیوشن پڑھاتا ہے۔

میں خوش ہوں کہ میں نے اوپر بیان کیے گئے سب کام کیے ہیں اور اس دوران جنت مکانی ابا کی دو بنیادی ہدایتیں یاد رکھی ہیں۔ انھوں نے کہا تھا کہ میاں! کبھی اپنے لیے، یا اپنوں کے لیے گری ہوئی روٹی مت اٹھانا اور خود کبھی گری ہوئی مجلس میں نہ بیٹھنا (یہ واضح طور پر رنڈی بازوں کی صحبت سے بچتے رہنے کو کہا گیا تھا)۔ وہ کہتے تھے کہ یہ دونوں کام self respecting بھلے لوگوں کے کرنے کے نہیں ہیں۔ تو میں نے اٹھاون برس کی عمر تک اپنی مجلس کے سلسلے سے احتیاط برتی مگر پھر کچھ نہ کچھ wayward لکھنے کے لیے (یا کسی طرح کا تجسس کہہ لیجیے) مجھے بیسواؤں کے علاقوں / کوٹھوں میں بے ثواب (اور مختصر) تاک جھانک بھی کرنی پڑی، سو میں لندن کے علاقے سوہو میں گھوما، پیرس کے محلے پگال میں مٹر گشت کی، بنکاک شہر کی میونسپل حدود میں موجود رہا (وہاں وہ لائیو شو دیکھا جو کاماسوترا کے مصنف نے دیکھا، سنا، سوچا تک نہ ہوگا)۔ اور میں شہر غرناطہ کے ایک مشہور اڈے ”سان خورنے کلب“ یعنی ولی جورج (نور اللہ مرقدہ) کے نام سے منسوب کوٹھے پر بھی گیا۔

اب جب کہ سانجھ کی بیلا ہے، پرندوں کے گھر لوٹنے کا وقت ہے تو میں بڑی ہیکڑی کے ساتھ یہ سب لکھ رہا ہوں۔ میرے بچوں کے بچے تک میری timing کی اس چالاکی پر ہاتھ کی اوٹ کیے مسکرا رہے ہوں گے۔

مگر ذرا رکیے! پہلے میں آپ کو مادرِد (Madrid - اسپین) کے Bash Bojari سے ملاتا ہوں۔ انھوں نے پہلی ملاقات میں ہم سے یہی کہا تھا کہ دوستو! یہاں مادرِد میں کوئی اطالوی آپ سے بات کرنا چاہے تو ٹال جانا، اشارے سے کہنا کہ ہم انگریزی تک نہیں جانتے، sorry۔ ہم نے پوچھا کس لیے؟ کہنے لگے، اطالیہ کے بھلے لوگ ادھر کم ہی آتے ہیں۔ بیش تر وہی سفیلے، جو روم میں بھی دلالی پیشہ تھے، ادھر آن مرے ہیں اور ماحول خراب کر رہے ہیں۔ اس لیے برادرِ م! سوری کہہ کے جان بچانا۔ اللہ بہتر کرے گا۔

بیش بوجاری اپنی طرف کے ہیں... پوٹھوہار کے یا لائل پور کے میدانی علاقے

چوتھا حصہ: بارے کوٹھوں کا کچھ بیاں ہو جائے ۶۸۳

کے پیدائشی... نام ان کا بشارت بخاری ہے۔ لفظ بشارت کو انھوں نے عام اسپینیوں کے لیے Bash کر کے آسان کر دیا ہے اور کیوں کہ Spanish میں جیم کی آواز کو خ (اور کبھی 'ح') سے اور حرف خ کو جیم سے بدلنے کا دستور ہے، سو یہ بخاری سے بجاری بلکہ بوجاری ہو گئے۔

سنا ہے کبھی یہ اپنی ایئر فورس میں جنرل ڈیوٹی پائلٹ تھے، بعد کو فلائنگ اوفیسر یا فلائٹ لیفٹیننٹ کے عہدے سے ریٹائر ہو کر مادرید کے ہوائی اڈے پر جہازوں کو اڑانے اتارنے کی اجازت دینے والوں میں ملازم ہو گئے۔ ان کے کہے بنا پرندہ پر نہیں مار سکتا۔ اوپر سے دوسرے (یا تیسرے) نمبر کے منصب پر فائز ہیں۔

میں نے یہ تفصیل جان کر کہا کہ بیش صاحب! پھر تو آپ کوٹ مادرید کے نائب قلعہ دار ہوئے؟ تو عزیزم افتخار عارف کی طرح ہنسے اور اپنی ناک کے بانے پر ایک انگلی سے چشمہ ٹھیک کر کے بولے، ”جی سرکار! نیاز مند ہوں بہہ ہا... جو چاہے آپ کا حسنِ کرشمہ ساز کرے۔“

یہ پہلی ہی ملاقات میں اتنے مزے کے آدمی لگے کہ میں نے دل ہی دل میں انھیں ان لوگوں میں شامل کر لیا جنہیں کم سے کم سات خون معاف کیے جاسکتے ہیں۔ بعد کو احساس ہوا کہ شامل کرنے کا یہ عمل بہت ضروری تھا، اچھا ہوا جو بروقت شامل کر لیا۔

اپنے بیش صاحب پوٹھوہاری (لائل پوری؟) ہوائی جہازوں کے علاوہ بھی اڑاتے بہت ہیں۔ تفصیل عرض کرتا ہوں۔

مادرید میں ہم سے ملاقات کے دوسرے ہی دن انھوں نے ویاگران (مادرید کی دو عظیم الشان شاہ راہوں میں سے ایک) کے ایک پاکستانی ہوٹل میں ہمیں رات کے کھانے پر بلالیا۔ اپنی روایتی پوٹھوہاری (یا لائل پوری؟... اب یاد نہیں) مہمان نوازی سے کام لیتے ہوئے بیش صاحب، ہماری ضیافت کے لیے ہوٹل والے کو فون پر کوئی درجن بھر dishes لکھوا چکے تھے۔ خیر، ہم قریب ہی ٹھہرے ہوئے تھے، قبل از وقت جگہ دیکھنے کی نیت سے (ویسے بھی بے کار بیٹھے تھے) ہم ٹہلتے ہوئے ہوٹل پہنچ گئے۔ وہاں جب یہ معلوم ہوا کہ بیش صاحب نے ہمارے لیے اتنا وسیع دسترخوان سوچا ہے تو ادھر ادھر فون

کھڑکھڑا کے ہم نے انھیں تلاش کیا اور گزارش کی کہ ہم اتنا بہت سا اور اس قدر متنوع نہیں کھا پائیں گے، تھکے ہوئے ہیں، ویسے بھی کراچی سے آئے ہیں۔ اس لیے ازراہ کرم کچھ ڈشیں معزول کر دیجیے۔ اس کمی پر بیش بہت مشکل سے راضی ہوئے۔ (بھائی! آپ نے یہ کمی اور بیشی کا حسن تضاد ملاحظہ کیا؟)

خیر، وقت مقررہ پر یہ بھی اور ہم بھی ہوٹل پہنچے۔ کھانا شروع ہوا۔ حسب معمول پہلے مشروب منگائے گئے۔ ہدایت کار دوست نے معذرت کر لی۔ اگرچہ جانتے تھے کہ دل آزاری گناہ ہے۔ تاہم میں نے تالیفِ قلب کے لیے کچھ پیش رفت کی... مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔ خیر، بیش نے اپنے ظروف سے کھیلے ہوئے جیسے شہر خوش کلامی کا دروازہ کھول دیا۔ کیا مزے مزے کی باتیں کیں اُس شیر بیشہ گفتار نے کہ جی خوش کر دیا۔

بتانے لگے کہ ایئر فورس میں خدمات کے دوران انھوں نے طیاروں کو جس بے جگری سے سطح زمین (یا درختوں کی پھٹنگوں) سے آدمی کے قد اتنی جگہ چھوڑ کے اڑایا ہے تو وہ واقعات اپنی فضائیہ کے legend کا حصہ ہیں (بعض واقعات تو بیش صاحب کی سروس بک میں سرخ روشنائی سے درج کر دیے گئے ہیں) بیش کو پوری سروس کے دوران سات بار reprimand کیا گیا۔ دو مرتبہ CL (یعنی confinement to lines) ملا۔ ایک مرتبہ تو وردی اتر جاتی اگر بزرگوں کی دعائیں شامل حال نہ ہوتیں۔ آخر بے جگری سے طیارہ اڑانے کے سلسلے میں انھیں ٹھیلے، بڑھاوا دیتے ہوئے چار چھ میڈل عطا کیے گئے اور فضائیہ سے فارغ کر دیا گیا۔ اب یہ پچیس برس سے کوٹ مادرید کے نائب قلعہ دار ہیں (واضح رہے کہ پندرہ سولہ سال یہ اپنی فضائیہ میں طیارہ شکن تیز رفتاری بھی دکھا چکے ہیں، تو کل مدت پچیس جمع پندرہ مساوی چالیس ہوئی)۔ ہدایت کار دوست نے ڈرتے ڈرتے کہا، ”بیش! آپ مجھے بیالیس پینتالیس سے زیادہ کے نہیں لگتے اور آپ کہہ رہے ہیں کہ آپ یہاں اور وہاں ملا کے کوئی...؟“

ہنسنے لگے، بولے، ”یہاں جو چھ برس میں نے بل فائٹنگ کی ہے اس کا تو ابھی کوئی ذکر ہی نہیں کیا ہے۔ بھائی جان! میں جتنا یگ نظر آتا ہوں اصل میں اتنا ہوں نہیں، بہہ ہا ہا... یہی حیرانی شاہ اسپین ہر میجسٹی کنگ کارلوس دی سیکنڈ کو بھی ہوئی تھی۔“

کنگ کارلوس کے حوالے پر زیادہ سے زیادہ مسکرایا جاسکتا تھا... ہنسنا ممکن نہیں

چوتھا حصہ: بارے کوٹھوں کا کچھ بیاں ہو جائے ۶۸۵

تھا... کتنی ہی کہانیوں میں سنا تھا کہ بادشاہوں پر یا ان کا نام نامی سن کر ہنسنا، کھلکھلانا بربادی کو دعوت دینا ہوتا ہے۔

خیر، بیش بتانے لگے کہ جب پہلی بار یہاں مادرید میں ایوی ایشن کلب کی ایک تقریب میں ماخس تاد (میجسٹی) تشریف لائے تھے تو انھوں نے اس خادم کی طرف نظر کی تھی اور Spanish میں فرمایا تھا... یہاں بیش نے شاہ کے فرمودے کا انگریزی ترجمہ سنایا جس کی چنداں ضرورت نہیں تھی۔ خیر، وہ کچھ اس طرح کا تھا کہ ینگ مین! تمہارے بارے میں ہوائی رسل و رسائل کے وزیر نے کلمات خیر کہے ہیں، ہم خوش ہیں (بادشاہ لوگ ”میں“ نہیں کہہ سکتے، ہمیشہ ”ہم“ کہتے ہیں)... ہم خوش ہیں کہ تم اپنے فرائض کی بجا آوری کے سلسلے میں یہاں مادرید میں موجود ہو۔ پھر شاہ کارلوس نے از راہ شفقت فرمایا کہ میاں! ملتے رہا کرو۔

آگے بیش بتانے لگے کہ شاہ اور وہ دونوں ایک دوسرے سے اتنی بار ملتے ہیں کہ ایک نوع کی بے تکلفی ہو گئی ہے۔

میں نے پوچھا، ”وہ آپ کا نام لیتے ہوں گے؟“
بولے، ”اور کیا؟... بیش کہتے ہیں یا بہت لاڈ میں ہوئے تو ’ہائی ینگ مین‘ کہہ کے بلاتے ہیں۔“

میں نے کہا کہ آپ انھیں کیا کہتے ہیں؟ ’ہائی کارلوس‘! یا ’ہیلو سیکنڈ‘؟ (ظاہر ہے، میں نے سوچا، فرسٹ کارلوس تو ہو گزرا) ہنسنے لگے، بولے، ”بھائی جان! بادشاہ آپ سے جتنا چاہے فری ہو جائیں آپ کو بہر حال پروٹوکول کی حدود میں رہنا ہوتا ہے۔ اس لیے میں بھی سب کی طرح انھیں ’ماخس تاد‘ یعنی Majesty کہتا ہوں۔“

ایسے ہی میں نے اپنی معلومات کے لیے دبے لفظوں میں پوچھ لیا کہ ان بادشاہوں وغیرہ کو خالی Sir یا Sire نہیں کہہ سکتے؟

ہدایت کار پریشان ہو کے بولے کہ واہ بھائی جان! سر، ور کہہ کے مرنا تھوڑا ہی ہے۔ شاید اپنے مغل لوگ تو اس طرح کی بے ادبی پر جن بچہ کولھو میں پلوا دیا کرتے تھے۔ پھر پوچھنے لگے، ”کیوں بیش بھائی! یہاں اسپین میں تو ایسا کوئی رواج نہیں ہوگا؟“
بیش مسکرائے۔ بولے، ”آپ دونوں بہت خوش مزاج ہو۔ خدا عمریں دراز کرے!“

میں نے کہا، ”دوست! میرے سلسلے سے یہ درازی عمر کا ریکٹ مت چلاؤ۔ میں ویسے ہی خاصا سینئر ہوں۔ پھر جو اپنی پیدائش کا سال بتایا تو مربیانہ تبسم کے ساتھ کہنے لگے، ”میاں صاحب! آپ بڑے بے شک ہو لیکن اتنے بڑے بھی نہیں ہو، ہا ہا ہا! میرے آپ کے بیچ چند ہی برسوں کا فصل ہے۔“

اللہ جانتا ہے، ایسا متواضع جوان میں نے زندگی میں دوسرا نہیں دیکھا۔ خدا بیش بوجاری کے مراتب فزوں کرے۔

اب کچھ سان خورنے کلب کے بارے میں:

سنت جورج یا ولی خورنے کے روحانی منصب سے میں یا میرا ہدایت کار دوست اور میرا پروڈیوسر دوست تاحال ناواقف ہیں۔ غرناطہ کے یہ بزرگ، صلیبی مجاہد (دہشت گرد؟) کروسیڈر تھے یا کوئی شب زندہ دار عابد؟ ولایت ان کی مادر زاد تھی کہ پاپائے روم کی صوابدید پر ولی بنائے گئے؟ ہمیں نہیں معلوم۔ ہمیں کیوں کہ دن کے اوقات میں الحمرا کے محلات (کمپلیکس) دیکھنے میں کامیابی نہ ہو سکی تھی اور کیوں کہ سہ پہر کا وقت پہاڑ سا ہمارے شانوں پر دھرا تھا اور کیوں کہ غرناطہ شہر سے جو ٹیکسی ہمیں ڈھو کر قصور الحمرا تک لائی وہ ابھی وہیں ڈولتی پھر رہی تھی، اس لیے بھائی پروڈیوسر نے اسے پھر engage کر لیا۔

انگیج کرتے ہوئے انھوں نے (اپنی دانست میں) ایک بے ساختہ خیر سگالی کے تحت اور ٹیکسی والے کے حسابوں کی معنی خیز بے تکلفی سے کہا کہ دوست! ہمارے پاس تھوڑا وقت ہے تو ہمیں کسی دلچسپ جگہ لے چل۔ ٹیکسی والا، اس خدائی خوار لفظ ”دلچسپ“ پر کھیل گیا اور خوشی خوشی ہمیں گاڑی میں بٹھا ولی خورنے کے آستانے پر لے آیا۔ ہم سمجھے یہ ملامتیہ فرقے کے کسی صاحب رمز بزرگ کا آستانہ ہے جو ممنوعات و مکروہات و نواہی کے روبرو لا کر وابستگان بارگاہ کی اصلاح فرماتے ہوں گے ورنہ یہ چھ آٹھ رنڈیاں یہاں بار سے ٹیک لگائے کھڑی کیا کر رہی ہیں؟

خیر، اب عرض یہ ہے کہ اور کچھ ملا ہو، نہ ملا ہو... (میں یہ کیا کہہ گیا؟) سچ تو یہ ہے کہ سبھی کچھ دیا ہے پالنبہار نے، اور ایک عطیہ خداوندی سے تو اس طرح نوازا گیا ہوں کہ کبھی تو بظاہر بے وجہ، بے اختیار زبان سے کلماتِ شکر ادا ہوتے ہیں (جنہیں لوگ

ڈراما سمجھتے اور گھور کے دیکھنے لگتے ہیں)۔

وہ خداوندی عطیہ ہے Great Expectations کا کہ جب بھی کوئی بھلی بات ہونے والی ہوتی ہے یا میں کسی بیان کردہ پُرفضا مقام کی سیر کو نکلنے کو ہوتا ہوں یا کسی پسندیدہ آدمی سے ملاقات کے لیے چلتا ہوں؛ تو میری خوش فہمی اس بھلی بات، اس پُرفضا مقام، اس پسندیدہ آدمی کا خوب بڑھا چڑھا کر ایک پیکر تیار کر لیتی ہے۔ پھر حقیقی دنیا میں جب وہ بھلی بات، وہ پُرفضا مقام، وہ پسندیدہ آدمی میرے سامنے آتا ہے تو اسے میں اپنی قائم کی ہوئی توقعات کے مطابق دیکھتا، برتاؤ اور خوش ہوتا رہتا ہوں۔

بے تکلف دوست اور گھر والے اسے میرا کوئیکزائٹک (Quixotic) رویہ کہتے ہیں۔ میں برا نہیں مانتا؛ تاہم ذرا سی تصحیح کے ساتھ ان سے اتفاق کرتا ہوں اور کہتا ہوں کہ اسے ”معکوس کوئیکزائٹ“ کہہ لو، کیوں کہ ڈون کیہوٹے صاحب کی متخیلہ مشتعل ہوتی تو ہوا چکی کو راکھشس سمجھ لیتی اور انھیں بھڑ جانے پہ اکساتی تھی؛ جب کہ یہ خاکسار تو اصل نسل راکھشسوں کو چکیاں مان کے خوش ہونا شروع کر دیتا ہے۔ یہ ہے بنیادی فرق مجھ میں اور کیہوٹے میں۔

اہلیہ میری ان باتوں سے جل کے رہ جاتی ہیں۔ ظاہر ہے وہ (انگریزی محاورے میں) پھاؤڑے کو پھاؤڑا پکارنا پسند کرتی ہیں۔ اس رویے کے برخلاف، میرے لکشن (یا لکھن) وہ ہیں، جو خلد آشیانی اسد اللہ خاں غالب کے تھے کہ جنھوں نے ”صاحب کے کف دست پہ“ چکنی ڈلی کو اس ”قدر اچھا“ دیکھا اور دکھایا تھا کہ کیا سے کیا بنا دیا تھا۔

قصور الحمر سے چلتے ہوئے ہمارے ٹیکسی ڈرائیور نے سمجھایا تھا کہ سان خورنے جانا خوب ہے، لطف آجائے گا۔ بعد کو پروڈیوسر دوست کچھ بینکی بینکی (یا fishy) سونگھ کر اچانک ڈرائیور کی سازش میں شریک ہو گئے تھے۔ انھوں نے بہت سوکھے سے منہ سے ہدایت کار دوست کو اور مجھ ڈون کیہوٹے کو باور کرا دیا کہ یہ St. George یا ولی خورنے یا سنت کھورکھے، ممالک آئبیریا (Iberia) اسپین و پرتگال کی عظیم تاریخ کے اور کلچر کے مرکزی آدمی لگتے ہیں جیسے ہند فارسی کلچر کے اپنے امیر خسرو رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

بعد کو ہم ٹیکس دریا اور دارالخلافہ لزبن دیکھنے پرتگال پہنچے تو وہاں بلند ترین

الکازر (القصر) کے دمے پر سان خورنے کا کانسی کا کوہ پیکر بت دیکھا جو سامنے اٹلانٹک کی سمت سے آنے والے ٹورسٹوں پر کڑی نظر ڈالتے ہوئے اپنی تلوار ٹکائے کھڑا تھا... بالکل میری ایک کہانی کے ڈکاروں والے ممند ریاض کی طرح، جسے کوٹھوں پر آنے والے گاہکوں کو دور سے scan کرنے کا ملکہ حاصل ہے۔

تو سلسلہ کلام وہیں سے جوڑتا ہوں کہ جہاں میں نے سان خورنے کلب کی بیسواؤں کو بار بار پر ہجوم کیے دیکھ کر گمان کیا تھا کہ ہونہ ہو اس صاحبِ آستانہ کا تعلق ملامتیہ فرقے سے ہے اور یہ اپنے ارادت مندوں کو پہلے مکروہات و نواہی کے سامنے لا کر چند در چند ممنوعات سے متعارف کراتے ہیں پھر ان کی اصلاح فرماتے ہیں۔

مگر یہ میری وہی بیان کی ہوئی بد عادت (یا معذوری) تھی۔ میں نے اصل دیو زادوں کو پھر پون چکی سمجھ لیا تھا۔ فی الحقیقت ہم ایک فتنہ خانے میں گلے گلے اترے ہوئے تھے۔ کہیں کوئی ولی دست گیر نہیں تھا۔

میں نے دل ہی دل میں کھلکھلاتے ہوئے کولرج کی مشہور نظم کی لائینیں دہرائی شروع کر دیں۔

Alone, Alone,
All, All, Alone,
Alone on a wide wide sea,
And never a saint took pity
On my soul in agony.

ادھر نیم روشن ہال میں کھڑے ہدایت کار دوست اسپینی ٹیکسی ڈرائیور سے دلی آگرے کے محاورے میں بھنا کے پوچھ رہے تھے کہ ابے یہ کاں لے آیا؟؟



پانچواں حصہ جس میں 'جینی رل' فرانکو آتا ہے

دروازے کے قریب دیوار پہ لکھا تھا: ”امفیانداسے پیار کرتا ہے پارتم نووس“
یہ چوبیس اگست کا دن تھا۔ خلیج نیپلز پر خوب دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ آسمان بالکل صاف اور
خوب نیلا ہو رہا تھا۔ فیشن ایبل قصبے ہرکلانی یم کی اونچی بیکری والے نانبائی نے اپنی
پیٹریاں، ڈبل روٹیاں جمانی شروع کر دی تھیں۔ ڈبل روٹیوں پیٹریوں پر نانبائی کے نام
کا ”ایس پی“ چھپا ہوا تھا... یعنی سکستیس پاتو لکس... برابر والے اسٹینڈ پر سبزی فروش فوفیرس
اپنی سبزیوں اور پھلوں کو پانی کا چھینٹا مار رہا تھا۔ جواہر تراشنے والے نے کٹر سنبھال لیا
تھا۔ وہ ایک خوش رنگ نگینے پر دیدہ ریزی کے ساتھ ابھرواں کام شروع کر چکا تھا (کیا
خبر اس نے گاہک سے آج کا وعدہ کیا ہو)۔ پیتل کی ڈھلائی والادکان دار ایک شمع دان
کی مرمت میں لگا تھا۔

درزی، مصور، پھیری والے، سرائے کے مالک، سبھی برابر سے مصروف تھے۔
قصبے میں آنے والوں کا تانتا بندھا تھا۔ وہ یہاں کے وسیع و عریض پالیسترا (اسٹڈیم)
میں ہونے والے مقابلے دیکھنے آئے تھے۔ کھیلوں کے یہ مقابلے روما کے پہلے ایمپیر
آگستس (سینر) کی سال گرہ کے سلسلے میں ہو رہے تھے۔ گہما گہمی، ہلچل، ہنسی ٹھٹھے، ہر
طرف میلے کا سماں تھا۔ لوگ ایمپیر کی سالگرہ منانے دور دور سے چلے آرہے تھے۔

جی ہاں، چوبیس اگست کا دن تھا۔ سال اناسی (عیسوی)۔ حضرت مسیح کو گزرے ابھی پورے پینسٹھ برس نہیں ہوئے تھے۔

قصبے ہرکلانی یم میں جشن کا سماں تھا...

لیکن ہر کوئی جشن نہیں مناتا تھا۔ کچھ لوگ اپنی الجھنوں میں تھے۔ عظیم چوک پر تعمیر کی گئی آگستس کے نام سے منسوب قربان گاہ کے ایک کمرے میں، جس کی کھڑکی پر سلاخیں جڑی تھیں، ایک بلند مرتبت آدمی اسیری کی صعوبتیں جھیلتا تھا۔ اب تو کوئی بھی اس کا نام نہیں جانتا۔ نہ میں نہ کوئی اور۔ اصل میں یہ آدمی بس اتنا ہی ہے۔ اور یہ بھی کہ یہ آدمی اس واقعے کا مرکزی کردار نہیں ہے۔

جواہر تراشنے والے کی دکان کے پیچھے کوٹھری میں لکڑی کے بستر پر ایک بیمار لڑکا پڑا تھا۔

کشتی گھاٹ پر چوڑے ہاڑ ہڈوں والے گٹھے ہوئے بدن کا ایک غلام اپنے درد کرتے رگ پٹھوں کو ایک اور کمر توڑ بوجھ کے لیے تیار کر رہا تھا۔ برابر کی حویلی میں چودہ برس کی ایک کھلائی، دس ماہ کے صحت مند بچے کو جیسے تیسے سنبھالتی تھی۔

(عرض کیا نا... کہ کچھ لوگ اپنی الجھنوں میں تھے)۔

اور ایسے میں... ایسے میں جناب والا! لوگوں نے ایک بے پناہ گڑگڑاہٹ سنی۔ زمین کو دہلا دینے والا ایک جھٹکا لگا اور اس کے بعد مسلسل گرج اور کڑک اور ابتلا۔ مشرق کی طرف چار میل دور آتش فشاں ویسوویس کے دہانے سے آگ اور گرم راکھ اور جھاگ کا ایک بھیانک ستون بلند ہونا شروع ہوا جو سولہ میل تک اٹھتا چلا گیا۔ اور سولہ میل کی اونچائی پر اس نے ایک کوہ پیکر لکڑی کی شکل اختیار کر لی۔

اس کوہ پیکر لکڑی کو بیان کرتے ہوئے... کہ جو نیپلز کے قریب کے قصبے ہرکلانی یم اور وہاں سے سات میل دور بے مشہور شہر پومپئی اور اس کے مضاف میں سن اناسی عیسوی میں دیکھی گئی تھی... آج میں اس نیوکلیائی لکڑی کو یاد کرتا ہوں کہ جو آدمی پر آدمی کی لائی ہوئی اب تک کی سب سے بڑی اور پہلی نیوکلیائی ابتلا ہے... جس کے بارے میں نہیں کہا جاسکتا کہ وہ آخری بھی ہوگی۔

پانچواں حصہ جس میں 'جینی رل' فراگو آتا ہے ۶۹۱

تو جناب، میں نے، میرے ساتھیوں نے، گھر سے نکلنے سے پہلے بہت سے امنگوں بھرے امکانات سوچ رکھے تھے۔ ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ سیریل کی ریکی کا کام نمٹا کے کچھ سیرسپاٹا کیا جاسکتا ہے۔ ہم اسپین کے 'دارالخلافت' مادرید میں تھے۔ رات کا کھانا کھا کے بیٹھے تھے۔ اندالوسیا کے پانچ شہر جو ہمارے سیریل کی کہانی کی زد میں آتے تھے، یعنی: قرطبہ، غرناطہ، مالقہ، اشبیلیہ، تورے مالینوس... سب دیکھے اور نوٹ کیے جا چکے تھے۔ fairy-tale castles کا شہر سگوویا اور یونی ورٹی شہر سلامانکا خوب چھان پھٹک لیا گیا تھا۔ ہم پرتگال کے صدر مقام لزبن ہو آئے تھے اور مادرید شہر میں تیسری بار وارد ہوئے تھے۔ اپنے مطلب کا سبھی کچھ دیکھا جا چکا تھا کہ ناگاہ پروڈیوسر بھائی نے نوید سنائی:

”دوستو! سنو۔ زادِ راہ کی تھیلی میں ابھی بھی سکے بچتے ہیں۔ واپسی کے لیے فرانس جانے سے پہلے کیوں نہ ہم اٹلی ہو آئیں۔“ پروڈیوسر بھائی نے گھر سے روانہ ہونے سے پہلے بھی اٹلی ”دیکھ رکھنے“ کا ارادہ ظاہر کیا تھا اور کہا تھا، ”چلیں گے مگر شرط یہ ہے کہ زادِ راہ اجازت دے“ اور ہم نے اسی وقت کہہ دیا تھا کہ بسم اللہ! پائے مرانگ نیست۔

سوا ب سارے ہی کام نمٹ گئے تھے اور ہم نے ”یہاں کی مچھلی وہاں پڑی“ کہہ کے روما اور نیپلز کے سیرسپاٹوں کی تفصیل طے کرنا شروع کر دی تھی تو میں، جو گھر سے پومپئیائی کے مدفون (اور بازیافتہ) شہر پر خوب کام کر کے چلا تھا، اپنی بساط پھیلا کے بیٹھ گیا:

میں نے شہر پومپئیائی اور قصبے ہرکلانی یم پران کے آتش فشاں ویسوویس کی لائی ہوئی مصیبت کا احوال سنانا اور علوم آثارِ قدیمہ کے بے مثال کارناموں کا قصیدہ پڑھنا اور اپنا اور اپنے ان دو بھائیوں کا لہو گرمانا شروع کر دیا... کہ کس طرح ہمیں روم سے درگزر کرتے ہوئے سیدھے نیپلز پھر پومپئیائی پھر ہرکلانی یم جانا چاہیے۔ روم تو سیاحت کی بساط کا پٹا ہوا مہرہ ہے۔ پرانا ہو گیا۔

اور یہ کہ ہمیں...

{ مگر روم کہ Eternal City ہے۔ کبھی پرانا نہیں ہوگا۔ }

... تو ہمیں پومپئیائی کے بازیافتہ گلی کوچوں میں یسوع اور جولیئس سیزر اور

آگستس (اور شاید اووڈ کی پرچھائیوں) سے کلام کرنے کا یہ موقع (اور شرف) اب حاصل کر ہی لینا چاہیے۔

میرے ساتھی کہنے لگے کہ دونوں سینزروں اور شاعر اووڈ کو تمہارے بتائے ہوئے شہر پومپئی اور اس دوسرے قصبے سے زیادہ روم میں feel کیا جاسکتا ہے اور یسوع کا یہ ہے کہ وہ تو شہروں اور زمانوں کی حدوں سے کب کے نکل چکے، ان کی کیوں دہائی دیتے ہو؟ اور سمجھو تو وے ٹی کن سٹی بھی انھی کا ہے، انھیں وہیں feel کر لینا۔ میں نے کہا چلو ٹھیک ہے، آپ لوگوں کی ”شہروں زمانوں کی حد“ والی دلیل ٹکڑی ہے، مانے لیتا ہوں۔ وے ٹی کن سٹی والی نہیں مانتا۔ وہ جگہ تو سمجھو ایک organised religion کی سیکریٹری ایٹ ہے۔ میں ہوا کی طرح آزاد عقیدت کا اور کسی بے لاگ آرادھنا کا قائل ہوں۔ تاہم وے ٹی کن سٹی کی حدود میں ماسٹرز کے پینٹ کیے میوزلز بھی ہیں اور دلی کی جامع مسجد جیسی سیڑھیاں بھی (سوادِ رومۃ الکبریٰ میں دلی یاد آتی ہے)۔ اور بھی بہت کچھ ہے۔ بہتر ہے، روم پہ tick لگا دو۔ وہاں بھی ہو لیں گے۔

اس حجت بازی میں نہ معلوم کیوں میں اپنے ساتھیوں سے اصل بات نہ کہہ پایا۔ اصل بات یہ تھی کہ میں پومپئی دیکھنا چاہتا تھا۔۔۔ صرف اس لیے کہ اس شہر کی باقیات میں میرا ایک دوست مجھے مل سکتا تھا جس کی شبیہ کوئی ۵۸/۵۷ سال سے میرے ساتھ ہے۔ یہ پومپئی پر آگ کی بارش اور لاوے کے سیل میں اپنے نیزے کی ٹیک لگائے یقینی موت سے ایک بالشت دوری پر قدم جمائے کھڑے اس رومن سپاہی کی شبیہ ہے جس سے سن پینتالیس چھیالیس میں میرا تعارف ہوا تھا۔

بتاتا ہوں کہ کیسے اس دوست سے ملاقات ہوئی تھی۔

میرے ابا بھوپال کے ایک صفِ اوّل کے اسکول میں آرٹ ماسٹر تھے۔ اسکول کے فائن آرٹس کے شعبے کو نواب کے ذاتی کتب خانے سے مصوری کی کتابوں کا عطیہ دیا جانا طے ہوا۔ اس شعبے سے متعلق کئی سو کتابیں تھیں جو نواب نے دنیا بھر سے اکٹھا کی تھیں۔ اب کہ ریاست کا چل چلاؤ تھا، نواب نے یہ نادر کتب اور ماسٹرز کی شاہ کار پینٹنگز کے prints عوام الناس کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ میرے ابا چھ سات روز قصرِ سلطانی سے بھیجی ہوئی گاڑی میں بیٹھ کتب خانے پہنچتے رہے اور اپنے طلبہ کے لیے

پانچواں حصہ جس میں 'جینی رل' فرانکو آتا ہے ۶۹۳

کتابیں اور پرنٹس پسند کرتے اور اٹھوا اٹھوا کے لاتے رہے۔ شہر کا دوسرا ہائی اسکول، جسے اس عنایت سے نوازا گیا تھا، بروقت کتب خانے نہ پہنچ سکا... جب تک وہ لوگ پہنچتے میرے ابا ڈھائی تین سو نادر کتابیں اور کئی درجن اعلیٰ درجے کے پرنٹس اسکول کے فائن آرٹس کے شعبے میں پہنچوا چکے تھے۔

کیا خزانہ ہاتھ آیا تھا۔

اسکول کی انتظامیہ نے دو فاضل الماریاں حوالے کر دیں۔ میں وہیں نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ ابا نے کہا، کتابوں کی کیٹلاگنگ کرنا ہے، پھر انھیں سلیقے سے الماریوں میں رکھنا ہے۔ دو دن کی چھٹی ہے، میں کتابوں کی درجہ بندی کرتا جاتا ہوں، تم اور فلاں فلاں طالب علم فہرستیں بناؤ اور سمجھا سمجھا کے دفتریوں کے حوالے کرتے جاؤ۔ وہ ہاتھ کے ہاتھ الماریوں میں جماتے جائیں گے۔ دو دن لگیں گے، کتابیں سب محفوظ ہو جائیں گی۔

ایسی نفیس و نایاب تصویروں کو اور چکنے مضبوط کاغذ پر چھپے مضامین کے ساتھ بیش قیمت جلد بندی والی کتابوں کو دیکھنا، چھونا اور جستہ جستہ پڑھنا میرے لیے اتنی بڑی مسرت تھی کہ اسے یاد کرتے اب بھی بدن میں سنسنی دوڑ جاتی ہے۔ لگتا ہے خون کی گردش تیز ہو گئی ہے۔

مصوری کے عالمی ورثے سے میرے چھوٹے موٹے تعارف کا زمانہ یہیں سے شروع ہوتا ہے۔ اور اس کے لیے میں اپنے باپ کا، اپنے اسکول کا اور نواب کے کتب خانے کا ممنون احسان ہوں۔

فہرست کی تیاری کا کام، جس طرح بتایا گیا تھا، ہم چار لڑکوں نے شروع کیا۔ کوئی آدھے گھنٹے ہم مستعدی کے ساتھ کیٹگری اور نمبر شمار اور نام کتاب کا یہ کھیل کھیلتے رہے، پھر ہم چار سے تین رہ گئے۔ میں نہ معلوم کس پل میں اپنا کام چھوڑ کے اور ایک کتاب سنبھال کے ایک طرف جا بیٹھا تھا۔ مجھے بہت ساری تصویریں دیکھنا اور ان سے مسحور ہونا تھا اور ساتھ میں لکھی ان کی تفصیل جانی تھی۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ کہاں ہوں اور یہ کہ یہیں قریب ہی ابا موجود ہیں... الماری کی اوٹ میں ایک ڈیسک میں دھنسا بیٹھا تھا کہ مجھ پہ ابا کی نظر پڑی۔ میں نے انھیں نہیں دیکھا۔ انھوں نے دیکھ لیا کہ میں کیا کر

رہا ہوں۔ ابا ڈسپلن قائم رکھنے والے باپوں اور استادوں میں سے تھے اور کسی طرح کی بھی کام چوری برداشت نہیں کرتے تھے۔ مگر اس روز میرا انہماک دیکھ کے وہ مسکراتے رہے، کچھ نہ بولے۔

میں مصوری کے دو شاہ کاروں، ڈاؤنچی کے The Last Supper سے اور کسی کم معروف مصور کے 'پومپیائی' کے پہرے دار سے اس روز پہلی بار متعارف ہوا۔ نویں جماعت میں تھا تو پہلے اس شہر کی بربادی کی کہانی پڑھی ہوگی۔ پھر کہیں سے عہد قدیم کے ہیروز کے قصے ہاتھ آئے ہوں گے تو اس شہر مدفون سے صدیوں بعد بازیافت ہونے والے رومن سپاہی کا حال پڑھا ہوگا کہ جو اپنی جگہ پر ہی تھہر ہو گیا مگر پہرے کی جگہ سے ہٹا نہیں۔

آج میں یہ تصویر دیکھ رہا تھا۔

اور اب ایسا ہے کہ سو بار کی دیکھی ہوئی اس پینٹنگ کو جزئیات کے ساتھ میں آج بھی بیان کر سکتا ہوں:

خزانے کے بند آہنی دروازے کے آگے کھڑا رومن پہرے دار اپنا سر اٹھائے میلوں دور دکھائی دیتے ویسویس کے جہنم دہانے سے فوارے کی طرح چھوٹتے اس دھکتے ہوئے ستون کو دیکھ رہا ہے (جو ماہرین کے شمار اور تخمینے کے مطابق فضا میں سولہ میل تک اٹھا تھا اور کمر متا چھتری بناتا بستیوں پر آن گرا تھا)۔ اس جاں سپار کے خود اور چار آئینے پر اور اس کی پتلیوں کے فولاد پر سرخ و نارنجی جہنم زار کی چھوٹ پڑ رہی ہے۔ لاوے کا لہو رنگ گاڑھا دریا کاہلی کے ساتھ بہتا ہوا قدموں تک آگیا ہے، اس کی تسموں سے بنی پاپوش سے بالشت بھر دور ہے۔ یہ جواں سال دانتوں پر دانت جمائے بے خونی... اور ایک نوع کے abandon کے ساتھ... قدم جمائے کھڑا ہے۔ لاہنے نیزے پر جمے ہوئے پنچے کی گرفت، جبرٹوں اور بازوؤں کے پٹھوں اور نسوں کا تناؤ اس کی فولاد پہنی چھاتی میں کسی دھڑکتے دل کا پتا دے رہی ہے... دل جو ایک فطری خوف سے بہ ہر حال جو جھٹکا ہوگا۔

ابا کہنے لگے کہ مصور نے سپاہی کی آنکھوں کو اور اس کی گرفت کو define کرتے ہوئے ایک نا موجود خوف کا موجود ہونا دکھا دیا ہے۔ اور میاں! یہی اس پینٹنگ کا جواز اور

پانچواں حصہ جس میں 'جینی رل' فراکو آتا ہے ۶۹۵

اس کا کلائمیکس ہے۔ ایک زندہ انسان کی تصویر کشی کی ہے اس نے، کسی مردے کا یا مشین کا فوٹو نہیں کھینچا ہے۔

ہم باپ بیٹے (خدا ہم دونوں کی مغفرت فرمائے) paintings کو پڑھنے، ان کو ”دور تک جا کے“ سمجھنے کا یہ کھیل خوب کھیلتے تھے۔ میرے لیے تو یہ کھیل ہی ہوتا تھا۔ ابا کے لیے یقیناً یہ کسی طرح کی exercise in Aesthetics ہوگی۔ کتنے ہی شاہ کار (یعنی ان کے پرنٹس) ابا گھر لے آتے تھے اور بلاتامل انھیں سامنے رکھ کے سمجھتے اور سمجھاتے تھے Judgement of Paris. Birth of Venus. The Naked Maja... اور بھی بہت سی پینٹنگز ہمارے (اس وقت کے/ شاید آج کے بھی) مسلم، مڈل کلاس گھروں میں taboo تھیں۔ کھلے عام آویزاں کرنا رہا ایک طرف، ان تصویروں کو میز پر پھیلا کر بھی نہیں دیکھا جاسکتا تھا۔ مگر ہمارے بڑے کمرے میں شاہکاروں کو سمجھنے سمجھانے کا یہ سیشن برابر چلتا رہتا تھا۔ گھر بھی حسب معمول اپنی رفتار سے چلتا رہتا۔ ایک بار کے سوا کبھی کوئی مسئلہ پیدا نہ ہوا۔ میرے تایا صاحب نے ایک دفعہ کچھ تصویریں دیکھ لی تھیں تو ابا پر بہت خفا ہوئے تھے کہ میاں! یہ انبیاء علیہم السلام کے نام کی شبیہیں اور بے لباس مردوں عورتوں کے فوٹو گراف تم گھراٹھالاتے ہو۔ ذرا بھی خیال نہیں کرتے... وغیرہ۔

آدمی کتنے ہی لوگوں کے ساتھ زندگی کرنا چاہتا ہے، مگر یہ پورا پھیلاوا کچھ اس طرح کا ہے کہ ایسا ہونہیں پاتا جیسا آدمی چاہتا ہے... عین مین اس طرح... بالکل اسی طرح نہیں ہو سکتا۔

خیر۔ میں نے ویسویس کی آتش فشانی سے برباد ہوئے ایک قصبے، ہرکلانی یم کی باقیات سے اپنے بیان کی ابتدا کی تھی... کہ وہ چوبیس اگست کا دن تھا۔ خلیج نیپلز پر خوب دھوپ نکلی ہوئی تھی۔ آسمان صاف اور خوب نیلا ہو رہا تھا... کہ زمین کو دہلا دینے والا ایک جھٹکا لگا اور مسلسل گرج اور کڑک کے ساتھ ابتلا آغاز ہوئی اور ویسویس کے جہنم دہانے سے فوارے کی طرح چھوٹا آگ اور گرم ترین راکھ اور جھاگ سے بنا ایک دکھتا ہوا ستون فضا میں سولہ میل تک اٹھا اور مکر متا چھتری بنانا بستیوں پر آن گرا۔

صبح کا وقت ایک نحوست آثار جھٹپٹے میں بدل گیا...

سورج کے بڑے حصے پر پردہ پڑ گیا تھا۔

اس قصبے کو اٹھارہویں صدی کے آغاز میں کھود کر نکالا گیا تو کھنڈروں کی باقیات میں کتے، بلیاں، چوہے (جو عام طور پر بھاگ ہی جاتے ہیں) نہ مل سکے۔ ہرکلانی یم کے لوگ (اور کتے بلیاں چوہے) شروع کے جھٹکوں اور گرج کڑک سے دہشت زدہ ہو کے بھاگ کھڑے ہوئے ہوں گے۔ زلزلے کے جھٹکوں اور گندھک کی بو کے ہوتے بھی بہت کم راکھ قصبے پر برسی۔ لیکن دھوئیں اور راکھ اور جھاگ کا ایک کوہ پیکر بادل سات میل جنوب میں بے (۲۰ ہزار آبادی کے) شہر پومپیائی کی طرف بڑھتا ہوا دیکھا گیا۔ دوپہر ہوتے ہوتے پومپیائی شہر کے پناہ گیروں کے ہجوم کے ہجوم بہت خوف اور پریشانی میں، شمال کی طرف جانے کے لیے، ہرکلانی یم کی سڑکوں گلیوں سے ہڑبڑاتے گزر رہے تھے۔ شمال میں نیپلز کی بندرگاہ تھی۔ اور عافیت تھی۔ یہ بھاگنے والے اپنے شہر پر برستی ہوئی آگ اور راکھ کے بارے میں بتاتے جاتے تھے۔ بہت سے لوگ اس خیال سے کہ اگر ہوا کا رخ بدل گیا تو یہ قصبہ بھی پومپیائی کی طرح برباد ہو جائے گا، ہجوموں کے ساتھ نیپلز کی طرف نکل گئے۔ نیپلز پہنچ کر وہ اس شہر ناپڑساں کے ایک حصے میں، جو آج بھی ”ہرکلانی یم کوارٹرز“ کہلاتا ہے، جا بسے۔

میں نے مثال دے کر سمجھاتے ہوئے اپنے ساتھیوں سے کہا، ”جیسے کسی کو کراچی آنا پڑے اور سمجھو وہ اپنی یادوں کی اسیری میں علی گڑھ کالونی، یا بنارس بنا کے بیٹھ جائے۔“ (ہدایت کار نے گھور کے دیکھا، ”بڑے بھائی! کراچی کا یہاں کیا ذکر؟“ میں نے سوچا، اپنے شہر سے محبت کرتے ہیں۔ انھیں یہ حوالہ بدشگونی جیسا لگا ہے، sorry)۔ اور پھر رات ہو گئی۔ لاوے کا گاڑھا دریا مسلسل بہتا تھا اور آتش فشاں کے دہانے سے جلتی ہوئی گیسیں مرغولے بناتی فضا میں دور دور تک اٹھتی تھیں۔

جو بہت ہی ڈر گئے تھے ساحل سمندر پر جا بیٹھے کہ اگر حالات اور خراب ہوئے تو ساحل کے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے آگے نکل جائیں گے یا کشتیوں میں بیٹھ ہجرت کر جائیں گے۔ بعضوں نے شہر پناہ کو ٹکائے رکھنے والی کمانوں محرابوں میں پناہ لی۔ انھوں نے سوچا ہوگا یہاں ٹھیک رہے گا، بالکل آگے سمندر جو ہے [سوان کے پتھرائے ہوئے جسد کہیں اٹھارہویں صدی گزرنے کے بعد کھدائی میں برآمد ہوئے... سمندر فرلانگوں پیچھے چلا گیا تھا۔ لاوے نے لینڈ ماس (real estate?) بڑھا دیا تھا]۔

پانچواں حصہ جس میں 'جینی رل' فراکو آتا ہے ۶۹۷

تو بھائی، آدھی رات کا گجر بجا، اگست کی پچیسویں تاریخ ہوئی، اور کچھ ہی دیر بعد آتش فشاں کے دہانے سے میلوں کی بلندی تک پہنچا ہوا، قیامت کی آگ اور راکھ اور سنسناتے ہوئے جھاگ کا وہ ستون... مکرمتا چھتری بناتا زمین پر آن گرا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون! یہ خاتمہ تھا۔

ہوا میں اور آتش فشانی گیسوں میں خوب پھینٹا گیا super-heated جھاگ اور راکھ کا ملغوبہ شہر کی طرف ساٹھ میل فی گھنٹے کی رفتار سے لپکا۔ اس کی حدت کا اندازہ ماہروں نے سات سو پچھتر درجے فارن ہائٹ لگایا ہے۔ احتفظنا!

جان بچانے کو تھوڑی سی مہلت ملی تھی۔ سو ہر کلانی یم والے جو بستی میں رہ گئے تھے ساحل تک پہنچنے کو دوڑے۔ مگر دہشت کی اس ہڑ بڑی میں، جوہری کی دکان کی کوٹھڑی میں لیٹا ہوا وہ بیمار لڑکا، اور آگستس سے منسوب قربان گاہ کے کمرے میں اسیری کی صعوبتیں جھیلتا عالی منصب قیدی، اور بھی کچھ بے چارے، جنہیں لوگ... بس بھول گئے تھے... ایک نہایت تکلیف دہ موت (اور ایک احمقانہ جسمانی ہمیشگی) بھگتے کو پھنسے رہ گئے۔ اس مقہور بستی پر سے آگ کا ایک بے پناہ سیل گزرا۔ وہ اپنی پلیٹ میں بہت کچھ لیتا ہوا ساحل آب تک پہنچ گیا۔ پھر دوسرا ریل آیا جو پہلے سے کہیں زیادہ بھیانک اور تباہ کن تھا۔ اس نے چھتیس اڑا دیں اور دیواریں گرا دیں۔ پھر دالانوں، اساروں اور چھتوں اور دیواروں اور سب چیزوں کو کچرے کی طرح سمیٹتا ہوا وہ سمندر میں اتر گیا۔

ویسویس جب انیس گھنٹے بعد خاموش ہوا تو یہ قصبہ چھیاٹھ فیٹ موٹی، بہت سیاہ اور چٹان کی طرح سخت کھرند سے ڈھکا ہوا تھا۔ یہ کھرند ایسی تھی کہ عام اوزاروں کے بس کی نہیں تھی اس لیے جب ۱۷۰۹ عیسوی میں کنوؤں کے جیسے shafts نچلے طبقے میں اتارے گئے تو بس ایک قدیمی "تھی ایئر" کے اسٹیج تک پہنچنے میں کامیابی ہوئی۔ وہاں سے بہ مشکل ماربل کے چند slabs اور یونانی اور رومی مجسمے ہاتھ آئے۔ اگلے پچاس برسوں تک کنویں کھودنے کا (اور چوری چکاری کا بھی) سلسلہ جاری رہا، پھر بند ہو گیا۔

کیوں کہ لوگوں کی توجہ دوسری طرف بڑھتی جا رہی تھی۔ قریب کے شہر پومپئیائی پر پڑی راکھ اور لاوا آسانی سے ہٹایا جاسکتا تھا۔

ہر کلانی یم سے کلاسیکی فن کے جو نوادر مختلف اشیا کی صورت میں برآمد ہوئے

تھے ان سے، بہ ہر حال، اس وقت کی عمارتوں اور فرنیچر اور کپڑوں کے ڈیزائن متاثر ہوئے اور کچھ رونق آگئی۔

واقعے کو انیس سے زیادہ صدیاں گزر گئی تھیں اور کھدائی میں بس اسی طرح کی چیزیں نکل پائی تھیں۔

کھودنے والوں نے اب جو پومپیائی پر توجہ دینی شروع کی تھی تو بیس فیٹ موٹی راکھ کی دولائی کے نیچے سے بہت سی چیزیں نکلی تھیں۔ پر میرے ’دوست‘ پومپیائی کے پہریدار کے سوا آدمی کوئی نہ نکلاتھا۔ شہر کی تباہی سے پہلے ہی سب ہر کلانی یم، یا اور آگے، نیپلز میں پناہ لے چکے تھے۔

پھر اٹھارہویں صدی کے کسی مصور نے پہرے دار کے نیزہ تھامے، پتھر ہوئے جسد کو دیکھا اور paint کیا اور میرے ابا نواب کے کتب خانہ خاص سے وہ کتاب پسند کر لائے جس میں اس بے مثل کینوس کا پرنٹ موجود تھا۔ اس وقت تک میں ”عہدِ قدیم کے ہیروز“ نامی کتاب میں پومپیائی کے پہرے دار کا قصہ پڑھ چکا تھا۔ اور پھر، جیسا کہ بیان کر چکا ہوں، میرے باپ نے اس پینٹنگ کے محاسن سے مجھے روشناس کرایا۔ اور اب... نئے ملے نیٹم کے اس جون مہینے میں، میں، اسپین کے دارالخلافہ مادرید میں بیٹھا اپنے دوستوں کو آمادہ کر رہا تھا کہ یارو! نیپلز چلو اور پومپیائی کے اس جواں مرگ ساونت کو دیکھو۔ ایسے موقعے بار بار نہیں آتے۔

”ایسے موقعے“ میں نے خود سے کہا، ”ایک نسبتاً چھوٹے شہر کے average طالب علم کے بے ماجرا لڑکپن میں... کب آتے ہیں... ایسے موقعے؟... کہ اسے ایسی کوئی کہانی پڑھنے کو ملے، اور ایسا کوئی شاہ کار دیکھنے کو ملے، اور طالب علم کو وہ مصور باپ ملا ہو جو تصویر کو اس طرح سمجھ اور سمجھا سکے۔“

میں ان سب opportunities، ان سب نوازشوں، عنایتوں، بہرہ مندیوں کے لیے وقت کا شکر گزار ہوں کہ جس کی کیمسٹری نے کسی سمجھ میں نہ آنے والے عمل کے دوران بہت سے واقعات بہ ظاہر ایک بے ترتیبی سے اوپر تلے رکھ دیے؛ جس سے وہ سب ہوتا چلا گیا جو میرے لیے اچھا، بہت اچھا تھا۔ اور جو میرے سان گمان میں بھی نہ تھا۔

یقین کیجیے ایسا نہ ہوتا تو کچھ اور ہو جاتا۔ برا، بھلا، بہت برا، یا نیوٹرل۔ گویا

میرے ساتھ یا کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ کچھ بھی ہو سکتا ہے۔

جیسا کہ، مثلاً میری سوچی ہوئی اس analogy میں ابھی ابھی عترت حسین زیدی کے ساتھ ہوا (عترت حسین زیدی میری فکشن کا ایک فرضی کردار، ایک بھلا آدمی ہے جسے ضرورت کے مطابق میں اپنی کہانیوں میں لاتا لے جاتا رہتا ہوں)۔
تو ع ح زیدی کے ساتھ یا کسی کے ساتھ کچھ بھی ہو سکتا ہے... ابھی بس اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں میں۔

میں وقت کے آمرانہ رویے پر ایک مثال دے کر خود کو یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ میں اپنی زندگی جی رہا ہوں۔ وقت اپنی رفتار سے چل رہا ہے۔ اس کی رفتار کسی نہ کسی ترتیب کی پابند ہے بھی اور نہیں بھی ہے، یعنی وقت اس بات کا ہرگز مکلف نہیں ہے کہ میری گزرتی ہوئی زندگی کو اپنے ساتھ جوڑتا ہوا، اسے compatibility دیتا ہوا چلتا رہے (دیکھیے نا، وہ کسی سے کسی طرح کی بھی مروت کیوں کرنے لگا؟) وہ میری analogy کے مطابق بھی کر سکتا ہے۔ گویا کچھ اس طرح ہو سکتا ہے کہ:

{ الف خان ناور کی بس میں بیٹھا صدر کی طرف جاتا تھا کہ ناگاہ اس نے اس حرام الدہر ب کو دیکھا جو اسی بس سے کینٹ اسٹیشن جا رہا تھا (جہاں سے اسے گاڑی پکڑ کے مردان کی طرف دفع ہو جانا تھا)۔ قبل اس کے کہ الف خان اس خدائی خوار بس سے اتر کے فرار ہوتا اور ہجوم میں شامل ہو جاتا، ب نے اسے دیکھ لیا اور نیفے سے ٹی ٹی نکال الف خان کو... }

(یہاں ب کا نشانہ چوکتا ہے۔ مسافر... میرا دوست عترت حسین زیدی حادثاتی طور پر مارا جاتا ہے)۔ انا للہ... {

ع ح زیدی کے سب کام دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ اس کے بیٹے کو ایف آر سی ایس چھوڑ کے کراچی واپس آنا پڑتا ہے جہاں اس کی بہن کے سرال والے ہیں۔
... اور جہاں اب ایک pre-meditated حرم زدگی شروع ہو جاتی ہے۔ کم سے کم بارہ آدمیوں کی زندگی کا ڈھرا بدل جاتا ہے۔

لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہ نکالا جائے کہ ایک ہارڈ ڈسک پر پہلے سے، بہت پہلے سے، ایک سوفٹ ویئر ترتیب دیا رکھا تھا کہ اس روز اس بس میں وہ خرکوزیہ ب

بیٹھے گا اور الف بھی سوار ہوگا۔ جب کہ عترت حسین زیدی کو دفتر میں بیٹھے بیٹھے خیال آئے گا کہ جتنی دیر میں ڈرائیور کمپنی کی گاڑی سروس کرا کے لاتا ہے کیوں نہ وہ برنس روڈ سے مٹھائی کے سربند ڈبے خرید کے رکھ لے۔ ورنہ ہو سکتا ہے کمپنی کی گاڑی کو ادھر سے نہیں ادھر سے ٹکنا پڑے اور ع ح زیدی ڈبے نہ خرید پائے (بھئی، بیٹی کی ہونے والی سرال کا معاملہ ہے)۔ تو بس۔ یہ سوچ کے وہ دواشاپ سفر کرنے کی نیت سے اس بس میں بیٹھنے لگے گا جس پر الف اور ب پہلے سے موجود ہوں گے۔ تب وہ پیرکش، ب، اپنے نیفے سے ٹی ٹی نکالے گا اور... نہیں جناب! اس میں قضائے مہرم جیسا کچھ نہیں تھا یعنی ایسا کچھ نہیں تھا جو Supreme Being نے پہلے سے طے کر رکھا ہو کہ یہی ہوگا اور اس کے سوا نہیں ہوگا۔

کہیں کوئی ہارڈ ڈسک نہیں تھی... کوئی software موجود نہیں تھا۔ یہ وقت کی کیمسٹری تھی جو اپنے ہی کسی اصول اور اپنی ہی کسی خود رو بے ترتیبی سے اٹھی تھی اور جیسا بھی اس سے سرزد ہوا، اس نے وہ سب کر کے رکھ دیا اور یہ بات کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ ایسا ہو جائے گا... ایک ٹی ٹی کی وجہ سے۔

میرے اس اُناسی عیسوی کے قصبے ہرکلانی یم کے سلسلے میں بھی کہیں نیفے میں اڑس کے چھپائی گئی ٹی ٹی جیسا ایک فیکٹر موجود تھا۔ وہ تھا آتش فشاں ویسولیس!

جس نے جواہر تراشنے والے کی دکان کے پیچھے کوٹھری میں پڑے بیمار لڑکے کو ٹھیک سے ناشتا بھی نہ کرنے دیا۔ لڑکے کے بستر کے سرہانے ایک طشتری میں مرغ کی تلی ہوئی اور پتھر بنی ہوئی ٹانگ رکھی تھی (آدھے گھنٹے پہلے ماں آئی ہوگی، ”لے میری جان! تیرے لیے لائی ہوں۔ لے کھالے۔ کچھ بھی تو نہیں کھاتا۔ باپ کے ساتھ لگا لگا چلا آتا ہے۔“)

اور ایک دروازے کے برابر دیوار پہ لکھی وہ graffiti کہ، ”امفیاندا سے پیار کرتا ہے پارتم نووس“ (میں نے اسی فقرے سے اپنی یہ کہانی آغاز کی ہے)۔

Aah! عشق! یہ خانہ آباد کبھی بھی ظہور کرے، کہیں بھی ظہور کرے، کوئی نہ کوئی جتن کر کے، ممٹی پہ چڑھ کے اپنی بانگوں سے سب گلیاں چوبارے بھر دیتا ہے کہ ”ارض و سما

تو سائل پر، اور الٹی پڑی کشتی کے برابر، اور دکانوں اور دست کاروں کے ٹھیوں پر اور نانبائی کے تنور میں وقت یوں ٹھیر گیا تھا کہ اسے دیکھا جا سکتا تھا۔ oven میں پوری اسی ڈبل روٹیاں لگی تھیں۔ ان روٹیوں، پیسٹریوں پر نانبائی کے نام کا "ایس پی..." سکسٹیس پاتوکس... چھپا ہوا تھا۔ وہ نگینہ جس پر جوہری کام شروع کر چکا تھا، اوزاروں کے برابر پڑا رلتا تھا کہ جوہری بے سوچے سمجھے بھاگ اٹھا تھا۔ اندر کوٹھری میں پڑا بیمار بیٹا بھی یاد نہیں رہا تھا اسے۔

پیتل کی ڈھلائی والا کاری گر مرمت کے لیے آئے شمع دان کو جہاں کا تہاں پھینک کے دوڑ گیا تھا (جی نہیں!..."جہاں کا تہاں" نہیں۔ یہ شمع دان اس کی بیٹھنے والی تپائی پہ پڑا تھا۔ گھبراہٹ میں وہ اٹھا ہوگا، شمع دان اور ہتھوڑی تپائی پہ ڈالی ہوگی اور نکل لیا ہوگا)۔

ہر کلانی یم کی تفصیلی کھدائی میرے پیدا ہونے سے آٹھ برس پہلے شروع ہو چکی تھی۔ اس وقت تک compressed-air برے، بجلی سے چلنے والے اوزار اور بل ڈوزر بھی آچکے تھے۔ کھدائی کا کام اب کے آثارِ قدیمہ کے ماہروں کے سپرد تھا۔ خزانے ڈھونڈنے والے طالع آزما بھائیوں کو اس جگہ سے پچاس (یا زیادہ) قدم دور بھیج دیا گیا تھا۔ آج... میں عرض کرتا ہوں کہ، آج اس قصبے کے سولہ بلاکس لاوے کی لوہا لاٹ چٹانوں کو chip off کر کے (گویا بڑی دیدہ ریزی سے "سادہ کاری" کرتے ہوئے) بازیافت کیے جا چکے ہیں۔ ان سولہ بلاکوں کی اکثر عمارتیں، پتھر جڑے کھڑنجوں والی گلیاں، فورم اور باسیلیک جس میں انتظامی دفاتر اور کچھریاں تھیں اور پالسترا کا آدھے سے زیادہ میدان (جہاں آگستس کی سال گرہ کی خوشی میں کھیلوں کے مقابلے ہو رہے تھے) نکالا جا چکا ہے۔ عمارتیں... اور ان میں پھنسے رہ گئے لوگ، ان میں پڑا سامان، سب اس لیے محفوظ (اور پتھر) ہو کر رہ گئے کہ آتش فشاں کا جاری کیا ہوا پگھلا مادہ سب میں بھرتا چلا گیا تھا... اور چیزیں اور لوگ "ہوابند" ہو گئے تھے۔

اس قصبے میں جانا بالکل ایسا ہے جیسے ہم نے کسی غیر مرئی دیوار کے پار... ایک

time-wrap میں چھلانگ لگادی ہو۔

سائل کنڈے، اپنے کھانچوں میں سٹے ہوئے، اب بھی گھومتے ہیں۔ پانی کے ذخیروں میں لگی جستی ٹوئیاں اشارے سے کھلتی بند ہوتی ہیں۔

رسوئی گھر میں برتن بھانڈے، ڈھلے ڈھلائے موجود ہیں۔ کوسلے کی چولھے پر ایک تسلا چڑھا ہے۔

ایک خواب گاہ میں مرمر کے تختے پر کنگھے اور آرائش جمال کا سب سامان پڑا ہے... کنگن، انگوٹھیاں، ہنسلیاں اور بروچ۔ آئے کچھ ابر، کچھ شراب آئے... اور صاحبو! اب یہ ہے کہ اللہ ہی اللہ ہے۔



مادر میں پہلی بار آئے تھے تو ایر پورٹ پہ اچھی انگریزی بولتا ہوا اور عرب بھائیوں جیسا دکھائی پڑتا ایک ہوٹل ایجنٹ کچھ ”اہلاً وسہلاً“ جیسا بدداتا ہوا جھپٹ کے بڑھا تھا اور ہمیں بٹھا کے، سامان جما کے، اپنا کارڈ پکڑا کے چلا گیا تھا۔ جاتے جاتے ٹیکسی والے سے کہہ گیا تھا کہ میرے دوست ہیں یہ دونوں، انھیں خیال سے لے جانا، ستانا مت۔

وہم سا ہوا تھا کہ وہ جو ہم سے کہہ رہا تھا کہ وہ آدھا اسپنی، چوتھائی ایفریکن، چوتھائی عرب ہے... تو کہیں یہ چپسی تو نہیں ہے؟ ہدایت کار دوست کہنے لگے کہ بڑے بھائی! چپسی ہے تو ہوا کرے، ہمارا کیا بگاڑ لے گا؟ میں نے کہا، نہیں نہیں، بگاڑے گا کچھ نہیں۔ سنوار دے گا۔ ”بھائی! یہ چپسی خانہ بدوش بڑے مزے کے لوگ ہوتے ہیں۔ مجھے دسویں جماعت میں پڑھا ہوا انگریزی نثر کا ایک سبق یاد آرہا ہے جس میں خانہ بدوشوں کے رومان کو بڑے پُراثر انداز میں بیان کیا گیا تھا۔“ ہدایت کار بولے کچھ نہیں، مسکرانے لگے۔ مسکراہٹ میں ان کی ایک پورا جملہ تھا جس میں مجھ سے کہا جا رہا تھا کہ بڑے بھائی، واپس آ جاؤ۔ دسویں جماعت کے اسباق بہت پیچھے رہ گئے ہیں۔

خیر، میں نے دل میں کہا، ”اپنا اپنا خیال ہے۔ میرے حساب سے تو کوئی چیز، کوئی بھی چیز، جسے ہم تازہ رکھنا چاہیں پیچھے نہیں رہتی۔ ساتھ ساتھ چلی آتی ہے۔“ جیسے نوعمری میں دیکھی ہوئی ایک فلم Loves of Carmen (جو مجھے یاد پڑتا ہے، خانہ بدوشوں کے بارے میں تھی) یا بمبئی میں بنی اور بھی درجن بھر فلمیں جن میں سر

پانچواں حصہ جس میں 'جینی رل' فرانکو آتا ہے ۷۰۳

سے قزاقوں والا رومال باندھے، کانوں میں کنڈل پہنے، راج کپور کا پھینی ناک والا بہنوئی دف بجابجا کے گاتا رہتا ہے... آج تک گارہا ہے۔

ٹیکسی جس ہوٹل میں لے کے پہنچی وہ ہمیں سستا اور سکڑا سمٹا سا لگا۔ وہ مادرِ کی شاہراہِ عظیم (ویا گران) سے ٹھیک بیس قدم دور، اندر کہیں ایک تنگ گلی میں پھنسا ہوا بیٹھا تھا۔

ٹیکسی کے جاتے ہی، ہوٹل کے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے ہدایت کار دوست نے کہا، ”وہ ایئر پورٹ والا ایجنٹ مجھے ایک بار مل جائے۔“

بات اتنے رسان سے کہی گئی تھی اور اس طرح لہجہ بنا کے کہی گئی تھی کہ میں سمجھا نہیں۔ میں ان کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا، سوتلی دیتے ہوئے کہنے لگا کہ بھائی جان! ملے گا ان شاء اللہ ضرور ملے گا۔

انھوں نے اب کے دانت پیستے ہوئے کہا: ”بس بڑے بھائی! ایک بار اور مل جائے وہ...“ مسکرانے کی باری اب میری تھی۔ انھوں نے دیکھا۔ کہا کچھ نہیں۔ پھر خود بھی تھوڑا مسکرانے لگے۔

ہم بہ ہر حال ہوٹل میں داخل ہو گئے۔

ری سپشن پہ بیٹھا اکیلا نو جوان اپنے چمک دار دانتوں کی نمائش کرتا ہوا آگے آیا۔ اس نے ہمارا سامان اٹھایا، سلیقے سے کاؤنٹر کے برابر رکھا، پھر وہ خود اندر کاؤنٹر میں پہنچا، اپنی کرسی پر ایک بار ٹکا، پھر فوراً ہی ”ویلم“ کہتا اٹھ کھڑا ہوا، اور اتنی تیزی سے کہ جیسے آموختہ سنا رہا ہو، اپنے ہوٹل کے محاسن بیان کرنے لگا کہ... عین شاہراہِ عظیم الشان پر واقع، ہمارا یہ ہوٹل آپ اپنی جگہ ایک لیجینڈ کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ ہوٹل وہ ہے کہ جہاں Faboulous Martha نے (جو خدا معلوم کون تھی) پورے چھ مہینے قیام کیا ہے۔ عظیم لارنزو (Lawrence of Arabia کو کہتا ہوگا) کے سب دوستوں، سب داشتاؤں کا پسندیدہ ہوٹل پورے مادرِ میں اگر کوئی ہے تو یہی ہے۔ یہی وہ ہوٹل ہے جہاں ”جینی رل“ فرانکو نے اپنے بریگیڈ کو، جب وہ مشکلات میں گھرا ہوا تھا...

”ایک منٹ!“ ہدایت کار دوست نے کہا، ”ایک منٹ! کیا وہی جینی رل فرانکو

تھا جو ہمیں ایئر پورٹ پہ ملا تھا؟... جس نے ہمیں یہاں بھیجا ہے؟ اگر وہی تھا تو میرے

عزیز! Believe you me... وہ اس وقت بھی مشکلات میں گھرا ہوا ہے۔ بی لیو و یومی!“ پہلے تو ری سپشنٹ کچھ نہیں سمجھا، پھر ہدایتکار دوست کے ایک بار اور دانت پیسنے اور میرے دوبارہ کھلکھلانے پر سمجھ گیا کہ کیا قصہ ہو سکتا ہے۔ وہ پہلے ایکسکیوز می کہہ کے مسکرایا، پھر ہنستے ہوئے کاؤنٹر سے باہر نکل آیا (دوبارہ اندر نہیں گیا) اور بتانے لگا کہ اگر آپ لوگ کسی Aa-rab کنٹری سے آئے ہو یا مسلم ہو تو میرا پوائنٹ آپ جلدی سے سمجھ لو گے۔ ویسے بھی یگ لوگ کوئی ریگولر Job نہ کر رہے ہوں student ہوں اور انھیں every now & then نئے سیمسٹر کی فیسیں دینا ایک دم ضروری ہو تو تھوڑا سا جھوٹ بولنے... یا سچ کو ذرا سا stretch کر لینے کی اجازت دے دینی چاہیے۔ What do you say, Sir!?۔ اس نے مجھ سے سوال کیا۔ میں نے کہا کہ ابھی کچھ کہہ نہیں سکتا اس لیے کہ میرے دوست کو تمھارے اس ”جپسی“ دوست پر بہت غصہ ہے۔

”جپسی!؟“ اس نے ضرورت سے زیادہ حیران ہو کر سوال کیا اور بولا:

"He is no gypsy. Sir! He is a Muslim... from

Morrocco"

ہدایت کار نہال ہو گئے۔ ”المسلم؟ المراكش؟“

"Yea Yea, El-Moslem. El-Murrakesh."



چھٹا حصہ: کیوں کہ نوری سے پیار کرتا ہے پیدرو

ہم مادر اپین میں تھے۔ میں نے ہوٹل ریپشنسٹ کو بتایا تھا کہ میرے دوست کو تمہارے اس 'جیسی' دوست پر بہت غصہ ہے۔

”جیسی؟“ اس نے بہت حیران ہو کے پوچھا، ”جیسی؟“ پھر کہنے لگا "He is

no gypsy Sir! He is a Muslim... from Morrocco."

ہدایت کار نہال ہو گئے۔ ”المسلم؟ المراكش؟“

"Yea Yea, El-Moslem, El-Murrakesh."

ریپشنسٹ پھر دانت کھول کر مسکرایا اور پوچھنے لگا کہ آپ لوگوں کو میرے مراکشی دوست کی کیا بات بری لگی ہے؟ بتائیے، میں سمجھانے کی کوشش کروں گا۔

ہدایت کار اب مسکرا رہے تھے۔ نفی میں سر ہلا کر بولے، ”نہیں نہیں، کچھ نہیں۔

کچھ برا نہیں لگا۔“

ہوٹل والے کا کہنا تھا کہ نہیں کوئی بات ہے ضرور۔ ہدایت کار دوست بولے،

”برادر! چھوڑیے اب تو ساری سچویشن ہی بدل گئی ہے۔ اس لیے کہ آپ لوگ student

ہو۔ باہر سے آئے ہو اور روزی کمانے، فینیس اکٹھی کرنے میں لگے ہو اور بھیا! ہوٹل

بزنس کا تو یہی ہے کہ تھوڑا بہت جھوٹ spice کی طور پر ڈالنا ہی پڑتا ہے۔ ہاہا!“

ریشنٹ نے یہ بات پسند کی اور ہمیں ہوٹل کے سب سے آرام دہ کمرے میں پہنچانے کے لیے سامان اٹھا کر آگے آگے چل پڑا۔ اس نے ایک وضاحت ہاتھ کے ہاتھ کر دی تھی کہ وہ خود طالب علم نہیں ہے، مقامی ہے اور رومن کیتھولک ہے اور یہیں مادر کی بل فائننگ اکادمی میں زیر تربیت ہے۔

”ارے! تم بل فائٹر ہو؟“ ہم دونوں نے رستے میں رک کے ایک ساتھ نعرہ لگایا۔

وہ کھیا کے بولا، ”ہوں نہیں... بننا چاہتا ہوں۔ ٹریننگ کا پہلا سال ہے۔ ابھی ٹھیک گیارہ مہینے ہوئے ہیں۔“

”اور تمہارا دوست؟ وہ مراکشی؟ وہ بھی بل فائننگ سیکھ رہا ہے؟“ میرے دوست نے بہت ارمان بھری آواز میں پوچھا۔

”نہ نہ! وہ Applied Chemistry میں ڈگری کر رہا ہے۔“

”چلو، یہ بھی ٹھیک ہے۔“ ہدایت کار دوست نے تسلی دی۔

ہم ایک ایسی لفٹ میں پہنچے ہوئے تھے جہاں تینوں کے پھنس کے کھڑے ہونے اور فرش پر سوٹ کیس رکھ دینے کے بعد اتنی جگہ بہر حال موجود تھی کہ زیر تربیت بل فائٹر نے ہمارے ایئر بیگز ایک ایک کندھے پر ٹکا کے لفٹ کے کونے کی طرف چہرہ موڑ لیا تھا۔ اس طرح وہ میرے دوست کی گدی میں breathe کرنے کے بجائے لفٹ کے گوشے میں آزادی کا سانس لے سکتا تھا۔ ہشیار آدمی تھا۔

ہمارا کمرہ واقعی اچھا تھا۔ پیسوں کے حساب سے تو بہت ہی اچھا تھا۔

ریشنٹ دوست نے ہمیں الماری میں نصب تجوری کے رموز سمجھانے کے لیے اس کے نمبروں والے تالے کو چلاتے پھراتے ہوئے ایک خاصا ٹکنیکل (چنانچہ مشکل) لیکچر شروع کر دیا۔ ہم نے کہا ناں ناں! تجوری و جوری چھوڑو، اپنے پاس ہے کیا جو اس میں رکھیں گے۔ اس نے لمحے بھر توقف کیا پھر ہم سے اتفاق کرتے اور tip کا شکریہ ادا کرتے ہوئے اچھا وقت گزارنے کا مشورہ دیا اور روانہ ہو گیا۔

آدمی کبھی کتنی نادانی کر جاتا ہے۔ افسوس، ہم اگر غیر ضروری باتوں سے پرہیز کرتے اور تالے کے ٹکنیکی رموز کو اچھے ٹورسٹس کی طرح سمجھ لیتے تو وہ نہ ہوتا جو دوسرے

چھٹا حصہ: کیوں کہ نورجی سے پیار کرتا ہے پیدرو ۷۰۷

دن ہوا اور جس کا علم ہمیں تیسرے دن ہو سکا۔

ہم دونوں دوست اپنے اپنے گھروں میں organized زندگی گزارتے ہوں گے (یا گزارنے پر مجبور ہوں گے) اپنے شیونگ کٹ اور ٹوتھ برش (اچھے انسانوں کی طرح) ہم واش روم میں سجا دیتے ہوں گے۔ استعمال کے بعد اپنے تولیے پھیلاتے اور غیر ضروری چیزیں سمیٹتے جاتے ہوں گے۔

یہاں ہم نے ایسا کچھ نہیں کیا۔ کم سے کم میں نے نہیں کیا۔

چنانچہ (بچوں کی ہدایات کے مطابق) میں نے کراچی سے، کسی کفایتی پیکیج ڈیل سے فائدہ اٹھاتے ہوئے، فلم کے جو پانچ rolls خریدے تھے، ان میں سے ایک رول اپنے کیمرے میں ڈال کر، کیمرے کو اپنی بیلٹ میں پہن کر بڑی امنگ، بہت شوق کے ساتھ میں اپنے ہدایت کار دوست سے چار قدم آگے چلتا ہوا ہوٹل سے نکل گیا۔ اور وہ جو عربی میں کہتے ہیں ناکہ ”زمین پر پھیل جاؤ“ تو دوست کے ساتھ مادرشہر میں پھیل گیا۔ بے ڈھنگے پن کے کوئی تئیس کہ چوبیس گھنٹے ہم نے گزارے۔ خوب گھومے پھرے۔ بہت سی جگہیں دیکھیں۔ طرح طرح کے فاسٹ فوڈ کھائے۔ کچھ ضروری فون کیے اور آتے جاتے ہوئے کمرے میں اپنے کپڑے، رومال، موزے اچھال اچھال کر غیر ذمہ دارانہ living کے سبھی ارمان پورے کر لیے اور پھر جو صفائی کرنے، کپڑے سمیٹنے بیٹھے تو معلوم ہوا وہ چار فلم رول جو کمرے میں کہیں ضرور موجود ہونے چاہیے تھے، اب نہیں ہیں۔

لاحول ولا...

میرا پہلا ری ایکشن تاسف کا تھا یعنی ہم نے کیوں نہ تجوری کے تالے کی تکنیک سمجھ لی، کیوں نہ اپنے رول تجوری میں رکھے، کیوں خود کو disorganized ہو جانے دیا۔ ہدایت کار دوست کا کہنا تھا کہ نہیں بڑے بھائی! ایسا بھی کیا ہے، ہم ایک مہذب ملک میں آئے ہیں۔ خود مہذب لوگ ہیں۔ ہم دوسروں پر اعتماد کر کے اپنے کمرے کو تالا لگا کر گئے تھے۔ جو چیز جہاں پڑی تھی وہیں پڑی ہوئی چاہیے تھی، جو نہیں ہے۔ اب ایسا بھی کیا ہے۔

ریشنسٹ نوجوان نے ہدایت کار دوست سے پورا پورا اتفاق کیا کہ ہاں جی

آپ مہذب لوگ ہیں۔ یہ ایک تہذیب یافتہ ملک ہے۔ آپ نے ہم پر بھروسہ کیا ہے۔ جزاک اللہ... آپ اپنے کمرے کو تالا مار کر گئے تھے، very true لیکن...! ہم م! آپ نے میرے عرض کرنے پر بھی ”تجوری کا علم“ نہیں سیکھا اور اس سہولت سے خاطر خواہ فائدہ نہیں اٹھایا۔ ہم پوری پوری کوشش کریں گے کہ آپ کے گم شدہ فلم رول ”تلاش ہو جائیں“۔ لیکن آپ جانتے ہیں سرائے ہوٹل وغیرہ ایسے اشاف کے ذریعے چلتے ہیں جو شفٹوں میں آتا جاتا ہے۔ بے شک، ہمارا ریگولر اشاف سبحان اللہ! کیا دیانت دار لوگ ہیں! مگر ہم روزنداری پر بھی کارکن بھرتی کرتے ہیں۔ خاص طور پر صفائی والے۔ وہ بھی برے لوگ نہیں ہوتے لیکن سر! آپ کو تو پتا ہے Blah Blah Blah۔

ہدایت کار دوست ہتھے سے اکھڑ گئے۔ کہنے لگے، میں آپ کے صفائی والوں سے ملنا چاہتا ہوں، ابھی۔ نوجوان نے عرض کیا کہ آپ کیا کریں گے مل کر؟ ہم خود ہی کچھ کرتے ہیں، آپ اطمینان رکھیں، گھومیں پھریں، اپنی وزٹ کیوں کڑوی کرتے ہیں۔ آپ کی فلمیں ”تلاش ہو جائیں گی“۔

بعد کو باہر جانے کی تیاری کرتے ہوئے ہدایت کار اپنی مزے دار آگرہ اسٹائل پنجابی میں کہنے لگے ”میں تے اناں دے وٹ کڈ دیاں گا۔“ مطلب کس بل نکال دوں گا ان کے۔

شام میں ہم لوٹے تو ہوٹل کی مختصر لابی میں مراکشی نوجوان نظر آیا (اُسے ہمارے دوست اب ”جینی رل فرانکو“ پکارنے لگے تھے)۔ وہ اداس سا دکھائی دیتا تھا۔ ہدایت کار دوست نے پوچھا، ”جینی رل فرانکو! کیا ہوا۔ منھ کیوں لٹکا ہوا ہے؟“ کہنے لگا کہ آپ لوگوں کے فلم رول گم ہو گئے، برا ہوا، میں اس بات سے اداس ہوں۔

وہ بولے، ”forget it، اس میں اداس ہونے کی کیا بات ہے، مل جائیں گے، نہیں ملے تو بھی کوئی مسئلہ نہیں۔“

فرانکو بولا کہ اصل میں رات ٹھیک سے میری پڑھائی نہیں ہو سکی، یہ الجھن بھی ہے۔ دوست نے تسلی دی کہ تم فکر مت کرو، ہم ہوٹل انتظامیہ سے ہرجانہ وصول کر لیں گے۔

مراکشی نے کہا، ”یہی تو پریشانی ہے۔ ہوٹل والے ہرجانہ نہیں دیتے۔“

دوست کہنے لگے ”کیسے نہیں دیتے؟ ہہ ہا! ہم آگے تک جائیں گے۔“

چھٹا حصہ: کیوں کہ نوری سے پیار کرتا ہے پیدرو ۷۰۹

”آپ آگے جائیں گے تو میں اور میرا دوست پیدرو اور آگے چلے جائیں گے
یعنی ہوٹل سے باہر۔“

”کیا مطلب؟“

”ذرا پیچیدہ بات ہے، آپ نہیں سمجھو گے۔“

دوست کچھ برہم سے ہو کر بولے کہ میاں تم ہمیں گھامڑ کیوں سمجھتے ہو؟ سمجھاؤ
گے تو کیوں نہیں سمجھیں گے؟

اگلے بیس منٹ میں جو کہانی unfold ہوئی وہ خاصی سنگین نوعیت کی اور گداز
کر دینے والی تھی۔ بیس منٹ کی مدت اس لیے صرف ہوئی کہ یہ نوجوان مراکش کا تھا اور
خاصا مہذب، self-respecting اور احسان مند بھی۔ اس نے بتایا کہ پیدرو اس کی
کلاس میٹ لڑکی Nurie کا فیانسے ہے۔ سال بھر بعد نوری کا گریجویشن ہے۔ اس کے
کوئی دو سال بعد پیدرو کو اکادمی سے ”بل رنگز“ کا بنیادی سرٹیفکیٹ ملے گا جس کے بعد
وہ درجہ بدرجہ ترقی کرتا خود کو bull rings میں منواتا اس قابل ہو جائے گا کہ ایک
اپارٹمنٹ لے سکے اور اتنی کمائی کر سکے کہ نوری اور وہ مادر میں رہتے ہوئے اپنا گھر چلا
لیں۔ گویا ان کی شادی کو چار سے پانچ سال تک لگ سکتے ہیں۔ کوئی miracle ہو جائے
تو یہ مدت گھٹ کے ساڑھے تین برس بھی ہو سکتی ہے۔ اس سے کم نہیں۔

”اور Sir! پیدرو کیتھولک بے شک ہے مگر جانتا ہے کہ miracles روز روز
نہیں ہوتے۔ ان لوگوں کو چار سے پانچ سال تک ایسے ہی رہنا پڑے گا۔ الگ الگ۔
اب ایک مشکل یہ بھی ہے کہ نوری کا گھر کاسابلانکا میں ہے۔ یہاں وہ اپنی ایک کزن
کے ساتھ رہتی ہے no rent وغیرہ۔ بس وہ اپنے کھانے پینے کا، فیسوں کا خرچ
اٹھاتی ہے۔“

”کہیں نوکری کرتی ہوگی نوری؟“

”ہاں جی، یہیں نوکری کرتی ہے، اسی ہوٹل میں۔“

”خوب!“

”جی ہاں، پارٹ ٹائم صفائی والوں میں ہے۔ آپ کے film rolls جس

روز گم ہوئے، وہ ڈیوٹی پر تھی۔“

”اومائی گا.....!.....!“ دوست دھیرے سے بولے۔

”غلط نہ سمجھیں، نوری نے آپ کا کمرہ صاف نہیں کیا تھا۔ She is a

gem... A real lady۔“

”ہاں ہاں ہاں، I'm sure۔“

”آپ کا کمرہ اس لڑکی نے صاف کیا تھا جس کے گھر میں نوری رہتی ہے۔“ اور

یہ کہہ کر مراکشی نوجوان اپنا سر پکڑ کر بیٹھ گیا اور اپنے جوتے کی نوک سے دوسرے جوتے کا سول ٹھک ٹھک کر کے بجانے لگا۔

میں نے آہستہ سے کہا، ”اومائی گاڈ!“

فرائکو مراکشی نے سر اٹھایا، کہنے لگا کہ نوری کی اس کزن کا پچھلا ریکارڈ کوئی

زیادہ قابلِ رشک نہیں ہے۔ صرف پیرو کی مروت کر کے management اسے رکھے

ہوئے ہے۔ پیرو عزت دار آدمی ہے، دوست نواز۔ نوبل اور شرمیلا۔ مجھے کہنا نہیں

چاہیے Sir! this is utterly personal، مگر یہ سچی بات ہے کہ نوری اور وہ آج

تک ساتھ نہیں سوئے۔ سر! میں ادھر کی نہیں کہتا۔ ادھر ایسا نہیں ہوتا But it looks

significant to me... the Moroccan that I am.

”بے شک، بے شک۔“ ہم دونوں نے کہا۔

”سوری آپ کا ٹائم خراب کیا۔“ وہ اٹھ کے چلا، پھر بیٹھ گیا۔ جھک کے

آہستہ سے کہنے لگا، ”آج رات تو آپ چیک آؤٹ نہیں کریں گے؟ I hope“

ہم نے انکار میں سر ہلایا۔ ”کیوں کیا بات ہے؟“ ہدایت کار دوست نے پوچھا۔

”دو فلم رول شام کو آجائیں گے اور دو پیرو کل صبح لے آئے گا۔ نوپرا بلیم۔“

ہم دونوں ایک دوسرے کی شکل دیکھنے لگے۔

پھر دونوں نے ایک ساتھ کہا، ”ہرگز نہیں!“

”یہ بات اب ختم ہو گئی۔ FINI، اوکے؟ No more discussion“

ہدایت کار نے ایک بار جوش میں کہا، "KHATAM!" اور ہنسنے لگے۔

مراکشی بھی کھسانی ہنسی ہنسا پھر سمجھانے لگا کہ ہم نوری سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ

ایسا ایسا ہو گیا ہے۔ اسے بالکل نہیں بتا سکتے ورنہ وہ یہ job چھوڑ دے گی اور کزن کے

چھٹا حصہ: کیوں کہ نوری سے پیار کرتا ہے پیدرو ۷۱

ساتھ رہنا بھی چھوڑ دے گی اور اس کے اور پیدرو کے پر ابلمز بڑھ جائیں گے۔
ہدایت کار آنکھیں نکال کر اور آواز دبا کے الٹی اسٹیج whisper میں دانت
پیتے ہوئے بولے، کہ ابے گھامڑ! ہم کہہ رہے ہیں ناکہ نو مور ڈسکشن۔ ہمارے کوئی فلم رول
گم نہیں ہوئے۔ ہم سے فضول باتیں مت کرو بس..... اور یارا جینی رل مراکشی! تم ہمیں
رابطہ شہر کے بارے میں بتاؤ..... یہ کہو کہ اس زمانے میں وہاں کا موسم کیسا ہوتا ہے۔
”آہا! رابطہ رابطہ! Subhaan-Allah! وہ شہروں کا شہر! وہ مرحمتِ الہی“ اور
اس نے ”یا قربان“ جیسے لحن میں کسی عربی قصیدے کی تان اٹھائی اور مزہ باندھ دیا۔
ہم اسے ویسا گران کے ایک میکسیکن کیفے میں لے گئے اور coffee سے اس
کی تواضع کی۔

اس طالب علم لڑکے سے، جو پڑھائی کا خرچ نکالنے کے لیے جھوٹ بول بول
کے مسافروں کو اس سے اور سکڑے سمٹے ہوٹل میں گھیر گھیر کے لاتا تھا، یہ ہماری آخری
ملاقات تھی۔

دوسری بار ہم اس ہوٹل میں آئے تو صرف پیدرو ملا۔ بتانے لگا کہ فرانکو مراکشی
اپنے امتحانوں کی تیاری میں لگا ہوا ہے۔

ہدایت کار دوست نے پوچھا، ”اور نوری؟“

اس کی آنکھیں گول ہو گئیں۔ ”آئیں! You know Nurie?... You

know her?”

میں نے کہا، ”Of course, we know her. کیوں کہ امفیاندا سے
پیار کرتا ہے پارتم نووس۔“

”آں! What do you mean by that?“

ہدایت کار نے انگریزی میں کہا، ”اس کا مطلب ہے نوری سے پیار کرتا ہے

پیدرو۔“

پیدرو کی پوری بیتیسی نظر آنے لگی۔ وہ ایک بار چابی کے گڈے کی طرح اچھلا۔
پھر وہیں، ریسپشن کاؤنٹر کے باہر کھڑے کھڑے، اپنی جوتا ڈانس کی گت
میں، ہوٹل کے چھوٹے سے مرمریں فرش پر ٹھکا ٹھک، ٹھکا ٹھک کر کے بل فائٹروں اور

اصیل مرغوں کا ملا جلا ناچ ناچنے لگا۔
 ”اولے اولے!“ ہدایت کار دوست نے تال دینی شروع کر دی۔
 بہار آمد بہار آمد بہار آمد
 ہم اسپن میں تھے۔
 اور اتنے بوڑھے ہرگز نہیں تھے جتنے نظر آتے تھے۔



برادر! ایک رجحان ساز کتاب یاد آ گئی (ہوٹل کی بات سناتے ہوئے میں،
 مراکشی طالب علم کے اور افریقا کے بارے میں سوچتا تھا)۔
 اس لیے... آ جاؤ افریقا!

سن ۱۹۷۶ء میں ایک امریکی مصنف Alex Haley نے اپنے ناول
 "Roots" کی اشاعت سے خاصا تہلکہ مچا دیا تھا۔ کتاب میں براعظم شمالی امریکا میں پکڑ
 کر لائے گئے افریقیوں کی پیتا بیان کی گئی تھی۔

اور ان کی اس ابتلا کی تاریخ ہزار تحقیق و تدقیق کے ساتھ لکھی گئی تھی۔
 بڑے بڑے ثقہ لوگوں سے سنا جا رہا تھا کہ افریقی الاصل سیاہ فام لوگوں پر اتنا
 سچا اور ایسے معرکے کا ناول آج تک نہیں آیا۔

آوازہ پڑ گیا تھا کہ یارو! لپک لو۔ ”روٹس“ چھپ کر آ گئی ہے اور دھڑا دھڑ
 بک رہی ہے۔ کہیں ختم نہ ہو جائے۔

واقعی اس کتاب کی تیاری میں باون بکسوں لگے تھے۔
 کتاب دیکھتے ہی دیکھتے رجحان ساز بن گئی۔ ہزاروں صاحب حیثیت سیاہ
 فاموں نے (اور دوسروں نے بھی) اپنے اب وجد کا سراغ اٹھانے کے لیے، ان کے
 کوائف جاننے کے لیے ماہرین کی خدمات حاصل کر لیں۔

زر خرید غلاموں کے اور انھیں خریدنے والے ’مالکوں‘ کے خاندانی رکارڈ سے نکال
 نکال کر ان کے اصل کی چھان پھٹک اس طرح ہو رہی تھی کہ کیانسی گھوڑوں اور کتوں کی
 pedigree چھانی جائے گی۔

بڑا پیسا خرچ ہو رہا تھا۔ سچی بات تھی، مغرب میں پہلی بار ہاشما کے نسب کو وہ

چھٹا حصہ: کیوں کہ نورنی سے پیار کرتا ہے پیدرو ۷۱۳

اہمیت حاصل ہو رہی تھی کہ جو جید طرہ والوں (اور جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا) نسلی گھوڑوں کتوں کو بھی کبھی حاصل نہ ہوئی ہوگی۔

وکیلوں اور pedigree جاسوسوں کے دفاتر امریکا کے بڑے شہروں میں کھل گئے تھے۔ براعظم افریقا کے ان علاقوں میں کہ جہاں سے آدمی پکڑ پکڑ کر برآمد کے لیے ”غلام منڈیوں“ میں بھیجے جاتے تھے، ذیلی دفاتر کھول دیے گئے تھے جن میں ٹیلی فون لگا دیے گئے تھے، ٹائپسٹ بٹھا دیے گئے تھے۔



میں یہ کتاب اردو میں ترجمہ کرنا چاہتا تھا۔ اس وقت تک اتنی ضخیم تصنیف ترجمے کی نیت سے نہیں اٹھائی تھی۔ بار بار کتاب کو اٹھایا اور (واقعی) بھاری پتھر سمجھ کر چھوڑ دیا، اس عزم کے ساتھ کہ ایک نہ ایک دن یہ کام کروں گا ضرور۔

مگر اب وقت گزر چکا، ایک عزیزہ نے یہ کام کر دکھایا۔ پچھلے دنوں اہلیہ کے ایک پڑھا کو شاگرد نے ”مکالمہ“ کے کسی شمارے کی ورق گردانی کرتے ہوئے یہ خوش خبری دی کہ مبین مرزا صاحب نے ”Roots“ کا اردو ترجمہ چھاپ دیا ہے۔ بہت جی خوش ہوا۔ ترجمہ کار خاتون کے لیے اور برادر! آپ کے لیے دل سے بہت دعائیں نکلیں۔ کس لیے کہ ایک اچھا، بلکہ بہت اچھا کام ہو گیا (اور خاں صاحب خود سے کیے گئے ایک وعدے سے بطریق احسن رہا ہوئے)۔

تالیف و تصنیف کی طرح ترجمہ ایک خیر کا کام ہے اور یہ ان خیر کے کاموں میں سے ہے کہ جو خاصے مشکل ہوتے ہیں۔ کیا تصنیف سے ایک درجہ مشکل؟

آپ جانتے ہیں، میں ترجمے کی ذمہ داری (بعض احباب کے کہے پر) اٹھاتا رہتا ہوں۔ خود سے اس رستے پر چل پڑنے کی ہمت کم ہی کرتا ہوں۔ وجہ عرض کر دی۔

اب تک جن شاہ کار افسانوں کا ترجمہ کرتے ہوئے اور سال ہا سال بعد بھی بے انتہا خوش محسوس کی ہے ان افسانوں کی تعداد (میرے حساب سے) انگلیوں پر گنی جاسکتی ہے۔

پہلی بورخیس کی کہانی ”The Handwriting of God“ ہے جسے میں نے ”دستِ خداوند کی تحریر“ کے عنوان سے ترجمہ کیا اور جو میرے دوسرے مجموعے ”برج

خوشاں“ میں شامل ہے۔ یہ کہانی ادبی جریدے ”آج“ میں چھاپی گئی ہے۔ اور بڑی داد وصول کی۔ یہ پڑھی جاتی رہے گی کیوں کہ اسے، برادرِ م! خیال ہے کہ میرے ترجموں کے مجوزہ والیوم میں بھی شامل کیا جائے گا۔

دوسری کہانی حوان رلفوکی "Luvina" ہے یہ بھی ”آج“ میں چھپ چکی ہے۔ کسی کتاب میں نہیں آئی۔

ایک افسانہ برادرِ م آصف فرخی نے Internet پر سے بڑے جتن سے اٹھایا تھا۔ اس کہانی کی بھی ایک کہانی ہے۔ میاں آصف سے سن کر کبھی اپنے پڑھنے والوں کو سناؤں گا۔ یہ معرکہ لارا کہانی ہے مارک ٹوئین کی "A War Prayer" جسے ”دُعائے جنگ“ کے عنوان سے میں نے اردو میں ڈھالا اور انھوں نے ”دنیا زاد“ میں چھاپا اور اہل نظر سے داد وصول کی۔ یہ اب تک کسی کتاب میں نہیں آیا۔

برادرِ م مرزا صاحب! اس بار جی کرتا ہے کہ "Luvina" اور "A War Prayer" کے اپنے تراجم ”لکروں میں کہی گئی.....“ پڑھنے والوں کی نذر کروں۔ رہ گئی بورخیس کی کہانی ”دستِ خداوند...“ تو جو نہ پڑھ پائے وہ اسے ترجموں کے موعودہ والیوم میں دیکھ لیں گے۔

تو لیجیے پہلے ”لووینا۔“

لووینا (تحریر: حوان رلفو)

”جنوب کی پہاڑیوں میں لووینا کی پہاڑی سب سے زیادہ سنگلاخ اور اونچی ہے اور وہ اُن بھورے پتھروں سے اُٹی پڑی ہے جن سے چونا بنایا جاتا ہے۔ مگر لووینا میں ان پتھروں سے کوئی چونا نہیں بناتا، نہ ہی انھیں کسی اور کام میں لاتا۔ وہاں اسے کچا پتھر کہا جاتا ہے، اور جو ٹیلا لووینا کی طرف چڑھتا چلا گیا ہے اُسے لوگ کچے پتھروں کی ٹیکری کہتے ہیں۔ سورج نے اور ہوانے اُسے پرت پرت جھڑانے اور مٹانے کا ذمہ لے رکھا ہے۔ اسی وجہ سے وہاں کی زمین ہمیشہ سفید رہتی ہے۔ ہر وقت ایسا لگتا ہے جیسے صبح کی شبِ نیم میں چمک رہی ہو۔ مگر یہ کہنے کی حد تک ہے۔ کیوں کہ لووینا میں دن بھی راتوں کی طرح سرد ہوتے ہیں اور شبِ نیم زمین تک آتے آتے اوپر آسمان ہی میں گاڑھی ہو جاتی ہے۔“

چھٹا حصہ: کیوں کہ نورنی سے پیار کرتا ہے پیدرو ۷۱۵

”اور یہاں کی ساری زمین کھڑی چٹانوں سے بنی ہے اور شگاف دار ہے۔ اس میں گہرے موکھے پڑ گئے ہیں جن کی تھانہ نظر نہیں آتی۔ لووینا والے کہتے ہیں کہ خواب انھیں موکھوں سے نکل کے آتے ہیں۔ میں نے تو بس ایک ہی چیز موکھوں سے آتی دیکھی ہے۔ وہ ہوا ہے جو ایسے سیٹیاں بجاتی نکلتی ہے جیسے اب تک نیچے گہرائی میں کہیں کسی نے اُسے نرکل کی نلیوں میں ٹھونس رکھا تھا۔ یہ ایسی ہوا ہے جو دل گمراہ کے ڈھیٹ پودوں تک کو نہیں جمنے دیتی۔ ورنہ یہ چھوٹے افسردہ پودے ایسے ہیں کہ تھوڑی سی بھی مٹی مل جائے تو اپنے سب نیچے پہاڑ کی کھڑی چٹان میں گڑائے جے رہتے ہیں۔ انھیں یہاں ہوا نہیں ٹکنے دیتی۔ ہاں کبھی کبھار تھوڑی چھاؤں مل جائے تو چٹانوں میں دُبکے چکالوٹ کے پودوں میں پوست جیسے سفید پھول کھل اُٹھتے ہیں۔ پر اس چکالوٹ کی عمر ہی کتنی ہوتی ہے، یہ جلد ہی مرجھاتا اور سوکھ جاتا ہے۔ اس کی خاردار شاخیں ہوا کو جیسے کھرچنے لگتی ہیں۔ یہ کھرچنا تم سن سکتے ہو کیوں کہ اس وقت ایسی آواز نکلتی ہے جیسے چاقو کو سان لگائی جا رہی ہو۔

”ہوا کو جو لووینا پر سے گزرتی ہے، تم دیکھ بھی لو گے۔ اتنی تاریک ہے وہ۔ لوگ کہتے ہیں وہ آتش فشاں کی ریت سے اُٹی رہتی ہے۔ جو بھی ہو، وہ کالی ہوا ہے۔ میں نے کہا نا، تم دیکھ ہی لو گے۔

”چیزوں کو وہ ایسے پکڑتی ہے جیسے بس انھیں دانتوں سے کاٹنے والی ہو۔ بہت دن تو ایسے ہوتے ہیں جب وہ مکانوں کی چھتوں کو یوں اُٹھا لیتی ہے گویا چھتیں نہیں ہیٹ ہیں اور اس نے انھیں اُٹھا کے دیواروں کو برہنہ سر کر دیا ہے۔ اور پھر وہ کھرچنا شروع کرتی ہے۔ توبہ! توبہ! جیسے ناخن ہوں اس کے۔ صبح شام، گھنٹوں، بے رُکے دیواروں کو کھرچتے، مٹی کے کپڑے کے کپڑے کھاڑتے، دروازوں کے پٹوں جھریوں تلے اپنے تیز پھاؤڑے چلاتے تم اُسے سنتے رہو گے، سنتے رہو گے یہاں تک کہ لگے گا وہ تمہیں اندر سے متھ رہی ہے، رڑک رہی ہے تمہیں اور ہڈیوں تک کے جوڑ کھلے جا رہے ہیں۔ دیکھ لینا یہ سب۔“

آدمی جو بات کر رہا تھا، تھوڑی دیر کو رکا... باہر کی طرف دیکھنے لگا۔ انجیر کے درختوں کی شاخوں کے درمیان سے اپنا ریلا گزارتے، چڑھے ہوئے دریا کا شور.. اور بادام کے پتوں میں نرمی سے سرسراتی ہوا کی آواز..... اور دکان کی روشنی سے اُجل سی گئی

اس تھوڑی جگہ میں کھیتے ہوئے بچوں کا سب غل غپاڑا اُن دونوں تک پہنچ رہا تھا۔
 پر دار چیونٹیاں آئیں، وہ تیل سے جلنے والے لیپ سے ٹکرا ٹکرا کر زمین پر
 گرنے لگیں..... اُن کے پر جھلس گئے تھے۔ باہر (معمول کے مطابق) رات گزرتی رہی۔
 ”ایے! کیکی لو! دو بیڑ اور!“ آدمی نے پکار کے کہا، ادھر اس سے کہنے لگا،
 ”ہاں مسٹر! ایک بات اور ہے۔ لووینا میں نیلا آسمان تمہیں کہیں نہیں ملے گا۔ پورے چھتچ پر
 میلی چکٹ چھاؤں چھائی رہتی ہے۔ ایک کالے دھبے کا بادل سا گھرا رہتا ہے جو کبھی نہیں
 ٹلتا۔ اور پہاڑیاں سب ننگی بوچی ہیں۔ کہیں ایک بھی درخت نہیں۔ کچھ بھی ہرا نہیں ہے
 کہ ذرا آنکھ ہی سستا لے، ہر شے راکھ جیسی دھند میں لپی رہتی ہے۔ ہاں۔ یہ تو تم دیکھ
 ہی لو گے کہ کیسا ہے سب کچھ۔ پہاڑیاں لاشوں کی طرح خاموش پڑی رہتی ہیں اور سب
 سے اونچی چوٹی پر بسا ہوا ہے، یہ..... لووینا۔ اپنے سفید گھروں کے ساتھ جیسے مردوں
 کے سر کا تاج سا لگتا ہے۔ سالا!“

بچوں کا شور غل پاس آگیا، پھر دکان میں داخل ہو گیا۔ اس پر آدمی کو اٹھنا
 پڑا پھر دروازے تک جانا اور اُن پر چیخنا پڑا، ”جاؤ رے جاؤ! کیوں ہمیں پریشان کر رہے
 ہو؟ کھیتے ہو کیلو، پر اتنا شور نہیں کرو۔“ پھر وہ واپس میز تک آیا، بیٹھ گیا اور بولا، ”ہاں،
 میں کہہ رہا تھا کہ وہاں زیادہ بارش نہیں ہوتی۔ سال کے وسط میں کچھ طوفان جھپٹتے آتے
 ہیں۔ وہ زمین کی سنگلاخ پڑی پر سے سب مٹی اکھاڑ لے جاتے ہیں، اوپر لڑھکتی چھوٹی
 بڑی چٹانوں پتھروں کے سوا کچھ نہیں چھوڑتے۔ اُس زمانے میں بادلوں کو بوجھل پن کے
 ساتھ ادھر ادھر ایک ٹیلے سے دوسرے تک اُچھل اُچھل کے جاتے ہوئے دیکھنا اچھا لگتا
 ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بادل نہ ہوں بھرے ہوئے مشکیزے ہوں جو کھڑی چٹان
 کے موکھوں کی دھار پر گر جتے، کڑکتے ٹکراتے ہوئے بس پھوٹنے ہی والے ہیں۔ لیکن
 دس بارہ دنوں کے بعد وہ چلے جاتے ہیں اور پھر اگلے سال آتے ہیں۔ کبھی تو یوں ہوتا ہے
 کہ کئی کئی سال وہ ادھر کا رخ نہیں کرتے۔ بتا تو رہا ہوں، زیادہ بارش وارش ہوتی
 نہیں ہے۔ مشکل ہی سے کچھ ہوتی ہے۔ اسی لیے زمین پرانے چمڑے جیسی سوکھی کھرنک
 ہونے کے ساتھ ساتھ تڑخ جاتی ہے اور گئی کی طرح کے سخت نوکیلے ڈھیلوں سے پورم پور
 دبھرجاتی ہے۔ اور جب تم اُس پہ چلتے ہو تو مٹی کے یہ ڈھیلے پاؤں میں گڑتے ہیں۔ لگتا

چھٹا حصہ: کیوں کہ نورنی سے پیار کرتا ہے پیدرو ۱۷

ہے خود زمین نے کانٹے نکال لیے ہیں۔ تو یہ قصہ ہے یہاں۔“

ایک ہی بار میں وہ اپنی بیئر چڑھا گیا۔ بوتل میں بس جھاگ کے بلبلے رہ گئے تو وہ شروع ہو گیا، ”جہاں سے بھی دیکھو، بڑی اُداسی جیسی بیٹھی ہوئی ہے۔ مسکرانا وہاں کوئی جانتا ہی نہیں۔ لوگوں کی شکلیں جیسے فریز ہو گئی ہیں۔ (فریز سمجھتے ہو؟) جی چاہے جب دیکھ لو..... جی ہوئی ہے یہ اُداسی، ملتی ہی نہیں صورتوں سے۔ ہوا کے جھونکے اسے ادھر ادھر چلاتے رہتے ہیں لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ اسے اڑا کے لے جائیں۔ لگتا ہے وہیں پیدا ہوئی ہے اور وہیں رہے گی اور ایسا ہے کہ تم اس کا احساس جیسا برابر کر سکتے ہو، اپنی زبان پر اس کا مزہ محسوس کر سکتے ہو، کیوں کہ وہ ہمیشہ تمہارے اوپر، بالکل تمہارے ساتھ لگی رہتی ہے۔ اور اس لیے بھی کہ یہ بہت بھاری ہوتی ہے، پلاسٹر کے بڑے تودے جیسی، دل کے زندہ گوشت پر اپنا بوجھ ڈالے ہوئے..... یہ اُداسی۔

”وہاں کے لوگ کہتے ہیں، جب پورا چاند ہوتا ہے تو وہ لووینا کی سرکوں پر ہوا کو جھاڑ دیتے دیکھ سکتے ہیں..... کہتے ہیں اُس نے..... ہوا نے..... اپنی پشت پر ایک کالا کبیل سا پھیلایا ہوتا ہے۔ لیکن پورے چاند میں، میں جتنا کچھ لووینا میں دیکھ پایا ہوں، میرے لیے تو وہ ہمیشہ مایوسی کی ایک تصویر ہی ہوتی تھی..... ہمیشہ۔

”مگر، بھائی! اپنی بیئر تو پی ڈالو۔ میں دیکھ رہا ہوں تم نے اُسے چھوا تک نہیں ہے۔ پیو، پیو۔ گرم شاید تمہیں اچھی نہیں لگتی۔ یہاں تو ایسی ہی ملتی ہے۔ مجھے پتا ہے تمہیں بری لگے گی، گدھے کے پیشاب جیسی۔ لیکن یہاں اس کی عادت سی پڑ جاتی ہے۔ قسم سے کہتا ہوں، وہاں یہ بھی نہیں ملے گی۔ جب وہاں پہنچو گے تو یہ بہت یاد آئے گی۔

”پینے کو وہاں ایک ہی قسم کی دارو ملتی ہے جسے وہ ہویازے نام کے کسی پودے سے بناتے ہیں۔ پہلے ہی گھونٹ کے بعد تمہارا سر ایسا گھومے گا کہ چکر گھٹنی ہو جائے گا۔ لگے گا تم نے اُسے کسی چیز سے ٹکرا دیا ہے۔ اس لیے اچھا ہی ہوگا جو یہ بیئر پی لو گے۔ مجھے پتا ہے میں کیا کہہ رہا ہوں۔“

باہر سے اب بھی دریا کے بُو جھنے کی آواز سنائی دے رہی تھی.. ہوا کا شور، بچوں کے کھیلنے کی آوازیں..... شام کا وقت ابھی شروع ہوا تھا۔

وہ آدمی ایک بار اور دروازے تک گیا، پھر وہاں سے کہتا ہوا آیا، ”بھیا! ابھی

اس جگہ بیٹھ کے، جہاں، اُس جگہ جیسا کچھ بھی نہیں ہے، چیزوں کو اپنی یادداشت سے نکال نکال کے لانا اور دیکھنا کوئی آسان کام ہے؟ لیکن جب بات ہو لووینا کی تو جو کچھ مجھے معلوم ہے اس کے بارے میں بولنا کوئی مشکل نہیں ہوتا۔ میں وہاں رہا ہوں نا۔ وہاں اپنی بیتی زندگی چھوڑ کے آیا ہوں۔ اُس جگہ سپنوں سے بھرا ہوا پہنچا تھا اور بوڑھا اور تھکا ہوا لوٹا ہوں اور اب تم وہاں جا رہے ہو۔ ٹھیک ہے۔ لگ رہا ہے شروع شروع کا قصہ مجھے سب یاد آرہا ہے۔ دیکھو تمہاری جگہ خود کو رکھ کے سوچتا ہوں..... ہاں، میں پہلے پہل لووینا پہنچا تو..... لیکن تم اپنی بیر سے پہلے مجھے ایک گھونٹ لینے دو گے؟ بہا۔ تمہیں اس کی پروا ہی نہیں ہے۔ پر میرے یہ بہت کام آئے گی۔ بڑا سکون دیتی ہے۔ ایسا کر دیتی ہے مجھے جیسے سمجھو روغنِ کافور سے سر کی مالش ہوئی ہو۔ تو میں کہہ رہا تھا، جب پہلی بار میں لووینا پہنچا تو اُس خچر والے نے، جو ہمیں لے کے گیا تھا، اپنے جانوروں کو ستانے بھی نہیں دیا۔ ہمیں اتارتے ہی وہ آدھا گھوم گیا، بولا، 'میں واپس جا رہا ہوں۔' ”ٹھہرو۔ جانوروں کو دم بھی نہیں لینے دو گے؟ بہت تھک گئے ہیں۔

”بولا، یہاں ان کی حالت اور بھی خراب ہو جائے گی۔ ہاں، نکل ہی جاؤں تو اچھا ہے۔“ اور وہ بھاگ لیا، کچے پتھروں والی ٹیکری سے ڈپٹتا ہوا، اپنے جانوروں کو ایڑ لگاتا، بھاگم بھاگ، جیسے وہ کوئی جگہ نہ ہو شیطان کا ٹھکانا ہو۔

”میں، میری بیوی، تینوں بچے وہاں بیچ چوراہے میں رُکے کھڑے رہے، اپنا سامان اٹھائے۔ ایسی جگہ کے بالکل بیچوں بیچ جہاں آپ بس ہوا چلنے کی آواز سن سکتے تھے.....“ ”بس یہ ایک چوک تھا، جہاں ہوا روکنے کو ایک پودا بھی نہیں تھا، وہاں تھے ہم۔“ ”میں نے اپنی بیوی سے پوچھا کہ اگر یہاں آگئے۔ یہ کیا جگہ ہے؟“ ”اور جواب میں اُس نے کندھے اچکا دیے۔

”میں نے کہا کہ اچھا، ایسا ہی ہے تو تم جا کے کوئی جگہ دیکھ آؤ جہاں کچھ کھا پی لیں گے، رات گزار لیں گے۔ جاؤ، ہم یہاں تمہارا انتظار کر لیتے ہیں۔

”اُس نے سب سے چھوٹے بچے کا ہاتھ پکڑا، اُسے لے کے چلی گئی۔ اور پھر واپس نہیں آئی۔

”جھپٹا ہونے لگا، جب سورج کی روشنی اتنی رہ گئی کہ اس میں صرف پہاڑیوں

چھٹا حصہ: کیوں کہ نوری سے پیار کرتا ہے پیدرو ۷۱۹

کی چوٹیاں دکھائی دے رہی تھیں تو ہم اُسے ڈھونڈنے نکلے اور لووینا کی چھوٹی پتلی سڑکوں پہ کچھ دیر چلتے رہے، آخر وہ ہمیں سنسان گر جا گھر میں بیٹھی ہوئی ملی، بچہ اس کی ٹانگوں کے درمیان سویا پڑا تھا۔

”اگر پیانا! یہاں بیٹھی کیا کر رہی ہو؟

”کہنے لگی کہ دُعا کرنے آئی ہوں۔

”میں نے پوچھا، کیوں؟

”اُس نے اپنے کندھے اُچکا دیے۔

”وہاں کون تھا جس سے دُعا کی جاتی؟ ایک خالی ڈھنڈار جھونپڑا تھا جس میں دروازے تک نہیں تھے۔ کچھ کھلی سی گیلریاں تھیں اور ایک دراڑوں سوراخوں والی چھت جس میں سے ہوا ایسے چلی آرہی تھی جیسے چھلنی میں سے آتی ہے۔

”چائے خانہ، ہوٹل وٹل کہاں ہے؟

”بولی، یہاں کوئی چائے خانہ، ہوٹل نہیں ہے۔

”کوئی سرائے؟

”کہنے لگی یہاں کوئی سرائے نہیں ہے۔

”میں نے پوچھا کہ تمہیں کوئی نظر آیا؟ کوئی رہتا بھی ہے یہاں؟

”...ہاں، سامنے سڑک پار کر کے عورتیں ہیں کچھ... اب بھی نظر آ رہی ہیں

مجھے۔ وہ دیکھو، دروازوں کی جھریوں میں سے ان کی آنکھیں چمکتی نظر آتی ہیں۔ برابر ہمیں گھورے جا رہی ہیں۔ دیکھو..... مجھے اُن کی آنکھوں کی چمکتی پتلیاں دکھائی دے رہی ہیں۔ لیکن ہمیں کھانے کو دینے کے لیے اُن کے پاس کچھ نہیں ہے۔ دروازوں سے سر نکالے بغیر وہ مجھے بتا رہی تھیں کہ پورے قصبے میں کھانے کو کچھ نہیں ہے۔ تو پھر میں..... دُعا کرنے خدا سے ہمد مانگنے..... یہاں آگئی۔ یہ کہہ کے وہ چُپ ہوگئی۔

”واپس چوک میں کیوں نہیں گئیں؟ ہم تمہارا انتظار کر رہے تھے۔

”بولی، یہاں دُعا کرنے آئی تھی۔ ابھی دعا ختم نہیں ہوئی۔

”یہ کیسی جگہ ہے، اگر پیانا؟

”اور اس نے پھر اپنے کندھے اُچکا دیے۔

”اُس رات ہم نے وہیں گر جا گھر کے ایک کونے میں، گرائی ہوئی قربان گاہ کے پیچھے رات گزارنے کا فیصلہ کیا۔ جھکڑ وہاں بھی پہنچ رہے تھے، لیکن اتنے فرائے دار نہیں تھے۔ ہم اُنھیں آتے، دُہرے دروازوں کے غار نما خلا سے ہو کر نکلتے اور ہم پر سے لمبی چیخیں مارتے، بین کرتے گزرتے ہوئے سنتے رہے۔ ہم اُنھیں ہاتھوں میں ہوا کے تھپڑے اٹھائے نشان گاہوں پر نصب صلیبوں پر کوڑے برساتے سنتے رہے۔ مسکیت لکڑی کی کپھٹیوں سے بنے کتنے ہی کھر درے صلیب نشان گر جا گھر کے طول میں تاروں سے کسے دیواروں سے لٹک رہے تھے، جھکڑوں کے ہر تھپڑے پر جب یہ تارتن تارتن جیسی آواز میں بجتے تو ایسا لگتا جیسے کوئی دانت پیس رہا ہو۔

”بچے رونے لگے، اس لیے کہ بہت ڈرے ہوئے تھے، سو نہیں سکتے تھے۔ میری بیوی سب کو بانہوں میں سمیٹنے کی کوشش میں تھی۔ وہ نکلے پڑتے تھے اور ماں اُنھیں کولی میں بھرنے کا جتن کر رہی تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کیا کروں۔

”صبح ہونے سے کچھ پہلے ہوا دھیمی ہو گئی۔ پھر واپس اُسی طرح چلنے لگی مگر صبح میں ایک وقت ایسا ضرور آیا جب سب چیزیں رُک گئیں، یوں لگا جیسے آسمان زمین سے آ ملا ہے اور اُس نے اپنے بوجھ سے سارا شور کچل کے رکھ دیا ہے۔ بچوں کو سکون سے سانس لیتے سنا جا سکتا تھا۔ وہ اب آرام سے تھے۔ مجھے قریب سے اپنی بیوی کا بھاری سانس سنائی دیا۔

”پوچھنے لگی، یہ کیا ہے؟

”کہاں کیا ہے؟ میں نے پوچھا۔

”یہ؟..... آواز؟

”یہ سناتا ہے..... جاؤ سو جاؤ۔ کچھ آرام ہی کر لو۔ تھوڑی دیر میں دن نکل آئے گا۔

”مگر جلد ہی وہ آواز میں نے بھی سن لی۔ ایسی آواز تھی جیسے چمگادڑیں

اندھیرے میں پھڑپھڑاتی ہوئی ہمارے پاس سے گزری ہوں۔ بڑے پروں والی چمگادڑیں، جن کے پر زمین کو چھوتے ہوئے جا رہے ہوں۔ میں اٹھا تو پروں کی پھڑپھڑاہٹ تیز ہو گئی۔ جیسے چمگادڑوں کا وہ جھنڈ بھڑک گیا ہو اور دروازوں کے سوراخوں کی طرف اُڑنے لگا ہو۔ اپنے آگے آگے ہلکی سرسراہٹ محسوس کرتا، میں پنچوں کے بل

چھٹا حصہ: کیوں کہ نورآئی سے پیار کرتا ہے پیدرو ۷۲

وہاں تک پہنچا، دروازے پر رُکا..... اور تب میں نے اُنھیں دیکھا۔ میں نے پانی کے قرا بے کندھوں پر اُٹھائے لووینا کی سب عورتوں کو دیکھا۔ چادریں سروں پر ڈالے ہوئے، میں نے اُن کے سیاہ وجود رات کے تاریک پس منظر میں دیکھے۔

”میں نے پوچھا، کیا چاہیے؟ رات میں اس وقت تم لوگ کیا ڈھونڈ رہی ہو؟

”اُن میں سے ایک بولی، ہم پانی لینے جا رہے ہیں۔

”میں نے اُنھیں سامنے کھڑے دیکھا۔ وہ میری طرف دیکھ رہی تھیں اور پھر

جیسے کہ وہ سائے ہوں، اپنے سیاہ قرا بے اُٹھائے وہ سڑک پر چل پڑیں۔

”نہیں بھئی۔ وہ پہلی رات میں کبھی نہیں بھولوں گا جو میں نے لووینا میں گزاری۔

”کیا خیال ہے تمھارا؟ ان یادوں کا کڑوا پن دور کرنے کو ہی سہی..... اور

بیزمنگانا کیا ضروری نہیں ہو گیا؟

”ایسا یاد آرہا ہے جیسے تم نے مجھ سے پوچھا تھا کہ میں کتنے برس لووینا میں

رہا ہوں..... ہیں نا؟ سچی بات یہ ہے، مجھے خود نہیں معلوم۔ وقت کو سمجھنے کی جو لیاقت ہوتی

ہے نا..... جب سے بخار نے مجھے پکڑا ہے تو وہ لیاقت اس نے میرے لیے گڈ مڈ

کر چھوڑی ہے۔ ہہا۔ میں سمجھتا ہوں اب تو ہمیشوں ہمیش سے ہی لووینا میں ہوں۔ وقت

بڑا لمبا ہوتا ہے وہاں۔ وہاں کوئی گھنٹوں کو نہیں گنتا اور کسی کو فکر نہیں ہوتی کہ برسوں پر برس

کیسے اکٹھا ہوتے چلے جاتے ہیں۔ دن شروع ہوتا ہے اور ختم ہو جاتا ہے۔ پھر رات آتی

ہے۔ بس دن اور رات.. یہاں تک کہ موت آجاتی ہے، جو اُن کے لیے ایک اُمید ہے۔“

”تم سوچتے ہو گے میں ایک ہی راگ الاپے جا رہا ہوں۔ ہاں بھائی! صحیح

ہے۔ ایک ہی راگ الاپ رہا ہوں۔ دروازے کی چوکھٹ پہ بیٹھ کے سورج کو نکلتے

ڈوبتے دیکھنا، اپنا سراٹھاتے جھکاتے ہوئے، یہاں تک کہ کمائیاں ڈھیلی پڑ جائیں۔ پھر ہر

چیز رُک جائے، وقت کی گرفت سے نکل جائے ہر چیز۔ اور پھر یوں لگتا ہے جیسے آدمی اس

ہمیشوں ہمیش ہی میں رہتا رہا ہے۔ تو یہ حال ہے وہاں کے بوڑھے لوگوں کا۔

”کیوں کہ..... بقول اُن کے..... جو واقعی بوڑھے ہیں اور جو ابھی پیدا نہیں

ہوئے، لووینا میں بس وہی رہتے ہیں۔ اور ہاں، کم زور عورتیں بھی، اتنی دُلی کہ سمجھو ہڈی

اور چمڑا۔ جو بچے وہاں پیدا ہوئے تھے وہ تو سب چلے گئے۔ دن کی روشنی بھی مشکل ہی

سے دیکھ پاتے ہیں کہ وہ بڑے ہو جاتے ہیں۔ وہاں یہ کہاوت کہی جاتی ہے کہ بچے اپنی ماؤں کی چھاتیوں سے چھلانگ مارتے ہیں تو پھر پھاؤڑا سنبھال لیتے ہیں اور لووینا سے غائب ہو جاتے ہیں۔ تو اس طرح ہے لووینا میں۔“

”وہاں صرف بڑھے رہ گئے ہیں اور اکیلی عورتیں، یا ایسی جن کے شوہر ہیں مگر پتا نہیں کہاں گئے ہوئے ہیں۔ جن طوفانوں کا میں بتا رہا تھا، وہ آتے ہیں تو یہ شوہر لوگ بھی برابر چلے آتے ہیں۔ وہ قصبے میں آتے ہیں تو ہر طرف ایک سرسراہٹ سنائی دیتی ہے اور دوبارہ جب چلے جاتے ہیں تو بس شکوے یا بڑبڑاہٹ جیسی آواز رہ جاتی ہے۔ وہ لوگ بڑھوں کے لیے کھانے پینے کا تھیلا بھر سامان چھوڑتے اور اپنی عورتوں کے شکم میں ایک اور بچے کا بیج ڈال جاتے ہیں۔ ایک اور برس گزر جاتا ہے اور اُن کے بارے میں اور کوئی خبر نہیں ملتی۔ یوں بھی ہوتا ہے کہ کبھی اُن کے بارے میں کچھ بھی نہیں معلوم ہو پاتا۔ یہی دستور ہے۔ وہاں سب سمجھتے ہیں کہ قانون اسی طرح ہے، لیکن کیا فرق پڑتا ہے۔ بچے ماں باپ کے لیے کام کر کر کے اپنی عمر ختم کر دیتے ہیں، جس طرح اُن کے ماں باپ نے اپنے ماں باپ کے لیے عمریں ختم کی تھیں اور پیچھے خدا جانے کتنی نسلوں نے اسی طرح اپنی ذمہ داری پوری کی ہوگی؟

”اس دوران میں بڑھے لوگ دروازوں کی چوکھٹوں پر بیٹھے اُن کا..... اور موت کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ بازوان کے ڈھیلے پن سے لٹکے ہوتے ہیں۔ صرف بچوں کی احسان مندی اُن میں کوئی تحریک پیدا کرے تو کرے، ورنہ وہ بڑھے بالکل تنہا ہوتے ہیں..... اس اُجاڑ قصبے لووینا میں۔

”ایک روز میں نے اُنھیں قائل کرنے کی کوشش کی کہ سب کسی دوسری جگہ چلیں جہاں زمین اچھی ہے۔ ’چلو یہاں سے۔‘ میں نے ان سے کہا، ’چلو۔ کسی نہ کسی طرح ہم کہیں جمنے کا بندوبست کر لیں گے۔ حکومت ہماری مدد کرے گی۔‘

”وہ سنتے رہے اور پلکیں جھپکائے بغیر اپنی آنکھوں کی گہرائی میں سے، جہاں سے بہت تھوڑی روشنی آ رہی تھی، مجھے گھورتے رہے۔

”ایک بولا، ٹیچر! تم کہتے ہو حکومت ہماری مدد کرے گی تب حکومت کو جانتے ہو؟

”میں نے کہا کہ ہاں جانتا ہوں۔

چھٹا حصہ: کیوں کہ نورؔی سے پیار کرتا ہے پیدرو ۷۲۳

”ہہہ! اتفاق سے ہم بھی اُسے جانتے ہیں لیکن ہم حکومت کی ماں کے بارے میں کچھ نہیں جانتے۔

”میں نے بتایا کہ بھی یہ تمہارا ملک ہے۔ انہوں نے انکار میں سر ہلایا کہ نہیں۔ اور وہ ہنسے۔ یہ پہلا موقع تھا جو میں نے لووینا کے لوگوں کو ہنستے ہوئے دیکھا۔ وہ اپنے پوپے منہ کھول کے مسکرائے اور بولے کہ نہیں حکومت کی کوئی ماں نہیں ہے۔

”اور بھائی، تمہیں پتا ہے؟ وہ صحیح کہہ رہے تھے۔ ان کا مالک انہیں صرف اُس وقت یاد کرتا ہے جب ان ’لڑکوں‘ میں سے کوئی وہاں کچھ غلط سلط کر بیٹھتا ہے۔ تب اُس کے لیے وہ کسی کو لووینا میں بھیجتے ہیں اور وہ آ کے اُسے مار دیتا ہے۔ اس کے سوا ان مالکوں کو پتا نہیں ہے کہ لوگوں کا یہاں کوئی وجود بھی ہے..... ایسی جگہ ہے یہ..... لووینا۔ اب تم جا ہی رہے ہو، تو خود ہی پتا چل جائے گا۔ میں تو کہتا ہوں، یہ وہ جگہ ہے جہاں اُداسی سالی گھونسل بنا کے بیٹھی ہوئی ہے۔

”وہ کہنے لگے کہ تم ہمیں یہ سمجھانے کی کوشش کر رہے ہو کہ ہمیں لووینا چھوڑ دینا چاہیے کیوں کہ تمہارے خیال میں ہم بلا وجہ بہت بھوکوں مر لیے۔ بتاؤ؟ اگر ہم یہاں سے نکلے تو ہمارے مردے کون ساتھ لے کے چلے گا؟ وہ بھی یہیں ہیں۔ ہم انہیں اکیلا تو نہیں چھوڑ سکتے۔

”تو بس وہ ابھی بھی وہیں پڑے ہیں۔ اب تم جا ہی رہے ہو، دیکھ لو گے انہیں۔ بھوک بھگانے کو مسکیت لکڑی کا گودا چباتے اور پیک نگلتے ہوئے۔ تم انہیں سایوں کی طرح گزرتے، گھروں کی دیواروں سے چپکے، سرکتے ہوئے..... دیکھ ہی لو گے۔ ہوا تقریباً انہیں کھینچتی لیے جاتی ہے۔

”میں نے آخر ان سے کہا کہ سنو! تم اس ہوا کی آواز نہیں سن رہے؟ یہ تمہیں ختم کر دے گی۔

”وہ کہنے لگے، جب تک اسے چلنا ہے چلے گی۔ یہ امر الہی ہے۔ مرضی ہے اُس کی۔ ویسے اس کا رک جانا اچھا نہیں ہے۔ جب کبھی ایسا ہوتا ہے تو سورج لووینا میں اُٹا آتا ہے اور جو بھی کچھ تھوڑی بہت نمی ہماری کھال کے نیچے ہوتی ہے اُسے اور ہمارے لہو کو چوس لیتا ہے۔ ہوا سورج کو اوپر ہی رکھتی ہے، نیچے نہیں آنے دیتی۔ اسی طرح صحیح ہے۔

”تو بس، میں نے ان سے اور کچھ نہیں کہا۔ لووینا چھوڑ دیا میں نے۔ واپس نہیں گیا، نہ کبھی جانے کا ارادہ ہے۔“

”لیکن دیکھو دنیا کس طرح گردش کرتی رہتی ہے۔ اب کچھ ہی گھنٹوں میں تم وہاں جا رہے ہو۔ کوئی پندرہ برس ہوتے ہیں جو انھوں نے یہی بات مجھ سے کہی تھی، تم سان یوآن لووینا جا رہے ہو۔“

”اُن دنوں جان تھی مجھ میں۔ سوچوں، خیالوں سے سمجھو بھرا ہوا تھا۔ تمہیں تو معلوم ہے آدمی کبھی کیسا پورم پور ہوتا ہے..... منصوبوں وغیرہ سے۔ وہ جہاں بھی جاتا ہے انھی سے کچھ نہ کچھ بنالینے کے خیال کے ساتھ جاتا ہے۔ مگر لووینا میں یہ سب نہیں چل سکا۔ کر کے دیکھ لیا میں نے۔ نہیں چل سکا۔“

”سان یوآن لووینا۔ یہ نام مجھے ایسا سنائی دیا تھا جیسے کسی بہشت کا نام ہو۔ مگر وہ اعراف ہے، کسی کفارے کا مقام۔ مرتی ہوئی جگہ ہے وہ۔“

”ایسی کہ وہاں کتے بھی مرمر کے ختم ہو گئے ہیں۔ اب وہاں سناٹے پر بھونکنے والی کوئی مخلوق نہیں ہے، کیوں کہ جوں ہی کوئی وہاں چلنے والی ہوا کا عادی ہو جاتا ہے، وہ بس اُن خدائی خوار اُجاڑ جگہوں میں راج کرتے سناٹے ہی کو سنتا ہے اور اسی سے آدمی ڈھب جاتا ہے۔ مجھے دیکھو، مجھے کیا کر دیا اس نے۔ اب جا ہی رہے ہو، جلدی سمجھ جاؤ گے کہ میں کیا کہہ رہا ہوں۔“

”تم کیا کہتے ہو؟ اس بھائی کو گلاسوں میں تھوڑی تھوڑی مسکال ڈالنے کو کہیں؟ بیڑ کے ساتھ یہ چکر ہے کہ ذرا دیر بعد اُٹھ کے باہر جانا پڑتا ہے، اس سے اپنی باتوں میں کافی خلل پڑتا ہے۔ ایے! کیسی لو! اس دفعے اپنے لیے دو مسکال لے کے آ۔“

”ہاں۔ میں تم سے کہہ رہا تھا.....!“

مگر اس نے کچھ نہیں کہا۔ میز پر اسی جگہ ایک ٹک دیکھا کیا جہاں بے پروا والی پر دار چیونٹیاں اب ننگے کیڑوں کی طرح چکراتی پھر رہی تھیں۔

باہر رات کو آگے بڑھتے سنا جاسکتا تھا۔ انجیر کے تنوں سے پانی کے ٹکرانے کی لپ لپ آواز آ رہی تھی۔ بچوں کا شور و غل، اُب بہت دور سے آتا تھا۔ دروازے کے ”چھوٹے سوراخ سے ستارے جھانک رہے تھے۔“

چھٹا حصہ: کیوں کہ نورسی سے پیار کرتا ہے پیدرو ۷۲۵

آدمی جو پر دار چیونیوں کو تکے جا رہا تھا وہ اب میز پر ایک طرف لڑھک گیا تھا، اور سو گیا تھا۔



دعائے جنگ (تحریر: مارک ٹوئین)

زبردست جوش و خروش کے دن تھے، ملک ہتھیار بند ہو کر اٹھ کھڑا ہوا تھا۔ جنگ جاری تھی۔ لگتا تھا ہر دل میں حب وطن کی آگ روشن ہے۔ ادھر نقارے پر چوب پڑتی تھی ادھر بینڈ بج رہے تھے۔ کہیں کھلونا پستول پھٹ پھٹ کرتے اور پٹانے سلگتے چمکتے تھے۔ ہر ہاتھ میں جھنڈا تھا۔ دور تک جاتی چھتوں چوباروں کی دھندلی پڑتی بجھات پر لہراتے پرچموں کا ایک دشت بے نہایت دھوپ میں پڑا لٹکتا تھا۔

بھڑک دار نئی نفیس وردیوں میں نوجوان رضا کاروں کے جیش چوڑی شاہراہ سے قوائد پریڈ کرتے روز گزرتے تھے۔ یہ ٹکڑیاں جھولتی لہراتی برابر سے نکلتیں تو اُن پر ناز کرتے ماں باپ بہنیں اور محبوبائیں فرط جذبات سے پھنسی ہوئی اور مسرت سے چھلکتی آوازوں میں تحسین کے نعرے سر کرتے تھے۔ راتوں کو عام جلسوں میں، جہاں تل دھرنے کو جگہ نہ ہوتی، لوگوں کے ہانپتے ہوئے ہجوم حب وطن میں ڈوبی خطابت سنتے۔ یہ خطابت دلوں کو ہلا کے رکھ دیتی اور گہرائیوں میں اترتی تو سب کچھ اٹھل پھل کر دیتی۔ پھر اگر ایک لمحے کا وقفہ بھی آتا تو لوگ اُسے تابڑ توڑ تالیوں سے بھرتے جاتے۔ اس دوران میں آنسو اُن کے رخساروں پر لکیریں بنا کے بہتے رہتے۔

گر جاگھروں میں خطیب اور پادری صاحبان اپنی خطابت سے اس قیامت کا طوفان اٹھا رہے تھے کہ رہے نام مالک کا۔ وہ ملک اور پرچم سے وفاداری کی تلقین کرتے، خدائے حرب و جدال کی دُہائی دیتے اور اُس سے التجا کرتے کہ اس عظیم مقصد میں وہ ان کی مدد فرمائے۔

بے شک یہ دور مسرتوں کا اور خداوند کی عنایتوں اور بخششوں کا دور تھا۔ تاہم چار چھ ناعاقبت اندیش افراد نے جنگ کو ناپسند کیا اور اس نیک و صالح صراطِ مستقیم پر شک سا ظاہر کرنے لگے۔ ان کو ایسی غضب ناک وارنگ دی گئی کہ دوبارہ یہ سب کرنے اور لوگوں کی خفگی مول لینے کی اُن کی پھر ہمت نہ ہوئی۔

اتوار کی صبح ہوئی۔ اگلے روز فوجی دستوں کو محاذ پر جانا تھا، گر جا گھر میں تل دھرنے کو جگہ نہ تھی، سبھی رضا کار موجود تھے، اُن کے چہرے حقیقت کے رنگوں میں رنگے ہوئے خوابوں سے روشن تھے جن میں سخت پیش قدمی اور رفتار پکڑتی، لپکتی یلغار اور لشکری شمشیروں کی تصویریں تھیں اور شور و غوغا کے اور غنیم کی پسائیوں، گھیرتے ہوئے دھوئیں اور غضب ناک تعاقب سے لے کر ہتھیار ڈالنے تک کے زندہ مناظر تھے! ان خوابوں میں میدان جنگ سے گھر لوٹتے دلاوروں کے سنولائے ہوئے چہرے تھے کہ جن کے سواگت میں خوب جے جے کا رہا ہوئی تھی، جنہیں خوب سراہا گیا تھا، جنہیں عظمت و اقبال مندی کے سنہرے سیلاب میں گلے گلے ڈبو دیا گیا تھا۔

رضا کاروں کے ساتھ اُن کے عزیز پیارے بیٹھے تھے... بہت مغرور و شاداں۔ اُن کی قسمت پر وہ ہمسائے اور دوست رشک کرتے تھے جنہیں عزت کی رزم گاہ میں بھیجنے کے لیے وہ بیٹے اور بھائی نصیب نہیں تھے جو یا تو پرچم کے لیے فتح یاب ہو کر لوٹتے یا انتہائی بلند رتبہ موت سے سرفراز ہوتے۔

عبادت کا آغاز ہوا، عہد نامہ عتیق سے جنگ کے ایک باب کی تلاوت کی گئی۔ دُعاؤں کی پڑھی گئی، جس کے بعد ارگن باجے کے سر اس شدت سے پھوٹے کہ گرجے کی عمارت لرزنے لگی۔ حاضرین ایک جھٹکے سے اُٹھ کھڑے ہوئے۔ دھڑکتے دلوں اور چمکتی آنکھوں سے انہوں نے خدائے منتقم کی دُہائی دی، اُس کی زبردست جبروت کی ثنا اور استمداد اس طور سے کی کہ اے صاحبِ جلال، اے قہار! بجلی کا کڑکا تیری نفیری، اُس کا لشکارا تیری تلوار ہے! سو ہمیشہ تیرا ہی امر نافذ رہے۔

اس کے بعد ”دُعا طویل“ شروع ہوئی۔ کسی کو یاد نہیں کہ اتنی گرم و پر جوش استدعا اتنے رقت انگیز اسلوب میں پہلے کبھی کی گئی ہو۔ اس التجا میں ٹیپ کا بند یہ تھا کہ ہمیشہ کرم کرنے والا ہمارا ارحم الراحمین باپ ہمارے عالی رتبہ نو جوان سپاہیوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھے، ان پر اپنی برکتیں نازل فرمائے اور حب الوطن کے اس فرض کی ادائیگی میں ان کی اعانت کرے، ہمت دے، ان کا حوصلہ بڑھائے، انہیں اپنے دستِ زور آور کی پناہ میں لے لے۔ اس خوں ریز پیکار میں انہیں مضبوط، ثابت قدم اور ناقابلِ تسخیر رکھے، غنیم کو کچلنے میں ہر طرح ان کی مدد فرمائے۔ انہیں، ان کے پرچم اور ملک کو لازوال

چھٹا حصہ: کیوں کہ نورؔی سے پیار کرتا ہے پیدرو ۷۷

سر بلندی اور شکوہ عطا کرے۔

اُسی وقت ایک عمر رسیدہ اجنبی گرجا میں داخل ہوا۔ وہ آہستہ آہستہ بے آواز قدموں سے نشستوں کے درمیانی رستے پر بڑھنے لگا۔ اُس کی نظریں پادری پر لگی ہوئی تھیں، اُس کا لانا قد پیروں تک آتے لبادے سے ڈھکا تھا۔ سر کھلا تھا اور سفید بال جھاگ اڑاتے چشمے کی طرح شانوں تک آ رہے تھے، جھریوں بھرا چہرہ غیر فطری زردی لیے ہوئے تھا، یوں لگتا تھا جیسے مردنی چھائی ہو۔ سب آنکھیں جاننے کے اشتیاق میں اُس پر لگی تھیں۔ وہ خاموشی سے چلتا رہا، بے رُکے سیڑھیاں چڑھ کر پادری کے برابر جا کھڑا ہوا اور انتظار کرنے لگا۔

اس کی موجودگی سے بے خبر، آنکھیں بند کیے، پادری نے اپنی رقت انگیز دُعا جاری رکھی۔ آخر کار ولولہ انگیز استدعا کے ساتھ اِن لفظوں پر اُسے ختم کیا اور کہا، ”اے مالک، اے خداوند، اے ملکِ عظیم اور پرچم کے محافظ، اے ہمارے باپ! ہمارے ہتھیاروں پر نزولِ برکت فرما، ہمیں فتح مندی عطا کر۔“

آنے والے نے پادری کا بازو چھوا، اسے ایک طرف ہونے کا اشارہ کیا۔ بدحواسی میں پادری نے تعمیل کی۔ اجنبی نے اُس کی جگہ سنبھال لی۔ چند لمحوں تک اُس نے اپنی گہبھر آنکھوں سے، جن میں ایک پراسرار جوالا روشن تھی، سحر زدہ حاضرین کا جائزہ لیا پھر گہری گونجیلی آواز میں کہا:

”میں تحتِ علا کا فرستادہ، باری تعالیٰ کا پیغام لے کر آیا ہوں۔“

ان لفظوں سے حاضرین کو جیسے جھٹکا سا لگا۔ آنے والے نے محسوس کیا ہوگا تو بھی اُس نے توجہ نہ دی، کہنے لگا:

”وہ فرماتا ہے کہ اُس نے اپنے خادم، تمہارے گلہ بان کی یہ دُعا سن لی اور قبولیت عطا کی یعنی یہ عاجز پیغام رساں اِس دُعا کے مضمرات..... سارے ہی مضمرات، تمہیں سمجھا چکے گا اس پہ بھی اگر تمہاری یہی خواہش ہوئی تو باری تعالیٰ دُعا قبول فرمائے گا۔ کیوں کہ انسانوں کی کتنی ہی دُعاؤں کے ساتھ یہ معاملہ ہوتا ہے کہ مانگنے والا حقیقت میں جو طلب کرتا ہے دُعا اُس سے زیادہ مانگ لیتی ہے۔ اِس لیے ایک بار رُکنا اور سوچنا ضروری ہے۔“

”خداوند کا اور تمہارا خادم اپنی دُعا کر چکا ہے۔ پر کیا یہ دم بھر کو رُکا ہے، کیا غور کیا ہے اس نے؟ اور سوچو کیا یہ ایک دُعا تھی؟ نہیں، یہ دو دُعائیں تھیں..... ایک وہ جو زبان سے ادا کی گئی، دوسری وہ جو نہیں کی گئی۔ دونوں اُس سمیعِ مطلق کے گوشِ شنوا تک پہنچیں جو تمام التجائیں سنتا ہے، زبان سے ادا کی گئی دُعا بھی اور ادا نہ کی گئی دُعا بھی۔ یہ بات سوچو، ذہن نشین کرلو۔ جب تم اپنے لیے ایک برکت کی التجا کر رہے ہوتے ہو، خبردار! کہیں ایسا تو نہیں کہ ٹھیک اُسی وقت تم، قصد و ارادے کے بغیر، کسی ہمسائے کے لیے قہر الہی مانگتے ہو۔ اگر تم اپنی فصل کے لیے رحمتِ باراں کی دُعا کرتے ہو، جس کی اُسے ضرورت ہے، تو اس عمل سے ممکن ہے کسی ہمسائے کی فصل کے لیے، جسے باراں کی ضرورت نہیں، جو اس سے برباد ہو سکتی ہے، تم عذاب و زحمت طلب کر رہے ہو۔

”اپنے خادم کی دُعا تم نے سنی..... یعنی اُس کا وہ حصہ جو زبان سے ادا ہوا۔ مجھے خداوند کا حکم ہے کہ اُس دوسرے حصے کو لفظوں کا جامہ پہناؤں جو پادری نے، اور تم نے بھی، اپنے دلوں میں خاموشی کے ساتھ، بہت شوق اور ولولے سے مانگی تھی اور اپنی لاعلمی میں، بے سوچے سمجھے مانگی تھی؟ خدا کرے ایسا ہی ہوا ہو..... تم نے یہ الفاظ سنے، ’اے مالک! اے خداوند! ہمیں فتحِ مندی عطا کر!‘ بس یہ کافی ہے۔ ادا کی گئی پوری دُعا ان پُر معنی لفظوں سے پیوستہ ہے۔ تفصیلات اور وضاحتیں ضروری نہیں تھیں۔ جب تم نے جیتنے کی دُعا مانگی، تم نے بیان نہ کیے گئے اُن بہت سے نتائج کی بھی دُعا کی جو فتح کے بعد ظاہر ہوتے ہیں، لازماً ظاہر ہوتے ہیں، رہ نہیں سکتے۔ دُعا کا وہ حصہ جو لفظوں میں بیان نہ ہوا تھا سمیعِ مطلق کے گوشِ شنوا تک پہنچا۔ اُس نے مجھے حکم دیا ہے کہ اُسے لفظوں میں بیان کر دوں۔ تو سنو! (تم نے یہ دُعا مانگی کہ)۔

”اے مالک، اے باپ ہمارے! دیکھ یہ جواں سال محبِ وطن، ہماری آنکھوں کے تارے، دلوں کے سرورِ رزم گاہ میں نکلتے ہیں، تو اُن کے نزدیک رہ! ہم بھی، اپنے پیارے گھر آنکھوں کا دل آویز امن اور شانتی چھوڑ کر، دشمن پر ضرب لگانے صورتِ جاں ساتھ چل پڑے ہیں۔ اے مالک، ہمارے خداوند! ہماری مدد کرتا کہ ہم اپنے گولوں سے اُن کے (حرامی) سپاہیوں کے چیتھڑے اڑا دیں۔ اعانت فرما کہ ہم ان کے مسکراتے کھپتوں میں اُنھی کے مردہ محبِ وطنوں کے زرد لاشے بچھا دیں۔ درد میں تشنج کرتے اُن

چھٹا حصہ: کیوں کہ نورِی سے پیار کرتا ہے پیدرو ۷۲۹

کے زخمیوں کی چیخوں سے توپوں کی گھن گرج کودبانے میں، خداوند! ہماری معاونت فرما۔
مدد کر ہماری کہ ہم اُن کے ادنیٰ گھروں کو ایک آگ کے طوفان میں نیست و نابود
کر دیں۔ اُن کی بے ضرر بیواؤں کے دل ایک رنجِ لا حاصل سے اچھی طرح کچلنے مسلنے
میں بارِ الہا! ہماری اعانت فرما۔ اُنھیں اُن کے چھوٹے بچوں کے ساتھ گھروں سے ہنکا
کر بے چھت، بے یار و مددگار کرنے میں اور خود اُن کی اپنی اُجڑی ہوئی زمینوں کے
خراہوں سے چیتھڑوں میں لپیٹ کر بھوک اور پیاس کا سہن کراتے ہنکاتے، اور ہنکاتے
رہنے میں اے مالکِ کل! ہمارا ہاتھ بٹا۔ کچھ ایسا ہو کہ وہ (سور کے تخم) گرما میں شعلہ زن
آفتاب کا اور سرما میں مُتند اور تیخ ہواؤں کا کھیل بن جائیں۔ اپنی روح میں کچلے ہوئے،
جاں کاہ مشقت سے تھکے ہوئے، قبر کی پناہ کے لیے وہ تجھ سے التجا کریں اور جواب میں
تیرا انکار ہی سنیں۔ ہماری خاطر، کہ جو تیری پرستش اور تیری ثنا کرتے ہیں، اے آقا!
امیدیں اُن کی خاک میں ملا دے، اُن کی زندگیاں مُرجھادے، اُن کی کڑوی مسافت کو
طویل تر بنا۔ بارِ الہی! اُن کے قدموں کو گراں بار کر دے، اُن کے رستے میں خود اُن کے
آنسوؤں کا چھڑکاؤ کر اور سفید برف کو اُن کے زخمی پیروں کے خون سے لالہ رنگ
کر دے! ہم یہ سب اُس کی محبت کے جذبے سے سرشار ہو کر طلب کرتے ہیں کہ جو سر
چشمہ ہے محبت کا، جو ہر حال میں اور ہمیشہ وفا کرنے والا دوست ہے، جو سبھی گھر جانے
والوں کی اور عاجز و پشیمان دلوں کے ساتھ مدد چاہنے والوں کی پناہ گاہ ہے۔ آمین۔“
تم نے یہ دُعا مانگی تھی۔ اگر اب بھی تم یہی چاہتے ہو تو کہہ دو۔ رَبِّ الْعَالَمِینَ کا یہ
حقیر پیغام رساں انتظار کر رہا ہے۔

بعد میں لوگوں کی سمجھ میں آ گیا کہ یہ آدمی پاگل تھا، کیوں کہ جو کچھ اُس نے
کہا اُس کی کوئی تک نہیں تھی۔



ساتواں حصہ: تورے مالینوس

”ٹکڑوں میں کہی گئی کہانی“ کا ڈھب کچھ اس طور کا بنتا جا رہا ہے کہ میں، راوی، یہ کہانی کہیں سے بھی سنانا شروع کر دیتا ہوں۔

تین آدمیوں کی ہماری ٹولی نے اسپین کی یا ترا میں (دارالحکومت) مادرید، (پریوں کی کہانی والے castle) سگوویا اور (یونیورسٹی ٹاؤن) سلامانکا دیکھے تھے اور اندلس کے چار شہروں مالقہ (لوگ اسے Malaga کہتے ہیں، میں اپنا دل خوش کرنے کو عربی تلفظ پر اصرار کروں گا) قرطبہ اور اشبیلیہ کی ’زیارت‘ کی تھی اور ایک بار سڑک کے راستے اپنے مہربان دوست Bash Bojari (بشارت بخاری جن سے آپ مل چکے ہیں) کی کار میں بیٹھ کر ہم چوبیس گھنٹے کے لیے پرتگال کے صدر مقام لزبن جا پہنچے تھے۔

اس وقت میں پرتگال کے لزبن کو اور ہسپانیہ کے مادرید، سگوویا، سلامانکا وغیرہ کو کچھ عرصے کی لیے بھلاتے ہوئے بس اپنے چار اندلسی شہروں کو یاد کروں گا... بلکہ پانچ کو... پانچواں تورے مالینوس ہے۔

مالقہ سے چند کلومیٹر دور، یہ ساحلی قصبہ، تورے مالینوس (جس کے نام کا انگریزی ترجمہ Tower of the Mill ہے) مجھے بار بار یاد آ رہا ہے، یعنی یہ کہ اپنے بیان کیے جانے پر اصرار کر رہا ہے۔

مالقہ کو ویسے تو مورز (Moors) کا شہر کہا جاتا ہے مگر وہاں صرف ایک اَلْکَا زَبَا (القصبہ) کے آثار محفوظ ہیں، جہاں، کہا جاتا ہے کہ طارق بن زیاد کی آمد سے پہلے کچھ عرب کشتیاں آن رکی تھیں اور اُن کی ایک چھوٹی سی جماعت نے ایک محلہ (یہ اَلْکَا زَبَا) بسا لیا تھا۔ اسے اب محکمہ سیاحت نے سنبھال لیا ہے۔ خیر ہم نے پہلے مالقہ کے اَس الْقَصْبہ کا چکر لگا یا... کوئی زیادہ متاثر نہ ہوئے تو پروڈیوسر دوست کے مشورے پر ایک مضافاتی بس میں سوار ہو، ہم تورے مالینوس آ گئے۔

بس سے اترے، جگہ کے نام کا ترجمہ پڑھا۔ ارے واہ! یہ ’ٹاور اوف دامل‘ ہے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہاں اُس پون چکی کا ٹاور ہوا کرتا ہو جس پر سرواتے کے شہرہ آفاق کردار، ڈون کیہوٹے نے ہلہ بول دیا تھا اور نتیجے میں ہوا چکی کے بھاری پنکھوں (یعنی دیو کے بھیانک بازوؤں) کی چھیٹ میں آ کر موصوف زخمی ہو گئے تھے؟

میں نے دوستوں کو اپنے گمان سے آگاہ کیا اور سارا دن انھیں اسی بدگمانی میں رکھا۔ رات پڑے بس میں بیٹھنے لگے تو میں نے ایمان داری سے قبول دیا کہ نہیں یہ وہ جگہ نہیں ہو سکتی۔ سرواتے کی کہانی کا venue یہ نہیں تھا۔ پروڈیوسر کہنے لگے، ”ہم نے کون سا یقین کر لیا تھا، ہم تو تمھیں خوش کرنے کو ہاں میں سر ہلا رہے تھے۔ ہا ہا ہا!“ (مجھے بھی اخلاقاً ہنسنا پڑا) یہ بستی Costa Del Sol یعنی ”ساحلِ شمس“ پر ہے۔ گویا بحیرہ روم کا سامنا کرتے، ہسپانیہ کے دھوپ بھرے جنوبی ساحل پر بسی ہے، جہاں تقریباً سارے سال (بیش تر) شمالی یورپ کے دھوپ سے محروم ٹورسٹ جمگھٹا کیے رہتے ہیں۔

مالقہ میں اور یہاں پہنچتے ہی چہرے گھما کر دیکھو تو ایک ہی سا منظر دکھائی دیتا ہے۔ بلند و بالا تعمیرات جن پر شوخ رنگوں میں پینٹ کیے گئے ہل بورڈز اور جلتے بجھتے نیون سائنز جن پر ہوٹلوں کی آسائشوں اور نائٹ کلبوں کے sizzling مناظر کے اشتہاروں پہ اشتہار۔ مجال ہے ساحلِ شمس کی ذرا بھی جھلک دکھائی دے جائے۔

میں نے کہا، ”کسی سے پوچھ کے آتا ہوں، یہ ’ساحلِ شمس‘ آخر گیا کہاں؟“

پروڈیوسر، جو نیویارک اور لاس ویگاس میں بالترتیب رہائش رکھتے اور کاروبار کرتے ہیں، پہلے ہنسے، پھر انکار میں سر ہلا کے بولے کہ ہڑے بھائی! کھانے پینے، پہننے اوڑھنے کی چیزیں بیچنے والے اور رہائش اور sizzling night life اور گائیڈڈ اور

unguided tours کا اہتمام کرنے والے لوگ قیامت ہوتے ہیں۔ یہ اچھے اچھے ساحلوں اور جلوے والی جگہوں سے متعلق ہوائی جہازوں، ریلوں اور بسوں کے تمام اڈوں کے گرداگرد کانگریٹ، شیشے اور اسٹیل اور گوشت و پوست کے حصار بنا دیتے ہیں اور اس طرح ساحلوں اور جلوے والی جگہوں کو اُس وقت تک 'حجاب' میں رکھتے ہیں جب تک کہ خود اُن چھچھوروں کی 'بوہنی' نہ ہو جائے۔

ڈائریکٹر نے جماہی لے کر کہا، ”بھائی جان، دنیا روز بہ روز مادیت پرست اور خود کو ضرر پہنچانے والی ہوتی جا رہی ہے۔“ پھر وہ نیند سے لڑتے ہوئے سر جھٹک کے بولے، ”خیر، پہلے سگریٹ ماچس پکڑ لیں.... پھر دیکھتے ہیں کیا کچھ کرنا ہے۔“ ہم دو ہنسنے لگے تو وہ بھی ہنسنے پھر ہم tobacconists کے گلیارے میں گھسے پھر برابر کی sex equipments(?) اور نیلی فلموں کے کیٹس کی کشادہ دکان کو تجسس (اور برہمی) سے گھورتے ہوئے ساحل شمس کی طرف اُترنے والی سیڑھیوں پر ہو لیے۔ دس منٹ تک ادھر ادھر بھٹکتی سیڑھیوں کے پیچیدہ نظام سے الجھتے ہوئے ہم ساحل پر پہنچ گئے۔ تو گویا یہ Costa Del Sol ہے؟ ہاں جناب؟... اور یہ اپنا بحیرہ روم ہے؟ اے سبحان اللہ!

مجھے یاد آیا ایک اندلسی جغرافیہ داں الادریسی نے کوئی ہزار نو سو برس پہلے Mediterranean کا نقشہ بنایا تھا۔ حکیم محمد سعید صاحب مرحوم نے کسی کتابچے میں اُسے بہت اہتمام سے چھپوایا تھا۔ کتنے ہی دن میں اسے اٹلس کے ساتھ رکھ کے دیکھتا رہا۔ ۸۵/۸۰ فی صد درست تھا۔

کچھ دیر اپنی محویت میں ہم تینوں خوش گوار دھوپ میں لہرتے Mediterranean کو دیکھتے رہے پھر بیک وقت تینوں کو خیال آیا کہ کہیں بیٹھ جائیں اور ذرا جم کے دیکھیں۔ اب جو مڑ کے اپنے عقب میں دیکھتے ہیں تو سمجھو تینوں پتھر کے ہو گئے۔

جہاں تک نظر کام کرتی تھی ریستورانوں، ہوٹلوں، کرسیوں پڑے چبوتروں، ہاتھ گاڑیوں اور کھوکھوں کا ایک جیشِ عظیم بحیرہ روم کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے، آپس میں کندھے سے کندھا بھڑائے، جیسے یلغار کرنے پر تلا کھڑا تھا۔ ہم تینوں منہ ہی منہ میں کچھ بک جھک کے، بدبواہی کے رہ گئے۔ ساری بات سمجھ میں آگئی تھی۔ یہ پروڈیوسر دوست

کے بیان کیے ہوئے بھیانک تجارتی حصار کا آؤٹری پیری میٹر تھا اور یہ چیخ چیخ کے کہہ رہا تھا کہ بھیا جی! دریا پہاڑ گھاٹیاں اور سایہ دار شجر اور گم صم گھانیں اور جھیلیں اور جھیل میں ہنستے نیل مکمل اور اپنی چھبی دیکھتے چندر ماں کسی کے باپ کے نہیں ہیں۔ جس کا جی چاہے ٹیکس دے کے یا بنا ٹیکس دیے بھی یہاں اپنا 'کھوانچا' لگا سکتا ہے۔ جاؤ تمھاری ایسی کی تیسری!

سو پہلا کام ہم نے یہ کیا کہ ایک کشادہ دل سا ریستوراں چن لیا، کچھ دیر کو وہاں ٹھیک لی، تازہ سو فلے منگائے، چائے پی، خوش کام ہوئے اور چل نکلے۔ ساحل پر لمبی ٹہل لگانے کا وقت ہو گیا تھا۔

ساحل پہ وہی سب تھا جو یورپ کے ساحلوں پر ہونا چاہیے تھا۔ ہمیں نہاتے، غسلِ آفتابی کرتے یا دھڑلے کے ساتھ راز و نیاز میں مصروف جوڑوں سے بس اتنا ہی 'شغف' تھا کہ ہم پاکستانی سنسر کی حدیں پہچان کر بعض مجوزہ مناظر کو اپنے مجوزہ سیریل کے لیے approve یا dis-approve کرتے چلے جا رہے تھے۔ پروڈیوسر کا خیال تھا کہ یہ سارا footage ڈالنا خوب رہے گا۔

ڈائریکٹر دوست کا موقف تھا کہ یہ سب جو یہاں سے وہاں تک ہو رہا ہے اس سے اپنے average ناظر کو شتمہ برابر دلچسپی نہیں ہے۔ یا شتمہ بھر ہوئی بھی تو مجھے بہ حیثیت ہدایت کار اس کی پروا نہیں کرنی چاہیے... کیوں اسد بھائی! میں ٹھیک کہہ رہا ہوں؟ جس پاکستانی کردار کو ہم یہاں لائیں گے اُس کی پہلے ترجیح... sorry

میں ہدایت کار دوست کی پوری بات نہ سن سکا، کیوں کہ بالکل سامنے ساحل کی ریت پر مجھے یسوع دکھائی دیے تھے۔

اپنی ان گنت شبیہوں کی طرح وہ صلیب پر تھے اور ہمیشہ کی طرح اُن کا سبھاؤ abandon کا... یعنی مکمل سپردگی کا سبھاؤ تھا کہ الوہی!...

”میں تیری رضائیں راضی ہوں۔“

”او مائی گاڈ! یہ کیا ہے؟ بھئی... سُب حاآن... اللہ!“

”کم.. ما آل ہے یار!“

کسی نے ساحل کی ریت میں انسانی قد کے چوگنے اسکیل پر جی رز کی bas-relief... اُبھرواں شبیہ... بنائی تھی۔ صلیب پر کیلوں سے ٹھکی ہوئی اُن کی ہتھیلیاں

اور اُن کے پیر، ریاضت سے دُبلا یا ہوا اُن کا زخمی torso... اور وہ چہرہ! بہت بڑے دُکھ میں اور مکمل سپردگی کے ساتھ (اور جیسا کہ میں نے کہا) راضی بہ رضا۔

ہم نے ایک تحیر میں شبیہ کے پاس جا کر دیکھا کہ ریت کو تھوڑا کچھ 'ثبات' دینے کے لیے بنانے والے نے، اُسے کسی طرح کے 'نظر نہ آنے والے' گوند میں گوندھ لیا تھا کیوں کہ سمندر سے خشکی کی جانب آنے والی ہوا اُبھرواں شبیہ کو چھیڑ ضرور رہی تھی.. اُسے مٹا نہیں پاتی تھی۔ ہوا اپنے ساتھ ریت لا رہی تھی جس نے bas-relief کے آغاز پر (یعنی جی زَز کے 'کانٹوں کے تاج پر') بادل سے بنادیے تھے۔ میں نے دل میں کہا، "اسد خانا! ہوا تو اسے ری ٹچ اور improve کر رہی ہے۔"

Mediterranean کی ہوا صورت گری جانتی ہے... صورت گروں کی محرم ہے۔ اطالیہ اور یونان اور کہاں اور کہاں کس کس سے اس کی شناسائیاں رہی ہیں۔

پھر ہمیں یسوع کے قدموں میں، کچھ دور، ریت میں، ریت کا ایک پیالہ سا نظر آیا۔ پیالے میں ہسپانوی peseta اور یورو اور پینی اور فرانک اور طرح طرح کے سکے پڑے تھے۔ پروڈیوسر نے، جو یہ سب دیکھ کر (شاید) آبدیدہ ہو گئے تھے... جھک کر، احترام کے ساتھ ڈالر کے دو سکے پیالے کی ریت میں کھونس دیے (دوسرے دن بتانے لگے کہ سکے "شکن" کے تھے۔ شبیہ ساز کے دن پھر جائیں گے)۔

خیر، بھوک لگ رہی تھی تو ہم نے طے کیا کہ بحیرہ روم کا براہِ راست سامنا کرتے کسی ریستوراں، ہوٹل، نانبائی، مطبخ یا 'کھوانچے والے' کی طرف جانے کی بجائے سیڑھیاں چڑھ کے اصل حصار میں پہنچا جائے۔ وہاں ہمیں کچھ افریقی، ایشیائی صورتیں دکھائی دی تھیں۔ ہو سکتا ہے کچھ اچھی اور kosher غذا بھی مل جائے۔

کسی بھی سیڑھی کے پیچیدہ نظام سے اوپر پہنچتے ہوئے ایک مسکین فوٹو شاپ سے مناسب داموں میں فلم رول خریدتے اوپر آئے تو دیکھا یہ وہ جگہ ہی نہیں ہے جس سے یہاں آتے سامنا ہوا تھا... شہر بے شک تورے مالینوس تھا۔ مگر ہم بھٹک گئے تھے۔ ویسے ہم نے سن رکھا تھا کہ مسافرت میں بھٹکنا کبھی کبھی اچھا ہوتا ہے۔

اس وقت بھی اچھا ہی ہوا، سوگرد و پیش پر نظر ڈالتے ہوئے ہدایت کار دوست

ہم نے دیکھا کہ شوخ و شنگ لڑکے لڑکیوں کا ہنستا کھلکھلاتا ہجوم ایک کیوریو شاپ سے انباروں عجائب و غرائب خرید کے نکل رہا ہے۔ بعض چیزیں، جنہیں وہ شرارتاً کندھوں یا سروں پر اٹھائے ہوئے نمائش کرتے نکلے تھے، دیکھنے میں اچھی لگیں تو ہم تینوں اس دکان میں جا گھسے۔

وہاں ہر براعظم کی نمائندگی ہو رہی تھی۔ ایشیا کی بہت سی چیزیں تھیں۔ اپنے پاکستان کی شیشم کی inset والی چھوٹی بڑی صندوقچیاں بھی نظر آئیں، لمحے بھر کو nostalgic ہوئے، انہیں خوش ہو کے ہاتھ لگا یا اور آگے بڑھ گئے۔ ہندوستان سے منگائی ہوئی راجستھانی گڑیوں کو دیکھتے، پسندیدگی میں سر ہلاتے ہم نے پوری دکان کا چکر لگایا۔ پروڈیوسر نے کسی ایفریقی علاقے سے آئی بالشت بھر کی ایک بھدی مورتی خریدی جو سیاہ لکڑی میں تراشی گئی تھی۔ مجھے تو یہ ایک موٹے، ننگ دھڑنگ witchdoctor (یا شامان) کا caricature لگتا تھا۔ دکان دار کہنے لگا کہ زولولینڈ کے لوگ ارواحِ خبیثہ کو دوڑا دینے کے مقصد سے اسے گھروں میں رکھتے ہیں۔ یہ جہاں بھی 'استھاپت' کی جائے گی اس سے مشرق، مغرب، جنوب اور شمال کے چار چار گھر بھی ارواحِ خبیثہ کے اثرات سے محفوظ رہیں گے۔ "اے سبحان اللہ!"

پروڈیوسر دوست بتانے لگے کہ انھوں نے یہ مورتی میرے لیے خریدی ہے تاکہ میں 'گنتی' جیسی روحوں سے محفوظ رہتے ہوئے سکون سے اُن کا سیریل لکھ سکوں۔ میں نے کہا ناں دوست، میں یہ نہیں لے سکتا۔ میں ڈراموں، سیریلوں کے اسکرپٹس ارواحِ خبیثہ کے درمیان بیٹھ کے لکھتا ہوں۔ یہ 'شامان' اگر میرے گھر میں رہا تو آپ کے سیریل کا کام کبھی مکمل نہیں ہونے کا۔

پروڈیوسر نے ہدایت کار کو آمادہ کرنے کو کہا کہ برادر! تم لے جاؤ۔ باقی عمر آرام سے رہو گے۔ وہ بولے، یہ تو اچھا ہے کہ میرا گھر بلیات سے بچا رہے گا۔ لیکن میں اپنے بالکل شمال اور ایک دم مشرق میں بسے ہوئے دو منحوس ہمسایوں کو کسی بھی صورت میں.. ہرگز ہرگز.. ارواحِ خبیثہ سے بچانا نہیں چاہتا۔ کوئی ایسا جادو منتر ہوتا تو میں شکرے کے ساتھ قبول کر لیتا کہ جو مجھے تو منحوس اثرات سے محفوظ رکھے مگر میرے امی جی ایٹ شمال اور مشرق کے پڑوسیوں، سالوں کا ٹیپا کردے۔ وہ واقعی سنجیدہ تھے۔ اس لیے مجبوری

تھی۔ کچھ بھی نہیں ہو سکتا تھا۔

ہم خاموشی سے آگے چل پڑے اور ایک تنگ و تاریک hovel میں، جو کیفے لگتا تھا، داخل ہو گئے۔ وہاں سناٹا تھا۔ ایک طرف ایک اکیلا آدمی بیٹھا کوئی مشروب sip کر رہا تھا۔ مشروب سپ کرنے والا ہمیں اور ہم اُسے ’آدھی بے تعلقی‘ سے دیکھتے رہے۔ ہمارا دیکھنا کچھ بیزاری کا بھی تھا، ہم جلدی میں تھے کس لیے کہ ہمیں کیفے کے مالک، ویٹر، کک .. یعنی کسی کا بھی انتظار تھا۔ اُس آدمی کو بالکل جلدی نہیں تھی، کیوں کہ اُس کا پسندیدہ مشروب اور بہت سا وقت اُس کے پاس تھا۔

بالآخر اس نے اپنا مشروب ختم کیا، ہمیں اُدھ کھلی آنکھوں سے دیکھا، اُٹھا... پھر عجب کام کیا... اس نے گلاس اُٹھایا اور پینٹری میں چلا گیا... لمحے بھر میں واپس آیا تو وہ ایپرن باندھے تھا اور menu کی پلاسٹک چڑھی رنگا رنگ شیٹس اُس کے ہاتھ میں تھیں، بازو پر پڑا سفید نیپکن چمک مار رہا تھا۔

وہ خبیث یہاں ملازم تھا — اور اب ہماری طرف آ رہا تھا۔

پروڈیوسر، جو ڈھیر ہوئے پڑے تھے ایک دم تن کے بیٹھ گئے۔ اُن کا چہرہ سُرخ ہوتا جا رہا تھا۔ وہ کسی بھی وقت اشتعال میں آ سکتے تھے۔ ہدایت کار نے اُن کے چہرے پر ایک بار نظر ڈالی اور بے سوچے سمجھے ہل ہل کے ہنسا شروع کر دیا۔ پھر ویٹر کی طرف دیکھ کر، کہ جو ہمارے بہت قریب پہنچ گیا تھا، وہ دلی آگرے کے محاورے میں کہنے لگے، ”اے بھوتنی کے! یہاں بھوک کے مارے آنتیں قل ہو اللہ پڑھ رہی ہیں اور تم گھنٹے بھر سے ہماری صورت کے سامنے بیٹھے شراہیں پی رہے ہو! That's great, really great! ہا ہا ہا۔ سالے!“

ویٹر نے پہلے بہت کوشش کر کے اُن کی بات سمجھنا چاہی، اور پریشان ہوا.. پھر جیسے ہی انگریزی کی مانوس آوازیں سنائی دیں، اس نے دانت نکال دیے اور جاپانیوں کی طرح بہت گہرا جھکتے ہوئے اس نے بار بار ”تھینک یو، تھینک یو، یس سر! ریالی گریٹ“ کہا، اور... ہدایت کار دوست کی طرح، زیادہ کچھ سوچے سمجھے بغیر، ہنسا شروع کر دیا۔

پروڈیوسر نے یہ سب دیکھا، اچانک غصہ تھوک دیا اور سب کی آواز میں آواز ملا کر، ”ریالی ریالی گریٹ“ کہتے ہنسی میں شامل ہو گئے۔

معلوم ہوا اس کی شفٹ بارہ بجے شروع ہوتی تھی۔ بارہ بج کر ٹھیک ایک منٹ

ہوا تھا۔ وہ اسی کیفے سے خریدے گئے مشروب سے لطف اٹھاتے ہوئے اپنی شفٹ شروع ہونے کا انتظار کر رہا تھا۔ کہنے لگا، ”سوری مجھے اگر معلوم ہوتا کہ تم پاکستانی ہو تو میں بارہ بجے کے انتظار میں نہ بیٹھا رہتا۔ تمہیں اٹینڈ کرتا۔“

پروڈیوسر نے پوچھا کہ پاکستانیوں میں ایسی کیا بات ہوتی ہے؟ رازداری سے جھک کر کہنے لگا، ”تم لوگوں نے پروا نہیں کی، بم بنا لیا۔“

”مگر یہ بہت بڑی ذمہ داری ہے بھائی!“ میں نے جیسے ذمہ داری کے بوجھ سے لرزتے ہوئے کہا، ”تمہیں ہیروشیما، ناگاساکی یاد ہے؟“

”ہاں یاد ہے، جبھی کہہ رہا ہوں کہ اچھا کیا، بنا لیا۔ کچھ لوگوں کی طرح تم فضول لوگ نہیں ہو۔ آدمی کی جان کی قیمت بھی سمجھتے ہو۔ اچھا کیا۔“

میں نے کہا کہ یہ اتنی آسان اور سسری بات نہیں ہے، اس پر پھر گفتگو ہوگی۔ گھڑی دیکھ کر کہنے لگا، ”رات آٹھ بجے تک یہیں ملو گا۔ آجانا۔“

ہم آٹھ سے پہلے ادھر سے گزرے تو جاننے والے مراقشی نے ہاتھ ہلا کے بلا لیا۔ وہ اپنے کیفے کے یہودی مالک سے ہمیں ملوانا چاہتا تھا۔ ہم تینوں نے کوئی اہمیت نہیں دی تو اُس نے اصرار سے کہا، مل لو، میں نے تمہارے بم کی خبر پڑھ کے اخبار سب سے پہلے اُسی کو دکھایا تھا۔ اُنھیں بھی تو پتا چلے۔ پروڈیوسر نے کہا، ”سو؟..... وہاٹ؟.....“ تم ابھی تک بم سے چمٹے ہوئے ہو؟“ ہدایت کار نے بات آگے بڑھائی، ”..... نہ صرف چمٹے ہوئے ہو بلکہ اُس (وہ کسی طرح کانسی حوالہ دہرانا نہیں چاہتے تھے، اس لیے انھوں نے اور ہی ناگفتہ بہ لفظ کہا) اُس فلانے کو بھی چمٹائے ہوئے ہو۔“

میں بولا، ”ہٹاؤ اُسے! کیا بات کرتے ہو؟ Classified چیزوں کے اتنے قریب ایروں غیروں کو نہیں لاتے۔“

وہ کچھ نہیں سمجھا تو پروڈیوسر نے انگریزی میں ”مٹی پاؤ، جیسی کوئی بات کہہ دی، پھر اُسے سمجھایا کہ وہ جہاں سے آرہے ہیں وہاں انھوں نے بہت یہودی دیکھے ہیں۔ Enough is enough۔ اور پھر اس موضوع پر ہمارا مکالمہ ختم ہو گیا۔ اور باتیں شروع ہو گئیں۔ ویسے یہ مراقشی نوجوان ہمیں اچھا لگا تھا۔ پھر کبھی تورے مالینوس جانا ہوا تو اُسے تلاش کریں گے۔

مرزا جی! اب خطوں اور ای میلوں کا ایک کولاج (Collage) بناتا ہوں۔ ادیبوں کو لکھے گئے تین خط ہیں سال ۷۶ء، ۸۵ء اور ۹۱ء کے اور اگست ستمبر ۲۰۰۴ء کی تین ای میلز ہیں جو میری ایک مجوزہ کہانی ”مہامائی کا ہریا“ کی صورت گری کے مراحل بیان کرتی ہیں اور یہ دکھاتی ہیں کہ کس طرح اُس کہانی، نے آخر کار ایک مجوزہ ناول، کا چولا پہننا شروع کیا ہے۔ اللہ بہتر کرے گا۔

28-6-76.

اسد محمد خاں 936/8 عزیز آباد، کراچی 38- پاکستان۔

سید محمود خان ہاشمی (in fact Mahmood Hashmi) سلامت باش! تم نے ساقی فاروقی کے ہاتھ رسالہ دنمان بھیج دیا، نوازش۔ اور تم پھر غائب ہو گئے۔ کیا مصروف ہو؟ میں نے دلی سے آکر دو کہانیاں اور لکھی ہیں۔ ایک پرسوں حلقے میں پڑھ رہا ہوں۔ شاعری کا کام بدستور رُکا ہوا ہے، نثر لکھنے میں لطف آرہا ہے۔ شاعری کے نام کا قرض دوسری زبانوں سے ترجمہ کر کے اُتار رہا ہوں، فی الحال۔ خیال ہے کہ اس سال اپنا پہلا اور آخری شعری مجموعہ لے آؤں گا۔ پندرہ برس میں جو کچھ کیا ہے ایک جگہ لکھ کر خود دیکھوں گا تو اندازہ ہوگا کہ کیا ہے اور آگے کے امکانات کیا ہیں (شمہیں معلوم ہے میں بے اجرت کی جمالی کا قائل نہیں ہوں)۔

اب یہ اس وجہ سے ہے کہ میں خود شعر نہیں کہہ رہا اور نثر کی طرف راغب ہوں یا حقیقت میں صورتِ حال بدل رہی ہے۔ ویسے تم نے خود اندازہ لگایا ہوگا کہ شعر کی سلطنت اُکھڑتی نظر آتی ہے۔ یہاں اور تمہارے ملک میں، دونوں جگہ، بڑی کس مپرسی کا سا عالم ہے۔ سید سلیم احمد کا بھی خیال یہی ہے کہ شعر کی سلطنت تاراج ہونے کو ہے اور اب جو یہ صدی آنے کو تیار بیٹھی ہے، نثر کی صدی ہے۔ واللہ اعلم! ویسے ہمارے یہاں تو ادب ہی کا ملک تاراج ہوتا نظر آتا ہے۔ ٹیلی وژن اور ڈائجسٹ نے ادب سے قاری چھین لیے۔ مطالعے کا اور غور کرنے کا وقت کسی کے پاس نہیں رہا۔ ادب اور علم کے ready reckoner اُس کاوش کی جگہ لے رہے ہیں جو ربع صدی پہلے لکھنے پڑھنے والوں کی زندگی تھی۔ یا شاید ہم بوڑھے ہو رہے ہیں۔ یا پیمبری سال لگ گئے ہیں سب کو۔ by the way تم دلی والے ہو، کبھی بتانا نکسالی زبان میں پیمبری سال کے

کیا implications ہیں؟

اب ظاہر ہے مڈل ایجنڈ لوگ تازہ دم نسل کی طرح چلت پھرت تو نہیں لا سکتے۔ مگر برادر! تازہ دم نسل کہاں ہے؟ وہ لوگ کون ہیں جو لکھنے پڑھنے کے کام کو جاری رکھیں گے؟ ہمارے یہاں کے تازہ دم لڑکے تو بنکوں میں افسری، خلیج کی ریاستوں میں ملازمت یا فلم ٹیلی وژن میں ایک چانس کے منتظر بیٹھے ہیں۔ اور جو لکھنے پڑھنے کے کیڑے سے کاٹے جا چکے وہ لیکچرر شپ سے آگے سوچنے سے انکار کرتے ہیں۔ ماشا اللہ ہمارے یہاں لیکچرر فرسٹ کلاس گزیٹڈ پوسٹ ہے۔ سات سو روپے basic pay گروپ سترہ کا اسکیل اور الاؤنسز وغیرہ ملا کر بارہ ساڑھے بارہ سو روپے اور پھر increment اور re-grouping اور لیکچررز یونین اور ٹی وی میں پروگرام کو میڈیئرنگ کا چانس اوف اوف۔ یار محمود ہاشمی! کیا ہم ہی... تیا تھے کہ انکریمینٹ اور ری گروپنگ اور فلموں میں چانس اور اوف اوف نہ کر پائے؟ تمہارے یہاں میں نے لکھنے پڑھنے والوں کی اکثریت کو سلیم، جاوید صاحبان کی طرف حسرت سے دیکھتے اور 'کاش کاش' کرتے سنا ہے اور یہاں کا لوئر مڈل کلاس کا لڑکا سیدھا بینک کی کرسی کی طرف لپکتا ہے۔ یا پھر اُسے لیکچرر شپ یا خلیج کی ریاستیں بلا لیتی ہیں۔ ذہین لڑکیاں microbiology اور medicine جیسے شعبوں میں جان کھپانے اور تقریباً مڈل ایجنڈ ہونے کے بعد شادی کر لیتی ہیں اور شادی کے بعد بڑی یک سوئی سے اچاروں، چٹنیوں اور سویٹرز کے چار سیدھے دو الٹے پھندوں کا لٹریچر جمع کرتی ہیں اور قسم ہے جو اپنے مضمون یا انسانی تاریخ یا ادب یا زندگی سے ایک سطر پڑھنے کا موقع آنے دیں۔ پھر اُن کی ٹھوڑیاں دُہری اور تہری ہو جاتی ہیں اور وہ درودِ تاج پڑھتے پڑھتے اللہ کو پیاری ہو جاتی ہیں... چلیے چٹھی ہوئی۔

راقم کو ہرگز درودِ تاج پر کوئی اعتراض نہیں۔ پڑھیے، آپ میں سے خدا جسے توفیق دے، ضرور پڑھیے۔ مجھے کہنا شاید یہ تھا کہ یہ بھی پڑھو اور کولرج کی قبلائی خان بھی اور ابن رشد بھی، وما توفیقی الا باللہ۔

ان پندرہ برسوں میں کہ میں لکھنے پڑھنے کے ایرینا میں مسخرہ پن دکھا رہا ہوں، میں نے بڑے بڑے نابغوں کو بگل بجا کر ادب اور شاغری کے میدان میں آتے دیکھا اور پھر وہ اچھے بچوں کی طرح کہیں اور کیریئر بنا کر چلے گئے۔ یا ۳۷، ۳۸ سال کی عمر

میں جب ذرا کمفرٹبل حالات ہوئے تو بعض نے قلم دوات دھو کر کاغذ پھیلائے اور اسلامی سوشل تنظیمیں اور اسلامی سوشل کہانیاں یا سیکولر (تقریباً سرخ) سوشل ادب اور قومی یک جہتی لکھنے کا جتن کیا (جو زندگی کے پورے پھیلاوے کا minimal ہو تو ہو، پوری زندگی ہرگز نہیں۔ یا میں اس طرح سوچتے ہوئے غلطی پر ہوں؟ میں نے USSR کی حیاتِ مستعار میں رشین لٹریچر کی committed کہانیاں اور تنظیمیں خوب پڑھی ہیں۔ مختصر یہ کہ بخ!)۔

تو اب اپنے narration کو وہیں سے پکڑتا ہوں جہاں سے سلسلہ ٹوٹا تھا... کہ قومی یک جہتی لکھنے کا جتن کیا اور مادیوں کو ڈرا دھمکا کر اپنے سرکاری/ فوجی رعب میں لے کر یا اشتہاروں کی رشوت دے کر ممتاز جگہ چھپنے کا بند و بست کر لیا اور بعض نے تو یہ کمال بھی کیا کہ ایک یا دوسرا یا تیسرا ادبی انعام بھی ہتھیا لیا۔ خود پر مضمون لکھوا لیے اور امیر شہر کی مسند کے قریب جا بیٹھے اور ادب و دب پر فیصلے صادر کرنے لگے۔

فراق گورکھپوری کو کس خدا کا حکم ہے جو وہ ہم ایسے اور تم ایسے مڈل ایجڈ لوگوں کو ستا رہے ہیں۔ ارے بھی سلیم احمد ہمیں ہینگ کی آڑھت کیوں نہیں کرنے دیتے اور رگھوپتی سہائے فراق صاحب قبلہ آپ نے تو اپنی عمر گزار لی، اپنے بگل بجوا لیے اب اس سید زادے، ہاشمیوں کے چشم و چراغ محمود میاں غریب کو اور اس الف میم نے کو retarded بچوں کی طرح منہ کھولے زانوئے ادب تہ کیے اپنے سامنے کیوں بیٹھنے دیا ہے؟ ارے اٹھا دیجیے انھیں، چھٹی کیجیے ان کی۔ کھانے کمانے موج اڑانے دیجیے سسروں کو۔

یہ نہیں ہے محمود! میری جان! کہ ہم یا تم یا ہمارے تمھارے بچے، خدا نخواستہ روزے پر روزہ رکھ رہے ہیں۔ مالی تکلیف میں ہیں۔ ناں بھی ناں، بہت مزے میں ہیں۔ پیٹ بھر کھاتے ہیں، من پسند پہنتے ہیں۔ سو سو دو دو سو کی کتابیں بھی خرید لاتے ہیں۔ ہاں یہ ہے کہ ہیرلڈ روبنز کی طرح ذاتی طیارہ نہیں ہے۔ مگر سوال وہی پرانا دُہراؤں گا کہ وہ نئے لڑکے کہاں ہیں جنھیں ہمارے سانحہ ارتحال کے بعد لکھنے پڑھنے کا یہ کام کرنا ہے؟ کیا ہماری سماجی صورتِ حال اور مالی حیثیت اتنی عبرت ناک سمجھی جاتی ہے کہ لوگ lepers کی طرح ہمارے گلوں میں گھنٹیاں ڈال کر دور دور بھاگ گئے ہیں؟ یا اس شخصیت ہوتی ہوئی بیس ویں صدی کے معیارات پلک جھپکتے میں بدل گئے؟ کل تک

تو لکھنے والے محترم سمجھ جاتے تھے۔

مجھے معلوم ہے میں بڑی میڈیوکر باتیں کر رہا ہوں۔ مگر تکلیف میں ہوں اور اپنے ساتھ کے لوگوں کو تکلیف میں دیکھ رہا ہوں اس لیے یہ باتیں کر کے اپنا system صاف کر لینا چاہتا ہوں۔ گاہے گاہے ضروری ہوتی ہیں یہ باتیں۔

میں دیکھ رہا ہوں کہ میرے بہت اچھے دوست جو بہت اچھا لکھ رہے تھے... بقول کے بہت اچھے جا رہے تھے status کی rat race میں کام آگئے۔ بڑے بڑے ہونہار جو اچھی اچھی نظمیں کہانیاں غزلیں لے کر آتے تھے اب یہ خبر وحشت اثر سناتے آرہے ہیں کہ بھائی! EB-2500-150-50-700 کے گریڈ میں آگئے ہیں ہم۔ ڈپٹی کمشنر کے ساتھ چائے پیتے ہیں۔ گوشت سبزی اور دودھ اسٹوڈنٹس کے وہاں سے مفت آجاتا ہے۔ فرسٹ کلاس گزیٹڈ پوسٹ ہے۔ ہم اب کیریئر سٹیفلیٹ پر دستخط کر سکتے ہیں... اور پاسپورٹ بنوالیا آپ نے؟ ہم پوچھتے ہیں بچہ جمورا! کوئی غزل کہانی نظم لکھی؟ کچھ نیا پڑھا؟ ارشاد ہوتا ہے کہ پرئی پل یا ڈی سی مہربان بہت ہے، بڑی ذمہ داریاں ڈال دی ہیں میرے سر (یعنی اب یہ ادب لکھنے پڑھنے کا غیر ذمہ دارانہ کام نہیں کر سکے گا)۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔ تو بھائی ہاشمی! اندھوں کے آگے رو میاں! اور بین بجا بھینس کے آگے۔ یا بدھیا بھینسا بیل شتر اکٹھا کر بھائی۔ کیوں جان عزیز گنواتا ہے؟ اب یہ بھی سن:

قلندروں کے قلندر، میرے یار نے ۳۲ ہزار کی گاڑی خریدی تھی، پانسو روپے کا ڈرائیور نوکر رکھ لیا ہے۔ تیس ہزار کی زمین پر ڈیڑھ لاکھ کا مکان بنا رہا ہے۔ موجودہ فریج چھوٹا پڑ رہا ہے، دوسرا خریدے گا۔ اُس کی بیوی نے دو ہفتے پہلے سری لنکا سے گوتم سدھا رتھ کا ہاتھی دانت کا بت خریدا تھا۔ بت چار سال کے بچے کے قد اتنا ہے۔ ایک رسالے میں اُس بی بی نے لکھا ہے کہ وہ ادب کی آدمی ہیں زیورات وغیرہ بھی خرید سکتی تھیں مگر انھوں نے نہیں خریدے کیوں کہ مسئلہ کلچر کا ہے اور ہائی تھنگنگ کا..... کہ بدھاں شرناں گچھاں می.. میں عالم پناہ بدھ کی شرن میں آتا ہوں۔

مگر یہ sarcasm نہیں سیدھی سیدھی jealousy ہے جو مجھ سے یہ سطور لکھوا رہی ہے۔ (کیا سچی بات لکھی تھی خاں صاحب نے۔ اب سوچتا ہوں کہ میری یہ

sermonizing ایک جھلسے ہوئے have-not کی بڑبڑ تھی۔ اس تحریر کے سولہ سترہ برس بعد جیسے ہی موقع ملا الف میم نے exactly وہی سب کر دکھایا۔ یعنی گاڑی [اور شروع میں] ڈرائیور، زمین، مکان یہاں تک کہ فریج کی بدلی تک بالکل اُسی طرح وقوع پذیر ہوئی۔

خیر تو بے بسی ہے جو مجھ سے یہ سطور لکھوا رہی ہے۔ کمینہ آدمی ہوں اس لیے کڑھ رہ ہوں۔ میرے اندر کوئی بدھیا بھینسا بیل شتر جمع کرنے والا خبیث بیٹھا ہوا ہے جو بڑا فریج اور ڈرائیور اور گوتم (?) رکھنا چاہتا ہے اور ہیرلڈ روبنز کی طرح اپنا ذاتی طیارہ خود اڑانا چاہتا ہے۔

تو ہم تم ایسا کرتے ہیں محمود خاں! کہ ایک بھوت ڈائجسٹ نکالتے ہیں اور اس میں بھوتوں سے مچھوٹوں کے ذاتی تجربے، برما کے پاگل ہاتھی اور کھٹمنڈو کے آدم خور شیر کے شکار کے قصے اور مارلن برانڈو اور راکیل ویلش کے fornication کے ساگا پر اور امریکا کے کسی بھی ملٹی میلے نیئر کی eccentricity اور اولیا اللہ کے mini adventure پر مواد جمع کرتے ہیں۔

سلیم احمد اور فراق کو، عسکری اور علی عباس جلاپوری کو خلیل الرحمان اعظمی اور سید عبداللہ کو، علی عباس حسینی اور انور سجاد کو دعوت دیتے ہیں کہ وہ آئیں اور برما کا پاگل ہاتھی شکار کریں، آدم خور کا جڑا توڑیں، برانڈو صاحب کو fornicate کرتے دکھائیں۔ میرا خیال ہے اولیا اللہ کے منی ایڈونچر پر انور سجاد کو، راکیل ویلش کی سلگتی راتوں کی تفصیل پر حسینی اور جلاپوری کو اور ہاتھی، شیر وغیرہ پر فراق، عسکری یا سلیم احمد کو مامور کیا جائے۔ ملٹی میلے نیئر سے اعظمی اور ڈاکٹر سید عبداللہ نمٹ لیں گے۔ کہو کیسی رہی؟

بھائی عمیق حنفی سے سلام کہنا۔ نیت یہ تھی کہ ان کے نام ایک عریضہ اسی لفافے میں روانہ کروں گا مگر اس الارم کلاک کی طرح کہ جس میں ضرورت سے زیادہ چابی بھر دی گئی ہو، چل پڑا اور اتنا کاغذ خراب کر دیا۔ میری طرف سے شکریہ ادا کر دینا، انھوں نے مجھ ایسے بے نوا کم آمیز پر اتنا کچھ لکھ دیا۔ محبت ہے ان کی۔ میں نے رگھویر سہائے، سرویشور دیال اور شری کانت ورما کو خط لکھے ہیں۔ بانی بھائی سے شرمندہ ہوں، جب تک ایک اور چکر دلی کا نہیں لگا لیتا شرمندہ ہی رہوں گا۔ کس محبت سے یہ سب لوگ

ملے تھے۔ محبتوں کا شکریہ ادا نہیں کیا جاتا ورنہ ایک ایک کو خط لکھتا اور شکریہ ادا کرتا۔
ہاں، ساتی ایک لفافہ لایا تھا جو ہماری بھانج نے اہلیہ کے نام لکھا تھا۔ اے
جید جوتا پوش! اُس میں تیرا خط نہیں تھا۔ بھائی کیا کاہل ہو گیا ہے میاں؟ سلیم بھائی سے
میں نے کہا تھا کہ عمیق حنفی نے بعثتِ نبویؐ پر ایک زبردست epic لکھی ہے۔ وہ منتظر
ہیں۔ پوچھتے رہتے ہیں کہ محمود نے حنفی صاحب کی وہ نظم (صلصلۃ الجرس) بھجوائی یا نہیں؟
اطہر بھائی سے ملاقاتیں رہتی ہیں۔ اب وہ زیادہ ہی تنگ دائرے میں گردش کر رہے
ہیں۔ دفتر، اصغر بھائی کے گھر، کبھی سلیم احمد کے جمال کے یا میرے گھر۔ اور بس۔

کیا ہم سب لوگ بوڑھے ہو رہے ہیں؟ ہم لوگ خود کو اور زیادہ insecure
کیوں محسوس کر رہے ہیں؟ کیا اس لیے کہ ہمارے بچے بڑے ہو رہے ہیں۔ اور وہ دنیا کو
face کرنے کو تیار ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک دن جب وہ دنیا کا head on سامنا کر
رہے ہوں گے تو انھیں پتا چل جائے گا کہ پاپا ڈیڈی ابو فضول آدمی تھا۔ یہ کوئی ایسی
مشکل دنیا تو نہیں ہے۔ پھر وہ ابو اس قدر سہا سہا جھنجھلایا ہوا اور high strung کیوں
رہا۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ ادب و دب نے اُسے بے عمل اور خوف زدہ کر دیا ہو۔

یہ سوچنے کا کام بڑا ذلیل کام ہے۔ میری رائے میں بھوت ڈائجسٹ والی اسکیم
اچھی ہے۔ اس پر غور کرنا۔

میں پھر چل پڑا ہوں اس لیے خدا حافظ! بھابی کو سلام، بچوں کو پیار، دعائیں۔
تمہارا اسد

۱۲ ستمبر ۱۹۸۵ء

اسد محمد خاں۔ سی ۱۴۔ شہر بانو پلازا۔

ایف بی ایریا، کراچی۔ ۳۸۔

برادرِ عزیز انور خاں!

ہر طرح سلامت اور خوش رہو۔ بے شک اللہ نے اپنے فضل و کرم اور صلاح
الدین پرویز کے مالی تعاون سے یہ کائنات بنائی اور زمین کو فرش کی طرح بچھایا اور پھل
پھول پودے اور گونگلو پیدا کیے۔ اور تمام تر معدنیات اور خونی اور بادی بوا سیریں مہیا

فرمائیں۔ اور اُس نے ڈاکٹر فلاں ابن فلاں کو ریٹائر کیا پھر انھیں پروفیسر ایمیریٹس بنایا اور پھر ریٹائر کیا اور پھر بنایا اور پھر کیا اور اپنے جو دو کرم سے انھیں وہ جہل عطا کیا کہ ابو جہل کا پتہ پانی ہووے، پھر انھیں چار اضافی انکریمنٹ دے کر گرینڈ کینیڈین پر مامور فرمایا تاکہ صاحب موصوف اُسے بھی اپنے فضلے سے پاٹ دیویں۔ اُس کی رحمت کے قربان جائے کہ اُس نے جناب الف کو علم عروض (اور علم لدنی) سے نوازا، تاہم عوام الناس پر یہ منکشف نہ ہونے دیا کہ (اُس کی عظیم المرتبت اسکیم اوف تھنگز میں) ہر دو علوم کی غرض و غایت کیا ہے۔

اور اُس نے آٹھ بجے کی لوکل ٹرین ٹھیک وقت پر چلوائی اور اُستاد اختر انصاری اکبر آبادی کو ایک ہوٹل کے کمرے میں ہلاک فرمایا (مگر یہ سب مقامی انتظامات ہیں۔ کائنات کے super-duper infra-structure میں ان کے نافذ ہونے یا نافذ نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑنے کا)۔

غیر کائناتی سطح پر ہی اس نے، اس کی رحمت کے قربان جائے، کچھ اور ایسے انتظامات کیے کہ بعض باجروت جرنیلوں کو دولتِ سخن عطا کی اور کمالِ نثر نگاری سے بھی نوازا، ہر چند کہ ان باتوں کا کوئی جواز نہ تھا۔ تاہم اُس نے انھیں صاحبِ دیوان اور صاحبِ تصنیف اس کینڈے کا بنایا کہ اُن کا طرہء دستار طوطی ہند کے طرے سے لگا کھاتا ہے۔ اور اُسی نے ایک محترم کے قلبِ گداختہ میں ان سب جرنیلوں کے لیے حد درجے کی محبت پیدا کی اور دوسرے مکرم کو بھی ان کا والہ و شیدا بنایا اور کچھ ایسا اہتمام کیا کہ مذکورہ محترم اور دوسرے مکرم ایک گھاٹ پانی پیتے پکڑے گئے۔ اور اُس نے کمر بند کی کچی بعض عورتوں کو مدبرانِ رسائل کے گرد پروانہ وار (مگر یہ اتہام تراشی ہوگی جو کہا جاتا ہے کہ گناہِ کبیرہ ہے اور میں گناہگار اپنے نامہ اعمال کو اور سیاہ کرنا انورڈ نہیں کر سکتا)۔

میاں تم جس دنیا میں رہتے ہو اس میں معتدل درجے کی منافقت اور نیم گرم حرم زدگی اور گا ہے گا ہے کی back biting اور کام چلاؤ قسم کی سازشوں سے گزارا ہو جاتا ہو گا۔ یہاں منافقت، حرم زدگی اور سازش سب اعلا درجے کی ہوتی ہے اور پبلک ریلیشننگ، زنا کاری اور دلالی سطحِ اوّل پر کی جا رہی ہے۔ ہمارے یہاں made to order اولیاء اللہ ہیں کہ ان کے تنخواہ دار، کمیشن خوار خلیفوں کا ایک حلقہ ہے جو حضرت صاحب کی کرامات

اور خرقِ عادات کی تصنیف و تالیف اور نشر و اشاعت میں ہر وقت منہمک رہتا ہے اور خوب خوب مال بناتا ہے۔ یہ اولیاء اللہ مذہب، ادب، سیاست، فنونِ لطیفہ و کثیفہ کی جملہ شاخوں میں موجود ہیں۔ آپ کے وہاں صلاح الدین پرویز اپنے اعلانِ ربوبیت کے چھٹے مہینے میں ایکسپوز ہو جاتا ہے اور باقی عمر سنگسار ہوتے ہوئے بسر کرتا ہے۔ یہاں ہر آدمی دوسرے کے سامنے ایکسپوز ڈ ہے اور ننگا کھڑا ہے مگر دوسرے کی ستر پوشی کر رہا ہے اور اپنے دل کی طمانیت میں اس بات سے پوری طرح واقف ہے کہ دوسرا اس کی ستر پوشی کر رہا ہوگا، اس کے مفادات اور جینیٹلز کو دھوپ کی تمازت سے بچا رہا ہوگا۔

یہ تمام باتیں، محی انور خاں! تمہارے کسی خط کے جواب میں نہیں ہیں۔ نہ ہی کسی نے مجھے خصوصیت سے ان دنوں ستایا ہے۔ یہ دراصل کتھارسس ہے۔ خود میں لوگوں کے ساتھ mild (ہاہ!) درجے کی منافقت کرتا ہوں اور یہ سمجھتا ہوں کہ مجھے کوئی نہیں دیکھ رہا۔ مگر مجھے یقینِ کامل ہے کہ ٹھیک اس وقت کہیں کوئی بیٹھا ہوا میری کمینگیاں یاد کر رہا ہوگا اور اسی طرح زمانے کو برا کہہ رہا ہوگا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کسی خط میں لکھ رہا ہو۔

مثلاً ابھی ابھی میں ایک خاتون کو ٹیلی فون پر یہ بتا کر آیا ہوں کہ دفتر کی طرف سے سندھ کے صاحبِ حال بزرگ شاہ عبداللطیف بھٹائی رحمۃ اللہ علیہ کی یاد میں کل جو جلسہ ہوا تھا اور جس میں وزرا اور علما اور فضلا آئے تھے تو اس کا دعوت نامہ میں نے فلاں کے ہاتھ آپ تک پہنچوایا تھا اور زبانی تاکید کرائی تھی تس پر بھی آپ تشریف نہ لائیں۔ یہ میں نے اس لیے کیا تھا کہ وہ مجھ سے شکایت نہ کریں۔ اصل بات یہ ہے کہ میں نے انھیں دعوت نامہ نہیں بھیجا تھا۔ میں بھول گیا تھا۔ سو میں نے جارحانہ شکوہ کر کے مسئلہ ختم کر دیا۔ دیکھا آپ نے؟

الف۔ میم۔ خے 12-9-1985



(فیروزہ جعفر سال ہا سال سے لندن میں قیام رکھتی ہیں، کہانیاں لکھتی ہیں۔ اُن کے نصف بہتر علامہ طالب جوہری کے ماموں ہیں۔ عزیزہ فیروزہ نے پروین شاکر سمیت کتنے ہی شاعروں ادیبوں کی میزبانی کی ہے۔ خوردوں میں اتنی شفیق خاتون میں نے کوئی اور نہیں دیکھی۔ عُمرش دراز۔ ضد کر کے اس مہمان کے سبھی کپڑے دھو دیے۔ بڑا شرمندہ کیا۔)

بہن فیروزہ! دُعائیں۔ ۱۷ جولائی کو ہیٹھرو کے لاؤنج سے آپ کو فون کیا تھا۔ ۱۸ کو کراچی پہنچ کر اب کہیں وقت پا سکا ہوں کہ آپ محبت کرنے والوں، میزبانوں، دوستوں، خوردوں کو چند سطریں لکھ سکوں۔ پندرہ ساڑھے پندرہ گھنٹے کی مسلسل فلائٹ کا پہلا تجربہ تھا۔ تین دن زبردست jet lag میں رہا۔

لندن جاتے وقت جمال احسانی کی ہم نشینی تھی تو پتا ہی نہ چل سکا کہ کب کوپن ہیگن اور پھر کب لندن آیا۔ پرلوٹتے وقت صرف حضرت مولانا قبلہ عالم تھی جناب فلاں فلاں نور اللہ تعالیٰ مرقدہ و مشہدہ کا ساتھ ہوا۔ [حضرت قبلہ عالم پانچویں قطار میں دو نہایت چھوٹی چھوٹی ایفریقی طالبات کے ساتھ فروکش تھے، یہ عاصی پانچ قطار پرے دو میلے شیئین لڑکیوں کے ساتھ بٹھا دیا گیا تھا۔ 'میری والی' لڑکیاں سخت خوف زدہ تھیں۔ جب بھی طیارہ جھٹکے سے ہوا کی آدھی سیڑھی اُترتا تھا، یہ بھیانک آواز میں سسکتی تھیں۔ میں نہایت بزرگانہ طیارہ شناس لہجے میں سمجھاتا تھا: It's nothing... just a little turbulence۔ لٹل ٹریبولنس کا آئیڈیا sell کرنے میں ناکامی ہوئی تو اُن سے A Tale of Two Cities اور ڈکنز کے بارے میں بات کرنے لگا۔ ایک لڑکی مسلسل A Tale.. پڑھتی آ رہی تھی۔ ادب نے دستگیری کی۔ اُن کا خوف کچھ دور ہوا تو میں نے بتایا کہ میرے ایک co-delegate پانچ قطار پیچھے برابر درود تاج پڑھ رہے ہیں۔ اُن کا خیال ہے کہ طیارے میں کوئی بنیادی خرابی پیدا ہو گئی ہے اور اب بس چل چلاؤ ہے۔ حضرت قبلہ نور اللہ مرقدہ کو تازیانہ عبرت کے طور پر استعمال کیا تو لڑکیوں کا کچھ حوصلہ بڑھا۔ انھوں نے ٹریبولنس کے ہنگام خوف کی آوانیس نکالنی بند کر دیں۔

یہ ایک نیا تجربہ تھا۔ میری اپنی بیٹیاں کمرے میں چھوٹے سے کاکروچ کی آمد پر جو فیل مچاتی ہیں وہ اس قبیل کی diversionary tactics سے روکی نہیں جاسکتی۔ مگر یہ دونوں قابو میں آ چکی تھیں۔ (Malaysia اپنے نوجوانوں کی خوب تربیت کر رہا ہے)۔ میں نے سوچ لیا کہ گھر پہنچ کر اپنی دونوں کو بتاؤں گا کہ دیکھو ایک تم ہو۔ ایک (یا دو) وہ لڑکیاں تھیں کہ میرے بھرے میں آگئیں اور مائیکل جیکسن سے لے کے مسز اکی نو کی بیٹی (جو شاید ٹی وی اداکار ہے) اور بی سی سی آئی تک، turbulence کے سوا، ہر موضوع پر بات کرنے لگیں۔ ہوا کا ہیجان ختم ہوا تو میں حضرت قبلہ نور اللہ مرقدہ کی خدمت میں

حاضر ہوا۔ وہ پی آئی اے کی انتظامیہ پر برہم تھے کہ انھیں ناجنسوں کے درمیان سیٹ دی گئی تھی۔ میں نے سوچا اچھا ہوا جو حضرت مشہدِ سخن قبلہ کو میرے برابر سیٹ نہ دی گئی ورنہ میں تمام رستے نشری نظم اور بلیک کومیڈی یا اینٹی اسٹوری پر بک بک کرتا ہوا آتا اور حضرت کا پلاسٹک کے برتنوں میں پلاسٹک چڑھی PIA کی پلاسٹک جیلی تک کھانا حرام کر دیتا۔

روم پر طیارے کا رکنا، نہ رکنے کی طرح تھا کیوں کہ ہمیں اُترنے کی اجازت تو رہی ایک طرف، سیٹ چھوڑنے تک کی رخصت نہ ملی۔ بیٹھے رہے اور لمبی لمبی تیل چپڑی دھول بھری چیکٹ زلفوں والے پاکستانی seamen کو بورڈ کرتے دیکھتے رہے۔ یہ ملاج شاید وہ تھے جو یونانی بحری جہازوں پر ڈیوٹیاں پوری کرنے کی بعد رخصت پر گھر جا رہے تھے۔ کچھ عجب سی دہشت گردوں والی صورتیں تھیں ان کی۔ یعنی ایسا لگ رہا تھا کہ لالو کھیت کے backwoods میں موساد اور خاد اور را اور آریس ایس کی مشترکہ کوششوں سے میرے شہر کے چند خوف ناک بچوں کو تربیت دے کر سروں میں تیل چپڑ دیا گیا ہے اور فلائٹ پی کے سات سویا سی پر اب روم سے سوار کرایا جا رہا ہے۔ خدا معلوم یہ مانوس شکلوں صورتوں والے ہمیں ہائی جیک کر کے 'کہاں کو' لے جائیں گے۔ مگر یہ تو بڑے docile سلیم الطبع 'دہشت گرد' نکلے۔ سب اپنے سیٹ بیلٹ باندھے، کانوں پر اسٹے تھسکوپ جیسی ہیئرنگ ایڈ لگائے حاجی فرید حاجی مقبول صابریوں کی دہشت کاری سنتے اور سر دھنتے رہے۔ ایک پار بھی جو ہاتھ میں بم لے کے بے چارے اپنی سیٹ سے اٹھے ہوں۔ میں ہی گنہ گار اپنے گیلے میں انگوٹھے پھنسائے سیٹوں کے درمیان ٹھلکتا رہا۔

گیلے پر خیال فوراً محب گرامی جعفر صاحب کی طرف جا رہا ہے۔ بھائی جعفر ہی نے تو ہم بوڑھے طوطوں کو گیلے پہننا سکھایا ہے۔ بتائیے کہ ان کی مصروفیات اب کس نہج پر چل رہی ہیں؟ فرینک فرٹ تشریف لے گئے یا علامہ صاحب کو لندن ہی سے خدا حافظ کہا؟

بھائی جعفر نے، میاں سلمان نے، اور ظاہر ہے، آپ نے ہم مسافروں کو (جمال تو خیر آپ کا لاڈلا بھائی ہے) جس طرح توجہ اور مہمان نوازی سے سرشار کیا، اُس کی یاد تازہ رہے گی۔ اگرچہ B.C.C.I. کے مسئلے میں آپ کا پورا گھر الجھا ہوا تھا۔ محرم کی آمد آمد ایک الگ مصروفیت تھی مگر جعفر گھرانے کی وضع داری اور غریب غربا نوازی

(یہ غریب الدیار سے آگے کی ترکیب لفظی ہے) بہر صورت ایک روایت تھی جسے نباہنا تھا۔ خدا آپ سب کو خوش و خرم رکھے۔ میں نے لندن میں دوستوں کے ساتھ کمال وقت گزارا ہے اور اس کمال وقت میں آپ تینوں دوستوں یعنی بھائی جعفر کا، آپ کا اور سلمان دوست کا زبردست حصہ ہے۔ دعا گو، اسد محمد خاں۔

ماما بُندیل کھنڈی کے بارے میں۔ (انور سن رائے کو ای میل) 11-8-2004

میرے گیتوں کا مجموعہ پڑھ کے ایک ذہین نوجوان، ناصر کمال نے جو شعر کہتے ہیں، ایک بڑے انگریزی روزنامے سے وابستہ ہیں اور وہیں کالم بھی لکھتے ہیں، میرے عزیز ہیں (ان کا ذکر اس mail کے آخر میں بھی آیا ہے) تو انھوں نے mail بھیج کر اور محبت میں خوش گمان ہو کر کہا، کہ اسد بھائی! آپ شاید پہلے شاعر ہیں جس نے بُندیل کھنڈی میں نعتیں لکھی ہیں، (بُندیل کھنڈی میری پیدائش کے علاقے وسط ہند کے دیہات کی بولی ہے)۔ میں نے کہا، ”نا عزیزم نا! یہ اعزاز مجھ کو خوش نصیب کو کیسے حاصل ہو سکتا ہے۔ نامیاں! مجھ سے پہلے بھی کتنے بہت سے بُندیل کھنڈیوں نے نعتیں لکھی ہوں گی۔“

نعتوں کے بارے میں اب ایک بات کسی عقیدت مندی کے اثر میں نہیں، خوب سوچ سمجھ کر کہتا ہوں کہ رسول کی ذات گرامی، آباد دنیا میں ہر جگہ، کسی لاگ، لالچ کے بغیر سراہی جاتی ہے۔ (Inferno والے حرام الدہر Dante اور اُس مجہول النسب سلمان رُشدی کے سوا) ساری دنیا میں کتنے ہی لوگ، جو طے شدہ نامسلم ہیں یا جو practicing Muslim نہیں سمجھے جاتے، (جیسے کہ کوئی عاجز.. جس سے آپ بخوبی واقف ہیں) محمد عربی کو خراج تحسین پیش کرتے آئے ہیں۔ اسی طرح جیسے آپ اور میں حضرت یسوع مسیح اور جناب زرتشت اور مہاتما بدھ سے ’اللہ واسطے کا‘ پیار کرتے ہیں کیوں کہ یہ سارے ہی اعلیٰ ترین سطح کے انسان ہیں، آدمی کے محسنوں میں سے ہیں۔

تو نبی کریم کو ہر زمانے میں، ہر جگہ، بے گنتی لوگوں نے اپنی اپنی زبانوں میں یاد کیا اور سراہا ہے، اُن کے لیے اپنی محبت ظاہر کی ہے۔

بھائی! یہ ممکن نہیں ہے کہ صاحب دل لوگوں سے پورم پور بھرے بُندیل کھنڈی میں، وہاں کی بھولی زبان، سچے محاورے میں رسول کے لیے پیار کے بول اب تک نہ لکھے گئے ہوں۔ نا عزیزم، نا! یہ ممکن نہیں! بہت پہلے ہی، بہت سے لوگوں نے اپنے اپنے

بول لکھ دیے ہوں گے۔

پھر میاں سن رائے! میں اپنی زاد بوم، بُندیل کھنڈ کے بارے میں شروع ہو گیا۔ میں نے لکھا:

بھیا! میں ان لوگوں کا پرانا ہلاک ہوں.. بُندیل کھنڈیوں کا۔

بچپن، لڑکپن میں تو گاؤں دیہات میں ان کے ساتھ خوب وقت گزارا ہے۔ میرے مالوے دیس والے گیت کی چندن موسیٰ اور ٹلسی اور لچھیا... اور 'یوم کپور' کا دو جو روؤں والا ٹھاکر اور مٹھو اور اُس کا ماما (دونوں آخر الذکر ابھی تک کسی کہانی میں نہیں آئے، مگر آئیں گے ضرور) اور ایسے کتنے ہی جن کے نام میں نہیں جانتا، میری یادوں کے بندی خانے میں براجتے ہیں۔ تم سے کبھی ملواؤں گا۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ لو اب سنو:

یہ ماما بہت دانش مند آدمی تھا۔ 'مہا مائی' کے باغ کی باوڑی پہ اپنے کچھوڑے کو پانی دے رہا ہوتا اور ڈول کھینچتے بیلوں کو ٹسکارتا تو اس کی آواز سن کر، میں کبھی تو ناشتا چھوڑ کر، بھاگا بھاگا باوڑی پہ جا پہنچتا اور دیکھتا کہ ماما بھرا ڈول کھینچتے ہوئے اپنے بیلوں کو جگت کے ڈھلوان پر سے اُتارے لیے جاتا ہے، یا ڈول خالی کر کے جوڑی کو اُلے قدموں incline پر چلاتا واپس باوڑی کے جگت کی طرف لا رہا ہے۔

وہ 'اُتار' پر جب اپنی جوڑی کو کھینچتا چلتا تو پانی بھرے ڈول کے 'بھار' سے تنے ہوئے رسوں پر بالکل جھک جاتا اور اُن پر اپنا 'بوجھا' ڈالتے ہوئے، بیلوں کے ساتھ ساتھ اُترنے لگتا۔ پھر جب اُچھل کر اُن تنے ہوئے رسوں پہ بیٹھتا تو (میں آج کی analogy میں کہوں گا کہ) کسی ماہر 'بیلے' رقص کی طرح foot work کرتا اور رسوں سے لٹک لٹک کر ڈھلوان پر پھسلتا جاتا۔ گھٹنوں تک کھلی اس کی پتھری پنڈلیاں، مٹی میں سے اُس کے چمردھے جوتے اور اس کی rhythmic 'ہہ ہہا! ہا.....' مجھے یہ سب ناچ جیسا لگتا تھا۔

ماما ہنس کے کبھی پوچھ بیٹھتا، 'ای تم کا ادا کیکھ رے او بھیا!؟'

میں کہتا، 'تمھارا ناچ' اور وہ ہنستے ہنستے رسے پہ جھول جاتا۔

یہ ماما، مٹی اور پانی اور بادل اور بجلی اور زمین سے اُگتی ہوئی چیزوں کے اور گرد و پیش کے سب احوال جانتا تھا۔ میں بھی ان سب چیزوں کے بارے میں اس سے جب

چاہتا سوال کرتا اور ماما ٹرنٹ جواب دیتا۔ اُس کے پاس ہر چیز کا جواب ہوتا تھا۔

”یہ بادل کہاں سے آتے ہیں؟“

وہ بیلوں کو ہنکانے والی سوئی سے ’پاترا‘ ندی کے پتّوں کو اُلانگھتا ہوا اشارہ کرتا،

”ووو پلے پار سے۔“

”مٹی میں کیا ہوتا ہے جو نیچے سے پیڑ بن جاتا ہے؟“

وہ جیسے گا کے کہتا، ”یامائی ماں تو سبّی لیلِا اَپرَم پار کو ہے بھیا!“ ... کیا پتا کسی

بھجن کی لائن سُناتا ہو۔ (’کو‘۔ بُندیلی میں ’کی‘ ہوتا ہے)

”یہ جو باؤڑی میں سیڑھیاں اُتر رہی ہیں یہ کہاں تک ہیں؟“

ماما فیصلہ کن جواب دیتا، ”جھان تولے باؤڑی، بھان تولے سِڈھی“ (جہاں

تک باؤڑی ہے وہیں تک سیڑھی ہے)۔

برادرِم انور سن رائے!

میں شکر گزار ہوں اپنے دادا اور باپ کا جنھوں نے میرے شعور کی عمر میں کئی

کاریوں کو، میرے سامنے ہوتے، برابر کا پروٹوکول دیا (ہمارے تمھارے دیس میں تو بعض

جگہ انھیں کئی کمین کہا جاتا ہے۔ جسے سن کر ہم تم اور ہمارے بہت سے دوست بہت

اداس اور برہم ہو جاتے ہیں)۔ وہ ’اونچیر گاؤں‘ کے ہمسایہ کسان اور کھیت مزدور تھے جو

کبھی دادا کے مزارعے ہوتے تھے۔ دادا کے بعد بھی وہ برابر ہم سے ملنے آیا کرتے اور

جنگل کی اور اپنے کھیتوں کی سوغاتیں لاتے تھے۔ ابا کے آگے کرسیوں پر بیٹھ کے وہ

میرے دادا کو اور اپنے پچھڑے ہوؤں کو یاد کر کے روتے اور تسلی کے دو بول سن کے چلے

جایا کرتے تھے.... کتنی نسلیں گزر گئیں۔

نہ اُن کے بچوں، نیک بختوں کو کوئی بتانے والا رہا کہ اس پھلتے ہوئے شہر کے

اس بے شکل و صورت مکان میں ایک ’بڑے میاں صاب‘ رہا کرتے تھے جو اپنی

جاگیر (بعد میں) مُستاجری کے گاؤں ’اونچیر‘ کے دیہاتیوں کو برابر کا انسان جانتے تھے۔

نہ وہاں کے بچوں اور اُن کے بچوں سے کوئی کہنے والا رہا کہ یہ جو سامنے نیل

گاڑی ہنکاتا، اپنے بیلوں کو ٹکارتا گاؤں والا جا رہا ہے، ہو سکتا ہے یہ ’اونچیر گاؤں‘ کا ہو

اور اس کے بڑے بوڑھوں کو تمھارے بڑوں سے کبھی بہت ’اللہ واسطے‘ کا پیار ملا ہو۔

ابھی ایک سوال ذہن میں آیا ہے — بہت عامیانہ سا: کہ کیا معاملات اب 'اللہ واسطے' نہیں ہوتے؟ اور کیا ہر معاملے میں کوئی لاگ لالچ موجود ہے؟ ثواب کا لالچ؟ اور good will کی چھتا؟ اور ووٹ اور پیسے حاصل ہونے کی امید؟ اور کیا لوگ اچھی اچھی باتیں کر کے یا کچھ دے دلا کے لوگوں سے کام نکال کے چلتے نہیں بنتے؟ کیا وہ پٹاتے seduce نہیں کرتے؟ اور کیا جنہیں بندوں سے بے تعلق اور بے نیاز یا خود غرض اور حرام الدہر کہا جاتا ہے وہ ابھی کے، اسی نئے millenium کی پیداوار ہیں؟ کسی اور زمانے میں ایسے لوگ نہیں ہوتے تھے؟ (ہوتے ہوں گے۔ بلکہ اب یاد آیا کہ... ہوتے تھے۔ بے شمار تھے۔ لیکن I don't care to recall them - کیسا؟) اور کیا میری یادوں میں جو goody goody باتیں اور پپے پپے لوگ ہیں وہ ختم ہو گئے اور اب ویسے بالکل نہیں ہوتے؟ ہوں گے — بہت ہیں!

But I have no patience (& time) left to dig them out.

Let younger persons do it.

مجھے تو اپنی یادوں کی باز یافت میں مزہ آرہا ہے۔

یارا... انور سین رائے!

دو روز سے اس کہانی "مہا مائی کا ماما" پر کام کر رہا تھا۔ نیت تھی کہ پوری ہو جائے گی تو پڑھنے کو تمہیں بھیجوں گا۔

ابھی صبح ہی صبح جب تم نے اپنے گھر لندن سے فون کیا تو اسد بھائی نہال ہو گیا اور نامکمل (ہی سہی) اُس نے یہ کہانی تمہیں اور عذرا کو بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ او میاں جب یہ پوری ہوگی تب بھی پڑھ ہی لو گے۔

اسے اب تک خود میں نے، میرے اُس عزیز، میاں ناصر کمال نے (جو بہ یک وقت میرا کزن بھی ہے اور بھتیجا بھی) پڑھا ہے۔ اب تم پڑھ رہے ہو۔

ایسا لگتا ہے کہ دو چار دن میں یہ پوری ہو جائے گی۔

بات جو پھیل گئی ہے... وہ جو میرا بائی قدس سرّ العزیز نے کہا ہے کہ "اب تو بات پھیل گئی..." وغیرہ وغیرہ۔

(اپنے بھتیجے/ بھائی ناصر کمال کو ایک ای میل)

ناصر میاں!

اُس ای میل میں جہاں یوسفی صاحب کا اور ضمیر نیاز سی صاحب مرحوم کا اور میری نظم ”مناجات“ کا ذکر چل رہا تھا میں نے جم کے لکھنا شروع ہی کیا تھا کہ آسمانی سلطانی ہوئی، بجلی چلی گئی اور mail ایریز ہو گئی۔ میں نے بے مزہ ہو کے، مختصر وضاحت سی لکھ کر قصہ ختم کر دیا۔ لیکن آدمی ضدی ہوں (اپنی لکھت کے حوالے سے) جب تک اُس طرح بیان نہ کر لوں جیسے بیان کرنا چاہتا تھا، مجھے چین نہیں آتا۔ تو میاں اب سنو:

مگر پہلے کچھ اُن محاوروں کے بارے میں جو نظم ”مناجات“ میں آئے ہیں:
بکرا بکرا نا.. Ululating.. صحیح کہا آپ نے۔

”بڑھک مارنا“ یہ لاف زنی کے معنوں میں ہے۔ ہماری پنجابی فلموں میں جب تک ۳۰ یا ۴۰ بڑھکیں نہ ہوں ایک عام viewer کو مزہ نہیں آتا۔ ہیرو یا ویلن اردو کے ۸ کی طرح ٹانگیں کھول کے سینہ پھلا کے دونوں بازوؤں کو غوطہ مارتے پرندے کے پروں کی طرح stiff کر کے بکنا شروع کرتا ہے اور دیر تک بکے جاتا ہے کہ میں ”ایٹج کر دیاں گا، اونج کر دیاں گا“ کرتا کراتا لکھ نہیں۔ یہ! badhak ہوتی ہے۔

ایک بھوپالی expression ہے: لو لو بولنا (Lu Lu Bolna) تو ایک دور دراز امکان ہے۔ wild thinking۔ یہ لو لو کہیں Ululating کا بگاڑ تو نہیں ہے؟ on second thought. یا یہ اپنی دلی کے محاورے میں۔ ”لو لو ہے بے لو لو!“ ”تو نہیں ہے؟“ ”لال قلعے کی ایک جھلک“ خواجہ حسن نظامی (علیہ الرحمۃ) کا ایک مضمون یا کتابچہ ہے جس میں انھوں نے بیان کیا ہے کہ جب قلعہ معلیٰ کے آگے سے ایک گورا صاحب گزر رہا تھا تو رہائش گاہ سلطانی سے نظر ڈالتے ایک شہزادے نے نفرت سے پکار کے کہا تھا کہ ”لو لو ہے بے لو لو“ گورا صاحب سمجھ گیا۔ اُس نے رولا ڈال دیا۔ پکڑو پکڑو ہونے لگی تو ایک وابستہ دولت نے سمجھا یا کہ حضور! لو لو فارسی میں موتی کو کہتے ہیں۔ شہزادہ تو صاحب کے حُسن جہاں سوز (my words) کی تعریف کرتا ہے۔ ہا ہا ہا Wild thinking continues مثلاً ان دنوں اسلام آباد سے گزرتے ہوئے اپنے چچا، میاں عنایت محمد خاں صاحب، کونڈو لیزا چاول کو دیکھ کر مجھ سے کہیں، ”دیکھنا خاں چاول بائی

جا رہی ہے۔“ ہو سکتا ہے وہ اُسے بریانی کہہ کر وضاحت کریں کہ اپنی طرف اس نام کی ایک بیڑنی رہتی تھی۔ ha ha! ان کی جھلسن کی وجہ، ظاہر ہے آپ سمجھ ہی گئے ہوں گے۔
خیر، dot dot برسیاہ رویان جہاں! یہ ’سیاہ رویاں‘ ہرگز ہرگز colour of the skin نہیں ہے۔ آپ کو تو پتا ہے black is beautiful -

اب یوسفی صاحب کے بارے میں:
عصمت کی نوکری کے سلسلے میں جو کچھ کیا وہ یوسفی صاحب نے اُس سے دس منٹ بات کر کے اور مجھ سے پوچھ کے کہ ’کیا یہ تمہارا حقیقی بھائی ہے؟‘ کر دیا تھا۔ بعد میں جب بھی میں نے یہ ذکر چھیڑا، انہوں نے جملہ پورا نہیں کرنے دیا.... ”بھئی خاں صاحب! بینک نے مجھے پابند کیا تھا کہ میں نئے افسر بھرتی کروں، صاحب زادے اچھے موقع سے آگئے، میں نے رکھ لیا۔“

... سبحان اللہ! کیا وضع داریاں ہیں!

میاں عصمت نے بھی انھیں مایوس نہیں کیا۔ ۱۶/۱۵ برسوں میں وہ senior manager بن چکا تھا۔ اور ایک عجیب بات ہوئی تھی... اُس کے انتقال کے پچاسویں دن بینکرز اکادمی کا ایک خط گھومتا گھومتا میرے پتے پر آیا تھا کہ ”مسٹر آئی ایم کے نے AVP کے لیے کوالیفائی کرنے والا امتحان پاس کر لیا ہے۔ اُمید کی جاتی ہے کہ انھیں اگلے چند برسوں میں (other things remaining the same) اے وی پی پروموٹ کیا جاسکے گا۔“

تو اب یوں ہے کہ صاحبو! اللہ ہی اللہ ہے۔ Man proposes, the Oldman disposes. اس لیے برادر! میں، مشتاق احمد یوسفی صاحب سے اُن کے لٹری کی کام کی وجہ سے بھی محبت کرتا رہوں گا اور اُن کی بھلمنسی اور احسان کو بھی tribute پیش کرتا رہوں گا۔
پچھلے دنوں کسی خبیث حاسد نے ایک گم نام مراسلہ لوگوں کو ڈاک سے بھیجا تھا جس میں میرے ان دو دوستوں، افتخار عارف اور یوسفی پر درجنوں بہتان لگائے گئے تھے اور حرم زدگی کی باتیں کی گئی تھیں۔ میں، اور سبھی احباب، بہت بے کیف ہوئے تھے۔ میں کیا کرتا... نوجوان دوستوں کے سمجھائے پر ہوا میں گالیاں بک کر چپ ہو رہا (پنجابی میں گالیاں بکنا نہیں نکالنا کہا جاتا ہے۔ شاید کیتھارسس کے حوالے سے کہتے ہوں گے)۔
کل آپ کا بے پناہ اہم میسج ملا۔ وہ جو آپ نے ”مہا مائی“ کے باغ کی حالیہ

وِٹ کے بعد بھیجا ہے۔ جیتے رہیے، خوش رہیے۔

سوچتا ہوں آپ کے اس narration کو بالکل اسی طرح، ترجمہ کر کے، اس بُت کا حصہ بنادوں۔ دیکھیے اللہ مالک ہے۔ مگر کیا بربادی، کیسا desolation ہے! اس کے بارے میں پھر کبھی لکھوں گا۔ اس وقت بہت تھک گیا ہوں۔ میرے حساب سے دو صفحے پورے ہو گئے۔ خدا حافظ! بامانِ خدا! فی امان اللہ! وغیرہ۔

اسد بھائی۔ ۹ ستمبر، دو ہزار چار۔



(اپنے بھتیجے / بھائی ناصر کمال کو ایک اور ای میل) Karachi.9-9-2004.

ناصر میاں!

زندہ و سلامت باش۔ بھائی، بہت کمال کا کالم لکھا ہے آپ نے۔ میری طرف سے بے حساب داد اور بھرپور حمایت شامل حال سمجھی جائے۔ میں نے صبح کی mail میں لکھا تھا کہ آپ کی تحریر نے... وہ کیا کہتے ہیں؟.. نہ صرف move کیا ہے، بلکہ ہلا کے رکھ دیا ہے۔ ماشا اللہ۔

گنتی کے لفظوں میں زندہ لکھت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ میں کالمسٹ کی مشکلوں کو سمجھتا ہوں۔ تاہم، کچھ کر کے، اپنے ریڈرز کو بتا دیجیے کہ جس نالے کے culvert کا ذکر کیا گیا ہے، وہ سارا سال بہنے والی پاترا ندی تھی جس پر چھوٹے خاں (Ref. History of Bhopal State) نے بند باندھ کے ایک آبشار بنایا تھا اور پاترا ندی کو 'مہامائی' کے اُس رُخ سے نکالا تھا جو ریلوے اسٹیشن کو face کرتا ہے۔ مجھے خوب یاد ہے کہ باغ سے ماڈل ہائی اسکول کے لیے نکلنے کو ہمیں ٹھنڈی سڑک Starting from "Narbada Ice Factory" پر آنے کے لیے 'چیل' کے ایک تناور درخت کے 'ڈالے' کو (جو پاترا ندی پر کسی پُل کی طرح جھکا ہوا تھا) straddle کرتے ہوئے ایک ایک چپا (چپا چپا چرخہ چلے) سرکنا پڑتا تھا۔ پاترا کے اُس پٹن ('pattan' in Punjabi means Saahil) اُس پرلے کنارے پر ڈالے سے چھلانگ لگا کر آئس کریم فیکٹری کی طرف دیوانہ وار دوڑنے کی مسہرت کو میں ابھی بیان نہیں کرنا چاہتا۔ اُسے ناول کے ایک باب کے لیے بچا رکھا ہے۔

عزیزم! اس کرتب کا مزہ ہی کچھ اور تھا۔ آٹھ سے گیارہ بارہ برس کے eloquent بچوں سے... جو ماشا اللہ گھر ہی میں ہیں... پوچھ لیجیے۔

میں نے ۱۹۸۰ء کی ایک کہانی ”گھر“ میں (جسے قاسمی صاحب نے بہت پیار سے رسالہ ”فنون“ میں چھاپا تھا) پاترا ندی کو بیان کیا ہے :

”... میں ایک دفعہ کے بعد گھر سے باہر نہیں نکلا۔ میں باہر کس لیے نکلوں؟ میرے گھر میں، گھر کے گردا گرد بڑی دل موہ لینے والی چیزیں ہیں۔ گھر کے پچھواڑے کی باڑ سے ملے ہوئے بانسوں اور سرکنڈوں کے چھدرے چھدرے جھنڈ ہیں جن سے بچتی بچاتی پاترا ندی بہتی ہے۔ نقشہ نویسوں نے اُسے کوئی نمبر دے رکھا ہے۔ وہ اُسے نالہ بارانی شمالاً جنوباً نمبری فلاں فلاں کہتے ہیں اور اپنی بے خبری میں اسے بہت مسکین جانتے ہیں۔ مگر چار پانچ دن لگاتار ایک ہی رفتار سے ننھی ننھی سوئیوں جیسی پھوار بھی پڑتی رہے تو یہ پاترا ندی اپنی بانہیں اور جانگھیں پھیلا دیتی ہے اور آس پاس کے سب کھیتوں کو اپنی خواہش کا نشانہ بناتی ہے اور انھیں اپنی کاہل، تیل چپڑی، آہستہ رو شہوت میں لتھیر دیتی ہے اور مجھے بڑی شرم آتی ہے جب میں اُس کی بغلوں سے اور پیڑوں سے جھانکتے ہوئے سرکنڈوں اور بانسوں کے گیلے جھنڈ دیکھتا ہوں۔ یوں لگتا ہے جیسے اپنے کسی محرم کو، جس سے کوئی جنسی ربط ممکن نہ ہو، کھلے ستر دیکھ لیا ہو۔ تب میں.. جو اس کا وستر، اس کا ستر پوش ہوں... میں اپنی پلکیں گرا کر اس کی ستر پوشی کرنا چاہتا ہوں، اسے محفوظ دیکھنا چاہتا ہوں۔ پر ساون بھادوں میں جہاں تک نظر ڈالو یہ بھاری استتوں والی اہلا، کالی مٹی پر اپنی کایا کا بوجھ ڈالے، آلس کے ساتھ کروٹ بدلتی دکھائی دیتی ہے اور بڑی غیر محفوظ لگتی ہے۔ اور میں سوچتا ہوں اسے کون سمیٹ سکتا ہے۔ کہاں تک سمیٹ سکتا ہے۔

ننھی سوئیوں جیسی پھوار، کہر کی دبیز چادر کی طرح دوسرے کنارے کے جانے پہچانے نشانوں کو ڈھانپ لیتی ہے اور ندی کا پاٹ کئی میل کا دکھائی پڑتا ہے۔ گہری دھند میں ندی کے پار سے آوازیں کچھ اس طرح آتی ہیں جیسے گیوں کے پار سے آرہی ہوں۔ تب ایسے میں، میں ندی میں اتر جاتا ہوں اور کندھوں تک پانی میں ڈوبا ہوا ان آوازوں میں لپٹی ہوئی ایک خاص آواز کو ڈھونڈتا ہوں جو پکار کر کہتی ہے کہ ہے پاترا! ہے پتریا! ہے ویشیا! ہے کلکننی! پھر یہی آواز ہچکیاں لے لے کر روتی بھی ہے۔ پتا نہیں کون بوڑھا

بدمعاش ہے جونھی ننھی سوئیوں کی ٹھنڈی دھند کے پار کھڑا ہواندی کو برے برے نام دے رہا ہے۔ میں کسی روز اسے ٹکڑی سے پکڑ کے اس کا منہ کیچڑ میں دے دوں گا۔

ایک روز میں نے چیخ کر کہا بھی تھا کہ او بڈھے سُور! بکو اس بند کر! اور مارے غصے کے پانی میں کھڑے کھڑے میرا پیشاب خطا ہو گیا تھا۔ یہ ایسی پریشانی کی بات تھی کہ میں ندی سے نکل کر سیدھا اپنے گھر بھاگ آیا اور بہت دنوں تک پانی کے پاس نہیں گیا۔ بس گھر میں بیٹھا رہا اور برگد کی چار ماترائیں سنتا رہا کہ تانا نانا ہو دو...“

برادر م!

یہ 'برگد کا آوازہ' وغیرہ، صوفیہ کے آوازے "تانا نانا ہو" کے مماثل ہے اور کہانی کی ابتدا سے جاری موسیقی کی terminology میں ایک refrain کی طرح ہے جو اس کہانی کو اپنے logical windup کی طرف لے جاتا ہے۔ پاترا ندی اس کہانی میں کم و بیش اتنی ہی ہے۔

اب میں چلتا ہوں۔ سہ پہر کے ساڑھے چار بجے ہیں۔ سوتا ہوں۔

دُعائیں۔ اسد بھائی۔

پس نوشت:

ناصر میاں!

میں اس ناول / ناولٹ کو بہ ہر حال 'مہا مائی کے باغ' سے آغاز کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے پاترا ندی کے معدوم ہونے کو جس دکھ سے بیان کیا ہے وہ بہت متاثر کن ہے۔ آپ اپنے شہر سے... جی نہیں، بلکہ زمین سے، زمین کی ہریاں سے، بہتے پانی سے اور نمو سے پیار کرتے ہیں۔ بے شک پیار کرتے ہیں۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں.. مگر کمال کی بات ہے یہ۔

میرا یہ ہے کہ میں اپنی زندہ ندی کو سن پینتالیس میں پہنچ کر آسانی سے 'ری کری ایٹ' کر لوں گا۔ اس لیے کہ میرے پاس تو وہی پرانے نقش ہیں دھندلے... اور خوب صورت۔ پھر وہ مرحلہ درپیش ہوگا کہ جب اُس 'ناموجود' کو.. ناموجود صرف میرے لیے.. اُس ناموجود پاترا ندی کو گاڑھے کیچڑ میں بدلتے یا زخم سے رستے ست رو puss کی لکیر میں بدلتے دکھانا ہوگا تو پھر کوئی اور جتن کروں گا۔

بھائی! میں کچھ تو جان گیا ہوں کہ چیزوں پر موت کا اور decay کا ورود کس

طرح ہوتا ہے۔ وقت گزرنے کے ساتھ اور بھی سمجھ میں آجائے گا۔ لو، اب دیکھو پاترا ندی اور مہامائی پر تم سے جو سوال جواب ہو رہے تھے، ان کی تخلیقی شکل اس طرح بنی ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ کہانی سے متبدل ہو کر یہ ناول کا باب کیسے ہو گیا۔ پڑھو:

اسد بھائی خانوں

(اسد محمد خاں کے آنے والے ناول کا ایک باب)

کسی برکتوں والی اُمید کے ساتھ خانوں میاں نے ہلکی آوازوں والے ایک شہر میں، سارے سال بہتی ایک ندی سے کوئی میل بھر دور ایک ایسے مکان میں آنکھ کھولی تھی جسے ڈیڑھ دو سو برس پہلے، بے سوچے سمجھے، بہت سی جگہ میں، بہت سی اینٹوں چتھروں سے بنا لیا گیا ہوگا۔

مکان ایسا بُرا نہیں تھا۔

شہر کے باہر ندی کے دوسری طرف ایک باغ تھا۔ باغ میں ایک مسجد، ایک باؤڑی، بہت سی پرانی قبریں اور دھوپ میں سُکھائی ہوئی اینٹوں سے بنی چھ آٹھ کمروں کی ایک عمارت تھی جو 'میاں کی باکھل' کہلاتی تھی۔ باکھل کی چھت کو یلو کی تھی۔ ساون بھادوں میں ٹوٹ کے برستی برساتیں چھت کو کائی جما کے ہرا کر دیتی تھیں اور گرمیوں کی دھوپ اس ہرے کو سیاہ بنا دیتی۔ سردیوں میں یہ چھت مٹ میلی دکھائی دیتی اور دیکھنے والوں میں سے بہت سوں کو اداسی میں ڈال دیتی تھی۔

خانوں کو یہ باغ اچھا لگتا تھا۔

باکھل والے میاں لوگ، خانوں کے بہت قریبی عزیز ہوں گے، اسی لیے خانوں کے گھر والے سال میں ایک دو بار یہاں آ آ کے رہتے اور خود کو زمین سے اُگتی اُن چیزوں کے قریب پا کر خوش ہوتے تھے کہ جن کے رنگ سبز اور نیلے اور سیاہ اور سُرخ اور زرد اور نارنجی اور کئی طرح کے ہوا کرتے تھے۔

اُگنے والی ان چیزوں کے رنگ بعد کو خانوں میاں کے لیے آہستہ آہستہ مٹ میلے ہوتے گئے اور دھندلا گئے... مگر ایسا برسوں بعد ہوا تھا۔ اور وہ ایک الگ کہانی ہے۔ خانوں میاں دس برس کا تھا تو اُس نے جھاڑیوں کے بیچ چھپا کر بنایا ہوا ایک دیوی استھان دیکھا تھا۔ سو پچاس برس پہلے کسی نے پیپل کے چھتار کے تنے سے، ایک

بے شکل سا دو ہاتھ اونچا پتھر ٹکا کر اُس پر گیر مل دیا تھا، آس پاس پھول بکھرا دیے تھے۔ جھاڑیوں نے دیوی استھان کے گردا گرد اُگ کر اُسے اُن لوگوں کی نظروں سے اوجھل کر دیا تھا جنہیں اس دیوی سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ ہاں پوجا پاٹھ والے آتے، جھاڑیاں ہٹا کے اپنی آرادھنا کرتے، کچھ دیر ٹھہرتے اور چلے جاتے۔

کچھواڑے میں کام کرنے والے کاچھی ہری لال نے خانوں کو بتایا تھا کہ یہ دیوی مہامائی کا استھان ہے۔

خانوں نے کہا تھا، اچھا!

پھر اُس نے خود سے کہا تھا، ہاں جی تو اس باغ کو مہامائی کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ ہری لال کاچھی نے، جسے سب ہریا کہہ کے بلاتے تھے، خانوں کو مہامائی کی اور بھی باتیں بتائی ہوں گی مگر اُسے اب کچھ بھی یاد نہیں تھا۔

ہریا سولہ اٹھارہ برس کا ہوگا پر اس وقت بھی بہت سی باتیں اُسے دوسروں سے زیادہ معلوم تھیں۔

بہت دانش مند اور گھٹنا تھا یہ ہریا۔

وہ مہامائی کے باغ کی باؤڑی سے کچھواڑے کو پانی دے رہا ہوتا اور ڈول کھینچتے بیلوں کو ٹٹکارتا تو اس کی آواز سن کر خانوں میاں، ناشتا چھوڑ، بھاگا بھاگا باؤڑی پہ جا پہنچتا اور دیکھتا کہ ہریا پانی سے چھلکتا، پوروں پور بھرا ڈول کھینچتے ہوئے زور لگاتے بیلوں کو جگت کے ڈھلوان پر سے ایسے اُتار رہا ہے جیسے سرکس کا تماشا دکھاتا ہو۔ یا پھر وہ ڈول خالی کر کے سیدھے سبھاؤ اپنی جوڑی کو اُلٹے قدموں ڈھلوان پہ چڑھاتا، بیلوں سے باتیں کرتا، واپس باؤڑی کے جگت کی طرف لا رہا ہوتا۔ یہ محنتی کئی کاری، ہریا۔ ہری لال کاچھی۔

وہ جب ’اُتار‘ پہ چلتا تو پانی بھرے ڈول کے بھار سے تنے ہوئے رسوں پہ جھک جاتا اور اُن پر اپنا بوجھ ڈالتے ہوئے، بیلوں کے ساتھ ہولے ہولے ”اُترنے“ لگتا۔۔۔ اور جب اُچھل کر تنے ہوئے رسوں پر بیٹھتا تو ماہر زرتیہ کار کی طرح قدم لیتا یا رسوں سے لٹک لٹک کے ڈھلوان پر پھسلتا۔ گھٹنوں تک کھلی اس کی پتھر جیسی پنڈلیاں، کیچڑ مٹی میں سنے اُس کے چمردھے جوتے اور تال کے ساتھ چلتی اس کی ”ہہ ہہا! ہاہ!“ خانوں میاں کو یہ سب ناچ جیسا لگتا تھا۔

ہریا ہنس کے کبھی پوچھ بیٹھتا، ”ای تم کا اادیکھ رے او بھیا؟ بیری بیری آئے کے کا اادیکھ بے او؟“

خاتون کہتا، ”تمھارا ناچ دیکھتا ہوں“... اور ہریا ہنستے ہنستے رے پہ جھول جاتا۔ یہ ہریا، مٹی اور پانی اور بادل اور بجلی اور زمین سے اُگتی ہوئی چیزوں کے اور ان کے آس پاس کے سب احوال جانتا تھا۔ خاتون ان سب چیزوں کے بارے میں جب چاہتا اس سے سوال کرتا اور ہریا سے ثرنت جواب پاتا۔ لگتا تھا اس سیانے کے پاس ہر بات کا جواب ہے :

”یہ بادل کہاں سے آتے ہیں؟“

وہ ہاں میں سر ہلاتا یعنی ٹھیرو، بتاتا ہوں۔ پھر بیلوں کو ہنکانے والی سونٹی سے وہ ’پاترا‘ ندی کے پتن کو اُلانگھتا ہوا اشارہ کرتا کہ ”وودو پلے پار سے۔“

”مٹی میں کیا ہوتا ہے جو نیچے سے پیڑ بن جاتا ہے؟“

ہریا جیسے گا کے کہتا، ”جاماٹی ماں تو سبری لیدا، سبرا کھیل تما سا ایکئی ان حد، ایکئی اپرم پار کو ہے۔“ کیا خبر کبھی کے سنے ہوئے کسی بھجن کے بول پڑھ دیا کرتا تھا وہ... یا کچھ بھی۔

خاتون اُس سے پوچھتا، ”ہری لال! باوڑی میں جو سیڑھیاں ہیں یہ کہاں تک گئی ہیں؟“

ہریا بدھی مانوں کی طرح سر ہلا کے کہتا، ”ہا آں۔ جھان تولے باوڑی رے بھیا! بھان تولے ای سڈھی ہوئے گی۔ اور نہیں تو؟“

جاڑوں میں ڈول سے اُلٹتے اور برہوں میں بہتے پانی سے بھاپ اُٹھتی اور خاتون حیرت سے آنکھیں پھاڑے یہ ان ہونی ہوتے دیکھتا، تو ہریا کسی گھمنڈی چمتکاری کی طرح ہنستے ہوئے گردن اکڑا کے خاتون پہ نظر ڈالتا۔ مانو ہریا ہی باوڑی کے پانی سے بھاپیں اُٹھاتا ہے اور خاتون کو حیرتوں میں ڈالتا ہے۔ یہ رُتوں موسموں کا پالنہار، جل داتا! — یہ ہریا — ہری لال کا چھی! کچھواڑوں کا سیوک! خانہ آباد!

”ایے خانہ آباد! ہریا! خوش بخت!“ ولایتین بوا کی آواز آتی، ”اُسے باتوں میں

نہیں لگا اوئے! ابی ناشتا بی نہیں کیا اُس نے۔ بھے جو، ادر بھے جو اُسے... خانہ آباد کو۔“

ہریا آنکھیں نکال کے دبی آواز میں خانوں سے جانے کو کہتا کہ جاؤرے
 بھیا، بوا اماں گصہ کڑی بے۔ تو مجبوراً خانوں، ہری ہری آنکھوں، مہندی رنگے
 بالوں اور لال بھبھوکا گالوں والی ولایتیں بوا کے پاس... اور ناشتے کے پاس لوٹ آتا۔
 مگر اسے بیلوں کو ٹٹکارتی ہریا ہری لال کی آواز برابر آتی رہتی۔ وہ خوب سمجھ
 رہا ہوتا کہ ڈول سے اترتا، لشکارے مارتا پانی، بہت ہی بھاپیں اٹھاتا، برہوں میں
 بہتا، کچھواڑوں میں پہنچ کے مٹیوں کو تر کرنا جارہا ہے۔
 وہ پہلے سے جانتا تھا کہ ہریا کی ٹٹکارتی آواز تمام سبز اور نیلی اور سیاہ اور سرخ
 اور زرد اور نارنجی چیزوں کو اُگنے پہ اکسا رہی ہے، اکساتی رہے گی۔
 ٹھیک تو ہے:

(یہ سب کچھ ویسا ہی تو ہو رہا ہے۔ کچھ اوپر ستر برس کے خانوں نے دل میں
 دُہرایا) ویسا ہی تو ہو رہا ہے جیسا کہ توریت کے باب اول ”کتاب پیدائش“ میں درج ہے...
 کہ یہووا خداوند نے پہلے زمین اور آسمان بنائے تھے۔ اور زمین پر (جو ابھی برومند نہ ہوئی
 تھی) نہ تو وحشی جھاڑیاں ہی تھیں، اور نہ کسی خودرو پودے نے ابھی سر اٹھایا تھا، کیوں کہ
 ’یہووا‘ نے (تا حال) زمین پر بارش نہیں بھیجی تھی اور نہ زمین پر اُسے جو تنے والا آدمی (یہ
 ہریا؟) آیا تھا۔ (تاہم) زمین سے ایک سیل (ضرور) اُٹھ رہا تھا جو مٹی کو تر کرتا جاتا تھا۔
 ہئے ہئے...! گویا یہ زمین آدمی سے آباد نہ ہوئی تھی؟... نصیبوں والی۔

تبھی ’یہووا‘ نے دھول کو پانی میں گوندھ کر اس آدمی (ہریا؟) کا پتلا بنایا اور
 ’یہووا‘ خداوند نے اس کے نتھنوں میں اپنا نفس (زندہ) پھونک دیا، اور یہ سانس لینے لگا۔
 ”اے سبحان اللہ!“... اور اب دیکھو! یہ خانہ آباد، پانی بھرا ڈول کھینچتے ہوئے
 کیسے ہوئے ہوئے بیلوں کی جوڑی کے ساتھ باوڑی کی ڈھلان پر سے اتر رہا ہے۔ یہ
 آدمی، ہریا ہری لال۔ اور چیزوں کو اپچاتی، اُنھیں برومند کرتی، ان میں اُنکر لاتی زمین
 کیسی چل پڑی ہے۔ کے... سی۔ اے سبحان اللہ!

چناں چہ، کچھ اوپر ستر برس کا خانوں اپنے دل کی مسرت میں کروٹ لے کر
 آسائش سے اونگھنے لگا۔



میں اور میرے لوگ

میں اور میرے لوگ

وسطِ ہند کی پٹھان ریاست بھوپال میں میرزا اسد اللہ خاں غالب کے ایک شاگرد تھے، نواب یار محمد خان شوکت، ان کے منجھلے صاحب زادے سردار سلطان محمد خان سلطان کی بیٹی منور جہاں بیگم میری ماں تھیں۔

میرا قبیلہ اورک زئی، میرزائی خیل، متوطن تیراہ (مضاف درہ خیبر) بانی ریاست بھوپال، صاحب السیف سردار دوست محمد خان بہادر، نویں پیڑھی میں میرے جد ہیں۔ یہ سن سترہ سوتین عیسوی میں، مالوے بندیل کھنڈ میں وارد ہوئے (میں نے دوسو سینتالیس برس بعد وہ ملک چھوڑ دیا)۔

میرے دادا، میاں کمال محمد خان... کسان، پیر شریعت، جاگیردار^۱۔
میرے باپ، میاں عزت محمد خان... مصوری کے استاد، شانتی نکیتن کے ڈراپ آؤٹ^۲ جنھوں نے عمر کے آخری تیس برس گاؤں گاؤں تبلیغ دین کے لیے نکلنے میں صرف کیے۔
میرے خاندان میں پینسٹھ کلرک، چودہ والیان ریاست اور نواب، دو ڈکیت، تین نیتا، گیارہ جرنیل، ایک صاحبِ کرامت ولی^۳، ایک شہید^۴، چھ ٹوڈی، دو کامریڈ، ایک

☆۱۔ جاگیر نو جوانی میں ہی چھنوا بیٹے تھے کہ خاصے مصلحت نا اندیش اور مغلوب الغضب بزرگ تھے، علیا حضرت والیہ ریاست کی خفگی مول لیتے پھرتے تھے۔

☆۲۔ چند ماہ بعد ہی میرے دادا کا حکم موصول ہوا تھا کہ... فوراً گھر پہنچو، بدعقیدہ لوگوں کی ہمہ وقت کی صحبت تمہارے حق میں چنداں مناسب نہیں۔ دادا نے یہ خط اپنے بچپن کے دوست ٹھا کر صاحبِ جگن پورہ کی تحریک پر لکھا تھا جو خود کٹر ہندو تھے اور میگور کے سٹی سزم کو ہندو ”چرچ“ سے انحراف کا شاخسانہ سمجھتے تھے۔

المپیٹن، سات مکنیک، چونتیس تحصیل دار، ایک مؤذن، ایک ڈپلومیٹ، سات شاعر، پانچ نا کے دار، کچھ پولیس والے، بہت سے لکچرر اور استاد، ایک تانگے والا، تیس چالیس جاگیردار اور پانچ سو نکلے پیدا ہوئے۔

میرے ایک پردادا نے ایک پرانا کو محض اس لیے تلوار مار کر ہلاک کر دیا تھا کہ دعوتِ ولیمہ کی کسی فرشی نشست میں جوتیاں اتارتے ہوئے غلطی سے ان صاحب کی جوتی پر ان صاحب کی جوتی چڑھ گئی تھی۔

میرے خاندان میں آج تک خودکشی کی واردات نہیں ہوئی۔

(ہم لوگ زندگی سے چمٹے رہنا جانتے ہیں)

میں بھوپال کے آبائی مکان میں ۲۶ ستمبر ۱۹۳۲ء کو پیر کے روز^{☆۵} پیدا ہوا تھا۔ شاہ جہانی ماڈل ہائی اسکول بھوپال، حمید یہ کالج بھوپال، جے جے اسکول آف آرٹ ممبئی، ریلوے والٹن ٹریننگ اسکول لاہور، جناح کالج کراچی، سندھ مسلم آرٹس کالج کراچی، اردو کالج کراچی اور یونیورسٹی آف کراچی (شعبہ انگریزی) وہ ادارے ہیں جنہوں نے مجھے کچھ نہ کچھ بنانے کی کوشش کی اور ناکام رہے۔

میں نے کمرشیل آرٹسٹ، پبلشر، کلرک، اسٹنٹ اسٹیشن ماسٹر، ٹریول ایجنٹ، انگریزی کا استاد، کمرشیل رائٹر، ریڈیو نیوز ریڈر... ایسے بہت سے کام کیے اور ٹھیک سے کچھ بھی نہیں کیا۔ میں بال بچوں والا آدمی ہوں۔

میں گیت، نظمیں، کہانیاں، ناول، ایک فلم، ایک ناول اور ایک وصیت نامہ لکھنا چاہتا ہوں اور اپنے باپ کی طرح تصویریں بنانا چاہتا ہوں۔

(میں زندگی سے... آکٹوپس کی طرح... آٹھ حوالوں کے ساتھ چمٹے رہنا چاہتا ہوں)



☆۳۔ صاحبِ کرامت، فیض الدولہ بہادر نواب فیض محمد خان فتح جنگ (المعروف بہ فیض بہادر اولیا نور اللہ مرقدہ) کہ جن کا مزار آج بھی مرجعِ خلائق ہے۔

☆۴۔ شہید عثمان محمد خان خاکسار تھے، بھوپال سے آکر لاہور میں انگریز کی گولی سے شہید ہوئے۔ انہوں نے بیلچے سے لڑتے ہوئے جان دے کر، میرے حسابوں اس گناہ کا کفارہ ادا کر دیا جو بھوپال سے ۱۸۵۷ء میں سرزد ہوا تھا۔ بھوپال میں نئے قلعے کے صدر دروازے پر ایک یادگاری تختی لگی تھی جس پر انگریز سرکار کی طرف سے تصدیق کی گئی تھی کہ بھوپال وفادار ہے اس نے پچاس سپاہیوں سے مدد دے کر بغاوت کچلنے میں ہاتھ بنایا ہے۔ میں نے گیارہ برس کے بے بس غصے میں سختی پر کچھڑل کر ذلت کا یہ داغ چھپا دینا چاہا تھا۔ میرے ماموں زاد عثمان شہید نے انیس برس کی عمر میں اپنے خون سے یہ داغ دھو دیا۔

☆۵۔ داد نے اپنی بیاض میں اس پیدائش کا اندراج یوں کیا ہے: ”ساعتِ تحس میں تولد ہوا۔ اللہ پاک اپنا کرم فرمائے۔“



اسد محمد خاں ۲۶ ستمبر ۱۹۳۲ء کو بھوپال میں پیدا ہوئے۔ ۱۹۵۰ء میں پاکستان آئے اور کراچی میں بس رہے۔ یہیں تعلیم مکمل کی۔ افسانہ نگاری، تراجم اور شاعری کے علاوہ ریڈیو اور بعد ازاں ٹیلی وژن کے لیے گیت، ڈرامے اور فیچر لکھے۔

اسد محمد خاں کی اب تک چھ کتابیں شائع ہوئی ہیں: ”کھڑکی بھر آسمان“ (کہانیاں اور نظمیں ۱۹۸۲ء)، ”برج خموشاں“ (کہانیاں ۱۹۹۰ء)، ”رُکے ہوئے ساون“ (گیت ۱۹۹۷ء)، ”غصے کی نئی فصل“ (کہانیاں ۱۹۹۷ء)، ”نربدا اور دوسری کہانیاں“ (کہانیاں ۲۰۰۳ء)، ”تیسرے پہر کی کہانیاں“ (کہانیاں ۲۰۰۶ء)۔ زیرِ نظر کتاب میں اسد محمد خاں کی ۲۰۰۵ء تک لکھی گئی سب کہانیاں یکجا ہیں۔

”نربدا اور دوسری کہانیاں“ کو اکادمی ادبیات پاکستان کی جانب سے ۲۰۰۳ء کا قومی ادبی ایوارڈ دیا گیا ہے۔ پاکستان اور امریکا میں بہ یک وقت فعال ادبی تنظیم فیض محمد ٹرسٹ نے اسد محمد خاں کو احمد ندیم قاسمی ایوارڈ برائے فکشن ۲۰۰۴ء میں دیا۔

